عطاء الحق قاسمی
امجد اسلام امجد
معاصر
زنگارنگ
اور تر و تازہ
معاصر ادب
پروین شاکر
پر خصوصی تحریریں تصویریں اور رنگین پوسٹرز

ہے کہاں تمنّا کا دوسرا قدم یارب
ہم نے دشتِ امکاں کو ایک نقشِ پا پایا

عطاء الحق قاسمی
امجد اسلام امجد
معاصر

غیر مطبوعہ تحریروں پر مشتمل

۱۹۹۶ء

مُدیران
عطاء الحق قاسمی
امجد اسلام امجد

معاون
عُمر قاسمی

مُدیر انتظامی
یاسر پیرزادہ

قیمت تین سو روپے


○ ترتیب : رُوبی شہناز قاسمی ○ سرورق : راجہ نیرّ ○ طباعت : زاھد بشیر پرنٹرز ریٹی گن روڈ — لاہور

خط و کتابت کیلئے : ادارہ معاصر ○ ۴۵ اے مزنگ روڈ — لاہور

# اِنتساب

بین الاقوامی شہرت کے حامل بینکار
اور ادب دوست شخصیت
جناب امتیاز پرویز
کے نام

# معاصر

○

## پروین شاکر
## ایک تصویری خاکہ

○

طلعت نورین، یاسمین حمید، عطاء الحق قاسمی اور پیر زادہ قاسم

(منگھانی کے ایک اسکول میں بچوں کی فرمائش پر ان کے ساتھ رقص کرتے ہوئے) مہتاب راشدی پروین شاکر' پریشان خٹک عطاء الحق قاسمی اور زہری کے بچے

بیجنگ میں پروین شاکر اور عطاء الحق قاسمی

(بیجنگ کے شہر ممنوعہ کے باہر) پروفیسر پریشان خٹک' پروین شاکر' عطاء الحق قاسمی اور مہتاب راشدی

عطاء الحق قاسمی ' گائیڈ' پروین شاکر' مس روز' پریشان خٹک' بشیر احمد اور مہتاب راشدی (پاکستانی ادیبوں اور دانشوروں کا وفد چین میں)

بیجنگ میں پروین شاکر، بشیر احمد، مہتاب راشدی اور پروفیسر پریشان خٹک

(بیجنگ میں دیوار چین کے سائے میں) عطاء الحق قاسمی، بشیر احمد، پروین شاکر، مہتاب راشدی اور پروفیسر پریشان خٹک

(ایک مشاعرے میں) احمد فراز کلیم عثمانی' پروین شاکر' شہزاد احمد' نجیب احمد' کشور ناہید' نوشی گیلانی' اقبال ساجد' اعجاز کنور راجہ

ڈاکٹر غزالہ خاکوانی' امجد اسلام امجد' پروین شاکر اور عائشہ ملک

امجد اسلام امجد' ایوب خاور' پروین شاکر' احمد ندیم قاسمی ' نوشی گیلانی
اور اختر حسین جعفری (احمد ندیم قاسمی کی ۷۵ ویں سالگرہ میں)

پروین شاکر کی محبتوں کا مرکز۔ مراد (گیتو)

# فہرست



## حمد و نعت



## پروین شاکر کی یاد میں

## افسانے



## پانچ شاعر



## وہ جو ہم سے بچھڑ گئے



## مکالمہ



## کشمیر

## شہر میں مضمون نہ پھیلا



## غیر ملکی نظمیں



## خاکے' طنز و مزاح



## ایک شاعر کا کلام

## مقالے



## غزلیں

## سفرنامہ



## تعارف و تبصرہ



## نظمیں

## خصوصی مطالعہ



## آپ کے خطوط



## چھپتے چھپتے



## آخری صفحہ

# ہارا ہوا لشکر اور بہادر سپاہی

(ادارہ)

ادب ادیب اور سماج کے باہمی تعلق پر قلم اٹھاتے ہوئے سب سے پہلا خیال جو دامن گیر ہوتا ہے وہ کلیشے میں الجھنے اور پھر چند روندے اور کچلے ہوئے نصیحت آمیز سلوگنز کی جکڑ میں مبتلا ہونے کا اندیشہ ہے کہ جب بھی ادب کو معاشرتی فریضوں کا پابند یا ان سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی جاتی ہے تان اسی سم پر آ کر ٹوٹتی ہے جس پر جھومتے جھومتے ہماری کتنی ہی نسلوں کی گردنوں کے منکے ہل چکے ہیں۔

ہماری طرح کے معاشرے، جن میں اقدار کا بحران برپا ہو اور جہاں لوگوں کو اپنے بنیادی حقوق کی حفاظت کے لیے مناسب ادارے نہ ملتے ہوں وہاں عوام الناس مخصوص طبقوں کا، ہر مسئلے کے حل کے لیے ادیبوں، یا کچھ شاعروں اور ادبی دانشوروں کی طرف دیکھنا کچھ ایسا غیر فطری بھی نہیں ہے کہ جس طرح ہر رونے والے کو کسی نہ کسی کندھے کی ضرورت ہوتی ہے اور ہر ڈوبنے والا تنکے کا سہارا ڈھونڈتا ہے اسی طرح اقدار کے آشوب میں مبتلا معاشرہ لکھنے والوں کے قلم کو اپنے مسائل کا حل سمجھتا ہے۔

بیسویں صدی میں دنیا کے نقشے پر جتنی تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں ان کی مثال شاید گذشتہ انیس صدیوں میں ملا کر بھی نہ مل سکے لیکن غور سے دیکھا جائے تو ان ساری تبدیلیوں کی ظہور پذیری میں قلم اور اہل قلم کا رول کم سے کمتر ہوتا نظر آتا ہے اور دنیا کی باگ ڈور ایسے معیشت دانوں، طاقت پرستوں اور تاجروں کے ہاتھ میں نظر آتی ہے جو سائنس

اور ٹیکنالوجی کے گھوڑوں پر بیٹھے منزلیں مارتے چلے جا رہے ہیں۔ یہ درست ہے کہ روس اور چین کے انقلابات کے پیچھے لینن اور ماؤ جیسے اہل قلم کا ہاتھ نظر آتا ہے اور ہوچی منہ، راجندر کرشن، وڈرو ولسن، ونسٹن چرچل اور ان جیسے کئی اور صاحبان علم و قلم مختلف وقتوں، وقفوں اور ملکوں میں حکومتوں کے سربراہ رہے ہیں لیکن بغور دیکھیے تو انھوں نے ترقی کے یہ زینے قلم کی مدد سے نہیں بلکہ کسی اور حوالے سے طے کیے ہیں۔ اس ساری بحث کا مقصد قلم اور اہل قلم کی مقبولیت، بے وقعتی، بے چارگی یا کم اثری کا رونا رونا نہیں بلکہ صرف اس حقیقت کو واضح کرنا ہے کہ ساری دنیا میں بالعموم اور تیسری دنیا کے ممالک میں بالخصوص معاشرتی ڈھانچوں کی تعمیر و تشکیل کے عمل میں قلم کا زور بڑھنے کے بجائے گھٹ رہا ہے۔ یہاں قلم سے ہماری مراد ادب کے اس قدیم روائتی اور مروجہ تصور سے ہے جس میں ادب اپنی ہیئت کے اندر رہ کر زندگی آمیز اور زندگی آموز بنتا ہے یعنی اہل قلم کی اس تعریف کے احاطے میں الیکٹرانک میڈیا، صحافت اور پروپیگنڈائی ادب شامل نہیں ہے کہ یہ بیسویں صدی کی وہ نئی دنیا ہے جو کسی کولمبس کے بغیر نہ صرف دریافت ہوئی ہے بلکہ امریکہ کے نیو ورلڈ آرڈر سے بھی بہت پہلے اپنا ورلڈ آرڈر نافذ کر چکی ہے۔

اندریں صورت ادب کی لڑائی نہ صرف مدافعانہ ہے بلکہ چومکھی بھی ہے کہ ادب کے نام پر لکھی اور پڑھی جانے والی بیشتر تحریریں ہی اپنی "عوامی" مقبولیت، فروخت اور پیش کش کے حوالے سے ادب کے اس تصور کے لیے سب سے بڑا چیلنج بن گئی ہیں جسے ہم حقیقت پسندانہ، ترقی پسند اور معاشرتی اقدار کا محافظ اور ترجمان گردانتے ہیں۔ اس بناسپتی گھی نے اس تیزی سے دیسی گھی کی جگہ لی ہے کہ نقل نے اصل کو پیچھے چھوڑ دیا ہے اور وقت کے بازار میں سچ کی جنس گوداموں میں پڑی اور جھوٹ کا سودا شوکیسوں میں سجا نظر آتا ہے۔ اور کچھ ایسا منظر ہے کہ

ہم    اہل    دل    سر    بازار    دنیا<br>
کھڑے    ہیں،    راستہ    ملتا    نہیں    ہے!

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ سچ اور جھوٹ کا نتارا کیسے کیا جائے اور اس تیز آندھی میں پاؤں کس طرح جمائے جائیں جو سروں سے دستاریں اور چادریں اڑائے لیے

چلی جا رہی ہے۔

ممکن ہے ہماری کھینچی ہوئی اس تصویر سے کچھ یا زیادہ لوگوں کو اختلاف ہو اور وہ اپنے معاشرے میں شعر و ادب کی عوامی مقبولیت اور شاعروں اور ادیبوں کی پذیرائی کے عمومی مظاہرے کو بہت سنجیدگی سے لیتے ہوں اور بین الاقوامی سطح پر چارلس ڈیگال کے اس جملے کے سحر سے باہر نہ نکلے ہوں کہ "میں سارتر کو کیسے قید میں ڈال سکتا ہوں سارتر تو فرانس ہے"' لیکن ہم اس صورت حال کو جس پہلو سے دیکھ رہے ہیں اس کا تعلق پیکر کی شکست و ریخت سے ہے لباس کی چمک دمک اور تراش خراش سے نہیں۔ کیا یہ ایک مانی ہوئی حقیقت نہیں کہ بارہ کروڑ کی آبادی کے اس ملک پاکستان میں بیسٹ سیلر کتاب (دو چار منشیات کو چھوڑ کر) ایک سال میں ہزار سے زیادہ نہیں چھپتی اور بہترین اور مستند ادبی رسائل کی ایک اشاعت دوہزار تک بمشکل پہنچتی ہے! کراچی میں جو اہل زبان کا گڑھ ہے ادبی کتابوں کی دوکانیں وہاں کے اسمبلی ممبروں سے بھی کم ہیں جبکہ لاہور' اسلام آباد' ملتان اور پشاور میں بھی ان کی تعداد کو معقول یا تسلی بخش نہیں کہا جا سکتا' سکولوں اور کالجوں میں اول تو لائبریریاں ہیں ہی کم کم لیکن جہاں ہیں وہاں بھی کئی سال سے نئی کتابوں کا داخلہ بند ہے کیونکہ بیشتر لائبریری فنڈ حکومتوں کے اللوں تللوں کی نذر ہو جاتے ہیں اور جو چند خیرات کے سکے ملتے ہیں وہ اخبارات اور رسائل کی مد میں خرچ ہو جاتے ہیں یعنی اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ ایک دو چار دس فیصد طلبہ لائبریری سے استفادہ کرنا چاہتے ہیں تو انہیں بھی گرد سے اٹی ہوئی الماریوں اور دیمک زدہ کتابوں کے سوا کچھ نہیں ملتا۔ دوسری طرف ریڈیو اور ٹی وی نے ادب اور ادیب کو جو سمعی و بصری' رنگین اور دلفریب روپ عطا کیے ہیں ان کی موجودگی میں کتاب کے Cold point سے قاری کب تک چمٹا رہ سکتا تھا سو آپ نے دیکھا کہ کتاب کی محبت اور افادیت میں نمایاں کمی واقع ہو رہی ہے۔ ایسے میں دیکھا جائے تو ادبی رسائل کسی بھی قسم کی گروہ بندی کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ یہ بات پسپا ہوتے ہوئے لشکر میں خانہ جنگی کے مصداق ہو گی کہ جس کے نتیجے میں لاشوں کو دفن کرنے اور ان پر رونے والوں کو ڈھونڈنا مشکل ہو جاتا ہے۔

# حمد باری تعالیٰ

مظفر وارثی

خدا ہے ایک مگر ایک کی بھی حد میں نہیں
اکائی اس کی کسی زمرۂ عدد میں نہیں
مقام اس کا شعور و مثال سے بھی پرے
وہ ہے رسائی لفظ و خیال سے بھی پرے
وہ جب بھی رب تھا نہ جب کوئی پلنے والا تھا
وہ تیرگی سے بھی پہلے فقط اجالا تھا
یہ آسماں یہ زمیں یہ مہ و نجوم نہ تھے
وہ جب بھی شاہد و عالم تھا جب علوم نہ تھے
تھکن سے اس کا تعلق نہیں خلل سے نہیں
ہر ایک شے کا ہے خالق مگر عمل سے نہیں
نہ جسم ہے نہ وہ سایا نہ کوئی صورت ہے
نہ بہر دید اسے آنکھ کی ضرورت ہے
کلام کرتا ہے لیکن لب و صدا کے بغیر
وہ سن رہا ہے مگر کان اور ہوا کے بغیر
وہ دور بھی ہے مگر فاصلوں کی طرح نہیں
قریب تر ہے مگر ہمسروں کی طرح نہیں
وہی کرے متزلزل وہی ثبات بھی دے
وہ امتحان میں ڈالے وہی نجات بھی دے

# نعت

احمد ندیم قاسمی

یہ حکایت ہے کوئی، اور نہ کوئی افسانہ
سنگ باروں پہ ترا ابر دعا برسانا

تجھ کو تقدیر بدلنے کی بھی آسانی تھی
وہی کچھ ہو کے رہا، تو نے جو دل میں ٹھانا

تو نے اس قوم کو بھی حکمت و حشمت بخشی
جس کا دل سرد تھا، اور ذہن فقط ویرانہ

تیری تعلیم نے اس کو بھی سکھا دی تہذیب
با ادب ہے تری محفل میں ترا دیوانہ

معجزہ اس سے بڑا اور بھلا کیا ہوگا
ظلمت کفر میں تابانئی قرآں لانا

نوع انساں کی تاریخ کا روشن آغاز
ارض مکہ سے ترا سوئے مدینہ جانا

نکہت و رنگ مجھے تیرے ہی صحرا سے ملے
جس کی خاطر چمنستان جہاں کو چھانا

تیرے معیارِ سخاوت کی نہیں کوئی نظیر
بوند اک مانگنا اور سات سمندر پانا

تیری امت کو ملی عظمتِ دائم کی نوید
یوں تو قوموں کا لگا رہتا ہے آنا جانا

تیری شانِ بشریت پہ ہے قربان ندیم
اس نے تیرے ہی توسط سے خدا پہچانا!

○

# نعت

## سید ضمیر جعفری

رحمت اللعالمین کے آستاں تک آ گئے
اس زمیں پر آ کے گویا آسماں تک آ گئے

یہ تو کچھ منظر بیاں تک آ گئے ورنہ دراصل
ہم جہاں تک جا نہ سکتے تھے وہاں تک آ گئے

اولیں میثاق آزادی جہاں لکھا گیا
وقت کے اس محور امن و اماں تک آ گئے

اے ولئی بے کساں اے چارہ ء بے چارگاں
درد کے مارے ترے دارالاماں تک آ گئے

لامکاں کی سمت ان دیکھے دریچے کھل گئے
آج جیسے آخری حد زماں تک آ گئے

دکھ کی تپتی دھوپ میں ایسا غنی سایا کہاں
گنبد خضرا ترے سکھ سائباں تک آ گئے

کیا انوکھا ہے یہ سنگ و خشت کا سحال حسن
ہم ستونوں سے لپٹ کر آسماں تک آ گئے

ذہن میں کانٹے بھری چتائیں پیچھے چھوڑ کر
ارض بطحا تیری خاک مہرباں تک آ گئے

منزل آخر اگر ملتی ہے تو سب راستے
گھومتے پھرتے ہوئے آخر یہاں تک آ گئے

یہ تو اس داتا کے لطف بے نہایت کا ہے فیض
ہم سے وامانده بھی پھر اس آستاں تک آ گئے

پاؤں گرد آلود ہیں لیکن یہ لگتا ہے ضمیر
کہکشاں پر چلتے چلتے ہم یہاں تک آ گئے

○

# نعتؐ

مظفر وارثی

محمدؐ کی اطاعت کر رہا ہوں
خریداریٔ رحمت کر رہا ہوں

نبیؐ کو جس نے پہلی بار دیکھا
میں اس لمحے کی بیعت کر رہا ہوں

ترے محبوب کی خاطر الٰہی
تری دنیا میں شرکت کر رہا ہوں

فراز کرسی و سدرہ پہ چڑھ کر
مدینے کی زیارت کر رہا ہوں

صحیفہ ہیں جو ہجر مصطفیٰؐ کا
ان اشکوں کی تلاوت کر رہا ہوں

ہیں نعلین محمدؐ تاج میرا
غلامی میں حکومت کر رہا ہوں

مجھے کعبہ بہت پیارا ہے لیکن
نبیؐ کے ساتھ ہجرت کر رہا ہوں

نمازیں پڑھ رہا ہوں ان کے پیچھے
میں فردا کی امامت کر رہا ہوں

مظفر معصیت کے ابروں سے
دل و جاں کی حفاظت کر رہا ہوں

○

# نعت

حفیظ الرحمٰن احسن

پھیلتے جاتے ہیں ہر سمت خزاں کے سائے
کب بلاوا مجھے گلزار حرم سے آئے؟

کب سے اک لمحہ تسکیں کو یہ آنکھیں ترسیں
چین پل کو بھی نہ یہ قلب پریشاں پائے

کاش طیبہ کا سفر پھر سے حقیقت بن جائے
رات دن سیر تصور مجھے کیا ترپائے!

کرب ہستی کی کڑی دھوپ وہاں ڈھل جائے
کیا سکوں بخش ہیں دیوار حرم کے سائے

اس بھری دنیا میں کوئی نہیں مونس اپنا
آستاں سے ترے اٹھ کر، کوئی کیسے جائے!

ذات رحمتؐ کے لبوں پر وہ بنے حرف دعا
اہل عدوان نے جو تیر ستم برسائے!

فتح کے روز وہ بخشش کے ترازو میں تلے
ظلم جو دست جفا کیش نے برسوں ڈھائے

آپؐ نے زیست کا ہر عقدہ مشکل کھولا
کیسے کیسے نہ فریب اہل خرد نے کھائے

دل پہ کھل جائے، ہے کیا آپ کا فیضان نظر
معنی لطف تبسم کو اگر پا جائے!

ان کے ممنون کرم سارے زمانے والے
ان کے الطاف کے پھیلے ہیں جہاں پر سائے

ملبس و ماکل و مشرب ہی نہ طیب ہوں اگر
پھر دعاؤں میں وہ تاثیر کہاں سے آئے!

دست بستہ سر دربار کھڑا ہوں احسن
شرم سے حرف تمنا نہ لبوں پہ آئے!

○

# نعت

ریاض حسین چودھری

کلک ثنا کو نور کی موجوں میں رکھ دیا
یعنی گداز عشق کو ہونٹوں میں رکھ دیا

دے کر غبار شہر تمنا کی آرزو،
کس نے چراغ ہجر کا آنکھوں میں رکھ دیا

باد صبا نے ورد درود و ثناء کے بعد
اسم رسول ادھ کھلی کلیوں میں رکھ دیا

آقا حضورؐ ، اہل ہوس نے قدم قدم
میرا ہر ایک خواب خیالوں میں رکھ دیا

میں عکس ناروا تو نہیں تھا زمین پر
دنیا نے مجھ کو بانٹ کے ٹکڑوں میں رکھ دیا

سالار کارواں نے سر ساحل مراد
کاغذ کی کشتیوں کو بھی شعلوں میں رکھ دیا

کوتاہ قامتوں سے گلہ کیا کرے کوئی
سورج مرے وجود کا سایوں میں رکھ دیا

سرکارؐ ناصحان قدامت پسند نے
حرفِ وفا پرانی کتابوں میں رکھ دیا
آقاؐ فقیہ شہر نے آئینۂ حیات
اڑتی ہے جن پہ دھول انھی رستوں میں رکھ دیا
عشاقِ مصطفیٰؐ نے بڑے ذوق و شوق سے
ذکر حضورؐ جھومتے لمحوں میں رکھ دیا،
کتنا کرم کیا ہے خدائے رحیم نے
انؐ کی ثناء کو ڈوبتی سانسوں میں رکھ دیا
کتنے عجیب لوگ ہیں ہم، رہبرِ عظیم!
منزل کا ہر نشان سرابوں میں رکھ دیا
روزِ الست آنکھ جو کھولی شعور نے
قدرت نے ایک نور سا ہاتھوں میں رکھ دیا
میں نے بڑے خلوص سے چوما اسے ریاضؔ
اور پھر قلم حضورؐ کے قدموں میں رکھ دیا

○

# نعت

## زاہد فخری

ذکر تیرا مری صبحوں میری شاموں میں رہے!
تیری ٹھنڈک مری جلتی ہوئی سانسوں میں رہے

عمر گزرے میرے آقا تری مدحت کرتے!
نام تیرا مرے شاہا مرے شعروں میں رہے

حوصلہ تجھ سے ملے دکھ کے بیابانوں میں
روشنی تجھ سے دھڑکتی ہوئی راتوں میں رہے

تجھ سے نسبت مجھے ورثے میں ملی ہے شاہا
تجھ سے نسبت میرے بچوں مری نسلوں میں رہے

جاگتے، سوتے رہے ساتھ تری یادوں کا!
تری خوشبو میری نیندوں مرے خوابوں میں رہے

دل میں آباد رہے شہر مدینہ تیرا!!
تیری گلیاں۔ تیرا روضہ میری آنکھوں میں رہے

بس ترا نام ہی کافی ہے مجھے محشر میں
اک ترا نام مرے آخری لمحوں میں رہے

○

# نعتؐ

## زاہد فخری

یہ دنیا اک سمندر ہے مگر ساحل مدینہ ہے
ہر اک موج بلا کی راہ میں حائل مدینہ ہے

زمانہ دھوپ ہے اور چھاؤں ہے بس ایک بستی میں
خدا کا شکر ہے اس دشت میں شامل مدینہ ہے

تجھے میں دیکھتے ہی اپنا ساتھی مان بیٹھا ہوں
تری آنکھیں بتاتی ہیں تری منزل مدینہ ہے

جہاں عشاق رہتے ہوں وہ بستی ان کی بستی ہے
جہاں بھی ذکر انؐ کا ہو وہی محفل مدینہ ہے

شرف مجھ کو بھی حاصل ہے محمدؐ کی غلامی کا
مرے دل میں وہ بستے ہیں مرا بھی دل مدینہ ہے

کرم کتنا ہے فخری ان کی ذات پاک کا مجھ پر
میں اتنی دور ہوں لیکن مجھے حاصل مدینہ ہے

○

# نعت

محمد منصور آفاق

نیند کا اک سبز گنبد اور میں
انتظار خواب احمد اور میں
ذات کی پہچان کا پہلا سفر
منزل حسرت کی سرحد اور میں
ساحل دل کی ملائم ریت پر
نقش پا کی چشم اسود اور میں
جذبہ تخلیق کی سرجوشیاں
سوچ کا پرنور معبد اور میں
دھڑکنوں کی مضطرب شہنائیاں
مصحف وحشت کی ابجد اور میں
لیلیٰ اظہار کے گل پوش لب
نغمہ اسم محمدؐ اور میں
قریہ ادراک کی جلتی زمیں
ایک سایہ دار برگد اور میں
لاکھ روشن کائناتوں کے امیں
اک شعور ذات کی حد اور میں
آسمانوں کی مقدس منزلیں
ارتباط خاک امجد اور میں
محرم لاہوت کی وسعت میں گم
بوعلی، منصور، سرمد اور میں

○

# پروین شاکر کی یاد میں

پروین شاکر کی یاد میں یہ خصوصی گوشہ ادیبوں کے علاوہ ادب کے قارئین کی تاثراتی تحریروں سے بھی مزین ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ پروین اپنی شاعری اور شخصیت کے نقوش کہاں کہاں چھوڑ گئی ہے۔

(ادارہ)

اب کے بھٹک گئے تو پلٹنا محال ہے
اب کے تو ساتھ راحلہ و رخت بھی نہیں

# خراج عقیدت

محمد اسلم

لاہور میں پروین شاکر کی یاد میں ادارہ "معاصر" کے زیرِ اہتمام قومی ادبی کانفرنس ہوئی جس میں اے این پی کے صدر اور ممتاز ادیب و دانشور اجمل خٹک مہمان خصوصی تھے۔ تقریب کے سٹیج سیکرٹری پروفیسر عطاء الحق قاسمی تھے۔ اشفاق احمد نے تقریب کی صدارت کی۔ امجد اسلام امجد' نجیب احمد' ڈاکٹر انعام الحق جاوید (اسلام آباد) جمشید چشتی' خالد احمد' حسن رضوی' عرفانہ عزیز' جمشید مسرور (اوسلو) ایوب خان' جاوید شاہین' عبدالعزیز خالد' شہزاد احمد' ڈاکٹر سلیم اختر' اعجاز حسین بٹالوی' محترمہ بانو قدسیہ' حمید اختر' انتظار حسین' اور قتیل شفائی سمیت مختلف ادیبوں اور شاعروں نے خطاب کیا۔

مقررین نے کہا کہ پروین شاکر اس دور کی سب سے بڑی خاتون شاعرہ تھیں۔ وہ نوجوانوں کے علاوہ ہر عمر کے طبقہ کی ترجمان تھیں۔ اے این پی کے صدر اجمل خٹک نے کہا کہ پروین شاکر نے اپنے ساحرانہ کلام سے فضا کو نکہتوں سے بھر دیا۔ پروین شاکر آج نظر نہیں آتی مگر اس نے چترال سے لے کر گوادر' تورخم سے کیماڑی تک اردو زبان و ادب بلکہ ملک بھر کے شعر و سخن میں وہ تابندگی پیدا کی جو چمن میں اس کے قلم کے حوالے سے قائم رہے گی۔

وقت کی آواز اور ادب کے تقاضوں کو پس منظر میں رکھتے ہوئے سوچنے کی ضرورت ہے کہ آنچل سرمئی ہو گیا ہے' اور جہاں ہم ہیں' وہاں آواز کو رستہ نہیں ملتا لیکن وہ شعور رکھنے والے آج بھی موجود ہیں' جنہوں نے 60-70 سال پہلے آنچل کو سرمئی دیکھتے ہوئے راستہ بتایا مگر آج اس سرمئی شام کی شام میں کوئی راستہ نہیں ملتا ہر سطح پر

ضرورت سرمئی آنچل میں پھولوں اور آواز کے لئے راستہ نکالنے کی ہے۔ انہوں نے عمران خان کا نام لیے بغیر کہا کہ ایک فرد تنہا کھڑا ہو کر اپنی ماں کے لئے ہسپتال بنا سکتا ہے اب جبکہ مادر وطن کا دوپٹہ تار تار ہو رہا ہے' بچوں کے پیٹ میں کھانا نہیں ہر شخص پریشان دکھائی دے رہا ہے' اس کا جواب شاعروں اور ادیبوں نے دینا ہے' میں اس مشن کے لئے اپنی زندگی کا باقی حصہ وقف کرنے کو تیار ہوں۔ اجمل خٹک نے کہا کہ وہ کانفرنس میں شرکت کرنے خصوصی طور پر اسلام آباد سے آئے ہیں۔ انہیں پروین شاکر کی موت پر جس قدر دکھ ہوا بیان سے باہر ہے۔ پروین شاکر نے انسانیت اور احترام آدمیت کو شاعری میں سمو کر دکھی انسانیت کی خدمت کی۔ تقریب میں سب سے پہلے امجد اسلام امجد نے پروین شاکر کے اکلوتے بیٹے مراد کے لئے کہی گئی نظم سنائی۔ ڈاکٹر انعام الحق جاوید نے اپنی یادیں تازہ کرتے ہوئے یہ شعر پڑھا۔

تمہاری قبر پہ ہم سب کو مل کے رونا تھا
یہ حادثہ بھی اس زندگی میں ہونا تھا

خالد احمد نے یہ شعر پڑھا

نوحہ کس کس کا پڑھیں روئیں کہاں تک خالد
آؤ اب خود کو تہہ خاک اتارا جائے

آخر میں پروین شاکر کے لئے فاتحہ خوانی کی گئی۔

# "خوشبو امر ہے"

ڈاکٹر سلیم اختر

شخصیت کا ہونا تخلیقی عمل کی کٹھالی میں کس طرح سے کندن میں تبدیل ہو جاتا ہے اس کی رمز سمجھنا آسان نہیں کہ اس میں متنوع عوامل و محرکات کی کار فرمائی شامل ہوتی ہے۔ ہر شاعر کا تخلیقی عمل منفرد ہوتا ہے اور اس کا تخلیقی تجربہ برحق۔ مگر اس کے باوجود سند قبولیت بہت کم شاعروں کو نصیب ہوتی ہے۔ چہ جائیکہ قبول عام کا خلعت بھی حاصل ہو جائے اس لئے تاریخ ادب پہر بے مہر ثابت ہوتی ہے تو ادبی مورخ نامہرباں۔ مگر کچھ شاعر ایسے بھی ہوتے ہیں جن کے تخلیقی تجربے کی گہرائی' تخلیقی شخصیت کا اعجاز' زاویہ نگاہ کی انفرادیت اور اسلوب کی ندرت ایسی تخلیقی قوت عطا کرتی ہے کہ وہ عصر اور معاصرین پر حاوی ہو جاتے ہیں اور بلاشبہ پروین شاکر بھی ایسی ہی شاعرہ تھی۔

پروین شاکر نے بیالیس سالہ عمر میں سے تقریباً نصف شاعرانہ سرگرمیوں میں بسر کی مگر جہاں تک شہرت اور مقبولیت کا تعلق ہے تو وہ اپنی تخلیقی عمر اور طبعی عمر دونوں سے ہی آگے نکل گئی ۔ نوعمر لڑکیوں سے لے کر پختہ عمر حضرات تک سبھی مداحوں میں شامل تھے معاصرین' ناقدین' الیکٹرونک میڈیا اور اخبارات و جرائد سبھی میں پروین کے نام کا ڈنکا بجتا تھا مگر اسے ناموری کا نشہ نہ چڑھا اسی لئے اس نے اپنی سینئرز اور معاصر شعرا کا نام ہمیشہ احترام سے لیا۔ احمد ندیم قاسمی کی انگلی پکڑ کر جس تخلیقی سفر کا آغاز کیا تھا اس کے اختتام تک پروین نے اپنے عمو کا احترام کیا۔ شہرت کے سفر میں اس نے سفر کے ساتھیوں کو مستعمل کپڑوں کی طرح پھینک دینے کے برعکس ان سے محبت' خلوص اور احترام کا رشتہ استوار رکھا۔

نہ جانے پروین شاکر کے بارے میں کیسے یہ کلیشے بن گیا کہ وہ کچی عمر کی لڑکیوں

اور ٹین ایجرز کی شاعرہ ہے۔ شاید خوشبو کی کومل شاعری کی بناء پر ایسا ہوا ہو۔ حالانکہ حقیقت برعکس ہے کہ پروین نے عصری شعور سے کبھی بھی صرف نظر نہ کیا۔ چنانچہ پاکستان کے مخصوص سیاسی حالات کے تحت خوشبو لٹانے والی پروین شاکر نے انکار کی صورت میں ایسا مجموعہ کلام دیا جس کی نظمیں، شاخ گل کی بجائے کیکٹس کی معلوم ہوتی ہیں۔ "انکار" اور اس کے بعد کی شاعری میں پروین شاکر کا انداز نظر اور موضوع سخن متعین نظر آتا ہے اور آخر وقت تک وہ انکار کی راہ پر گامزن رہی۔

ہم فرد کی عمر کیلنڈر کے حساب سے متعین کرتے اور اس کے اعمال کو ماہ و سال کی میزان میں تولتے ہیں عام افراد کے لئے تو یہ درست ہو سکتا ہے مگر تخلیقی فنکار کے لئے نہیں کیونکہ اس کی اصل عمر تخلیقی عمر ہوتی ہے جو اس کی تخلیقات سے طے پاتی ہے یہی وجہ ہے کہ بہت سے قلم کار زندگی ہی میں تخلیقی لحاظ سے محروم ہو جاتے ہیں جب کہ کچھ توانا تر تخلیقات کی بناء پر حدود وقت سے ماوراء ہو جاتے ہیں۔ بلاشبہ پروین شاکر بھی ایسی ہی شاعرہ ہے جس نے کم عرصہ حیات میں نہ صرف بہت کچھ حاصل کیا بلکہ اس کی تخلیقات اور ان کی خوشبو حدود وقت سے آگے نکل جائیں گی، وقت اس کا کچھ نہ بگاڑ سکے گا اور تاریخ ادب ہمیشہ اس پر مہربان رہے گی۔

○

# پروین شاکر کی شاعری

سحر انصاری

فرانس کے شاعر پال ورلین کی ایک مشہور نظم کا آغاز اس مصرعے سے ہوتا ہے

"وہی میرے دل میں اشکوں کی طرح روتا
اور شہر پر بارش کی طرح برستا ہے"

پروین شاکر کی اچانک' المناک موت کے بعد' ہمارے دلوں کی انفرادی کیفیت اور ہمارے شہر کی اجتماعی صورت کچھ ایسی ہی ہو گئی ہے۔ پروین شاکر اس عہد کی ایک مقبول' معروف اور پسندیدہ شاعرہ تھیں۔ اگر وہ یہی کچھ ہوتیں تب بھی میں ان کے اور ان کی شاعری کے بارے میں کچھ نہ کچھ کہہ سکتا تھا۔ لیکن بات یہ ہے کہ اس شجر پر بہار کو میں نے اس وقت سے دیکھا' جانا اور پہچانا ہے جب وہ ایک نخل نو خیز کے مانند کسی تخلیقی جہت میں نمو پانے کی خواہش سے معمور تھا۔ پروین شاکر اس وقت نویں جماعت کی طالبہ تھیں اور ہمارے عہد کی ایک قابل قدر خاتون زاہدہ تقی کے اسکول رضویہ گرلز کالج میں پڑھتی تھیں۔ وہ اسی شہر میں مرحلہ وار اپنی تعلیم اور تخلیقی صلاحیت کے جوہر دکھاتی رہیں۔ میں بحیثیت استاد کراچی یونیورسٹی میں آ چکا تھا جب وہ انگریزی میں آنرز کر رہی تھیں۔ پھر انھوں نے انگریزی ادبیات میں ایم اے کیا۔ کالج میں لیکچرار ہو گئیں۔ پھر لسانیات میں ایم اے کیا اور کچھ دن کے بعد سول سروس میں منتخب ہو گئیں۔ ان کا سارا شعری ارتقا نظروں کے سامنے بھی ہے اور اس کی

گواہی ان کی کتابوں اور ادبی رسالوں سے بھی ملتی ہے۔ اکثر مشاعروں اور شعری نشستوں میں بھی ساتھ رہا۔

جب پروین شاکر ہارورڈ میں MPA کا ایک نصاب مکمل کر رہی تھیں تو میں بھی کئی پاکستانی شعرا و ادبا کے ساتھ امریکہ میں تھا۔ پروین شاکر نے ہمیں ہارورڈ مدعو کیا اور بڑی اچھی ضیافت کی۔ اپنا تازہ کلام سنایا۔ اس وقت جناب احمد ندیم قاسمی' جون ایلیا' شہزاد احمد' فتح محمد ملک ہم سب اس ماحول میں پروین سے مل کر اور ان کے طرز حیات کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ اس وقت پروین کا بیٹا مراد بھی انہی کے ساتھ تھا۔

گزشتہ مہینوں کے دوران "جشن محشر" کے موقع پر دوبئی میں پروین شاکر نے اپنا کلیات دکھایا جو "ماہ تمام" کے نام سے شائع ہوا۔ ان سے آخری ملاقاتیں اسلام آباد میں اکادمی ادبیات پاکستان کی ادبی کانفرنسوں میں رہیں۔ ایک ایک منظر آنکھوں میں زندہ تصویروں کی طرح گھوم رہا ہے۔

یہ تمہید صرف اس لیے تھی کہ یہ اندازہ ہو سکے کہ شہر کی مجموعی اداسی سے الگ پروین کی ناگہانی موت نے مجھے ذاتی طور پر کیوں اتنا متاثر کیا۔ شخصی ربط و تعارف بھی زندگی میں بہت اہمیت رکھتا ہے۔

پروین شاکر کا پہلا شعری مجموعہ "خوشبو" واقعی ساری اردو دنیا میں خوشبو کی طرح پھیل گیا۔ اس میں تازگی تھی۔ نازک اور نرم احساسات اور کومل اظہار تھا۔ اپنی ذات کے حوالے سے ان محسوسات کو سپرد حرف کرنے کا رجحان تھا جنہیں بعض فن کار محبت میں مایوسی یا بےبسی سے تعبیر کرتے ہیں اور ان کے اظہار و انکشاف کو اپنی توہین سمجھتے ہیں۔ پروین کی شاعری اور شخصیت کا یہ رخ بہت اہم ہے اور اس پر بہت تفصیل سے لکھنے کی ضرورت ہے کہ ایک طرف وہ بہت محتاط' انا پسند اور ایک حد تک مغرور نظر آنے کو ضروری خیال کرتی تھیں اور دوسری طرف ان کا رویہ یوں تھا کہ

میں اپنے ہاتھ سے اس کی دلہن سجاؤں گی
جو مانگتا اسے دیتی امیر ایسی تھی

پروین یہاں مرد کے چار روپ بہت کھل کر شاعری کا حصہ بنے ہیں۔

باپ، بھائی، محبوب اور بیٹا۔ اس ضمن میں ان کے محسوسات اور ان کا اظہار رسمی نہیں ہے۔ جو کچھ پروین نے بطون ذات میں پایا ہے اس کا اظہار کر دیا۔ اس سچائی اور تسلسل تخلیق نے پروین شاکر کی شاعری کو قابل توجہ بنایا۔

رومانیت، جنس اور سماجیات کے بہت سے رخ پروین شاکر کی شاعری کا حصہ ہیں۔ کہیں انھیں شاعری کے پیکر میں ڈھالتے ہوئے مکمل کامیابی حاصل ہوئی اور کہیں اسے شاعری کی مشق کے کھاتے میں رکھا جا سکتا ہے۔ یہ بات اکثر شعراء کے یہاں نظر آئے گی۔ ہر روز تاج محل تعمیر کرنے پر کوئی فن کار بھی قادر نہیں ہوتا۔

ان موضوعات سے قطع نظر ایک ذہین، تعلیم یافتہ اور حساس خاتون کی حیثیت سے پروین شاکر نے اپنے عہد کی آگہی کو بھی مختلف زاویوں سے دیکھا ہے۔ اس ضمن میں ان کے اس شعر نے پروین کو بہت شہرت دی اور ان کی فکر کا ایک رخ بھی متعین ہوا

جگنو کو دن کے وقت پکڑنے کی ضد کریں
بچے ہمارے عہد کے چالاک ہو گئے

پروین کی ایسی شاعری جس میں نئی آگہی کا اس انداز سے اظہار ہوا ہے ہماری ادبی فضا کا دیر تک ساتھ دے گی۔ اور وہ حصہ جس میں رومانیت کے بعض ابتدائی عکس ملتے ہیں، ایک خاص عمر اور ذہنی سطح کے افراد کے لیے کشش رکھتے ہیں۔

"خوشبو" "صد برگ" "خود کلامی" "انکار"۔ پروین کی شاعری کا ایک گراف بناتے ہیں۔ مجھے یاد ہے کہ جب "خود کلامی" پر انعام دینے کا سوال آیا تو اس کے ایک مصنف عزیز حامد مدنی نے کئی کہنہ مشق شعرا کے مقابلے میں "خود کلامی" کو زیادہ سے زیادہ نمبر دیے۔ ان کا استدلال یہ تھا کہ پروین شاکر کے ہاں اگرچہ ان اساتذہ فن کی سی مشق اور پختگی تو نہیں ہے لیکن تازہ کاری ہے جسے تخلیق کے شعبے میں یقیناً اولیت حاصل ہونی چاہیے۔

پروین شاکر نے مشرق و مغرب کے ادب اور سماجی تاریخ کا گہرا مطالعہ کیا تھا۔ انھوں نے پی ایچ ڈی کے لیے مشرقی پاکستان کے المیے کا تجزیاتی جائزہ منتخب کیا تھا۔ ان کی نسبتاً آخری دور کی شاعری میں ایک نوع کی شکستگی اور تھکن کا احساس ہونے لگا تھا۔ مثلاً یہ اشعار

اب یاد نہیں کہ زندگی میں
میں آخری بار کب ہنسی تھی

جینے کا حوصلہ نہیں، رکنا محال کر دیا
عشق کے اس سفر نے تو مجھ کو نڈھال کر دیا

اس گھر میں تیرگی کے سوا کیا رہے، جہاں
دل شمع پر ہیں اور ارادت ہوا سے ہے

شہر کا شہر یہاں ڈوب گیا
اور دریا کی روانی ہے وہی

تیرے پیمانے میں گردش نہیں باقی ساقی
اور تری بزم سے اب کوئی اٹھا چاہتا ہے

اس قسم کے اشعار میں صرف ذاتی کیفیات ہی نہیں ان کے محرکات میں سماجی اور سیاسی زندگی کے تغیرات سے لے کر ماورائی سوالوں اور کائناتی جبر کی حدوں تک بات پہنچ جاتی ہے۔

پروین کے کلام کا یہ حصہ بلاشبہ غور و فکر کی دعوت دیتا ہے۔ گانے کی محفلوں میں پروین کی جن غزلوں پر سر دھنا جاتا ہے یہ اس سے مختلف شے ہے۔

پروین شاکر کی نظمیں ایک علیحدہ مطالعے کا موضوع ہیں۔ ان میں غزل کی رمزیت اور ایمائیت کے برخلاف زیادہ براہ راست اظہار ہے۔ گزشتہ سال پروین کی دو تازہ نظمیں نظر سے گزریں۔ "ہوا جام صحت تجویز کرتی ہے" اور "ایک ساؤنڈ پروف نظم" پہلی

نظم میں "خوشبو" کی سی پروین شاکر نظر آتی ہے جو کہتی ہیں کہ:

کوئی آتا ہے
آکر چادر غم کو بڑی آہستگی سے
میرے شانوں سے ہٹا کر
سات رنگوں کا دوپٹہ کھول کر مجھ کو اڑھاتا ہے
میں کھل کر سانس لیتی ہوں
مرے اندر
کوئی پیروں میں گھنگھرو باندھتا ہے
رقص کا آغاز کرتا ہے۔

دوسری نظم میں "ساؤنڈ پروف" کی اصطلاح سے خاصی معنوی گہرائی پیدا کی ہے۔ اس نظم کا موضوع امریکہ کی نسبت سے تیسری دنیا کی صورت حال ہے اور نظم کا اختتام ان مصرعوں پر ہوتا ہے۔

شاہراہ شرق اول پر
طلسمی رنگ، جادوئی فضا
اک اور بستی ہے
جہاں دنیا سوم کے
کسی کوچے سے آتے ہیں کو
پروانہ رہداری عظمی نہیں ملتا
جہاں ہم ہیں
وہاں آواز کو رستہ نہیں ملتا

پروین شاکر کی اچانک موت پر ان شاعروں اور شاعرات کی یاد تازہ ہو گئی جنھوں نے عین عالم جوانی میں اپنے سفر کو ادھورا چھوڑ کر...... امکانات کی ایک دنیا کی سمت اشارہ کر کے...... ایک اور رہگذر پر قدم رکھ دیا۔ اور کہنے والے کہتے رہ گئے۔

خوش درخشید ولے شعلہ مستعجل بود

پروین کی شاعری سے عام اور مخصوص حلقے یکساں طور پر متاثر تھے۔ اب جو اپنے اپنے انداز میں لوگ پروین شاکر کو یاد کر رہے ہیں ان کے کلام کی داد دے رہے ہیں اور ادبی محفلوں میں ان کی کمی محسوس کر رہے ہیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ اصل مقبولیت اور دائمی شہرت وہی ہے جو بیک وقت عام لوگوں کے دلوں میں بھی ہو اور تاریخ کے صفحات پر بھی۔ زندہ باد پروین شاکر تمہارا ہی ایک شعر تمہاری نذر ہے۔

چہرہ و نام ایک ساتھ آج نہ یاد آ سکے
وقت نے کس شبیہ کو خواب و خیال کر دیا

(شکریہ "قومی زبان" کراچی)

○

---

# ماہ تمام ----- ناتمام

## ڈاکٹر سعادت سعید

پروین شاکر کی شاعری نئے نسائی عصری شعور سے مملو ہے۔ ہر طبقے اور ہر فکر کے قارئین کی ایک بڑی تعداد کو مسحور کرنے کے بعد ہماری یہ شاعرہ اپنے فن کی ان بلند منزلوں کی جانب رواں دواں تھی جہاں بقائے دوام کی وادیوں میں لے جانے والے مقدر کے کارکنان اس کے بسرو چشم منتظر تھے۔ شہرت عام بھی تو ہر کسی کا مقدر نہیں ہے اس کا خواب غالب نے بھی دیکھا تھا لیکن انہیں شہرت عام کی حسرت رہی مگر بقائے دوام کے دربار میں ان کی بلند پایہ مسند ممتاز و منفرد نقش کی حامل ہے۔ خوشبو 'صد برگ' خود کلامی اور انکار جیسے مقبول اور بڑا بزنس کرنے والے شعری مجموعوں کے بعد پروین شاکر شاعری کے اس آب حیات کی متلاشی تھیں جو انہیں ہومر' فردوسی' حافظ ' جلال الدین رومی ' ورڈز ورتھ ' کالرج ' گوئٹے' میر' غالب اور اقبال جیسے شاعروں کی صف میں لا کھڑا کرتا۔ تاہم اس منزل کا خواب تو دیکھا جا سکتا ہے لیکن اس تک پہنچنے کے لیے سو سو طرح سے جگر خون کرنا پڑتا ہے۔ پروین شاکر کے شعری امکانات انہیں شاعری کی اس سطح تک ضرور پہنچا دیتے لیکن اپنی عمر مختصر میں انہوں نے جو منزلیں ماری ہیں وہ بھی کسی کسی کو نصیب ہوتی ہیں۔ ویسے تو شاعرات میں سیفو ' میرا بائی ' قرۃ العین طاہرہ ' وغیرہ کے نام شاعرانہ عظمت کے اعتبار سے ممتاز و منفرد ہیں لیکن اپنے عورت ہونے کے ناتے عہد قدیم میں ان کے بہت سے امکانات بروئے کار نہ آ سکے۔ پروین شاکر نے ادا جعفری اور فہمیدہ ریاض کے مقرر کیے ہوئے شعری و فکری میدانوں سے گزر کر اپنا مخصوص شعری لب و لہجہ دریافت کر لیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے ہاں لمس کے انتہائی نجی معاملوں سے لے کر وجدانی معراج کے انتہائی اجتماعی سلسلوں تک بہت کچھ سمٹ آیا ہے۔

پروین نئی نسل کی ممتاز اور منفرد شاعرہ ہونے کے ناتے عصری مسائل سے نابلد نہیں ہو سکتی تھیں یہی وجہ ہے کہ ان کے ہاں رومان کی گہرائیوں میں بھی مسائل بھری جدید زندگی کے کھردرے حقائق راہنما جگنوؤں کی مانند دمکتے نظر آتے ہیں۔

سامنے تھا وہ اور خامشی تھی
اب نہ ہم تھے نہ وہ دل رہا تھا

رنگ و روغن کی باتیں محل میں
شہر بنیاد سے ہل رہا تھا

ابھی تیرے سوا دنیا بھی ہے موجود اس دل میں
میں خود کو کس طرح تیرے برابر دیکھ سکتی ہوں

پروین نے اپنے ارد گرد دم توڑتی انسانی قدروں کا اپنے باریک بین شعور کے وسیلے سے جائزہ لیا۔ ان کی سوچ ترقی پسندانہ اور فکر روشن خیال تھی ۔ انہوں نے تاریخ، عصر اور اپنے وجود کے سہ جہتی مطالعوں کو ایک کل میں ڈھالنے کا ہنر سیکھ لیا تھا۔ اس سلسلے میں ان کی نظم "شہزادی کا المیہ" کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہ ہو گا۔ اس نظم کے آغاز میں ایک محل کے نیچے احتیاج مندوں اور قرب شاہی اور عہدے حاصل کرنے والے افسروں اور لوگوں کا ہجوم اس امر کا منتظر ہے کہ علیہ حضرت کی خواب گہ کا حریری پردہ کب ہٹے گا۔ وہ اپنے ساتھ اپنے اپنے کارناموں اور وفاداریوں کا ثبوت لائے ہیں۔ ان کی نگاہیں پردہ اٹھنے کی منتظر ہیں وہ اپنے اپنے شناخت نامے ہوا میں لہرا کر یہ کہنے کا موقع پانا چاہتے ہیں کہ انہوں نے سیاہ اپریل کے اوائل میں کہ جسے پروین شاکر نے خزاں کے دور سے بھی تعبیر کیا ہے اور شام بے وارثی اترنے کی ساعت بھی قرار دیا ہے مقتول وزیر اعظم کے سوگ کے سلسلے میں "دودمان عالی جناب کو چادر عزا نذر کی تھی..." ۔ یہ لوگ وہ ہیں جو ساعت قتل سے پہلے اور بعد اپنے اپنے گھروں میں چھپے ہوئے تھے لیکن اب احسان جتانے اور صلے پانے کے لیے محل کے ارد گرد جمع ہوئے ہیں۔ وہ یہ کہنے کے لیے شرف ملاقات چاہتے ہیں کہ انہوں نے جمہوریت کی بحالی کے لیے نمایاں خدمات انجام دی ہیں ۔ ان میں ایسے لوگ بھی ہیں جو فوجی آمریت کے دور میں شمالی یورپ میں تعیش پسندانہ

زندگیاں گزارتے رہے۔ پروین لکھتی ہیں

سواد شہر صبا میں
خوشبو کی واپسی کے لیے
وہ ہم تھے
جو مثل خاشاک در بدر تھے
شمالی یورپ کے دور افتادہ یخ کدے میں
تمام تر مرکزی نظام حرارت و نور و گرمی میں
وہ ہم تھے جو
سخت اجنبیت کی برفباری میں جل رہے تھے
اور اپنے گھر بار' اپنی املاک' اپنے پیشوں سے دور ہو کر
نئے وسیلوں سے رزق کی دوڑ میں تھے شامل
خمیری روٹی کی یاد میں
سینڈوچ پہ کرتے رہے گزارا
(یہ کار غالیچہ و جواہر تو صرف فرصت کا مشغلہ تھے)
ہمارے ایثار کے تناسب سے
اب صلے کی نوید پہنچے
کسی دیار غزال چشماں و گل عذاراں میں ہم کو تفویض ہو سفارت
مناصب و مال و فصل و املاک کی وزارت
نہیں تو باب مشاورت ہی کھلے کسی پر
جو یہ نہیں تو
کسی علاقے کی صوبہ داری
کسی ریاست میں منصب چاردہ ہزاری
بکار خاص افسروں کی لمبی قطار ہی میں کوئی جگہ دیں
ہمیں صلہ دیں!

اس نظم میں پروین شاکر کا لہجہ آزاد نظم کے سب سے بڑے شاعرن۔ م راشد

کے حکایاتی اور تجزیاتی اسلوب کے قریب قریب پہنچا نظر آتا ہے۔ یہ صلہ مانگنے والے لوگ بزدلی اور موقع پرستی کے چلتے پھرتے مرقعے ہیں۔ پروین نے ان پر طنز کرتے ہوئے اپنے سیاسی اور عصری شعور کا کھل کر اظہار کیا ہے۔ انہیں معلوم ہے کہ وہ لوگ جن کے لہو سے ملکی شاہراہیں رنگین ہوئی تھیں وہ کوئی اور لوگ تھے۔ وہ جنھوں نے جیلیں کاٹیں، قلعوں میں تشدد بھرے دن گزارے، جو ققنسوں کی طرح اپنی آگ میں جل گئے، وہ جو پھانسیوں پر جھول گئے وہ اور لوگ تھے۔ انہوں نے یہ سب کچھ صلوں کی تمنا میں نہیں کیا تھا۔ پروین کو ان واقعات پر شدید دکھ تھا۔ اس کا اظہار انہوں نے ذوالفقار علی بھٹو کی برسی پر لاڑکانے کے ایک مشاعرے میں کیا تھا۔ یہ لوگ جو صلے لینے کے لیے علیہ حضرت کی محل سرا سے باہر انتظار کی گھڑیاں گزار رہے ہیں یہ کون لوگ ہیں؟ یہ وہ ہیں جو لہو کے تاجر اور بیوپاری ہیں۔ پروین کو ان کی پوری پوری شناخت تھی۔ یہ ان لوگوں کی لاشیں بیچنے کے لیے آئے ہیں جنھوں نے اپنے اعمال سے عوام کے دلوں میں سورج اگا دیئے۔ یہ عظمت اور بلندی کے حوالے سے کہکشاؤں پر قدم رکھ چکے تھے۔ صلہ مانگنے والوں نے ان لوگوں کی کھالوں کو جفت سازی کے لیے استعمال کیا۔ جنھوں نے آزادی، جمہوریت اور روشن خیالی کی شمعیں جلائیں وہ اور لوگ تھے صلہ مانگنے والے ان لوگوں سے چوہوں کی مانند خائف تھے۔ ان کے جذبوں کی وجہ سے وہ بید مجنوں کی مانند لرزاں تھے۔ وہ صلہ طلب لوگوں کے کسبوں اور کرتوتوں سے واقف تھے۔ اس لیے انہوں نے ایسے لوگوں کے لیے طرح طرح کے الزام وضع کیے۔ ان کے سچے جذبوں کی بدولت گلوبل ولیج بنانے کا خواب تکنے والوں کے دلوں میں کھلبلی مچی ہوئی تھی۔ وہ بے چارگی کی ریگ تلے دفن ہو رہے تھے مگر انہی صلہ طلب اور عہدہ پرست لوگوں نے سچے لوگوں کے سچے جذبوں کو اپنے حرفوں کی قبروں میں دفنا کر ان کا نام و نشان مٹانے کی کوشش کی۔ ان کے خوابوں کو زر کی تھیلیوں میں سی دیا اور ان کے آزادی پسند، انسان دوست اور غریب پرور دماغوں کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے موت کی نیند سلا دیا۔ اب شہیدوں کی لاشیں تو اہمیت اختیار کر گئی ہیں مگر ان کے پیغام اور ان کے فکر کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا۔ کیا اب کسی کو "سوشلزم ہماری معیشت ہے" کا نعرہ سنائی دیتا ہے یا کوئی " روٹی، کپڑا اور مکان ---- مانگ رہا ہے ہر انسان کی صدا کہیں سے آتی ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسی صدائیں اب کیوں آئیں گی کہ اسی کا صلہ مانگنے کے لیے علیہ حضرت کی محل سرا کے باہر مشاورت، صوبے داری اور سفارت کے طلبگاروں کی لمبی قطار موجود ہے۔

پروین نے خوشبو کے پیش لفظ "دریچہ گل" میں لکھا تھا

"برسوں ہوئے گئی رات کے کسی ٹھہرے ہوئے سناٹے میں ایک کچی عمر کی لڑکی نے اپنے رب سے دعا مانگی کہ وہ اس پر اس کے اندر کی لڑکی کو منکشف کر دے۔ دعا قبول ہوئی اور اس لڑکی کو چاند کی تمنا کرنے کی عمر میں ذات کے شہر ہزار در کا اسم عطا کر دیا گیا۔ پھر جب موسم آیا تو شہر ذات کی گلیوں میں زندگی نے خوشبو کھیلی اور بہار نے آنکھوں پر پھول باندھ دیے۔ انہی پھولوں کی پنکھڑیاں چنتے چنتے آئینہ در آئینہ خود کو کھوجتی یہ لڑکی شہر کی اس سنسان گلی تک آ پہنچی یہاں اس نے مڑ کر دیکھا تو دور دور تک کرچیاں بکھری ہوئی تھیں۔ اس لڑکی نے اپنے عکس کو جوڑنے کی سعی کی لیکن اسی کو اعتراف ہے کہ اس کھیل میں کبھی تصویر دھندلا گئی اور کبھی انگلیاں لہو لہان ہو گئیں۔"

پروین کی شاعری اظہار ذات کے شفاف آئینوں میں منعکس ہوتی شبنمی روشنی سے معمور ہے۔ ان کے ہاں واحد متکلم کا حوالہ بڑا مستحکم ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس واحد متکلم نے تجربات کے پرتنوع اور بوقلموں میدانوں کے طویل فاصلے کچھ اس انداز سے طے کیے ہیں کہ کہیں سطحی نرگسیت یا بوجھل انانیت کا شائبہ تک نظر نہیں آتا۔ اس کی وجہ صرف اور صرف یہ معلوم ہوتی ہے کہ شاعرہ نے اپنے وجود کو انسانی دنیا کے ساتھ ساتھ نسائی دنیا کے مسائل کی پہچان کے لیے وقف کیے رکھا۔

پروین کی شاعری اور طرز احساس کو ان کی زندگی میں بعض ادبی طالع آزماؤں نے فقروں میں اڑانے کی کوشش کی اور ان کے مرنے کے بعد بھی اک دکا رقیب پیشہ نقادوں نے انھیں نشانہ تنقیص بنایا۔ اگر یہ نقاد لسانی تشکیلات کے نظری و عملی معیارات سے ہم آغوش ہو کر پروین کی شاعری پر اعتراض کرتے تو ان کی بات میں کچھ وزن بھی ہوتا۔ لیکن ان کی تنقیصی آرا کو اس لیے نظر انداز کر دینا چاہیے کہ انھوں نے تنقیدی معرکہ آرائی کے لیے سانچو پیزا کا کردار اپنا رکھا ہے اور ان کی تلواریں اور بانس بیچاری بے جان چیزوں پر بھی برستے رہتے ہیں۔ انھوں نے شاید کہیں سے پڑھ یا سیکھ لیا ہے کہ شاعری میں ارتقا کے لیے ضروری ہے کہ اس میں سے قارئین کو کسی قسم کی ہمک یا بدبو آتی رہے۔ کہیں کہیں تو وہ اس ہمک کو ناکافی سمجھ کر اپنے شاعرانہ فرمودات کو قے کی صورت اگلنے سے بھی گریز نہیں کرتے۔ ان میں سے ایک نقاد کا کہنا

ہے کہ پروین کی "شاعری میں محبت کا جذبہ روایتی ہے۔ اور اختر شیرانی کے عہد سے تعلق رکھتا ہے۔ اس دوران وہ محبت کے بارے میں ۱۹۶۰ء کے ارد گرد ہونے والی بحث کو نظر انداز کر گئیں۔ اس لئے ان کا محبت کا رویہ ہم عصری رویے کے مطابق نہیں ہے؟

۱۹۶۰ء کے بعد ۱۹۹۵ء تک کئی اور سال بھی انہوں نے دیکھے ہیں لیکن نقاد صاحب کی سوئی ۱۹۶۰ء ہی کے ہندسوں پر اڑی ہوئی ہے۔ انہیں معلوم ہونا چاہیے کہ پروین کی شاعری میں عصری مشرقی اور مغربی ادب کے مطالعے کے بعد جو پختگی پیدا ہوئی تھی اس نے انہیں اختر شیرانی ہی نہیں عباس اطہر اور زاہد ڈار کے تصور محبت سے بھی بہت آگے کا شعور عطا کیا۔ یہ عصر ساٹھ کی دہائی سے بہت دور نکل آیا ہے۔ آج عورت غیر مشروط ہتھیار پھینکنے یا محض ایک کھلونا یا شے بننے کے لیے تیار نہیں - پروین شاکر نے ایک لمبی خود کلامی کے بعد اردو شاعری میں جس نسائی افکار کی شمعیں جلائی ہیں وہ مرد حاکمیت کے نشے میں گم لوگوں کی رہنمائی کر سکتی ہیں۔ پروین شاکر نے پختہ عمر کے رومانی شعور کو فنکارانہ خوش سلیقگی سے پیش کیا ہے۔ بلاشبہ وہ ایک مقبول شاعرہ تھیں .........
اور شرف قبولیت حاصل ہونا کوئی منفی بات نہیں ہے۔ ان کی شاعری میں رومانوی تجربوں کے ساتھ ساتھ زندگی کی جو تلخیاں ننگے حقائق کی صورت نظر آتی ہیں ان کی بنیاد کی جانب خوشبو کے مذکورہ پیش لفظ میں واضح اشارے موجود ہیں - تمناؤں کی عدم تکمیل سے پیدا ہونے والی تلخیاں ہر جینوئن شاعر کے ہاں موثر اظہار پاتی ہیں اور پروین شاکر تو اس خیال کی مکمل کر حمایت کرتی تھیں کہ

"تلخی اور تمنا دونوں شاعری کے محسوسات سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور میں نہیں سمجھتی کہ انہی معروضی مفاہیم میں اس کی تشریح کی جائے۔ یہ تو نقاد کا کام ہے۔ میں ہمیشہ پر امید رہی ہوں اور تمنا کو میری شاعری میں کلیدی حیثیت حاصل ہے۔"

نہ میں نے چاند دیکھا
اور نہ کوئی تہنیت کا پھول کھڑکی سے اٹھایا
مرا ملبوس اب بھی ملگجا ہے
حنا سے ہاتھ خالی
اور چوڑی سے کلائی

نہ میرے پاس تھے تم
اور نہ میرے شہر سے گزرے
میں کیا افشاں لگاتی
مانگ میں سیندور بھرتی
رنگ اور خوشبو پہنتی
کہ میری لذت دیدار تو تم ہو!
مرا تہوار تو تم ہو!

○

یہ میرے ہاتھ کی گرمی
جسے چھو کر
تمہاری آنکھ میں حیرت کے ڈورے ہیں
کہ اس سے قبل
جب بھی تم نے میرا ہاتھ تھاما
برف کا موسم ہی پایا تھا
یہ موسم میرے اندر کتنے برسوں سے فروکش تھا
بہار آتی تھی
اور میرے دریچوں پر کبھی دستک نہ دیتی تھی
گلابی بارشیں میرے لئے ممنوع تھیں
اور صبح کی تازہ ہوا کا ذائقہ
میں بھول بیٹھی تھی
مرے ملبوس سے سب گرم رنگوں کو شکایت تھی
مجھے بس برف کی چادر پہننے کی اجازت تھی
مگر جاناں!
تمہارے ساتھ نے تو زیست کا منظر بدل ڈالا
یہاں اب رنگ کا تہوار ہے

خوشبو کا میلہ ہے

مرا ملبوس اب گہرا گلابی ہے

مرے خوابوں کا چہرہ ماہتابی ہے

مرے ہاتھوں کا موسم آفتابی ہے

جسے چھو کر.......

.....................

آفتاب احمد خان نے درست لکھا ہے کہ

"پروین شاکر نے اپنی شاعری کے سفر کا آغاز' خوشبو کے وطن' یعنی خوش رنگ پھولوں' خوش نما رنگوں اور خوش نوا طائروں کی وادی سے کیا' مگر جلد ہی زندگی نے ان کی راہ میں کانٹوں کے جال بچھا دیئے۔ چونکہ وہ طبعاً" گلشن پرست واقع ہوئی ہیں لہٰذا انہوں نے پھول ہی نہیں چنے' کانٹے بھی سمیٹ لئے۔ نتیجہ یہ ہے کہ ان کی شاعری میں غم و خوشی کی لہریں بیک وقت ابھرتی ڈوبتی نظر آتی ہیں' تخلیق کی دیوی ان کے ہاں بہ چہرہ تبسم بہ چشم تر آئی ہے۔"

پروین شاکر نے اپنے جذبات' محسوسات ' افکار اور تجربات کو شاعری میں یوں منتقل کیا ہے ہمارے عصر کے اندر پرورش پاتی صداقتیں کھل کر سامنے آئی ہیں انہوں نے شعری احساسات کو چن چن کر شعری تشکیلات میں ڈھالا ہے۔ عمدہ شاعر اپنے گہرے تجربات کو استعاروں اور علامتوں کے پیرائے میں بیان کرنے کے ہنر سے پورے طور پر واقف ہوتے ہیں اور پروین اس میدان میں بہت آگے نکل گئی تھیں۔ انہوں نے انسان اور خصوصاً"عورت کے احساسات' توانا جذبوں ' دکھوں' سکھوں ' خوشیوں ' تکلیفوں کو اپنی موثر اور براہ راست اثر کرنے والی علامتوں میں منتقل کیا ان کی مقبولیت کی یہ ایک بہت بڑی وجہ تھی۔ انہوں نے محبت کے جذبے کو اس طور صفحہ قرطاس پر منتقل کیا ہے کہ سنگدل بھی موم ہونے لگتے ہیں۔

سواد زندگانی میں

اک ایسی شام آتی ہے

کہ جس کے سرمئی آنچل میں

کوئی پھول ہوتا ہے
نہ ہاتھوں میں کوئی تارہ
جو آ کر بازوؤں میں تھام لے
پھر بھی
رگ و پے میں کوئی آہٹ نہیں ہوتی
کسی کی یاد آتی ہے
نہ کوئی بھول پاتا ہے
نہ کوئی غم سلگتا ہے
نہ کوئی زخم سلتا ہے
گلے ملتا ہے کوئی خواب
نے کوئی تمنا ہاتھ ملتی ہے
سواد زندگانی میں
اک ایسی شام آتی ہے
جو خالی ہاتھ آتی ہے!

پروین شاکر نے صنف نازک کی نزاکتوں کے خام تصور کو زیادہ اہمیت نہیں دی۔ انہوں نے اپنے ذاتی تناظر میں تو ان اقدار کو چیلنج کیا ہی تھا جو عورت کو صدیوں سے عام انسانی سطح سے کمتر قرار دیتی ہیں۔ انہوں نے ہر مقام پر یہ باور کروانے کی کوشش کی ہے کہ عورت اگر جس سطح پر نزاکت کی مظہر ہے وہ زندگی کا ایک پہلو ہے ورنہ باقی تمام معاملات میں وہ مضبوط وجود اور گہرے شعور سے متصف دکھائی دیتی ہے۔ پروین نے زندگی کو منفعل یا مجہول شعور کے وسیلے سے نہیں پرکھا۔ وہ ایک ایسی عامل شاعرہ تھیں جس نے خارجی دنیا کے صدیوں کے ڈھلے ڈھلائے اور بنے بنائے معیارات کو ماننے سے انکار کیا۔ اور اپنی ان بے پایاں مستور و معذور قوتوں کو نئی توانائیوں سے ہمکنار کیا۔

خمار لذت سے ایک پل کو
جو آنکھیں چونکیں
تو نیم خوابیدہ سرخوشی میں

غرور تاراجگی نے سوچا
خدائے برتر کے قہر سے
آدم اور حوا
بہشت سے جب بھی نکلے ہوں گے
سپردگی کی اس حسیں انتہا پہ ہوں گے
اسی طرح
ہم بدن اور ہم خواب و ہم تمنا

کیوں مجھ پہ ہوا ہے مہرباں تو
اک ذرہ خاک اور کہاں تو
میں دھوپ کی عادی ہو چلی تھی
کیوں مجھ پہ بنا ہے سائباں تو
میں تیری زمین نصف شب ہوں
تاروں بھرا میرا آسماں تو
تیار ہوں میں سفر کو لیکن
کشتی کا اٹھائے بادباں تو
پتھر میں گلاب دیکھتا ہے
کس درجہ ہے مجھ سے خوش گماں تو
کتنا بھی ہو سخت میرا لہجہ
دیبا و حریر و پرنیاں تو

سلا رہا تھا نہ بیدار کر سکا تھا مجھے
وہ جیسے خواب میں محسوس کر رہا تھا مجھے

پروین نے معروضی حالات اور داخلی تاثرات کا مطالعہ ایک آئینے کی مانند نہیں کیا کہ ان کی شاعری اشیا، کائنات اور انسان کے عکس ہائے محض کی شماریات نظر آنے لگے۔ ان کی شیرازہ بند فکر نے انسان خصوصاً" نسائیت کے حوالے سے بیشمار نئی پرتوں کو منکشف کیا ہے۔ ان

کے ہاں رومانوی جذبے یک سطحی نہیں ہیں۔ ان کے تخلیقی عمل نے تجربے، حقیقت اور تخیل کے نئے آمیزے تیار کیے جو ظاہر ہے کہ مواد اور مشاہدات کی رنگا رنگی کے حامل ہیں۔

یہی تھا چاند اور اس کو گواہ ٹھہرا کر
ذرا سا یاد تو کر تو نے کیا کہا تھے مجھے
تمام رات مری خواب گاہ روشن تھی
کسی نے خواب میں اک پھول دے دیا تھا مجھے
وہ دن بھی آئے کہ خوشبو سے میری آنکھ کھلی
اور ایک رنگ حقیقت میں چھو رہا تھا مجھے
میں اپنی خاک پہ کیسے نہ لوٹ کر آتی
بہت قریب سے کوئی پکارتا تھا مجھے
درون خیمہ ہی میرا قیام رہنا تھا
تو میر فوج نے لشکر میں کیوں لیا تھا مجھے

خوشی کی بات ہے یا دکھ کا منظر دیکھ سکتی ہوں
تری آواز کا چہرہ میں چھو کر دیکھ سکتی ہوں
ابھی تیرے لبوں پہ ذکر فصل گل نہیں آیا
مگر اک پھول کھلتے اپنے اندر دیکھ سکتی ہوں
مجھے تیری محبت نے عجب اک روشنی بخشی
میں اس دنیا کو اب پہلے سے بہتر دیکھ سکتی ہوں
کنارہ ڈھونڈنے کی چاہ تک مجھ میں نہیں ہو گی
میں اپنے گرد اک ایسا سمندر دیکھ سکتی ہوں
وصال و ہجر اب یکساں ہیں، وہ منزل ہے چاہت میں
میں آنکھیں بند کر کے تجھ کو اکثر دیکھ سکتی ہوں

پروین شاکر نے شاعری کے حوالے سے اپنی ایسی پہچان کرائی کہ ان کے بہت سے معاصر شعرا اور شاعرات انگشت بدنداں رہے اور اکثر نے تو شہرت کے حصول کے لیے پروین کی شاعری کا رنگ بھی اپنانے کی کوشش کی لیکن اصل اصل ہے اور نقل نقل۔ یہ رنگ پروین کے

ان تجربات اور فنی اکتسابات کا نتیجہ تھا جو کسی دوسرے کے حصے میں نہیں آسکا۔ وہ ابتدا میں ادبی دنیا سے فنون اور احمد ندیم قاسمی کے وسیلے سے متعارف ہوئیں لیکن ان کی محنت اور فنی لگن کی بدولت دیکھتے دیکھتے شعرو ادب کے تمام بند دریچے ان پر وا ہو گئے۔

خوشبو سے لے کر انکار تک ان کے فنی سفر میں واضح ارتقا ملتا ہے انہوں نے ایک سوال کے جواب میں درست کہا تھا:

"خوشبو" کی اشاعت میری پندرہ برس سے پچیس برس کے دوران کی شاعری ہے۔ اور بعد میں آنے والے مجموعے ایک مختلف نوعیت کے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس دوران قاری کے نقطہ نظر سے "خوشبو" اور "خود کلامی" کے مابین خاصا فاصلہ دکھائی دیتا ہے"

اک حجاب تہہ اقرار ہے مانع ورنہ
گل کو معلوم ہے' کیا دست صبا چاہتا ہے

مدتوں بعد اس نے آج مجھ سے کوئی گلہ کیا
منصب دلبری پہ کیا مجھ کو بحال کر دیا

خوشبو ہے وہ تو چھو کے بدن کو گزر نہ جائے
جب تک مرے وجود کے اندر اتر نہ جائے
خود پھول نے بھی ہونٹ کئے اپنے نیم وا
چوری تمام 'رنگ کی تتلی کے سر نہ جائے
ایسا نہ ہو کہ لمس بدن کی سزا ملے
جی پھول کا ہوا کی محبت سے بھر نہ جائے

دو دلوں کی دھڑکنوں میں گونجتی تھی اک صدا
کانپتے ہونٹوں پہ تھی اللہ سے صرف اک دعا
کاش یہ لمحے ٹھہر جائیں ٹھہر جائیں ذرا

ماہ تمام کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ کہیں کوئی ناتمامی رہ گئی ہے۔ شاعرہ کے جذبات

و خیالات کی دنیا میں بسا اوقات ایسی ویرانی کا احساس ہوتا ہے کہ جہاں دشت اور گھر ایک ہو جاتے ہیں ۔ انہیں اپنے اندر کسی خلا کا احساس ہوتا ہے اور وہ خود کلامی کرتی ہیں۔ یہ کیسا خلا ہے○جو خوابوں کے رستے مری روح میں آ گیا ہے○میں جس پھول بن میں○ہری گھاس پر تتلیاں چن رہی تھی○وہ فرش گھر میرے قدموں سے کیسے جدا ہو گیا○میں جس آسماں کے○ستاروں میں اپنا ستارہ الگ کر رہی تھی○وہ تاروں بھری سقف○سر سے مرے کس طرح ہٹ گئی○زمیں پر ہوں میں اور نہ زیر فلک ○نہ دھڑکا ہے دل میں نہ کوئی کسک○ترے ساتھ ہوں اور نہ تیرے بغیر!○جئے جا رہی ہوں میں اپنے بغیر!○

پروین کے پاس سب کچھ تھا۔ وہ سب کچھ جو اس دنیا میں ایک نارمل زندگی گزارنے کے لیے ضروری ہوا کرتا ہے۔ عزت، شہرت، محبت، عہدہ، اہل وطن کا پیار مگر پھر بھی ان کے اندر سے ایک ہوک اٹھتی تھی کہ دل آباد نہیں ہے۔ کوئی چیخ بلند ہوتی تھی کہ کہیں کوئی ویراں آباد خلا ہے۔ ان کی شاعری میں انسانی جذبے کے استعاراتی اظہار سے کسی قسم کی ماورائیت پیدا نہیں ہوئی۔ انہوں نے اپنے گہرے ترین رازوں، الجھی ہوئی سوچوں اور نادر و شفاف جذبوں کو حیاتی سطح پر کچھ اس انداز سے بیان کیا ہے کہ قاری غیر محسوس طریقے سے ان کے خیالات و افکار کی منطق سے ہم آہنگ ہوتا چلا جاتا ہے۔ اس حوالے سے ان کی نظم مگر یہ دل کی ویرانی ملاحظہ ہو:

تمہارا ہاتھ میرے ہاتھ میں ہے
اور اس کی خوش اثر حدت
مرے اندر
طلسمی رنگ پھولوں کی نئی دنیا کھلانے میں مگن ہے
تمہارے لب پہ میرے نام کا تارہ چمکتا ہے
تو میری روح ایسے جگمگاتی ہے
کہ جیسے آئینے میں چاند اتر آئے
مری پلکوں سے آنسو چوم کر
تم نے انہیں موتی بنانے کی جو ضد کی ہے
وہ ضد مجھ کو بہت اچھی لگی ہے
بہت خوش ہوں

کہ میرے سر پہ چادر رکھنے والا ہاتھ
میرے ہاتھ میں پھر آگیا ہے!

یہ پھول اور یہ ستارے اور یہ موتی
مجھ کو قسمت سے ملے ہیں
اور اتنے ہیں کہ گنتی میں نہیں آتے
مگر اس دل کی ویرانی!
مگر اس دل کی ویرانی!

پروین کے ہاں الفاظ' خیالات اور جذبات ایک دوسرے کی اعانت کرتے نظر آتے ہیں - یہی وجہ ہے کہ ان کی نظموں میں ایک دلکش مانوسیت کا انداز ملتا ہے۔ قاری سوچتا ہے کہ اس کی اپنی روح اور دماغ میں بھی اسی نوع کے تاثرات و کوائف کا دور دورہ ہے۔ انہوں نے کچھ بھی الجھا ہوا نہیں چھوڑا۔ جو کچھ کہا واضح' کھلا اور صاف ہے۔ اگر کہیں ابہام نظر آتا ہے تو وہ صرف اتنا ہے کہ جو خیال کو شعر کے قالب میں ڈھالنے کے لیے ضروری ہوا کرتا ہے اور اسے استعاراتی اور علامتی ابہام کا نام بھی دیا جاتا ہے۔ یہ ابہام شعری جمالیات کا جزو لاینفک ہے۔ اس کے وسیلے سے شعر کی معنوی پرتیں عمیق و وسیع تر ہوتی چلی جاتی ہیں۔

خلقت نہیں ہے ساتھ . تو پھر بخت بھی نہیں
کچھ دن یہی رہے گا تو یہ تخت بھی نہیں
اب کے بھٹک گئے تو پلٹنا محال ہے
اب کے تو ساتھ راحلہ و رخت بھی نہیں
اس بار ہم سے خیمہ کشی کیوں نہ ہو سکی
اس بار تو زمین بہت سخت بھی نہیں
منصب پہ جو خاک نہ ڈالیں تو یہ کھلے
ہم جیسے لوگ اتنے سیہ بخت بھی نہیں
کھینچا ہے جب بھی طول وراثت کی جنگ نے
وارث بھی تخت پہ نہ رہا' تخت بھی نہیں

تار مژگاں نہیں مل رہا تھا
زخم کس یاد کا سل رہا تھا
برف میں روشنی گھل رہی تھی
وہ مجھے خواب میں مل رہا تھا
کچھ عجب روشنی باغ میں تھی
پھول کس رنگ کا کھل رہا تھا

حقیقت یہ ہے کہ پروین کی شاعری اپنے امکانات کے اعتبار سے بلند پایہ ہے۔ اس پر غور و فکر کرنے والے جان سکتے ہیں کہ شاعرہ نے زندگی کی تہ در تہ گھمبیرتا ہوا خوش اسلوبی اور شعری مہارت سے گرفت میں لیا ہے

○

# چھٹی کی گھنٹی

## نجیب احمد

پروین سے میں ہمیشہ ایک بات پوچھا کرتا تھا

"آپ ایسی خوبصورت شاعری اتنی وافر مقدار میں کیسے کر لیتی ہیں۔"

"بس ہو جاتی ہے" وہ جواب دیتی۔

"کیسے" میں کہتا۔

"یہ تو میں نہیں جانتی" وہ مسکرا کر سر جھکا لیتی۔

لیکن اس کی وفات کے روز مجھے معلوم ہوا کہ وہ ایسی خوبصورت شاعری اتنی وافر مقدار میں کیسے کر لیا کرتی تھی۔

قدرت نے جس شخص کو اپنے پاس جلدی بلانا ہوتا ہے اسے وہ تیزی سے کام نمٹانے کے مواقع اور صلاحیت عطا کر دیتی ہے۔

سکول میں پڑھنے والے ہر بچے کو چھٹی کا وقت معلوم ہوتا ہے لیکن آخری پیریڈ شروع ہوتے ہی اس کے ذہن میں گھنٹیاں سی بجنا شروع ہو جاتی ہیں اور وہ پڑھنے کی بجائے اپنی کتابیں اور کاپیاں بستے میں سمیٹنا شروع کر دیتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ پروین کے ذہن میں چھٹی کی گھنٹی دو برس سے بجنا شروع ہو گئی تھی۔ اسی لئے تو اس نے اپنی چاروں کتابوں کو ماہ تمام میں یکجا کر دیا تھا۔

تقریباً ڈیڑھ یا دو ماہ قبل میں اور منظر آخری بار پروین سے ملے تھے۔ اس ملاقات کے دوران میں نے اسے اس کے کالموں کی بے حد داد دی تھی۔

"کیا واقعی میں اچھے کالم لکھتی ہوں" اس نے انتہائی سادگی سے پوچھا تھا۔

"آپ کی شاعری رومانٹک رویئے پر مشتمل ہے جبکہ آپ کے کالم حقیقت کے بے حد قریب ہوتے ہیں۔" میرے جواب پر وہ مسکرائی تھی۔

اس کی مسکراہٹ میں معصومیت کے بے شمار رنگ چھپے ہوئے تھے۔ ایسے رنگ جو صرف بچوں کی وراثت ہوتے ہیں۔ ایسے بچوں کی وراثت جن کے ذہن میں آخری پیریڈ شروع ہوتے ہی چھٹی کی گھنٹی بجنا شروع ہو جاتی ہے۔

○

---

# پھول شہزادی

## پروین قادر آغا

اگر میں شاعرہ ہوتی تو پروین شاکر پر ایک نظم لکھتی۔ اگر میں ادیبہ ہوتی تو پروین کی شاعری اور شخصیت کی خوبیاں بیان کرتی اور کچھ تعریفی کلمات کہتی۔ بدقسمتی سے نہ تو میں شاعرہ ہوں اور نہ ادیبہ۔ اور سچ تو یہ ہے کہ یہاں جو بہت سے قابل ذکر لوگ پروین کو یاد کرنے کے لئے جمع ہوئے ہیں ان جیسی بھی نہیں ہوں' میں پروین کو ایک بڑی شاعرہ کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک عمدہ انسان کی حیثیت سے جانتی ہوں۔

پروین شاکر سے میری پہلی ملاقات آج سے دس سال پہلے میرے دفتر میں ہوئی تھی۔ یہ مئی کا ایک گرم ترین دن تھا اور دفتر کے سب لوگ سالانہ بجٹ کے سلسلے میں بے حد مصروف تھے اور کسی بھی ملاقاتی کو سی بی آر کے دفتر میں داخل ہونے کی اجازت نہیں تھی۔ اچانک اس وقت کے چیئرمین میرے پاس آئے اور کہا کہ اپنی ایک ہم نام کو اور کولیگ کو چل کر چپ کراؤ کہ وہ مسلسل روئے جا رہی ہے۔ اس وقت میں نے پروین شاکر کے بارے میں صرف سن رکھا تھا مگر اسے کبھی دیکھا نہیں تھا اور نہ ہی کبھی اس سے ملاقات ہوئی تھی۔ اس روز اس کی ناراضگی کی وجہ یہ تھی کہ اسے سی بی آر کے استقبالیہ پر روک لیا گیا تھا کیونکہ اس کے پاس داخلے کا خصوصی پاس نہ تھا۔ پروین کے تعارف کرانے کے باوجود اور یہ بتانے کے بعد بھی کہ وہ سرکاری دورے پر کراچی سے آئی ہے اسے دفتر کی سیڑھیاں چڑھنے کی اجازت نہ ملی تھی۔

جب میں کمرے میں داخل ہوئی تو میری نظر ایک نازک سی لڑکی پر پڑی جس کی بڑی بڑی خوبصورت آنکھوں کی پلکیں بھیگی ہوئی تھیں اور اس کی لمبی پلکیں بھی اس کے آنسوؤں کو مسلسل بہنے سے روک نہیں پا رہی تھیں۔ مجھے اس نازک اور کومل سی لڑکی سے محبت ہو گئی۔ اتنی خوبصورت آنکھیں رونے کے لئے تو نہیں بنیں۔ اس کی اس وقت کی کیفیت اس کا منحنی قد کاٹھ' اس کے نازک احساسات بلکہ اس کی پوری شخصیت میرے دل میں اتر گئی۔

اس کے اندر سے کسی نے مجھے اپنی حفاظت کے لئے پکارا اور میں نے محسوس کیا کہ اس کا تحفظ میری ذمہ داری ہے۔ اس ملاقات میں وہ مجھ سے تفصیل سے بات نہ کر سکی۔ میں پروین کی دلجوئی کے لئے اسے اپنے کمرے میں لے گئی۔ جب تک اس کے آنسو تھمے اس کا کراچی جانے کا وقت بھی آ گیا۔ ان دنوں وہ کراچی میں رہتی تھی کیونکہ اس کی پوسٹنگ بھی وہیں تھی۔ اس کے بعد ہمارا آپس میں کوئی رابطہ نہ ہو سکا۔

اس کے چند ماہ بعد ایک روز میرے دروازے پر ایک ہلکی سے دستک ہوئی اور ساتھ ہی ایک روشن اور خوش کن مسکراہٹ کے ساتھ پروین کمرے میں داخل ہوئی اور اس نے انتہائی مسرت کے ساتھ کہا "میری کراچی سے اسلام آباد سی بی آر میں ٹرانسفر ہو گئی ہے" اور یہاں سے ہماری مستقل گہری قربت کا آغاز ہوا۔

وہ ایک پھول شہزادی تھی۔ ایک ترنم' ایک خوشبو اور حقیقت میں بذات خود ہی شاعری تھی۔ مجھے اس کی شاعری پڑھنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی کیونکہ میرے لئے وہ خود ایک نظم تھی۔ میں اسے پڑھتی اور سمجھتی رہی۔ وہ میرے گھر میں میرے ساتھ سال بھر رہی ۔اس نے ایک سال میری بہن کے ساتھ امریکہ میں گزارا۔ اس طرح وہ ہمارے گھر کا ہی ایک فرد تھی۔ جب وہ ہمارے پاس ہوتی تھی تو پھولوں کی ضرورت نہیں رہتی تھی۔ پورا گھر اس کی موجودگی اور خوشبو سے لبالب بھر جاتا تھا۔

پروین ایک بے حد حساس روح تھی۔ وہ کوئی بات کہے یا پوچھے بغیر سب کچھ سمجھ جایا کرتی تھی۔ وہ اپنے شعری وجدان کی بدولت انسانوں کی اندرونی کیفیات کو محسوس کر لیا کرتی تھی۔

پروین نے اپنا آخری شعری مجموعہ "انکار" میرے نام کیا۔ اس سلسلے میں اس نے مجھ سے کبھی نہ ذکر کیا تھا اور نہ ہی کوئی اشارہ دیا تھا۔ ایک دن میں اس سے ملنے گئی' اس

نے مسکراتے ہوئے ایک کتاب میری طرف بڑھائی۔ یہ اس کا شعری مجموعہ "انکار" تھا۔ اس نے اس کا پہلا صفحہ کھولا' میں حیران رہ گئی۔ محبت بھرے احساسات سے میری آنکھوں میں آنسو امڈ آئے۔ میں اداس ہو گئی۔ اتنی اعلیٰ ظرفی۔۔۔۔ اتنے تھوڑے کے لئے اتنا زیادہ۔ میں نے اس سے محبت کی تھی کیونکہ وہ تھی ہی محبت کے قابل۔ کوئی بھی اس سے محبت کئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا اور ادھر وہ اس بات کے لئے اتنی ممنونیت کا اظہار کر رہی تھی۔

ایک حساس روح ہونے کی وجہ سے اس نے میری محبت اور پیار کی قدر کی اور اس کے اظہار کا یہ طریقہ اپنایا۔

پروین شاکر میں کوئی خاص بات تھی جو اسے دوسروں سے منفرد اور بلند کرتی تھی۔ میں حیران ہوتی تھی کہ اتنی کم عمری میں اپنی شاعری کی بدولت اس نے جو شہرت حاصل کی ہے اسے اس نے کتنی بردباری سے اپنے اندر جذب کر لیا اور جب ہم نے اس کلیات ماہ تمام شائع کی اس وقت بھی میں سوچ رہی تھی کہ سب کام کیسے جلدی جلدی ہو رہے ہیں۔ یہ بہت جلد تھا' میں اندر سے ڈر گئی۔ مجھے حیرت تھی کہ خدا اس کا ہر کام اتنی جلدی جلدی کیوں پایہ تکمیل تک پہنچا رہا ہے۔ میرے خدشات درست ثابت ہوئے۔ خدا نے اس کے ذمے اس دنیا میں جو کام کئے وہ انہیں لپیٹ رہا تھا۔۔۔۔ سمیٹ رہا تھا۔۔۔۔ میرا خیال ہے خدا بھی اپنی اس تخلیق (پروین) سے محبت کرتا تھا' وہ اسے جلد از جلد جنت میں بلانا چاہتا تھا۔

میں جب ہسپتال میں اس کے پاس اس کے جوتے اور پرس ہاتھوں میں لئے کھڑی تھی اس وقت میں کتنا بے بس محسوس کر رہی تھی کیونکہ اس کے پہلے سالوں میں جب بھی اسے میری ضرورت محسوس ہوتی تھی تو میں ہمیشہ اس کے ساتھ ہوتی تھی لیکن اس لمحے ہسپتال میں سب بے کار ہوا۔ میری پھول شہزادی جا رہی تھی۔ میں نے دعا کی لیکن تسبیح کے دانوں نے حرکت کرنے سے انکار کر دیا' میں نے محسوس کیا کہ تمام دعائیں بے اثر ہو چکی ہیں کیونکہ اللہ کی طرف سے دعائیں مستجاب نہیں ہو رہی تھیں۔ یہ کتنا عجیب اتفاق ہے کہ جب وہ میرے پاس آئی تھی تو اس کی آنکھوں میں آنسو تھے اور اب جو یہ مجھ سے جدا ہو رہی تھی تو میری آنکھیں آنسوؤں سے لبریز چھوڑے جا رہی تھی۔

اب جب میں پیچھے مڑ کر دیکھتی ہوں تو مجھے احساس ہوتا ہے کہ آخر خدا نے اس کی موت کے لئے اس وقت اور طریقے کا انتخاب کیوں کیا؟ وہ ایک غیر معمولی شخصیت تھی وہ

بڑھاپا لے کر ایک عام موت نہیں مر سکتی تھی۔ اسے تو ہمیشہ رہنا تھا لہٰذا خدا نے اس کی بے وقت موت کے لئے ایک ایسے غیر معمولی طریقے کا تعین کیا اور اسے بڑھاپے کی سختیوں سے بچا لیا اب وہ ہماری یادوں میں ایک تازہ جوان اور خوبصورت پروین شاکر کے طور پر زندہ رہے گی۔ ایک بے رنگ پھول کی بجائے ایک خوش رنگ تازہ پھول کی طرح ---- اس طرح مرنے والے کبھی نہیں مرتے۔

○

# شہرذات کی مسافر

سرفراز سید

"......... پھر جب موسم آیا تو شہرذات کی گلیوں میں زندگی نے خوشبو کھیلی اور بہار نے آنکھوں پر پھول باندھ دیئے۔ اپنی پھولوں کی پنکھڑیوں کو چنتے چنتے، آئینہ در آئینہ خود کو کھوجتی یہ لڑکی شہر کی اس سنسان گلی تک آ پہنچی یہاں اس نے مڑ کر دیکھا تو دور دور تک کرچیاں بکھری ہوئی تھیں.........."

پروین شاکر نے اپنے بارے میں یہ تحریر کوئی بیس برس لکھی تھی۔ وہ بیس برس پہلے جان گئی تھی کہ آخری لمحہ کیسا ہو گا!

صرف یہ کہ یہ واقعہ شہر کی کسی سنسان گلی میں نہیں بلکہ بھرے پرے چوک میں پیش آیا......... اخبارات میں خبر چھپی کہ حادثہ کے بعد دور دور تک کرچیاں بکھری ہوئی تھیں!

۱۹۹۴ء کا سال بہت ظالم نکلا۔ کیسے کیسے چاند چہروں کو ساتھ لے گیا! دلدار پرویز بھٹی کی باتیں ختم نہ ہو پائی تھیں کہ اخبارات میں یکے بعد دیگرے سیاہ حاشیے چھپنے لگے۔ دسمبر کے مہینے نے تو انتہا کر دی۔ اکٹھے سات افراد کو سمیٹ لیا۔ جانباز جتوئی، یاسین قدرت، بابا جی اے چشتی، احمد داؤد، ظہیر کاشمیری، احسن شیرازی اور ابھی مہینہ ختم ہونے میں چار روز باقی تھے کہ پروین شاکر!!

اس روز شہر میں، ملک بھر میں ٹیلی فون کی بہت گھنٹیاں بجیں۔ "تم نے سنا! پروین شاکر حادثہ میں چل بسیں ——!" ہر کوئی پھر کسی کو خبر دے رہا تھا، خبر سن رہا تھا علمی ادبی حلقوں پر تو سناٹا چھانا ہی تھا۔ دوسرے لوگ کیوں دکھی ہو رہے تھے؟ میں اور عطاء الحق قاسمی

ایک دکان سے پھل لینے لگے۔ دکاندار بولا "جناب پروین شاکر کا بہت دکھ ہوا۔ کیا شاعرہ تھی۔۔۔۔ میں ابھی دوپہر کو گھر گیا تھا تو میری بچی رو رہی تھی۔۔۔۔!"

پروین شاکر۔۔۔۔ شاعری کا نیا اسلوب' نیا انداز۔۔۔۔! پھول کو' خوشبو کو ایک رنگ کلاسیکی شاعروں نے دیا' ایک مفہوم اقبال نے دیا اور اب ایک نیا مفہوم پروین شاکر نے دیا۔ کلاسیکی موسیقی کے ماہر اساتذہ ایک مختصر بول کو سو طرح سے ادا کرتے ہیں' ہر بار نیا رنگ' نیا تاثر پیدا ہوتا ہے۔ پروین شاکر نے بھی خوشبو کا استعارہ سو طرح سے باندھا' ہر بار اس سے بے شمار رنگ' پھوٹے' خوشبو در خوشبو' حسن بیان' خیال آفرینی' شدت احساس' آزردگی' بھرے شہر میں اکیلے ہونے کا آشوب۔۔۔۔ پروین شاکر کا سفر جاری تھا۔ اس نے ابھی بہت کچھ کہنا تھا۔ شاعری کبھی ختم نہیں ہوتی' موسیقی کا سفر کبھی نہیں رکتا۔ لفظ رواں رہتے ہیں۔۔۔ مگر شاعری' موسیقی اور لفظوں کی جادوگر پروین شاکر اچانک اس عالم میں رک گئی کہ دور دور تک کرچیاں بکھری ہوئی تھیں۔

پروین کے بارے میں بہت کچھ لکھا جا رہا ہے' بہت کچھ لکھا جائے گا۔ امجد اسلام امجد نے بروقت فیصلہ سنا دیا ہے کہ وہ اردو زبان کی سب سے بڑی خاتون شاعرہ تھی!

پروین نے بہت ہی ادبی محفلوں میں شرکت کی' بہت سے مشاعرے پڑھے' اندرون و بیرون ملک اس کے ساتھ بہت سی ادبی نشستیں منعقد ہوئیں۔ اس کے شعری مجموعہ "خوشبو" کے پچاس سے زیادہ ایڈیشن شائع ہوئے۔ بے شمار ایڈیشن وہ بھی تھے جو بعض ناشروں نے بلا اجازت چھاپ لئے۔ یہی صورت حال اس کے دوسرے شعری مجموعوں کی رہی۔ اسے بے شمار لوگ جانتے تھے۔ اس کی باتیں سنی تھیں اس سے باتیں کی تھیں۔ ہر شخص اس کے بارے میں اپنے تاثرات رکھتا ہے۔

پروین کو جس روز حادثہ پیش آیا' اس روز میں نے بہت سے لوگوں سے ان کے تاثرات معلوم کرنے کے لئے ٹیلی فون پر رابطہ قائم کیا۔

احمد ندیم قاسمی ملک سے باہر تھے' قتیل شفائی' امجد اسلام امجد' عبدالعزیز خالد' عطاء الحق قاسمی' شہزاد احمد' خالد شریف اور بہت سے لوگ! جس شخص سے بھی رابطہ ہوا اس کی آواز میں شکستگی' لہجہ نڈھال تھا۔

میں احمد ندیم قاسمی صاحب کے دفتر مجلس ترقی ادب گیا۔ خیال تھا کہ شاید مسقط

سے واپس آ گئے ہوں گے۔ وہاں دفتر میں منصورہ احمد اکیلی بیٹھی سسکیاں لے رہی تھی۔ میری اپنی آنکھوں میں نمی تیر رہی تھی، میں خاموشی سے واپس چلا آیا۔

اس روز ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر بار بار اعلان ہوتا رہا۔ ٹیلی فونوں کی گھنٹیاں بجتی رہیں۔ دکھ کی شدت انتہا کو پہنچ جائے تو زبان، حرف اور لفظ ساتھ چھوڑ دیتے ہیں، کلام ساکت ہو جاتا ہے۔ اس روز لوگ ایک دوسرے سے بات کرتے اور بس اتنا کہتے کہ "یہ کیا ہوا" اور پھر چپ ہو جاتے۔

اس روز احمد ندیم قاسمی اور احمد فراز مسقط میں تھے۔ قاسمی صاحب کی طبیعت اچھی نہیں تھی۔ انہوں نے اگلے روز لاہور آنا تھا۔ منصورہ پریشان تھی کہ قاسمی صاحب لاہور پہنچیں گے تو انہیں یہ اطلاع کیسے دی جائے گی! مگر قاسمی صاحب کو مسقط میں پاکستانی سفارت خانہ نے اطلاع پہنچا دی۔

۲۲ برس پہلے انہوں نے پروین شاکر کو منہ بولی بیٹی بنایا تھا۔ اس خبر نے انہیں نڈھال کر دیا۔ وہ اور احمد فراز مسقط کے ہوائی اڈے پر آ گئے۔ احمد فراز بتاتے ہیں کہ طیارہ صبح روانہ ہونا تھا قاسمی صاحب ساری رات ہوائی اڈے پر ٹہلتے رہے اور روتے رہے۔ لاہور پہنچے تو حالت بہت خراب تھی۔ اس کے پیش نظر انہیں نیند کا ٹیکہ لگا کر سلانا پڑا۔

اور ہمیشہ یوں ہوتا ہے کہ لوگ دور چلے جاتے ہیں تو ہمیں یاد آتا ہے کہ جانے والے تو بہت اچھے تھے۔ وہ ہم سے کچھ بھی تو نہیں مانگتے تھے۔۔۔ بس یہی محبت کے دو بول، خلوص کی ایک آدھ بات۔۔۔ اور بس!

اور ہمیشہ یوں ہوتا ہے کہ ہم کسی کو محبت کے دو بول، خلوص کے کچھ کلمات نہیں دے سکتے۔ اور جب وہ چلے جاتے ہیں تو پھر انہیں یاد کرنے لگتے ہیں، قدموں کے نشان گننے لگتے ہیں۔

پروین شاکر نے زندگی میں بہت سی خوشبو بانٹی اور خود کیا پایا؟ اس کے پاس گھر تھا، اچھی ملازمت تھی، اچھی گاڑی تھی، بہت شہرت پائی، بہت ناموری حاصل کی، ملکوں ملکوں گھومی، اعلیٰ ترین اعزازات حاصل کئے مگر پھر اس نے کیوں کہا کہ:

یہ کیسا خلا ہے

جو خوابوں کے رستے مری روح میں آگیا ہے
میں جس پھول بن میں
ہری گھاس پر تتلیاں چن رہی تھی
وہ فرش گہر میرے قدموں سے کیسے جدا ہو گیا!

ایک بس ڈرائیور کی ذرا سی غفلت' ذرا سی کوتاہی' چند لمحوں کی غیر ضروری عجلت پروین شاکر کو بہت دور لے گئی۔ اسے ابھی نہیں جانا تھا۔ اس نے ابھی بہت کچھ کہنا تھا۔ اس نے بہت خوبصورت رومانی شاعری کی مگر اس کی شاعری کا ایک پہلو عام طور پر سامنے نہ آیا وہ تھا بغاوت کا اعلان!

پروین نے ۲۲ برس کی عمر میں غزل کہی کہ

رستہ بھی کٹھن دھوپ میں شدت بھی بہت تھی
سائے سے مگر اس کو محبت بھی بہت تھی
خوش آئے تجھے شہر منافق کی امیری
ہم لوگوں کو سچ کہنے کی عادت بھی بہت تھی

پروین شاکر کے سانحہ کی خبر سنی تو مجھے ایسے ہی ناروے کے مشہور ادیب کنوت ہامسن کی مشہور کہانی "مسٹریز" کا مرکزی کردار یاد آگیا جو غریب مچھیروں کی ایک بستی میں آکر رہتا ہے اور روزانہ شہر جا کر اپنے نام مسرت انگیز ٹیلی گرام بھیجتا ہے۔ بالآخر بے نام اذیت کا شکار ہو کر اپنا راز فاش کر دیتا ہے۔

پروین شاکر کی خوشبو کی شاعری نے نوجوان لڑکے لڑکیوں کے دلوں کی دھڑکنوں کو تیز کرنے کے ساتھ بڑی عمر کے لوگوں کے احساس کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ وہ خوشبو کی باتیں کرتی تھی خود خوشبو کی طرح پھیلتی گئی۔ ابتداء میں بہت رومانی شاعری کی پھر احساس کی شدت اور گہرائی کی باتیں کرنے لگی۔ وہ ایسی زندگی گزار رہی تھی جو لوگوں کو بظاہر بہت خوشنما لگتی تھی ـــــ مگر یہ راز دیر بعد کھلا کہ وہ تو مچھیروں کی بستی میں رہ کر خود ہی اپنے نام مسرت آمیز تار

بھیجا کرتی تھی اور بالآخر اپنا راز فاش کر دیا۔ "معاصر" میں شائع شدہ اپنے آخری کلام میں ایک نظم سواد زندگی میں اس نے کہا۔

سواد زندگی میں
اک ایسی شام آتی ہے
کہ جس کے سرمئی آنچل میں
کوئی پھول ہوتا ہے
نہ ہاتھوں میں کوئی تارہ
جو آ کر بازوؤں میں تھام لے
پھر بھی
رگ و پے میں کوئی آہٹ نہیں ہوتی
کسی کی یاد آتی ہے
نہ کوئی بھول پاتا ہے
نہ کوئی غم سلگتا ہے
نہ کوئی زخم سلتا ہے
گلے ملتا ہے کوئی خواب
نے کوئی تمنا ہاتھ ملتی ہے
سواد زندگانی میں
اک ایسی شام آتی ہے
جو خالی ہاتھ آتی ہے

پروین کے ذکر پر مجھے بمبئی کی گیتانجلی بھی یاد آ رہی ہے۔ ایک سکھ گھرانہ کی لڑکی، ۱۲ جون ۱۹۶۱ء کو پیدا ہوئی، ۱۱ اگست ۱۹۷۷ء کو کینسر کے باعث انتقال کر گئی۔ والدین نے ٹیگور کی نظم گیتانجلی کے نام پر اس کا نام رکھا تھا۔ اس لڑکی نے ۱۴ برس سے ۱۶ برس کی عمر کے دو برسوں میں انگریزی میں دو سو نظمیں لکھیں جن کا دنیا بھر کی زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ بمبئی

میں ایک سڑک کا نام اس کے نام پر رکھ دیا گیا ہے۔ ایک نظم میں گیتانجلی کہتی ہے: (ترجمہ)

مری آواز لوٹ آتی ہے سناٹے سے ٹکرا کر
وہی بس اک صدا جیسے مقدر بن گئی میرا
مجھے لے جائے گی اک دن یہ مینار خموشی تک
وہ مینار خموشی دیکھتی ہوں جس کو خوابوں میں
تصور کے ہمالہ کی حسین چوٹی پہ استادہ
بلندی، منزل آخر کی ہے میری نگاہوں میں
یہ رہ پامال ہے اس پہ ہزاروں لوگ گزرے ہیں
وہ منزل سامنے ہے اور نہیں خائف سفر سے میں
کسی کا دل دکھایا ہے نہ مجرم میں کسی کی ہوں
گزر جاؤں گی یوں ہی زندگی کی رہ گزر سے میں

گیتانجلی تو زندگی کی رہ گزر سے چپ چاپ گزر گئی مگر پروین شاکر تو یوں گزری کہ دور دور تک کرچیاں بکھر گئیں! اس نے خود ہی تو کہا تھا کہ

یک لخت گرا ہے تو جڑیں تک نکل آئیں
جس پیڑ کو آندھی میں بھی ملتے نہیں دیکھا

اس کی مٹھی میں بہت دیر رہا میرا وجود
میرے ساحر سے کہو اب مجھے آزاد کرے

اور یہ کہ:

میری طلب تھا ایک شخص، وہ جو نہیں ملا تو پھر
ہاتھ دعا سے یوں گرا، بھول گیا سوال بھی!

○

# پروین شاکر کی یاد میں

زاہد فخری

پچھلی تین چار دہائیوں میں اردو شاعری نے بڑے اہتمام سے خواتین شاعرات کا استقبال کیا ہے۔ اور شاعرات نے بھی بڑی محبت اور ماتا کے ساتھ نظم اور غزل کو پروان چڑھانے میں اپنا بھرپور کردار ادا کیا ہے۔ اس محبت اور اس کے ردعمل سے اردو شاعری مزید معتبر ہوئی ہے۔ اور اس مشینی دور کے عروج کے دنوں میں بھی اپنے ہر دل عزیز ہونے کا سفر نہ صرف بہت اعتماد اور تیزی سے طے کیا ہے بلکہ خدا کی تخلیق کے دونوں نمائندوں مرد اور عورت کو یکساں طور پر اپنے وارث ہونے کا حق عطا کر دیا ہے' اور پروین شاکر اور اس کے قبیلے کی دوسری شاعرات نے بحث کی کوئی گنجائش ہی نہیں چھوڑی' لیکن مجھے یہ کہنے میں کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں ہوتی کہ پروین اپنے قبیلے کی سردار شاعرہ ہے' جس کا اعتراف نہ کرنے والے میری رائے میں ہمیشہ نقصان میں رہیں گے۔ اور آنکھ کھلنے پر پچھتاوے کے سوا ان کے ہاتھ کچھ نہیں آئے گا۔ میں یہاں پروین شاکر کی شاعری کی فنی خوبیوں کا موازنہ کسی اور شاعر یا شاعرہ سے نہیں کرنا چاہتا کیونکہ میں اس محاورے کا قائل ہوں کہ "Comparison is no where" ویسے بھی میں گروہ بندیوں سے آزاد اس قافلے کا مسافر ہوں جو ہر اس شاعر کی عزت کرتا ہے جس نے زندگی میں ایک بھی اچھا اور سچا شعر کہا ہو' لیکن اس نے تو سینکڑوں ایسے اشعار کہے ہیں جو اردو ادب اور اس کے پڑھنے والوں کے دلوں میں ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ اس کی مضبوط اور دل نشین شاعری نے اپنے عہد سے شاعر اور قاری دونوں کو ہی بہت متاثر کیا ہے۔ اس کا گھر ہر اس دل میں ہے جو درد مند ہے۔ خواہ کوئی تاجر ہو' استاد ہو' نوجوان نسل کے لڑکے' لڑکیاں ہوں' دکان دار ہو' مزدور ہو سیاستدان' مجھے یقین ہے کہ وہ ہم سب کے درمیان لوک گیتوں کی طرح ہمیشہ

زندہ رہے گی۔ انگلش ادب کے وسیع مطالعے اردو ادب کی محبت اور محترم احمد ندیم قاسمی کی شفقت اور راہنمائی نے اسے لازوال شہرت اور عزت عطا کی اور اس کی اچانک اور بے وقت موت نے اس سے اور اس کے فن سے محبت کرنے والوں کے دلوں میں ایک ایسا دکھ شامل کر دیا ہے جس سے اس کی یاد کا موسم ہمیشہ ہرا بھرا رہے گا۔

وہ جس انداز اور ڈکشن کی شاعرہ تھی مجھ ایسا کم علم اس کے بارے میں سوائے عقیدت کے اور کچھ نہیں لکھ سکتا۔ لیکن میں اتنا ضرور کہہ سکتا ہوں کہ وہ اپنے وقت سے بہت مختلف اور بہت آگے تھی اس لئے وہ ہر جگہ' ہر ماحول میں اور ہر محفل میں گم سم' الگ تھلگ' بے نیاز اور اداس اداس رہتی تھی۔ شاید وہ اس سارے ماحول میں "Misfit" تھی یا یہ سارا ماحول اس کے لئے "Misfit" تھا۔

ہم جس خاص بندھے بندھائے فریب زدہ معاشرے میں زندہ ہیں' ہم جس جھوٹ کے میلے میں بڑے شوق سے ریاکاری کے سکے ہاتھ میں لے کر منافقت خریدتے ہیں وہ وہاں سچ دیکھنا چاہتی تھی۔ ہم جس دوہری زندگی کو پوری ڈھٹائی سے بسر کر رہے ہیں وہ اس کی نفی کرنا چاہتی تھی۔ وہ بہت کچھ چاہتی تھی۔ لیکن جب وہ یہ سب کچھ نہ بدل سکی تو اس نے اپنا ٹھکانہ بدل لیا اور اس خدا کے پاس چلی گئی جو دلوں کے حال بہتر جانتا ہے۔ میں آپ کو اس کے چند ایسے اشعار سنانا چاہتا ہوں جو مجھے بے حد پسند ہیں اگرچہ یہ اتنی مقبولیت حاصل نہ کر سکے جتنی اس کے دوسرے شعروں نے کی۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ آنے والے زمانوں میں اس کے یہی اشعار بے پناہ مقبولیت حاصل کریں گے' یہی تو بڑے لوگوں کی خوبی ہوتی ہیں کہ وہ حال' ماضی اور مستقبل کو ساتھ لے کر چلتے ہیں۔

جنگل سے ڈرا ہوا پرندہ
شہروں کے قریب رہ رہا ہے
باہر سے نئی سفیدیاں ہیں
اندر سے مکان ڈھ رہا ہے

شدت ہے مزاج میرے خوں کا
نفرت کی بھی دے تو انتہا دے

چکھوں ممنوعہ ذائقے بھی
دل سانپ سے دوستی بڑھا دے

صدیوں سے سفر پہ ہے سمندر
ساحل پہ تھکن پٹک رہا ہے

قامت سے بڑی صلیب پا کر
دکھ کو کیوں کر گلے لگاؤں

اس نسل کا ذہن کٹ رہا ہے
اگلوں نے کٹائے تھے فقط سر

○

# دسمبر.........! مت آنا

فوزیہ چودھری

میں حیران ہوں' مجھے اس بات کا اندازہ پہلے کیوں نہ ہوا' کہ میں اسے شدید محبت کرتی ہوں۔ اب سوچتی ہوں تو خود پہ حیرت ہوتی ہے' کمال ہے' کوئی شخص اتنا بھی بے خبر ہو سکتا ہے؟ یہ جذبہ ہی ایسا ہے۔ ایسے چپکے چپکے انسان کے اندر گھر کر جاتا ہے کہ کانوں کان خبر نہیں ہوتی۔ پتہ تب چلتا ہے جب پانی سر سے گزر چکا ہوتا ہے۔ میرے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہے۔ میری محسوسات میں یہ شدت پہلے نہ تھی اور میں اسے اس بری طرح Miss بھی نہ کرتی تھی۔ پہلے ہر چیز معمول کے مطابق تھی۔ مجھے احساس تھا کہ وہ موجود ہے اور ان معمولات کا ایک حصہ ہے۔ احساس مطمئن تھا کہ وہ اپنی جگہ موجود ہے اور معمولات زندگی میں سرگرداں اور مصروف۔ میں نے کبھی اس کی کمی محسوس نہ کی تھی۔ اور پہلے میری محبت میں اتنی شدت بھی نہ تھی۔

میری کوئی اس سے اتنی لمبی چوڑی ملاقاتیں بھی نہ تھیں' بلکہ بالکل ہی نہ تھیں۔ بس میں زندگی میں ایک بار اسے دو بدو ملی تھی۔ صرف ایک بار......... اور وہ بھی اتنا کم......... کہ مجھے اب اس ملنے کی کم مائیگی کا احساس ہوتا ہے تب میں نے یہ جانا تھا کہ شاید یہ میری پہلی ملاقات ہے اس کے بعد میں بے تحاشا بار اسے ملوں گی' اسے چھو کے دیکھوں گی' اس سے مخاطب ہوں گی۔ اس کی آواز کا ٹھہرا ہوا لہجہ مجھے اپنے حصار میں لے لے گا اور میں سر تا پا اس لہجے کے تاثر میں گم ہو کر الکھ نگری میں پہنچ جاؤں گی۔ لیکن مجھے کیا پتہ تھا کہ یہ سب کچھ یوں ہی کچھ وقت میں ختم ہو جائے گا اور پھر نہ کوئی آس رہے گی اور نہ کوئی امید.........

وہ معمولی سا واقعہ ایک فلم کی طرح میرے ذہن کی سکرین پر بارہا چل چکا ہے

پہلے میں نے کبھی اسے یوں نہ دہرایا تھا بس اسے ایک اتفاقی ملاقات ہی خیال کیا۔ مگر اب وہی معمولی واقعہ غیر معمولی بن گیا ہے اور اپنی جملہ جزئیات سمیت بار بار میرے ذہن کی سکرین کا طواف کر رہا ہے۔ مجھے وہ موہوم سا لمس بھی بڑا واضح محسوس ہوتا ہے جو اس کے کندھے کے اوپر سے ڈائری پکڑاتے ہوئے میں نے اس کے ریشمی' ہلکے آسمانی رنگ کے لباس کا لیا تھا۔ میں کئی بار ڈائری کا وہ صفحہ کھول کے اس کے ہاتھوں کا وہ لمس اپنے ہاتھوں کی پوروں پر محسوس کرنے کی کوشش کر چکی ہوں۔ جہاں بڑے واضح اور روشن لفظوں میں یہ شعر رقم ہے۔

شب وہی لیکن ستارہ اور ہے

اب سفر کا استعارہ اور ہے

میں نے پہروں ان مختصر لفظوں کو دیکھا ہے اور پھر وہ دبلے پتلے ہاتھ میری آنکھوں کے سامنے گھوم جاتے ہیں جن میں میں نے قلم تھمایا تھا۔ اس وقت یہ واقعہ کسی خاص اہمیت کا حامل نہ تھا۔

یہ اپریل کی ایک خنک شب تھی جب پریس کلب بہاولنگر کے احاطے میں مشاعرہ برپا تھا اور ملک کے چند نامور شعراء جن میں پروین شاکر بھی شامل تھیں وہاں مدعو تھے۔ میں نے پہلی بار پروین شاکر کو دو بدو دیکھا اور سنا میں بہت خوش تھی کہ میں نے پروین شاکر کے ساتھ ساتھ احمد فراز کو بھی یہاں پہلی بار ہی سنا تھا۔ میری یہ خوشی اس وقت دو چند ہو گئی جب امجد اسلام امجد نے مجھے اور بچیوں کو با اصرار اس کھانے میں شمولیت کی دعوت دی جو مہمانوں کے لئے تیار کیا گیا تھا۔ اب میں سوچتی ہوں اگر امجد اسلام امجد اصرار کر کے ہمیں اس کھانے میں شامل نہ کرتے تو شاید ہم لوگ اس واحد فقرے سے بھی محروم رہتے جو پروین شاکر نے ہمیں مخاطب کر کے کہا تھا۔

کھانے کی میز پر ہم کل پانچ خواتین ہی تھیں۔ میرے ساتھ منصورہ بیٹھی تھیں اور ساتھ میں احمد ندیم قاسمی۔ پھر میز کے دوسرے رخ احمد فراز اور پروین شاکر اور پھر نوشی گیلانی۔۔۔ میں نے کھانا تو برائے نام ہی کھایا۔ مگر میرا زیادہ وقت ان لوگوں کو کھانا کھاتے دیکھتے ہوئے گزرا۔ اس وقت کی چھوٹی سی چھوٹی بات بھی واقعہ بن جائے گی۔ یہ تو میں نے کبھی نہ سوچا تھا۔

میں اپنے بچپنے ہی سے "ہیرو پرست" واقع ہوئی ہوں میرا ذہن جو اگرچہ اب

پختگی کی عمر کو پہنچ چکا ہے یہ بات ماننے کو ہرگز تیار نہیں ہوتا' کہ وہ لوگ جنہیں میں ایک بار اپنے نگار خانہ دل کے سنگھاسن پر بیٹھا لیتی ہوں۔ وہ بھی میری اور عام لوگوں کی طرح ہی کے لوگ ہوتے ہیں۔

پروین شاکر کو دیکھتے ہوئے بھی میری یہی ہیرو پرستی غالب رہی۔ میرا دل اب بھی اسے ایک عام خاتون ماننے کو تیار نہیں ہے اور واقعتاً وہ عام تھی بھی نہیں۔ کم از کم میرے لئے تبھی تو اس کی چھوٹی سے چھوٹی بات بھی واقعہ بن کر اب میرے سامنے آ رہی ہے۔ کھانے کے دوران جب ایک بار میری آنکھیں پروین شاکر سے چار ہوئیں' میرے ہاتھ میں کھلی ڈائری دیکھ کر جسے میں نے آگے کی طرف بڑھایا ہوا تھا۔ پروین شاکر نے میرا مقصد بھانپ لیا' اور ایک خوبصورت سی مسکراہٹ کے ساتھ وہ واحد جملہ مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "میں کھانا کھا لوں؟" "ہاں ہاں ضرور کھایئے" میں نے قدرے شرمندہ ہو کر کہا!۔۔۔۔ میرا مقصد یہ نہیں تھا کہ وہ ابھی آٹوگراف دیتیں۔ تھوڑی دیر کھانے میں مصروف رہنے کے بعد موصوفہ نے ٹشو پیپر سے ہاتھ پونچھتے ہوئے مسکرا کر ہماری طرف دیکھا جیسے کہہ رہی ہوں اب میں کھانا کھا چکی ہوں اور آٹوگراف دینے کے لئے فارغ ہوں۔

بیتی زندگی پر پچھتاوے بھی بہت جان لیوا دکھ ہیں۔ اب میں سوچتی ہوں میں نے پروین شاکر سے باتیں کیوں نہ کیں؟ مگر اس نے تو مجھ سے میرا نام تک نہیں پوچھا؟ گفتگو کا سلسلہ چلتا تو کیسے چلتا؟ اب یہ ساری باتیں میں سوچ رہی ہوں۔ تب تو ایسا خیال نہیں آیا۔ میرا نہیں خیال تھا کہ یہ میری اس سے آخری ملاقات ہو گی۔ ہم یہ سب پہلے کیوں نہیں سوچ کے رکھتے کہ اس عارضی دنیا میں کچھ بھی ہونا ممکن ہے۔ مجھے اس بات پہ پچھتاوا ہے کہ میں نے اس وقت کیوں نہ اپنے دل کو ٹٹول کر دیکھا۔ شاید میں اپنے یہ شدید محسوسات اسے بتا سکتی۔ میں محبت میں ضبط اور جبر کی قائل نہیں ہوں۔ اور یک طرفہ محبت میرے نزدیک کار بیکار ہے۔ مگر مجھے خود پہ حیرت ہوتی ہے کہ میں خود بھی ایک عرصہ سے اس کار بیکار میں بری طرح پھنسی ہوئی ہوں۔ شاید مجھ میں جرات اظہار کی کمی ہے یا پھر میں اس ردعمل سے خوفزدہ ہوں جو مجھے میرے پرخلوص جذبات کے جواب میں ملے گا۔

اب مجھے محسوس ہوتا ہے کہ پروین شاکر کس کس حوالے سے میری زندگی میں در آئی تھی۔ اگرچہ "خوشبو سے انکار" تو ممکن نہیں ہے۔ مگر "خوشبو سے انکار تک" کا ایک

ایک جذبہ، تجربہ مجھے اپنی ذاتی زندگی پر لاگو ہوتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ نہ صرف مجھ پر بلکہ اس "مردانہ معاشرے" کی ہر باشعور اور حساس لڑکی کی زندگی کم و بیش انہی خطوط پر گزرتی ہے جس سے پروین شاکر گزریں۔ بعض اوقات تو یوں محسوس ہوتا ہے گویا پروین نے منہ سے بات چھین لی ہے۔

"میں اب مانتی جا رہی ہوں
میرے اندر کی ساری رتیں
اور باہر کے موسم
تمہارے سبب سے
تمہارے لئے تھے
جواباً
خزاں مجھ میں چاہو گے تم دیکھنا
یا کہ فصل بہاراں
کوئی فیصلہ ہو
مگر جلد کر دو تو اچھا!"

("ایک خط"۔ خود کلامی ص ۱۵۲)

مرا جو احوال پوچھنا ہے تو یہ ہے جاناں!
کہ جانے کب سے
جدائی کے بندی خانے میں بند
برف کی سل پہ تنہا بیٹھی
حرارت زندگی سے کچھ ربط ڈھونڈتی ہوں
بدن کو اپنے
تمہارے ہاتھوں سے چھو رہی ہوں۔"

(جدائی کے بندی خانے میں۔ خود کلامی ۱۵۵)

ایسے میں مرا اس سے محبت کرنا کوئی اچنبھے کی بات نہیں ہے۔ مگر پچھتاوا اس بات کا ہے کہ میں اسے یہ سب بتا کیوں نہ سکی۔ اب یہ پچھتاوا شاید میری زندگی کے ساتھ چلے مگر میں اس پچھتاوے کو اب مزید بڑھا نہیں سکتی میں اپنی ان سب محبوب ہستیوں کو یہ بتا دینا چاہتی ہوں کہ مجھے ان سے کتنی محبت ہے۔ مجھے احمد ندیم قاسمی' مشفق خواجہ' اشفاق احمد' بانو قدسیہ' قراۃ العین حیدر' عبداللہ حسین' شفیق الرحمن' کرنل محمد خان' مشتاق احمد یوسفی' ضمیر جعفری' خالد اختر' مستنصر حسین تارڑ' امجد اسلام امجد' عطاء الحق قاسمی' عمران خان اور پاکستان سے شدید محبت ہے۔

میں آج سب کے روبرو اس بات کا برملا اقرار کرتی ہوں کہ میری زندگی میں ان سب کا عمل دخل اس حد تک ہے کہ بعض اوقات مجھے اپنا وجود ان کے سامنے زائل ہوتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ اگر یہ سب میری زندگی میں نہ ہوتے تو میری زندگی ایک پرہول خلاء کی مانند ہوتی جس میں دور و نزدیک کسی روشنی یا تبدیلی کا امکان موجود نہ ہوتا۔

اگرچہ موت برحق ہے۔ لیکن اگر خدانخواستہ میرے منہ میں خاک ان میں سے کسی کو کچھ نہ کچھ ہو گیا تو میری ذات کے خلاؤں کی کوئی انتہا نہ رہے گی۔ اے رب ذوالجلال! کیا ایسا ممکن ہے کہ میری زندگی کے بے شمار بیکار لمحے' دن' رات ماہ و سال منہا ہو کر ان کی زندگیوں میں تقسیم ہو جائیں۔ دکھ کی ایک گھنی سیاہ چادر نے دل پر قبضہ جما رکھا ہے۔ وقفے وقفے کے بعد ایک سیلاب سیل شکیبائی کی تمام حد بندیوں کو توڑتا ہوا آنکھوں کے راستے بہہ نکلتا ہے۔ ان کی حدت روح تک کو پگھلائے دے رہی ہے۔ یہ سلسلہ کئی دن سے جاری ہے اور تھمنے کا نام نہیں لیتا۔ جانے میں اس پاک باز منظر کو کیا نام دوں جب پھولوں کی طرح نازک اور گڑیا سی پروین کو نہلا دھلا کر سفید جوڑا پہنا کر پھولوں سے لدی منوں مٹی میں اتارا ہو گا اور دسمبر کی ہلکی بارش نے قبر کی کچی مٹی و خوشبو سے معطر کر دیا ہو گیا۔ قبر کی مٹی بھی اپنی قسمت پر رشک کر رہی ہو گی آخر کو خوشبو نے اسے اپنا مسکن بنایا ہے۔

انا للہ وانا الیہ راجعون○

کتنا بڑا سچ ہے اور کتنا بڑا حوصلہ ہے۔ انسان کے لئے کہ آخر کو ایک دن سبھی نے اپنی اصل کی طرف لوٹنا ہے۔ یقیناً موت زندگی کی ہی ایک ارتقائی منزل ہے اور یہ ارتقائی منزل سبھی نے طے کرنا ہے۔

"دیکھ دسمبر!
اب مت آنا
اور اگر تو آئے بھی تو
اپنے دکھ کی برف پہن کر
دھوپ دریاؤں تک مت جانا
میرے پیاروں تک مت جانا
دیکھ دسمبر!
اب مت آنا
اب مت آنا"

("دسمبر اب مت آنا۔" ص ۴۲)

اس بار بھی دسمبر نے نصیر احمد ناصر کی بات نہیں مانی اور اردو ادب کا ناقابل تلافی نقصان کر گیا۔ کاش ۱۹۹۴ء کا دسمبر نصیر احمد ناصر کا مشورہ مان لیتا اور واقعتاً" نہ آتا۔

○

# میں آپ سے تعزیت کرنا چاہتی ہوں

جہلم ب۔ ش

۱۴۔۱۔۹۵

جناب عطاء الحق قاسمی صاحب!

السلام علیکم!

میری آپ سے کوئی واقفیت نہیں۔ سوائے اس کے کہ میں آپ کے کالم کے قارئین میں سے ہوں اور کبھی کبھار ٹی وی مشاعرہ میں آپ کو دیکھنے اور سننے کا اتفاق ہوا۔ اس وقت یہ تحریر لکھنے کا مقصد شاید آپ کو کچھ عجیب معلوم ہو' لیکن میرے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ میں اپنے غم کا اظہار کسی شناسا سے کروں۔ خواہ وہ شناسائی پڑھنے تک ہی محدود ہو۔ یہ اظہار غم اس لئے بھی آپ سے ہی کر رہی ہوں کہ خوشبو جو مٹی میں مل گئی' آپ کو عطا بھائی کہتی تھی۔ اس لئے سوچا کہ ایک بھائی کے نام اس کی بہن کے جانکاہ حادثے پر دکھ اور افسوس کا سندیسہ بھیجوں کہ شاید اس سے خود میرے غم میں کمی واقع ہو کہ سنا ہے کہ مل کر رو لینے سے غم غلط ہو جاتا ہے۔ اگرچہ میں نہیں چاہتی میرے دکھ کا یہ احساس کم ہو۔

قاسمی صاحب! پروین شاکر کی موت کا ذکر میں نے اپنی بہن سے صرف یہ کہہ کر کیا کہ بے حد افسوس ہوا۔ اس سے زیادہ میرے پاس الفاظ نہ تھے۔ میں نے اس کی موت پر چیخ چیخ کر رونا چاہا لیکن رو نہ سکی۔ میں نے بین کرنے چاہے لیکن نہ کر سکی۔ اس کی والدہ کے پاس

جا کر افسوس کرنا چاہا لیکن جا نہ سکی کہ اپنا کیا تعارف کرواتی' اس سے کیا رشتہ بتا کر روتی۔ وہ آنسو قطرہ قطرہ میرے دل پر گرتے رہے۔ آنسوؤں کو باہر کے بجائے اندر گرانا کتنا اندوہ ناک ہے۔ حالانکہ اس دن تو آسمان بھی اس کی قبر پر رویا۔ وہ جو خود کو خوشبو کی سفیر کہتی تھی' درحقیقت خود خوشبو تھی۔ اس دور کے تعفن میں زندہ رہتے ہوئے اس طرح پاک و صاف تھی کہ جیسے ابھی بند کلی کی آغوش میں ہی ہو۔ اس کی خوشبو چاروں طرف پھیل گئی لیکن اس میں اس سڑاند کی آمیزش نہ تھی جو چند ادیبوں نے وطن پرستی کے نام پر پھیلا رکھی تھی۔ وہ پیپلزپارٹی کے لئے نرم گوشہ رکھنے کے باوجود اس کے اس منتقمانہ رویہ سے بھی دور تھی جو کھلونا چھن جانے کی صورت میں کھلونا توڑ دینے پر تل جاتا ہے کیونکہ ایسا ۱۹۷۱ء میں ہو چکا تھا۔ پروین شاکر نے ایک شاعرہ کو ایسے رویہ پر اپنے خوبصورت انداز میں ٹوکا بھی۔ کہ اس دھرتی کے ساتھ اس کا رشتہ بیج اور بوند کا سا تھا۔ ایک وہ ماں جس کی آغوش میں اس نے پرورش پائی اور دوسری وہ ماں جس کی آغوش میں آخرکار اس نے ہمیشہ کے لئے سو جانا تھا' اس پر کوئی حرف گیری کرے' اس کے سینے کو غیر روند ڈالیں یہ اسے کیسے گوارا تھا وہ اگرچہ معروف معنوں میں اس وطن کے لئے خون نہ بہا سکی لیکن اس کی دھرتی کو اپنے خون سے رنگین کر گئی۔

قاسمی صاحب! میرا دل چاہتا تھا کہ میں اس کی موت کا نوحہ لکھوں۔ لیکن نہ تو میں شاعرہ ہوں نہ نثر نگار۔ میں تو متوسط ذہن کی حامل ایک خاتون ہوں۔ میں صرف اپنے گہرے دکھ کا اظہار کرنا چاہتی تھی جو اس کی موت کے دن سے لے کر آج تک نہ کر سکی۔ قاسمی صاحب! کسی نے سچ کہا ہے کہ دکھ گہرے سمندروں کی طرح ہوتے ہیں۔ مجھے لگتا ہے کہ میں اس کی موت کے دکھ کے سمندر میں ڈوب گئی ہوں' ڈھیروں پانی میرے اوپر سے گزر گیا ہے۔ اور وہ جو لوگ کہتے ہیں کہ ڈوبنے والا پانی اندر جانے سے ڈوبتا ہے' تو لگتا ہے کہ اس دکھ کے سمندر کا پانی میرے اوپر سے گزرنے کے ساتھ ساتھ میرے اندر بھی اتر گیا ہے۔ اور جیسے موت بے حسی طاری کر دیتی ہے تو میں بھی بے حس ہو گئی ہوں۔ میری آنکھوں سے آنسو کا ایک قطرہ بھی نہیں گرا۔ لیکن یہ آنسو گہر بن کر میرے دل پر بیٹھ گئے ہیں۔

پہلے سوچا کہ اپنی بیٹی سے اظہار غم کروں کہ وہ ٹین ایجر ہونے کے باوجود میری ہی طرح اس کی مداح ہے کہ یہ کمال تو خوشبو کا ہے جو جب پھیلتی ہے تو کیا بوڑھے' کیا جوان' کیا بچے سب اس سے فرحت پاتے ہیں کہ خوشبو کا کوئی طبقہ نہیں ہوتا کوئی عمر نہیں ہوتی' اس میں

جنریشن گیپ کا کوئی مسئلہ نہیں ہوتا۔

یہ خواہ گلاب کی ہو یا موتیے کی، یکساں پسندیدہ ہوتی ہے۔ بچیاں موتیے کے گجرے بنا کر پہن لیتی ہیں اور بڑی بوڑھیاں کانوں کے سوراخ میں پھول اڑس لیتی ہیں۔ گلاب کے پھول بھی گلے کا ہار ہوتے ہیں اور قبر کا حسن بھی۔ تو قاسمی صاحب وہ خوشبو سب کے لئے فرحت آمیز تازگی تھی۔ اس کا اس دنیا کی فضاؤں سے مسافر ہو جانے کا بے حد دکھ ہے۔ لیکن اس زمین پر اس کا سفر ختم ہو چکا تھا اب اس نے شہر خموشاں کے باسیوں کو مہکانا تھا۔ اس نے اپنے تمام سفر جلدی جلدی مکمل کئے۔ کیونکہ وہ تو ہواؤں کے سنگ اڑتی تھی۔ کب تک چلنے والوں کی سست روی کا ساتھ دیتی۔ اس نے اپنی تعلیم، شاعری اعلیٰ عہدوں اور امتیاز کا سفر بڑی تیزی سے طے کیا اور آخری سفر بھی پل بھر میں مکمل کر لیا۔ کوئی صورت ہو کہ اس دنیا سے کوئی ہوا آئے اور خبر دے کہ کیا اس خوشبو نے اس جہاں کو بھی معطر کیا؟ لیکن بقول اس کے

پاؤں سے ہواؤں کے بیڑیاں نہیں کھلتیں

تو پھر کون اس کے احوال کی خبر دے۔

والسلام

ب۔ ش

جہلم

# پروین! تم سے ملاقات ضرور ہو گی!

لبنیٰ شہزادی

وہ خوابیدہ آنکھیں جب کسی جانب اٹھتیں تو ہر شے کو اپنے سحر میں گرفتار کر لیتیں وہ دھیما دھیما' ٹھہرا ٹھہرا سا لہجہ جو ہر کسی پر جادو کا سا اثر کر جاتا' اس کا قلم جب تحریر کے موتی پروتا تو وہ موتی سچے موتیوں کی طرح ہر جانب روشنی پھیلا دیتے۔ مگر اس نے وہ خوابیدہ آنکھیں ہمیشہ کے لئے موند لی ہیں۔ وہ دھیما دھیما' ٹھہرا ٹھہرا سا لہجہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گیا اور اس کے قلم کے رکنے سے ادب کی دنیا میں ایسا خلا پیدا ہو گیا جسے شاید کوئی نہ پر کر سکے۔ وہ خوبصورت تھی خوبصورت دکھائی بھی دیتی تھی اور سب سے بڑھ کر اس کی خوبصورتی محسوس ہوتی تھی۔ اس کے لہجے کی مٹھاس امرت بن کر کانوں میں رس گھولتی تھی۔ مگر اس کی اچانک موت نے اس امرت کو چاٹ لیا اس کی اچانک موت کی خبر سن کر آنکھوں تلے اندھیرا محسوس ہوا۔ خبر سنانے والے کی طرف بے یقینی سے دیکھا۔ مگر اس کی اپنی ذات بے یقینی کا مجسمہ تھی۔ دل نے چیخ چیخ کر اس خبر کو ماننے سے انکار کرتے ہوئے بھیانک مذاق قرار دیا مگر دماغ کو دل کی ہر صدا دباتے ہوئے اس کا اعتراف کرنا پڑا کہ وہ سوئے جاگے نینوں والی پروین شاکر اس سفر پر روانہ ہو گئی ہے جہاں واپسی کی راہ نہیں' جہاں واپسی کا ہر دروازہ بند ہو جاتا ہے۔ اس کی بے وقت موت نے ہلا کر رکھ دیا۔ میرا اس سے بظاہر کوئی قریبی رشتہ نہیں مگر سب کی طرح میں نے بھی اس کے دکھ کو اپنے اندر اترتا ہوا دیکھا اب اس کا دکھ ایسی کسک میں بدل گیا جو ہر بار نئے درد سے آشنا کرتا ہے اس نے تو یہ کہا تھا۔

خود اپنے سے ملنے کا تو یارا نہ تھا مجھ میں
میں بھیڑ میں گم ہو گئی تنہائی کے ڈر سے

مگر وہ کیا جانتی تھی کہ عنقریب وہ اس بھیڑ میں گم ہو جائے گی جہاں سے اسے کوئی ڈھونڈ کے نہیں لا سکے گا۔ مگر نہیں وہ زندگی سے جسم کا ناطہ توڑ کر ہم سے اور کوئی بندھن باندھ گئی ہے اور بہت دور جا کر بھی بہت قریب ہو گئی ہے۔

وہ تنہائی میں ہم سے اپنی کتاب "خود کلامی" سے کلام کرتی ہے۔ "میں سب سے دور ہو گئی ہوں۔" اس کی نفی وہ "انکار" میں کرتی ہے۔ اور یادوں کی کڑی دھوپ کے سفر میں "صد برگ" ایک گھنی چھاؤں بن جاتی ہے اور "خوشبو" میں وہ خوشبو کی طرح ہر طرف پھیل جاتی ہے۔

وہ چلی گئی مگر اپنی شخصیت کے انمٹ نقوش چھوڑ کر۔ وہ اب کبھی نہیں ملے گی۔ ہاں مگر ہم کبھی گرمیوں کی طویل دوپہروں اور کبھی سردیوں کی لمبی راتوں میں اس کی کتابوں میں اسے ملیں گے!

○

# خوشبو لہجے کی شاعرہ........ پروین شاکر

رحیم طلب

پروین جدید حسیت کی ایک نہایت ممتاز اور صاحب طرز شاعرہ تھی اس کی شاعری میں عورت کے دکھ، مظلومیت اور عظمت فنکارانہ کا اظہار ملتا ہے۔ اس کی "خوشبو" میں کلاسیکی فریم میں جدید لہجہ کی امیجری کی تازہ کاری اپنی مثال آپ ہے جو اسے معاصر شعراء و شاعرات میں ممتاز کرتی ہے۔ اور اسی جدیدیت اور کلاسیکیت کے ملے جلے تاثر سے پروین کے تیکھے، لہلہاتے معطر معطر اسلوب نے کئی ناقدین کو چونکا کے رکھ دیا۔ اس امتیازی خصوصیت کے ساتھ اس کی شاعری میں فکر و نظر کی بالیدگی تھی۔ سماجی شعور اور حوادث پیہم کی تجربہ انگیزی، عصری داخلی و خارجی مشاہدہ کی کرنیں اس کی شاعری کے قاری کو لمحہ بھر کے لئے ساکت کر دیتی ہے۔

تو گویا پروین نے نئے لب و لہجے سے اردو ادب کو سحر آلودہ اور دل و دماغ پر چھا جانے والی شاعری دی ہے۔ پروین کے ہاں نغمگی ہے غنائیت و ترنم ہے اس کی شاعری میں جہاں گہرا تفکر، سنجیدگی پائی جاتی ہے وہاں تنوع، جدت بیان، عصری حسیت، الفاظ کا حسن انتخاب داخلی نغمگی کے علاوہ درد مندی کے جذبات نمایاں ملتے ہیں۔

پروین کی شاعری سے پتہ چلتا ہے کہ کوئی انتہائی قیمتی اور پیاری چیز اس سے چھن گئی ہے جس کی تلاش و فکر میں وہ لمحہ لمحہ سرگرداں ہے۔ اسے پا لینے کی جستجو و سعی میں اس نے جو مترنم اور خوشبو انگیز لہجہ برتا ہے وہ مشاہدہ کرنے والے پر بھی براہ راست اثر انداز ہوتا ہے۔

پروین شاکر بے باکی اور جرات کے ساتھ شعری زبان کی حرمت کا احترام بھی کرتی نظر آتی ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ اسے زبان و بیان پر بے پناہ قدرت حاصل تھی اور اس نے اساتذہ کی سی پختگی کا ملکہ بھی پالیا تھا۔ وہ جدت طرازیوں سے روایتی حسن بیان کو نئے سانچے میں ڈھالنے کے فن سے خوب آشنا ہو چکی تھی۔ گو جدیدیت میں پروین کے نئے تجربات اس کی اصطلاح سازی' اس کے تلازمے بہت کم قارئین کی توجہ کا باعث بن سکے ہیں۔ کیونکہ "خوشبو" کا مہکتا لہجہ ذہنوں کو اتنا معطر کر دیتا ہے کہ قاری گہرائی میں غوطہ زن ہونے کا سوچتا ہی نہیں۔

پروین نے سیاست کو بھی اپنے موئے قلم سے چھوا اور جس بے باکی سے متانت و تدبر سے ان سے پہلے یا معاصر شاعرات میں ایسا لہجہ سامنے نہیں آیا۔ وہ سیاسی موضوعات میں نڈر' بے باک' حوصلہ مند' متفکر دکھائی دیتی تھی۔

غرض پروین شاکر نے اپنی کئی جتنوں سے مختلف رنگ و روپ میں ideas دیئے اور مجموعی طور پر طرز اظہار میں خواتین کے لہجے کو معتبر کیا۔ وہ کئی اطراف Prismic سے عورت کی طرفدار نظر آتی ہے۔ اور اس طرفداری میں اس کا لہجہ خوشبو خوشبو بن کر بکھرتا جاتا ہے' نکھرتا جاتا ہے۔ چند اشعار پیش خدمت ہیں جس سے پروین کے خوشبو لہجے نے کتنا تیزی سے سفر کیا۔

میں اس کی دسترس میں ہوں مگر وہ
مجھے میری رضا سے مانگتا ہے

کیسے کہہ دوں کہ مجھے چھوڑ دیا ہے اس نے
بات تو سچ ہے مگر بات ہے رسوائی کی
وہ کہیں بھی گیا لوٹا تو میرے پاس آیا
بس یہی بات ہے اچھی میرے ہرجائی کی

میں سچ کہوں گی مگر پھر بھی ہار جاؤں گی
وہ جھوٹ بولے گا اور لاجواب کر دے گا

حسن کے سمجھنے کو عمر چاہیے جاناں
دو گھڑی کی چاہت میں لڑکیاں نہیں کھلتیں

اس قسم کے خوشبو رفتار اشعار پروین کے "ماہ تمام" میں بے شمار ہیں جن کی بدولت انہیں خوشبو لہجے کی شاعرہ قرار دیا جا سکتا ہے۔

پروین نے انسان سے ہٹ کر جب قلم کو صرف اور صرف عورت کا روپ دیا تو جذبے کومل ہو گئے' لہجہ موم سے بھی زیادہ نرم ہو گیا اور تجربوں اور چاہتوں سے لبریز جام ٹھہرا۔

پروین عصر حاضر کے حالات پر بھی بلا کا مشاہدہ رکھتی تھی اور اسے خارجی و داخلی دونوں سطحوں پر سمجھتی تھی اور اس کا نرم لہجہ خود بخود استدلالی ہو گیا یہی تو اس نے کہا ہے کہ۔

خون پینے کو یہاں کوئی بلا آتی ہے
قتل تو روز کا معمول نہیں ہو سکتے

المختصر پروین کلاسیکیت و جدید حسیت کے ساتھ ساتھ روایات حسن و عشق کی پاسبان تھی وہ جہان سوز و ساز کی آواز ہی نہیں تھی بلکہ مہربلب خواتین' بے زبان خواتین کی زبان بھی تھی۔ وہ دکھی سماج کے درد کا درماں ہی نہیں بلکہ عصری سماج سوز پر ماتم کناں بھی تھی تڑپتی اور سسکتی انسانیت کی آہ فغاں بھی تھی اور وہ اپنی ذات میں تجربات و مشاہدات اور سیاسی تصورات اور تمدنی نظریات' لطیف و کومل جذبوں سے مزین انجمن بھی تھی۔

○

# آہ پروین

## مظفر وارثی

جمال ذات کی تشریح تھا ہنر اس کا
خود اپنے خوں سے ہے آراستہ سفر اس کا
وہ کوہ قاف محبت کی رہنے والی تھی
دلوں میں تاج محل کی طرح ہے گھر اس کا
ہواؤں میں جو نکلتی تھی خوشبوؤں کی طرح
رکھا ہے خاک کے تکیے پہ آج سر اس کا
دکھائی دیتی رہے گی وہ اپنے قاری کو
سخن سخن میں ہے اک لہجہ نظر اس کا
نہ تھا تعلق خاطر بھی اس قدر اس سے
ہوا ہے رنج مظفر کو جس قدر اس کا

# پروین شاکر

## نور بجنوری

خوشبوؤں کی شاعرہ

اپنی زلفوں میں بسائے عود و عنبر کی مہک

اپنی پیشانی پہ فکر و فن کی تابانی لئے

اس کی آنکھوں میں کئی ماہ تمام

اس کے ہونٹوں پہ ہزاروں کہکشائیں

اس کے پیکر میں قلوپطرہ کا پندار جمال

اپنے دامن میں سجائے ان گنت رنگوں کے پھول

اپنے ہاتھوں میں اٹھائے جگمگاتی مشعلیں

دفعتہً" ہر رنگ ہر خوشبو سے ناطہ توڑ کر

ہر کرن کو چھوڑ کر

یک بیک کوہ ندا کو چل پڑی

○

# مراد اور خوشبو

آثم مرزا

مراد---
خوشبو کی وادیوں سے جدا ہوا ہے
اگرچہ محرومیاں سلگتے چنار کی مانند بن گئی ہیں
مگر یہ کیسی اذیتیں ہیں
کہ چاند آنگن میں مسکراتی ہوئی تمناؤں کے ہیولے
سمٹ گئے ہیں
کہ اب تو چارہ گروں کی بے نام الفتوں کا
بھرم بھی مایوس کر گیا ہے
کہاں ہے
خوشبو کی تتلیوں سے
حیات کی خوشنما عمارت سجانے والی
کہاں ہے خوشبو کی مستیوں سے
مراد کی زندگی کے ہر زاویہ کو بے خود بنانے والی
مراد---
ممتا کی رس بھری لوریوں سے محروم ہو گیا ہے
وہ روشنی جو کہ
خوشبوؤں کے حسین دامن سے پھوٹتی تھی
اجل کی کالی زمیں نے اس کو نگل لیا ہے

مراد۔۔۔ اب یوں
بچھڑتی خوشبو کے دائروں کو پکارتا ہے
کہ جیسے دھرتی کی سب طنابوں کے ٹوٹنے سے
حیات کے رت جگوں کی رونق بھی
ریزہ ریزہ بکھر رہی ہو
مراد۔۔۔
اب خوشبوؤں کی لے پر
محبتوں کے حسین نغمے نہ گا سکے گا
خدا کرے!
زندگی کی بے تابیوں کو
خوشبو کا اجلا دامن
ہلورے دے کر نہال کر دے!!

○

# پروین شاکر کے نام

ماجد صدیقی

"خوشبو" کی وہ بھولی سیاروں سا نام اس کا
یکبارگی ٹوٹا ہے کیوں "ماہ تمام" اس کا
"صد برگ" ٹھہرنے کو اس گل نے بکھرنا تھا
کیوں نام کیا اپنے جو بھی تھا پیام اس کا
وہ مرگ سے بھی شاید "انکار" نہ کر پائی
اس تک بھی پہنچنا تھا آخر کو سلام اس کا
کلیوں کے چٹخنے سے بیزار تھی وہ شاید
تتلی سا رہا اکثر "خود ہی سے کلام" اس کا
دل اس کا لہو تھا سو اب جاں بھی لہو ٹھہری
آنکھوں میں اترنا تھا کیسا یہ مقام اس کا
وہ جس کے قدم اپنے خلقت کے دلوں پر تھے
یاد آئے گا "بیٹے" کو کیا کیا نہ خرام اس کا
ماجد تری آنکھیں بھی بھیگی ہیں ندیم☆ ایسی
ابھرا ہے اجالوں میں کیوں منظر شام اس کا

☆(ندیم ـــــ احمد ندیم قاسمی)

○

# اجل کے راہزن

گفتار خیالی

لہو آشام لمحوں کا یہ کس پر قہر ٹوٹا ہے
یہ کس کا سوگ ہے
کہ چرخ رویا بادلوں نے بال کھولے ہیں
یہ کیوں ماتم کناں ہیں
لفظ---- کاغذ اور قلم میرے
بنے معبود احساسات کیوں
غم کے صنم میرے
اجل کے راہزن نے آج پھر یہ کس کو لوٹا ہے
پھٹا ہے چرخ یا تازہ فلک سے کوئی ٹوٹا ہے
کہ غم کی شعلگی افلاک سے دل تک چلی آئی
نظام روح بکھرا
آنکھ میں غم کی نمی آئی
مرے اطراف روئے اور مرے اکناف محشر ہیں
جہان خامہ و قرطاس کے افسردہ منظر ہیں
کوئی سر بگریباں خوشبوؤں کو یاد کرتا ہے
کوئی صد برگ لے کر ہاتھ میں فریاد کرتا ہے
زبان بے بسی پر خود کلامی بین کرتی ہے
لئے انکار آنکھوں میں زمانہ طفل گریاں کی طرح مٹی میں لت پت ہے
نہ اک سد سہارا ہے نہ سر پر آس کی چھت ہے
بس اک مرگ تکلم ہے

بس اک غم ایک ماتم ہے

میرے افلاک سے اک رشتہ تو پر چھوٹا ہے

لہو آشام لمحوں کا یہ کس پر قہر ٹوٹا ہے

○

# پروین شاکر کے نام

ڈاکٹر انعام الحق جاوید

تمہاری قبر پہ ہم سب کو مل کے رونا تھا
یہ حادثہ بھی اسی زندگی میں ہونا تھا

کسے خبر تھی فلک کے سوا کہ شام ڈھلے
زمین اوڑھ کے "خوشبو" نے آج سونا تھا

سلام کیوں نہ کرے تجھ کو آج ہر شاعر
کہ شاعری ہی ترا اوڑھنا بچھونا تھا

چمن کے واسطے "صد برگ" تھیں تری سوچیں
کہ تو نے اس میں تفکر کا بیج بونا تھا

ترا کلام بھی پر تو تھا "خود کلامی" کا
کہ تار اشک سے تو نے اسے پرونا تھا

بنائے آب پہ دیوار کس سے ممکن ہے
اجل کے سامنے "انکار" کس سے ممکن ہے

○

# مگر ایسی بھی کیا جلدی

سید عارف

ابھی تو کتنے امکانات کے باب مقفل
آب کوثر سے دھلی سوچوں کے دروازے
گلاب آہنگ جذبوں کے دریچے
اور کئی خوابیدہ قرنوں کی شب تاریک میں
ڈوبے ہوئے لمحے
تری آنکھوں میں رکھے
ان گنت سندر حسیں سپنے
صبا انداز خوابوں کے جزیرے
حرف و معنی کے صحیفے
فکر کے پھیلے ہوئے آفاق
تیرے فن ترے دست ہنر کے منتظر تھے
پر تجھے بیٹھے بٹھائے دفعتہً جانے یہ کیا سوجھی
یہ مانا موت برحق ہے
مگر اے خوشبوؤں کی اے دھنک رنگوں کی شہزادی
ابھی یہ عمر تھی مرنے کی
اپنے چاہنے والوں کو روتا چھوڑ جانے کی
ہر اک رشتہ اچانک توڑ جانے کی
یہ مانا موت برحق ہے
مگر ایسی بھی کیا جلدی

○

# خود کلامی

سرور انجم

ابھی تو موسم گل تھا

ابھی تو صحن چمن میں بہار آئی تھی

ابھی تو دست صبا

شاخ گل بداماں سے

مشام جاں کے لئے نکہتوں کو چنتا تھا

ابھی تو ــــ

عندلیب دل فگار کی چہکار

الاپتی تھی محبت کے زمزموں کا راگ

ابھی تو ساقی مہ وش

درون بزم وفا

علاج تشنہ لبی کر رہا تھا ہنس ہنس کر

حیات!

شوق کے رستوں پہ چل رہی تھی ابھی

ادائے دلبری

سانچے میں ڈھل رہی تھی ابھی

ابھی تو۔۔۔۔

لکہ ابر سخن کی رم جھم سے

فضائے دہر میں تھا برشگال کا موسم

دیار دل میں ہو جیسے وصال کا موسم

تمہارے جاتے ہی

منظر بدل گئے یکسر

اجڑ کے رہ گئے بزم سخن کے بام و در

کہاں سے آئے گا!

پروین تجھ سا نغمہ گر!

ترے وجود میں

اک آنچ تھی صداقت کی

ترے بیان میں

سچائیوں کا حاصل تھا

دیار شوق سے ہو کر کدھر گیا جانے!

ابھی تو سامنے نظروں کے تیرا محمل تھا!

# بجھ گئی شمع سخن

شفیق احمد

قریہ جاں میں کوئی درد کا موسم آیا
سال نو کیسی اذیت لایا
اک دورا ہے پہ یونہی آنکھ جھپکتے ہی کوئی چھوڑ گیا
دائمی ہجر مقدر ٹھہرا
جاں گسل سوگ میں ڈوبی ہے ترے ہجر کی شام
تیرگی پھیلتی جاتی ہے سر حلقہ بام
آنکھ کی حد سے کہیں دور ہوا ماہ تمام
شدت درد نے پتھر سا بنا رکھا ہے
آنکھ روئے تو تری یاد میں روئے کیسے
پیکر نور تھی ہر انگ میں سو رنگ لئے
جس کے ہر لفظ میں تھی عشق و محبت کی نمو
محفل زیست میں روشن تھی جو اک شمع سخن
حسن اس کا بھی تہ خاک ہوا
سال نو کیسی اذیت لایا

# پروین شاکر

بلقیس محمود

اے شہر حسن پرور!
اے شہر امن و آسائش!
ترے دامن پہ زندہ خون کے چھینٹے.....
عدالت چاہتے ہیں
مسلسل خون کے آنسو بہاتے.....

مدعی
حسن بیاں
حسن قلم
حسن تخیل
حسن منظر کے
عدالت چاہتے ہیں
یہ قتل حسن تیری شاہرہ پر؟
قلم کی سلطنت کے حسن کو تاراج کر کے
عروج حسن منظر کو
سپرد خاک کر کے...
سماعت کے...
بصارت کے...

وہ نادر جشن لمحے لوٹ کے...
خاموش ہے تو
اے قاتل!
جرم قتل آگہی بردوش ہے تو!
ترے اک لمحہ سفاک پر
پہروں...
زمین و آسماں روتے رہے ہیں
ترے دامن میں زندہ قوم پر
اک مردنی سی چھا گئی ہے
خبر اتنی سی تھی
"پروین شاکر مر گئی ہے"
یہ چھوٹی سی خبر...
سب پر قیامت ڈھا گئی ہے
مشام جان تک تڑپا گئی ہے
اے شہر زندگی پرور!
تو قتل حسن کا مجرم ہوا ہے
ترے دامن پہ...
حسن گفتگو...
حسن قلم...
حسن نظر...
حسن تکلم کا لہو ہے
یہ سارے مدعی تجھ سے
عدالت چاہتے ہیں
اے پاکستان کے گلشن!!
تو اپنے سینکڑوں پھولوں گلابوں کا

امیں ہے
قلم کاروں کی دنیا کا
وہ تنہا اک گلاب تازہ
خوشبو جس کی اک دنیا میں پھیلی
تو نے اس کو نہ سنبھالا
ہماری پھول جیسی شاعرہ کو مار ڈالا!!
تو اوروں کا تحفظ کیا کرے گا؟
تو اب کس حسن کا چرچا کرے گا؟
گلستان ادب کے
دور تک اجڑے ہوئے لمحے
عدالت چاہتے ہیں
عدالت چاہتے ہیں
عدالت...

○

# پروین شاکر کی وفات پر

غلام محمد غلام

کہیں بلبل کی آنکھوں میں ہے اشکوں کی جھڑی' ہائے!
کہیں خوشبو چمن کو چھوڑ کر دیکھو چلی' ہائے!
کہاں تک آنکھ روئے' دل کہاں تک بیٹھتا جائے؟
کہ اخبار حوادث کی قطاریں ہیں لگی' ہائے!
ظہیر کاشمیری کا ابھی تازہ ہی تھا صدمہ
کہ اب پروین شاکر بھی جدائی دے گئی' ہائے!
وہ جس کے لفظ پھولوں سے تھے' جس کی بات خوشبو سی
وہ بلبل ہے گلستاں سے اچانک اڑ گئی' ہائے!
بہت عرصے سے لڑتی آ رہی تھی زندگانی سے!
سنا ہے کل وہ بازی زندگی کی ہر گئی' ہائے!
غلام! اس جاں گسل صدمے پہ آنکھوں سے لہو ٹپکا
نہیں اب روک سکتا مجھ کو رونے سے کوئی' ہائے

○

# ابھی تو بات آدھی تھی

اشرف یوسفی

تری آنکھوں کے ان بھاری پپوٹوں میں
گزشتہ شب کا ہر اک خواب
ابھی تک نامکمل تھا
فسانہ جو تری گل ریز پلکوں سے اترنا تھا
قلم تیشے کی زد میں
ٹوٹتے پتھر کے سینے میں جو اک شفاف جھرنا تھا
وہ اک نغمہ ابھی جو خاک کی تہہ سے ابھرنا تھا
تجھے جو کام کرنا تھا
سہیلی وہ ادھورا تھا
ابھی تو بات آدھی تھی---
ابھی تو چاند پورا تھا
ابھی تو صبح نو افروز کے ماتھے کے جھومر میں تجھے موتی پرونے تھے!
تری آنگن کے پیڑوں پر
دسمبر کی روپہلی دھوپ میں ہر پھول کھلنا تھا
تجھے سب قہقہے، چڑیوں کے سارے گیت، تیرے پیڑ
گڑیائیں، کھلونے، پھول بن تیرا
جو تجھ سے وقت نے چھینا
تجھے واپس وہ ملنا تھا
ابھی تو پچھلی ہجرت کا بھی ہر اک زخم سلنا تھا
سہیلی سب ادھورا تھا
ابھی تو بات آدھی تھی---
ابھی تو چاند پورا تھا

(پروین شاکر کی موت پر)

# اک نوحہ گر ترا!

جمشید چشتی

مجھ میں زندہ ہے سخن گر تیرا    ڈھونڈتا ہے تجھے، پیکر تیرا!
تھا تبسم ترا، پوشاک تری    گفتگو تھی تری، زیور تیرا
تیری خوشبو، تری تنہائی تھی    خود کلامی تھی، مقدر تیرا

تیرے گردوں پہ ترا ماہ تمام
تیرے ماتھے پہ ہے جھومر تیرا

شہر، کس رو میں تجھے روند گیا    کس پڑاؤ میں تھا لشکر تیرا؟
ایک خوشبو سی اڑی جاتی تھی    چاک تھا، پھول سا پیکر تیرا
کیسے دوبارہ سنوں تیری صدا    کیسے رخ دیکھوں مکرر تیرا؟
تاحد خواب ابد پھیل گیا    دیکھتے دیکھتے منظر تیرا

موجہ ریگ رواں، گھاٹ لگا
ایک صحرا تھا، سمندر تیرا
میں تیرا کچھ نہیں، پر جان سخن
رو پڑوں، نام بھی سن کر تیرا

# پروین شاکر کی یاد میں

شیخ عطاء اللہ جوہر

ہماری بزم میں آ کر چلا گیا کوئی
جہان عشق بسا کر چلا گیا کوئی

بہار اپنی دکھا کر چلا گیا کوئی
نئے گلاب کھلا کر چلا گیا کوئی

اسی کی خوشبو سے مہکا کریں گے شام و سحر
چمن میں رنگ جما کر چلا گیا کوئی

اب اس کی کھوج میں صدیاں گزار دیں گے ہم
کچھ ایسی راہ دکھا کر چلا گیا کوئی

وہ کر گیا ہے نئی زندگی کی تعبیریں
دلوں میں خواب اگا کر چلا گیا کوئی

بجھا بجھا ہوا لگتا ہے شہر ناپرساں
وفا کے دیپ جلا کر چلا گیا کوئی

جہاں کو اپنی بصیرت کی روشنی دے کر
فراز طور بنا کر چلا گیا کوئی

میں سوچتا ہوں تو کتنا عجیب لگتا ہے
بلا جواز رلا کر چلا گیا کوئی

سنا کے نغمۂ شب ساز جان پہ جوہر
اجل سے آنکھ ملا کر چلا گیا کوئی

○

# ہوئی رزق ہوا خوشبو

ناہید قمر

محبت کی زباں کی شاعرہ نے

خوف کی قیدی نگاہوں پر

نزول خواب اور اس خواب کی تعبیر کو آساں بنایا تھا

وہ جس نے تتلیوں، پھولوں، ہواؤں، جگنوؤں

اور بارشوں کے ساتھ چلنے کا ہنر سب کو سکھایا تھا

جو خود بھی خواب لگتی تھی

اک ایسا خواب، جس کے ہاتھ سے

روشن لکیریں چاہے مٹ جائیں

یہ جس کے منظروں کے رنگ کبھی پھیکے نہیں پڑتے

وہ جس نے عمر بھر

ہمراہیوں سے اک قدم آگے ہی رکھا تھا

یہاں بھی دوسروں سے اک قدم پہلے اٹھا کر

جانے اپنے کون سے اک خواب کی

تعبیر لینے ایک انجانی سی دنیا کی طرف چل دی

وہی دنیا

جہاں سے کوئی واپس لوٹ کر آیا نہیں کرتا

وہ خوشبو تھی

ہوا کا رزق ہونا اس کی قسمت میں ازل سے درج تھا شاید

مگر ہم سب پہ اس کا قرض ہے

ان خوبصورت' ان چھوئے جذبوں سے آگاہی کا

جن کا لمس ہی

رکتی ہوئی نبضوں کو جیون کی روانی بخش دیتا ہے

سو اب اس قرض کے لوٹائے جانے تک

ہمیں شہر سخن کو اس کی یادوں سے بہت آباد رکھنا ہے

○

# شاخِ سبز کی خوشبو

احمد ادریس

وہ ایک موجۂ خونیں کہ چھین لی جس نے
رتوں کے پیڑ سے اک شاخِ سبز کی خوشبو
ہمیں اتار گیا ہے خزاں کے صحرا میں
کسے تلاش کریں اب گماں کے صحرا میں
بلا کا وقت ہے پروین کے وصال کے بعد
حواس کھو سے گئے ایک اس ملال کے بعد
سسک رہا ہے فضا میں ہوا کے سانس کا روگ
محیط ہو گیا لمحوں پہ غم کی پھانس کا روگ
بکھر گئے ہیں سبھی دائرے صداؤں کے
فغاں میں ڈوب گئے حوصلے ہواؤں کے
مرے خیال کے پہلو میں کوئی ساز نہیں
قلم کی ڈوبتی نبضیں بلاجواز نہیں
کہاں وہ کھو گئی اقلیمِ فن کی شہزادی
صدائے عصر وہ ملکِ سخن کی شہزادی
اگرچہ آج بھی زندہ ہے مثلِ ماہِ تمام
بجا کہ ذہن پہ غالب ہے اس کا سحر کلام
مگر اب عمر بھر تشنہ لبی کا یہ موسم
ہمیں گزارنا ہے بے کلی کا یہ موسم

○

افسانے

# ڈھور ڈنگر کی واپسی

اشفاق احمد

ذرا دیکھئے انسان کی کایا کلپ کیسے ہوتی ہے! اس کا اصلی اور حقیقی نام تو سلیمان تھا مگر جونہی وہ نائیلہ کی محبت میں مبتلا ہوا تو اس نے اپنا نام سلمانی بتانا شروع کر دیا۔ وہ جو اس کے مضبوط اور کسرتی بدن کے ساتھ ساتھ اس کے نام کی وجہ سے ایک واضح دیہاتی پن کا شائبہ تھا تو اس نے اپنی ڈگریوں اور سارٹیفکیٹوں میں سلیمان کے "یو" کو سلمان کے "اے" کی طرح بلانا شروع کر دیا۔

پرانے دوستوں نے پوچھا "تم تو سلیمان تھے سلیمان؟" تو سلیمان نے کہا "ہمارے دیہات میں چونکہ یہی تلفظ عام ہے اس لئے مجھے بھی بہ امر مجبوری یہی تلفظ استعمال کرنا پڑا ورنہ میں تو سلمان ہوں۔"

نائیلہ کا تعلق اپر مڈل کلاس سے تھا۔ جب وہ ایف اے میں تھی تو اس کا گھرانہ سمن آباد میں رہتا تھا لیکن جب اس نے آرٹس کالج میں داخلہ لیا تو وہ لوگ لوئر مال کے ایک ایسے گھر میں آ گئے جس کی وضع قطع پرانے انگریزی بنگلے کی سی۔ اس بنگلے کے تین حصے تھے۔ بائیں ہاتھ کا حصہ ان کو الاٹ ہو گیا۔ انہوں نے گہرے رنگ کی ایک فوکسی بھی لے لی جو بائیں ہاتھ کا سٹیرنگ رکھتی تھی۔

لیکن سلمان نائلہ سے اس کی فوکسی یا اس کے ایک تہائی بنگلے یا اس کے کھنچے ہوئے ستواں حسن سے مرعوب نہیں ہوا تھا۔ وہ اس کے کھلے ڈلے پن' اس کی بے حجابی' اس کی جرأت اور اس کی آسان گیری سے متاثر ہوا تھا۔ بالکل اسی طرح جس قدر اس کے بڑے بزرگ اپنے اپنے زمانوں میں شہر آ کر کسی ایک گھرانے کی دہلیز پر منہ میں انگلی ڈال کے کھڑے ہو

جاتے تھے اور بی بی کہتی تھی بسم اللہ اندر آجاؤ۔"

نائیلہ کمال کی آرٹسٹ تھی۔ اس کو واٹر' پیسٹل اور آئل پر ایک سی دسترس حاصل تھی اس کے محبوب موضوع دو تھے: سٹل لائف اور نیوڈ!

پاکستان میں سٹل لائف کا مواد تو کہیں سے بھی حاصل کیا جا سکتا تھا اور کسی وقت بھی کیا جا سکتا تھا لیکن نیوڈ سٹڈی کے لئے ماڈل دستیاب نہ تھے۔ صرف مالی بابے' چوکیدر' فقیر اور ناکام پہلوان مل جاتے تھے جنہیں لنگوٹے بندھوا کر نیوڈ سٹڈیاں کی جا سکتی تھیں لیکن وہ اصل نیوڈ نہیں تھے۔ نیوڈ سٹڈی کے کمزور اور بے مزا سے قائم مقام سہارے تھے' جن کو کاغذ پر اتارنے میں کوئی لطف نہیں تھا۔ بس ایک نیابتی سی لذت تھی۔ لذت بھی کیا تھی لذت کی جانشین سی کوئی چیز تھی۔ جس نے نائیلہ کو رنجیدہ اور بیزار کر رکھا تھا۔

سلمان بڑا دلیر اور جی دار نوجوان تھا۔ اس کو دلیر اور بہادر لوگ پسند تھے۔ نائیلہ کو وہ اس کی فنکاری' خوش نمائی یا دلیری کی وجہ سے پسند نہیں کرتا تھا بلکہ اس کی بے باکی اور دلداری کا دلدادہ تھا۔

نائیلہ لاہور کے نہایت ہی جدید اور امروزی اشرافیہ کی وہ رنگ ماسٹر تھی جس کے سامنے سارے بحث مباحثے' ڈائیلاگ اور دلیل و حجت کے خونخوار باگھ۔ ھگیرے اپنی نمناک تھوتھنیاں پنجوں پر رکھ کر آرام سے بیٹھ جاتے تھے اور اس وقت تک بیٹھے رہتے تھے جب تک وہ انہیں اپنا سانٹا پنچ کر اٹھ جانے یا جھومر ڈالنے کا اذن نہیں دیتی تھی۔ نائیلہ ایک لڑکی نہیں تھی ایک قوت تھی جس نے سارے شہر کو حرکت عطا کر کے کمزور لوگوں کو اپنا گرویدہ بنا رکھا تھا اور کمزوروں کی ہر محفل' ہر لحظہ اسے اپنی شمع بنانے کی آرزو مند رہتی تھی۔ اگر آپ کبھی نائیلہ سے ملے ہوتے تو اس وقت یہ افسانہ نہ پڑھ رہے ہوتے بلکہ اس کی طلب میں مختلف جگہوں پر گھوم کر اس کے کسی بھی نشان پا پر بیٹھے ہانپ رہے ہوتے۔

سلمان کے اپنے خاندان میں اور خاندان سے باہر' اپنے علاقے میں اور علاقے سے باہر پورے پاکستان میں اور پاکستان سے پرے مغربی ممالک اور مشرق اوسط میں ایسے ایسے قریبی تعلقات تھے کہ وہ جہاں چاہتا آسانی کے ساتھ دل لگا سکتا تھا۔ دل لگانے کے بعد شادی کر سکتا تھا اور شادی نہ کرنے کی صورت میں لگایا ہوا دل واپس لے سکتا تھا۔ وہ ایک سیاسی خاندان کا فرد تھا اور اس کے قبیلے کے لوگ مضبوط سیاسی جماعتوں میں اس طرح سے پھیلے ہوئے تھے کہ

ہر آنے والی حکومت میں ان کا طے شدہ حصہ پہلے سے موجود ہوتا تھا۔ سلمانی کو کوئی کمی نہیں تھی۔ وہ فراوانی کی فیکٹری کا بنیادی حصے دار تھا۔

اتنی آسانیاں ہونے کے باوجود سلمان کو نائیلہ کی جرأت بداخلاقی اس قدر پسند آ گئی تھی کہ اس نے صرف اسی سے شادی کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا اور اپنے بڑوں کو بھی اس فیصلے سے آگاہ کر دیا تھا۔ اصل میں نائیلہ مذہب کے بارے میں ایسی آزادی کا ساتھ اپنی رائے کا برملا اظہار کرتی تھی کہ کوئی اور اپنی تنہائی کے غلیظ ترین لمحوں میں ایسا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ اسی کے پاس خدا کے نہ ہونے کی سترہ ایسی طاقتور دلیلیں تھیں کہ بڑے بڑے مفکروں اور دانشوروں کے پاس بھی ان کا جواب نہیں تھا۔ پندرہ دلیلیں تو اس نے نیٹشے' سارتر' مارکس اور کیمو وغیرہ سے مستعار لی تھیں لیکن دو اس کی اپنی ذاتی تھیں۔ وہ ان کو سب سے آخر میں پیش کیا کرتی تھیں اور پھر آرام سے سگریٹ سلگا کر جواب کے انتظار میں بیٹھ جاتی تھی۔

سلمان نے اس کے ساتھ اپنے گہرے روابط انہی طاقتور دلیلوں کی بناء پر قائم کیے۔ وہ ہر دوسرے چوتھے روز کسی ایک دلیل یا ان میں کی چند دلیلوں کے مدلل جواب لے کر اس کے پاس آتا اور منہ کی کھا کر اپنی تھوتھنی نائیلہ کے پنجوں پر رکھ کر بیٹھ جاتا اور آنکھیں اوپر اٹھا کر اس کا چہرہ دیکھنے لگتا۔ ان دونوں کو اور ان کے ملنے والوں کو ان علمی مباحث میں بڑا لطف آتا تھا اور وہ مباحث کی ایک ہی نشست میں اس قدر سیکھ جاتے تھے کہ کوئی انٹرنیشنل سیمینار یا بیس جلدی انسائیکلوپیڈیا بھی اتنا کچھ عطا نہ کر سکتا تھا۔

نائیلہ کی ڈرائنگ کا سٹائل گوگین سے ملتا تھا۔ بھاری لائن' موٹا زمینہ' بوجھل حاشیہ' فربہ کردار' بھاری کندھے' بھرے بھرے کولہے' موٹی رانیں' بھرکم پنڈلیاں کالے سیاہ بال' چوڑے نقوش' ڈھیو عورتیں' مجرب بچے' جسیم بڑھیائیں' کپے برتن اور ہٹی کٹی سٹل لائف۔ ان سب میں طاقت کا اظہار' من مانی کا دعویٰ اور انکار کا اعلان کہ اگر میں نہیں تو یہ سب کچھ ہوتے ہوئے بھی کچھ نہیں ہے اور اگر میں نہ چاہوں تو یہ سارا وجود عدم ہے۔ یہ میرا اختیار ہے اور میرا اختیار چیلنج نہیں کیا جا سکتا کہ میں انسان ہوں اور انسان عظیم ہے خدایا۔ اور میں لافنا ہوں کہ میرا فن امر ہے۔ اور فن زندگی ہے' فن حیات ہے' فن شکتی ہے۔ اور اس ساری کائنات کا مدار فن پر ہے۔ ساری تخلیق فن کی لیلا ہے! اور فن آرٹسٹ کے ہاتھ کا مرہون منت ہے۔ انسان کے ہاتھ کا دست نگر ہے۔ اور انسان بہت بڑا ہے۔ اس پوری کائنات سے بڑا اور

اس ہر لمحہ پھیلتی ہوئی کائنات سے اور بھی بڑا ہے!

نائیلہ اس قدر پاک صاف خود مختار' دھلی دھلائی' خود سمجھدار اور پاک نفس لڑکی تھی کہ نہ اس کو کسی سے محبت تھی اور نہ وہ کسی کی محبت کی طلبگار تھی۔ وہ ایسی نار میلسی کے نقطہ عروج پر زندگی بسر کر رہی تھی۔ جہاں ذات اور وجود محبت و نفرت' مدح و ذم اور توجہ' بے توجہی سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔ اس کے خیال میں محبت کرنے والے اور کروانے والے عام طور پر کمزوریاں' نحیف' ماڑے اور بودے لوگ ہوتے ہیں ان میں کوئی ایسی کمی اور کجی رہ جاتی ہے جسے وہ کسی دوسرے کی ذات سے پورا کر کے ہی اپنی زندگی بسر کر سکتے ہیں۔ اکیلے نہیں' کہتی تھی جو بادام صحت مند اور مضبوط ہوتا ہے اس کی ایک ہی بھری بھری گری ہوتی ہے دو گریوں والے بادام کی دونوں گریاں کمزور ہوتی ہیں۔ جو گریاں ٹیڑھی' کمزور اور خمیدہ ہوتی ہیں وہ ہمیشہ ایک دوسری کی کجی میں سر چھپائے جڑواں صورت میں زندہ رہنے کی کوشش کرتی ہیں۔ نائیلہ کا ایقان تھا کہ جو جنین کمزور' بودا اور ڈرپوک ہوتا ہے وہ اپنے حصے کا خون' اپنے حصے کی جگہ اور اپنی صفتوں کو آدھا بانٹ کر اپنے ساتھ ایک اور جنین تیار کر لیتا ہے تاکہ اس کا دل لگا رہے اور اندھیرے میں اسے خوف نہ آئے۔ پیدائش کے بعد بھی یہ دونوں توام بچے ایک دوسرے کا سہارا بن کر زندگی گزارتے ہیں اور ان کے وجود کے کیسٹ پر زندگی کا بس ایک ہی فیتہ ہوتا ہے۔ سنگل ٹریک! ایک ہی پگڑی ہوتی ہے جسے دونوں نے بیک وقت پرچ سنوار کے باندھا ہوتا ہے۔

نائیلہ اس قدر انڈی پنڈنٹ' بے نیاز' پاک باز اور مبرا قسم کی لڑکی تھی کہ اس نے کوئی تعصبات نہیں پالے تھے۔ وہ رندوں کے ساتھ بھی خوش تھی اور محاسبوں کے ساتھ بھی مسرور و دلشاد۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ ایک خود برپا قسم کی لڑکی بھی تھی جو ایکسیلیٹر پر اپنا ننگا پاؤں رکھ کر فوکسی جیسی کار سے بھی جستیں لگوا سکتی تھی۔ اگر آپ یہ سمجھنے لگے ہوں کہ نائیلہ ایک متکبر' گھمنڈی اور مغرور لڑکی تھی اور کسی کو خاطر میں نہیں لاتی تھی تو آپ غلطی پر ہیں۔ جو خود پسند یا خود بیں نہیں تھی خود مختار اور خود آشنا تھی۔ وہ دونوں ہاتھوں سے پینٹ کر سکتی تھی۔ دونوں ہاتھ سے سکیچ بنا لیتی تھی۔ دونوں پاؤں پر بیٹھ کر سمادھی لگا لیتی تھی۔ دونوں قوتوں سے طاقت حاصل کر لیتی تھی۔ اپوزیشن اور حکومتی حلقوں میں ہر دلعزیز تھی۔ اے سی' ڈی سی دونوں کرنٹ اس کے تھے لیکن وہ یزداں کے مقابلے میں اہرمن کو زیادہ پسند کرتی تھی۔ جلال دین کے مقابلے میں گنگا رام کو زیادہ آسانی سے سکیچ کر لیتی تھی۔ اپنے گھر والوں کے مقابل اپنے

گھرانے کے مخالفوں کو اچھا سمجھتی تھی۔ چونکہ وہ متعصب نہیں تھی اس لئے اپنی آزاد خیالی کے اظہار کے لئے اسے ہر وقت اپنے اور اپنے پن کے خلاف جھکنا پڑتا تھا۔ زیادہ نہیں جھکتی تھی اور ہر بار نہیں جھکتی تھی۔ بس جھکی ہی رہتی تھی۔ باپوں کو بہت ہی پسند ہوتی ہیں اس لئے نائیلہ بھی اپنے ڈیڈی کی آئیڈیل لڑکی تھی!

اب آپ بیچ کی گفت و شنید کو چھوڑیں اور ان لمبی میٹنگوں میں جانے سے احتراز کریں جو نائیلہ اور سلمان کے درمیان پورے سوا سال تک چلتی رہیں۔ جاننے کی بات یہ ہے کہ ایک روز بدھ کے دن انہوں نے شادی کا فیصلہ کر لیا اور جمعرات کو ان کی شادی ہو گئی۔

سلمان کے اپنے گاؤں میں اور گاؤں سے ملحقہ دوسرے گاؤں میں اور برادری اور ساکا داری کے تیسرے گاؤں میں کوئی مہینہ بھر ان کا ولیمہ چلتا رہا اور نائیلہ ان سب کے ویڈیو خود تیار کرتی رہی۔ جن سرداروں کو کچھ ولیموں میں نہیں بھی شریک ہونا تھا کہ ان کی آپس میں پرانی اڑ پھس تھی وہ بھی ہر ولیمے میں شریک ہوئے۔ نوجوان اپنے قبیلہ سردار سلمان کی وجہ سے نہیں بلکہ نئی سردارنی کے زور پر جس کے کپڑے بھی عجیب ہوتے تھے اور جن کی فٹنگ بھی ٹھیک ٹھیک جگہوں پر ٹھیک ہوتی تھی بلکہ بہت ہی ٹھیک ہوتی تھی اس گھرانے کے اور بھی تابع فرمان ہو گئے تھے۔

گاؤں کی عورتیں' کیا بڑی بوڑھیاں' کیا جوان لڑکیاں اور کیا نوخیز چھوکریاں سبھی نائیلہ کی عاشق ہو گئی تھیں۔ جن باتوں کا اظہار مردوں کے منہ پر کرنے سے وہ ڈرتی تھیں اور جن باتوں کے ایک مرتبہ کر دینے کی حسرت لے کر ان کی مائیں' ماسیاں اور دادی نانیاں قبروں میں چلی گئی تھیں وہ باتیں نائیلہ چھناک دے کے بڑے بزرگوں کے منہ پر دے مارتی تھی اور ارد گرد دور دور تک پھیلی عورتوں کے کلیجے میں ٹھنڈ پڑ جاتی تھی۔ ان کے ہردے دیر تک تالیاں بجاتے رہتے تھے اور ان کی کوکھیں ہر ہر جنبش کے ساتھ نعرے مارتی چلی جاتی تھیں۔

نائیلہ نے اپنے علاقے کی بہت سی عورتوں کو چڑھاوے چڑھانے' درگاہوں پر جانے' پیروں کے پیروا بننے اور خاوندوں کی ہر بات ماننے سے توڑ لیا تھا۔ ان ساری باتوں میں سب سے اچھی بات یہ تھی کہ جب خاوند پیار سے بلائے تو اس کے قریب نہیں جانا اس کی نیت بد ہوتی ہے! عورتوں نے اس مسئلے پر اپنے اپنے تجربات کی اتنی بڑی بڑی گٹھڑیاں کھولی تھیں کہ حویلی کے بڑے صحن میں دور دور تک یہی چرچے چیتھڑوں کی طرح پھیل گئے تھے۔

ایک مرتبہ جب سلمان نے نائیلہ کو کوئی اوبسین لطیفہ سنانے کے لئے دارو، حکمی، نیی، صغریٰ اور شادو کو اٹھا دیا تو نائیلہ نے سخت اعتراض کیا اور لطیفہ سننے سے انکار کر دیا۔ جب سلمان نے اپنے کلچرل پیٹرن کی وجہ سے مجبوری کا اظہار کیا تو نائیلہ نے اسے اور اس کے فرسودہ کلچرل پیٹرن کو مادر---- والی گالی دے کر خاموش کرا دیا۔ پھر جب تک صغریٰ، شادو، نیی اور دارو کے سامنے اس لطیفے کو بلا کم و کاست سنوا نہیں لیا نائیلہ نے اپنا احتجاج جاری رکھا۔ دراصل وہ گاؤں کی عورتوں کے ذہن سے صدیوں پرانی گھٹن دور کر کے انہیں پاک صاف کرنا چاہتی تھی۔ وہ ان کے ذہن سے وہ جالے دور کرنا چاہتی تھی جو فیوڈل نظام اور ملا کے کلام نے متفقہ سازش کے ذریعے ان کے ذہنوں میں تان رکھے تھے۔ وہ شفاف ذہن، شفاف بدن، شفاف الیکشن اور شفاف سودے کی قائل تھی۔ وہ ایسی غلط ملط غلیدن قسم کی زندگی کے بے حد خلاف تھی جس میں انسان ساری زندگی ٹوٹتا تڑپتا ہی رہے اور تڑپ تڑپ کر جان دے دے۔

بل کھاتے چناب سے تھوڑی دور پرے اس گاؤں میں نائیلہ کا ایسا دل لگا تھا کہ وہ اپنے میکے کو بھولتی سی جا رہی تھی۔ شہر میں تو اس کے اباجی نے اپنی ناطاقتی اور کم دوستی کی وجہ سے اپنی گری ہوئی ساکھ کو ماڈرن ازم کے گیسی غباروں سے اٹھایا ہوا تھا اور اپنی لڑکیوں کو پرمسو بنا کر امیر حلقوں میں داخلہ لے رکھا تھا لیکن یہاں تو سچ مچ کی دولت تھی۔ حویلی کے اندر اور باہر جگہ جگہ فراوانی کے ڈھیر تھے۔ دیواروں سے پرانے تمول کے کھڑ پھڑ اتر رہے تھے، اور حویلی کی امارت نے سارے گاؤں کو چندھا کر رکھا تھا۔ لوگ آنکھوں کے آگے ہاتھ کر کے اور دیواریں پکڑ پکڑ کر چلتے تھے۔ نئی گاڑیوں کا باڑہ حویلی کے عین سامنے تھا اور پرانی موٹروں کا قبرستان شہریار نیاؤں میں تھا۔ جس مکان میں شکاری کتے رہتے تھے اسی کے بالا خانے میں بازوں، شکروں اور ترمتوں کے پنجرے تھے۔ حویلی کے اندر اور اردگرد دولت کی اس قدر پولیوشن تھی کہ گاؤں کے سارے لوگ مرضی اکھمری میں مبتلا ہو کر کیڑے سے ہو گئے تھے۔

نائیلہ حرف ایک لفظ کی ادائی سے کہ "مجھے قبول ہے" اس ساری دولت، ساری عزت، ساری نیک نامی میں برابر کی شریک ہو گئی تھی۔ لفظ کے کھل سم سم میں بھی کیا جادو ہے۔ صحیح بولا جائے اور بروقت بولا جائے اور سوچ سمجھ کر بولا جائے تو اس میں فائدے ہی فائدے ہیں۔ بھاگ ہی بھاگ ہیں لابھ ہی لابھ ہے۔ نائیلہ ہیومن رائٹس کی لیڈر ہونے کی وجہ سے ہمیشہ فائدے کا سودا کرتی تھی۔ جان بوجھ کر نہیں۔ بے خیالی اور بے فکری ہیں۔ تدبیر و تفکر

سے نہیں۔ بھول پنے اور الہڑپن میں۔

لیکن ـــــ ایک شام!

ایک شام جب نائیلہ حویلی کے مدھرے پردوں والی چھت پر اپنا ایزل لگا کر ہاکو مسلن کا نیوڈ سکیچ کر رہی تھی تو چار کول اس کے ہاتھ سے ٹوٹ ٹوٹ جاتا تھا۔ ہاکو کے کندھے۔ اس کا گلا' گلے سے نیچے کا گات' مضبوط کمر' گہری ریڑھ' چلو بھر پیٹ اور سیدھی سطر ٹانگیں' سب کچھ اصول کے مطابق ڈھلا تھا۔ نائیلہ شرم سے مری جا رہی تھی کہ مجھے بھی اپنی گُر پر بڑا ناز تھا لیکن اصل گُر تو کسی انجانے مقام سے آتی ہے ڈانٹنگ کر کے نہیں ملتی۔ اس کا سرچشمہ تو کہیں اور ہی ہے۔

وہ چوکی پر بیٹھی ہوئی ہاکو کے کالے سیاہ بدن اور کھلے ہوئے گھنیرے بالوں کو دیکھتی دیکھتی ٹرانس میں چلی گئی۔ سکیچ اچھا بنا تھا لیکن ہاکو کے بدن جیسا نہیں۔ اس کی آؤٹ لائن بڑی زوردار تھی لیکن ہاکو کی جلد جیسی نہیں تھی۔ اس کے چہرے کے سارے خد و خال ہاکو کے تھے اور مشابہت بھی سو فیصد تھی لیکن وہ ہاکو نہیں تھی۔ چوکی پر بیٹھی ہوئی ہاکو اور ایزل پر لٹکی ہوئی ہاکو میں وہی فرق تھا جو کوسٹ پر بیٹھے ہوئے آدمی اور صلیب پر لٹکے ہوئے انسان میں ہوتا ہے۔

ہاکو نے گردن گھما کر پہلے بی بی کو اور پھر اتنے بڑے چوکھٹے میں اپنے آپ کو دیکھا تو اپنے مقابلے میں اس کو بی بی چھوٹی چھوٹی سی لگی۔ اس نے ترس بھرے انداز میں کہا "شہدی اتنی امیر ہو کر بھی ہولی ہولی سی ہے اور اتنے کپڑے پہن کر بھی ننگی بچی لگتی ہے۔ پتہ نہیں اس کے ماپے کماپے کون ہیں اور ان کا تھوہ ٹھکانہ کدھر ہے" پھر اس نے نائیلہ کی طرف دیکھ کر کہا "کپڑے پہن لوں بی بی جی۔"

نائیلہ نے اثبات میں سر ہلایا تو پہلے ہاکو نے اپنی کالی سیاہ دھوتی باندھی اور پھر کالی ململ کا کرتہ پہن کر بٹن بند کرنے لگی۔

سارے میں ڈوبتے ہوئے سورج کی خوشبو پھیلنے لگی تھی اور پرندوں کی اپنے گھروں کو واپسی شروع ہو گئی تھی۔ ڈھلتے سورج کی روپہلی کرنوں میں ہر پرندہ اپنی اپنی کرن کے ساتھ روشن ہوتا جا رہا تھا۔ اپنی اڑان میں اپنی بڑھت میں' پھر اتران میں اور آخر میں اپنی تیز پرواز کو کھڑے پروں سے روکتے ہوئے ہر پرندہ اپنی اپنی کرن میں' سپاٹ لائٹ میں' وی وی پی

آئی کی طرح لینڈ کر رہا تھا۔ نائیلہ نے سر کے اشارے سے ہاکو کو چلے جانے کے لئے کہا اور وہ اپنے بھیتر کھینچتی ہوئی کوٹھے سے نیچے اتر گئی۔

نائیلہ نے اس سے پہلے نہ ایسے رنگ کا آسمان دیکھا تھا نہ کبھی ڈوبتے سورج کا اندازہ کیا تھا۔ شہروں میں چڑھتے اترتے سورج کو کوئی نہیں دیکھتا نصف النہار والے سورج سے سبھی واقف ہوتے ہیں۔ لیکن ٹاپ لائٹ والا سورج کسی کام کا نہیں ہوتا۔ نہ شیڈ نہ سلوٹ نہ کیارو نہ ٹکورو!

نائیلہ اپنی دونوں بینیاں مدھرے پردے کی دیوار پر ڈال کر کھڑی ہو گئی اور اس نے اپنی ٹھوڑی ہاتھوں کے روے پر جمائی۔ ٹاہلیوں' شہتوتوں اور دھریکوں کے پیچھے ایک کھلا میدان تھا اور میدان کے پیچھے دور تک پھیلا ہوا ایک سیلا سیلا کنارہ۔ اس کے پیچھے سورج کا ایک تھال اور تھال سے گرے اور براؤن روشنی کا اخراج۔ نائیلہ نے دو چار بار آنکھیں جھپکیں' سر کو ایک جھٹکا دیا لیکن وہ رنگ اپنی جگہ اسی طرح قائم رہا۔ ہم لوگوں کو تو ڈوبتا ہوا سورج ہمیشہ سرخ نارنجی اور پیلا پیلا نظر آتا ہے اور ہم سونے کے اس تھال کو ہمیشہ اسی رنگ میں دیکھتے ہیں لیکن ہم نائیلہ تو نہیں ہیں۔ نہ ہم نے کبھی پینٹ کیا' نہ سکیچ کیا' نہ کلرنگ کی' ہم کو کیا پتہ رنگ کے خاندانوں میں کیسی کیسی رشتہ داریاں اور کس کس قسم کی دشمنائیاں ہوتی ہیں۔ کون کون چوری چھپے ایک دوسرے کے ساتھ ملتے ہیں اور کس کس نے ایک دوسرے کے خلاف خفیہ عرضیاں ڈالی ہوئی ہیں۔ ہم کو تو ہر شیڈ بس ایک بنیادی رنگ ہی نظر آتا ہے۔ ہم سب بنیاد پرست ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا بھر کے ملکوں کے جھنڈے بنیادی رنگوں پر مشتمل ہوتے ہیں کسی میں کوئی شیڈ' سایہ رنگ یا پھیکا رنگ نہیں ہوتا' بنیادی رنگ ہی ہوتے ہیں!

پھر نائیلہ کے دیکھتے دیکھتے سورج کی اس گرے اور براؤن روشنی کے سامنے باریک گرد کا ایک پردہ اٹھا اور دیکھتے دیکھتے فرش سے عرش تک سیپیاٹون کا ایک شامیانہ سا تن گیا۔ یہ رنگ سورج کی گرے اور براؤن روشنی سے باہر نکل کر اپنے پاؤں پر کھڑا تھا اور اس کی گہرائی اور گیرائی میں لحہ بہ لحہ اضافہ ہو رہا تھا۔ نائیلہ نے گردن گھما کر ادھر ادھر دیکھا لیکن دریائے نیل کے منبع کی طرح اس رنگ کا کوئی سرچشمہ اسے نظر نہ آیا۔ پھر اس نے اپنی ٹھوڑی ہاتھوں کے روے سے اٹھائی اور پردے کے ساتھ تن کر کھڑی ہو گئی۔ سیپیاٹون کے اس مہین پردے کے پیچھے کروم اور اوکر کلر کے ملے جلے ذرات سکرین بن کر کھڑے ہو گئے تھے اور اسی

و۔سناوژن پر مویشیوں کے ہیولے ابھرنے لگے تھے۔ بڑے بڑے بدنوں والی بھینسیں' اونچے اونچے سینگوں والے ناگدری بیل' دھنی کے چتکبرے داند اور بھیڑوں اور بکریوں کے الگ الگ ریوڑ۔ ان کے پیچھے پانچ اونٹ اور ساتھ جواں سال گائیوں کا ایک بے نیاز گلہ۔

لیکن یہ تو غبار کے پردے پر ان مویشیوں کی تصویر ہے' مویشی کہاں ہیں۔ وہ جانور کدھر ہیں جن کا یہ امیج ہے۔ اصل کہاں ہے جس کی یہ نقل ہے۔ پھر تھوڑی دیر بعد نائیلہ نے گھنٹیوں کی ہلکی ہلکی آواز اور بھیڑوں کے ممیانے کی صدائیں سنیں۔ سورج اور نیچے ہو گیا تھا اور غبار کا سیپیا پردہ الٹرا میرائن رنگ کی جھلک دینے لگا تھا۔ "اف میرے خدا یہ کس طرح سے ہو سکتا ہے" نائیلہ نے پرانی اینٹوں کے مدھرے پردے مکا مارتے ہوئے کہا "یہ تو کمپلیمنٹری کلر میں ہی نہیں پھر یہ ایک دوسرے کے قریب کس طرح آ سکتے ہیں۔" کسی نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔

اچانک اس نے دیکھا کہ بھیڑوں کے تین ریوڑ پیش منظر پر ابھر آئے ہیں اور تینوں ٹکڑیوں کے درمیان سات سات آٹھ آٹھ فٹ کا فاصلہ ہے۔ لیکن غبار کی سکرین پر یہ تینوں ریوڑ ایک دوسرے میں مدغم چلے آتے ہیں اور ان کے درمیان کوئی فاصلہ نہیں۔ بھیڑیں اپنی چھ چھ انچیا رفتار کے ساتھ بڑی مستعدی کے ساتھ آگے بڑھ رہی تھیں اور سکرین پر نارنجی رنگ کا ایک بہت بڑا فلیش شرقاً" غرباً" پھیل گیا تھا۔

ان کے پیچھے دو میل کالی بھینسیں تھیں جن میں سے بیشتر کے سینگ نیچے کی طرف ڈھلکے ہوئے تھے۔ جو جوان تھیں ان کے سینگ کنڈل دار تھے اور ان میں دریا کنارے کی چکنی مٹی اور گھاس کے سبز تنکے پھنسے ہوئے تھے۔ ان کے ساتھ دائیں طرف ایک کالا سیاہ چمکدار ارنا بھینسا چلا آ رہا تھا جس کا پٹھا کولڈ سٹارٹ ڈیزل انجن کے وجود کی طرح تیل سے سنا ہوا تھا۔ ان کے پیچھے بیائی ہوئی گایوں اور کنواری بچھیاؤں کا غول تھا جو سارے کا سارا یلو اوکر رنگ میں نہایا ہوا تھا اور اب "پرپل کلر" سے گذر کر سبزی مائل سا ہو گیا تھا۔ ان کے پیچھے بکریاں تھیں براؤن' سفید کالی' چتکبری' سینگوں والی' گھونی گابھن' سوکھی اور تھنوں کے بوجھ سے بمشکل چلنے والی۔ ایسی بھی جن کے کان بہت لمبے تھے اور ایسی بھی جن کے گلے کے نیچے دو نلکیاں سی لٹکی ہوئی تھیں ـــــ اونٹوں کے قدم لمبے تھے مگر چال دھیمی تھی۔ ان کے گلوں سے بندھے ہوئے لوہے کے ڈھیلے ڈھیلے گجر اندر لٹکی ہوئی لکڑی کی گلیوں سے بج رہے تھے اور ان کی

مہاریں ان کی گردنوں کے گرد گلو بندوں کی طرح لپٹی ہوئی تھیں۔

پیچھے تین چرواہے تھے۔ دو بڑی عمر کے گڈریئے اور ایک نوجوان گلہ بان۔ ڈوبتے ہوئے سورج نے ان تینوں کو جوگیا رنگ میں لپیٹ رکھا تھا اور ان کی دن بھر کی تھکاوٹ اور کھنچل نے ان کے سارے وجود کو پاکیزگی کے غسل سے نکھار دیا تھا۔

دریا کے اس پار ٹھنڈی میٹھی زمین میں دن بھر چرنے چگنے کے بعد گاؤں کی دولت واپس گاؤں آ رہی تھی۔ ڈھلا ہوا سونا واپس اپنی کانوں پہنچ رہا تھا۔ سورج اس قیمتی سرائے کو گاؤں کی راہ دکھا کر آخری ڈبکی مارتے ہوئے کہہ رہا تھا "اے گاؤں کے لوگو! جب شام کو تم اپنے مویشی جنگل سے لاتے ہو اور صبح چرانے لے جاتے ہو تو ان سے تمہاری عزت و شان ہے۔ میں گواہ ہوں کہ تم عزت و شان والے لوگ ہو اور تم کو ان مویشیوں کی وجہ سے بھی عزت و شان عطا کر دی گئی ہے۔ آسان رہو اور آسانیاں تقسیم کرتے رہو!"

گاؤں کا ان پڑھ مولوی نیم پختہ مسجد کی ٹوٹی ہوئی سیڑھیوں کے درمیان کھڑا اپنی بے رس اور خشک آواز میں مغرب کی اذان دے رہا تھا اور نائیلہ چھت پر پردہ والی ساتھ کھڑی ․ میں ․ میں رو رہی تھی۔ اس نے اپنے منہ پر پورے ہاتھ کا دباؤ دے کر اپنی آواز روکنا چاہی تو اس کی گھگھی بندھ گئی۔ اور پھر تھوڑی دیر بعد اس کا سارا بدن سسکیوں سے ہلنے لگا اور اس کی ناک اور حلق سے ایسی آواز آنے لگی جیسے سردیوں کی رات میں غیر محفوظ بھٹ کے اندر بے ماں کا پلا رویا کرتا ہے۔

اچانک نیچے گلی میں آدمیوں کا شور بلند ہوا اور لوگ تالیاں بجا بجا کر ہنسنے گے۔ وہ ایک دوسرے کو آوازیں دے رہے تھے اور نیا بائسکوپ دیکھنے پر اکسا رہے تھے۔ نائیلہ نے پردے اوپر سے آگے کو ہو کر دیکھا تو اماں طالعاں کی تندوری پر پانچ چھ جوان بوڑھے اور کڑ بڑے مرد جمع تھے اور تالیاں بجا بجا کر اونچے اونچے ہنس رہے تھے۔

سندر میو کی جوان کنواری بچھیا تائی خورشید کا گلے سے بچھڑا ہوا لیلا اپنی حفاظت میں لے کر واپس آ رہی تھی۔ وہ اسے اپنے بے سینگ گھونے سر کی ڈھڈیں مار مار کر سیدھے راستے پر رکھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اور وہ بار بار بھٹک جاتا تھا۔ ان دونوں کو اپنے گاؤں کے مویشیوں سے بچھڑے پہلے ہی بڑی دیر ہو گئی تھی اور یہ احمق لیلا اماں طالعاں کی تندوری تک پہنچ کے پھر گڑبڑا گیا تھا۔ بچھیا اس کا پیچھے کا راستہ روکے کھڑی تھی اور اسے آگے

چلانے کی کوشش کر رہی تھی۔ لوگ ہنس رہے تھے اور تالیاں بجا رہے تھے۔ بڑا دلچسپ منظر تھا۔

جوان جہان سفید براق بچھیا۔ سفید ستواں دم' کالی سیاہ آنکھیں' ماتھے پر شاہی بھنور' تھوتھنی کے اوپر اڑن بھنبھیری جتنا براؤن دھبہ' شام کا وقت' گاؤں کے مرکز سے دور' اکیلی ذات اور بے ہودہ مردوں کی ہنسی' شرما بھی رہی تھی اور اپنی ذمہ داری کو نبھا بھی رہی تھی۔ اور ظلم کی بات یہ کہ اس کی ذمہ داری ایک احمق ترین مخلوق کے روپ میں اس کے سامنے کھڑی اپنے ہی گھر کا رستہ بھول گئی تھی۔

پھر جب بھٹکے ہوئے بدھو لیلے کو سامنے میرائیوں کے پرنالے میں پیپل کا پیڑ نظر آیا تو اسے اپنا کھویا ہوا روٹ مل گیا۔ اتنی تیزی سے اپنے باڑے کی طرف بھاگا کہ اس کے پیچھے سندر مینو کی بچھیا کا بھاگتے بھاگتے سانس پھول گیا۔

نائیلہ نے سوچا کیا میں بھی جا کر سلمان سے کہتی ہوں کہ "میں تائی خورشید کا بھٹکا ہوا لیلا ہوں اور مجھ سے بھی میرا راستہ گم ہو گیا ہے۔ اور مجھے بھی اپنے باڑے تک پہنچنا ہے۔ میرے لئے سندر کی بچھیا بن کر بغیر سینگ مارے بغیر ڈرائے باڑے تک پہنچا دو گے؟ لیکن اسے معلوم تھا کہ سلمان ایسا نہیں کر سکے گا۔ وہ نیچے حویلی میں اپنی' رائفلوں' بندوقوں اور پستولوں کو گریس لگا رہا تھا اور اپنا وقت بے ہودہ کاموں میں صرف کرنے کا روادار نہیں تھا۔

پھر نائیلہ حویلی کی لپی ہوئی چھت پر پھسکڑا مار کر بیٹھ گئی اور منہ اوپر اٹھا کر بولی میں تو جو تھی سو تھی' تو نے تبھی مجھے کبھی نہیں بلایا۔ خود نہیں بتایا کہ اس نماز میں کتنی رکعتیں ہوتی ہیں اور کس میں کیا پڑھتے ہیں۔ پر اب میں نے بھی تیرا پیچھا نہیں چھوڑنا پھر اس نے اپنی اپاہج نانی کی طرح سامنے کی دیوار پر دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیاں ماریں اور کھلے ہاتھوں کو اپنے منہ پر مل لیا...... اس کے آگے کیا کرنا تھا اسے معلوم نہیں تھا۔ اتنی بڑی مصور دیکھتے دیکھتے اس فریسکو کا حصہ بنتی جا رہی تھی جس میں رنگ برنگی دھول کے پیچھے گاؤں کے مویشی گھر واپس آ رہے تھے۔ وہ ڈوبتے سورج کی طرف منہ کر کے آنے والے مویشیوں کی دھول میں گم ہو کر بیٹھ گئی اور ادب کے ساتھ سینے پر ہاتھ باندھ لئے---!

○

# شہر کافور

بانو قدسیہ

ہماری حویلی اور نئی بستی کے درمیان ایک سڑک کا فاصلہ ہے پھر ایک اجاڑ سا احاطہ ہے جس میں اب سارا دن مالی کام کرتے نظر آتے ہیں۔ پٹڑیاں بچھائی جا رہی ہیں۔ درخت بوٹے گاڑے جاتے ہیں۔ گھاس کی چھوٹی چھوٹی پنیری لگائی جا رہی ہے۔ سنا ہے نئی بستی کا یہ پارک بڑی ہی ماڈل جگہ ہو گی۔

سڑک اور پارک گذر کر جو پہلی سفید کوٹھی ہماری حویلی کی تیسری منزل سے نظر آتی ہے بڑی خوبصورت ہے۔ اس کے لمبے لمبے ستون رومن کولوسیم کی یاد دلاتے ہیں۔ سامنے سیاہ پھاٹک' پھاٹک کے آگے توڑے دار بندوق والا چوکیدار ہے--- چوکیدار کے نیچے لوہے کی کالی کرسی ہوتی ہے۔

اس کوٹھی کے بند پھاٹک' اونچے ستونوں میں سے رات کے پچھلے پہر ایک آواز آتی ہے "اورے بھیا......... بہادر محمد بن قاسم.......... سن.......... تجھے رسولؐ کی سوگند.......... سن لے.........." ہوائیں سفید کوٹھی سے بڑی لٹک کے ساتھ حویلی کی تیسری منزل میں پہنچتی ہیں--- اور یہ مریل سی آواز......... مجھے جگانے کے لئے چھوڑ جاتی ہیں۔

اور تو سارے شوق جاتے رہے ایک خبر دینے اور سننے کا آخری شوق تھا اس آواز نے اس کا بھی ستیاناس مار دیا ہماری حویلی سے پیچھے پیچھے پرانا شہر آباد ہے۔ گلیاں اندر گم ہو جاتی ہیں۔ سڑک پر ابھی دودھ دہی کی دوکانیں' پنواڑی' پتنگ والے' گنے کے رس کی ریڑھیاں' نجومی اور ان گنت موسمی تاجروں کا بکاؤ مال فٹ پاتھ پر سجا رہتا ہے۔ کبھی شالیں' ٹوپیاں' گرم مفلر دکھائی دیتے ہیں' کبھی چاقو چھری اور پلاسٹک کا سامان بیچنے والے فٹ پاتھ سنبھال لیتے ہیں۔

ادھر کی بستی کا ادھر کی کالونی سے کوئی تعلق نہیں۔ صرف کبھی کبھی رات کے

پچھلے پہر جب ہوا چلتی ہے تو ایک دبی دبی سی آواز حویلی کی تیسری منزل میں گھومنے پھرنے لگتی ہے۔۔۔ "او بھیا اے گاؤں کا راجہ چور ہے۔ اے سن......... بہادر محمد بن قاسم......... تجھے رسولؐ کی سوگند۔۔۔ سن تو سہی۔"

ہماری حویلی راجہ رنجیت سنگھ کے عہد کی ہے۔

حویلی کی ہیئت بارہ دری کی سی ہے۔ عمارت سہ منزلہ اور ساری کی ساری پختہ' چونا گچ سے بنی۔ مہاراجہ کھڑک سنگھ کے عہد میں مزروعہ و بنجر سو بیگھہ زمین داجئے پر تھی جنوب رویہ جہاں ابھی شہر آباد نہ ہوا تھا ایک تالاب ایسا خوشنما اور ٹھنڈے پانی سے لبریز تعمیر تھا کہ خلق سارا دن پانی ڈھوتی اور حویلی والوں کو دعائیں دیتی تھی۔ فقیر عزیزالدین سے ہمارے بڑوں کے مراسم دانت کاٹی روٹی کے سے تھے۔ ہمارے بزرگ پشت ہا پشت سے طبیب رہے جو عزت اور توقیر آج بڑے بڑے کنسلٹنٹ ڈاکٹروں کی ہے وہ ہماری حویلی کو نصیب تھی۔ بیٹھک کے باہر مریضوں کے بیٹھنے کو پکی بنچیں' تھوکنے کے لئے اگال دان' چائے پلانے کے لئے خدمت گار تھے.........

سنا ہے ساری حویلی میں بڑی رونق رہا کرتی تھی۔ دن پل بھر میں اور پل ایک پل جھپکنے میں گزر رہا تھا۔ ہمارے بزرگ فارسی میں شعر کہتے تھے۔ فارسی کا ملکہ خواتین میں بھی تھا اور وہ نوکرانیوں کے درمیان ذاتی گفتگو فرفر فارسی میں کرتی تھیں جیسے آج کل کالونی میں انگریزی استعمال کی جاتی ہے۔ فقیر عزیزالدین کے گھرانے کی طرح تمام مرد گیروے رنگ کی پگڑی پہنتے اور سردیوں میں پشمینے اور چوغے بھی اسی رنگ کے اوڑھتے۔۔۔ اس طرح حویلی کے لوگ عوام سے بچھڑ کر بالکل منفرد نظر آتے تھے۔ علم و دولت کے علاوہ لباس نے بھی اسی آبادی میں حویلی والوں کی چڑھ مچا رکھی تھی۔ لیکن سنا ہے اتنی عزت و توقیر کے باوجود ہمارے گھروں میں اسراف بیجا پر سب لعنت بھیجتے تھے۔ اونچی آواز میں بولنا گناہ تھا۔ نگاہیں جھکا کر چلنا اور آپے میں رہنے کا دستور تھا۔

دسترخوان پر کبھی ایک سے زائد سالن نہ ہوا۔ میرے پڑدادا نے ساری عمر اچار کی پھانک یا روٹی چٹنی رکھ کر کھائی اور خدا کا شکر ادا کیا۔ پتہ نہیں یہ گھرانہ کس مٹی کا بنا تھا؟ بہشتی پوش راہ مولا مٹھیاں بھر بھر روپوں کی تصدق کرتے اور کھنکتے سکوں کی آواز پر بھی آنکھ کھول کر نہ دیکھتے۔ خیرات' صدقہ' زکوٰۃ سب رات کے پچھلے پہر دینے کا حکم تھا۔ پھر پتہ نہیں کیوں جنوب رویہ تالاب سوکھ گیا۔ کھاری پانی کی وجہ سے سو بیگھہ زمین قابل کاشت نہ رہی۔ انگریز بہادر کے عہد میں زمین کو منشی کندن لال نے خرید لیا اور اس پر ہولے ہولے گھر دوکانیں تعمیر

کیں۔ پہلے جہاں ہماری حویلی بطخوں میں راج ہنس کی طرح تھی اب منشی کندن لال کا پختہ محل جگمگانے لگا۔ ہولے ہولے تین منزلہ حویلی سے لوگ کھسکنے لگے۔ کچھ کراچی جا آباد ہوئے کچھ دوبئی شارجہ چلے گئے۔ میرے دونوں ڈاکٹر بھائی امریکہ کی ریاست ٹیکساس نے چھین لئے۔ وہ بینچیں جن پر مریض بیٹھا کرتے تھے اب ان پر آوارہ کتے' بلیاں اور فقیر بیٹھے نظر آتے۔ اگال دان کوڑے کے ڈھیروں میں بدل گئے۔۔۔ رونق' سخاوت اور فارسی نہ جانے کیا ہوئی؟

م ف یہ تین منزلہ حویلی پرکھوں کی یاد باقی ہے۔۔۔

آپ تو مجھے بے حس کہیں گے ہی لیکن کسی نہ کسی سے تو دل کی بات کرنا ہی پڑتی ہے۔ حویلی کی اونچی چھتوں والے کمروں میں صدیوں پرانے پلنگ' آئینے' تلواریں' جھاڑ فانوس' چھپر کھٹ' بڑے بڑے حقے اور بوسیدہ قالین بچھے ہوئے ہیں۔ آپ خود بتائیں جن کمروں میں راتوں کو تاریخ کا بسیرا ہو اور دن کے وقت رنگین شیشوں سے پڑنے والی روشنی ان گنت آسیب پیدا کرے وہاں کوئی کیسے زندہ رہے؟ سنا ہے کہ تاریخ اپنے آپ کو دوہراتی رہتی ہے۔۔۔ اب تو میں مایوس سی ہو چکی ہوں بھلا کوئی اس کے دوہرانے کا انتظار کب تک کرے؟ اس کمرہ در کمرہ حویلی میں صرف بوڑھے رہتے ہیں۔ کھانستے ہونکتے' تھوکتے اور پرانی باتیں دوہراتے ہوئے بڈھے اور بڈھیاں......... کبھی کبھی کراچی' جدہ یا ٹیکساس کے ڈاکٹر بھائی آ جاتے ہیں تو کچھ دنوں کے لئے کمروں سے آوازیں آنے لگتی ہیں......... باقی وقت تاریخ کے پرانے اوراق ہیں اور ہم ہیں۔

ہم سے مراد بڑی آپا' دادی ماں اور میں ہوں۔ ہم تیسری منزل میں رہتے ہیں۔ آپا کسی زمانے میں خوبصورت تھی اب وہ لٹکی ٹھوڑی کے ساتھ چپ چپ فضا کو تاکتی رہتی ہے۔ دادی ماں کا خیال ہے کہ کسی جن نے انہیں مغلوب کر رکھا ہے۔ جنوں کو بھی شاید ایسی ہی حویلیاں پسند ہیں۔ وہ بھی بیکار لوگوں اور بیکار اشیاء میں رہنا پسند کرتے ہیں۔

دوسری اور زمینی منزل پر دادا ابا کے علاوہ اور کئی ان گنت سواریاں بوریا بستر باندھے چلنے کو تیار بیٹھی ہیں۔ لیکن جانمیں پھکیں' حویلی کی طرح ان سب رفتہ گذشتہ لوگوں کی حیثیت تاریخی ہے۔ ان زنگ کھائی تلواروں سے نہ تو کوئی وار کر سکتا ہے نہ ہی یہ زیبائش کے کام آتی ہے۔۔ خدا کے لئے آپ مجھے بے حس نہ کہیں۔ مجھے ان سنگ میل قسم کے لوگوں سے بڑا پیار ہے۔ جب سے میں نے آنکھ کھولی میں بوڑھے چہروں کے سہارے ہی جی رہی ہوں۔ لیکن اب مجھے کبھی کبھی شبہ ہوتا ہے کہ اچانک کسی رات جب ہوا چلتی ہے اور کالونی کی سفید کوٹھی سے رسولؐ کی سوگند سے لدی آواز حویلی سے ٹکراتی ہے اچانک کسی چوبی صندوق کا ڈھکنا

کھلے گا اور اس میں سے کوئی جن برآمد ہو گا۔ چار ابرو صفا اس جن کو دیکھ کر پہلے مجھے تے آئے گی پھر میں چبوترے پر چڑھ کر چاہ چرخی دار میں جھانکوں گی اور آپا کی طرح قہقہے لگانا شروع کر دوں گی۔

مجھے سخاوت اور فارسی کا تو افسوس نہیں۔

لیکن وہ رونق......... جو شعر و سخن سے وابستہ تھی۔ حکیموں کے دروازے پر ان گنت مریضوں کا ہجوم......... سخاوت کی وجہ سے ضرورت مندوں کا پھیرا ٹورا--- وہ ساری رونق---

وہ......... ساری رونق کہاں گئی؟---

میں آپا سے بیس سال چھوٹی بھی ہوں اور ابھی سوچنے پر مجبور ہوں--- کیا وہ لوگ جو وقت ساتھ بہہ نہیں سکتے تنہا رہ جاتے ہیں؟---

میں نہیں کہتی میرے ہاتھوں میں مہندی لگے پھولوں سے لدی کار حویلی کے سامنے آ کر رکے اور میں حویلی چھوڑ جاؤں--- کراچی......... شارجہ......... ٹیکساس--- لیکن کیا میں اتنی خواہش بھی نہیں کر سکتی کہ اس حویلی سے کسی کا جنازہ اٹھے--- دھوم سے......... حویلی کے تمام کمروں میں لوگ متوحش پھریں' سڑک پار تک بنجر احاطے میں لوگ پوچھنے آئیں' شامیانے لگیں--- کیا ہمارے گھر میں مردہ رونق بھی نہیں لگ سکتی جبکہ امکانات یہیں پر سب سے زیادہ ہیں--- ہر منزل پر تاریخ بیٹھی ہے اور ورق الٹنے نہیں دیتی سنا ہے ہمارے باپ دادا لاہور کے ناظم رہے وائسرائے کی بگھی اسی احاطے میں آ کر رکا کرتی تھی۔ اچھے ناظم تھے! ایک چھوٹا موٹا فنکشن ہمارے گھر میں کبھی نہ ہو پایا!

آپ ضرور کانوں کو ہاتھ لگا کر کہیں گے کہ واہ بھئی اچھا شوق ہے۔ چلیے مرنا تو برحق ہے ناں سماع کی طرح ہی سمجھیے اگر حلال نہیں تو مباح ضرور ہے--- دادی کہا کرتی ہیں سماع کا شوق بھی برا ہے یہ آتش شوق کو بھڑکاتا ہے۔ عشق حقیقی ہو تو قرب الٰہی کا شوق بڑھتا ہے۔ عشق مجازی ہو تو ہوس کی آگ شعلے بن جاتی ہے--- لیکن دادی کا کیا ہے وہ تو دسویں محرم کو تمام رنگین شیشوں والی کھڑکیاں بند کرا دیتی ہیں۔ تاکہ محرم کے جلوس پر نظر نہ پڑ جائے.........

بڑے انفعال کے ساتھ کہوں......... جی چاہتا ہے اپنی حویلی سے کوئی جنازہ دھوم دھام سے نکلے--- کسی اپنے کے جانے کا ڈرامائی رنج ہو--- گلا پھاڑ کر' بال بکھرا کر روئیں--- سامنے والی کالونی میں جب بھی کوئی اس جہاں سے جاتا ہے یوں لگتا ہے کوئی بڑا

ننگن کھڑا ہو گیا........ اب دادی ماں کہتی ہیں کسی کی ریس نہیں کرنی........ اونچی آواز میں
رونا معیوب ہے۔ جانے والے کی روح کو تکلیف ہوتی ہے۔ یہ بھی کوئی بات ہوئی........

آپ کو یاد ہو گا پھوپھی بتول کے شوہر اختر پھوپھا جب دوبئی میں فوت ہوئے
آدھی رات کو پورے پونے دو بجے فون آیا۔ بدقسمتی سے میں دیر سے پہنچی جمشید ماموں نے فون
اٹھا لیا۔ تینوں منزلوں میں یک دم جمشید ماموں ہیرو بن گئے۔ مجھے اپنے آپ پر بہت غصہ آیا۔
خاک میں بیس برس کی تھی۔ اتنا بھی نہ ہوا کہ تیسری گھنٹی تک دوسری منزل میں پہنچ جاتی
بھاگ کر بارہ سنگھے کے نیچے ساگواں کی تپائی پر سے فون اٹھاتی اور پھر سارے کمروں پر دستک دیتی
پھرتی--- پھوپھی بتول کے میاں فوت ہو گئے........ حاضرین!

لیکن مجھ سے پہلے زیرو بلب کی روشنی میں بارہ سنگھے کے نیچے لمبی لٹکویں
مونچھوں والے ماموں سفید اونی ٹوپی پہنے لمبے ازار بند سمیت فون سن رہے تھے۔ دوسری منزل
میں اترنے والی آخری سیڑھی پر ہی میں رک گئی۔

میرا جی چاہا اگلے پچھلے سارے بدلے اپنے آپ سے لوں۔

ماموں جمشید یوں کمرو کمری جانے لگے جیسے کسی فتح کا پیغام ہارے ہوئے جرنیل
کو سنا رہے ہوں "لیجئے ایک افسوس ناک خبر ہے--- کہتے ہوئے زبان بند ہوتی ہے--- لیکن
بتانا پڑے گا پھوپھی بتول کے میاں دوبئی میں فوت ہو گئے--- جنازہ بدھ کے روز عصر اور مغرب
کے درمیان پہنچے گا---"

پوپلی گالوں والی تائی جان تک خبر پہنچی تو انہوں نے سر ہلا ہلا کر پوچھا--- "کیسے
کیسے؟"

"بھائی اختر فرنٹ سیٹ پر تھے........ غلط ہاتھ سے ٹرک آیا۔ سریا لدا تھا۔
فرنٹ کا شیشہ چکنا چور........ سٹیرنگ ڈرائیور کے پیٹ میں کھب گیا۔ بھائی اختر دروازہ کھول کر
نکلنے کو تھے دھڑام گرے پیچھے سے گاڑی آ رہی تھی........"

کتنی بڑی خبر جمشید ماموں کے ہاتھ آ گئی تھی اور یک دم وہ کبڑے چھوٹے سے
جان سے نہیں لگ رہے تھے دادا ابا نچلے صحن میں پیڈسٹل کے سامنے نواڑی چارپائی پر بیٹھے پنکھا
جھل رہے تھے۔

"کیوں کیسے کب؟"---

جمشید ماموں میں نہ جانے کدھر سے توانائی آ گئی تھی۔ ایک ایک تفصیل بڑے مطمئن لہجے میں سنائی۔

"ہاں تو جنازہ؟۔۔۔" ہونکتے ہوئے دادا ابا نے پوچھا۔۔۔

"وہی بدھ کی شام عصراور مغرب کے درمیان کراچی۔۔۔"

ایک ایک کر کے حویلی کے سارے کمرے' غلام گردشیں' صحن روشن ہو گئے۔ آوازیں آنے لگیں لوگ چلنے پھرنے لگے۔ میرا جسم ایک خاص قسم کی امید' توانائی سے بھر گیا۔ ی نے سوچا شاید جنازے پر مجھے بھی کراچی لے جائیں۔ لیکن پھر خیال آیا کہ دادی ماں کہیں گی چلو ہٹو لڑکیوں کا کیا کام' مجھے تو یوں لگتا ہے جیسے لڑکیوں کا دنیا ہی میں کوئی کام نہیں۔ منڈیر سے جھانکو تو پوچھا جاتا ہے کیا دیکھ رہی ہے۔۔۔ کھڑکی سے نگاہ ڈالو تو سوال ہوتا ہے باہر کون ہے؟ دروازے کی درز سے جھانکو تو پوچھتے ہیں تاک جھانک سے مطلب۔۔۔۔۔۔۔۔

صبح جب تک سفید کوٹھی کی طرف سے ہوا نہیں چلی مسلسل یہی خیال رہا لوجی عین ممکن ہے بڑے ساتھ لے چلیں۔ بستی پگڑی والوں کی اولاد مجھے کسی کی نگرانی میں چھوڑنا پسند نہ کریں۔ ایک تو یہی بات یہ ہے ان پرانے دھرانے خاندانوں میں نگرانی کا بہت اعلیٰ معیار ہوتا ہے سب کچھ زیرِ نظر رکھتے ہیں۔ اور پھر بھی وقت ان ہی آنکھوں کے سامنے سب کچھ چرا لیتا ہے۔۔۔

حویلی میں نہ تو اب وہ رونق ہے نہ سخاوت نہ ہی کہیں فارسی نظر آتی ہے۔

بڑی دعائیں مانگیں کہ مجھے جنازے پر کراچی ہی لے چلیں۔ میں نے صبح تو نہیں کیا پر جب بھی کروں گی اسی کے نام ثواب منتقل کروں گی جو ساتھ لے چلے۔ مجھے پھوپھی بتول کے مرے ہوئے شوہر کا چہرہ دیکھنے کی بڑی خواہش تھی۔ ان کو زندگی میں صرف دو بار دیکھا تھا۔ لیکن یہ تیسری بار بڑی اہم تھی۔ ایک بار تو وہ غسل خانے سے کندھے پر تولیہ رکھے نکل رہے تھے اور دوسری بار جب وہ پھوپھی بتول کے ساتھ حویلی آئے تھے۔ پھوپھی بتول ہمارے باقی خاندان والوں کی طرح پتھر کا چہرہ لئے دم سادھے یوں بیٹھی تھیں جیسے خشک دھرتی۔ پاس پھوپھی بتول کے شوہر گھٹنے جوڑے دانت ۔ بیٹھے بیٹھے تھے۔

پھوپھا جی۔۔۔ اور پھوپھی بتول ایک تھے۔

ایک بادام میں دو گریاں' ایک انڈے کی دو زردیاں' ایک شاخ پر جڑواں

پھول' درد ایک کو ہوتا کراہ دوسرے کے منہ سے نکلتی' چوٹ جدھر لگتی عین وہیں دوسرے کے نیل پڑ جاتا' بھوک بتول پھوپھی کو لگتی پر جب تک پھوپھا سیر چشم نہ ہوتے پھوپھی کا پیٹ نہ بھرتا--- دونوں کی محبت میں تیسرے کی ضرورت تو تھی پر گنجائش نہ تھی۔

ان دونوں کو دیکھ کر لگتا ہے کہ جب کوئی بیاہتا مرد عورت دل سے ایک ہو جائیں تو ان کی اداسی اکیلے دل سے بڑھ جاتی ہے---

دل چاہتا تھا کہ اختر پھوپھا کا چہرہ آخری بار دیکھوں......... پھر پھوپھی بتول پر نظر ڈالوں مجھے ایسے لوگوں کو دیکھ کر بڑی ململاہٹ ہوتی ہے جو دوسروں کی خاطر اپنی زندگی ساقط کرنے کا فن جانتے ہیں۔

چاہیے اور نہ چاہیے سے کیا ہوتا ہے جب اماں حیات تھیں تو کہا کرتی تھیں میت کا چہرہ ضرور دیکھنا چاہیے۔ پھر اس کی موت کا یقین آ جاتا ہے سچ بتاؤں مجھے رسم و رواج میں "چاہیے" کی جگہ سمجھ نہیں آتی۔ میں تو اتنا جانتی ہوں کہ میت دیکھ کر بڑا الٹا اثر ہوتا ہے۔ لگتا ہے یا تو مردہ سو رہا ہے یا کوئی ڈرامہ ہے ابھی ٹھاہ کر کے اٹھے گا اور سب کو ڈرا دے گا۔ جب عورتیں چہرے سے چادر سرکا کر دیکھتی ہیں تو مٹی رنگا چہرہ بولتا نہیں بس پڑا سنتا ہے۔

"ہائے کتنا نور ہے چہرے پر---"

"لگتا ہے سو رہے ہیں---"

"کتنی نورانی مسکراہٹ ہے---"

"خود تو سکون میں چلے گئے' پر بچے--- ہائے کمسن یتیم بچے---"

بچوں کا نام سنتے ہی سب کے ہاتھ سے صبر کا دامن چھوٹ جاتا ہے اور ہر کوئی ایک دوسرے کو چپ کرانے میں مشغول۔ عورتیں لپٹا کر محبت سے دلاسے دیتی ہیں۔ شادی اس معاملے میں بڑی خراب چیز ہے سب کو اپنے اپنے لباس اور بالوں کا خیال رہتا ہے۔ ایویں چہرے پاس لا کر بچ بچ کر لیتے ہیں۔ لیکن غم بڑی یونیورسل چیز ہے اس میں سبھی قریب آ جاتے ہیں۔

آپ کو یاد ہو گا جب مرد حضرات منظور صاحب کو سپرد خاک کر کے لوٹے تھے تو پورچ کے نیچے ایک درمیانی عمر کے گرے شلوار قمیص میں ملبوس صاحب نے مجھے لپٹا کے بڑی تسلیاں دی تھیں حالانکہ میں کچھ خاص رو بھی نہیں رہی تھی--- اور کالونی کے منظور صاحب سے حویلی والوں کا ملنا بھی واجبی سا تھا!

لیکن اماں جب تک زندہ رہیں انھوں نے غم کو بھی اسلامی قدروں کے تابع کر رکھا تھا۔ بسنتی پوش پتہ نہیں کہاں کہاں سے قدریں لا کر عام زندگی کو ٹیکہ لگا دیا کرتے تھے۔ اماں تو خاص طور پر اپنی تاریخ میں اس قدر گم تھیں انہیں فقیر عزیزالدین پل بھر کو نہ بھولے۔۔۔ اب فنکشن تو شادی اور مرگ دونوں ٹھیک ہیں۔ لیکن اماں کے جیتے جی ہم دونوں بہنوں کا جنازے پر جانے کا بنتا ہی نہ تھا۔ پھر شادی پر لے جاتیں تو محرم کا لباس پہنا کر۔ انہیں ہر وقت محرم نامحرم کا خیال ستایا کرتا۔ نئی کالونی میں جا کر دیکھ لیں۔ کیا ہلڑ مچا ہوتا ہے مہندی کی رات۔ کون دیکھتا ہے دوپٹہ کھسکا کہ پائنچہ اٹھ گیا۔ دمکتے چہرے' بوتیکوں کے لباس......... لٹک مٹک قہقہے ڈانس......... رونق ہی رونق......... سخاوت ہی سخاوت۔

پتہ نہیں کیوں اماں شرافت کے برقعے کو زندگی کی آبشار سے بہتر سمجھتی تھیں۔ ہمیشہ کہتی رہتیں شادی میں تو اتنا تصنع۔۔۔ فضول خرچی' شوبازی آگئی ہے کہ رشتہ داروں میں یگانگت کا پتہ ہی نہیں چلتا.........

پتہ نہیں اماں کی تربیت کا اثر تھا کہ حویلی میں ائی پرانی چیزوں کا اچانک ہی آپا پر جن آگیا۔ مجھے اب یوں لگتا ہے کہ کسی رات کے پچھلے پہر جب کالونی کی طرف سے ہوا چلے گی۔ پرانے جستی ٹرنک میں سے جس میں زنگ آلود تلواریں مردہ سروں کی ڈابتائیں سینے سے لگائے سوتی ہیں۔ بسنتی رنگ کی پگڑی پہنے کوئی سفید جن نکلے گا اور میرا گلا تن سے کاٹ کر اتنی زور سے ہنسے گا کہ راجہ رنجیت سنگھ کے زمانے کی بنی ہوئی حویلی میں دراڑیں پڑ جائیں گی۔۔۔

آپ سے سچ کہوں فنکشن تو دونوں اچھے شادی بھی اور ہنگامہ رخصتی انسان بھی......... لیکن سچ کہوں مرگ والے گھر میں لطف کے امکانات زیادہ ہوتے ہیں۔ جنازہ دیکھنا' جنازہ اٹھنا......... جمعراتیں منانا' سوئم چالیسواں۔۔۔ ون ڈے میچوں کی طرح ہر دن اکساہٹ سے انگیخت۔۔۔ اجلے اجلے کلف لگے بھینی بھینی بدیسی خوشبوؤں میں رچے بسے دوپٹے' کبوتروں کی طرح نرمی سے سفید چادروں پر پڑتے پاؤں' اجلی انگلیوں میں پھسلتی کھجور کی گٹھلیاں' قرآن پڑھتی دائیں بائیں ٹھٹھکتی آنکھیں' دیگوں کے پکے کھانوں کی خوشبو......... ہر طرف کھسر پھسر۔۔۔ آپ مانیں نہ مانیں غمزدہ چہروں کی محبت جو موت کے وقت نظر آتی ہے وہ شادی کے وقت کہاں۔

آپ ضرور کہیں گے کہ بڑی بے حسی ہے۔

لیکن مجھے اول تو اخبار ملتا نہیں جو کبھی مل جائے تو میں بڑی تفصیلی سے ساری وہ خبریں پڑھتی ہوں جن میں قتل و غارت' گینگ ریپ اور بے دردی سے لوٹنے کا ذکر ہو۔ مجھے تو مردہ سی فلمیں بھی اچھی نہیں لگتیں۔ بس آٹھ دس قتل ہوں۔ کاریں ایک دوسرے کا تعاقب کریں عورتوں کی بے حرمتی کے سین ہوں آپ ناراض نہ ہوں تو آخر Excitement تو ان ہی منظروں میں ہوتی ہے لیکن کیا کروں وی سی آر تایا جی کی الماری میں بند رہتا ہے۔ جب بھی مانگیں پونے گھنٹے کا لیکچر سننا پڑتا ہے کہ آج کل کی فلمیں دیکھ کر لڑکیوں کا کریکٹر خراب ہوتا ہے۔

شادی کا فنکشن اپنی تمام خوشی' رونق رنگ اور خوشبو کے باوجود بڑا tame ہوتا ہے مجھے مرے مرے فنکشن اچھے نہیں لگتے۔ کچھ بچ مچا ہو۔ سلگنے آگ لگانے کا سماں۔ آپ کو یاد ہو گا جب سامنے کالونی میں طہ آپا کی بڈھی اماں فوت ہوئی تھی تو سارے اخباروں میں اس کا چرچا تھا۔ آخر طہ آپا کے میاں فیڈرل منسٹر تھے۔ جب جنازہ میانی صاحب روانہ ہوا تو پون میل لمبی کاروں کی قطار تھی......... پولیس ٹریفک کنٹرول کے لئے حاضر......... جہاں اب مالی کام کرتے ہیں وہاں شامیانے ہی شامیانے۔

لیکن اماں کی تو عادت تھی ہر اچھے میں نقص نکالنا انہوں نے کبھی لائف انجوائے نہیں کی اس لئے دوسروں کا مزہ کرکرا کر دینا ان کا بنیادی فن تھا۔ گھر آتے ہی بولنا شروع ہو گئیں۔ ہمیں بھی خاندانی روایات کا بڑا پاس ہے لیکن اماں کی طرح لمبا سانس لینا ہمارے نزدیک اسراف میں شامل نہیں تھا۔ "اب تو سوگ اس قدر شان و شوکت سے مناتے ہیں......... کہ خوف آتا ہے۔۔۔ یہ بالکل غیر شرعی کام ہیں......... ہمارے خاندان میں تو اونچی آواز میں بھی نہیں روتے تھے۔۔۔"

جب تک آپا پر جن نہیں آیا تھا۔ ہم دونوں اکٹھی بیٹھ کر سوچا کرتی تھیں۔ سارے گھر میں نئے پردے' قالین' فرنیچر لگائیں گی ہم بھی کالونی والوں کی طرح کھلا کھلا رہیں گی جس میں آنا جانا بہت ہو گا سونا بیٹھنا کم ہو گا۔۔۔ لیکن اماں کے ہوتے لوگوں نے ہمیں مرگ پر بھی بلانا ختم کر دیا تھا۔ لوگ چالیسواں کر کرا کے خبر بھیجتے تھے.........

اور اپنے گھر کا یہ حال ہے کہ تین منزلہ حویلی میں بائیس کھانستے' ہونکتے بڑبڑاتے' لوچکتے بڈھے وگرگوں پڑے ہیں۔ تمام کمروں میں کوئی جوان صورت چلتا پھرتا نظر نہیں

آتا....... میرا جی چاہتا ہے کالونی والوں کی طرح ہمارے گھر کی خبر بھی لگے کل سوئم ہے۔۔۔ چالیسویں کا اشتہار آئے۔ ذرا خود ہی سوچئے کن کن ہاتھوں میں اخبار جاتا ہے۔ کیسی کیسی نظر' کیسے کیسے لوگ خبر پڑھتے ہیں۔ کتنا رعب پڑتا ہے۔۔۔ اتنا رعب ساری حویلی سالم کی سالم نہیں ڈال سکتی جو ایک خبر سے پڑ جاتا ہے۔ جب میجر افتخار فوت ہوئے تو گھر والوں نے چالیسویں کی اخباری خبر فوٹو سٹیٹ کرا کے تمام رشتہ داروں میں بانٹی تھی۔۔۔ کسی کو زبانی اطلاع دی ہی نہیں۔۔۔ ویسے بھی کتنا چیپ لگتا ہے خود سب کو بتاتے پھریں۔ میجر صاحب کے گھر والے بڑے منظم اور سٹائل والے لوگ ہیں۔ ان کی کوٹھی کالونی کے شروع میں مسجد کے بالکل پاس ہے۔

ابھی کچھ سال پہلے جہاں گودھے لوٹنیاں لگایا کرتے تھے اب وہاں اتنے خوبصورت باغ میں موتی سی چمکتی میجر صاحب کی کوٹھی ہے۔ میجر صاحب خود تو اللہ کو پیارے ہوئے لیکن ذوق' تنظیم سٹائل گھر والوں کو خوب سکھا گئے۔ جو خط تاریں موصول ہوئیں ایک فائل میں ان کو رکھا گیا۔ فائل کور سیاہ تھا اس پر سفید حروف میں لکھا گیا میجر افتخار کی یاد میں۔ اندر سب سے پہلے پرائم منسٹر کی چھٹی تھی کہ افسوس میں ملکی اہمیت کی مصروفیت کے باعث جنازے میں شریک نہ ہو سکوں گا۔ لیکن جملہ اہل خانہ کے لئے دعاگو ہوں آگے صدر مملکت کی تار تھی پھر فیڈرل گورنمنٹ کے چند منسٹروں کے خط اور پھر سلسلہ وار خطوں کا سلسلہ۔ جب کوئی ان کے گھر پرسا دینے آتا۔ یہ فائل اور جنازے کی تصویریں ضرور دکھائی جاتیں۔

احاطے کے پار کالونی میں جنازے کے دن وڈیو بنانے کا رواج عام ہو گیا ہے لیکن میجر صاحب کی طرح ہر کام منظم طریقے پر انجام دینا ان ہی کے گھر کا خاصہ ہے۔ تایا ابا ان سے ایک وڈیو مانگ کر لائے تھے ہم سب نے بیٹھ کر یہ فلم دیکھی۔۔۔ بائیس کے بائیس بڈھے بڈھیاں خوب روئے میری بھی آنکھیں بھر بھر آئیں اور زندگی کی بے ثباتی کا پتہ چلا۔ مجھے معلوم نہیں کس کا جنازہ تھا۔ لیکن میت کے بڑے دلدوز کلوز اپ تھے۔ رونے والوں کے کلوز اپ۔ جس وقت چیف منسٹر صاحب آئے پہلے کیمرہ ان کے پیروں پر گیا کیسے وہ کار سے اترے ملاقاتیوں سے ملے۔ اتفاقاً" وہ مسکرائے تو کیمرہ کس چابک دستی سے پھرا کر میت کی طرف موڑ دیا گیا۔ جس وقت چیف منسٹر نے میت کا منہ دیکھا جیب سے رومال نکال کر آنکھوں کو لگایا لوگ کیسے دھاڑیں مار کر روئے۔۔۔ خدا جانتا ہے سب سے زیادہ رقت اسی سین نے پیدا کی۔

لیکن چھوڑیئے ہمیں کیا؟

میں تو سوچا کرتی ہوں کیا تبدیل نہ ہونے والے لوگ اسی طرح تنہائی کا شکار ہو جاتے جیسے حویلی والے........ سنا ہے حویلی میں فارسی کے مشاعرے ہوا کرتے تھے دور دور سے شاعر حضرات کئی دن پہلے ہی جمع ہو جاتے یہ بھی گھر والے ہی بتاتے ہیں۔ سخاوت کا یہ عالم تھا کہ اندر باہر مسائل گھسے رہتے گھر والوں کو ان کے مسائل سے ہی چھٹی نہ ملتی کہ اپنی خبر لیتے--- طبیب اس درجہ عاقل و صائب کہ دروازے کے آگے مریضوں کا جمگھٹا رہتا........ لیکن اب' آپے میں رہنا اور نیچی نظر کر کے چلنے کا رواج بھی ختم ہو گیا۔

نہ رونق رہی نہ سخاوت اور پتہ نہیں فارسی کو کیا ہوا؟--- یہ زبان تو ایسے لگتا ہے جیسے کبھی اس حویلی میں بولی ہی نہیں گئی........ میں سوچ بھی نہیں سکتی کہ کبھی انگریزی کا بھی ایسا حال ہو سکتا ہے؟

جب سے آپا پر جن آنے لگا ہے--- ہم نے باہر نکلنا بند کر دیا ہے۔ خواہ مخواہ لوگ الٹے سیدھے سوال کرتے ہیں اور جا و بیجا مشورہ دیتے ہیں۔ پہلے مجھے جنازوں پر جانے کا شوق تھا۔ بدقسمتی سے اب صبح کے وقت کبھی کبھی ایسی دلدوز آواز کالونی کی طرف سے چلتی ہے کہ خبر لینے اور دینے اپنی ذات کو دکھانے اور نمائش کا جو ایک موقعہ میسر تھا وہ بھی جاتا رہا پہلے کہیں مرگ ہو ہونکتی ہانکتی گھر کی بڈھیاں منہ دیکھنے کو چل نکلتی تھیں--- میں بھی کسی نہ کسی کا دم چھلا بن جاتی لیکن اب دل ڈرتا ہے--- خوف آتا ہے۔

آپ کو میں نے بتایا ناں کہ سڑک پار احاطہ ہے جس میں سارا دن بیل دار 'مالی کام کرتے ہیں بالکل حویلی کے سامنے وہ سفید کوٹھی ہے جس کے ستون رومن عمارتوں جیسے ہیں۔ کوٹھی کے آگے بڑا سا کالا گیٹ ہے گیٹ کے آگے کالی کرسی پر چوکیدار بیٹھا رہتا ہے۔

بس آخری بار میں یہیں جنازے کی شرکت میں گئی۔ ہمارے گھر میں کسی کو علم نہ تھا کہ کیا ہوا۔ بس اتنا پتہ چلا کہ قتل ہو گیا---

کون؟--- کس کا قتل!

لیکن انفرمیشن نہ مل سکی۔ دادی نے ریشمی آف وائٹ برقعہ نکالا۔ تائی نے تین گز لمبی بوسکی کی سفید چادر میں اپنا چہرہ جسم چھپایا ہم تینوں کالونی کی سفید کوٹھی میں داخل ہوئیں۔ بڑے بڑے کمروں میں قیمتی فرنیچر دیواروں کے ساتھ لگا کر سفید براق چادریں بچھائی گئی تھیں۔ عورتیں سلیقے سے دوپٹے اوڑھے تیسرا کلمہ پڑھ رہی تھیں۔ غم و اندوہ کے باعث سبھی

چہرے ایک سے تھے کچھ دیر بعد ایک سسکی بھری آواز "او رے محمد بن قاسم ---- بول رے کہاں ہے تو ......... تجھے رسولؐ کی سوگند آ بھی جا ........."

میں ہر عورت کا چہرہ دیکھ کر سوچتی کیا یہ مقتول کی ماں ہے؟

کبھی لگتا جو سیاہ دوپٹہ اوڑھے بار بار اپنی ناک کو پونچھتی ہے وہی ہو گی اس کے گرد بہت عورتیں جمع تھیں اور وہ ہولے ہولے نظریں جھکا کر بیچارگی سے کچھ بتا رہی تھی۔ کبھی محسوس ہوتا وہ بھدی سی عورت جس نے پورے تخت پوش پر کمبل پھیلا کر اپنا منہ سر ڈھانپ رکھا ہے سوگوار ماں ہے۔ کبھی اس پر شک پڑتا جو دونوں پاؤں صوفے پر دھرے بیٹھی تھی اور جسے بار بار لڑکیاں گلوکوز پلانے پر اصرار کر رہی تھیں۔

بڑی دیر بعد میرے پاس والی نوجوان خاتون نے ساتھ والی سے کہا ---- "تو جھگڑا صرف پانچ روپے پر ہوا جھٹ کلاشنکوف نکالی اور شہید کر دیا ----"

"ایک ہی بیٹا تھا ناں ........." کاسنی دوپٹے والی نے سوال کیا۔

"بالکل ایک ......... پتہ ہی نہیں چلا۔ یہاں پھاٹک کے سامنے قتل ہوا ---- چوکیدار کے سامنے ......... شیخ صاحب فیکٹری سے آ رہے تھے ........."

میرے بائیں جانب بیٹھی عورت نے بڑی بڑی آنکھیں گھما کر کہا ---- "سنا ہے ماں غم سے دیوانی ہو گئی ہے کہتی ہے شیخ صاحب آپ جنازے پر کوڑی نہ لگائیں۔ بس انصاف دلا دیں ---- ایف آئی آر کٹا دیں ......... کاسنی دوپٹے والی بھنبھنائی ---- "ایسا جنازہ تو کوئی اپنوں کا نہیں کرتا۔ سنا ہے رات پریس کے لوگ بھی آئے تھے۔ باہر شامیانے دیکھے ہیں آپ نے بڑے نیک لوگ ہیں۔ ذرا دریغ نہیں کیا ---- نیک لوگوں کی کمی نہیں ---- ابھی بھی ........."

"پھر بھی پیچھا کرنا تھا قاتل کا ---- ایف آئی آر کٹانی تھی ......... چوکیدار نے بندوق کیوں نہ چلائی؟"

"او جی کیا فرق پڑتا ہے۔ قاتل کا پیچھا کرتے شیخ صاحب اس کے پاس تو کلاشنکوف تھی ......... انصاف کبھی ملتا ہے جو ایف آئی آر کٹاتے ......... ایسے وقت ضائع کرتے ........."

"پھر بھی قانون کا دروازہ کھٹکھٹانا چاہیے ........."

"چھوڑیں جی قانون کو ......... بات کریں شیخ صاحب کے گھرانے کی ......... کیا

نیک لوگ ہیں ایک ملازمہ کے غم میں ایسے شریک ہوئے ہیں۔ واہ وا........ واہ وا--- سنا ہے
اس جمعہ کو خاص مضمون نکل رہا ہے شیخ صاحب پر--- تصویریں بنا کر لے گئے ہیں شیخ صاحب
کی....... جرنلسٹ لڑکی بتا رہی تھی انٹرویو بھی کر گئی ہے گھر والوں کا.........."

جب ہم لوگ واپس لوٹے تو باہر والے برآمدے میں صوفے کے پیچھے بیبیوں کی
جوتیوں کے پاس رسولن پڑی تھی اس کا چہرہ سوچ کی سرحدوں سے دور نکل گیا تھا۔ کھانا پکانے
والی رسولن کے پاس صفائی والی مارتھا گم سم بیٹھی آتی جاتی بیبیوں کو دیکھ رہی تھی۔

کسی افسوس کرنے والی عورت کو معلوم نہ تھا کہ بیٹے کی جدائی میں دلدوز آواز
نکالنے والی رسولن اور اس کا بیٹا کون تھے؟ جب ہم اس کے پاس سے گذرے اس وقت رسولن
نے دونوں ہاتھ اٹھا کر کہا۔

"محمد بن قاسم او رے کہاں ہے تو--- تجھے رسولؐ کی سوگند......... میرے بیٹے
کو آکر انصاف دلا........."

نہ تو دادی نے ادھر دیکھا نہ تائی جی نے سب شیخ صاحب کے گھرانے سے
مرعوب ان کی نیکی کی باتیں کرتے باہر نکل آئیں--- میرے دل میں خیال آیا--- کیا کسی
مرحلے پر........ کسی عہد میں بسنتی پگڑیاں پہننے والے، ہاتھ بھر کھنکتے سکے بانٹنے والے نیک لوگ
بھی انصاف دلانا بھول گئے تھے؟ کیا انصاف کا گہرا تعلق زوال سے ہے---؟

جمشید ماموں پڑھ پتھر ہیں۔ ان کے کتب خانے میں علم دین کی ایسی نادر کتابیں
فارسی میں موجود ہیں جنہیں چھونے پر کاغذ ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتا ہے ایسے ایسے دینی رسائل اور
ان میں اس قدر گنجلک مسائل ہیں کہ آدمی کی عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ ایک بار جمشید ماموں نے
مجھے بہ اصرار ایک دینی رسالہ پڑھنے کو دیا تھا۔ اس میں لکھا تھا کہ عیسائیت کی اساس محبت ہے۔
اور اسلام کی بنیاد انصاف........ پہلے تو اللہ نے چاہا کہ بنی نوع انسان ایک دوسرے سے محبت
کریں کالے گورے کا امتیاز نہ پالے اور امیر غریب کا تفرقہ نہ ڈالے لیکن پھر اللہ نے انسان کی
جبلی حالت دیکھ کر دین کو آسان کر دیا۔ محبت انسان خود بخود اختیار کرنے کا اہل نہ تھا۔ بڑی بڑی
محبتوں میں بھی کہیں نہ کہیں نفرت کپا لگائے بیٹھی رہتی ہے--- اسی لئے اس نے بنی نوع انسان
کے لئے آسانی پیدا کر دی کہ بھائی چلو تم میں اس قدر صلاحیت نہیں کہ پڑوسی سے محبت
کرو........ کالے کو گورے برابر چاہو تو اب انصاف کرنا........ اور انسانی لین دین میں

معاملات دنیا میں انصاف کو زندگی کا زاویہ قائمہ بنانا......... ہو سکتا ہے کہ میں ہی غلط سمجھی......... عین ممکن ہے کہ دین کی اساس کچھ اور ہو......... پر اس رسالے سے یہی پتہ چلا کہ جنگ میں دشمنی سے انصاف کرنے والا فاتحہ زوال سے آشنا نہیں ہوتا۔ بیویوں میں انصاف سے رہنے والے کو کسی بیوی کی محبت نصیب ہو یا نہ ہو اس کی ذات میں شکستگی نہیں آتی.........

چھوڑیئے سرپہ تو مسئلے مسائل ہیں۔ ان کا حل میرے پاس کہاں؟

میں تو بس اس آواز سے ڈرتی ہوں۔ بچ مانیں جب پچھلے پہر رات کو نئی کالونی کی جانب سے ہوا چلتی ہے احاطے کو پار کر کے حویلی کی تیسری منزل کے رنگین شیشوں پر دستک دیتی ہے تو میرا دل ہول کھانے لگتا ہے......... میں چپکے سے پلنگ چھوڑتی ہوں۔ تینوں منزلوں میں چوبی صندوق' یخ دان' کشمیری صندوقچے پڑے ہیں۔ ان میں چار پانچ پشتوں سے تلواریں' دو شالے' چاندی کے ظرف' پاندان' بندوقیں' زیبائش اور آرائش کی ان گنت انمول چیزیں بند ہیں.........

کبھی کبھی۔

اچانک۔

مجھے لگتا ہے کوئی چوبی ٹرنک کھلے گا اس میں بسنتی ٹوپ اور زرد جینز پہنے کوئی جن برآمد ہو کر مجھ سے فرفر انگریزی بولنے لگے گا......... اور میں اس کی بات نہ سمجھتے ہوئے بھی خوشی سے قہقہے لگانے لگوں گی.........

○

# پھٹی پرانی ٹیلیفون ڈائری

---

حمید اختر

بادل ایک بار پھر زور سے گرجا' تیز طوفانی ہواؤں کے شور میں کچھ سنائی
نہیں دیتا تھا۔ بڑے میاں نے بیوی پر ایک اچٹتی ہوئی نگاہ ڈالی جو سات آٹھ روز سے سانس
کی جان لیوا [illegible] کی وجہ سے مردہ چوہیا کی طرح بے حال پڑی تھی مگر آج سر شام طبیعت
سنبھلنے کے بعد اٹھ کر بیٹھتے ہی میاں پر بری طرح برس پڑی تھی کیونکہ اس کے خیال سے
مطابق میاں نے جوتوں سے قالین داغ دار کر دیا تھا' قالین پر نشان ان کے جوتوں کے نہیں
تھے مگر بڑی بی' برسوں سے گھر میں ہونے والی ہر خرابی کی ذمہ داری انہیں پر ڈالنے کی عادی
ہو گئی تھی۔ بڑے میاں کو بیوی کا یہ بے وقت چنگھاڑنا اچھا نہیں لگا اور وہ حسب معمول جوا
جلے کی تیاری کر رہے تھے کہ اچانک بڑی بی کے اچھا ہونے کے خیال سے انہیں اطمینان
محسوس ہوا' ہفتے بھر کی بیماری اور خاموشی کے بعد بڑھیا کی بک بک یقیناً یہ ظاہر کر رہی تھی
بیماری کا زور کم ہو گیا ہے اور وہ معمول کی حالت میں واپس آ گئی ہے اس لئے فکر کی کو
بات نہیں۔

طمانیت کے اس احساس سے سرشار وہ اپنے کمرے کی طرف جا رہے
کہ ان کی چھوٹی بہو نے ٹیلیفون کی پھٹی پرانی اور خستہ حال ڈائری ان کے ہاتھ میں تھما
ہوئے بڑے گستاخانہ لہجے میں کہا "ابا جی! کتنی بار آپ سے کہا ہے اس میں سے پرانے اور
ضروری نمبر کاٹ دیجئے۔ یہ تیس برس پرانی ڈائری تو اب جان کا روگ بن گئی ہے۔ کوئی

ملتا بھی ہے تو پڑھا نہیں جاتا۔ ورق پھٹ گئے ہیں، نمبر تبدیل ہو گئے ہیں، یا جن کے نمبر ہیں وہ اب اس دنیا ہی میں نہیں ہیں مگر آپ ان غیر ضروری نمبروں کو کاٹتے ہی نہیں۔ آج تو یہ کام کر ہی دیجیے تاکہ کل ضروری نمبروں کو نئی ڈائری میں اتارا جا سکے۔

بڑے میاں کو بہو کا لہجہ بہت برا لگا، پھر انہوں نے سوچا کیا واقعی وہ گستاخی کا مظاہرہ کر رہی ہے یا اب انہیں ہر شخص کے بارے میں ایسی باتیں سوچنے کی عادت ہو گئی ہے، پھر انہوں نے ڈائری پر ایک نظر ڈالی۔ پرانے نمبر انہیں کے ملنے والوں کے تھے، اب اس میں ان کے بیٹوں بیٹیوں پوتوں اور نواسوں کے ملنے والوں اور ملنے والیوں کے بے شمار نئے نمبر لکھے جا چکے تھے۔ ایک ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے انہوں نے دل ہی دل میں کہا "ڈائریاں اور کتابیں اور گھریلو سازوسامان ہی نہیں خود انسانیت بھی وقت کے ساتھ ساتھ پرانے اور ازکار رفتہ ہو جاتے ہیں۔ ان کا یہ احساس نیا نہیں تھا بلکہ پچھلے کئی برس سے وہ اس قسم کی سوچوں کے بوجھ تلے دبے جا رہے تھے، رواں صدی کے دوسرے عشرے میں شروع ہونے والا ان کا یہ سفر ختم ہونے ہی میں نہیں آتا تھا، قدم قدم پر انہیں محسوس ہوتا تھا کہ دنیا کو، اہل خانہ کو، حتیٰ کہ ان کی ہم سفر کو بھی اب ان کی ضرورت نہیں ہے، ان کے پاس اب کچھ نہیں تھا، وہ زندگی بھر نیکیاں کماتے اور گذارہ کرتے رہے، کبھی کبھی وہ سوچتے کہ مال و دولت جمع کر لیتے تو شاید گھر اور باہر والوں کا رویہ کچھ مختلف ہوتا، اب کوئی ان کا دست نگر نہیں تھا وہ سب کے دست نگر تھے، وہ کچھ کر بھی نہیں رہے تھے، پڑھ ہی نہیں سکتے تھے، نظر کمزور ہونے کی وجہ سے اخبار اور کتب بینی کا عمر بھر کا مشغلہ بھی باقی نہیں رہا تھا، بس وہ بے کار دن بھر گھر کے کمروں میں گھومتے رہتے، کبھی ان کے بیٹے بیٹیاں ان کی اس بے جا مداخلت پر ناپسندیدگی کا اظہار کرتے ہوئے نظر آتے تو کبھی گھر کے چھوٹے بچے ان کی روک ٹوک پر بیزاری کا اظہار کرتے دکھائی دیتے۔ بڑے میاں بہت کوشش کرتے کہ وہ ان سے الگ تھلگ رہیں اور کسی کو شکایت کا موقع نہ دیں۔ وہ اپنی زندگی گزار چکے ہیں۔ اصولاً وہ دوسروں کو اپنی مرضی کے مطابق زندہ رہنے اور زندگی بسر کرنے کا حق دیتے تھے مگر جب تک زندگی باقی ہے اور سانس کی ڈوری چلتی ہے، کوئی بھی شخص اپنے اردگرد کی دنیا سے کیسے علیحدہ رہ سکتا ہے؟

ٹیلیفون کی چھوٹی پرانی ڈائری ہاتھ میں لئے وہ اپنے کمرے میں داخل ہوئے

تو انہیں ایک دم گھبراہٹ کا احساس ہوا۔ ان کا بستر پلنگ پر ایک طرف سے کھسک کر دوسری طرف سے نیچے لٹک رہا تھا' دوہرے کئے ہوئے تکئے کا میلا غلاف ان کا منہ چڑا رہا تھا' میز پر تین دن کے اخبارات بکھرے پڑے تھے' وہ ڈائری کے اوراق الٹ پلٹ کرتے ہوئے اپنے پلنگ پر بیٹھے تو یکایک یادوں کے ان گنت چراغ ان کے ذہن میں روشن ہو گئے۔ ایسے ہی ایک کمرے میں برسوں پہلے ان کی بڑی بی دلہن بن کر آئی تھی تو ان کی زندگی کے روز و شب کیسے تبدیل ہو گئے تھے۔ انہوں نے حساب لگایا تو پتہ چلا یہ کم و بیش نصف صدی پہلے کی بات تھی۔ پھر وہ اپنی ازدواجی زندگی کے ابتدائی برسوں کو یاد کرتے رہے جب وہ اکثر سوچتے تھے یہ کیسا رشتہ ہے جو دو اجنبیوں کو اس طرح جوڑ دیتا ہے کہ وہ یک جان نظر آتے ہیں۔ ایک ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے انہوں نے ذرا بلند آواز سے کہا "آہ وہ سنہری دن کہاں چلے گئے" ان کی آواز باہر کے طوفان اور سمندر کی شوریدہ لہروں کی ہیبت ناک آوازوں میں دب گئی اور خود ان کو بھی پوری طرح سنائی نہیں دی۔ ان کا یہ مکان ساحل سمندر سے کچھ ہی فاصلے پر تھا۔ تقریباً تیس برس پہلے جب وہ اس شہر میں بیوی اور تین چھوٹے بچوں کو لے کر آئے تھے پرشور ساحلی ہوائیں اور بحر بیکراں سے اٹھتی ہوئی لہروں کی آوازیں ان کی زندگی کا حصہ بن چکی تھیں مگر آج کی رات عجیب قسم کی طوفانی رات تھی۔ ہوا سنسناتی ہوئی گذر رہی تھی۔ کمرے کی کھڑکیوں کے پٹ بند ہونے کے باوجود ہل رہے تھے۔ بڑھتے ہوئے طوفان اور لہروں کی شوریدہ سری نے بڑے میاں کو کچھ اور پریشان' کچھ اور مغموم کر دیا۔ باہر سے آنے والی طوفانی لہروں کی یہ آوازیں جو ہمیشہ ان کے خون کی گردش کو تیز کر دیتی تھیں اور وہ زندگی کے حسن و جمال کے اسیر دکھائی دینے لگتے تھے آج جیسے کوئی غمگین نوحہ الاپ رہی تھیں۔ ان کا دل بیٹھ گیا۔ انہوں نے کمرے میں پھیلی ہوئی چیزوں پر ایک دفعہ پھر نظر ڈالتے ہوئے ایک ٹھنڈی آہ بھری۔ یہ کمرہ' یہ گھر کیسا خوبصورت' صاف ستھرا اور زندگی سے معمور تھا' ہر چیز قرینے سے اپنی جگہ رکھی رہتی تھی' پھر انہوں نے بڑی بی کی وہ شبیہہ ذہن کے گوشوں سے نکالنے کی کوشش کی جو اس وقت نظر آتی تھی جب وہ نئی نویلی دلہن بن کر ان کے گھر میں آئی تھی' اس ذہنی ہیولے کو تصور میں لا کر وہ مسکرائے۔ ان دنوں زندگی کتنی حسین' دلکش' متحرک اور آرام دہ تھی۔ گراں بارئی ایام کا وہ حال نہ تھا جس سے اب وہ برسوں سے دوچار

تھے' یہ گھر اس کا آنگن' کمرے' دیوار و در سبھی کچھ اس میں رہنے والوں سے بھرا رہتا تھا۔ جب ان کے ہاں پہلا بچہ پیدا ہوا تو یہ ان کے لیے ایک نیا' انوکھا اور خوبصورت تجربہ تھا۔ اس بچے میں گویا ان کی جان تھی۔ دن بھر کے کام کاج اور مشقت کے بعد وہ گھر میں داخل ہوتے تو گویا ان کی نس نس سے زندگی پہاڑی چشموں کی طرح پھوٹ پڑتی' پھر انہوں نے اپنے اس بڑے بچے کے بارے میں سوچا۔ اب وہ برسوں سے ان سے دور کسی دوسرے ملک کا شہری بن چکا تھا' وہ یہاں کی اکتائی ہوئی زندگی سے بھاگ کر روشنیوں کی دنیا میں جا بسا تھا' کبھی سال چھ ماہ بعد اس کا رسمی سا خط آ جاتا۔ وہ اپنے بیوی بچوں اور نئی دنیا کے سحر میں مگن تھا۔ اس کے بچپن کی باتوں اور چھوٹی چھوٹی حرکتوں کو یاد کرتے ہوئے بڑے میاں کا دل بھر آیا۔ یہ بچے بڑے کیوں ہو جاتے ہیں' انہوں نے سوچا' یہ سوچتے سوچتے ان کے چشمے کے شیشے دھندلا گئے۔ عینک اتار کر انہوں نے شیشے صاف کئے اور عینک میز پر رکھ دی۔ انہیں عینک کے ساتھ یا بغیر عینک کے کچھ بھی صاف دکھائی نہیں دیتا تھا۔ اب بھی انہیں کچھ صاف نظر نہیں آ رہا تھا' پھر وہ انہی دنوں کی یادوں میں گم ہو گئے' شادی کے آٹھ دس برس میں ان کے بچوں کی تعداد درجن ہو گئی۔ یہ سوچ کر وہ ایک دفعہ پھر مسکرائے اور سوچتے رہے کہ شاید خاندانی منصوبہ بندی کی باتیں نہیں ہوتی تھیں' زمین بہت تھی اور ابن آدم کا پھیلاؤ اتنا نہیں بڑھا تھا کہ ہوائیں مسموم اور سانسیں رکی ہوئی محسوس ہوتیں۔ بچے انسانی تخلیق کا شاہکار اور زندگی کا جوہر قرار دیے جاتے تھے۔ انہوں نے اپنے تمام بچوں کی بچپن کی چھوٹی چھوٹی معصوم حرکتوں کو یاد کیا۔ غنودگی اور باہر کی بڑھتی ہوئی طوفانی ہواؤں کے شور میں وہ سارے ایک ایک کر کے ان کے سامنے آتے رہے۔ بڑے میاں جاگ رہے تھے نہ سو رہے تھے' ایک عجیب سے احساس نے انہیں اپنے حصار میں لے لیا۔ وہ خواب اور حقیقت' زندگی اور موت کے درمیان کہیں معلق تھے اور پر شور سمندری لہروں کی گونج اور تھپیڑے مارتی ہوئی طوفانی ہواؤں کی غضبناک آوازوں کے درمیان اپنے بچوں کی پوری زندگی اور ان کے بچپن کی بازیافت کر رہے تھے' بہت دیر تک وہ اسی کیفیت میں رہے اور انہیں اس کے سوا کچھ یاد نہ رہا۔

اس کیفیت سے نکلنے کے تھوڑی دیر بعد وہ اٹھ کر بیٹھے تو ٹیلیفون کی وہ پرانی ڈائری جو ان کی بہو نے انہیں تھمائی تھی ابھی تک ان کے ہاتھ میں تھی' عینک تلاش کر

کے آنکھوں پر جمانے کے بعد انھوں نے سوچا "آج بھولی شکایت کا نتیجہ نہ کچھ کرنا ہی پڑا۔ بہت غصے میں تھی' واقعی اس ڈائری میں سے پرانے اور غیر ضروری نمبر نکال ہی دینے چاہئیں" پھر انھوں نے ڈائری کو غور سے دیکھا۔ اس کا ابتدائی حصہ غائب تھا۔ جلد کے ایک طرف کا گتہ موجود نہیں تھا۔ دوسری طرف کا موجود تو تھا مگر ڈائری سے الگ ہو چکا تھا۔ ورق گردانی کی تو بڑے میاں کو پتہ چلا بہت سے ورق پھٹ چکے ہیں۔ اکثر حروف اور اعداد کی سیاہی اتنی مدھم پڑ چکی تھی کہ نام اور نمبر پڑھے نہیں جاتے تھے' کئی صفحات کے کونے بوسیدہ ہو کر معدوم ہو چکے تھے اور اکثر صفحات پر تحریر داغ دھبوں کے نیچے دب کر غائب ہو گئی تھی۔

بڑے میاں نے عینک ناک پر مضبوطی سے جمائی مگر کچھ عرصے سے انھیں عینک کے باوجود پڑھنے میں دشواری محسوس ہو رہی تھی' کافی کوشش کے بعد اپنے سامنے ڈائری کے پھیلے ہوئے صفحے پر انھیں جو دوسرا نام نظر آیا' اسے پڑھتے ہوئے انھیں اپنا وجود پگھلتا ہوا محسوس ہوا۔ قلم جو انھوں نے پرانے' غیر ضروری اور بے کار نمبر کاٹنے کے لئے ہاتھ میں پکڑ رکھا تھا' نیچے کر لیا۔ باہر بجلی بڑے زور سے چمکی اور مرے کی چھت اور کھڑکیوں کے چھجوں پر تیز بارش گرنے کی آوازیں آنا شروع ہو گئیں۔ سمندر کی بپھری ہوئی لہروں کی آوازیں بارش کی بوچھاڑ سے بلند ہونے والی صداؤں میں دور ہوتی گئیں۔ ہوا کی سائیں سائیں پہلے سے بڑھ گئی۔ بڑے میاں ان آوازوں کے درمیان بت کی طرح ساکت بیٹھے سامنے پھیلے ہوئے ڈائری کے صفحے پر دیر تک ایک نام کو دیکھتے اور اس پر نظریں جمائے رہے۔

یہ قیامت کا ایک لمحہ تھا جس میں وہ وقت اور مقام کی قید سے آزاد ہو گئے۔ خواب اور حقیقت زندگی اور موت اور ہونے نہ ہونے کے درمیان کہیں وہ اپنے اس دوست کی صحبت میں بیٹھے تھے جسے ان سے جدا ہوئے پندرہ بیس برس گزر چکے تھے مگر انھیں اس کا احساس ہی نہیں ہوا تھا۔ وہ تو ہمیشہ ان کے ساتھ ان کے آس پاس رہا تھا اور جس کے نام اور فون نمبر پر خط کھینچنے کے خیال ہی سے قلم ان کے ہاتھ سے گر گیا۔ وہ جاگ رہے تھے یا سو رہے تھے' زندہ تھے یا مردہ' بے ہوشی میں تھے یا ہوش و خرد کی سرحدوں کو پار کر چکے تھے انھیں کچھ پتہ ہی نہیں چلا وہ تو یہ دیکھ رہے تھے کہ ان کا پرانا دوست میاں نصیر جس سے برسوں ان کا یارانہ رہا اسی طرح ان کے سامنے بیٹھا تھا' ویسی ہی دل لبھانے والی باتیں کر رہا

تھا۔ بڑے میاں بھی اس سے اسی طرح ہمکلام تھے جیسے عام طور پر بہت بے تکلف دوست کچھ وقفے کے بعد ملنے کی صورت میں ہمکلام ہوتے ہیں۔ انہوں نے گذرے ہوئے دنوں کو یاد کیا پرانی محبوباؤں کے حسن جہاں سوز اور جمال آفریں اداؤں کی جھلکیاں دیکھیں اور ان چمکدار سنہری دنوں کی یادوں میں کھو گئے جب وہ ایک دوسرے کے بغیر ایک دن بھی نہیں رہ سکتے تھے' میاں نصیر ہمیشہ سے زندہ دلی اور خوش نصیبی کا مرقع تھا' وہ کچھ ایسا حسین تو نہیں تھا لیکن قسمت اور عورتیں ہمیشہ اس پر مہربان رہیں۔ ان کے دیکھتے دیکھتے وہ شہر کی مجلسی زندگی کا ستون بن گیا تھا۔ اس کی قیام گاہ دوستوں کی محفلوں اور بزم آرائیوں سے ہمیشہ آراستہ رہتی تھی۔ اس کے ہاں ہر قسم کے لوگ آتے تھے اور اس کے بلند آہنگ قہقہوں سے لطف اندوز ہوتے اور اس کے وسیع دسترخوان کی خوشہ چینی کرنے میں لگے رہتے۔

بڑے میاں اسے پیار بھری نظروں سے دیکھ رہے تھے' اچانک میاں نصیر ایک آنکھ بند کر کے بولا "ادھر بھی کبھی گئے ہو یا نہیں؟" پھر اس نے بڑے میاں کا بازو پکڑ کے انہیں اٹھایا اور بولا "چلو چلتے ہیں" انہیں یہ اشارہ سمجھنے میں کوئی دقت نہیں ہوئی۔ سازو آواز کی جن محفلوں میں اس زمانے کے شرفا جس علاقے میں جاتے تھے یہ دونوں بھی کبھی کبھی وہاں جاتے تھے' انہی دنوں اچانک زرینہ بڑے میاں پر عاشق ہو گئی۔ یہ سلسلہ کتنے دنوں چلا۔ کب ٹوٹا انہیں کچھ یاد نہیں تھا لیکن اس وقت وہ یہ سلسلہ ٹوٹنے یا قائم ہونے کے خیال سے ماورا اپنے عالم میں کشاں کشاں اس کوچے کی طرف رواں تھے' وہاں سب کچھ ویسا ہی تھا' سازندے' موتئے کے پھول' طبلے کی تھاپ' گھنگروؤں کی شیریں آوازیں' وہی بت طناز ویسے ہی ان دونوں کو خوش آمدید کہہ رہا تھا۔ بڑے میاں اسی عالم میں دیر تک اپنے دوست کے ہمراہ موسیقی کی لہروں پر سر دھنتے اور سوچتے رہے کہ بعض عورتیں کس طرح انسان کے اعصاب پر سوار ہو جاتی ہیں' وہ جب سامنے آتی ہیں تو پھر دنیا میں اور کچھ نہیں رہتا' وہی سب کچھ ہوتی ہیں' ارض و سما کوہ و دریا اور پورا کرہ ارض ان کے قدموں میں پڑا نظر آتا ہے۔ زرینہ بھی ایسی ہی عورت تھی' وہ اس کی عشوہ طرازیوں اور جمال آرائیوں سے معلوم نہیں کتنی دیر تک محظوظ ہوتے رہے کہ اچانک بادل کی گڑگڑاہٹ نے انہیں واپس اپنے کمرے میں پہنچا دیا۔ وہ کافی دیر تک اس سارے تجربے اور موجود حقیقتوں کے بارے میں سوچتے رہے پھر وہ اٹھ کر

بیٹھ گئے۔ انہیں یہ کام تو کرنا ہی تھا۔ آج ہی ڈائری سے پرانے اور غیر ضروری نام اور نمبر کاٹنے تھے۔

بڑے میاں نے قلم اٹھایا۔ ڈائری کا صفحہ پلٹا۔ دو تین نام تو ضروری اور موزوں نظر آئے لیکن ایک نام پر ان کی نگاہ جمی تو جمی کی جمی رہ گئی۔ یہ ان کے مرحوم شاعر دوست کا نام تھا۔ وہ بھی برسوں پہلے انہیں چھوڑ کر عدم آباد سدھار گیا تھا لیکن وہ گیا کہاں تھا۔ وہ تو آج بھی ان کی نس نس میں آباد اور ان کے لہو میں شامل تھا۔ اس کے نام کے حروف بڑے میاں کے سامنے گڈمڈ ہو گئے اور فون نمبر کے اعداد اس طرح ناچنے لگے کہ ان میں سے گیتوں کی لے پھوٹ کر بہنے لگی' انقلاب کا پیاسا یا پیادہ زندگی کے کریہ پالحات سے عمر بھر لڑتا ہوا ایک دن خاموشی سے خاک کا رزق بن گیا۔ بڑے میاں کو جیسے اس کے قدموں کی چاپ سنائی دی' اس کے نغموں کی گونج اور اس کی ذاتی محرومیوں کی کسک محسوس کی۔ وہ کہیں ان کے آس پاس ہی تھا اور ان کو بہتر دنیا کے خواب دکھا رہا تھا۔ وہ پھر وقت اور مقام کی قید سے آزاد ہو گئے اور سر جھکائے بیٹھے اس سے باتیں کر رہے تھے' شاعر انہیں اپنی نظم سنا رہا تھا اسی لے میں جس کے وہ ہمیشہ سے عادی تھے۔ یہ نظم امن اور محبت کا پیغام بھی تھی اور نفرت کی آگ میں بجھی ہوئی بھی' محبت اس دنیا کے عام معصوم لوگوں اور محنت کشوں سے' نفرت غاصبوں جابروں اور استحصال کرنے والوں سے' مگر بڑے میاں اسے اپنا گھر بنانے اور اپنی زندگی سنوارنے کی تلقین کر رہے تھے مگر شاعر کو تو اپنی خبر ہی نہیں تھی۔ وہ تو خلق خدا کی محرومیوں پر آنسو بہا رہا تھا' وہ سب کے لئے انصاف' چھوٹا سا گھر اور محبتیں مانگ رہا تھا لیکن اس کی آوازیں' نغمے اور گیت سبھی صدا بصحرا ثابت ہوتے رہے مگر وہ تو نیکی شرافت انسانیت اور محبت کا پیامبر تھا جو آخری سانس تک بدی کی قوتوں سے جنگ کرتا رہا اس سے ہم کلام ہونے کی کوشش میں قلم بڑے میاں کے ہاتھ سے گر گیا اور وہ غنودگی کی لپیٹ میں آ گئے۔

کافی دیر تک سکتے کے عالم میں رہنے کے بعد وہ اٹھے ڈائری اسی طرح ان کے سامنے پھیلی ہوئی تھی' اگلے صفحے پر بہت سے نام اور نمبر مٹ چکے تھے مگر جو چند نام پڑھے جا سکتے تھے ان میں سے ایک نام پر بڑے میاں کی نگاہ جم گئی۔ نگہت کا نام انہوں نے ڈائری میں اس طرح لکھا تھا کہ اسے صرف وہی پڑھ سکتے تھے' یہ نام شاید واقعی انہوں نے

تیس برس پہلے لکھا تھا۔ انہیں بالکل یاد نہیں تھا کہ انہیں پہلے پہل وہ کہاں ملی تھی لیکن اس کے بارے میں سوچتے ہوئے ان کے خون کی گردش ایک دم تیز ہو گئی۔ پھر انہوں نے حساب کتاب کر کے سوچا کہ دس بارہ برس سے اس کا کوئی پتہ نہیں تھا۔ آخری بار وہ انہیں اس وقت ملی تھی جب وہ ملک سے باہر جا رہی تھی اور نہیں جانتی تھی کب واپس آئیگی۔ نکہت عجیب و غریب قسم کی عورت تھی۔ وہ بڑے میاں کی ڈھلتی ہوئی جوانی کے دور میں بڑی کوشش سے ان کی زندگی میں داخل ہوئی تھی اور اب ان کے سامنے بیٹھی ہوئی اسی طرح شکوہ و شکایت کر رہی تھی جس طرح پہلی ملاقات پر کر چکی تھی۔ اسے گلہ تھا کہ انہوں نے اس کی طرف اتنی دیر سے توجہ کیوں دی حالانکہ ایک مدت تک کسی کلب' ریسٹوران یا محفلوں میں وہ آمنے سامنے ہوتے رہے' آس پاس رہے اور نکہت انہیں متوجہ کرنے کی کوشش بھی کرتی رہی مگر انہیں اس کا پتہ بہت دنوں بعد چلا حالانکہ نکہت ایسی عورت تھی جس کے جسم کا ہر حصہ بولتا تھا۔ اسے نظر انداز کرنا ممکن ہی نہیں تھا' جب ان کی پہلی بے تکلفانہ ملاقات ہوئی تو نکہت نے ہاتھوں' آنکھوں اور اشاروں سے اس بے رخی پر سخت غم و غصے کا اظہار کیا تھا اب بھی وہ ان کے سامنے بیٹھی گلے شکوے کر رہی تھی۔ وہ اپنی مترنم' شیریں اور رس میں گھلی ہوئی آواز میں اس بے رخی کی وجہ پوچھ رہی تھی جس کا ارتکاب ان سے ان جانے میں ہوا تھا یہ واقعہ اگرچہ ڈائری میں اس کا نام اور نمبر لکھنے سے بھی برسوں پہلے پیش آیا تھا مگر وہ آج بھی بڑی خفت محسوس کر رہے تھے۔ بڑے میاں نے آنکھیں بند کر کے نکہت کی خود سپردگی اور جنوں خیزی کے بارے میں سوچا تو ان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی' تکئے پر سر رکھا تو آہستہ آہستہ ان پر غنودگی طاری ہو گئی۔ پھر انہیں کچھ یاد نہ رہا وہ کہاں ہیں اور کیا سوچ رہے ہیں البتہ نکہت اسی بانکپن سے ان کے سامنے بیٹھی تھی۔ انہیں ایسا لگا کہ ان کا کمرہ اور ان کا جسم اور ان کی زندگی پھر سے مہک اٹھی ہے اور ہر طرف خوشبو ہی خوشبو ہے۔ جوان بدن کی خوشبو' سانس کی مہکار اور نسوانی لباس کی سرسراہٹ ان کے رگ و پے میں سرایت کرنے لگی۔ کتنے ہی دن اور کتنی ہی راتیں انہوں نے اس کی معیت میں گذار دی تھیں۔ وہ ایسی عورت تھی جسے چھوڑا نہیں جا سکتا جو انسان کے سارے دکھ' ساری پریشانیاں اور کمزوریاں دور کر دیتی ہے۔ جس کے سہارے کا عادی انسان بے دست و پا ہو کر رہ جاتا ہے۔ وہ اپنے سوا

کچھ یاد نہیں رہنے دیتی' مدتوں بعد آج وہ پھر اس کی حفاظت کے حصار میں تھے۔ وہ واحد عورت تھی جس سے وہ شادی کے بعد بھی مدتوں ملتے رہے تھے اور جس سے ان کا تعلق جسمانی رشتوں کے انقطاع کے بعد بھی قائم رہا۔ بڑے میاں اٹھ کر بیٹھ گئے اور دیر تک سوچتے رہے کہ وہ اب کہاں ہوگی۔ زندہ ہے یا مر گئی۔ انہیں یاد آیا برسوں پہلے وہ اس نمبر پر اسے کئی دن تک ڈھونڈتے رہے تھے مگر وہ نہیں ملی' ایک دفعہ پھر انہوں نے اپنے ہاتھ کے شکستہ انداز میں لکھے ہوئے اس کے نام کو پڑھا اور پھر فون نمبر کے اعداد پر غور کرتے رہے اس کیفیت میں نام اور نمبر کاٹنے کے لئے انہوں نے قلم اٹھایا لیکن کاٹا نہیں' قلم میز پر رکھ دیا اور چپ چاپ بیٹھ گئے۔

بارش اب تیز ہو گئی تھی اور لگاتار برس رہی تھی' ہوا کا زور کم ہو گیا تھا اور سمندر کی شوریدہ لہروں کی گونج ہیبت ناک ہو گئی تھی۔ بڑے میاں کرسی سے اٹھے اور کمرے کی ایک کھڑکی کھول دی۔ باہر گہرا اندھیرا تھا۔ آسمان پر دبیز بادل چھائے ہوئے تھے۔ کبھی کبھی بجلی چمکتی تو سامنے کا منظر روشن ہو جاتا۔ اب کے مکان کے چاروں طرف عمارتوں کا اژدہام تھا' انسانوں کا ہجوم تھا۔ وہ جب آئے تھے یہاں پر شائد دو چار ہی مکان تھے' زمین کھلی اور ہوا صاف تھی۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے چاروں طرف عمارتوں کا جال بچھ گیا' اینٹ پتھر' بجری اور لوہے کے ڈھیر لگ گئے۔ انسانوں کا ایک جنگل ان کے آس پاس آباد ہو گیا' خود ان کا یہ کشادہ مکان خاندان میں اضافے کے ساتھ چھوٹا ہوتا گیا' کبھی کبھی اس فضا میں ان کا سانس گھٹنے لگتا۔ وہ اس بھاگتی دوڑتی زندگی سے عاجز آ کر اللہ تعالی سے گڑگڑا کر دعا کرتے کہ یہ نئی دنیا اب ان کے رہنے کے لئے موزوں نہیں ہے لیکن ان کی زندگی کا یہ بے مزہ اور بے معنی سفر ختم ہونے ہی میں نہیں آتا تھا۔ یہ کیسی مجبوری تھی کہ ایک ہنستی گاتی گنگناتی ہوئی زندگی اب بوجھ بن گئی تھی اور وہ اسے اپنے ناتواں کندھوں پر اٹھائے پھر رہے تھے۔

بڑے میاں نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور پھر بستر پر بیٹھ گئے' باہر کی طوفانی ہوائیں اب کچھ کچھ تھم گئی تھیں اور ایسا معلوم ہو رہا تھا گویا آس پاس کی فضا میں سسکیاں ابھر رہی ہیں۔ انہوں نے ایک دفعہ پھر خستہ ڈائری کے بوسیدہ اور شکستہ صفحات پر نظر ڈالی' عینک درست کی اور قلم ہاتھ میں پکڑ کر ڈائری کے ورق الٹنے لگے۔

تیسرے صفحے پر چوتھا نام نظر آتے ہی انہوں نے محسوس کیا جیسے ان کا کلیجہ پھٹ گیا ہے۔ نام کا پہلا حصہ ہی پڑھا جاتا تھا' دوسرے حصے کی سیاہی مدھم پڑ چکی تھی۔ انہوں نے نام کے اس پہلے حصے کو دو تین بار بلند آواز سے پڑھا حسن۔ حسن۔ نمبر کے اعداد مٹ چکے تھے۔ انہوں نے حساب لگایا اس حسین جوان کو بچھڑے ہوئے پچیس برس سے زائد گزر چکے تھے۔ وہ ایک بے حد حسین اور وجیہہ جوان تھا جس کے وجود میں انسانی اعضا کا حسن اور معصومیت مکمل مل گئے تھے۔ یکایک انہیں محسوس ہوا گویا وہ سروقد جوان رعنا ان کے سامنے کھڑا اسی طرح مسکرا رہا ہے جس طرح وہ اپنی زندگی کے چوبیں برس میں مسکراتا ہوا نظر آتا تھا۔ حسن ایک دراز قد دبلا پتلا اور تیکھے نقوش والا نوجوان تھا جس کے وجود سے پیار کے نغمے پھوٹتے تھے' وہ ایک سیاسی کارکن تھا جو اس نئے ملک میں نقل مکانی کرنے والے لاکھوں انسانوں میں سے ایک تھا مگر یہاں آنے والوں کی اکثریت کی طرح اس نئے اور آزاد ملک میں لوٹ کھسوٹ کی دوڑ میں شامل ہونے کی بجائے اس کو بہتر بنانے کے لئے کام کر رہا تھا۔ وہ تو اپنی قسم کا ایک ہی نوجوان تھا۔ اس جیسا کوئی دوسرا پھر کہیں نظر نہ آیا۔ وہ اس نئے ملک میں سب لوگوں کے لئے یکساں مواقع پیدا کرنے' ان کی زندگی کو بہتر بنانے اور حق و انصاف کی سربلندی کے لئے کام کرتا رہا۔ حکمرانوں کی طرف سے اس کے خلاف غیظ و غضب کا اظہار ہوتا تو وہ مسکرانے لگتا۔ اس کی گرفتاری کے لئے وارنٹ جاری ہو گئے' اسے ملک دشمن قرار دیا گیا تو وہ زیر زمین رہ کر کام کرتا رہا۔ انہی دنوں ایک دوست کے توسط سے وہ خفیہ طور پر بدلے ہوئے نام کے ساتھ بڑے میاں کے گھر میں قیام کرنے کے لئے وارد ہوا۔ بڑے میاں یاد کرنے لگے کہ حسن کے نام سے ان کے گھر میں مہینوں قیام کرنے والا یہ جوان باہر نکلنے کے لئے اپنے چہرے اور جسم کو بگاڑنے اور بھدا بنانے کی کیسی کیسی کوششیں کرتا تھا مگر اس کی وجاہت کسی پردے میں چھپتی ہی نہیں تھی' بڑے میاں اس سے اپنے بیٹوں سے بڑھ کر پیار کرنے لگے تھے' وہ گھنٹوں اس کی میٹھی میٹھی پر عزم باتیں سنتے رہتے۔ وہ جس قدر حسین و جمیل تھا اس سے کہیں زیادہ شیریں زبان بھی تھا۔ ہوش اور بے ہوشی کی کسی درمیانی حالت میں بڑے میاں نے محسوس کیا جیسے وہ ان کے سامنے بیٹھا اپنے نرم اور مہذب لہجے میں باتیں کر رہا ہے۔ وہ کہہ رہا ہے یہ ملک تو سب کا ہے اور زیادہ ان کا ہے جنہوں نے اسے بنایا اور

اس کے لئے قربانیاں دیں۔ اسے وجود میں لانے میں کتنے لاکھوں لوگوں نے جانیں دیں۔ عزتیں لٹائیں، گھر بار سے محروم ہوئے۔ ان سب کا لہو اس وطن کی بنیادوں میں بکھرا پڑا ہے۔ پھر ہم چند موقعہ پرستوں کو یہ حق کیسے دے سکتے ہیں کہ وہ اس نئے ملک کے ذرائع پر قبضہ کر کے خلق خدا کو محرومیوں اور پریشانیوں میں مبتلا رکھیں۔ نہیں نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔ اس کا میٹھا لہجہ اور شیریں آواز بہت دیر تک بڑے میاں کے کانوں میں رس گھولتی رہی ۔ وہ چند ہی ماہ ان کے پاس رہا تھا پھر کسی دوسری جگہ منتقل ہو گیا۔ وہاں وہ کسی اور نام سے رہا مگر بڑے میاں اور اس میں اتنی محبت اور اتنا اعتماد پیدا ہو گیا تھا کہ وہ مروجہ اصولوں کے خلاف انہیں اپنا نیا نام اور فون نمبر دے گیا تھا' یہ نیا نام اب مٹ چکا تھا جو بڑے میاں نے حسن کے نام کے نیچے لکیر کھینچ کر لکھ دیا تھا' ایک دفعہ ان کے درمیان رابطہ بھی ہوا لیکن کچھ ہی روز بعد حسن اس جگہ سے کہیں اور چلا گیا اور اس کے بعد اس کی بڑے میاں سے ملاقات نہ ہو سکی۔ وہ اپنے کام میں مصروف رہا۔ سال سوا سال تک ان کو اس کا کچھ پتہ نہ چل سکا۔ پھر اچانک پہلے سینہ بسینہ خبروں کے ذریعے اور پھر اخبارات کی چیختی چنگھاڑتی سرخیوں کے واسطے سے انہیں معلوم ہوا کہ حسن کو گرفتار کر کے پولیس جس عقوبت خانے میں لے گئی تھی وہاں اسے بہیمانہ جسمانی تشدد کے ذریعے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا اور کسی نامعلوم جگہ پر دفنا دیا گیا۔ بڑے میاں نے ہر ممکن ذریعہ سے معلوم کرنے کی کوشش کی کہ وہ انسانی خوبصورتی کا مجسمہ مرنے سے پہلے کن مراحل سے گذرا' اس پر کیا جرم عائد کیا گیا اور وہ اس دنیا کو جسے وہ خوبصورت اور امن کا گہوارا بنانے کے لئے برسوں کوشاں رہا کیسے چھوڑ گیا لیکن انہیں کچھ بھی معلوم نہ ہو سکا۔ نیم بے ہوشی اور غنودگی کی حالت میں سامنے پھیلی ہوئی ڈائری میں حسن کا نام اور نمبر دیکھ کر بڑے میاں کا خون منجمد ہو گیا۔ وہ اپنے کانوں سے اس کی صاف اور شیریں آواز سن رہے تھے جیسے وہ کہیں ان کے آس پاس ہی موجود ہو۔ وہ انہیں رگ و جاں سے بھی قریب لگا' جیسے وہ ان لاکھوں کروڑوں افراد سے جن کے لئے اس نے اپنی جان قربان کی' پوچھ رہا ہو کہ اس کے مشن کا کیا ہوا؟ اس نے ان کے لئے اپنا خوش حال خاندان' اپنی جوانی' اپنی زندگی سب کچھ لٹا دیا مگر انہوں نے اسے اتنی آسانی کے ساتھ کیسے فراموش کر دیا۔

کمرے کی پراسرار فضا میں حسن کی موجودگی کے احساس نے بڑے میاں

کو نڈھال کر دیا۔ باہر اب ہوا کی رفتار میں ٹھہراؤ آ گیا تھا اور اس کی سسکیوں کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔ بڑے میاں کو دم گھٹتا ہوا محسوس ہوا۔ انہیں ایسے لگا جیسے وہ نزع کے عالم میں ہوں اور صرف یہ سوچ رہے ہوں کہ کیسے کیسے جوانانِ رعنا' کیسے کیسے لعل و گہر اور کیسے کیسے بہادر ان تاریکی راہوں میں مارے گئے جو روشن ہونے کی بجائے اور تاریک ہو گئی ہیں۔ آج انہیں کوئی یاد نہیں کرتا۔ کوئی ان کا نام نہیں لیتا' کوئی ان کے لہو کی پکار کو نہیں سنتا۔ پھر انہوں نے غنودگی اور بے بسی کی کیفیت میں ان دنوں کو یاد کیا جب کچھ ہی لوگوں نے وطن میں جگہ جگہ عقل و خرد کی قندیلیں روشن کی تھیں' جب حق و انصاف کے لیے بلند ہونے والی آوازیں چاروں طرف سنائی دیتی تھیں اور ہر طرف آج کی طرح سناٹا نہیں تھا۔ جب امیدیں ختم نہیں ہوئی تھیں اور اندھیرے میں روشنی کی کرنیں جھلملاتی تھیں۔ اب انہیں چاروں طرف اندھیرا ہی اندھیرا نظر آتا تھا۔ اس اتھاہ اندھیرے میں وہ بہت دیر تک بے سدھ لیٹے رہے۔ کبھی کبھی ماضی کے آئینے میں کوئی شعلہ سا لپکتا اور پھر تاریکی چھا جاتی' بہت دیر تک بے سدھ لیٹے رہنے کے بعد وہ پھر اٹھے' ڈائری ابھی تک ان کے ہاتھ میں تھی۔ انہوں نے پلنگ کے نیچے پڑے ہوئے قلم کو تلاش کیا اور ڈائری کے ورق پھر سے پلٹنے لگے۔

ایک پھٹے ہوئے صفحے پر اچانک ان کی نظر ایک نام پر آ کر رک گئی' یہ رضیہ کا نام تھا جسے انہوں نے ایسے طریقے سے لکھا تھا کہ وہی صحیح نام کی شناخت کر سکتے تھے' دیر تک وہ اس نام پر نظر جمائے بیٹھے رہے۔ اس عالم میں کتنا وقت گذر گیا۔ انہیں پتہ ہی نہیں چل سکا مگر ان کی دھڑکن تیز سے تیز تر ہوتی گئی۔ دیکھتے ہی دیکھتے یہ بانکی اور طرح دار عورت ان کے حواس پر چھا گئی۔ وہ دوہرے جسم کی ایک دلربا خاتون تھی جس کی آنکھیں اس کی زبان کا کام کرتی تھیں۔ بڑے میاں دیر تک اس کے بارے میں سوچتے رہے اس کی ایک ایک بات ایک ایک ادا انہیں یاد تھی۔ وہ آنکھوں سے اتنا کچھ کہہ دیتی تھی کہ شاید زبان سے اتنا کچھ کہنا ممکن نہیں تھا۔ وہ بھی ملک کے دوسرے حصے سے نقل مکانی کر کے اس نئے وطن میں پہنچی تھی مگر اکیلی' ابتدائی دو تین برس اسے اپنے والدین اور بہن بھائیوں کے مل جانے کی امید تھی اور ان کو تلاش کے نام پر اس نے بنائے وطن سے بہت دھوکے کھائے۔ وہ کبھی سیاسی رہنماؤں کے ہاتھ میں کھلونا بنی تو کبھی مذہبی پیشواؤں کی چیرہ دستیوں کا شکار ہوئی' وہ ایک

گھر سے دوسرے گھر ایک شہر سے دوسرے شہر ایک آدمی سے دوسرے کے پاس منتقل ہوتی رہی مگر سبھی کے لئے اس کا ایک ہی مصرف تھا۔ جب اسے ان لوگوں کی اصلیت کا پتہ چلا اور جب اس کو یقین ہو گیا کہ اس کے گھر والے سبھی مارے گئے ہیں تو اس نے فیصلہ کیا کہ وہ ایسی زندگی نہیں گذارے گی جسے وہ دو تین برس سے گزار رہی تھی اس تنہا نوجوان اور خوبصورت عورت نے یہ ڈھائی تین برس کیسے گذارے تھے یہ ایک طویل صبر آزما اور حوصلہ شکن امتحان تھی لیکن یہ سارے صدمے سہتے سہتے وہ ایک مکمل اور با اختیار عورت بن گئی۔ اس نے اپنے خوبصورت جسم سے از خود کام لینے کا فیصلہ کر لیا۔ وہ بڑے بڑے ہوٹلوں اور بڑے بڑے لوگوں کی کمزوری بن گئی مگر خود اندر سے کھوکھلی ہوتی گئی۔ جب ایک بہت دولت مند دوست کی وساطت سے بڑے میاں سے اس کی ملاقات ہوئی تو اس کی جسمانی اور ذہنی شکست و ریخت کی ابتداء ہو چکی تھی۔ بڑے میاں سے اس کا کسی قسم کا جسمانی تعلق نہیں رہا مگر ان دونوں میں اپنائیت اور انسیت کی ابتداء پہلی ہی ملاقات میں ہو گئی تھی۔ برسوں وہ ایک دوسرے کے ہمدرد اور غم گسار بنے رہے' ان کی سوچ اور مزاج بہت ملتا تھا۔ وہ مذاق میں ہمیشہ اس سے کہتے "رضیہ تمہارے جیسی لذیذ عورت میں نے دوسری کوئی نہیں دیکھی"۔ رضیہ ہمیشہ ایک ہی جواب دیتی "کسی چیز کو چکھے بغیر لذیذ کیسے کہا جا سکتا ہے" مگر یہ بات بھی وہ مذاقاً ہی کہتی۔ اس کی طرف سے بھی بڑے میاں سے جسمانی تعلق کی خواہش کا کبھی اظہار نہیں ہوا۔ بڑے میاں نے اس ملک میں اس کی ابتدائی زندگی کے پہلے دو تین برس میں پیش آنے والے واقعات کے بعد اسے ہمیشہ ایک نیک' بہادر اور حوصلہ مند خاتون کے طور پر ہی لیا۔ وہ اس کی اداؤں اور بانکپن سے اس طرح کبھی متاثر نہیں ہوئے جیسے عام طور سے ایسی عورتوں کو دیکھ کر مرد ہو جاتے ہیں۔ لیکن وہ انہیں ہمیشہ بہت عزیز اور اپنے دل کے قریب محسوس کرتے رہے۔ پھر اچانک وہ کہیں غائب ہو گئی' وہ یقیناً ایسی عورت تھی جو کچھ بھی کر سکتی تھی' اس کے غائب ہونے کے بعد قسم قسم کی داستانیں اس کے متعلق سنائی دیتی رہیں مگر انہیں یاد آیا گذشتہ پندرہ بیس برس سے اس کا کوئی اتہ پتہ نہیں معلوم ہو سکا تھا۔ ابتداء میں انہوں نے دو چار بار اس نمبر پر واسطے کی کوشش بھی کی مگر ہمیشہ ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔

بڑے میاں دیر تک اس کے نام اور سامنے لکھے ہوئے اعداد پر نظریں

جمائے بیٹھے رہے۔ پھر ان پر غنودگی' تھکاوٹ اور نیم بے ہوشی کی کیفیت طاری ہو گئی۔ وہ تکئے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئے اس عالم میں انہیں محسوس ہوا جیسے کسی نے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا ہے۔

"کیا سوچ رہے ہو؟" یہ رضیہ کی آواز تھی۔

"تم کہاں چلی گئی تھیں" بڑے میاں نے سرگوشی کے انداز میں پوچھا

"کہیں بھی نہیں' میں تو یہیں تھی۔ اس شہر کے ہر گلی کوچے میں' اس ملک کے ہر شہر میں گھوم رہی ہوں۔ تم تو اب بڈھے ہو گئے ہو مگر ڈھونڈنے والوں کو میں آج بھی مل جاتی ہوں۔ میرا سفر بہت لمبا ہے۔ یہ صدیوں سے جاری ہے اور آنے والی صدیوں تک پھیلا ہوا ہے تم ہی کم بخت نکلے۔ میں تو کہیں نہیں' گئی"

بڑے میاں کو رضیہ کی قربت میں کمرے کے چاروں طرف پھیلی ہوئی مہک نے گھیر لیا' ایسی مہک جس میں انسانی جسم کا لمس اور پھولوں کی خوشبو گڈمڈ ہو کر ایک انوکھی اور لازوال شکل اختیار کر لیتی ہے اور انسان کے حواس پر چھا جاتی ہے۔ وہ بڑی دیر تک یہ مہک اپنے جسم میں انڈیلتے رہے یہ سرشاری اور لذت کا ایسا احساس تھا جس سے وہ برسوں سے محروم چلے آ رہے تھے' پھر سے ہوش اور بے ہوشی' جاگنے اور سونے اور دیوانگی اور فرزانگی کی سرحدوں کے درمیان جھولتے رہے' ان کا دماغ کام کر بھی رہا تھا اور معطل بھی تھا۔ تھوڑی دیر میں وہ بالکل بے سدھ ہو کر بستر پر دراز ہو گئے۔

وقت گذرتا رہا' رات چپ چاپ آگے بڑھتی رہی' تھوڑی دیر بعد جب وہ ہوش و حواس کی دنیا میں واپس آئے تو اپنے بستر سے اٹھ گئے۔ ٹیلی فون کی پھٹی پرانی ڈائری ان کے ہاتھ میں تھی' آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے ہوئے وہ کھڑکی کے پاس پہنچ گئے۔ باہر اب خاموشی تھی۔ طوفان تھم چکا تھا۔ انہوں نے اس ڈھلتی ہوئی رات کے خاتمے کی امید میں کھڑکی کے دونوں پٹ کھول دئے۔ سپیدہء سحر ابھی نمودار نہیں ہوا تھا۔ ابھی باہر اندھیرے کی چادر پھیلی ہوئی تھی۔ اجالے اور روشنی کے آثار دور دور تک نہیں تھے۔ افق پر پھیلے ہوئے گہرے سیاہ بادلوں میں سے کہیں اجالے کی کوئی کرن نظر آ جاتی۔ سیاہ بادلوں کے پیچھے کہیں دوڑتے اجالے کی جھلک کا احساس ہوتا تھا جس نے بادلوں کے کناروں کو جھلملاتی ہوئی سنہری رنگت

دیدی تھی۔ سارا منظر خاموش تھا' چاروں طرف سناٹا تھا۔ خاموشی گہری اور جان لیوا تھی۔ انہیں
اب معلوم ہوا جیسے پوری کائنات ٹھہر گئی ہے۔ زندگی کے سارے ہنگامے' شور اور صدائیں
غائب ہو چکی ہیں' انہیں محسوس ہوا جیسے اس پوری کائنات میں زمین اور آسمان کے درمیان
صرف وہ موجود ہیں باقی سب کچھ ختم ہو چکا ہے۔

بڑے میاں نے کھڑکی کے پٹ بند کر دئے اور واپس آ کر بستر پر دراز
گئے۔ انہیں بہت تھکاوٹ محسوس ہو رہی تھی لیکن اس تھکاوٹ میں ایک گونہ اطمینان بھی
جیسے تھکا ہارا مسافر بالآخر منزل پر پہنچ گیا ہو۔ جلدی ہی پھر وہ نیم بے ہوشی کی حالت میں
گئے۔ اس دفعہ ان کے سامنے ڈائری میں لکھا ہوا کوئی ایک نام نہیں تھا بلکہ بہت سے نام
بہت سے چہرے تھے' بہت سے جسم تھے' زندہ' متحرک' فعال اپنا اپنا کام کرتے ہوئے' اپنی اپنی
زندگی بتاتے ہوئے' رزق پیدا کرتے ہوئے مگر خالی پیٹ رہتے ہوئے وہ کچھ نہ کچھ کرتے نظر
آتے تھے۔ زندہ رہنے کے لئے سانس کی ڈوری کو رواں رکھتے ہوئے بے مقصد زندگی گزارنے
والے لوگ جن کے آنگن محبت اور خوشی سے خالی تھے۔ بڑے میاں نیم بے ہوشی کی کیفیت
میں ان لاکھوں چہروں کو دیکھتے ہوئے اس ڈائری اس گھر اس شہر اور اپنی اس محدود دنیا سے نکل
گئے۔ بچپن' جوانی اور بڑھاپے کی بہت سی منزلیں ان کے سامنے گھومنے پھرنے لگیں وہ دھان
کے لہلہاتے ہوئے سیاہی مائل کھیتوں' مکئی اور گنے کی خوشبوؤں کے ساتھ ساتھ دوڑتے رہے
جہاں ان کا بچپن گذرا تھا۔ پھر عنفوان شباب کے کئی حادثے کئی مناظر اور کئی زندہ بدن ان کی
آنکھوں کے سامنے آئے۔ کیسی کیسی سلگتی ہوئی جوانیاں' جلال و جمال کے کتنے آثار اور زندہ
اور مردہ شخصیتوں کے کتنے ہی ہیولے ان کے سامنے آئے اور غائب ہوتے رہے۔ کیسی کیسی
حسینائیں' محبوبائیں' مہربان' غم گسار اور ہمدرد نظروں کے سامنے گھوم گئے۔ محبت کرنے والے
اور نفرت کے شعلے برسانے والے سبھی ایک جگہ موجود تھے۔ اپنی زندگی کے اس طویل سفر کی
پرچھائیاں ان کے سامنے پھیلی ہوئی تھیں۔ انہوں نے کہاں کچھ کھویا تھا اور کہاں پایا تھا وہ سب
کچھ یاد ہی نہیں نظر بھی آ رہا تھا۔ ایک کہکشاں تھی جو حد نظر تک جھلملا رہی تھی اور بڑے
میاں اس کی روشنی اور چکا چوند کرنے والے جمال' کشش اور روشنی کے سامنے سربسجود ہو
گئے۔

صبح کو دیر تک بڑے میاں کے کمرے کا دروازہ نہیں کھلا تو ان کے منجھلے بیٹے کو بڑی حیرت ہوئی وہ ہمیشہ بہت سویرے اٹھنے کے عادی تھے۔ بیٹے نے سوچا شاید رات کی طبیعت خراب ہو گئی ہے۔ اس نے آہستہ سے دروازہ کھولا وہ بڑے اطمینان سے بستر پر سیدھے لیٹے تھے۔ چھاتی پر ٹیلی فون کی پھٹی پرانی ڈائری پڑی تھی اور بند مٹھی میں پنسل تھی۔

جب بیٹے نے قریب جا کر انہیں غور سے دیکھا تو اسے یہ جاننے میں زیادہ دیر نہیں لگی کہ اس کے سامنے ایک بے جان جسم پڑا ہے۔

○

# نیک پروین

ڈاکٹر سلیم اختر

"تم اسے نہیں سمجھ سکو گے" وہ خاموشی سے جلتے سگریٹ کی سرخ نوک کو گھورتا رہا اور اتنی دیر تک گویا سلگتے سرخ نقطے نے اس پر مسمریزم کر دیا ہو۔ آنکھیں بند تھیں یا کھلیں' کچھ کہا نہیں جا سکتا تھا۔ شاید سگریٹ کے بل کھاتے دھوئیں کی لکیر کسی نیلگوں تحریر میں تبدیل ہو گئی تھی' پورے انہماک سے جس کا وہ مطالعہ کر رہا تھا۔ پھر اس نے سر جھٹک کر گویا خیالات جھٹکنے کی کوشش کی "تم اسے نہیں سمجھ سکو گے' میں خود بھی نہیں سمجھ سکا۔"

میں نے کچھ کہنے کو منہ کھولنا چاہا مگر خاموش رہا' میں اس کا مزاج دان تھا اور جانتا تھا کہ اسے ٹوکنا اس کی سوچ کے کچے برتن توڑنا ہو گا۔ لہذا چپ رہا۔ وہ جیسے خود سے مخاطب تھا" میں خود بھی اسے نہیں سمجھ سکا اور شاید اسی میں اس کی کشش ہے" اس نے بغیر کش لئے' سگریٹ کو ایش ٹرے میں مسلا' وہ اس گہرے انہماک سے سگریٹ مسل رہا تھا گویا سگریٹ کے روپ میں کسی اور کو مسل رہا ہو' ریزہ ریزہ کر دینا چاہتا ہو۔ "غالباً" کشش کا لفظ صحیح نہیں "اس نے خود ہی اپنی تصحیح کی" وہ مجھے عجب طرح سے نفسی نیت کرتی ہے' ہانٹ کرتی ہے "وہ لمحہ بھر خاموش رہا" کسی آسیب کی مانند پھر وہ خود ہی ہنسا بلکہ زیادہ بہتر تو یہ کہ کسی چڑیل یا بد روح کی مانند۔"

یہ عجیب الفاظ تھے اور ان سے بھی عجیب تر اس کا لہجہ۔ بیوی سے محبت کرنے والے شاید ہی کسی خاوند نے اپنی بیوی کے لئے ایسے الفاظ استعمال کئے ہوں گے ہاں! نفرت کرنے والے خاوندوں کی اور بات ہے' وہ مجھ سے پوچھ رہا تھا۔

"ایک بات تو بتاؤ۔"

"ہوں"

"جس طرح عورتوں پر سایہ ہو جاتا ہے اور ان پر جن عاشق ہو جاتے ہیں کیا اسی طرح مردوں پر بھی چڑیلیں عاشق ہو جاتی ہیں؟"

میں نے قہقہہ لگایا "مجھ جیسے کالے بھتنے پر تو کوئی چڑیل بھی عاشق ہونا پسند نہ کرے گی مگر یار تم تو ہی مین ہو' سیکسی ہو تم پر تو کسی پری ہی کو عاشق ہونا چاہئے۔ ویسے تم پر پریاں تو مرتی بھی رہی ہیں۔"

"پریاں؟" اس نے پر خیال انداز میں یوں دہرایا گویا زبان پر لفظ کا ذائقہ محسوس کر رہا ہو۔ "پریاں!" اس نے کافی کا گھونٹ بھرا' پھر بولا "نہیں پریاں نہیں! وہ تو اچھی ہوتی ہیں مجھ پر تو کسی پھل پائی ہی کا سایہ ہو گا۔"

"کیا بکتے ہو"

"اور چڑیل کے روپ میں ہے تمہاری بھابی۔"

"کیا احمقانہ بات کی ہے تم نے"

"تم مانو گے نہیں بلکہ کوئی بھی نہ مانے گا مگر حقیقت یہی ہے۔"

"کہ بھابی...؟" میرے منہ سے لفظ چڑیل ادا نہ ہو رہا تھا۔

"ہاں" پرزور لہجہ میں بولا "وہ جادوگرنی ہے"

"یار! خدا کے لئے۔"

مگر وہ اپنی دھن میں بولے جا رہا تھا "وہ ویمپائر ہے۔ ہاں! اب مجھے اندازہ ہوا ہے' شی از اے ویمپائر! بلڈ تھرسٹی ویمپائر!!"

اگر یہ کسی خوفناک فلم کا منظر ہوتا تو ہم دونوں کردار ویرانہ میں ٹنڈ منڈ درختوں کے درمیان بیٹھے ہوتے' سوکھے درختوں کی بے برگ و بار شاخیں مردہ ہاتھ کی انگلیوں سے مشابہ ہوتیں۔ دھند کی دبیز چادر میں ہوا شکنیں پیدا کر رہی ہوتی جبکہ الاؤ کے شعلے ہمارے خوف زدہ چہروں پر رقص کر رہے ہوتے مریض چاند درختوں کی شاخوں میں اٹکا سا محسوس ہوتا اور سگ پراسرار آسمان کی جانب منہ اٹھا کر دل دہلا دینے والی آواز میں رو رہا ہوتا۔ چڑیلوں' پھل پائیوں اور ویمپائرز کے تذکرہ کے لئے ایسا ماحول ہی مناسب ہوتا ہے جبکہ ہم اس کے برعکس فیشن ایبل علاقہ کے ایک مشہور اور بارونق ریستوران کے کافی کارنر میں بیٹھے کافی پی رہے تھے۔ بس

منظر کی موسیقی کے طور پر گٹار پر سپینش دھن بج رہی تھی اور اس الٹرا ماڈرن ماحول میں میرا دوست مجھے یہ خوشخبری سنا رہا تھا کہ میری بھابی چڑیل' جادوگرنی اور ویمپائر ہے! اصولاً تو ایسے شخص کی دماغی صحت پر شبہ کرنا چاہئے مگر خاور جذباتی' رومانی اور تخیلی کے برعکس سو فی صد عملی انسان ہی نہ تھا بلکہ حصول مقصد کے لئے محنت اور لگن کے ساتھ ساتھ چالاکی عیاری سب کچھ کر گزرنے والوں میں سے تھا۔

ہم دونوں کی دوستی لیگو پازیٹو جیسی تھی۔ خاور مردانہ وجاہت کی مکمل تصویر' ہیرو ٹائپ' اس کے برعکس میں کالا بھدا بدنما۔۔۔۔ اسی لئے میں ہمیشہ احساس کمتری کا شکار رہا اور زندگی میں پروفیسر کے علاوہ اور کچھ نہ بن سکا۔ خاور خود اعتمادی کی مکمل تصویر' کامران انسان کی مکمل شبیہ بلکہ کامرانیوں نے کسی حد تک اس کا دماغ بھی خراب کر دیا تھا۔ اس لیے وہ خود پرست اور خود رائے بھی تھا۔ جبکہ میں خود رحمی کا دائمی مریض' ہم دونوں ہر لحاظ سے ایک دوسرے کی ضد تھے شاید اسی تضاد نے ہماری دوستی کی بنیاد میں سیمنٹ کا کام کیا۔ میں خاور کی نرگسی شخصیت کے لئے آئینہ کا کام کرتا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی اسے یہ احساس ہو جاتا ہو گا کہ اگر وہ وجیہ' جامہ زیب اور کامیاب انسان نہ ہوتا تو وہ "میں" ہوتا۔ ادھر میری بیل جیسی ناتواں شخصیت کے لئے خاور کی پرجوش اور جارح شخصیت مضبوط سہارے کا کام کرتی' میں زندگی میں "وہ" تو نہ بن سکا۔ بن سکتا ہی نہ تھا۔۔۔۔ تاہم میں اس کا واحد رازدار تھا۔ مجھے وہ تمام خفیہ باتیں یوں سناتا گویا کنویں میں پتھر پھینک رہا ہو۔ میں واقعی قابل اعتماد امین تھا کہ اس کے رازوں کی امانت میں کبھی خیانت نہ کی۔ یہی نہیں بلکہ یہ خفیہ باتیں اور راز میرے لئے نفسیاتی تسکین کا بھی ایک ذریعہ تھے' بالواسطہ قسم کی تسکین' محروم لذت کی تشفی!

میں اپنے مشاہدات اور تجربات کی بناء پر یہ کہہ سکتا ہوں بلکہ دعویٰ کر سکتا ہوں کہ کچھ پیشے ایسے ہوتے ہیں جو متحرک' خوش اور زندہ رکھتے ہیں اور کام کی نوعیت یا ماحول کی وجہ سے انسان سدا بہار رہتا ہے جیسے فلم' ٹیلی ویژن' ایڈورٹائزنگ' فیشن' فوٹو گرافی' ڈریس ڈیزائننگ اور کالم نگاری وغیرہ جبکہ بعض پیشوں کی نحوست آکاس بیل کی مانند شخصیت سے تمام رس چوس لیتی ہے ایسے پیشے جہاں خوبصورت بات اور جمالیاتی تصورات کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ سرفہرست تو خود میرا اپنا پیشہ ہے یعنی معلمی' اگر بعض پروفیسروں نے اپنی طرح دار شاگردوں سے شادی کر لی تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ یہ بڑا گلیمرس پیشہ ہے (اور پھر ایسے

پروفیسروں کو کس بھاؤ پڑتی ہیں اسے کون جانے؟) نژاد نو کی تربیت' مستقبل کی معماری' قوم کی سربلندی' علم کی دولت وغیرہ کو چھوڑیئے اصل بات یہ ہے کہ پروفیسری مرد کو "کچھ اور بنا کر ذرا پروفیسر بنا دیتی ہے' خوف کا مسلسل اسیر' کلاس میں لڑکوں کا خوف' کالج میں پرنسپل کا خوف' ہڑتال کروانے والی مذہب نما سیاسی جماعتوں کا خوف۔ حتیٰ کہ گھر میں بیوی کا خوف۔ ہو سکتا ہے ایسا نہ ہو اور یہ میری فرسٹریشن ہو کہ میں ایک معزز پیشے کے بارے میں ایسی بے تکی سوچ رکھتا ہوں۔ وجہ کچھ ہی کیوں نہ ہو مگر میں یقیناً" اپنی پروفیسری سے اکتایا ہوا تھا اسی لئے خاور کی ایڈورٹائزنگ ایجنسی میرے لئے جنت نگاہ تھی۔ میں جب بھی اکتاتا (اور میں اکثر اکتایا ہی رہتا ہوں) خصوصاً میں جب بھی بے زار ہوتا (میں اکثر بے زار ہی رہتا ہوں) یا میں جب بھی بور ہوتا (میں اکثر ہی بور رہتا ہوں) تو میں کے۔ اے۔ اے (خاور ایڈورٹائزنگ ایجنسی) میں جا پہنچتا۔ اس کا پوش دفتر' دفتر نہیں راجہ اندر کا اکھاڑا تھا۔

آتی نئے انداز سے اب سبز پری ہے!
پر سبز ہیں' لب سرخ ہیں' پوشاک ہری ہے۔

امانت کی "اندر سبھا" کے جو اشعار میں نالائق لڑکوں کو سمجھانے کی کوشش کرتا ان کا عملی روپ مجھے یہاں نظر آتا میں کیونکہ ادب کا استاد تھا اس لئے میرے بلئے اشعار کی زندہ تصویریں دیکھنا' اشعار کی عملی تشریح بلکہ چلتے پھرتے اشعار دیکھنا بہت ضروری تھا ایسی لئے فارغ اوقات میں' میں عموماً وہیں پایا جاتا تھا بلکہ کبھی کبھار کسی پروڈکٹ کے سلوگن یا "جنگل" وغیرہ کے سلسلہ میں ادبی نوعیت کا مشورہ دے کر میں خود کو کار آمد بھی ثابت کر دیا کرتا۔

میں نہیں جانتا کہ خلاور ایڈورٹائزنگ ایجنسی کا کام کس وقت کرتا تھا کیونکہ میں نے تو ہمیشہ اسے حسینوں کا دربار لگائے دیکھا۔ اس کی مردانہ وجاہت اور ایجنسی کا مالک ہونا ہی بذات خود باعث کشش تھا لیکن کشش مزید کا باعث اس کا کنوارہ ہونا بھی تھا۔ لہٰذا دوشیزاؤں کے لئے وہ زبردست شکار تھا بھلا کون ناکتخدا حسینہ سنہری کلغی والا ایسا پنچھی ہاتھ سے جانے دے گی اور یہ کم بخت اسی کا فائدہ اٹھاتا تھا۔ لہٰذا فوائد کی فہرست اسی کے کنوارے فلیٹ سے لے کر سنگا پور اور ہانگ کانگ کے ہوٹلوں تک پھیلتی چلی گئی' میں نے ضمنی فوائد کا تو ذکر ہی نہیں کیا۔

اس کے خیالات عالیہ کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے ہمارا ایک دوست بیوی لے کر امریکہ گیا تو خاور نے اس کا خوب ریکارڈ لگایا۔

"یہ تو ایسے ہی ہے جیسے تم گھر سے اچھے ہوٹل میں کھانا کھانے جاؤ اور ٹفن کیریئر میں گھر کی دال بھی رکھ لو۔"

اس پر خوب قہقہے لگے' دوست جھینپ کر بولا۔

"یار! اب سب تم جیسے تو آزاد پنچھی ہوتے نہیں' ہم تو تابعدار شوہر ہیں۔"

"تابعدار نہیں برخوردار کہو۔۔۔ برخوردار"

مزید قہقہوں میں ایک کلی چٹک کر بولی۔

"خاور صاحب! اب آپ بھی شادی کر ہی لیں"

"تاکہ تمہارا برخوردار بن جاؤں" وہ قہقہہ لگا کر بولا۔ "تو! سویٹ میٹ"

وہ سرخ ہو گئی' خوشی سے یا جھینپ سے؟

"پھر کیا خیال ہے تمہارا؟"

"اوہ! خاور صاحب..." اس مرتبہ وہ خوشی سے سرخ سرخ تھی۔

ان تمام معاملات میں میری غیر عملی شرکت بالواسطہ طور پر' میری محرومیوں کے مداوے کے مترادف تھی اور میں اسی پر خوش تھا جانتا تھا کہ اس سے زیادہ خوشی مجھے مل بھی نہ سکتی تھی لہٰذا میں اس پر قانع تھا' کچھ لوگ مقدر کے سکندر ہوتے ہیں جبکہ میں برعکس تھا۔۔۔ یعنی منو کا "خوشیا!"

جب میں نے اسے دیکھا تو مجھے اس میں کوئی قابل ذکر تو کیا ناقابل ذکر خصوصیت بھی نظر نہ آئی۔ بس عام سی تھی وہ' معمولی شکل و صورت کی' کارگہ قدرت میں ٹھپکہ پر بنی ہزاروں لڑکیوں جیسی۔۔۔ یعنی نہ تو اس کی وجہ سے ٹریفک جام ہو سکتی تھی' نہ راہ چلتے مردوں کے قدم ٹھٹکیں گے' عورتوں کی آنکھ میں حسد کی چنگاری نہ سلگے گی حتیٰ کی مجھ جیسے پروفیسر کی عینک کا شیشہ بھی کریک نہ ہو گا۔۔۔ بس ایسی ہی تھی وہ' جیسی کہ "نباتاتی عورتوں کی اکثریت ہوا کرتی ہے' بے رنگ روپ' کشش ثقل سے عاری!

خاور کی تو اور بات ہے میں معنک پروفیسر بھی اس میں دلچسپی نہ لے سکتا تھا۔ ویسے وہ روایتی معنوں میں بدصورت بھی نہ تھی میں اس لئے لکھ رہا ہوں کہ بدصورتی میں بھی ایک ابنارمل قسم کی کشش ہوتی ہے جو مرد کے اعصاب پر عجب جارحانہ انداز سے اثرانداز ہوتی ہے یہی نہیں بلکہ خوبصورت مرد پر اور طرح سے اور بدصورت مرد پر اور طرح ہے! لہٰذا میں

خالص بدصورتی کا احترام کرتا ہوں۔ جس طرح خالص حسن نایاب ہے اسی طرح خالص بدصورتی بھی کمیاب ہے اور یہ ان دو انتہاؤں کے درمیان کہیں بھی فٹ ہو سکتی تھی اس پر مستزاد اس کی خاموشی! بعض گفتار کی غازی ثابت ہوتی ہیں اور باتوں کی پھلجھڑی سے صورت کے مدھم خاکہ میں شوخ رنگ بھر لیتی ہیں—— یہاں یہ خانہ بھی خالی تھا۔

پہلی مرتبہ آئی تو صوفہ پر سکڑی بلکہ سہمی سہمی سی بیٹھی رہی' دونوں ہاتھ گود میں رکھے' وہ ہر بات کرنے والے کا گویا حیرت سے منہ تکنے لگتی اور پھر گھبرا کر یوں نظریں جھکا لیتی کہ دیکھنے کی چوری نہ پکڑی جا سکے۔ کسی بات پر قہقہہ لگتا تو وہ بھی مسکرا دیتی' چہرہ کا روپ بدل دینے والی مسکراہٹ کے برعکس نام نہاد سی مسکراہٹ اور' اس علامتی مسکراہٹ کے بعد بھی وہ جیسے خجل سی ہو کر مزید سمٹ جاتی۔

"یار! یہ کیا چیز تھی؟" اس کے جانے کے بعد میں نے خاور سے پوچھا۔

وہ کندھے اچکا کر بولا "ڈونٹ نو! وہ شاہدہ کے ساتھ آئی تھی' کالج کی سہیلی ہے' یہاں کسی سکول میں استانی ہے اور کسی گرلز ہاسٹل میں رہتی ہے" وہ لاتعلقی سے اس کا بایوڈیٹا سنا رہا تھا۔

"یہ شاہدہ تو بڑی شے ہے۔ یہ اس نے ساتھ کیا لگا رکھی ہے۔؟"

"دوستی کا بھی عجیب معاملہ ہے" خاور فلسفیانہ لہجہ میں بولا "بعض دوست ہم خیالی کی وجہ سے بنتے ہیں بلکہ بعض..." اسے مناسب لفظ نہ ملا تو میں نے لقمہ دیا۔

"بدخیالی کی وجہ سے"

وہ قہقہہ لگا کر بولا "بس! یہی سمجھ لو' یعنی کوئی بات مشترک نہیں ہوتی اور اسی لئے وہ گہرے دوست ہوتے ہیں' یعنی ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ہیں۔"

"جیسے ہم دونوں!"

وہ جلدی سے بولا "میرا یہ مطلب نہ تھا۔"

"یہی ہے" میں نے کہا "میرا تمہارا بھی یہی معاملہ ہے اور شاہدہ اور—— اور کیا نام ہے، اس کا؟"

"نام؟" وہ ذہن پر زور دے کر بولا "لو! اس کا تو نام بھی یاد نہیں رہا"

—— اور خاور کو جس کا نام بھی یاد نہ رہا تھا جب چند ماہ بعد خاور نے اسی سے

شادی کرلی تو یقیناً یہ ایک تعجب خیز، دھماکہ خیز، سنسنی خیز بلکہ ہر طرح کی "تیز" خبر تھی۔ خاور اور شادی؟ ممکن تھا مگر خاور کی اس سے شادی؟ ناممکن!

---

حقیقی زندگی میں تو نہیں فلموں میں ایسے ملازم مل جاتے ہیں جو کنبہ کے فرد کی مانند ہوتے ہیں اور انہیں ملازم نہیں بلکہ گھر کا فرد یا پھر بزرگ سمجھا جاتا ہے اور رمضان بھی ایسا ہی ملازم نما بزرگ تھا۔

خاور جیسے لاابالی انسان کے لئے رمضو بابا نعمت سے کم نہ تھا۔

رمضو مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوا۔

"کئی مہینوں بعد آپ آئے ہیں —— ہیں نا؟"

میں نے بتایا گرمیوں کی چھٹیوں میں، میں بھائی کے پاس امریکہ گیا تھا۔ وہ چائے لے آیا، پتہ چلا میاں بیوی مری گئے ہیں۔

"خاور نے بیاہ کرلیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"جی ہاں!" وہ خوشی سے چہک کر بولا۔

"کیسی ہیں ہماری بھابی؟"

"آپ ملے ہوں گے ان سے —— بہت اچھی ہیں جی وہ!"

"کیا نام ہے"

"پروین"

میں اس نام کی کسی ماڈل اور گلیمر گرل سے واقف نہ تھا لہٰذا پوچھا "پروین —— کون پروین؟"

"وہ جی!" وہ اپنی مالکن کا حلیہ کیسے بیان کرتا "وہ جی سانولی سی جی —— وہ جی..."

تب وہ یاد آگئی —— "وہ جو استانی ہے؟"

"جی ہاں! مگر اب انہوں نے ملازمت چھوڑ دی ہے۔"

"ظاہر ہے۔ اب بھلا نوکری کی کیا ضرورت۔"

اچانک جیسے گرم چائے ٹھنڈی ہو گئی، اگرچہ یہ خاور کا ذاتی معاملہ تھا مگر مجھے

اچھا نہ لگا' ایک تو اس لئے کہ مجھ قریبی دوست اور رازدار سے بھی اسے راز رکھا گیا۔ اسی خلجان سے قطع نظر اس لئے بھی کہ خاور جیسے خوبصورت مرد کے لئے وہ چھپکلی نما عورت قطعاً موزوں نہ تھی۔ خاور کی تو نسل ہی خراب ہو جائے گی ۔ بچے کالے پیدا ہوں گے۔ چھپکلی کی تشبیہ اور کالے کلوٹے بچوں کے تصور سے میں دل ہی دل میں خوش ہوا۔

"رمضو بابا! یہ سب کیسے ہو گیا؟"

"کیا کیسے ہو گیا؟"

"یہی--- یہ شادی--- میرا مطلب ہے اتنی جلدی' خاموشی سے!"

"وہ جی... دراصل پروین بٹی میں...

"بٹی؟"

"وہ جی انہوں نے... بی بی جی نے مجھے اپنا باپ بنا لیا ہے۔"

"باپ؟"

"وہ جی... وہ کہتی ہیں مجھے ان میں اپنا مرا ہوا باپ نظر آتا ہے وہ مجھے بابا جی کہتی ہیں۔"

"اچھا! تو یہ بات ہے"

"جی! وہ پروین بٹی بہت اچھی ہیں' بہت ہی اچھی' ان آوارہ لڑکیوں کی طرح نہیں جو ہر وقت خاور صاحب کو گھیرے رہتے تھیں۔"

"وہ تو ٹھیک ہے مگر پھر بھی میں یہ شادی سمجھ نہیں سکا۔"

"پروین بٹی جی بہت نیک ہیں۔"

"وہ تو ٹھیک ہے مگر پھر بھی..."

"دراصل پروین بٹی خاور صاحب کا بہت خیال رکھتی تھیں۔"

"تھیں؟"

"ہاں جی! میرا مطلب ہے شادی سے پہلے"

"شادی سے پہلے بھی..." میں خاصا بے خبر ثابت ہو رہا تھا اس کم بخت خاور نے مجھے اس معاملہ سے دور ہی رکھا۔

"ہوا یہ کہ ایک دن پروین بٹی آئی"

"تم تو حیران ہوئے ہو گے"

رمضو ہنسا "جی ہاں! یقیناً!! اسی لئے کہ وہ ان لڑکیوں میں سے نہ تھی جو یہاں آتی رہتی تھیں۔"

"یقیناً وہ ان لڑکیوں میں سے نہ تھی جو یہاں آتی رہتی ہیں" میں نے دہرایا۔

"میں نے اسے پہلے کبھی دیکھا بھی نہ تھا اس لئے میں خاصہ حیران ہوا' اس نے بتایا کہ وہ دفتر میں خاور صاحب سے مل چکی ہے' پھر اس نے مجھ سے باتیں شروع کر دیں۔"

"کس قسم کی؟"

"الگ قسم کی--- خاور صاحب کیسے کھانے پسند کرتے ہیں' ناشتہ میں کیا لیتے ہیں۔ بس ایسی باتیں جیسی گھریلو عورتیں کیا کرتی ہیں' بیویاں کیا کرتی ہیں اور استانیاں کیا کرتی ہیں--- وہ پھولوں کا گلدستہ بھی لائی تھی جسے اس نے خود ہی خاور صاحب کے بیڈ روم میں جا کر سجا دیا۔"

"خاور نے پھولوں کا پوچھا نا"

"پوچھا جی' میں نے بتا دیا پروین بی بی لائی ہیں۔"

"پھر؟"

"بس اس طرح وہ آتی رہی پھر اس نے خاور صاحب کی پسند کے کھانے لانے شروع کر دیئے۔"

"خاور نے پوچھا ہو گا"

"جی ہاں' پوچھا جی! میں نے سب بتا دیا کہ یہ سب پروین بیٹی کر رہی ہے۔ پھر ایک دن آئی تو میری طبیعت کچھ خراب سی تھی سو اس نے کھانا پکا دیا۔ پھر آکر سارا گھر جھاڑ گئی۔"

"پوچھا تو ہو گا کہ یہ سب کیوں کرتی ہو؟"

"جی پوچھا جی! کہنے لگی میں ہوسٹل میں رہتی ہوں' وہاں میری کوئی سہیلی نہیں' میرا دل نہیں لگتا وہاں' ایک دن اس نے تقریباً روتے ہوئے بتایا کہ میرا کوئی گھر نہیں نہ ہی گھر والے--- اس لئے اس طرح سے کام کرنا اچھا لگتا ہے۔"

"اور خاور؟"

"سب معلوم تھا اگرچہ اس نے مجھے منع کر رکھا تھا کہ میں اس کے بارے میں خاور صاحب سے کوئی بات نہ کروں مگر مجھے بھلا بات چھپانے کی کیا ضرورت تھی۔"

"بھلا تمہیں بات چھپانے کی کیا ضرورت تھی۔"

"پھر جی سچی بات تو یہ ہے کہ مجھے وہ بیٹیوں جیسی لگتی تھی اس کے آنے سے اکیلے گھر میں میرا بھی جی بہل جاتا۔ وہ بھی باپ کی طرح میرا خیال رکھتی' میرے لئے کپڑے لاتی' مجھے کمزور دیکھ کر طاقت کی دوا لا دی۔"

"خاور نے کوئی اعتراض نہ کیا۔"

"انہیں اعتراض کی ضرورت نہ تھی اگر وہ پھول لاتی تھی یا ان کا پسندیدہ کھانا پکا جاتی تھی یا ڈرائنگ روم کو ٹھیک ٹھاک کر دیا تو اس میں خاور صاحب کو کیا تکلیف ہو سکتی تھی۔"

"ہاں! اسے بھلا کیا تکلیف ہو سکتی تھی۔"

مجھے تو وہ بار بار یہی کہتی کہ خاور صاحب کو اس کے بارے میں کچھ نہ بتایا جائے۔ دراصل جی وہ بڑی گھریلو تھی اور اسے گھر کا کام کاج کرنا اچھا لگتا تھا۔۔۔ لفنگی نہ تھی۔"

اس پر میں ہنسا۔ رمضو کا بیان جاری تھا۔

"شروع شروع میں تو خاور صاحب کچھ کچھ بولے کہ وہ یہ سب کیوں کرتی ہے مگر پھر خاموش سے ہو گئے۔"

"اور اس کے سالن کھا لیتے"

"تو اور کیا۔۔۔ پھینک دیتے؟"

"یہ بھی ٹھیک ہے"

"اور وہ گھر ہی پر آتی تھی"

"جی گھر پر اور اس وقت جب خاور صاحب گھر پر نہ ہوتے"

"دفتر نہیں جاتی تھی"

"میرا تو خیال ہے نہیں"

"وہ ایسا کیوں کرتی تھی۔۔۔ تم نے اس سے پوچھا تو ہو گا"

رمضو بابا خوب ہنسا' کہنے لگی مجھے خاور صاحب سے ڈر لگتا ہے اس لئے میں

دفتر نہیں جاتی۔"

"تم نے پوچھا نہیں ڈرنے کی کیا بات ہے خاور غصیلا یا بدمزاج انسان تو نہیں ہے۔"

"میں نے پوچھا تھا کہنے لگی' وہاں بڑی بڑی خوبصورت لڑکیاں آتی ہیں' تیز طرار' جامہ زیب' ہیئر سٹائل والیاں اور میں تو ان کے مقابلہ میں کچھ بھی نہیں ہوں۔"

"کمال ہے!"

"سلیم صاحب! میں جی خوبصورتی اور بدصورتی تو نہیں جانتا لیکن پروین بیٹی کمال کی ہیں اتنی سگھڑ' اتنی خدمت کرنے والی' اتنی اچھی اتنی اچھی کہ جتنا جھوٹ بولو۔"

"اتنی اچھی کہ جتنا جھوٹ بولو" میں نے زیر لب دہرایا "رمضو بابا! تم عجب فلسفہ بولے ہو اس وقت..."

رمضو بابا ہنسا "او جی! میں فلسفہ کیا بولوں گا میں تو بس رمضو بابا ہی ہوں۔"

میں کچھ دیر تک خاموشی سے چائے پیتا رہا پھر پوچھا "رمضو بابا! چلو تمہاری بات مان لی کہ وہ بہت اچھی اور سلیقہ مند ہے مگر تم خاور کو تو جانتے ہی ہو--- کیسی کیسی خوبصورت لڑکیاں اور ماڈلیں اس کے پیچھے پیچھے پھرتی تھیں مگر وہ کسی کے قابو میں نہ آیا تو پھر یہ شادی---؟"

رمضو بابا نے جواب دیا "کیونکہ پروین بیٹی ان لڑکیوں جیسی خوبصورت نہ تھی اس لئے یا تو شادی ہوتی یا کچھ بھی نہ ہوتا۔"

رمضو بابا پھر فلسفہ بول گیا تھا "مگر پھر بھی رمضو بابا..."

وہ برا مان کر بولا "سلیم صاحب! اگر آپ یہ سوچ رہے ہیں کہ پروین بیٹی نے خاور کو پھانسا ہے تو وہ ایسی نہیں' وہ تو صرف خدمت کرنا چاہتی تھی اور ہمیشہ مجھے خاور کو کچھ بھی نہ بتانے کو کہتی رہتی تھی وہ پھل پھول وغیرہ ہمیشہ اپنے پلے سے لاتی تھی۔"

"مگر پھر بھی..."

رمضو بابا اب مجھے باقاعدہ سمجھا رہا تھا "دیکھئے سلیم صاحب! وہ کوئی ایسی خاص خوبصورت نہیں مگر ایک خوبصورتی اندر کی بھی تو ہوتی ہے' دل کی خوبصورتی' روح کی خوبصورتی--- جس کا لباس اور صورت سے تعلق نہیں ہوتا--- ایسی خوبصورتی جو بس ہوتی

ہے!"

"رمضو بابا! میرا یہ مطلب نہ تھا اور اصل میں اب تک اس شادی کو سمجھ نہیں سکا ہوں۔"

"دیکھئے میں آپ کو سمجھاتا ہوں دو مہینے پہلے کی بات ہے خاور صاحب بہت بیمار ہو گئے۔ میں ڈاکٹر کو لے آیا اس نے دوا وغیرہ دی مگر بہت پریشان تھا' دل میں برے برے خیال آتے' میں نے کبھی خاور صاحب کو بیمار ہوتے نہ دیکھا تھا۔ اس لئے میں بہت زیادہ گھبرا گیا آپ بھی یہاں نہ تھے' ان کے اور کسی دوست رشتہ دار کو جانتا نہ تھا چنانچہ میں سیدھا پروین بی‌بی کے ہاسٹل پہنچا اور خاور کی بیماری کا بتایا وہ اسی وقت ان ہی کپڑوں میں میرے ساتھ چلی آئی اور آپ یقین مانئے ساری ساری رات پلنگ سے لگی بیٹھی رہتی۔ نہ کھانے کی ہوش نہ پینے کی' جن کپڑوں میں آئی ان ہی میں رہی' اس دوران کچھ لڑکیوں کے فون بھی آئے مگر اس نے کسی کو بھی گھر نہ آنے دیا اکیلی خدمت کرتی رہی۔"

رمضو بابا اچانک چپ ہو گیا جیسے زیادہ بول گیا ہو یا پھر مزید کہنا چاہتا ہو اور سوچ رہا ہو کہے یا نہ کہے میں خاموشی سے اسے دیکھتا رہا بالآخر وہ بولا۔

"ایک شام میں کمرہ میں داخل ہوا تو وہ رو رہی تھی۔"

"رو رہی تھی؟ کیوں؟ خاور تو مرا نہ تھا۔"

"اس نے برا مان کر میری طرف دیکھا "میں نہیں جانتا کیوں؟ بس وہ خاور صاحب کے سرہانے بیٹھی چپکے چپکے رو رہی تھی میں حیران سا کھڑا رہ گیا۔ عین اسی وقت خاور کی آنکھ بھی کھل گئی' وہ اٹھ کر بیٹھ گیا اور پھر عجیب بات ہوئی جی' خاور بھی رونے لگا' دونوں ایک دوسرے کو چپ کراتے اور پھر رو پڑتے بالکل بچوں کی مانند جی۔"

"اوہ!"

"بس ٹھیک ہوتے ہی خاور نے شادی کر لی۔"

"اور دونوں خوش ہیں۔"

"خوش؟ جی وہ تو خاور کی پوجا کرتی ہے ہر وقت خاور کا لباس' خاور کے جوتے' خاور کا یہ خاور کا وہ ـــــ وہ تو جی خاور کو دیکھ کر جیتی ہے۔"

"چلو اچھا ہوا! خاور خوش تو پھر سب ٹھیک ہے" میں نے کہا۔

اس کے باوجود میرا اطمینان نہ ہوا سب ٹھیک نہیں تھا کہیں نہ کہیں کوئی ایسی بات تھی جسے میں کیا خود خاور بھی نہ سمجھ سکا تھا رمضو بابا تو بے چارہ محض رمضان خان تھا۔

---

میں نے دونوں کی دعوت کی!

پروین کو دیکھ کر میں حیران سا رہ گیا۔ آف وائٹ رنگ کے سوٹ میں اس کا نمک بلکہ زیادہ بہتر تو یہ ہے کہ کالا نمک چمک رہا تھا' اندرونی طمانیت اور شادمانی سے۔۔۔ یہی نہیں سکڑی سمی کے برعکس وہ اب پراعتماد تھی۔ جلد ہی میں یہ محسوس کئے بغیر نہ رہ سکا کہ وہ خاور کی چکور تھی۔

"خاور یہ لو! خاور یہ کھاؤ' خاور یہ بہت ٹیسٹی ہے خاور یہ۔۔۔"

خاور لقمہ کبوتر بنا بیٹھا تھا۔

مجھ سے رہا نہ گیا "بھابی! خاور کا فیڈر کہاں رہ گیا۔"

خاور نے خوش دلی سے قہقہہ لگایا وہ میری بات نظرانداز کرتے ہوئے بولی "سلیم بھائی! اب آپ بھی شادی کر ہی لیں۔"

"ارے بھابی!۔۔۔"

میں فقرہ مکمل نہ کر پایا۔ مجھے خاور کی قسمت پہ رشک آ رہا تھا۔ کم بخت عمر بھر عورتوں کے معاملہ میں ایڈونچرس رہا اور اب ایسی اچھی بلکہ فلمی اصطلاح میں "پتی ورتا استری" مل گئی ایک ہم ہیں کہ نہ لڑکی ملی نہ بیوی۔"

خاور چمک کر بولا "یہ کم بخت اتنا سست ہے کہ اٹھ کر منہ نہیں دھوتا' بیاہ کیا کرے گا۔"

"تو میں تلاش کر دیتی ہوں۔"

"کر دو۔۔۔ مگر اپنی جیسی تلاش کرنا۔"

"کیوں؟"

"تم جیسی بیویاں مرد کا دماغ خراب کر دیتی ہیں اور وہ کسی کام کا نہیں رہتا۔"

"بالخصوص مرد اگر خاور ہو" میں نے لقمہ دیا۔

کالے نمک پر سرخی کی لہر دوڑ گئی۔۔۔ خوشی؟ کامرانی؟ شرم؟ خفت؟

---

ہم دونوں اپنے پسندیدہ ریستوران کے کافی کارنر میں تھے۔

"یار خاور!" میں نے کہا "میں اب تک نہیں سمجھ سکا۔"

"کیا۔"

"تمہارا شادی کرنا۔"

"دنیا بھر کے مرد شادی کرتے ہیں اس میں مجھنے سمجھانے کی کیا بات ہے؟"

"تم دنیا بھر کے مردوں میں سے نہیں ہو' تم ان مردوں میں سے ہو جن کی دنیا اور بھی ہوتی ہے اور اس میں بیوی کی گنجائش نہیں ہوتی۔"

وہ کچھ دیر تک کافی کے کپ کو گھورتا رہا پھر بولا "شاید تم ٹھیک ہی کہتے ہو۔ سچی بات تو یہ ہے کہ میں خود بھی نہیں سمجھ سکا کہ یہ سب کیسے ہو گیا۔"

"اور اب تم خوش ہو۔"

"بہت"

"بس تو پھر ٹھیک ہے۔"

"مجھے جب رضو نے اس کے گھر آنے' پھول لانے یا کھانا پکانے کا بتایا تو میں نے رضو کو منع بھی کیا' غالباً اس نے منع نہ کیا اور وہ یہ سب کچھ کرتی رہی۔"

"تم سے ملے بغیر"

"ہاں! یہی تو عجیب بات ہے' نہ دفتر آتی نہ میری موجودگی میں کبھی گھر آئی۔ عورت خدمت گزاری یا محبت کرتی ہے تو کم از کم داد تو چاہتی ہی ہے نا۔"

"ہاں! یہ تو ٹھیک ہے۔"

"مگر اللہ کی اس بندی نے کبھی جھوٹے منہ بھی نہ پوچھا' فون کرتے بھی یہ نہ پوچھا کہ اس کا لایا ہوا سالن کیسا تھا" اس نے خاموش ہو کر کافی کا گھونٹ بھرا پھر بولا "پہلے پہل خاصی الجھن سی ہوتی' پھر میں نے سوچا ابنارمل ہے' اگر میری خدمت سے اسے خوشی ہوتی ہے تو میرا کیا جاتا ہے چنانچہ میں لاتعلق سا ہو گیا لیکن--- لیکن کچھ عرصہ بعد جیسے مجھے اس کی عادت سی پڑ گئی' میں گھر جانے سے پہلے سوچتا کیا وہ آج پھول لائے گی اگر لائے گی تو کون سے؟ اگر کھانا پکایا ہے تو کون سا؟ کیا پچھلی مرتبہ کی مانند اس مرتبہ بھی نمک کم رہ جائے گا--- وہ ہنسا

پھر بولا "مجھے اپنی سالگرہ کی تاریخ بطور خاص یاد نہیں' نہ میں نے کبھی سالگرہ منائی ہے لیکن تعجب اس وقت ہوا جب رات کو گھر پہنچا تو چاکلیٹ کیک کے ساتھ ہیپی برتھ ڈے کا کارڈ میز پر سج رہا تھا۔"

"صرف کیک؟"

وہ ہنسا "اور کون ہوتا۔"

"اور کیک بھی چاکلیٹ --- خاصی علامتی بات ہے۔"

وہ خوشی سے مزید ہنسا۔

"اور خبیث انسان! تم نے یہ سب مجھ سے چھپائے رکھا۔"

وہ جھینپ کر بولا "یار معاف کرنا! واقعی میں نے تم سے یہ سب چھپا کر رکھا۔

"اس نے منع کیا تھا۔"

"وہ کیوں منع کرنے لگی وہ تو مجھ سے ملتی ہی نہ تھی دراصل..." وہ نیا سگریٹ سلگا کر بولا "دراصل --- یہ ایک ذاتی اور خفیہ سا راز تھا جس میں میں کسی کو بھی شریک نہ کر سکتا تھا۔"

"ذاتی اور خفیہ راز؟"

"اسے یوں سمجھو بچہ اپنے تمام کھلونے دوسرے بچوں کو کھیلنے کے لئے دے دیتا ہے مگر ایک آدھ ایسا کھلونا بھی ہوتا ہے جسے وہ سب سے چھپا کر رکھتا ہے اور کسی کو بھی اس سے کھیلنے نہیں دیتا۔"

"مس پروین بھی ایسا ہی کھلونا تھی۔"

"ایڈیٹ! وہ کھلونا نہ تھی۔ بلکہ اس کا یہ سب کچھ کرنا یعنی دور رہ کر بلکہ روپوش رہ کر خدمت کرنا میرے لئے ایک خاص طرح کی لذت میں تبدیل ہو چکا تھا ایک خاص طرح کا تھرل محسوس ہونے لگا تھا مجھے۔"

"میں نہیں سمجھا۔"

"تم کیا کوئی بھی نہ سمجھ سکتا تھا میں خود عجیب سے پس میں تھا --- اس لئے تو تم سے ہر بات چھپائی گئی تھی" ہم دونوں کچھ دیر تک خاموش بیٹھے کافی پیتے رہے پھر وہ بولا "مجھے بخار کی دھند میں کچھ کچھ یہ احساس سا تھا کہ کوئی عورت ہے جو میری دیکھ بھال کر رہی ہے

کئی راتوں کے بعد جب ایک رات میں قدرے پر سکون تھا تو میری آنکھ کھل گئی وہ خاموش بیٹھی آنسو بہا رہی تھی، میں حیرت زدہ سا اسے دیکھتا رہ گیا جب اسے میرے جاگنے کا اندازہ ہو گیا تو وہ اٹھنے لگی مگر میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا اور پھر عجیب بات یہ ہوئی کہ میں اسے چپ کرانے لگا تو میری آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے ہم دونوں خاموشی سے ایک دوسرے سے لپٹے روتے رہے۔"

"رونے والے تجھے کس بات پہ رونا آیا۔"

"بکواس مت کرو! تم یہ سب نہیں سمجھ سکو گے۔"

"سو تو ہے۔"

"ایک بات اور سنو---" یہ پچھلے دنوں کی بات ہے" وہ لمحہ بھر کو جھجکا، بات کہے یا نہ کہے مگر پھر بولا "ایک رات آنکھ کھلی تو وہ میرے پیر چوم رہی تھی۔" عجب والہانہ انداز سے---- دیوانہ وار۔"

"کیوں؟ تم اسے منہ چومنے نہیں دیتے۔"

"خبیث! بد زبانی سے باز آ!" وہ ہنستے ہوئے بولا" وہ تمہاری بھابی ہے۔"

"یہی تو مصیبت ہے کہ وہ میری بھابی ہے۔"

---- اور اب چند ماہ بعد وہ یہ خوشخبری سنا رہا تھا "وہ چڑیل عورت کے روپ میں تمہاری بھابی ہے۔"

"کیا احمقانہ بات ہے۔"

"تم مانو گے نہیں بلکہ کوئی بھی نہ مانے گا مگر حقیقت یہی ہے۔"

"کہ بھابی..." میرے منہ سے فقط چڑیل ادا نہ ہو رہا تھا۔

وہ پر زور لہجہ میں بولا "وہ جادوگرنی ہے۔"

"یارا خدا کے لئے..."

مگر وہ اپنی دھن میں بولے گا" وہ ویمپائر ہے... ہاں! مجھے اب اندازہ ہوا ہے شی از اے بلڈ تھرسٹی ویمپائر۔"

"آخر بات کیا ہے" یہ خاور کا نیا روپ تھا جو پہلے سے بھی زیادہ ناقابل فہم تھا اس نے سگریٹ پھینک کر نیا سگریٹ سلگایا اور طویل کش لیا۔

"وہ تمہیں تنگ کرتی ہے۔"

"نہیں۔"

"زیور، کپڑے کی فرمائش کرتی ہے۔"

"نہیں۔"

"لڑتی ہے۔"

"نہیں"

"خدمت میں کمی آگئی ہے۔"

"نہیں"

"تمہاری پوجا کرنے میں کمی آگئی ہے۔"

"نہیں"

"تو پھر یہ کیا بکواس ہے"

"یہی تو میں کہتا ہوں کہ اسے سمجھنا آسان نہیں۔"

"تمہیں، پتہ ہے میں "گرائپ واٹر" کا عادی ہوں۔"

"ہاں۔۔۔ تو کیا اس نے چھڑانے کی کوشش کی؟"

"نہیں! چھڑانا کیا اس سے الٹ بات ہوئی۔"

"یعنی؟"

"ایک دن میں گھر آیا تو فریج میں بیئر کی بوتلیں ٹھنڈی ہو رہی تھیں۔"

"اور تم اس پر ناراض ہو؟"

"نہیں نہیں! ناراض تو نہیں۔"

"تو پھر؟"

"بس مجھے اچھا نہ لگا۔"

"اس نے بھی ساتھ بیٹھ کر پی؟"

"وہ تو کافی بھی نہیں پیتی۔"

"تو پھر تمہیں اچھا کیوں نہ لگا۔"

اس نے بے چینی سے پہلو بدلا، ادھ جلا سگریٹ ایش ٹرے میں پھینکا اور بولا 'یار وہ میری بیوی ہے۔"

"تو؟"

"اسے تو شراب نوشی سے منع کرنا چاہئے نہ کہ..."

"بھئی عجیب گھامڑ شوہر ہو' میں تمہاری منطق نہیں سمجھ سکا یعنی روایتی بیویوں کی مانند وہ تمہارے ساتھ لڑتی جھگڑتی تو پھر تم خوش ہوتے لیکن دل پر جبر کر کے تمہاری خوشی کی خاطر اور خود شراب گھر میں لے آئی تو ناراض ہو رہے ہو۔"

وہ خاموش رہا۔

"پھر تم نے کیا کیا؟"

"زہر مار کرنا پڑی مگر مزا نہ آیا۔"

"اوہ! تو یہ تکلیف ہے۔"

"اور سنو---"

"ابھی اور بھی ہے سنانے کو..."

"یار! ابھی چند دن کی بات ہے وہ رک گیا۔

"کہو! کہو!" شاید اس نے بالاخر کوئی ایسی حرکت کر دی تھی جو نہ کرنی چاہئے تھی۔

--- وہ ایک--- وہ ایک عورت لے آئی۔"

"ایک عورت لے آئی--- کیا مطلب؟ گھر کے کام کے لئے؟"

"نہیں بھئی میرے لئے..."

"تمہارے لئے--- کیا مطلب؟"

"بڑے گدھے ہو" وہ چڑ کر بولا "سمجھتے کیوں نہیں--- میرے لئے" میرے پر زور دے کر بولا "میرے لئے--- میرے لئے۔"

کیا خاور وہ کہہ رہا تھا جو میں سمجھ رہا تھا میں نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا "یعنی کہ تمہارے لئے' خالص تمہارے لئے۔"

"ہاں! ہاں" وہ جلدی سے بولا۔

"پھر تم نے کیا کیا؟"

"وہ بے زاری سے بولا" مجھے کیا کرنا تھا زہر مار کرنا پڑی مگر مزا نہ آیا۔"

"خاور حرام زادے! تمہیں اندازہ نہیں کہ تم کتنے خوش قسمت ہو۔"

اس نے غصہ سے میری طرف دیکھا "خوش قسمت' بلڈی ہیل۔"

"ہاں! اور کیا؟"

"تمہیں پتہ ہے اس کا نتیجہ کیا نکلا --- اس دن کے بعد سے نہ تو اپنا گرائپ واٹر چکھنے کو جی چاہا اور نہ ہی..."

اوہ! تو یہ تکلیف ہے۔"

"اسی لئے تو کہتا ہوں کہ پروین نے مجھ پر جادو کرایا ہے اس نے مجھے کسی کام کا نہیں چھوڑا --- اب میں ایک مرد سے محض ایک خاوند بن کر رہ گیا ہوں' ماضی کا خاور مرچکا ہے --- شی از اے بلڈی وچ!"

"تو طلاق دے دو۔"

"اس نے میری جانب یوں دیکھا گویا میرا دماغ چل گیا ہو۔"

"طلاق دے دوں؟"

"ہاں! جب اتنے تنگ ہو تو..."

"مگر میں تنگ تو نہیں۔"

"تو پھر..."

"آئی کانٹ --- تم یہ سب نہ سمجھ سکو گے' اس نے مجھ پر تعویذ کرا رکھے ہیں' کوئی بھی سمجھ سکتا' شی از اے وچ' میں خود بھی یہ سب نہیں سمجھ پا رہا --- بٹ شی از اے... اے لو!"

میں نے نظریں اٹھالیں تو پروین آتی دکھائی دی' اس نے مسکراہٹ کا لشکارا مارا' مجھے دیکھ کر خوشی سے چہکی "کیسے ہیں سلیم بھائی آپ --- مجھے اندازہ تھا کہ آپ یہیں ملیں گے "پروین نے مجھے عجب نظروں سے دیکھا۔

وہ ہمارے ساتھ بیٹھ گئی میں مزید کافی کا آرڈر دینے لگا تو وہ خاور سے مخاطب ہوئی "جانی! میں نے سٹور سے آج برازیل کی بڑی شاندار کافی خریدی ہے کیوں نہ گھر چل کر پئیں۔ آپ بھی چلئے نا سلیم بھائی۔"

"مجھے تو رہنے دیں" میں نے گھڑی دیکھی "مجھے ایک ضروری کام ہے۔"

"تو پھر ہم چلیں خاور ڈیئر۔"

"ہاں چلو۔"

میں ان دونوں کو جاتے دیکھتا رہا خاور سے ایک یا شاید آدھا قدم آگے چلتی محسوس ہو رہی تھی میں اپنے عزیز ترین دوست کو کافی کار ہی سے نہیں بلکہ اپنی زندگی سے بھی نکلتا محسوس کر رہا تھا۔ میں نے جھوٹ بولا تھا مجھے کوئی ضروری کام نہ تھا۔ لہٰذا بیٹھا رہا تازہ کافی منگوائی زہر مار کی مگر مزا نہ آیا۔

○

# جنگل شہر

## منشا یاد

رات کو وہ دیر تک پڑھنے کا عادی تھا۔

کتابوں اور رسالوں کے علاوہ وہ اخبار کا اداریہ' کالم اور خبروں کی تفصیل بھی رات ہی کو پڑھتا تھا۔ جب اس کی آنکھیں پڑھتے پڑھتے تھک جاتیں تو وہ بتی بجھا کر کچھ دیر پڑھی ہوئی باتوں اور ان سے پیدا ہونے والے خیالوں کی جگالی کرتا' جس کے دوران میں اسے نیند آ جاتی اور وہ سو جاتا۔ مگر کچھ عرصہ سے ایک عجیب بات ہو گئی تھی۔ جونہی وہ مطالعہ کے بعد بتی بجھا کر سونے لگتا۔ کمرے میں کسی چیز کے چلنے کی آہٹ سنائی دینے لگتی۔ ایسے لگتا جیسے اندھیرا ہوتے ہی کوئی چوہا' چھپکلی یا سانپ حرکت کرنے لگا ہو۔ وہ دوبارہ بتی جلا کر کمرے کا جائزہ لیتا۔ دیر تک تکیے سے گردن اٹھائے اور کان لگائے رکھتا مگر کوئی آہٹ یا آواز سنائی نہ دیتی۔ لیکن جونہی وہ روشنی بند کرتا۔ لگتا کوئی زندہ چیز تھوڑی دیر بعد رینگ کر ساکن ہو جاتی یا سانس لے کر چپ ہو جاتی ہے مگر آہٹ یا سرسراہٹ کا دورانیہ اتنا قلیل ہوتا کہ اسے اس کی صحیح نوعیت جاننے کی بھی مہلت نہ ملتی۔ کبھی لگتا جیسے کہیں کچھ ابل یا رس رہا ہو۔ کوئی چیز کسی دوسری چیز کو کھا یا نگل رہی ہو۔

اس کی بیوی اس کے دیر تک بتی جلائے رکھنے اور پڑھتے رہنے کی عادت سے بیزار رہتی تھی اور عام طور پر بچوں کے ساتھ دوسرے کمرے میں سوتی تھی۔ مگر کبھی وہ اس کے پہلو میں لیٹی ہوتی تب بھی اسے کسی قسم کی آہٹ سنائی نہ دیتی اور وہ اسے اس کا وہم قرار دیتی تھی۔ لیکن پھر ایک روز اس نے میز کی درازیں صاف کرتے ہوئے کاغذوں کے بہت سے پرزے دیکھے یہ اس کی تعلیمی اسناد تھیں جنہیں چوہے نے کتر ڈالا تھا۔ بڑی تلاش اور محنت کے بعد

آخر کار ایک چھوٹی سی چوہیا ملی جسے پکڑ کر ہلاک کر دیا گیا۔ اور اگرچہ ان میں سے بعض اسناد کی اب ضرورت نہیں رہی تھی کہ اس نے ان سے بہتر ڈگریاں حاصل کر لی تھیں مگر پھر بھی وہ ریکارڈ کے لئے ضروری تھیں اس لئے اسے ان کے دوبارہ حصول کے لئے خاصی محنت اور بھاگ دوڑ کرنا پڑی۔ اس کے بعد جب بھی وہ کمرے میں آہٹوں کی شکایت کرتا اس کی بیوی میز کی درازوں' پیٹیوں اور بک شیلفوں کی صفائی کرنے لگ جاتی مگر کچھ بھی برآمد نہ ہوتا۔ البتہ کمرے میں چھپکلیاں ضرور تھیں وہ انہیں مارتی بھگاتی رہتی مگر وہ کبھی ختم نہ ہوتیں۔ چند روز بعد پھر کوئی کسی دیوار چھت سے چپکی نظر آنے لگتی۔

ایک روز اس کی بیوی نے اطلاع دی "اب آپ اطمینان سے سوئیں گے۔ رات کو جب پنکھا چلتا تھا۔ دیوار پر لگا ہوا کیلنڈر ہوا سے ہلتا رہتا تھا میں نے اتار دیا ہے۔"

اگرچہ اس نے یہ نہیں بتایا کہ روشنی میں کیلنڈر کیوں نہیں ہلتا تھا مگر اس کا قیافہ سچ نکلا اور اگلی رات سکون سے گزر گئی۔ مگر دوسرے تیسرے روز پھر وہی صورت حال پیدا ہو گئی۔ وہ کبھی شیلفوں کے نیچے بچھے ہوئے اخبار کا پھٹا ہوا کونا ٹھیک کرتا' کبھی ردی کی ٹوکری میں پڑے کسی لفافے یا خالی پولی تھین بیگ کو باہر نکال کر پھینکتا اور کبھی کھڑکیوں کے پردوں کا جائزہ لیتا۔ اس نے پیچ کس لے کر سیلنگ فین کے پروں کے نٹ بولٹ بھی کسے اور اپنے کانوں کا میل بھی صاف کیا مگر آہٹوں اور سرسراہٹوں کا سلسلہ بند نہ ہوا۔ تنگ آ کر اس نے اسے معمول کا ایک حصہ سمجھنا اور بھلانا چاہا لیکن جونہی نیند کی کوئی تتلی اپنے نرم نرم پروں سے اس کے پپوٹے سہلانے لگتی وہ اندھیرے کمرے میں سرسراہٹ کی آواز سن کر چونک پڑتا۔ اس کے بعد نیند اڑ جاتی اور بہت سے اچھے برے خیالات اس کے ذہن کو گھیر لیتے۔ وہ انہیں جھٹکنے کی کوشش کرتا مگر وہ چیونٹیوں کی طرح رینگتے اور کاٹتے رہتے۔

آہستہ آہستہ سرسراہٹ اسے بتی جلا کر پڑھتے وقت بھی سنائی دینے لگی۔ لیکن اس کی نوعیت اب بھی واضح نہ تھی۔ کبھی اس پر پاؤں کی چاپ کا شائبہ ہوتا۔ کبھی صریر خامہ کا اور کبھی لگتا کسی نے لمبا سانس لیا' چھوڑا یا پھونک ماری۔

اس کا بچپن ایک پہاڑی گاؤں میں گزرا تھا۔ جہاں گلہریاں تھیں' نیولے تھے' بھڑیں اور شہد کی مکھیاں تھیں۔ کھٹمل' پسو اور چھچھوندریں تھیں اور گھروں' درختوں اور منڈیروں پر بندر دوڑتے پھرتے تھے۔ لڑکپن میں اس نے گیدڑ' لومڑیاں' ریچھ اور بھیڑیے دیکھے

تھے۔ دور افتادہ سکول تک آتے جاتے کئی بار اس کا ریچھوں، بھیڑیوں اور سانپوں سے پالا بھی پڑا تھا۔ بعض اوقات بھوکے جنگلی جانور گھروں میں بھی گھس آتے تھے۔ گھاس پھونس کی چھتوں میں سانپ گھسے رہتے تھے۔ سوتے میں دو ایک بار اسے کسی چوہے نے کاٹ بھی لیا تھا۔ رات بھر جنگلی جانوروں کے بھاگنے دوڑنے ایک دوسرے کو شکار کرنے اور چیخنے چلانے کی آوازیں سنائی دیتی رہتی تھیں لیکن اس کے باوجود وہ کبھی خوف اور پریشانی میں مبتلا نہیں ہوتا تھا اور دیئے یا لالٹین کی روشنی بجھا دینے کے بعد گہری اور چین کی نیند سوتا تھا۔

اس نے بہت کٹھن حالات میں اپنا تعلیمی سفر جاری رکھا تھا لڑکپن میں کئی بار دریا چڑھا ہوتا، برفیلی ہوائیں چل رہی ہوتیں کوئی چٹان ٹوٹ کر یا گلیشیر پھسل کر سکول جانے کا راستہ روک لیتا مگر وہ کبھی ناکام واپس نہ لوٹتا وہ بہت آگے جانا چاہتا تھا اپنے خوابوں اور خواہشوں کے سہارے وہ گھنے جنگلوں، خاردار راستوں اور سنگلاخ چٹانوں کو عبور کرتا ہوا جگمگاتے شہر میں آبسا تھا۔

وہ ایک سرکاری کالج میں روزانہ اجرت (Daily Wages) پر پڑھاتا تھا۔ نئی بھرتی پر پابندی کی وجہ سے وہ پچھلے کئی برسوں سے کبھی ایڈہاک اور کبھی روزانہ اجرت پر ملازمت کر رہا تھا۔ شروع شروع میں وہ ایڈہاک لیکچرار تھا لیکن پھر ایڈہاک لیکچراروں کے مستقل کرنے کے مطالبے سے پریشان ہو کر حکومت نے ایڈہاک تقرریوں پر بھی پابندی لگا دی تھی۔ تاہم پرنسپلوں کو اختیار دے رکھا تھا کہ وہ اساتذہ کی کمی اور اپنی ضرورت کے پیش نظر نوے دن کے کنٹریکٹ کی بنیاد پر بھرتی کر سکتے تھے جن کو چھٹیوں کی تنخواہ نہیں دی جاتی تھی اور ہر تین ماہ بعد اور گرمی کی تعطیلات سے پہلے سبکدوش کر دیا جاتا تھا تاکہ ان کی ملازمت میں وقفہ آ جائے اور انہیں مستقل کئے جانے کا قانونی حق نہ مل سکے۔

اس کی بیوی اور جاننے والوں نے اسے کئی بار کوئی دوسری ملازمت تلاش کرنے کا مشورہ دیا تھا لیکن ایک تو معلم بننا اس کا خواب تھا کہ اس کے خیال میں معاشرے کی ساری پسماندگی اور خرابیوں کی سب سے بڑی وجہ شرح تعلیم کی کمی تھی اور نئی نسل کو علم دوستی اور تعلیم کے فروغ کے لئے تیار کرنا بے حد ضروری تھا۔ دوسرے ہر طرح کی ملازمت پر مسلسل پابندی چلی آ رہی تھی۔ اس دوران میں کئی حکومتیں تبدیل ہوئی تھیں لیکن ملازمتوں پر پابندی کی پالیسی تبدیل نہیں ہوئی تھی۔ البتہ بعض اوقات عارضی طور پر پابندی اٹھا لینے کا اعلان کر دیا جا

مگر جب تک عام لوگوں کی درخواستوں پر دفتری کارروائیاں مکمل ہوتیں اپنی پسند اور ضرورت کے لوگوں کو بھرتی کر کے دوبارہ پابندی لگا دی جاتی۔ یہ کھیل پچھلے کئی برسوں سے جاری تھا۔ تاہم اس نے اس دوران میں اپنی تعلیمی استعداد میں خاطر خواہ اضافہ کر لیا تھا۔ مستقل ملازمت نہ ملنے کا شاید یہی ایک مثبت پہلو تھا۔

جب اسے پہلا ایم اے کرنے کے بعد باقاعدہ ملازمت نہ ملی تو اس نے دوسرا ایم اے ایک ایسے سبجیکٹ میں کیا جس کی آسامیاں ہر کالج میں خالی چلی آتی تھیں۔ مگر اس میں وہ کوٹہ سسٹم میں مار کھا گیا۔ بعض دوستوں نے اسے کسی دوسرے صوبے کا ڈومیسائل بنوانے کا مشورہ دیا مگر وہ کوئی جعلی کام نہ کرنا چاہتا تھا۔ اور اب تو اس نے ایک تیسرے مضمون میں بھی ایم اے کر لیا تھا جس کی آسامیاں اس کے اپنے کالج میں خالی پڑی تھیں۔ لیکن بھرتی پر پابندی کے سبب اسے کنٹریکٹ کی بنیاد پر کام کرنا پڑ رہا تھا۔

اس کے بے تکلف دوست اور جاننے والے اسے دیہاڑی دار کے نام سے پکارتے تھے تاہم اسے امید تھی کہ ایک روز یہ پابندی ختم ہو گی اور اسے باوقار اور مستقل ملازمت مل جائے گی لیکن اب ایک اور پریشانی پیدا ہو گئی تھی وہ اوور ایج ہو گیا تھا۔ اگر حکومت سے اسے عمر میں رعایت نہ ملی یا کمیشن نے اسے سلیکٹ نہ کیا تو روزانہ اجرت کا موجودہ سلسلہ بھی ختم ہو سکتا تھا مگر حکومت نے اب پھر اعلان کیا تھا کہ بھرتی سے پابندی اٹھنے والی ہے اور اگرچہ یہ دعویٰ بھی کیا جاتا تھا کہ بھرتی میرٹ پر ہو گی مگر میرٹ شاید سیاسی سفارشوں کی بنیاد پر تیار کیا جاتا تھا اور اس کی پشت پر کوئی سیاسی سفارش نہ غیر سیاسی۔

اس نے اپنی ملازمت کی ابتداء ایک پرائیویٹ تعلیمی ادارے سے کی تھی۔ لیکن جلد ہی چھوڑ دی کیونکہ اس قلیل تنخواہ میں جو اسے ملتی تھی اس کا گزارہ نہیں ہوتا تھا۔ سکول کی انتظامیہ خود تو خوب کماتی تھی بڑی بھاری بھاری فیسیں لیتی تھیں اور شاید حکومت سے گرانٹ بھی۔ لیکن پڑھانے والوں کو کاغذات میں درج معاوضے سے بہت کم تنخواہیں دیتی تھی۔ اسے ان پرائیویٹ تعلیمی اداروں سے یہ شکایت بھی تھی کہ بظاہر وہ تعلیم کے فروغ کا کام کر رہے تھے لیکن درحقیقت وہ ایسے بچوں کی تعلیم اور توجہ کے لئے مخصوص تھے جن کے والدین بھاری فیسیں ادا کر سکتے تھے بعض لوگوں نے اسے اپنا سکول کھول لینے کا مشورہ بھی دیا کیونکہ یہ نہایت منافع بخش کاروبار ثابت ہو رہا تھا۔ پڑھانے کے لئے قلیل تنخواہوں پر اعلیٰ تعلیم یافتہ افراد

آسانی سے مل جاتے تھے اور ان مہنگے سکولوں میں پڑھنے والے بچوں کی کمی نہیں تھی لیکن اپنا سکول کھولنے کے لئے اچھی خاصی انوسٹمنٹ کی ضرورت تھی اور وہ قرض لینا چاہتا تھا نہ اس ڈھنگ سے روپیہ کمانا۔ البتہ وہ یہ سوچ سوچ کر ضرور حیران ہوتا کہ لوگوں کے پاس اتنا پیسہ کہاں سے آگیا تھا۔ مہنگی اور سمگل شدہ چیزوں سے دکانیں بھری پڑی تھیں۔ شاپنگ سنٹروں اور ڈیوٹی فری شاپس پر بھیڑ لگی رہتی تھی۔ درآمدی اور مہنگی اشیاء سماجی مرتبے کی علامت بن گئی تھیں۔ ہر کوئی مہنگے سکولوں' ہسپتالوں' ہوٹلوں اور مہنگی سواریوں کی طرف لپکتا تھا۔ بالٹی گوشت' پیزا اور چکن تکہ کی دکانوں' ریستورانوں پر باری نہ آتی تھی۔ اصولا" آدھ کلو گوشت خریدنے کی استطاعت نہ رکھنے والا بھی آدھا بکرا یا دنبہ تلواتا۔ سارا معاشرہ کاروباری ہو گیا تھا۔ اور ہر کوئی ہر طریقے سے پیسہ بٹورنے میں لگا ہوا تھا۔ پیر فقیر اور سجادہ نشین کئی کئی منزلہ عمارتیں' پلازے اور کئی کئی ستاروں والے ہوٹل تعمیر کر رہے تھے۔ جگہ جگہ پرائیوٹ ہسپتال' کلینک اور لیبارٹریاں قائم ہو گئی تھیں۔ جن میں سرکاری شفاخانوں کے ٹھکرائے ہوئے اور مایوس مریض مہنگا علاج کراتے اور جہاں گردوں اور خون کی خرید و فروخت بھی ہوتی تھی۔ کاروباری میدان میں سمگلنگ' بلیک مارکیٹنگ اور دو نمبر مال کا لین دین عام تھا۔ ہر کوئی ایک دوسرے کو دھوکا دیتا اور آنکھوں میں دھول جھونک رہا تھا۔ کبھی کبھی اسے لگتا چیزیں ہی نہیں ایک نمبر کا آدمی ملنا بھی دشوار ہو گیا تھا۔ البتہ جن لوگوں کے دل میں خدا کا خوف اور گناہ کا احساس ہوتا وہ باقاعدگی سے نماز پڑھتے' زکوۃ دیتے اور جمعہ کا وعظ سنتے تھے۔ اور حرام کھانا پڑ جائے تو بسم اللہ ضرور پڑھ لیتے تھے۔ پھر بھی اگر دل میں کچھ میل رہتا تو عمرہ اور حج کر آتے جس سے ان کا اندر باہر پاک اور صاف ہو جاتا۔ تقویٰ کا درس دینے والے علماء اپنے ساتھ کلاشنکوف برداروں کا دستہ رکھتے۔ سیاستدان الیکشن پر روپیہ پانی کی طرح بہاتے اور الیکشن جیت کر ایک ایک بوند کا حساب لیتے۔ کروڑوں کے قرضے لیتے' سود معاف کراتے اور اپنے عزیز و اقارب کو ان کی پسند کی ملازمتیں دلواتے۔ اقتدار کے حصول کی خاطر ہر اصول اور اخلاقی قدر کو پامال کر دیا جاتا۔ اقتدار میں آنے والوں کا اپنا مسئلہ حل ہو جاتا تو انہیں لگتا جیسے عوام کے سارے مسائل بھی حل ہو گئے۔ وہ کبھی کسی حکمران کی تقریر سنتا تو اسے لگتا کہ ایک ہی تقریر تھوڑے سے رد و بدل کے ساتھ برسوں سے کی جا رہی ہے۔ افسر شاہی میٹنگوں' سیمیناروں اور غیر ملکی دوروں میں مصروف رہتی۔ وہ ان سب باتوں پر کڑھتا رہتا لیکن پھر اس نے اخبار میں مضامین لکھنے کا سلسلہ شروع کر دیا۔

اس کے مضامین پسند کئے جا رہے تھے۔ سٹاف اور پرنسپل نے بھی ان کی تعریف کی اور اس اخبار کی معرفت پڑھنے والوں کے بہت سے خطوط بھی آئے جن میں ان مضامین کو سراہا گیا تھا لیکن ایک دن نظام تعلیم کی خرابیوں پر اس کے لکھے گئے ایک مضمون پر اس کی جواب طلبی ہو گئی اور اسے تنبیہہ کی گئی کہ وہ آئندہ کوئی مضمون متعلقہ وزارت سے اجازت لئے بغیر شائع نہیں کرائے گا۔ اس نے مضامین لکھنے کا سلسلہ موخر کر دیا اور تھرو پراپر چینل مضامین چھپوانے کی اجازت کے لئے درخواست دی جو کئی مہینوں سے دفتری فائلوں اور ضابطوں میں دبی پڑی تھی وہ جب بھی پرنسپل سے اس کا ذکر کرتا وہ اسے وزارت کے دفتر میں جا کر متعلقہ افسران سے ملنے کا مشورہ دے کر ٹال دیتے۔ مگر وہ دفتر جانے سے ہچکچاتا تھا پتہ نہیں دفتر والے کیا سلوک کریں کیسے پیش آئیں۔ اسے اپنی عزت اور وقار بہت عزیز تھا۔

اس کے ایک کولیگ کا خیال تھا کہ وہ سوچتا بہت ہے جس سے دماغ میں خیالات کا ہجوم رہتا ہے۔ اس کا مشورہ تھا کہ وہ مضامین لکھنے کا سلسلہ جاری رکھے تاہم ان کی اشاعت اس وقت تک ملتوی رکھ سکتا ہے جب تک تحریری اجازت نہ مل جائے۔ لیکن جس تحریر کے بارے میں لکھنے والے کو یقین نہ ہو کہ وہ لوگوں تک پہنچے گی یا نہیں۔ اس کا لکھنا بے حد دشوار ہو جاتا ہے اس نے بھی مضامین لکھنے کا سلسلہ ملتوی کر دیا۔

ایک روزہ وہ کالج سے لوٹا تو اس کی بیوی نے کہا۔

"گھن لگ گیا ہے۔"

"کسے؟" اس نے چونک کر پوچھا۔

"پلنگ کی لکڑی کو" وہ بولی "میں نے آج صفائی کرتے ہوئے بہت سا برادہ دیکھا ہے کوئی دوائی لا دیں ورنہ پلنگ کی لکڑی اندر سے کھوکھلی ہو جائے گی۔"

اسے خیال آیا ضرور یہ آہٹیں اور سرسراہٹیں دیمک ہی کی وجہ سے ہوں گی۔ تکیے یا ہتھیلی سے کان بند ہو تو معمولی سی خراش یا آہٹ بھی غیر معمولی سنائی دینے لگتی ہے۔ چنانچہ اس نے فوراً پلنگ کو کمرے سے نکلوا دیا اور اس رات فرش پر دری بچھا کر سویا مگر آہٹیں اور آوازیں اب بھی آ رہی تھیں تو کیا فرش کو بھی دیمک لگ گئی تھی اس نے پریشان ہو کر سوچا۔

اگلے روز وہ بک شیلف سے کتاب نکال رہا تھا کہ یہ دیکھ کر پریشان ہو گیا

کتابوں کو بھی دیمک چاٹ رہی تھی۔ اس کا مطلب تھا دیمک گھر کی اور چیزوں کو بھی لگی ہوئی تھی اس نے کھڑکیوں دروازوں اور چھت کی لکڑیوں کا جائزہ لیا تو دہل گیا دیمک چپے چپے سارے گھر کو چاٹ رہی تھی۔ وہ جس کسی سے بھی اس کا تذکرہ کرتا اور مشورہ لینا چاہتا وہ اپنی شکایت لے کر بیٹھ جاتا۔ لگتا تھا سارے معاشرے کو گھن لگ گیا تھا۔

ایک روز کالج سے چھٹی تھی اس نے بازار سے دوائی لا کر ہر جگہ سپرے کیا۔ اس کی بیوی نے جھاڑو سے دیواروں اور چھتوں سے دیمک کے گھروندے اور گزر گاہیں صاف کیں۔ اسے قدرے اطمینان ہو گیا دیمک کو اگرچہ پوری طرح ختم نہیں کیا جا سکا تھا کہ دوائی دو نمبر کی تھی یا دیمک اور اینٹی ٹرمائیٹ ڈرگز میں موافقت (Adaptation) پیدا ہو چکی تھی۔ مگر گھر کو اندر سے کھوکھلا کر دینے کی اس کی رفتار ضرور کم ہو گئی تھی۔ مگر رات کو آہٹوں اور آوازوں کا سلسلہ ختم نہ ہوا بلکہ اسے اب یہ آوازیں اور آہٹیں کالج میں پڑھاتے اور اکیلے بیٹھ کر کتاب یا رسالہ پڑھتے ہوئے بھی سنائی دینے لگیں جس کا مطلب تھا خرابی کہیں اس کے اپنے اندر تھی۔

آخر اس نے ای این ٹی سپیشلسٹ سے ملنے کا فیصلہ کر لیا۔

"آپ کے دونوں کانوں میں فنگس ہے" کانوں کے ماہر ڈاکٹر نے معائنہ کرنے کے بعد کہا۔

"وہ کیا ہوتا ہے؟"

"یوں سمجھئے ——— بیکٹیریا نے کانوں میں چھتے لگا لئے ہیں اگر جلد علاج نہ کیا گیا تو پھپھوندی کی انفیکشن دماغ میں بھی سرایت کر سکتی ہے۔"

"سمجھ گیا مجھے بھی کیڑا لگ گیا ہے" اس نے کہا "آپ نکال دیجئے۔"

"پہلے ایک کان صاف کرا لیں کیونکہ کان کو دوائی سے بند کرنا پڑے گا تاکہ بیکٹیریا دوبارہ داخل نہ ہو سکے۔ پھر دوسرا کان صاف کر دیں گے۔"

"آپ دونوں کانوں کو ایک ساتھ صاف کر دیجئے" اس نے کہا "میں کالج سے چھٹی لے لوں گا" "جیسے آپ کی مرضی" ڈاکٹر نے کہا اور دونوں کانوں کو صاف کر کے ان میں دوائی بھر دی اور انہیں اچھی طرح بند کر دیا۔

دونوں کان بند ہوتے ہی وہ ایک نئی کیفیت اور راحت سے آشنا ہوا۔ چاروں

طرف ایک گہری چپ اور سکون چھا گیا۔ وہ سڑک پر آیا تو اسے عجیب طمانیت کا احساس ہوا ہر طرف خاموشی تھی۔ لوگ چپ چاپ آ جا رہے تھے۔ بسوں ویگنوں کے چلنے اور ہارنوں کا شور تھا نہ دکانوں اور ہوٹلوں پر بجتے فلمی گانوں کا۔ لوگ نہایت مہذب اور دھیمے لہجے میں ایک دوسرے سے بات کرتے تھے۔ وہ بس میں سوار ہوا تو کسی مسافر نے گالی بکی نہ کسی نوجوان نے خواتین پر آوازہ کسا۔ سب لوگ ایک ہی روز میں نرم دم گفتگو اور شائستہ ہو گئے تھے اسے بے حد رشک آیا اس نے ایسے ہی خوش خلق اور مہذب معاشرے کا خواب دیکھا تھا۔ اگر معاش کا مسئلہ نہ ہو تو وہ کانوں کو اسی طرح بند رکھے اس نے دل میں سوچا۔

گھر پہنچ کر اس نے بیوی کو بتایا کہ وہ دو ایک روز سن نہیں سکے گا اس لئے اگر کوئی بہت ضروری بات ہو تو اسے لکھ کر دی جائے وہ ہنسنے لگی اور شاید اس نے کچھ کہا بھی مگر وہ سن نہ سکا۔

آج وہ چین کی نیند سونا چاہتا تھا آج اسے کوئی سرسراہٹ یا آواز ڈسٹرب نہیں کر سکتی تھی کھانا کھا کہ وہ کچھ دیر پڑھتا رہا پھر بتی بجھا کر سونے کے لئے لیٹ گیا۔ مگر تھوڑی دیر بعد ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا کمرے میں پہلے کی طرح کسی زندہ چیز کے چلنے پھرنے کی سرسراہٹ سنائی دے رہی تھی۔ کہیں انفیکشن اس کے دماغ میں تو سرایت نہیں کر گئی تھی!!

ڈاکٹر نے اسے اطمینان دلایا کہ اس کے کان اب بالکل صاف تھے اور ان میں کسی طرح کا بیکٹیریا یا فنگس نہیں تھا ڈاکٹر کا خیال تھا کہ وہ سوچتا بہت تھا جس سے دماغ میں اجتماع خون ہو جاتا اور اس کی آواز کانوں میں سنائی دینے لگتی تھی اسے زیادہ سوچنے سے پرہیز کرنا اور پرسکون رہنا چاہیے۔

ایک روز پرنسپل نے اسے اپنے دفتر میں طلب کیا۔ اس کی پیشیاں اکثر ہوتی رہی تھیں شروع میں وہ بہت گھبراتا تھا مگر اب پرنسپل صاحب خود اس کی باتوں اور وضاحتوں سے گھبرانے لگے تھے۔ شاید وزارت کی طرف سے اس کی درخواست کا جواب آیا ہو یہ سوچ کر وہ اندر آیا۔ پرنسپل صاحب ڈانٹنے کے انداز میں بولے۔

"آپ اپنے ساتھ میرے لئے بھی مشکلات پیدا کرتے رہتے ہیں۔"

"کیوں ——— کیا ہوا سر؟"

آپ نے کل جس لڑکے کو ایگزامینیشن ہال سے باہر نکالا۔ جانتے ہیں وہ کون

تھا؟"

"ایک سٹوڈنٹ۔——— آدمی کا بچہ۔"

"نہیں" وہ بولے۔ اسے اپنی ہنسی روکنا مشکل ہو گیا۔

"تو کیا وہ آدمی کا بچہ نہیں تھا۔"

"میرا یہ مطلب نہیں" پرنسپل نے کہا "وہ محض ایک سٹوڈنٹ نہیں۔ اس کا باپ..."

"مجھے معلوم ہے سر" اس نے اطمینان سے جواب دیا "مگر قواعد اور اصول تو سب کے لئے یکساں ہوتے ہیں وہ چیٹنگ کر رہا تھا۔"

"میری ٹرانسفر ہو گئی ہے اور آپ کی چھٹی۔"

"مجھے آپ کی ٹرانسفر کا افسوس ہے۔"

اسے یقین ہو گیا تھا کہ اس جیسے لوگوں کے آگے بڑھنے کے سارے راستے بند تھے۔

وہ جہاں سے چلا تھا وہیں لوٹ آیا۔

اب اس نے اپنے پہاڑی گھر میں سکول کھول رکھا ہے جہاں وہ دن بھر چبوترے پر بیٹھا مختلف عمروں کے لڑکے لڑکیوں کو پڑھاتا رہتا ہے۔

اس گاؤں میں بجلی ہے نہ اخبار آتا ہے۔ بعض اوقات بھوکے جنگلی جانور گھروں میں بھی گھس آتے ہیں اور رات بھر ان کے بھاگنے دوڑنے' ایک دوسرے کو شکار کرنے اور چیخنے چلانے کی آوازیں سنائی دیتی رہتی ہیں۔ گھاس پھونس کی چھتوں میں سانپ اور چوہے گھسے رہتے ہیں لیکن وہ خوف اور پریشانی میں مبتلا نہیں ہوتا اور لالٹین بجھا دینے کے بعد گہری اور چین کی نیند سوتا ہے۔

○

# پابجولاں

—— مرجب قاسمی

"سالے ——" نیچے ڈھلکتی ہوئی عینک کو دوبارہ ناک کی پھننگ پر اٹکاتے ہوئے وہ مجسم گالی بن گیا۔ "انسانوں کو بھی کٹھ پتلیاں سمجھتے ہیں۔ ہر دفعہ گنتی بھلا دیتے ہیں۔"

دراصل آج اس کا سارا دھیان اپنی بیوی کی طرف تھا۔ وہ کئی دنوں سے اپنی بیوی کی فرمائش ٹال رہا تھا اور اسی بات پر آج تھیٹر آتے ہوئے ان کی آپس میں خاصی تو تو میں میں ہوئی تھی۔ اور اب مسلسل اس کا ذہن اسی ادھیڑبن میں تھا کہ جلدی گھر پہنچے۔ آج کی آمدنی میں اس کا کمیشن بھی خاصا بنتا نظر آ رہا تھا۔ اس لئے اسے امید تھی کہ جب وہ بیوی کا تحفہ اور موتیا کے گجرے لے کر جائے گا تو بیوی کی خشمگیں آنکھیں —— گلہ بھول کر مسکرانے لگیں گی —— وہ مسکرایا اور پھر گنتی بھول گیا۔

رات گہری ہوتی جا رہی تھی۔ ابھی ڈیڑھ دو گھنٹے پہلے اسی ہال میں کس قدر شور تھا۔ تالیوں کی گونج سے در و دیوار لرزاں تھے۔ پھر کھیل ختم ہوا —— اور لوگ آہستہ آہستہ نکلنے لگے —— اپنی دنیا میں مگن —— کھیل کے کرداروں —— ان کے مکالموں پر تبصرہ اور تنقید کرتے ہوئے —— ' پروڈیوسر کی مہارت کو سراہتے اور کہانی کے موڑ پر۔ اور پھر اس کے انجام پر افسوس کرتے ہوئے۔

"اگر یہ کٹھ پتلیاں نہ ہوتیں تو اپنے انجام پر ضرور احتجاج کرتیں —— مگر احتجاج کی ڈوریں بھی کسی اور کی انگلیوں سے بندھی ہیں۔"

اس سے پیشتر کہ کھلی فضا میں گھٹ جاتے۔ گیٹ کیپر نے جلدی سے دروازہ بند کر دیا —— اور یوں دراوزے سے باہر نکلتے ہوئے آخری گروپ کے یہ آخری جملے ہال ہی

میں گونج کر رہ گئے۔

گیٹ کیپر بڑی عجلت میں تھا۔ وہ جلد از جلد اس گلی میں پہنچنا چاہتا تھا۔ جب سے موٹے پیٹ والے سیٹھ کو ڈاکٹروں نے زینہ چڑھنے سے منع کیا تب سے گیٹ کیپر سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ وہ ہفتے کی رات چمپا کے کوٹھے ضرور جاتا۔

گیٹ کیپر آخری آدمی تھا۔ اس کے بعد کاریڈور میں ایک گہرا سناٹا چھا گیا۔ سناٹے کی اپنی ایک تصویر ہوتی ہے اس کی آوازیں شور کی آوازوں سے بھی زیادہ تیز اور مہیب تھیں۔ ہال سے کافی آگے چل کر ایک کمرے میں چند لوگوں کے زور زور سے گفتگو کرنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ بند دروازے کے پیچھے آفس میں صوفوں پر چند لوگ جس میں کھیل کا پروڈیوسر ——— ڈائریکٹر وغیرہ شامل تھے ——— چائے کے کپ ہاتھ میں تھامے تماشے کی کامیاب آمدنی پر خوش ہو رہے تھے۔ بیچ بیچ میں وہ کیشیئر کی طرف منہ اٹھا کر نوٹ جلدی گننے کا کہتے اور پھر اپنی باتوں اور کامیاب پروڈکشن پر اونچا قہقہہ لگاتے۔

"جتنی جلدی تھی اتنی ہی دیر ہو رہی ہے۔" کیشیئر نے "اف خدا" کہہ کر سر اٹھا کر آفس میں چاروں طرف نگاہ دوڑائی۔ دو نوکر کٹھ پتلیوں کو اکٹھا کر کے بڑے سے لکڑی کے صندوق میں بھر رہے تھے تاکہ رات جاتے ہوئے اسٹور میں رکھتے جائیں۔ اس نے گھبرا کر سر جھٹکا ——— یہ تو ان کٹھ پتلیوں کی لاشیں لگ رہی تھیں۔ جو شام کو اسٹیج پر ناچتی گاتی۔ زندگی سے بھرپور نظر آتی تھیں۔

کافی ٹائم ایسے ہی گزر گیا۔ ان لوگوں نے رقم آپس میں بانٹی۔ چیزیں احتیاط سے رکھیں اور بند کمروں ہال کے دروازوں پر اک طائرانہ سی نگاہ ڈال کر اپنے اپنے گھروں کی طرف چل دیئے۔

رات بیتنے لگی۔ نجانے شب کا کونسا پہر تھا۔ جب اسٹور میں چیزیں سرکنے، صندوق کا ڈھکنا کھلنے کی آواز گونجی۔ پھر اس کا دروازہ چرچرایا۔ اور ساری کٹھ پتلیاں قطار میں چلتی ہوئی آفس میں آ بیٹھیں۔

"توبہ ہے ——— خدا بچے ان سے ——— میرا تو جوڑ جوڑ دکھ گیا ہے۔ مطلبی کہیں کے۔"

ایک کٹھ پتلی نے جو کہ ناٹک میں سائیڈ ہیروئن کا کردار کر رہی تھی، صوفے پر

تقریباً ڈھیر ہوتے ہوئے کہا۔ دوسری کٹھ پتلیاں بھی صوفوں پر براجمان ہو کر دل کی بھڑاس نکالنے لگیں۔ ناٹک کی ہیروئن ——— اداسی سے چلتی ہوئی آفس کی میز کے قریب گئی۔ بے خیالی میں اس نے پین ہولڈر سے پین نکالا اور ایک رف کاغذ اٹھا کر اس پر آڑی ترچھی لکیریں کھینچنے لگی۔ کئی لکیریں ایسا کرتے ہوئے اس کے ماتھے پر بھی کھنچ گئیں۔ پھر اس نے بور ہو کر پین رکھ دیا اور پیپر ویٹ ہاتھ میں تھام کر گھمانے لگی ——— گھماتے گھماتے پیپر ویٹ لڑھک کر ریوالونگ چیئر کی طرف چلا گیا۔ وہ اس کی آواز سے چونک سی گئی۔ اس نے بے ساختہ ہاتھ بڑھا کر پیپر ویٹ کو تھامنا چاہا مگر وہ کرسی پر جا گرا۔ اس نے پیپر ویٹ اٹھا کر میز پر رکھا اور خود اس چیئر میں تقریباً دھنس سی گئی۔ اس کی اس حرکت پر کئی کٹھ پتلیاں ہنس پڑیں۔ اس نے اپنے بازو میز کے شیشے پر ٹکائے اور خفگی میں بولی۔

"کیوں ہنس رہی ہو ———؟"

اس کے لہجے پر وہ اور بھی کھکھلا کر ہنس پڑیں ———

حالانکہ نہ انہوں نے ہنسنے کا جواز بتایا اور نہ ہی اس نے پوچھا۔ بس اس دفعہ پہلے وہ مسکرا دی ——— پھر اداس ہو کر اس نے اپنا ماتھا میز پر ٹکا دیا۔

"کیا ہوا ———؟" ——— ناٹک کے ہیرو نے پوچھا۔

"کچھ نہیں ——— کچھ بھی تو نہیں ———" اس کا گلا رندھا ہوا تھا۔ آنکھوں میں ہلکی ہلکی سی نمی تھی۔ جس کے پیچھے لال لال ڈورے اس بات کے غماز تھے کہ وہ بہت اداس ہے۔ اس کا لہجہ ٹوٹا ہوا تھا۔ اور آواز کا زیر و بم یوں ہچکولے کھا رہا تھا جیسے شہتیر پانی کی لہروں کے رحم و کرم پر۔

"لہریں طاقتور ہیں ——— پانی قوت ہے ——— یہ قوت ہے ——— وقت زور آور ہے اور میں ———' اور میری ہستی کمزور و بے بس ہے۔ ہم بس اس قوت' جسے تقدیر کہتے ہیں' کے آگے بے بس ہیں۔

جسٹ لائک اس (Just like us) ہم جو کٹھ پتلیاں ہیں جن کی حرکات و سکنات دوسروں کی مرضی کے تابع ہیں۔"

"تمہیں کیا ہو گیا آج ———؟" ہیرو نے پھر پوچھا۔

"کچھ بھی نہیں ——— بس ذات کے اندر کہیں گہرائیوں میں ایک پودا اگ

آیا ہے۔ جس کی جڑیں بہت دور تک پھیل گئی ہیں۔ پودا ـــــ جو دکھ کا ہے' اذیت کا ہے ـــــ"

"دکھ کا پودا ـــــ؟" ہیرو بولا۔

"اگر یہ دکھ کا پودا ہے تو پھر اسے اکھاڑ پھینکو۔ بھلا اس کا بیج کہاں سے آگیا۔ اور اگر پودا ہی پروان چڑھانا ہے تو پھر خوشی کا پودا کیوں نہ ہو ـــــ!!؟"

اس کے لہجے میں استفسار تھا۔

"یہ اپنے بس کی بات کہاں ـــــ" اور پھر ذات کے صحرا میں خوشی کے پھول کب اگتے ہیں۔ صحرا کے نصیب میں تو صرف کیکٹس ہیں ـــــ"

ہیروئن کا لہجہ مزید گلوگیر ہونے لگا۔

"بھلا اس پودے کو سینچنے کے لئے پانی کہاں سے آئے گا ـــــ؟ وہ لحہ بھر کو رکا ـــــ اور پھر بولا "اس دکھ کا کوئی تو جواز ہو گا ـــــ؟"

"جواز ـــــ؟" اس نے نگاہ بھر کر ہیرو کو دیکھا ـــــ پھر بولی۔

"اندر اس کی آبیاری کے لئے بہت اشک ہیں۔ مگر تمہیں ان کا کیا علم ـــــ' لوگ صرف قہقہے سنتے ہیں ان کے پیچھے چھپے نوحے ان تک نہیں پہنچ پاتے۔ دکھ کے پودوں کو صرف اشکوں ہی سے سینچا جا سکتا ہے۔"

"پلیز ـــــ جانم ـــــ اس پودے کو مت اگنے دو۔ ورنہ میں دکھ و اذیت سے مر جاؤں گا۔" ہیرو نے بے قراری سے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

"ہیر ـــــ ہیر!!! ـــــ یہ آفس ہے کوئی اسٹیج نہیں۔ جہاں پر ابھی تک ناٹک چل رہا ہے۔ اور تم اپنے اپنے مکالمے بول رہے ہو ـــــ بھئو! ناٹک ختم ہوئے تو بہت سمے بیت گیا ہے۔"

ایک کٹھ پتلی بہت مزاحیہ سے انداز میں زور زور سے بولنے لگی۔ اس کٹھ پتلی کا رول ناٹک میں ہیرو کی بیوی کا تھا۔ جس سے اس کی شادی کم عمری میں ہی ہو جاتی ہے۔ اور محبت کا دیوتا کیوپڈ اسے شادی کے کئی سال بعد شکار کرتا ہے۔ اور اب وہ زندگی کے بڑے عجیب و غریب موڑ پر پہنچ جاتا ہے۔ جہاں پر دونوں صورتیں اپنی اپنی جگہ اہمیت رکھتی ہیں۔ دونوں عورتیں اس کے لئے اہم ہیں۔ بیوی اس کی زندگی میں جب آئی تو وہ محبت کے نام سے آشنا تھا

لہذا زندگی اس کے لئے انتہائی سادہ ——— پرسکون اور اطمینان بخش تھی۔ جہاں اس کا گھر ——— اس کے بچے ——— اور اس کے والدین ——— سب دائروں کی مانند تھے اور وہ ان دائروں کا محور تھا۔ ایسا محور جو اپنی جگہ مضبوطی سے جما ہوا تھا۔ اس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ کوئی اور ——— بھی اس کی زندگی میں دبے پیر داخل ہو سکتا ہے ——— نجانے اس لڑکی کی کون سی ادا اسے اچھی لگی۔ وہ کوئی خوبصورت حور شمائل بھی نہ تھی کہ اسے دیکھتے ہی انسان اس کے حسن پر مرمٹے۔ لیکن اس کی شخصیت میں کوئی بات ضرور تھی۔ جو اسے اوروں سے ممتاز کرتی تھی۔ وہ ہولے ہولے لاشعوری طور پر اس کے دل کی وادی کی طرف قدم بڑھاتی رہی۔ بس اسٹاپ پر کھڑے ہوئے۔ بس میں بیٹھتے ہوئے اس کی موجودگی اسے ایک سرور سا بخش دیتی۔ اسے اس کے لباس کے رنگ ——— ہر سو بکھرے نظر آتے۔ اس کی ہنسی کی کھنک سے ساری بس جیسے بھر سی جاتی اور وہ جس دن وہ نہ ہوتی تو اسے لگتا جیسے بس کی روح غائب ہو گئی ہو۔ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی اسے مس کرتا۔ اس کی ہنسی کو تلاش کرتا' خموشی اس پر ڈیرے جمانے لگتی۔ اور اک بے نام سی یاسیت ڈھلتی شام کی مانند اس کے چہرے پر اتر آتی ——— کئی دفعہ تو اس کے کولیگز پوچھ بیٹھتے ——— "کیوں کیا ہوا ———؟ تمہارا چہرہ اتنا اترا ہوا کیوں ہے ———؟" مگر وہ اس پوزیشن میں نہ تھا کہ لوگوں کو بتلا سکتا کہ میری اداسی کا کارن کیا ہے اور اچھی بھلی ہنستی مسکراتی دنیا ——— خوبصورت موسم ——— حسین پروا اور پھول سب اپنی رونق کیوں کھو بیٹھتے ہیں۔ یہ سب اپنے محسوسات کی بات ہے کہ

دل تو میرا اداس ہے ناصر
شہر کیوں سائیں سائیں کرتا ہے

"سو ——— لوگو ——— مجھ سے یہ مت پوچھو ——— کہ یہ شام میرے چہرے پر کیوں اتری ہے ——— میں سچ نہیں بولوں گا ——— اور تم جواز مانگو گے ——— میں کیسے بتاؤں کہ یہ میرے اختیار سے باہر ہے۔ جذبہ اپنی دلیل آپ ہے۔ محبت وہ شے ہے جو خود بخود انسان کی روح میں سرایت کر جاتی ہے۔ مجھے بھی یہی لگتا ہے۔ بظاہر میرے پاس اس کے خیالوں میں گم ہونے ——— اس سے پیار کرنے کا کوئی سبب نہیں۔ خواہ تم فرائیڈ کی مانند ——— سائیکالوجیکل تجزیئے کرتے پھرو ——— یا منطق و فلسفہ کے پیمانوں سے ناپو۔ کیونکہ نہ میری بیوی بدصورت ہے۔ نہ وہ میرے حقوق دینے میں کوئی کوتاہی کرتی ہے۔ اس کی ہر ادا ———

اس کا ہر فعل میری پسند اور میرے مزاج کے مطابق ترتیب پاتا ہے۔ وہ سراپا محبت، مجسم وفا و خدمت گزاری ہے۔ اس نے مجھے اولاد کا سکھ بھی دیا ہے۔ غرض وہ اک مرد کے غرور کی مکمل تفسیر ہے، پھر میں کیسے کہوں کہ صدیوں سے طے شدہ فلسفے اور انسانی سائیکی پر لکھی گئی کتابوں کے تحت میری بیوی میں کوئی کمی ہے۔ اس لئے کوئی تشنگی مجھے اس نئے جذبے میں گرفتار ہونے کے لئے اکساتی ہے ——— نہیں بجنو ——— میرے پاس اس قسم کا کوئی فرسودہ جواز نہیں ہے۔ لیکن میں کچھ نہیں کہہ سکتا ———، کچھ نہیں جانتا ——— ہاں ——— صرف اتنا ——— صرف اتنا سوچ پایا ہوں اور میری یہ سوچ صدیوں کی سوچ پر محیط ہے کہ ——— زندگی کے کسی موڑ پر ——— عمر کی کسی بھی گلی میں آپ پر یہ آشکارہ ہو سکتا ہے کہ آپ کو کوئی اور بھی اچھا لگنے لگتا ہے ——— کیوں؟ ——— کب ——— کیسے ———؟ یہ سب سوال انسان خود اپنے اندر ——— اپنے ضمیر کی عدالت میں خود سے کئی بار کرتا ہے۔ لیکن جواب سے مطمئن نہیں ہوتا۔ لہٰذا میں سمجھتا ہوں کہ محبت کے لئے اتنی ہی دلیل کافی ہے کہ "وہ محبت ہے جس کے وارد ہونے کا سے کہیں آفاقی وادیوں میں چھپا ہوتا ہے۔ نجانے کب کہاں ——— کیسے ——— یہ تم میں اتر جائے۔ سو اگر تم مجھ سے پوچھو کہ میں اداس کیوں ہوں اور اس انجانی سے لڑکی ——— جس سے میرا کوئی رشتہ ——— نہیں، کی غیر موجودگی کو کیوں اتنا محسوس کرتا ہوں تو میں کچھ نہیں بتا سکوں گا۔ بس وہ ہولے ہولے اپنی جھانجھر جھنکاتی میری روح میں اتر رہی ہے "میں بے وفا ہوں یا نہیں ———؟" یہ سوال میں نے اکثر کیا ہے ——— کیا میں قصور وار ہوں ———؟ ——— کیا میں اپنی بیوی کا حق مار رہا ہوں ——— ؟ کیا وہ لڑکی ظالم ہے۔ جو اپنے ہی جیسی کسی عورت کا احساس نہیں کر رہی ———؟ وہ کیوں میری بیوی کے چہرے پر اپنا چہرہ سجا لیتی ہے، کیوں ہر جگہ پہنچ جاتی ہے۔ کبھی وہ میری بیوی کی مسکراہٹ میں بس جاتی ہے۔ کبھی اس کے ملبوسات میں چھپ جاتی ہے کبھی میز پر بیٹھے کھانا کھانے کے دوران میری پسند کی ڈشیں میری طرف بڑھاتی رہتی ہے۔ کبھی وہ میری بیوی کی آنکھوں میں سما کر مجھے اپنی آنکھوں کی جھیل میں ڈبو دیتی ہے۔ مجھے نہیں علم کہ یہ میرے تصور کا کرشمہ ہے یا واقعی وہ چھپ کر میرے گھر آتی ہے ——— اور کسی جادو کے عمل سے بار بار میری بیوی کے وجود میں سما جاتی ہے۔ ایسے لمحے میری نگاہوں کا انداز بھلا کیوں بدل جاتا ہے۔ میری دھڑکنیں کیوں نت نئے روپ بدلتی ہیں۔ اس سے اپنے بیوی کو پیار کرتے ہوئے

میرے انداز میں کیوں اتنی شدت اور والہانہ پن آ جاتا ہے ـــــــ کیوں وہ مجھے نئی نئی سی عورت لگی ہے ـــــــ !!؟ ـــــــ سچ مانو بجنو ـــــــ یہ وہ سارے سوالات ہیں جو میرے دماغ کی دہلیز کے آگے ہاتھ باندھے جواب کے منتظر ہیں۔ لیکن جواب کون دے ـــــــ عقل محو تماشائی ـــــــ اور دل کی نظر میں یہ سارے سوال ہی فضول۔ کیونکہ "جذبہ" سوال و جواب کا ملغوبہ نہیں ہوتا۔ یہ کوئی حساب کا سوال نہیں۔ جس طرح کیلکولیٹر پر ہم اپنی محبوبہ کی ہنسی کی کھنک کی پیمائش نہیں کر سکتے۔ جس طرح اس کی اک نگاہ سے پیدا ہونے والی مسرت کی گہرائی نہیں ناپ سکتے۔ اسی طرح اس نوع کے لاجواب سوالات بھی کیلکولیٹر کی گرفت میں نہیں آ سکتے۔ مجھے وہ کیوں' کب' کیسے اور 'کتنی اچھی لگی ہے ـــــــ معلوم نہیں ـــــــ بس وہ میرے دل کی سیپی میں ابرنیساں کے قطرے کی طرح ٹپکی ـــــــ اور اب اک سچے موتی کی مانند محفوظ ہے ـــــــ میں اس موتی کا امین ہوں ـــــــ خریدار نہیں' میں جانتا ہوں۔ میں سوداگر نہیں ہوں جو مذہب کے اصولوں کے تحت دو بولوں سے سے اسے خرید سکوں۔ میں اب اس بات کا قائل ہو گیا ہوں کہ "محبت برائے محبت کو" "محبت برائے شادی نہ کرو" اور میرا خیال ہے کہ وہ بھی اسی بات ـــــــ اسی خیال کی حامی ہے ورنہ وہ کبھی تو تقاضہ کرتی ـــــــ وہ سوچتا ـــــــ ہو سکتا ہے اس کا دل یہ چاہتا ہی نہ ہو ـــــــ کہ وہ میرے ساتھ بندھن میں بندھے ـــــــ یا پھر اسے میری مجبوریوں کا احساس ہے۔ اسی لئے تو وہ ایسی بات بھی منہ سے نہ نکالتی ـــــــ لیکن ـــــــ کیا اس نے کوئی سپنا بھی نہ دیکھا ہو گا ـــــــ؟ کیا سنہری موسم اسے کوئی نوید نہ دیتے ہوں گے۔ پھر اس کی محبت کا کوئی روپ ہے یہ۔"

"اب خوابوں کی دنیا سے نکل بھی آؤ ـــــــ کیا پاگلوں کی طرح دن میں خواب دیکھنے لگے ہو ـــــــ"

ہیرو کٹھ پتلی اپنی سوچوں میں گم دور نکل گیا تھا کہ ایک اور مرد کٹھ پتلی نے شرارت سے کھانستے ہوئے اپنی اک آنکھ دبائی اور مسکرا کر کہا۔

وہ تھوڑا سا جھینپا اور پھر خفت مٹانے کو بولا۔

"ہاں پاگل تو ہم ہو ہی گئے ہیں۔ اور پھر انسان اگر خوابوں میں بھی نہ جیئے تو کیا کرے ـــــــ اسی کے سہارے تو جی سکتا ہے۔ ورنہ حقائق ـــــــ تو ـــــــ" اس نے

جملہ نامکمل چھوڑ کر اک لمبی آہ بھری۔

کئی کٹھ پتلیاں ہنس پڑیں ——— "بھیا یہ تو کام سے" "دعائے مغفرت کرو"

"اللہ شفا دے" ——— یکے بعد دیگرے مختلف کٹھ پتلیاں بولیں۔

آفس میں ان کا ہنسی مذاق گردش کرتا رہا۔ پھر نجانے کیوں ہیرو کے دوست کو کچھ خیال آیا ——— وہ یک دم مڑا ——— اور اس کٹھ پتلی سے جو کہ ناٹک میں ہیرو کی بیوی کا کردار ادا کر رہی تھی' سے کہنے لگا۔

"——— تم اسے دوسری شادی کی اجازت کیوں نہیں دے دیتیں؟ ——— یہ تو انصاف پسند آدمی ہے۔ کبھی بھی تمہاری حق تلفی نہیں کرے گا۔"

"اجازت ہے ——— اجازت ہے ——— میری طرف سے اجازت ہے ——— شادی کرنا چاہو تو کر لو ——— میں نے کب منع کیا ہے۔"

بیوی کٹھ پتلی زور سے شرارت آمیز لہجے میں بولی ——— پھر نجانے دوسرے ہی لمحے اس کے لہجے کو کیا ہوا ——— اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے' لہجہ گلوگیر ہو گیا ——— وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر ہیرو کے دوست کے نزدیک آئی اور اشارہ کرتے ہوئے بولی۔

"دیکھو ——— میں ایک عورت ہوں۔ پل بھر میں دکھ کی ہلکی سی آنچ سے موم کی مانند پگھل جانے والی' شبنم کے ایک ہی قطرے سے کھل کر کلی سے پھول بن جانے والی' ہوا کے ہلکے سے جھونکے سے بکھر جانے والی ———" وہ تیز تیز بول رہی تھی ——— "اور ——— میں اک بیوی ہوں ——— دیکھو ——— میرے ماتھے پر ———' میرے ماتھے پر اس کا نام لکھا ہوا ہے۔ یہ دیکھو میرے گلے میں اسی کے نام کا منگل سوتر ہے' میری زبان پر اسی کے نام کی مالا ہے ——— اور یہ دیکھو یہ میرے ہونٹ ——— ان پر اسی کے پیار کی تصدیقی مہریں ثبت ہیں۔ اور پھر اس کی طرف دیکھو ———" اس نے جوش میں ننھی کٹھ پتلی کو زور سے گھسیٹ کر خود سے چمٹا لیا۔ جو اس ناٹک میں ہیرو کے بچے کا کردار ادا کر رہی تھی۔

"دیکھو ——— یہ ہماری محبت ——— ہماری شادی' ہمارے خوشگوار بندھن کا سب سے اہم ثبوت' حسین نتیجہ ہے۔ یہ گواہ ہے کہ اس نے مجھ سے محبت کی ہے' کرتا ہے ——— وہ صرف زمین کا ہی فاتح نہیں ہے۔ اس کا وجود میرے لئے تحفظ کا ضامن ہے۔ اس کے وجود سے میری جنت آباد ہے۔ پھر ——— میں کیسے اسے دوسری شادی کی

اجازت دوں —— میں یہ بات مذاق میں تو کہہ سکتی ہوں —— لیکن —— ایسا عملی شکل میں ہو' یہ ناممکن ہے —— اس کا تصور بھی محال ہے۔ حالانکہ میں جانتی ہوں کہ ان کے من کے اندر چور آبسا ہے —— میں نے بارہا کبھی فون کے نزدیک —— کبھی اس کی آنکھوں میں اور کبھی اپنے شب خوابی کے کمرے میں اسے پکڑا بھی ہے —— لیکن اسے کبھی احساس نہیں ہونے دیا۔ میں اندر ہی اندر کڑھتی رہتی ہوں۔ اس کی بانہیں اجنبی سی لگتی ہیں —— کبھی کبھی —— مجھے لگتا ہے کہ اس کا وجود کہیں اور غائب ہو گیا ہے —— اس سے میرا وجود سلگنے لگتا ہے —— دل چاہتا ہے کہ زور زور سے بولوں —— اسے جتاؤں —— لیکن میں بیوی ہوں —— میں اپنے مان کا بت سب سے اونچی جگہ رکھنا چاہتی ہوں —— لیکن میں اس کی نظروں سے گرنا بھی نہیں چاہتی —— میں اسے سزا نہیں دینا چاہتی —— میری خواہش ہے کہ وہ خوش رہے' اس کی ذرا سی اداسی مجھے —— دکھی کر دیتی ہے —— میں اس کی معمولی سی تکلیف پر تڑپ اٹھتی ہوں —— لیکن کیا کروں —— میرا عورت پن' —— میرا حق مجھے اکساتا ہے کہ میں اپنے لہجے کو نرم رکھ کر —— اسے بظاہر اس کی محبوبہ کے نام پر چھیڑ کر اور لاپرواہی کا انداز اپنا کر اسے خود اس کی ضمیر کی عدالت میں کھڑا کر دوں —— تاکہ وہ احساس کرے کہ وہ غلطی کر رہا ہے —— وہ میرا حق چھین کر کسی اور کو دے رہا ہے' اس کے ہر خوبصورت جملے —— ہر فعل اس کے تصور' غرض اس کی ہر چیز پر میرا حق ہے۔ اسے میری محبت کو بانٹنے کا کوئی حق نہیں۔ اگر انسان ہونے کے ناتے کبھی اپنی مجبوری کی تلوار سے محبت کے وجود کو دو حصوں میں تقسیم کر بھی دے تو بھی مجھے یقین ہے کہ وہ دونوں حصے سدا زخمی اور لہولہان رہیں گے —— اور میں جانتی ہوں میرا شوہر بہت حساس ہے وہ کبھی ایسی صورت حال میں خوش نہیں رہ سکتا۔ وہ کسی کو بھی اذیت نہیں دے سکتا۔ پھر میں کیوں اسے اجازت دوں کہ وہ میری ماتھے کی بندیا آدھی کرتے کسی اور کو دے دے —— کوئی بھی عورت —— دنیا میں اپنا سب کچھ دے سکتی ہے سب کچھ بانٹ سکتی ہے —— لیکن اپنا بستر ——' اپنا گھر اور اپنا شوہر نہیں بانٹ سکتی۔

—— تم مجھے ایسا مت کہو —— میں اس لڑکی کے خلاف نہیں۔ وہ یقیناً اچھی ہوگی کیونکہ میرے شوہر کا ذوق اچھا ہے۔ اس لڑکی میں ضرور کوئی متاثر کرنے والا گر

ہو گا ــــــ مجھے بتلاؤ ــــــ وہ کیسی ہے؟ ــــــ کیا ہنر ہے اس میں' کیا وہ مردوں کو لبھا سکتی ہے ــــــ؟ مگر نہیں ــــــ میں یہ بھی نہیں کہوں گی کیونکہ میں اپنے مرد کو جانتی ہوں وہ بہت مضبوط کریکٹر کا مالک ہے۔ اسے یہ ہتھکنڈے متاثر نہیں کر سکتے ــــــ وہ یقیناً ایک رحم دل' ملنسار' ہنس مکھ' ہنرمند' محنتی اور ٹائم کی پابند لڑکی ہو گی ــــــ اسے لباس پہننے کا فن اور گفتگو کرنے کا سلیقہ آتا ہو گا۔ صرف شکل و صورت میرے شوہر پر ایک ٹھوس تاثر قائم کرنے کے لئے کافی نہیں ہیں۔ وہ کیوں ایسا کر رہا ہے میں نہیں جانتی ــــــ میں اسے موردِ الزام نہیں ٹھہراتی لیکن اپنے گھر کا دروازہ دوسری عورت پر نہیں کھول سکتی۔ کیونکہ میرے پاس صرف یہی ایک چار دیواری ہے جس پر میں نے اس کی نیم پلیٹ لگا رکھی ہے۔ کبھی کبھی اس کے احساس پر کہ نیم پلیٹ میں ٹھکی ہوئی کیل کچھ ڈھیلی پڑ رہی ہے۔ میں اسے اکھیڑ کر تو نہیں پھینک سکتی ــــــ

سوچو ــــــ کیا ہمارے معاشرے میں ایسا کیا جا سکتا ہے ــــــ؟"

اس نے ہیرو کے دوست سے باتیں کرتے کرتے رک کر زور زور سے سانسیں لیں ــــــ جذبات میں وہ خاصا زور سے بولنے لگی تھی ــــــ سارے لوگ اس کی باتوں سے بہت متاثر اور دل گیر نظر آ رہے تھے ــــــ سب کے دلوں میں اس کے لئے ہمدردی اور اپنائیت کے جذبات موجزن تھے۔ ان کی آنکھوں میں تسلی کے سمندر موجیں مار رہے تھے۔ جیسے کہہ رہے ہوں کہ ــــــ "نہیں تم بے فکر رہو ــــــ ہم کبھی بھی تمہاری حق تلفی نہیں ہونے دیں گے۔"

ناٹک کی ہیروئن اس عرصے میں سر جھکائے کچھ شرمندہ سی بیٹھی تھی ــــــ جیسے سارا قصور اسی کا ہو ــــــ حالانکہ اس کا قصور نہیں تھا۔ اسے تو خود بھی علم نہ تھا کہ یہ سب کیوں اور کیسے ہو رہا ہے۔ اس نے بارہا فراریت اختیار کرنے کی کوشش کی تھی لیکن ــــــ ہر دفعہ ایک مجبوری ــــــ اس کے پیروں کی زنجیر بن جاتی تھی۔ وہ اکثر سوچتی ــــــ "آہ ــــــ دنیا میں محبت سے بڑی کوئی مجبوری نہیں ہے' دنیا میں محبت سے بڑی کوئی اذیت نہیں ہے ــــــ' دنیا میں محبت سے بڑی کوئی خوشی نہیں ہے ــــــ!!

میں کہاں جاؤں ــــــ؟ میں تو جب سے اس جذبے میں جکڑی ہوں نجانے کس کس صلیب پر میری روح چڑھی رہتی ہے۔ میرا ذہن ہر دم مجھے ذاتی تجزیہ کی بھٹی میں

جھونکتا ہے —— میں سونا نہیں —— جو اس آگ سے کندن بن کر نکلوں —— میں انسان ہوں —— میری سوچیں —— میرے خواب —— میری خوشیاں سب کی سب اس آگ سے جھلس جاتی ہیں۔ میں عورت ہوں۔ آئینہ دیکھنا میرا حق ہے لیکن یہ کون سا آئینہ ہے جس کے سامنے میں روز کھڑی ہو جاتی ہوں' کبھی اس کے تصور سے لجانے لگتی ہوں اور کبھی احساس جرم کو اپنے چہرے پر تلاش کرتی ہوں میں نے آئینے سے بارہا یہ سوال کیا ہے کہ کیا میں مجرم ہوں —— ؟ مجھے یہ سب نہیں کرنا چاہئے —— ؟ لیکن آئینے میں میری آنکھوں سے جھانکتی روح مسکراتی نظر آتی ہے —— یہ مسکراہٹ بڑی مطمئن ہے اس کے چہرے پر جرم کی کوئی دفعہ نہیں لگی ہوئی —— وہ ہر دفعہ کہتی ہے —— "نہیں تم مجرم نہیں۔ تم نے یہ جان بوجھ کر نہیں کیا۔ یہ سب اس نے لکھا تھا —— جو آکاش کی بلندیوں میں پوشیدہ ہے۔ جو اپنے رجسٹر میں درج روحوں کو ان کی پسند کے مطابق ایڈریس تھما کر کہتا ہے —— "جاؤ —— دنیا میں فلاں شہر کی فلاں جگہ ایک اور روح تمہاری منتظر ہے —— میں نے تمہاری کشش کا آلہ اس میں پوشیدہ رکھا ہے۔ تم جاؤ —— تم جیسے بھی حالات' جس روپ میں بھی جاؤ گے —— وہ آفاقی کشش کا منبع جو دل میں فٹ ہے۔ خود بخود تمہیں سگنل دے گا' پہچان لے گا۔ جاؤ —— وہ کشش تمہیں پکار رہی ہے —— جاؤ —— روحوں کو تلاش کرو۔ اذیت اور دکھوں سے مت گھبرانا —— یہ تمہیں گہرائی دیں گے۔ تمہاری شخصیت کو نکھاریں گے —— یہ تمہیں ذات کا اعتماد دیں گے' تمہیں ملن رت کے طرب' جدائی کے لمحوں کے کرب سے آشنا کریں گے —— سنو جسم کا تعاقب مت کرنا —— اس پر کسی اور کی مہر بہت پہلے لگائی جا چکی ہے —— ہاں جو تمہارا مقدر ہے وہ تمہیں ملے گا —— شاید تمہاری حیثیت سے کہیں زیادہ —— تمہیں کسی کے تصور کی پوری دنیا ملے گی —— تمہیں کسی کی پوری توجہ ملے گی —— ظاہری آسودگی —— اور ظاہری تشنگی کے فاصلوں کو جانو —— من کی آسودگی کے درجے کو سمجھو' اپنے اندر کی آنکھیں کھولو —— پرکھو —— اپنے من اور یقین و ایمان کی کسوٹی پر —— ' دنیاوی پیمانے جانے دو —— دو بولوں کا وزن یقین و آسودگی کے وزن سے زیادہ نہیں ہوتا۔ اسے سمجھو۔ اور اپنی روح پر یقین و کشف کے سارے دروازے کھول دو —— اے روحو —— مطمئن رہو —— ' آسودہ رہو۔ اپنے مندروں میں ناقوس بجاتے رہو ——

اپنی عبادت گاہوں کو آباد رکھو ——— کہ یہی خوشی کی راہ ہے۔ تم اپنے رب کی مصلحتوں کو نہیں سمجھتے۔ تمہارا مستقبل اس پر منکشف ہے۔ اس پر یقین کرو ——— وہ ہر ایک کے حق میں بہتر کرے گا۔ تم کسی کا حق نہیں مار سکتے۔ یہ سب کچھ میری مرضی سے ہو رہا ہے۔ اپنے آپ کو خود ساختہ صلیبوں پر مت چڑھاؤ ——— اپنے آپ کو دکھی مت کرو ——— جاؤ اور اپناؤ ——— اور دکھاؤ کہ دنیا حسین ہے ——— شاعروں' ادیبوں اور فنکاروں نے تمہارے لئے اپنے فن کے دریا بہا دیئے ہیں۔ کوئل تمہارے لئے ہی گیت گاتی ہے ——— موسم ——— برکھا رت' پھول سب تمہارے لئے دعائیں کرتے ہیں۔ تمہارے من پر اپنا سایہ ڈالتے ہیں۔ جاؤ اور ملو ——— مگر ——— سنو تکبر مت کرنا اپنی فتح پر ——— غرور مت کرنا اپنی آسودگیوں پر ——— بلکہ کلمہ تشکر بجا لانا ———!!"

کٹھ پتلی کو لگا کہ جیسے اس کے وجود میں چھپا "کل" کا "جز" یہ سب کچھ کہہ رہا ہو۔ وہ آہستہ آہستہ پرسکون ہوتی چلی گئی ——— جیسے فراریت کے راستے سے لوٹ آئی ہو۔ جیسے طوفان گزر چکا ہو ——— جیسے سامنے کی ساری دھند چھٹ گئی ہو۔ اس نے پلکیں زور زور سے جھپکائیں ——— تو آنکھوں کے عین سامنے ہیرو کٹھ پتلی کا چہرہ تھا۔ روشن ——— مسکراتا ہوا ——— ذہانت اور اعتماد سے چمکتا ہوا ——— وہ خود بھی مسکرا دی۔ نجانے کیسے وہ بہت تیزی سے اپنی اپنی فیلنگز کیچ کر لیتے تھے۔ ان کے ذہن ایک ہی فریکوئنسیز پر سفر کرتے۔ انہی اتفاقات اور ذہنی ہم آہنگیوں نے انہیں ایک دوسرے کے نزدیک کر دیا تھا۔ اسے وہ دن اب تک یاد ہے جب آفس کے کامن روم میں کسی نے کہا تھا کہ "سنا ہے اس نے تمہیں پرپوز کیا ہے۔"

"کیا ———!؟ دماغ تو خراب نہیں ہو گیا تمہارا ———' جو اس قدر فضول باتیں کر رہی ہو۔ اسے کیا پڑی ہے جو ایسی فضول بات کرے ——— شرم تو نہیں آتی تمہیں کسی شریف آدمی کے حوالے سے جھوٹی بات کرتے ہوئے ———"

وہ حیرت سے تقریباً چلا اٹھی تھی۔ اس کے تو وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ کوئی اسے اس کے نام سے بھی چھیڑ سکتا ہے۔ حالانکہ وہ بہت اچھا تھا۔ وہ کافی سالوں سے اسے جانتی تھی ——— محنتی' ایکٹیو' خوش لباس' خوش مزاج' شریف' بذلہ سنج۔ مگر اس نے آج تک اس قسم کی کوئی فضول حرکت نہیں کی تھی جس کی بنیاد پر ایسی بات کا تصور بھی کیا جا سکتا۔ اس

نے اسی لیے فیصلہ کیا کہ وہ خود اس سے بات کرے گی۔ لہٰذا جب بس میں اس پر نظر پڑی تو اس نے اس کے اسٹاپ پر اترنے سے پہلے اسے مخاطب کیا۔ "معاف کیجئے گا کیا آپ مجھ سے فون پر بات کر سکیں گے مجھے آپ سے ضروری کام ہے——" اور اس نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے اس کی جانب ایسے دیکھا جیسے وہ اس کا مدعا سمجھ چکا ہو—— پھر ان کی آپس میں فون پر بات بھی ہوئی۔ جس میں یہ انکشاف ہوا کہ یہ اس کے کسی دوست کی شرارت ہے جس کا خیال یہ ہے کہ وہ ایک دوسرے کے لئے بہت موزوں ہیں۔ اس نے اپنے جرم ناکردہ پر شرمندگی کے احساسات کا اظہار کیا اور لڑکی نے "کوئی بات نہیں—— لیکن آئندہ محتاط رہئے گا ورنہ ——" اس کی اس "ورنہ" میں تنبیہہ تھی۔

یہ بات یہاں ختم ہو گئی تھی—— لیکن دراصل "بات" شروع ہی یہاں سے ہوئی دوسرے دن جب ان کا آمنا سامنا ہوا تو وہ دونوں ایک دوسرے سے نظریں چرا گئے۔ مگر اس نے دیکھا کہ دونوں نے تقریباً ایک ہی رنگ کے کپڑے پہنے ہیں۔ لیکن اس بات کے بعد وہ لاشعوری طور پر اس کی ہر بات نوٹ کرنے لگی' اس کا قد و بت اس کی شخصیت—— اس کا لباس—— غرض وہ جتنا کتراتی—— سوچیں اس سے اتنا ہی نزدیک ہوتی چلی جاتیں—— وہ اس کی غیر موجودگی کو شدت سے محسوس کرتی۔ وہ اسے جتنا نظرانداز کرتی وہ اتنا ہی اس کی نظروں میں سماتا۔ کبھی کبھی اسے لگتا جیسے وہ بھی اسی قسم کی کیفیات کا شکار ہے۔ وہ کترانے کی کوشش میں ہر جگہ موجود ہوتا۔ اس کی نگاہوں کا انداز ہی بدل گیا۔ پہلے اس کی آنکھوں میں آشنائی والی نرمی اور احترام ہوتا تھا۔ لیکن اب اس کی آنکھوں میں ماورائی سی چمک ابھر آتی۔ جس کی تپش اسے پگھلانے لگتی۔ ان کی آنکھوں نے اپنی اپنی جگہ دوستی کے قدم آگے بڑھائے۔ اور مسکراہٹوں نے نئے لباس پہنے پھر کبھی کبھار وہ ایک آدھ ذو معنی جملہ کہہ دیتے اور پہروں اسے سوچ کر لذت حاصل کرتے۔ کبھی کبھار بس سے اترتے ہوئے وہ شرارت سے اس کا دوپٹہ دبا دیتا—— یا وہ—— یک دم اپنا پیر آگے کر کے اس کا راستہ روک لیتی۔ یہ وہ غیر محسوس شرارتیں تھیں جن کا علم کسی اور کو ہوتا ہی نہیں تھا۔ لیکن وہ دونوں دیر تک مسرور ہوتے رہتے۔ ان کے وجود میں تازگی کی ایک لہر سی سرایت کر جاتی۔ اکثر و بیشتر انسان اپنی روزمرہ کی مصروفیات میں الجھ کر یہ بھول جاتا ہے کہ اس کے اپنے طرز عمل کا انحصار بڑی حد تک دوسروں کے رویئے پر ہوتا ہے اور جن حسین چہروں یا ناز پرور لوگوں کو چاہا جاتا ہے' ان

کے مزاج کی معمولی تبدیلیاں بھی حیرت انگیز ردعمل پیدا کرتی ہیں۔ میرے ساتھ یہی ہوتا
——— جب لگے بندھے باوقار رویئے میں کوئی بہت شوخ تبدیلی رونما ہو تو حیرت ہوا کرتی ہے
——— میں بھی حیرت کے بعد مسرتوں کے پینگے میں ہلکورے لینے لگی۔ سوچتے سوچتے میری ذہنی رو اس کی طرف مبذول ہو جاتی ——— یہ سارا عرصہ نجانے کتنے وقت پر محیط ہے۔ لیکن کبھی کبھی میں سوچتی۔ بھلا میری زندگی میں یہ رنگینیاں کیسے بھر گئی ہیں اس وقت مجھے احساس ہوا کہ محبت بھی ایک عجیب سا جذبہ ہے جس کی لذت سے۔ محبت کئے بغیر آشنا نہیں ہوا جا سکتا ——— محبت ہمارے دلوں میں ——— گداز پیدا کرتی ہے جب تک محبت نہ کی جائے' کسی کو چاہا نہ جائے۔ دل کسی پتھر کی طرح سخت' کٹھور اور سپاٹ سا رہتا ہے۔ نہ کسی کے ملنے کی خوشی ہوتی ہے' نہ بچھڑنے کا افسوس۔ انسان ایک کھاتا پیتا ——— جیتا جاگتا کمپیوٹر بنا رہتا ہے۔ جو اپنی روزمرہ کی ضروریات کا کارڈ بنا کر اسے فیڈ کرتا ہے اور حسابی رزلٹ حاصل کرتا ہے۔ اس کا تعلق صرف حقائق کی دنیا سے رہتا ہے ——— لطیف' مہین اور موہوم جذبوں سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ اور ——— "محبت" ——— وہ مسکرائی۔

——— دیر تک سوچ سوچ کر مسکراتی' شرماتی' کسماتی اور جھینپتی رہی ——— اس نے دہرایا ——— اور ——— "محبت!! محبت بھی سوچ سمجھ کر نہیں کی جاتی بس اچانک ہو جاتی ہے (اچانک ——— ؟ اس نے خود سے پوچھا ——— پھر مسکرائی ——— مسکراہٹ ——— تصور اور محبت کا تعلق کتنا گہرا ہے۔)

کبھی کبھی تو ہمارے وہم و گمان میں بھی نہیں ہوتا کہ ہم محبت کر سکتے ہیں یا کرنے والے ہیں ——— لیکن اسی لمحے کیوپڈ کسی خاموش گوشے سے اپنا تیر چلا دیتا ہے ——— اور احساس بھی نہیں ہوتا ——— کہ کچھ ہوا ہے۔ محبت اسی بے خبری میں پروان چڑھتی ہے۔ اس کا پتا اس وقت چلتا ہے۔ جب چاہا جانے والا غیر متوقع طور پر روٹھ جائے یا کچھ دنوں کے لئے بچھڑ جائے۔ مجھے بھی یہ احساس اس سے پہلی بار چند مہینوں کے لئے بچھڑ کر ہوا کرتا تھا کہ وہ نادانستگی میں میرے کتنے نزدیک آ گیا ہے۔ میں اس سے دور رہ کر بہت مضطرب اور بے قرار سی رہتی ——— بے پناہ مصروفیات شاید یہ اضطراب کچھ دیر کو تحت الشعور میں کہیں جا دبکتا تھا ——— لیکن شدید مصروفیت کے لمحوں کے گزرتے ہی وہ میرے پورے وجود پر دوبارہ چھا جاتا۔ میں نے بہت مشکل سے وہ دن کاٹے۔ واپسی پر علم ہوا کہ وہ بھی بیمار ہو گیا

تھا۔ میں آج بھی حیران ہوں کہ ہم ان دنوں خود پر کیسے خود ساختہ خول چڑھائے رکھتے تھے۔ اپنی شدت کو چھپا کر نارمل انداز میں ملنے کی کوشش کرتے۔ ایک دوسرے سے وہی سلوک کرنے کی کوشش کرتے جو اوروں سے روا رکھتے تھے۔ بعد میں ہم نے ایک دوسرے کو بتلایا کہ اکثر ہمارے نزدیکی دوست کہتے کہ "تم دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے ہو۔ لیکن اس انتظار میں ہو کہ دوسرا پہل کرے۔ کیونکہ تم دونوں خود پسند اور انا پرست ہو۔ تمہیں جھکنا اپنی شان کے خلاف لگتا ہے" ہو سکتا ہے وہ درست ہی کہتے ہوں لیکن میرا اپنا فلسفہ یہ تھا کہ "محبت اور توجہ بھیک میں نہیں دیئے جا سکتے کہ کسی کے سوال کرنے پر کشکول میں سکے کی طرح ڈال دیا جائے۔ میں تو اس پر تب برسوں گی جب وہ دھرتی کی طرح بارش کے قطروں کے لئے بے قرار ہو جائے گا۔ اور اس کے تڑپ کے بخارات مجھے بھی برسنے پر مجبور کر دیں گے۔ اس نے بعد میں مجھے بتایا کہ میں اسے کئی سالوں سے اچھی لگتی تھی —— لیکن میرا سفر الفت بہت دیر سے شروع ہوا۔ دراصل میں اس بات پر یقین رکھتی ہوں کہ ——

"سوال کسی اور کی محبت کا نہیں ہوتا —— اپنی محبت کا ہوتا ہے۔"

پوری حیاتی میں کون کون سے ہاتھ میرے در پر دستک دیتے رہے۔ مجھے کبھی اس بات کی پرواہ نہیں ہوئی اور نہ میں نے ان کے لئے کوئی کسک محسوس کی بلکہ میرا رویہ عجب ظالمانہ سا ہو جاتا ہے۔ حساس دلوں کو صاف صاف کہہ دینا —— اور حقائق کی مار —— مارنا زیادتی ہی تو ہے —— لیکن میں کیا کروں۔ صرف اس مسئلہ پر میں مصلحت کی قائل نہیں۔ ان کے صحیح مقام کی نشاندہی کرنا بہتر سمجھتی ہوں۔ ہو سکتا ہے کہ میرا اصول غلط ہو —— لیکن کیا کیا جائے —— کہ کبھی کبھی حقائق سے مکمل آشنائی ہونے کے باوجود انسان مجبور ہو جاتا ہے —— جیسے مجھے سب کچھ علم ہے —— مگر.. اور اس "مگر" کے آگے اتنے سوالات ہیں کہ دل سہار ہی نہیں سکتا۔ وہ تو "بالک ہٹ" کا قائل ہے۔ کچھ سمجھتا ہی نہیں —— آہ مجبوری!! —— خوبصورت مجبوری جو —— سارے حقائق۔ سارے مسائل —— لوگوں کی تنقید و تبصرے —— معاشرے کے خوف —— احساس زیادتی —— احساس محرومی —— احساس فرار۔ غرض ہر قسم کے خوف سے مبرا ہو کر پیروں کی زنجیر کی مانند لپٹ گئی ہے —— اور وہ جو اس راہ پر مجھ سے پہلے روانہ ہوا تھا —— اب مجھے لگتا ہے کہ میں اپنی تیز رفتاری کے باعث راہ الفت پر اس سے بھی بہت

آگے نکل آئی ہوں ــــــ اس سے گفتگو کے ــــــ اس سے ملاقاتوں کے چھوٹے بڑے خوبصورت اتنے ڈھیر سارے واقعات میرے ذہن کے اسکرین پر چلتے رہتے ہیں جن کا شمار نہیں ــــــ میں ایک ایک فلم بار بار ریوائنڈ کر کے دیکھتی ہوں۔ میں نے ان سب کو موتیوں کی طرح مالاؤں میں پرو لیا ہے اور میری روح انہیں تسبیح کی طرح گلے میں لٹکائے پھرتی ہے۔ جب بہت گداز ہو جاتا ہے تو میں ان واقعات اور ملاقاتوں کی تسبیح کو بہت احترام سے اپنے ہونٹوں سے چومتی ہوں اور آنکھوں سے لگا کر روح کو تسکین پہنچاتی ہوں۔ وہ بہت اچھا ہے ــــــ اس کا تصور محترم اور مقدس ہے ــــــ میری آنکھیں خواب دیکھنے لگی ہیں۔ اس کے وجود اور گھر کے خواب ــــــ اس کی خدمت کرنے کے سپنے ــــــ اس کے نام سے پہچانے جانے کے سپنے۔ میں جانتی ہوں یہ سارے سپنے ناقابل تعبیر ہیں ــــــ یہ سب دکھ کے سودے ہیں۔ سکھ کی کوئی راہ نہیں ــــــ درد کا صحرا ہے جسے تنہا ہی پار کرنا ہے۔ میں نے کبھی اسے اپنے سپنوں کی حقیقت سے آشنا نہیں کیا۔ ٹوٹے ہوئے شیشوں کی کرچیوں سے اپنے پیر لہولہان کئے ہیں۔ آنکھوں میں نمی کی پھوئی تک نہ لائی ــــــ تاکہ وہ دکھی نہ ہو۔ وہ خود کو مجرم نہ سمجھے ــــــ وہ اس اذیت سے نہ گزرے ــــــ سپنے نہ دیکھنا میرے بس میں نہیں۔ اگر انسان کی زندگی میں سپنے اور خوش فہمیاں نہ ہوں تو کیسے جیے۔ یہی دو چیزیں تو اسے جینے کا حوصلہ دیتی ہیں۔ یہ تو مجھ سے مت چھینو ــــــ مت چھینو ــــــ مت چھینو!!

ــــــ "کیا بڑبڑا رہی ہو ــــــ؟" ہیرو کھ پتلی نے ہولے سے اس کے ہاتھ کو چھوا ــــــ اسے ہمیشہ کی طرح اس کے چھونے پر کرنٹ سا لگا۔ وہ چونکی پھر مسکرائی اور نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولی ــــــ "کچھ نہیں بس ــــــ یونہی!!"

"بس یونہی تم لوگ بڑھتے چلے جانا!! ــــــ کیا فائدہ خوامخواہ لوگوں کی نظروں میں آنے کا ــــــ پتہ بھی ہے۔ لوگ نجانے کیسی کیسی باتیں بناتے ہیں۔ ہمارا معاشرہ ابھی اتنا فارورڈ نہیں ہوا ہے کہ ایک لڑکی کا یہ رویہ اور دوسرے سے میل جول برداشت کر لے۔ تمہاری ان حرکتوں سے ہمیں شرمندگی اٹھانی پڑتی ہے۔ آخر تم سمجھتی کیوں نہیں ہو کہ کل کو تمہاری شادی ہونی ہے۔ یہ ساری باتیں تمہاری شادی کی راہ میں رکاوٹ بھی بن سکتی ہیں۔ ہمارے معاشرے میں مرد خواہ کتنی بھی لڑکیوں سے دوستیاں کرتا پھرے وہ اس کے لئے خود کو حق بجانب سمجھتا ہے لیکن اس کی ہونے والی بیوی کا کسی سے کوئی تعلق یا دوستی ہو ــــــ یہ

بات اس کے لئے ناقابل برداشت ہوتی ہے۔ وہ شادی کے لئے ہمیشہ پردے کے پیچھے ڈھکی چھپی لڑکی۔ جس کے تصور میں بھی کوئی نہ آیا ہو' کو ترجیح دیتا ہے۔ سمجھیں ——— !!" ——— ایک قدرے بڑی عمر کی کٹھ پتلی نے جو ناٹک میں ہیروئن کی بڑی بہن کا رول کر رہی تھی ——— ' نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔

ان دونوں نے سر جھکا کر شرمندگی سے یہ باتیں سنیں مگر ان دونوں کو اپنی مجبوری اور ثابت قدمی کا احساس اچھی طرح سے تھا۔ ہیرو کی اس حالت پر سامنے صوفے پر بیٹھی ہوئی کٹھ پتلیوں نے جو ہیرو کی بہنوں کے روپ میں تھیں' نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ پھر لڑکی کو سر تا پا غور سے دیکھا۔ ان نگاہوں میں تاسف کی بجائے ——— اپنے بھائی کی محبت موجزن تھی۔ وہ جانتی تھیں کہ بھلے ان کا بھائی منہ سے نہ بولے۔ لیکن وہ اس لڑکی کو پسند کرنے لگا ہے۔ ان کے دل اس عجیب و غریب پچویشن پر افسردہ ہو گئے۔ وہ اپنے بھائی کی اس حالت پر کڑھ سکتی تھیں مگر حقائق میں کسی تبدیلی کے لئے سوچ بھی نہ سکتی تھیں۔

"اے سنو ——— اب سر بھی اٹھاؤ ——— اب یہ سب تو برداشت کرنا ہی پڑے گا۔ صرف ان باتوں کی وجہ سے ہم اپنی خوشیوں کا خون تو نہیں کر سکتے۔ اپنی مسرتوں کو اپنے ہاتھ سے قتل کرنا تو ناممکن ہے ناں!" ہیرو نے میز پر جھکے اس کے سر کو ہلایا۔ اس نے ایک آہ بھرتے ہوئے سر اٹھایا۔ اس کی آنکھوں میں نمی تیر رہی تھی ———

"کیا یہ سب کچھ ہمارا ہی مقدر ہے ——— سمجھ میں نہیں آتا میں کیا کروں۔ یقین کرو ——— جانم ——— میں بے حس و ظالم نہیں ——— میں تمہارے اور تمہاری بیوی کے لئے بہت حساس ہوں۔ میں یہ سوچ سوچ کر عذاب میں مبتلا ہوں کہ میرے وجود سے ان کا سکون برہم ہوتا ہے ——— میری وجہ سے وہ دکھی ہیں۔ اگر میرے بس میں ہوتا ناں ———" وہ روہانسی ہو گئی ——— پھر چند لمحوں کو چپ ——— جیسے آنسوؤں کو پینے کی کوشش کر رہی ہو۔

"سچ ——— یقین مانو ——— اگر میرے بس میں ہوتا ناں تو ——— میں" اسے لگا جیسے سارے آنسو آواز و الفاظ کا راستہ روک کر کھڑے ہو گئے ہوں۔ اس نے اس کے آگے بھی کچھ کہنا چاہا مگر نہ کہہ سکی۔ وہ کسی کے سامنے رونا نہیں چاہتی تھی وہ اوروں کے سامنے ٹوٹنا نہیں چاہتی تھی ——— لیکن اس کے لہجے کی تڑپ اور اضطراب ہیرو کو تڑپا گیا

——— وہ بے قراری سے اس کے ہاتھ پر تھپکیاں دینے لگا۔

"پلیز ——— پلیز ——— چھوڑو اس ذکر کو ———۔ مجھے یقین ہے ——— مجھے سب معلوم ہے ——— ہم دونوں مجبور ہیں۔ ہم نے اپنے تئیں سب کچھ کر کے دیکھ لیا۔ نہ ملنے کا فیصلہ بھی کر کے ہم دیکھ چکے ہیں۔ میں پہلے بہت ان باتوں پر سوچتا تھا۔ لیکن اب ——— خود کو وقت کے دھارے پر چھوڑ دیا ہے۔ جو بھی ہو ——— میں جانتا ہوں ہم دونوں میں سے کسی کا بھی قصور نہیں ——— تم کچھ مت سوچو ——— اگر سوچو تو یہ ——— کہ ———" وہ بولتے بولتے رک گیا۔ اس کے لہجے میں خوشگوار سی تبدیلی کے احساس پر ہیروئن نے ان کی جانب دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں شریر سی چمک تھی۔ ہونٹوں پر بکھری مسکراہٹ میں سارے جہان کی بہاروں کا روپ تھا۔ وہ جھینپ گئی مگر دیکھتی رہی۔ دونوں کی نگاہیں کئی ساعتوں تک یونہی ایک دوسرے میں مدغم رہیں۔ اسے لگا جیسے اس کے وجود پر جمی دکھ کی برف اس کی نگاہوں کی گرمی سے پگھل گئی ہو۔ سارے وجود میں نشہ سا دوڑنے لگا۔ آنکھوں کے پیمانے شراب سے بھر گئے ——— ایک بے نام سی مستی کا احساس ان کے رگ و پے میں رقص کرنے لگا۔ یہ لمحے کتنے اعتماد و طمانیت کے تھے ——— اس کے لہجے میں شرارت کا عنصر اور گہرا ہو گیا۔ اس نے لحہ بھر کے توقف کے بعد دوبارہ کہا۔

"اگر سوچنا ہی ہے تو یہ سوچو کہ ——— میں تمہارے لئے کتنا پاگل ہوں ———!!

بالکل دیوانہ ———!!

وہ یک دم کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ ہیرو کو لگا ساری کائنات اس کی ہنسی میں شامل ہو گئی ہو ——— اس نے مزید شوخی سے کہا۔

"سچ ———!! ——— اور اس کے ساتھ اپنی ایک آنکھ دبائی۔

"ہشت بے ایمان ———!! ——— ہیروئن نے جھینپ کر فوراً کہا۔ مگر نجانے کیسے اپنے مزاج کی شوخی بھی اس لمحے عود آئی اور وہ بھی اپنے ہونٹ کے گوشے کو دانتوں تلے کر کے شرارت سے جواباً اپنی آنکھ دبا بیٹھی۔ اور پھر ہیرو کے بلند بانگ قہقہے پر شرم سے اپنا چہرہ ہاتھوں کے پیالے میں چھپا لیا ——— وہ دونوں ہنس رہے تھے۔ جھینپ رہے تھے۔ ان کی اس ادا پر ان کی دوست کٹھ پتلی نے رشک سے انہیں دعا دی ——— " جاؤ ——— کسی اور

جنم میں تمہارا ملاپ ہو گا۔"

ہیروئن نے یہ سنا ——— اور اپنے دل میں ہی سجدہ ریز ہو گئی۔ پھر اٹھی اور ہاتھ پھیلا کر دعا کرنے لگی ——— "اے رب! ——— میں ہندو نہیں ——— جو ہندو مائیتھالوجی کے تحت فلسفہ آواگون پر یقین رکھتی ہو ——— میں جنموں کو نہیں مانتی لیکن بس مجھے ذات کا سکون اور اعتماد دے ——— اسے خوش رکھ اور مجھے دوسروں کو خوش رکھنے اور اپنے وجود سے دوسروں کو دکھ نہ دینے کی قوت عطا فرما ———!!"

"اے ——— یہ آنکھیں بند کئے ہاتھ پھیلائے اتنی دیر سے کیا دعائیں مانگ رہی ہو ——— کچھ ہمیں بھی بتاؤ ———" ہیرو نے شرارت سے سوال کیا۔

"اونہوں!! ———" اس نے پٹ سے آنکھیں کھولیں ——— "تمہارے بتانے کی بات نہیں اور سنا ہے دعا بتانے سے اس کا اثر اڑ جاتا ہے۔"

"اچھا!! ——— لیکن اگر میں ضد کروں تو پھر بھی نہیں بتاؤ گی ———"

ہیرو نے پہلے "اچھا" کو کھینچا ——— اور پھر یقین سے سوال کیا۔

"دراصل میں نے یہ دعا مانگی ہے کہ پروڈیوسر یا کہانی کار جو بھی کرنا چاہتا ہے ——— وہی ہو ——— لیکن بس تم خوش رہو ——— مجھے اس کے اختتام کی پرواہ نہیں لیکن تمہاری خوشی اور اپنے ضمیر کا اطمینان مقصود ہے ———!!"

"سچ کہتی ہو ———" ہیرو نے ہولے سے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

"ہوں ——— کیونکہ ہم دونوں اپنی اپنی جگہ بے قصور ہیں۔"

ہیرو نے اس کے ہاتھ کو دبایا ——— وہ کچھ شرما سی گئی اس نے نگاہیں بھر کر پیار سے اس کی جانب دیکھا۔ دونوں کی آنکھیں ——— جذبوں اور چاہتوں سے لبریز تھیں۔

"پھر ہمارے خوابوں کا کیا ہو گا ———؟"

"بھلا خوابوں کے ہرنوں کو کوئی زنجیر پہنا سکا ہے۔ یہ تو یونہی آنکھ وادیوں میں قلانچیں بھرتے رہیں گے ———" ہیرو کا لہجہ مزید خوابناک ہو گیا۔

رات دھیمے سروں میں گنگناتی رہی۔ کٹھ پتلیاں باتیں کر کر کے تھک ہار کر سو گئیں۔ وقت گزرتا رہا۔ ہیرو ہیروئن کے سپنے ایک دوسرے کے ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے نیند کی وادی میں گھومنے کے لئے دور نکل گئے ——— رات کی سیاہی دن کے اجالے سے گھبرا کر منہ

چھپانے اپنے گھر چلی گئی۔

کوریڈور میں ـــــ ڈائریکٹر' پروڈیوسر اور کہانی کار کے جوتوں کی چاپیں اور آپس میں باتیں کرنے سے اک گونج سی پیدا ہو رہی تھی۔ پروڈیوسر کی خواہش تھی کہ مصنف آج کے کھیل میں کہانی کو کوئی اور موڑ دے تاکہ ناظرین کی توجہ میں مزید اضافہ ہو سکے۔ عرصے سے یہی کھیل ہو رہا تھا۔ اس وقت بھی گفتگو کا موضوع یہی تھا۔ کہانی کار جو کافی دیر سے پروڈیوسر کی باتوں پر محض سر ہلا رہا تھا' بولا۔

"سر ـــــ ویسے تو آپ جو حکم دیں میں کرنے کو تیار ہوں لیکن مجھے اس کے لئے پوری کہانی بدلنی پڑے گی۔ اور اگر نئی کہانی یہاں کے تماشائی کو پسند نہ آئی تو ہمارا ناٹک فیل بھی ہو سکتا ہے۔ آپ ایسا کیوں نہیں کرتے کہ کہانی کی تھیم یہی رہنے دیں ـــــ البتہ عوام کی دلچسپی کے لئے کرداروں اور ان کا ماحول بدل دیں۔ بیک گراؤنڈ بدلنے سے یقیناً اچھا اثر مرتب ہو گا۔ اور پھر لوگ بھی ایک ہی جیسے چہرے دیکھ دیکھ کر بور ہو گئے ہوں گے ـــــ"

"واہ کیا اچھا آئیڈیا ہے ـــــ تھیم وہی ـــــ ماحول اور ایکٹرز مختلف!! اب آپ دیکھئے گا پروڈیوسر صاحب کہ میں پہلے سے بھی اچھا اور کیسا دھانسو قسم کا کام لیتا ہوں ـــــ آپ کا بھی جی خوش ہو جائے گا۔"

ڈائریکٹر نے کہانی کار کی بات پر خوش ہوتے ہوئے زور سے پروڈیوسر کے کندھے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔

"چلیں ـــــ یہ بھی ٹھیک ہے ـــــ" پروڈیوسر نے یہ کہتے ہوئے جیب سے چابی نکالی اور آفس کا دروازہ کھولنے لگا۔

"ارے ـــــ یہ کیا ـــــ؟؟" تینوں کے منہ سے ایک ساتھ نکلا۔ اور دوسرے ہی لمحے پروڈیوسر نے زور سے چوکیدار اور دوسرے نوکروں کو پکارا۔ نوکر اور چوکیدار جو اپنے مالک کے غصے سے خائف رہتے تھے۔ دوڑے دوڑے کمرے میں داخل ہوئے۔

"جی مالک ـــــ؟؟" انہوں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

"جی مالک کے بچے ـــــ حرام خور ـــــ کل رات یہ کٹھ پتلیاں اٹھا کر نہیں رکھی تھیں کیا ـــــ؟ کام چور کہیں کے ـــــ"

"وہ مالک رات آپ کے سامنے ہی تو اسٹور میں رکھیں تھیں۔ پھر یہ یہاں کیسے

بکھری پڑی ہیں ـــــ" نوکر کانپ کانپ کر بہت مشکل سے بول رہا تھا "اسٹور میں رکھی تھیں ـــــ کے بچے ـــــ' اگر رکھی تھیں تو پھر یہ یہاں کیسے پڑی ہیں ـــــ نشہ تو نہیں کرنے لگا ہے ـــــ یہ خود تو چل کر آ نہیں سکتیں ـــــ کام چورو ـــــ' اب میرا منہ کیا دیکھ رہے ہو ـــــ اٹھاؤ ـــــ انہیں ـــــ اور احتیاط سے واپس رکھو ـــــ"

پروڈیوسر غصے سے مسلسل نوکروں پر برس رہا تھا اور نوکر کٹھ پتلیوں کو اکٹھا کر کے بڑے سے لکڑی کے بکس میں ڈال رہے تھے ـــــ جبکہ ڈائریکٹر ـــــ' کہانی کار سے ان نئے ملبوسات پر گفتگو میں مصروف تھا جو وہ اب ان کٹھ پتلیوں کو بدلوانے والے تھے ـــــ !!

# چھری

## نیلم احمد بشیر

"صفدر! صفدر! ادھر آئیں ذرا!"

نازی نے تین چار بار آواز دی مگر صفدر صاحب نہ جانے کہاں جا چھپے تھے کہ ان تک ان کی بیوی کی آواز ہی پہنچ نہیں پا رہی تھی۔ "ہائے کہاں چلے گئے ہیں۔" وہ دل ہی دل میں جھنجھلانے لگی۔ "ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی تو دفتر سے آئے تھے۔ کپڑے بدلے تھے' کھانا کھایا تھا' گھر ہی میں تو تھے' پھر ایسی بھی کیا بے خبری! کتنی ہی آوازیں دے چکی ہوں مگر سننے کا نام نہیں لے رہے۔ توبہ ہے اس آدمی کی بے نیازی کا بھی جواب نہیں ہے۔ کام کرنے والی ماسی بھی اب تو گھر جا چکی ہے۔ ورنہ اسے ہی بلا لیتی وہ بڑبڑانے لگی دراصل اسے باتھ روم جانا تھا اور سلیپر کا ایک پاؤں بستر کے نیچے کہیں جا گھسا تھا اور اسی کام کے لئے وہ صفدر کو آوازیں دے رہی تھی۔ مگر وہ سن نہیں رہا تھا۔

نازی کی حالت ایسی نہیں تھی کہ وہ بستر کے نیچے گھس کر اپنا سلیپر خود تلاش کر سکتی۔ پریگنینسی کا آٹھواں مہینہ' اوپر سے گرمی کا موسم' وہ حال سے بے حال ہو چکی تھی۔ ڈاکٹر نے پچھلے دو بار کے مس کیرج کے سبب اسے سختی سے بیڈ ریسٹ کی ہدایت پر عمل کرنے کو کہہ رکھا تھا۔ اس لئے زیادہ وقت وہ لیٹ کر ہی گذارنے پر مجبور تھی۔ مگر کیا کرتی' لیٹے لیٹے بور ہو جاتی' دل اداس ہونے لگتا تو بڑبڑانے لگتی۔

صفدر آفس سے تین چار بجے تک آ تو جاتا تھا مگر وہ محسوس کر رہی تھی کہ وہ آج کل اس کو اتنی توجہ نہیں دیتا تھا جتنی وہ چاہتی تھی' یہ نہیں تھا کہ صفدر اس سے پیار نہیں کرتا تھا۔ اس نے بڑی چاہت سے نازی سے شادی کی تھی شادی سے پہلے تو اس کا دیوانہ تھا ہی'

شادی کے بعد بھی نازی کے بغیر ایک پل نہیں رہ سکتا تھا مگر اب جب سے نازی اس حال کو پہنچی تھی وہ اس کی اتنی دل جوئی نہیں کرتا تھا جتنی وہ چاہتی تھی۔ یا شاید اسے ہی ایسا محسوس ہوتا تھا۔

سوچتی' شاید میرا بے ڈھنگا جسم' سوجے ہوئے پیر' چہرے پر پڑنے والی چھائیاں دیکھ کر صفدر میں اس والہانہ پن کی کمی آگئی ہے جو اس میں پہلے ہوا کرتی تھی پھر اسے اپنی بدصورتی دیکھ کر خود ہی رونا آنے لگتا اور دل گھٹ گھٹ جاتا۔ وہ بھی اتنا بے حس تھا اسے مذاق میں موٹی کہہ کر کبھی کبھار چھیڑ بھی دیتا اور وہ اسے ہنستا دیکھ کر' آنکھوں میں ڈبڈباتے' موٹے موٹے آنسوؤں کو چھلک جانے سے روکنے کی کوشش میں اپنے ہونٹ کاٹنے لگ جاتی۔ جی میں تو اس کے بھی آتا کہ جواباً صفدر کو بھی کچھ جلی کٹی سنا ڈالے' رو رو کر اس سے اس کی بے حسی' بے نیازی اور لاپرواہی کی شکایت کرے مگر وہ خاموش رہتی۔ ایک تو اس میں کچھ ایسا حوصلہ بھی نہ تھا' اس میں اس کی کچھ ڈرپوکی بھی شامل تھی' مگر زیادہ وجہ اس کی یہ تھی کہ اسے صفدر سے اتنا پیار تھا' اتنی Possessive تھی وہ اس کے بارے میں کہ' اسے اس سے لڑائی کرنا بالکل بھی اچھا نہیں لگتا۔ صفدر کو اس نے اپنی کل کائنات بنا رکھا تھا اور وہ اس کائنات کے نظام میں کوئی خلل برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ اس لئے چپ چاپ برداشت کئے جاتی۔

نازی نے سن رکھا تھا کہ اس حالت میں عورت بہت خوبصورت لگتی ہے مگر نازی کو اپنے شوہر کی زبان سے کبھی کوئی ایسی میٹھی بات سننے کو نہ ملی تھی جس سے وہ بھی خوش ہوتی اور پراعتماد رہتی' بے فکری سے دن گزارتی۔ اسے تو یہی محسوس ہوتا کہ وہ اب اس کے قریب بھی کم ہی آتا ہے اس سے بات چیت بھی کم ہی کرتا ہے' حال چال بھی کم ہی پوچھتا ہے۔

اس نے کتاب میں پڑھ رکھا تھا کہ ہارمونز کی زیادتی کی وجہ سے عورت اس حالت میں زیادہ جذباتی' زود رنج اور حساس ہو جاتی ہے' اسے زیادہ کیئر اور محبت کی ضرورت ہوتی ہے۔ مگر اپنے شوہر کا رویہ دیکھتی تو اسے اور ہی زیادہ رونا آنے لگتا' بات بات پہ آنکھیں گیلی ہو جاتیں اور دل پھٹنے سا لگ جاتا "صفدر! صفدر! نازی نے آخری بار آواز دینے کے بعد خود ہی ہمت کر کے اپنے آپ کو بستر میں سے گھسیٹ کر باہر نکالا اور دھیرے دھیرے چلتی' بیڈ روم کی کھڑکی سے باہر جھانکنے لگی۔ اسے یہ دیکھ کر بہت حیرت ہوئی کہ صفدر نیچے' گھر کے پورچ میں کھڑا گاڑی صاف کر رہا تھا۔

"ہیں؟ انہیں اس وقت گاڑی صاف کرنے کی کیا ضرورت پڑ گئی' صبح ہی تو ملازم لڑکے نے اسے دھویا تھا۔ ویسے بھی صفدر کو گاڑی خود صاف کرنے سے تو ہمیشہ ہی چڑ ہوتی تھی۔ پھر آج بھلا کیا ایمرجنسی ہو گئی؟"

نازی دل ہی دل میں حیران ہوئی۔ ابھی اس معمہ کو سلجھانے کی کوشش کر ہی رہی تھی کہ اسے یوں لگا جیسے صفدر کسی سے باتیں کر رہا ہو۔ وہاں تو کوئی تھا ہی نہیں مگر نازی کی نظروں نے صفدر کی نظروں کا تعاقب کیا تو وہ یہ دیکھ کر دنگ رہ گئی کہ صفدر ساتھ والے گھر کے ٹیرس میں کھڑی ایک نوجوان لڑکی سے محو گفتگو تھا۔

"ہیں؟ یہ لڑکی کون ہے' پہلے تو یہاں کبھی نظر نہیں آئی؟" نازی بڑبڑائی پھر دوسرے ہی لمحے اسے خیال آیا کہ کل ہی تو اس گھر میں نئے کرایہ دار شفٹ ہوئے تھے۔ سامان آتے دیکھ کر یہ اندازہ بھی ہو گیا تھا کہ ٹھیک ٹھاک مالدار لوگ ہیں۔ اعلیٰ فرنیچر' قالین' نوکر' چاکر' سبھی کچھ بڑا متاثر کن تھا۔ مگر نازی نے کسی چیز پر کوئی خاص توجہ نہیں دی تھی۔ اب جو' گھر کے ٹیرس پر کھڑے سب سے قیمتی سامان کو دیکھا تو نازی کی تو جان ہی نکل گئی۔

"یا اللہ کس قدر خوبصورت ہے یہ لڑکی!" نازی کو اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔ سرخی مائل سفید رنگت' شانوں تک کٹے ہوئے بھورے بھورے بال' دبلا پتلا مگر متناسب جسم' لانبا قد تو دلکش تھا ہی' اس کی سی تھرو نائٹی نما گاؤن سے چھلکتا مے کے پیالے جیسا سراپا راہ چلتوں کو پل بھر کے لئے روک کر منجمد کر دینے کے لئے کافی تھا۔ نازی کو یوں محسوس ہوا جیسے وہ کوئی جادوگرنی ہو جو اپنی مقناطیسیت اور طلسماتی قوت سے نوجوانوں کو اسیر کر لینے کے بعد' مکھی بنا کر دیوار پر چپکا دیتی ہو۔ ان پر مکمل قبضہ جما لیتی ہو۔

نازی دیکھ رہی تھی' باتوں کے دوران خوبصورت بلا جب کوئی ہلکا سا قہقہہ لگاتی تو اس کے گاؤن کی ادھ کھلی ڈوریاں اس کی' کرسٹل کے بیش قیمت وائن گلاس جیسی گردن کی بلائیں لینے لگتیں اور صفدر بھی مسکرا کر گاڑی پر زور زور سے کپڑا مارنے لگتا۔ دونوں بڑے مزے سے گپ شپ کرتے نظر آ رہے تھے۔

اسی لمحے نازی کو اپنا آپ اور زیادہ بھدا اور بدصورت لگنے لگا مگر وہ کچھ نہ کچھ ضرور کرنے کے ارادے سے گرتی پڑتی دروازہ کھول کر باہر نکل آئی اور صفدر کے پاس جا کھڑی ہوئی۔

"ہیلو!" نازی نے اپنے آپ کو اس حسین طلسمی سین میں ٹھونسنے کی کوشش میں اپنے آپ کو مع اپنے بھاری بھرکم وجود کے، پورے کا پورا صفدر پر گرا دیا۔

"اوہ! یہ میری واقف ہیں نازی!" صفدر پھیکی سی مسکراہٹ سے نازی کو سہارا دیتے ہوئے بولا۔

"آئی ایم مسز صفدر اینڈ یو؟" نازی نے سوال کیا۔

"بھئی یہ ہماری نئی نے بر (Neighbour) شیما سہیل ہیں۔ ان کے شوہر دبئی میں بزنس کرتے ہیں۔ فی الحال وہیں ہیں۔ شیما اکیلی ہی یہاں شفٹ ہوئی ہیں!"

صفدر نے یوں اس کا تعارف کروایا جیسے وہ اس کی کوئی قریبی رشتہ دار نکل آئی ہو۔ اور وہ اسے بہت پہلے سے جانتا ہو۔

"Nice to meet you Mrs. Sohail!" نازی نے مسز سہیل پر زیادہ زور دیتے ہوئے کہا۔

میں نے انہیں کہا ہے کہ چونکہ یہ ہماری ہمسائی ہیں اور ہمارا فرض ہے کہ اس Neigbourhood میں ایٹ ہوم فیل کروائیں تو یہ ہم سے جب بھی کوئی مدد چاہیں تو ہم بخوشی ان کی مدد کرنے کو تیار ہو جائیں!"

صفدر کی بتیسی نازی ایک لمبے عرصے کے بعد دیکھ رہی تھی۔

"Oh! You are so sweet Mr. Safdar!"

میں تو infact آپ سے پہلے ہی ایک فیور مانگنے والی تھی!

"کیا؟" صفدر نے للچائی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"اگر آپ مائنڈ نہ کریں تو جب تک ہمارے ہاں فون نہیں لگ جاتا میں اپنے ہزبینڈ کو آپ کا نمبر دے دوں تاکہ وہ مجھے آپ کے ہاں کال کر لیا کریں؟

خوبصورت بلا کی سلکی نائٹی نما گاؤن کا شانوں سے پھسل جانے کو جی چاہنے لگا اور نازی کا سانس رکنے لگا۔ اس کا جی چاہا کہ وہ لپک کر اڑ کر جائے اور کسی نہ کسی صورت اس حادثے کو رونما ہونے سے روک دے۔

"ہاں ہاں شیور، شیور! وائی ناٹ! نو پرابلم!"

"Oh! safdar Sahib You are so kind!

مصری کی ڈلی منہ میں گھلنے لگی۔

"کائنڈ تو یہ واقعی بہت ہیں! میرا بھی بہت خیال رکھتے ہیں!" نازی نے خوانخواہ ہی اوچھوں کی طرح پھر اپنا پیٹ' سین میں نمایاں کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ صفدر بھی کھسیانی سی ہنسی ہنسنے لگا۔ اب اس نے گاڑی کو رگڑنا بھی چھوڑ دیا تھا۔

"صفدر مجھے آپ سے ایک کام تھا اسی لئے آپ کو ڈھونڈتے ڈھونڈتے باہر چلی آئی۔" دراصل انہوں نے میرا بیڈ روم سلیپر بستر کے نیچے سے مجھے نکال کر دینا ہے۔ مجھے urgently باتھ روم جانا ہے!

Lets go darling

اس نے جملے کا آخری حصہ خوبصورت بلا کو مخاطب کر کے کہا اور صفدر کو تقریباً دھکیلتے ہوئے اندر کی طرف چل دی۔

اتنے حسین رومانوی ماحول میں نازی کی موجودگی نے رنگ میں بھنگ ڈال دی تھی۔ صفدر کا منہ یوں ہو گیا جیسے اسے کوئی کڑوی گولی نگلنا پڑ گئی ہو۔

نازی نے سوچا صفدر سے اس بارے میں کچھ کہے مگر اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کہے۔ ٹھیک ہے اگر ایک خوبصورت جوان ہمسائی سے اس نے ہیلو ہائے کر لی تھی تو اس میں بظاہر تو اتنی قیامت آ جانے والی بات کوئی نہیں تھی۔ اسے صفدر کے جواب کا بھی اچھی طرح پتہ تھا۔ اس نے یہی کہنا تھا کہ تم خواہ خواہ insecure ہو جاتی ہو کیا تمہیں میری محبت پر اعتماد نہیں؟ اور اس جواب کے آگے اسے اپنے لاجواب ہو جانے کا بھی بخوبی احساس تھا اس لئے سوچا میں کیوں اسے کانشیس کرواؤں؟ بہتر ہے کہ نظرانداز ہی کر دوں اس لئے خاموش رہی' کچھ بھی نہ کہا۔

مسز شیما سہیل نے آفر ملتے ہی وقت ضائع کرنا مناسب نہ سمجھا اور اگلی صبح سے ہی روزانہ اپنے شوہر کے فون کا انتظار کرنے ان کے گھر آنا شروع کر دیا۔

ٹھیک ساڑھے آٹھ بجے صبح دروازے کی گھنٹی بجتی تو صفدر کی خوشی سے باچھیں کھل اٹھتیں۔ خوبصورت بلا' کبھی جینز ٹی شرٹ' کبھی ٹریک سوٹ اور کبھی فٹنگ والی شلوار قمیض میں ملبوس امپورٹڈ پرفیوم میں بسی خوشبوئیں بکھیرتی' مسکراہٹیں لٹاتی' بال جھٹکتی' گڈ مارننگ کہہ کر اندر آ جاتی۔ کچھ دیر کو ہیلو' ہائے' ہائے آر یو! ہاؤ آر یو فیلنگ؟ کے ملے جلے رسمی

سوالات‘ رسمی جوابات‘ نازی‘ صفدر‘ شیما کے بیچ گیس بھرے غباروں کی طرح ادھر سے ادھر فضا میں اڑتے پھرتے‘ پھر جملے ختم ہو جاتے‘ کچھ اور باتیں کرنے کو جی چاہنے لگتا اور تینوں ان باتوں کو نہ کرنے کی کوشش میں مصروف ہو جاتے۔

صفدر کا جی چاہتا‘ اسے کانوں میں ہائے بیوٹی فل

Step into my parlour کہے۔

نازی کا جی چاہتا ایک تھپڑ مار کر اس کی چٹیا پکڑ کر اسے "کنجری" کہہ کر گھر سے نکال باہر کرے اور شیما کا جی چاہتا۔ صفدر سے کہے تم اچھے بھلے سویٹ سے پیارے سے آدمی ہو‘ اس موئی بھدی کے ساتھ‘ کیسے وقت گزار رہے ہو؟ poorman مجھے تم پر بہت ترس آتا ہے۔

مگر وہ تینوں عام سی روزمرہ کی باتیں کرنے لگتے اور کرتے چلے جاتے۔

"اوہ میں اپنے hubby کو اتنا مس کرتی ہوں کہ بس کیا بتاؤں۔ ان کا فون سن کر بھی دل کو چین نہیں آتا۔ دن بھر اکیلے رہنا۔ راتوں کو اکیلے سونا‘ بڑا لونلی فیل کرتی ہوں..."

وہ اپنے پرفیکٹ لپسٹک لگے ہونٹوں کو سکوڑتی تو صفدر کے جسم پر چیونٹے سے رینگنے لگتے۔ اور نازی کے اندر ابال سے اٹھنے لگتے۔

"بے چاری! اکیلی ہے نا... اور فون بھی نہیں گھر میں‘ بڑی کٹ آف فیل کرتی ہے... اچھی عادت کی ہے۔ ہے نا؟

صفدر بعد میں بہانے بہانے اس کا ذکر چھیڑ دیتا۔ نہ جانے کیوں۔

"اتنے امیر تو ہیں موبائل فون کیوں نہیں لے لیتی؟" ایک دن نازی نے اس بے چاری کی بے چارگی کا ذکر سنتے سنتے تنگ آ کر کہہ دیا۔

"اوہو‘ بھئی مشکل ہوتی ہے۔ اکیلی ہے کون انسٹالیشن کروائے‘ بھاگ دوڑ کرے۔ کیسے کر سکے گی؟ میاں پاس نہیں ہے!"

صفدر نے یوں اس کا ذکر کیا جیسے وہ ایک ایسی بے سہارا نوجوان بیوہ ہو جو محلے بھر کے کپڑے سی سی کر اپنے چار بچوں کا پیٹ پالنے‘ عزت کی روٹی کھانے کے لئے قربانیوں پہ قربانیاں دیئے چلی جا رہی ہو۔ اور اس کا سوائے اس ہمدرد ہمسائے کے‘ اس بھری پری دنیا میں کوئی والی وارث نہ رہ گیا ہو۔

نازی کے گلے میں وٹامن کی گولی اٹکتے اٹکتے بچی جو وہ رات کے کھانے کے بعد معمول کے مطابق لیا کرتی تھی۔

"وٹامن پابندی سے لے رہی ہو نا... اچھا ہے!" صفدر نے سرسری نظر سے اسے گولی پھانکتے دیکھ کر یونہی تبصرہ کر دیا۔

"ہونہہ' آج بڑا خیال آگیا میری وٹامن کی گولی اور میری صحت کا' اتنے دن سے تو کبھی پوچھا تک نہیں۔" نازی کی آنکھیں ڈبڈبانے لگیں۔ اور اس کے ذہن میں ماضی کے وہ سنہرے دن گھومنے لگے جب وہ اسے سامنے بٹھا کر گھنٹوں تکتا رہتا تھا۔ اسے اپنی زندگی کی ڈرائیونگ فورس کہا کرتا تھا۔

وہ دونوں ایک دوسرے کی محبت میں سرشار زندگی کے آئندہ پروگرام بناتے رہتے۔ پیار میں جیا جاتا' پیار میں رہا جاتا' ساری دنیا کو وہ اپنے پیار کے حوالے سے دیکھتے تھے۔ اور اب جبکہ شادی کو ہوئے محض دو سال ہی گذرے تھے وہ یوں حسرت سے ان دنوں کو یاد کر رہی تھی جیسے وہ کسی ایسی پرانی فلم کے سین تھے جو اب نہیں بنا کرتیں اور جنہیں دیکھنے کی اب کوئی خواہش بھی نہیں رکھتا۔

صفدر دیکھ رہا تھا کہ مصری کی ڈلی کے آتے ہی نازی کچھ موڈ آف سا کر لیتی ہے یا پھر اپنی کمر درد' بلڈ پریشر' طبیعت کی متلی کا ذکر لے بیٹھتی ہے۔ صفدر اور شیما موسم کے ذکر کے بعد دبئی' دوسرے ممالک میں پاکستانیوں کی امیگریشن' نئی وڈیو ریلیز' Phil Collinis کے Latest Single' جاپانی کاروں کے نہ ملنے والے پرزوں' اوزون لیئر اور اس قسم کے دوسرے موضوعات پر گفتگو کرنا چاہتے مگر نازی اسی وقت اپنے مسائل لے کر بیچ میں آن کودتی۔

"کبھی تم بھی اس سے کوئی گپ شپ کر لیا کرو۔ بے چاری اپنی تنہائی مٹانے کو ہمارے ہاں آ جاتی ہے۔ تم تو خواہ مخواہ جیلس ہو جاتی ہو۔ بھئی انسانی رشتہ بھی کوئی چیز ہوتا ہے۔ اس کے پرابلم کو انڈر سٹینڈ کرنے کی کوشش کرو!"

ایک دن صفدر نے اس کے جانے کے بعد نازی پر نکتہ چینی کرتے ہوئے کہا۔

"پرابلم کو انڈر سٹینڈ!" نازی دل ہی دل میں خون کے گھونٹ پی کر رہ گئی۔

"Be Generous' یار آخر وہ ہماری ہمسائی ہے۔ کچھ خیال رکھنا تو ہمارا فرض بنتا ہے نا۔

"اچھا!" کہہ کر نازی نے منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ وہ اپنے چہرے کے تاثرات اپنے شوہر پر ظاہر نہیں کرنا چاہتی تھی۔

اگلی صبح صفدر اپنی سفید سلک شرٹ پر کالی سفید لوکا ڈاٹ ٹائی لگائے' نئی انگریزی دھن پر سیٹی بجاتا دفتر جانے کے لئے تیار کھڑا تھا تو مخصوص وقت پر گھنٹی بجی۔ صفدر نے لپک کر "ویلکم کہہ کر دروازہ کھول دیا۔"

"ہیلو! ہاؤ آر یو؟ Looking great۔" خوبصورت بلا نے آتے ہی صفدر کو اتنا ویل ڈریسڈ ہونے پر Compliment پیش کر دیا۔

"کیسی ہیں آپ؟" اس نے مصنوعی مسکراہٹ سے نازی کو ہاتھ ہلا کر سلام کیا۔

"بالکل ٹھیک! اوہ! میرا فون آ گیا!" وہ گھنٹی کی آواز سنتے ہی اس کی طرف لپکی اور فون سے یوں لپٹنے لگی جیسے اس کا ہی ڈیئر وہی فون ہو۔ ہُبی ڈیئر نے بھی نہ جانے کیا کہہ دیا تھا کہ خوبصورت بلا کی کمر مزید لچکیلی ہو کر بل کھانے اور آنکھیں' شراب انڈیلنے لگیں۔

"Vulgar" نازی نے دل ہی دل میں اسے کوسا۔ مگر کم بخت لگ کتنی خوبصورت رہی تھی۔ اس احساس کو وہ جھٹلا نہیں پا رہی تھی۔

"او ڈارلنگ' بے بی! آئی مس یو ٹو!" مصری کی ڈلی فون پر کسی اور ہی دنیا میں پہنچ چکی تھی اور صفدر کو دیکھنے سے صاف معلوم ہو رہا تھا کہ وہ بھی فوراً ہی اس کی دنیا میں پہنچ جانے کے لئے تڑپ رہا تھا۔

صفدر کبھی دل پھینک نہیں رہا تھا۔ پھر اس کمینی کو دیکھ کر کیسے اس کی رال نکلنے لگ جاتی تھی۔ نازی حیران ہو کر سوچے جا رہی تھی۔

"So! How is life"

خلاف توقع نازی نے اس سے ڈائریکٹ سوال کر دیا کیونکہ ایسے ہی سوال صفدر اس سے کیا کرتا تھا "Fine fine!" خوبصورت بلا نے مختصراً جواب دیا۔ اور چلنے کے لئے اٹھ کھڑی ہوئی "ابھی آج تو میں آپ کو کافی پیئے بغیر نہ جانے دوں گی۔" نازی کا لہجہ مٹھاس سے بھرپور ہو چلا تھا۔

"مگر مجھے تو ابھی اپنی ایروبکس Aerobics کلاس میں جانے کی تیاری کرنا ہے!"

"Physical fitness! good good." صفدر اس کی سلیولیس قمیض میں سے نظر آتے گورے گورے بھرے بھرے بازوؤں کو نہ دیکھنے کی کوشش کرتے ہوئے بولا۔

"آپ کو دیر نہیں ہو رہی؟" نازی نے زہریلی نظروں سے اپنے شوہر کو گھورا۔

"اوکے بائے۔ سی یو Have Fun۔ صفدر اشارہ پا کر گاڑی کی چابی پکڑ کر چل دیا۔

ماسی نے کافی بھی جلد سے بنا ڈالی ورنہ وہ تو ہر کام میں گھنٹہ لگا دیا کرتی تھی۔

دیکھئے آپ سے ایک بات کرنا ہے!" نازی نے لہجے میں کچھ جرات پیدا کرتے ہوئے کہا۔

"جی؟"

"دراصل آپ کی میرے ہزبینڈ سے اتنی فرینک نیس... میرا مطلب ہے ہماری فیملی ویلیوز کچھ اور ہیں...!"

"What do you mean" وہ ناک بھوں چڑھا کر بولی۔

"مجھے پسند نہیں ہے یہ سب کچھ! آپ بھی شادی شدہ ہیں۔ مجھے یقین ہے آپ سمجھ جائیں گی کہ میں کیا feel کرتی ہوں!" نازی نے اپنے بڑے سے پیٹ کو مزید ڈھیلا چھوڑتے ہوئے کہا۔ نہ جانے اس میں آج اتنی طاقت کہاں سے آ گئی تھی۔ وہ خود حیران سی ہو رہی تھی۔

"Well thank you very much" خوبصورت بلا ناگن کی طرح پھنکارنے لگی اور ہونہہ کہہ کر اسے ایک ڈرٹی لک دے کر چل دی۔

صفدر حیران ہو رہا تھا کہ مصری کی ڈلی اپنے ہبی ڈیئر کو فون کرنے کے لئے کچھ دن سے نہیں آ رہی تھی۔ ایک برانڈ نیو لال سرخ ہونڈا گاڑی ضرور ان کی ڈرائیو میں نظر آنے لگی تھی۔

"ہوں۔ نئی گاڑی خریدی ہے۔ مصروف رہی ہو گی خریدنے میں' بے چاری' اسی لئے نہیں آ سکی۔ اس نے اپنے دل کو تسلی دی' آ جائے گی' کتنی اچھی ریفریشنگ گپ شپ رہتی تھی اس سے۔

نازی اب پہلے سے کچھ زیادہ ہی چہکنے لگ گئی تھی۔ اس شام جب اس نے صفدر سے ڈرائیو پر لے جانے' پان کھلانے کی ضد کی۔ تو بات اپنی منوا کر ہی چھوڑی۔ صفدر نے

لاکھ کہا کہ اسے بے آرام نہیں ہونا چاہئے' گھر پر ریسٹ کرنا چاہئے مگر وہ کسی صورت بات ماننے کو تیار نہیں ہوتی۔

گاڑی نکالتے ہوئے صفدر کی نظر اچانک ساتھ والے محفل نما گھر سے نکلتی لال سرخ ہونڈا پر جا پڑی۔ خوبصورت بلا اپنی نئی گاڑی نکال رہی تھی۔ غالباً وہ بھی کہیں باہر جا رہی تھی۔

"ہائے! صفدر نے شیشہ نیچا کر کے 'وِ' کیا۔"

مصری کی ڈلی صفدر کو مکمل طور پر نظرانداز کر کے اپنی گاڑی زوں سے نکال کر لے گئی۔ صفدر کی کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ بھلا اس نے دیکھ لینے کے باوجود اسے جواباً ہیلو کیوں نہیں کہا۔

"یہ ساتھ والوں کے بڑے دماغ ہو گئے ہیں!" وہ کھسیانا سا ہو کر نازی سے کہنے لگا۔

"یہ امیر لوگ ہوتے ہی ایسے ہیں!" نازی اطمینان سے کہنے لگی۔ اور اپنے نرم ملائم پیٹ سمیت سیٹ پر ریلیکس ہو کر دراز ہو گئی۔

○

# گلابو

نگار سجاد ظہیر

نام اس کا گلابو تھا!

تھی بھی گلاب جیسی' خوبصورت' تر و تازہ' بلکہ بہت خوبصورت اور بے حد و حساب کھلی ہوئی' جب میں نے اس کو پہلی بار دیکھا تو میری نظریں اس کے کومل چہرے پر جم کر رہ گئیں۔ مجھے اس طرح دیکھتے پا کر پہلے وہ گھبرائی اور پھر ہنس دی' لیکن اس کی ہنسی میں حسن کا غرور نہیں تھا' تھوڑی حیرت' تھوڑی بے ساختگی تھی۔

"یہ سارے کام کرلیتی ہے۔" مسز خان مجھے بتا رہی تھیں "بس چونکہ ابھی ابھی شادی ہوئی ہے اس لئے بیٹھی بیٹھی کھو سی جاتی ہے' ٹوکنا پڑتا ہے۔" مسز خان کے ایسا کہنے پر وہ تھوڑا شرما کر پھر ہنس پڑی۔

میں گھر تبدیل کر کے حال ہی میں اس نئے محلے میں آئی تھی اور مسز خان میری پڑوسن تھیں مجھے گھر کے کام کاج کے لئے ایک ملازمہ چاہئے تھی اور اس کا تذکرہ میں نے مسز خان سے کیا تھا دوسرے ہی دن مسز خان گلابو کو لے آئی تھیں جو ان کے یہاں گذشتہ ایک سال سے بہت اچھا کام کر رہی تھی۔

"بلکہ اگر آپ کو باہر کے کاموں کے لئے ملازم کی ضرورت ہو تو گلابو کا شوہر اکو برا نہیں" مسز خان نے مجھے بتایا۔

لیکن فی الوقت مجھے کسی مرد ملازم کی ضرورت نہیں تھی یوں بھی اکو مسز خان کے یہاں سودا سلف وغیرہ لایا کرتا تھا' بچوں کو اسکول چھوڑنے جاتا تھا میں نے سوچا اگر مجھے

ضرورت ہو گی تو وقت کے وقت پیسے دے کر اس سے کام لے لوں گی۔

"میں کل صبح ہی صبح آ جاؤں گی بیگم صاحب جی" گلابو مسز خان کے ساتھ واپس جاتے جاتے بولی۔

دوسرے دن وہ واقعی صبح ہی صبح آ گئی اور باورچی خانے میں جھوٹے برتن سمیٹنے لگی۔ جب میں نواز کو کلینک جانے کے لئے تیاری میں مدد دے رہی تھی تو گلابو جھاڑن جھلاتی ہمارے کمرے کے سامنے سے گذری، میرے شوہر نواز نے جس طرح چونک کر اسے دیکھا، مجھے قطعی اچھا نہیں لگا حالانکہ اسی بے ساختگی اور حیرت سے میں بھی اس کو دیکھ چکی تھی۔

دوسرے دن سے میں نے گلابو کے اوقات میں تبدیلی کر دی اب وہ دس بجے آتی تھی جب بچے اسکول اور نواز کلینک جا چکے ہوتے تھے۔ مسز خان نے صحیح کہا تھا کہ وہ کام کرتے کرتے کھو جایا کرتی تھی، کپڑے دھوتے دھوتے رک جاتی، نل میں سے پانی تڑتڑ گر رہا ہے، صابن گل رہا ہے اور وہ کپڑے تھامے خدا جانے کہاں ہے۔ کبھی روٹی توے پر جلا دیتی، تو کبھی دودھ ابلتے ابلتے گر جاتا۔ لیکن وہ میری ضرورت تھی اس لئے مجھے درگذر کرنا پڑتا تھا۔ اس ایک خامی کے علاوہ وہ بہت اچھی لڑکی تھی۔ سارے کام محنت اور خوش دلی سے کرتی تھی، وہ جتنی دیر کام کرتی رہتی اس کا شوہر اکو ایک دو بار ضرور چکر لگا جاتا، بس یونہی بے وجہ!

اکو لمبا چوڑا، مضبوط اعضاء کا وجیہ نوجوان تھا اور گلابو کا دیوانہ تھا، جب وہ گلابو کو دیکھتا، جب وہ اس سے بات کرتا، جب وہ اسے لینے آتا، جب وہ اسے چھوڑ کر جاتا، اس کی ہر حرکت اور ہر نظر میں محبتوں کے دریا بہتے ہوتے۔ یہ بات ہر دیکھنے والا محسوس کر سکتا تھا جب کہ گلابو کی طبیعت میں بڑی بے نیازی تھی، ایسا لگتا تھا جیسے اسے اکو کی کوئی پرواہ نہیں تھی۔ کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ اکو بے چارہ گلابو کے انتظار میں باہر کھڑا ہے اور گلابو جان بوجھ کر دیر کر رہی ہے، کپڑے دھل گئے ہیں، لیکن انہیں خواہ مخواہ میں مزید دھو رہی ہے۔ یا اگر ڈسٹنگ کر رہی ہے تو ایک ہی جگہ کپڑا مارے چلی جا رہی ہے، ایسے میں مجھے اس کو جھڑکنا پڑتا "بس اب ختم بھی کر، باہر آدھے گھنٹے سے اکو انتظار کر رہا ہے۔"

وہ ابھی بھی بیٹھے بیٹھے کھو جاتی تھی لیکن یہ کھو جانا کچھ اور طرح کا تھا۔ وہ اکو کے خیالات میں گم نہیں رہتی تھی کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو اکو کے آنے پر ننگے پاؤں دروازے کی طرف بھاگتی۔ پھر یہ سب کیا تھا؟ میں الجھ گئی، وہ کیا سوچا کرتی تھی؟

اس دن اکو اسے لینے نہیں آیا۔ گلابو خود ہی کام ختم کر کے چادر لپیٹ کر چلنے لگی تو میں نے پوچھا "اکیلی جا رہی ہو؟ اکو کہاں ہے؟"

"وہ بیمار ہے جی' کل رات سے اسے تیز بخار ہے۔"

"کوئی دوا وغیرہ دی؟"

"ابھی تو نہیں دی' ابھی میرا دیور اسے کالونی کے ڈاکٹر کے پاس لے جائے گا۔"

"اگر وہ زیادہ بیمار ہو تو کل کی چھٹی کر لو۔"

"نہیں جی' ایسی بھی کیا بات ہے ٹھیک ہی ہو جائے گا" وہ لاپرواہی سے بولی۔

اس کے لہجے میں اکو کے لیے ذرہ برابر پریشانی نہیں تھی' مجھے بہت افسوس ہوا' کیونکہ پچھلے ماہ جب گلابو کو کھانسی ہوئی تھی تو اکو دن میں تین چار دفعہ گھر آتا' نواز کو تفصیلی حال بتاتا' دوا لے جاتا۔ اس کی شکل سے برستی پریشانی سے اس کی گلابو سے محبت کا پتہ چلتا تھا اور اب اکو بیمار ہے تو گلابو کو جیسے کوئی فکر ہی نہیں۔ آرام سے کام کرتی رہی تھی اور اب چادر لپیٹ کر پہلی کوٹھی میں کام کرنے چل دی تھی۔

دوسرے دن وہ برتن دھوتے دھوتے پھر کسی سوچ میں گم ہو گئی۔ پانی گر گر کر ضائع ہوتا رہا اور صابن کے جھاگ میں لتھڑے ہوئے ہاتھوں میں آدھی منجھی پتیلی پھنسی رہی۔ کچھ دیر تو میں نے اسے دیکھا جب وہ ٹس سے مس نہ ہوئی تو میں نے اسے ٹوکا۔

"اکو کی وجہ سے پریشان ہو تو دو دن کی چھٹی کر لو۔"

"بیگم صاحب چکوال کا کتنا کرایہ لگتا ہے۔" وہ میری بات سنی ان سنی کر کے بولی۔

"پتہ نہیں۔"

"کیا ریل گاڑی یہاں سے سیدھی چکوال جاتی ہے؟"

"یہ بھی مجھے نہیں پتہ --- کیا تجھے جانا ہے؟"

"میں تو ایسے ہی پوچھ رہی تھی جی' اکو مجھے جانے کہاں دیتا ہے" وہ تلخ ہو گئی۔

"یہ تو اس کی محبت ہے' لیکن تو اس کی بالکل پرواہ نہیں کرتی" میں نے اسے جھڑکا" دیکھ گلابو شوہر سے اتنی بے پروائی ٹھیک نہیں ہوتی' تھوڑا اس کا لحاظ کیا کر' اس کی فکر کیا کر۔"

وہ چپ ہو گئی' سر جھکا کر دوبارہ برتن دھونے لگی' کچھ دکھی سی لگ رہی تھی۔

دس بارہ دن بعد اکو اسے دوبارہ سے لینے آنے لگا' کچھ کمزور ہو گیا تھا اور شکل سے بھی اداس نظر آتا تھا' گلابو پہلے ہی کی طرح تھی' میرے ساتھ ہنستی بولتی رہتی' اکو کو دیکھ کر اینٹھ جاتی۔ ایک دن جب اس نے پھر روٹی جلا دی تو میں نے اسے دھر لیا۔

"کیا بات ہے؟ تو کہاں کھو جاتی ہے؟؟"

"معاف کر دیں بیگم صاب' روٹی جل گئی۔"

"وہ تو اب جل گئی' لیکن آج تو مجھے بتا' تو کس کو یاد کرتی رہتی ہے۔"

"کسی کو بھی نہیں جی' بھلا میں کس کو یاد کروں گی؟ میرا کون بیٹھا ہے؟؟" وہ روہانسی ہو گئی۔

"کیوں اکو ہے تو سہی تیرا۔ کیا وہ تجھے پریشان کرتا ہے؟"

"نہیں جی' وہ کیا پریشان کرے گا' وہ چڑ گئی' اکو کے ذکر پر یونہی خار کھا جایا کرتی تھی اور اس دن وہ اکو کے آنے سے پہلے ہی چلی گئی۔ جب اکو اسے لینے آیا اور میں نے اسے بتایا کہ وہ جا چکی ہے تو وہ ایک دم پریشان ہو گیا' محبت آمیز پریشانی کے ساتھ وہ پیلی کوٹھی کی طرف تیز تیز قدموں سے چل پڑا۔ مجھے اکو پر ترس آنے لگا۔

دوسرے دن صبح ہی صبح اکو بہت ہراساں میرے پاس آیا۔

"یہاں گلابو آئی ہے جی؟"

"ارے بھئی ابھی تو سات بجے ہیں' میں نے کالونی کے ایک ایک گھر میں پوچھ لیا' اس کے رشتہ داروں کے یہاں پوچھ لیا' وہ کہیں نہیں ہے جی۔" اکو کی آواز بھرا گئی۔

مجھے رہ رہ کر اس کا کھو جانا یاد آ گیا۔

خدا جانے کس کے ساتھ بھاگ گئی' مجھے اس پر شدید غصہ آیا' اتنے محبتی شوہر کو جو اس پر "واقعتا" جان وارتا تھا چھوڑ کر چلی گئی' اور شکل سے کتنی معصوم دکھتی تھی۔

توبہ یہ لڑکیاں۔

اس دن اکو تین بار گھر آیا' ہر بار ایک آس سے پوچھتا۔

"اب تو نہیں آئی گلابو؟"

مجھے ہر دفعہ اس کی آس توڑتے ہوئے بہت دکھ ہوتا' اچانک مجھے یاد آیا کہ وہ

چکوال کا کرایہ معلوم کر رہی تھی۔

"چکوال میں اس کا کون ہے؟" میں نے اکو سے پوچھا۔

"وہاں اس کے ماں باپ ہیں جی' لیکن وہ اتنی دور اکیلی نہیں جا سکتی' وہ تو بہت بھولی ہے جی' نہ تو اسے ریل گاڑی کا پتہ ہے اور نہ ہی اس کے پاس کرائے کے پیسے تھے۔"

"تیری اس سے لڑائی تو نہیں ہوئی تھی۔"

"کیسی لڑائی جی" اس کا گلا رندھ گیا "کیسی لڑائی بیگم صاحب... میں نے تو اس کے آگے اپنی ہستی ختم کر دی تھی۔" وہ خاموشی سے منہ پھیر کے چلا گیا۔

پھر اکو مجھے نظر نہیں آیا' مسز خان کے یہاں سے بھی وہ چلا گیا تھا' مجھے چند دن کام کی کافی دشواری رہی پھر مسز خان ہی کے ذریعہ میری مشکل حل ہوئی وہ کہیں سے ایک بنگالن لڑکی کا بندوبست کر چکی تھیں اب وہی میرے یہاں بھی آتی تھی' کچھ عرصے بعد میں گلابو کو بھول گئی۔

اس کی سرشت میں وفا نہیں تھی تو وہ یاد رکھے جانے کے قابل بھی نہیں تھی۔

اس بات کو تین سال گزر گئے۔ ایک دن اچانک گلابو آ گئی تھوڑی موٹی ہو گئی تھی اور اس کی گود میں تقریباً سال بھر کا بچہ تھا۔

"تو بغیر بتائے کہاں چلی گئی تھی؟" میں نے سخت غصے سے پوچھا' حالانکہ اب وہ میری ملازمہ نہیں تھی۔

"میں چکوال چلی گئی تھی جی ماں کے پاس۔"

"ماں ہی کے پاس جا رہی تھی تو بتا کر جاتی' اکو اس قدر پریشان تھا۔"

"وہ تو مجھے جانے ہی نہیں دیتا تھا جی"

"نہیں جانے دیتا تو نہ جاتی' آخر تیرا شوہر تھا' تجھ سے اتنی محبت کرتا تھا۔"

"ہاں بیگم صاب جی' میرا دل اس کے لئے دکھتا ہے۔"

"دل دکھتا ہے' مجھے سخت غصہ آیا "اسے چھوڑ کر چلی گئی اب کہتی ہے دل دکھتا ہے۔

یہ کس کا بچہ ہے؟ اچانک مجھے اس کی گود میں بچے کا خیال آیا۔

"میرا ہے جی" اس نے پیار سے بچے کی طرف دیکھا "ماں نے دوسری جگہ

میری شادی کر دی وہ غلام رسول میرا میاں ہے۔" اس نے دور صحن میں بیٹھے ہوئے، کالے، کلوٹے، بدشکل اور بھدے سے آدمی کی طرف اشارہ کیا "اکو تو مجھے طلاق دیتا ہی نہیں تھا۔"

"تو خوش ہے؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"ناخوشی کی کیا بات تھی؟ میرا گھر ہے، بچہ ہے، چاہنے والا میاں ہے..."

"چاہنے والا تو اکو بھی تھا" میں اس کی بات کاٹی "پھر کیسا بانکا تھا وہ، تیری تو اس کے ساتھ سورج چاند کی جوڑی تھی۔ اور پھر تجھے کتنا چاہتا تھا، بیوی کو اتنا چاہنے والے مرد ہوتے کہاں ہیں۔"

"وہ مرد ہی کہاں تھا جی" گلابو بے زاری سے بولی اور میری طرف پشت کر کے بچے کو دودھ پلانے لگی۔

○

# بے ستوں آئینہ

نگہت سلیم

وہ سب فرحاں و شاداں تھے اتنی روشنی تھی کہ ایک دوسرے کے چہرے بھی پہچانے نہیں جا رہے تھے۔

"اسد۔۔۔ شاہ تم سے بہت خوش ہیں۔ اس گھنیرے اندھیرے جنگل میں تمہاری جرأت بے مثل تھی۔۔۔ شاہ کا فرمان ہے تم جس قلم دان پہ ہاتھ رکھ دو وہ تمہارے گھر کی لونڈی۔۔۔!"

ہاؤ ہو کے شور تلے وہ دب گیا اسے لگا جیسے دربار مغلیہ میں وہ اپنے حصے کی بخشش لینے آیا ہے۔ اتنی افراتفری تھی کہ کاسہ گدائی اور تاج شاہی کا فرق رکھنا مشکل نظر آ رہا تھا۔ ہر شخص اپنے کار ہائے نمایاں کو شعلہ بیانی کی نذر کر رہا تھا محسوس ہوتا تھا جیسے ایک طویل قحط کے بعد لذیذ اشیائے خورد و نوش سرعام پھیلا دی گئی ہیں اور من و تو کی تخصیص کئے بغیر ہر شخص اپنے حصے سے زیادہ جھپٹ لینے کی تگ و دو میں مصروف ہے۔

وہ اپنے آپ سے دوری کو شدت سے محسوس کرنے لگا یکایک جیسے بھاری بوٹوں کی ٹھوکر نے اسے چونکایا۔

"خواب دیکھنے کی آزادی چاہتے ہو۔۔۔ تم مڈل کلاس کے خود ساختہ مغرور دانشور۔۔۔ اپنے پیٹ پر پڑے چیتھڑے سے دنیا کی نظر ہٹانے کے لئے ذہن کی شعبدہ گری دکھاتے ہو۔۔۔ تم مداری ہو۔۔۔ اپنے افکار کو بندر کی طرح نچاتے اور لوگوں سے فن کی داد پاتے ہو۔۔۔ میں دوں گا تمہیں داد۔۔۔"

اور پھر ننگی برقی تار اس کے منہ میں تالو کے آخر تک اتر گئی۔ حلق جبڑا پلکوں

تک چہرے کی تمام نسیں تشنج میں مبتلا ہو گئیں ---

---

وہ وہاں سے اٹھا اور پر شور ہجوم کو چیرتا ہوا باہر نکل گیا۔

رانجھن تخت ہزارے دا

تینوں جھنگ سیال پچایا وے

میں کہاں آ گیا

میں کہاں آ گیا

اس نے خود سے پوچھا۔

کیا مجھے یہیں آنا تھا

کیا یہی سب تھا جس کے لئے میں...

اس نے اپنے حلق میں گرم پانی اترتا محسوس کیا۔

---

دور کہیں وادیٔ سینا تھی جہاں دیدار ملتا تھا۔ زرد رنگ کے ٹیلے اور اونٹوں کی قطاریں --- وہ سمت کا تعین کئے بغیر چلتا رہا۔ راہ میں مجوسیوں کے خیمے تھے، میگھ ملہار منتظر تھا اس طرف نظر کون کرتا --- دعا کو ہاتھ کون اٹھاتا --- وہ مجبور تھا مگر کس کے لئے --- اس کا خیال تھا وہ بہت کچھ جانتا ہے مگر اب وہ مرحلہ آ گیا تھا کہ جب منکشف ہوا وہ کچھ نہیں جانتا۔

زندگی موت کی ہتھیلی پر منجمد کیڑے کی طرح پڑی تھی۔ ابتدائی دینی درس اسے یاد تھا "موت تمہاری محافظ ہے۔" وہ پہلے سے زیادہ بے خوف ہو گیا۔

"تو ساری بات بتائے گا --- یہاں ہر کوئی اگل دیتا ہے ---" ایک موٹی سی گالی اور بھاری بوٹ کی ٹھوکر۔

"اچھا --- تو تو اذیت کے متعلق مضمون لکھتا تھا۔

ہاں --- تو کون لوگ تھے جو ترے ساتھ تھے --- کون تھے جنہوں نے تجھے پناہ دی --- وہ ایڈیٹر ---" پھر موٹی سی گالی کہاں چھپا ہوا ہے ---؟؟؟"

"تم مجھے متعلقہ حکام کے حوالے کر دو --- پہلے مجھ پر مقدمہ چلنا چاہئے۔

جرم ثابت ہونا چاہئے پھر... پھر..."

"یہ سب تو جب ہو گا۔ میرے باپ... جب تیرا مردہ یہاں سے جائے گا---"

دم کٹے لومڑ نے اس کے منہ پر تھوک دیا۔

"یہ مشین دیکھ--- تو اسے پہچانتا تو ہے--- اس کی کارکردگی پر مضمون لکھتے ہوئے تو نے سوچا تھا کہ تو بھی اس سے حاصل کردہ جدید ایذا رسانی کے طریقوں سے لطف اٹھانے یہاں آئے گا---" دم کٹے لومڑ نے سختی سے ہونٹ بھینچے۔

"تم کس قانون کے تحت یہ طریقے..." زوردار طمانچہ اس کے منہ پر پڑا۔

"کتے تو چاہتا ہے کہ تیرا مقدمہ کھلی عدالت میں چلا جائے--- تجھے جیل بھیجا جائے تجھے ہیرو بنایا جائے--- تو ہمیں قانون سکھانے آیا ہے--- میں سکھاتا ہوں تجھے قانون---" اور پھر وہ آہنی برقی کرسی' تشنج سے لرزتا اس کا جسم۔

---

بچپن ہی سے اس کے سر پہ خوابوں کا ٹوکرا دھرا تھا۔ اس کے خواب پہلے وجود میں آئے کہ وہ خود--- اسے نہیں معلوم--- اس کے خواب اتنے قد آور ہو گئے کہ سر اٹھا کے انہیں دیکھنا پڑتا تھا۔

پھر ایک خوفناک انکشاف ہوا۔ اس کے سر میں بادشاہت کا سودا سما گیا تھا--- ایسی بادشاہت جسے تخت کی نہیں تختے کی سج دھج عزیز ہوتی ہے--- وہ کسی گمشدہ سلطنت کی تلاش میں تھا۔

---

تنگ کوٹھری کے سیلن زدہ کھردرے فرش پہ اپنی غلاظت میں سوتے ہوئے وہ گھر کے آنگن میں لگے چمپا' موتیا' موگرے کو خود سے قریب محسوس کر رہا تھا اچانک یوکلپٹس کی شاخیں لچک اٹھیں۔

"اسد--- تم اس مشکل رستے سے واپس آ جاؤ زندگی ایک بار ملتی ہے--- ایک بار کوئی آواز سچائی سے پکارتی ہے--- اسے اور آوازوں میں مدغم کر دیا جائے تو انسان عمر بھر انجان آوازوں کے تعاقب میں بھاگ بھاگ کے آبلہ پا ہوتا رہتا ہے۔"

وہ ہنس دیا---

"یہ تم مغلیہ شہزادیوں والی پوشاک پہن کے' ہاتھوں میں چنبیلی کے گجرے سجا

کے یہی کچھ بتانے آتی ہو---

"ہاں---" زیب النساء اس کی شوخی پر مسکرا دیتی پھر وہ بڑے چاؤ سے اس کے قریب بیٹھ جاتی اور اسے بتانے لگتی کہ جھیل سیف الملوک جہاں چاندنی رات میں پریاں اترتی ہیں وہاں سرسبز پہاڑوں اور آبشاروں میں گھرا ایک چھوٹا سا گھر ہونا چاہئے--- پگھلتی ہوئی دودھیا چاندنی کا دریا--- شفاف رواں پانی کی جلترنگ' سلائیڈنگ کرتے ہوئے گلیشیر--- اور---"

"میں ان باتوں کو بہت پیچھے چھوڑ آیا ہوں" وہ گھمبیر سنجیدگی سے کہتا "زندگی میں کبھی نہ کبھی تمہیں ان باتوں کی ضرورت پڑے گی' زیب النساء کے لہجے میں تیقن ہوتا---

---

اس کی انگلیوں کو شکنجے میں ڈالا جا رہا تھا--- لہو میں تر چپچپاتی انگلیاں--- جنہوں نے وہ لفظ لکھے جنہیں حاکم وقت کا مورخ حذف کرنا چاہتا تھا۔

"ہاں بولو--- کیا لکھا تھا تم نے--- پانیوں میں زہر گھل رہا ہے۔ فضا میں ارتعاش ہے۔ قوم کے ساتھ بھیانک کھیل کھیلا جا رہا ہے۔ فکری آزادی پر پہرے ہیں سلوپوائزن دیا جا رہا ہے۔"

دم کٹا لومڑ طنزیہ لہجے میں اس کا مضمون فرد جرم کی طرح سنا رہا تھا---

"تو تمہیں فکری آزادی چاہئے---" وہ غراتے ہوئے۔

اخبار لپیٹنے لگا پھر اس کے قریب آیا اور اس کے بالوں کو مٹھی میں لے کر اس کے سر کو جھٹکے دیئے---

"جب یہ سر ہی نہ رہے گا تو فکری آزادی لے کے کیا کرو گے--- جب زبان ہی نہ رہے گی تو نوحہ کیسے پڑھو گے---"

بھاری بوٹ فرش پہ مار کے اس نے زور دار قہقہہ لگایا آس پاس کھڑے بھورے بھورے سائے اس قہقہے میں شامل ہو گئے اسد کو یوں لگا جیسے وہ الورا اور اجنتا کے غاروں میں بھٹک گیا ہے اور کریہہ المنظر مورتیاں اس کے گرد گھیرا ڈالے ناچ رہی ہیں۔ دم کٹے لومڑ نے اخبار پانی کے ٹب میں ڈبو دیا تھا مگر گھلتے لفظوں کی خوشبو اس کے نتھنوں کو معطر کر رہی تھی۔

وہ پھر قریب آیا لائٹر جلایا اور اس کے کان کی لوؤں کو سلگانے لگا "تم نہیں جانتے ہم کیا کیا کر سکتے ہیں' منہ بھینچ کے وہ مسکرایا درد کی شدت سے اسد نے آنکھیں سختی سے بند کر لیں۔

ہم جو کچھ کر سکتے ہیں سب کچھ کریں گے وہ پھر بولا۔

بغاوت کی بو میں لپٹے تمہارے ایک ایک لفظ کا حساب لیں گے۔ تمہارے ایڈیٹر کو' تمہارے ساتھیوں کو اور تمہارے گھر والوں کو بھی اس جنت کی سیر کرائیں گے جس کی خواہش--- نہیں لالچ--- تم اس لئے کرتے ہو کہ تاریخ تمہیں ہیرو بنا دے گی--- وہ دانت کچکچانے لگا... ہم سب کچھ کریں گے لیکن اس بات کا خیال رکھیں گے کہ کسی دیوار پر تمہارے نام کی تختی نصب نہ ہو سکے۔

---

"کچھ سنا تم نے--- اسد نے تمام اختیارات و مراعات لینے سے انکار کر دیا ہے۔"

جو اسے جانتے تھے ان کے لئے یہ خبر زیادہ حیران کن نہ تھی مگر وہ اسے واقعی جان لینے کا اعتراف پسند نہ کرتے تھے۔

"بے چارہ--- ذہنی طور پر دیوالیہ ہو چکا ہے---" یہ وہی تھے جن کے نام کی حفاظت اس نے عقوبت خانے میں اپنی زندگی سے زیادہ کی تھی---

"اسے علاج کی ضرورت ہے---"

"آہ--- ہاں--- کتنا نستعلیق ہوا کرتا تھا اسد---

اس کی آواز کا لحن--- ذہانت کی چکا چوند۔ آہ اسد تو بالکل قدیم ساحروں جیسا تھا--- فلسفے کی موشگافی' مابعد الطبیعیات' شاعری کی حسیات اور اس کی شعلہ بیانی--- مگر اب تو اسے قید تنہائی میں رینگتی چیونٹیوں کی تعداد یاد رہ گئی ہے یا بھاری بوٹوں کی ٹھوکریں---"

"ہاں--- اذیت کس نے نہیں اٹھائی؟ مجھے دیکھو حوالات در حوالات ایک کوارٹر گارڈ سے دوسرے کوارٹر گارڈ--- شہر در شہر لیکن اپنے حوالوں میں رہنا بہت ضروری ہے---"

"شاید--- وہ اتنا ہی سفر کر سکتا تھا--- اب آگے کے لئے اس کا رستہ

ختم---" کسی ساتھی نے پیش گوئی کی۔

"وہ تو قلعے کا دیو ہے فتح کر کے نکلا ہے--- چاہے تو عمر بھر اپنی فتوحات کیش کرا سکتا ہے لیکن وہ سمجھتا ہی نہیں---" تاسف ہی تاسف تھا۔

وہ سب نہیں جانتے تھے کہ دیو کے پاؤں بہت بڑے ہوتے ہیں دیو کارواں کے ساتھ پاؤں اٹھا تو سکتا ہے لیکن بہت جلد بہت آگے نکل جاتا ہے یہاں تک کہ تنہا ہو جاتا ہے---

مگر وہ سب بھی تو غلط نہیں تھے۔

بالآخر رات کٹ چکی تھی نیا سورج طلوع ہو چکا تھا اب بھاری بوٹوں کی جگہ شاہ کے انعامات و اکرامات تھے۔ مصاحبوں کے علاوہ عوام الناس نے بھی نئے سورج کی کرنوں کو دیکھا تھا--- دکانوں کے بورڈ چمکنے لگے تھے۔ اجناس بھی وافر ہو ہی جاتیں--- لوگوں کی پسلیوں پر گوشت چڑھ ہی جاتا--- ذہنی و فکری آزادی جیسے الفاظ کے استحصال پر کوئی پابندی نہ تھی--- صحافت اب تشدد کا شکار نہیں تھی اور سمجھوتہ---! وہ تو بقاء کے لئے ضروری ہوتا ہے۔

لیکن وہ کال کوٹھری---؟

جو اس کے آدرش کی روشنی سے جگمگاتی تھی۔

اس کی جگمگاہٹ کوچہ و بازار تک کیوں نہیں آئی۔

وہ یہی سوچتا---

شہر کے بام و در اسے سوال کرتے نظر آتے۔

جتنے سر تھے اپنے شانوں پہ نہیں تھے' دیواروں پر آویزاں تھے۔ جتنی آنکھیں تھیں اپنے حلقوم میں نہیں تھیں فضا میں ڈولتی تھیں وہ چلتا--- اس کا تعاقب کرتیں--- اس سے کہتیں بس--- یہی کچھ "آخر" تھا کیا---

جہاں زاد' کیسے ہزاروں برس بعد
اک شہر مدفون کی ہر گلی میں
مرے جام و مینا و گلداں کے ریزے ملے
ہیں
کہ جیسے وہ ہر شہر برباد کا حافظہ ہوں

وہ اونٹنی جس پر سوار وہ سیاہ تپتے ریگستان طے کر آیا تھا اب نخلستان میں آ کے بدک گئی تھی --- وہ اس کی مہار کھینچتا وہ اپنے پاؤں موڑ لیتی --- ایسے میں کون تھا --- زیب النساء بھی نہیں --- انسانوں کی بھیڑ میں گم زیب النساء بھی کیا ادھورا سچ تھی ---؟

وہ اس کے مشن سے کتنی بددل رہتی تھی ---

"شہزادی --- کیا اب بھی تمہارے تین سوالوں پر لوگ زندگی ہار دیتے ہیں ---"

وہ ہنس دیتی --- اور شوخی سے کہتی۔

"اب تخت نہیں تختے کا زمانہ ہے --- ہوشیار رہو بازی گر --- تمہارے لفظوں کا جال وقت کے بے رحم ہاتھوں ٹوٹ بھی سکتا ہے ---"

وہ کیسے ---؟

"ہر شے کو پرکھنے کے لئے وقت درکار ہوتا ہے ---"

"مثلاً" ---؟ وہ پوچھتا۔

"مثلاً یہ کہ کولمبس کا جغرافیہ غلط تھا --- یہ بعد میں معلوم ہوا ---"

"اور میرا جغرافیہ ---" وہ بھی شوخ ہو جاتا۔

اور زیب النساء یک دم بہت سنجیدہ ہو جاتی ---

"اسد --- تم ایسے ستارے کی مانند ہو جو کسی بڑے مدار کے لئے تخلیق کیا گیا ہے --- لیکن تم چھوٹے مدار میں اپنا جیون ڈھونڈ رہے ہو --- چھوٹے مدار میں تم رہ نہیں سکتے اس سعی میں ٹوٹ جاؤ گے ---"

---

وہ اپنی تمام سحر بیانی کہیں رکھ کے بھول گیا تھا اس کے لفظوں کا کمال زوال پذیر ہو گیا تھا --- وہ چاہتا تھا ساتھیوں کو لے کے بہت آگے تک جائے --- کم از کم وہاں کہ جہاں تک انہوں نے جانے کی باتیں کی تھیں ---

انہیں بتائے کہ جسم کے زخم اور عزت نفس کی بے حرمتی انعام کی ایک پوٹلی کی خاطر برداشت نہیں کی جاتی --- کوئی بڑا آدرش --- کوئی عظیم مقصد ---!!

مگر دور تک معدوم رستوں میں کوئی نہیں تھا جو سنتا ------

بس ایک نیم جاں خواب جو زنگولہ بن کے اب بھی ناچتا تھا۔۔۔

زندگی بجھارت بن گئی تھی شاید وہ اتنا ہی جینے کا حق دار تھا۔۔۔ اس کے سانسیں تو باقی تھیں مگر تاریخ نے عجلت میں ورق پلٹ دیئے تھے اب وہ اس کے جنون کی متحمل نہیں ہو سکتی تھی۔

---

پھر وہ جنگلوں میں بھٹکنے لگا۔

پرندوں سے باتیں کرنے لگا۔

اور ایک دن اخبارات میں دھڑا دھڑ شہ سرخیاں لگیں۔۔۔۔

اسد کھو گیا ہے۔۔۔

گمشدگی۔۔۔۔ اغواء۔۔۔۔ حادثہ۔۔۔۔

بہت سوال تھے۔

شاہ کا فرمان آیا "اسے ڈھونڈا جائے۔۔۔"

مگر کہاں۔۔۔؟

شاہ کے کارندے احکام کی بجا آوری کی خاطر زمین کا پاتال کھدیڑنے اور آسمانوں کے بھید چیرنے کو تھے کہ ایک اندھیرے غار میں وہ مل گیا۔۔۔

نہ کوئی کہف تھا نہ اصحاب

لیکن نیند وہی مشروط تھی

اپنے من پسند زمانے کی آمد تک طاری

لیکن اس کے بدن پر نہ چادر تھی نہ تنفس کی جنبش

بس چیونٹیاں تھیں جو اس کے گوشت میں اندر تک پیوست تھیں۔

○

# خبر

جاوید اصغر

منصور آج بھی بستر سے حسب معمول منہ اندھیرے ہی اٹھ گیا۔ حالانکہ اس کا سارا جسم درد کی شدت سے چکنا چور ہو رہا تھا۔ اس کا جی چاہا کہ وہ بے سدھ بستر پر پڑا رہے۔ اور بستر پر لیٹے لیٹے سورج کو طلوع ہوتے ہوئے دیکھے۔ مگر یہ اس کے لئے ممکن نہ تھا' اسے روز کی طرح آج بھی بستی سے منہ اندھیرے ہی نکل جانا تھا۔ اس کی بہت ساری خواہشات کی طرح یہ خواہش بھی سینے کے کسی گوشے میں دفن تھی۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ آج پانی نہیں بیچے گا۔ صرف اخبار فروخت کر کے واپس آ جائے گا۔ منصور جب اپنے "دھندے" کے لئے اپنے اڈے پر پہنچا تو اکی وہاں پہلے سے ہی موجود اپنے مالک کے چاول کی ریڑھی صاف کر رہا تھا۔ برتن تو وہ رات کو صاف کر کے جاتا تھا۔ مگر ہر صبح ریڑھی کو دھونا اس کی ذمہ داری تھی۔

اسے بھی منصور کی طرح منہ اندھیرے اس لئے آنا پڑتا تھا کیونکہ اسے اپنے مالک کے حکم پر چاول چھولے ناشتے کے لئے لوگوں کے سامنے پیش کرنا پڑتا تھے۔ اکی صبح کے وقت بہت مصروف ہوتا۔ کبھی پلیٹیں دھو رہا ہے تو کبھی "چھوٹے" کی آواز پر بھاگ کر پانی دے رہا ہے۔ کہیں مالک کی گالی کے جواب میں سر جھکائے گاہک کو پلیٹ پیش کر رہا ہے۔

اکی اور منصور دونوں چوتھی جماعت تک کلاس فیلو رہے تھے۔ اکی اور منصور میونسپل کمیٹی کے سکول میں' ایک ہی محلے کے ہونے کی بناء پر دونوں کی گاڑھی چھنتی تھی۔ وقت کا پہیہ پھر اس انداز سے گھوما کہ دونوں اکٹھے ہی اس کی زد میں آ گئے۔ اکی کا والد جو فروٹ منڈی میں مزدوری کرتا تھا' ایک بم دھماکے میں دنیا کی مشقت سے نجات پا گیا۔ مگر اکی کی قسمت میں دائمی مشقتوں کا نصاب لکھ گیا۔ اس وقت بھی شہریوں کے جان و مال کا تحفظ حکومت ہی کی

ذمہ داری تھی۔ اکی نے بستے کے بوجھ سے فراغت حاصل کر لی۔ مگر اسے اپنے پانچ بہن بھائیوں کا بوجھ اٹھانا تھا۔ وہ سکول سے نکلا تو منصور بھی اپنے ہاتھوں میں اخبارات کے بھاری بھرکم بنڈل اٹھا کر سڑکوں کے کنارے تازہ خبریں فروخت کرنے میں مصروف تھا۔ منصور کے والد کو کوئی عورت ورغلا کر لے گئی تھی۔ اس نے اپنی والدہ کی زبانی یہ واقعہ اس تسلسل کے ساتھ سنا تھا کہ اسے صرف اسی جملے میں سچائی نظر آئی کہ واقعی اس کے والد کو ورغلایا گیا تھا۔ اس کو نادیدہ عورت کے وجود سے نفرت سی ہونے لگی تھی۔ جس نے اس سے لفظوں کی معنویت چھین کر خبروں کی بے معنی سرخیاں اس کا مقدر کر دی تھی۔ منصور اور اکی کی دوستی صرف "کاروباری" تھی۔ کیونکہ اس قبیلے کے لوگ نہ تو ایک دوسرے کے گھر جا سکتے تھے اور نہ ہی سماجی سطح پر کوئی تعلق قائم کر سکتے تھے۔

منصور نے سٹال پر پہنچتے ہی اخباروں کو ترتیب دیا۔ اپنے میلے کپڑوں کو جھاڑا خالی جیب میں احتیاطاً" ہاتھ ڈال کر تسلی کر لی۔ ٹوٹے ہوئے بوٹ کے تسمے کو مضبوطی سے باندھا۔ گریبان کے بٹن بند کر کے اخبار دکانوں میں پھینکنے چل پڑا۔ اکی بھی اپنے کام میں مصروف تھا۔ سورج طلوع ہو چکا تھا' اکی اور منصور کی مصروفیات جاری تھیں۔ سڑک پر اب ٹریفک کا دباؤ بڑھ گیا تھا۔ چوک میں رش کی وجہ سے اب قطاریں لگنا شروع ہو گئیں تھیں دفتر' سکول' کالج جانے والے اپنے اپنے رستوں پر بڑی تیزی سے گامزن تھے۔ منصور اپنے ہاتھوں میں اخبار اور دل میں خواب چھپائے کھڑا تھا۔ کبھی اپنی ٹوٹی پھوٹی اردو میں کوئی خبر پڑھتا۔ تو اسے محسوس ہوتا کہ سنی جانے والی خبریں ایک سی ہیں اور ہر روز ایک جیسا ہی اخبار ہوتا ہے۔ جس سے ماحول میں کوئی خاص ارتعاش پیدا نہیں ہوتا۔ منصور اس وقت تک بھاگ دوڑ کر اخبار بیچتا رہتا' جب تک لوگوں کا کارواں تیزی سے رواں دواں رہتا۔ جب تھوڑی سی فرصت ملتی تو منصور اکی کے بنچ پر آ کر بیٹھ جاتا۔ اس وقت اکی کے ہاں بھی چاول کھانے والوں کی تعداد کم ہو جاتی تھی۔ جب دونوں مل کر بیٹھتے تو اکی اخبار پر نظر ڈالتا اور منصور چاول کی ریڑھی کی جانب دیکھتا رہتا۔ اکی رنگین تصاویر دیکھتا۔ فلموں کے اشتہارات پڑھتا۔ یا وہ خبر جس کی طرف منصور اشارہ کرتا۔ پھر دونوں بڑی دیر تک حیرت میں کھوئے رہتے۔ آج منصور جب اکی کے پاس بیٹھا تو اس کے جسم میں شدید درد ہو رہا تھا۔ اکی نے اس کی جیب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ جشن آزادی تو کب کا گذر چکا ہے اور تم نے ابھی تک بیج لگایا ہوا ہے۔ منصور نے جھنڈے والے بیج پر ہاتھ پھیر کر کہا جب

کپڑے بدلوں گا تو جھنڈا بھی اتر جائے گا۔ ویسے بھی میں نے شوق سے لگایا ہے۔" اکی نے کچھ کہنا چاہا مگر بریک کے شور نے دونوں کو اس کی طرف متوجہ کر دیا۔ منصور نے کہا "پتہ نہیں اتنی گاڑیاں کہاں سے آ جاتی ہیں؟ کہ سارا دن سڑک پر سے ختم ہی نہیں ہوتیں۔ بڑی بڑی چمکتی کاریں' چھوٹی صابن دانی جیسی۔ ایک دوسرے کے آگے پیچھے دوڑتی ہیں۔ جیسے کتے دوڑتے ہیں۔ بڑے بڑے ٹرک ان کے پیچھے بنی لڑکیوں کی تصویریں اور......... اکی اور منصور نے پولیس والوں کو اپنی طرف آتے دیکھا تو بات ادھوری چھوڑ دی۔ پولیس والوں نے دونوں کو بنچ سے اٹھا دیا۔ اور خود اس پر براجمان ہو گئے۔ کیونکہ آج یہاں سے کسی بڑی سیاسی شخصیت کو گذر کر ایک تقریب میں جانا تھا۔ اور انہیں اس شخصیت کے لئے رستہ صاف اور ہموار کرنے کے ساتھ ساتھ اس کی حفاظت بھی کرنی تھی۔ کچھ دیر کے بعد منصور نے گھر جانا چاہا تو اکی نے یہ کہہ کر روک لیا کہ سیاسی لوگوں کی تصویریں تو روزانہ اخباروں میں شائع ہوتی ہیں آج انہیں گاڑی میں بیٹھا ہوا بھی دیکھیں گے۔ ان کی گاڑی کے آگے جھنڈا لگا ہو گا۔ اور ساتھ گاڑیوں کی لمبی لائن' پھر آگے پیچھے پولیس کی گاڑیاں ہارن بجاتی گذریں گی تو بڑا مزہ آئے گا۔

پولیس والے اب چوک میں اپنی پوزیشن سنبھال چکے تھے۔ کسی وقت بھی بڑی شخصیت کی آمد متوقع تھی۔ دکاندار' گاہک' اخبار بیچنے والے' پانی بیچنے والے ریڑھی بان' خوانچہ فروش' ہوٹل کے ملازم سارے ہی ہارن کی آواز سن کر سڑک کے کنارے اکٹھے ہونے لگے تھے۔

اکی اور منصور بھی لپکے' گاڑیوں کی بھیڑ اور سیاسی شخصیت کو دیکھنے کے اشتیاق میں منصور سڑک کے عین درمیان میں پہنچ گیا۔

اکی کی آوازیں بھی اس کو نہ روک سکیں۔ گاڑیوں کے اس قافلے میں سیاسی شخصیت کی گاڑی کی ٹکر لگنے سے منصور سڑک کے وسط خون میں لت پت پڑا تھا۔ اخبارات بے ترتیبی سے بکھرے پڑے تھے۔

بوسیدہ لباس اب پہلے سے زیادہ خستہ حال دکھائی دے رہا تھا۔ اس حادثے نے ٹریفک کی ساری صورت حال یکسر بدل دی تھی۔ منصور کو اب علاج کے لئے دوسری گاڑی میں ڈالا جا رہا تھا۔ سیاسی شخصیت کی گاڑی روانہ ہو چکی تھی اور اس کا سیکرٹری لوگوں کو باور کرا رہا تھا کہ "جناب" کو بڑی جلدی تھی۔ کیونکہ انہیں بچوں سے "مشقت" کے موضوع پر سیمینار سے

خطاب کرتا تھا۔

اگلی صبح اکی اکیلا ہی اخبار میں منصور کی موت کی خبر پڑھنے اور اس کی تصویر دیکھنے کے لئے تیزی سے اخبار کے ورق پلٹ رہا تھا۔ مگر اسے ہر صفحہ پر سیاسی شخصیت کی تصویر ہی نظر آ رہی تھی۔

○

# وصال

محمد الیاس

میرے دفتر کی چھت' فرش اور دیواریں شیشے کی بنی ہوئی ہیں۔ یہ ایک طلسماتی شیش محل ہے۔ جو میری منشا کے تابع ہے۔ روشنی یا تاریکی اور گرمی یا سردی کے لئے یہ قانون فطرت کا محتاج نہیں۔ میں اپنے اس شیش محل کے صدر دروازے پر "وقفہ برائے عبادت" کی تختی آویزاں کرتا ہوں تو ایک عجیب سا احساس تفاخر میرے اندر سرایت کر جاتا ہے۔ سر پہ ٹوپی اور ہاتھ کی انگلیوں میں پھسلتے ہوئے تسبیح کے موتی' جب میں عبادت سے فارغ ہو کر باہر قدم رکھتا ہوں تو سڑک پر چلتے ہوئے انسان میری نظروں میں حقیر ہو جاتے ہیں۔ مجھے ان کے ناپاک جسموں سے گھن آنے لگتی ہے۔ خوشبو میں بسا ہوا رومال ناک اور منہ پر رکھ کر میں اپنے شیش محل میں پناہ لیتا ہوں تو میرا سانس بحال ہوتا ہے اور میں سکون محسوس کرتا ہوں۔ لیکن یہ کریہہ منظر دیو قامت چھل پائی میرے بدن میں اپنے بدہیئت نوکیلے دانت گاڑے آندھی اور طوفان کی رفتار سے مسلسل میری جانب بڑھتی چلی آ رہی ہے۔ مجھے یہ شکوہ ہے کہ خضوع و خشوع سے کی ہوئی میری عبادت بھی مجھے اس خوفناک چھل پائی سے نجات کیوں نہیں دلاتی۔ مجھے یہ امر رنجیدہ کر دیتا ہے کہ راہ راست پر گامزن ایک شخص کے بدن میں تو ڈائن کے نوکیلے دانت گڑے رہیں لیکن گمراہ لوگ اس روح فرسا اذیت سے محفوظ ہوں۔ یہ انصاف تو نہیں۔

میرے اور افقی لکیر کے درمیان کوئی بھی چیز حائل نہیں۔ نشیب و فراز' جمادات یا ذی روح۔ جیسے میں کرۂ ارض پر تنہا کھڑا ہوں۔ سر پہ آسمان ہے پاؤں تلے مٹی کا فرش بھی لیکن سورج' چاند' ستارے' کچھ بھی نہیں۔ موسم' کسی خاص ماحولیاتی کیفیت کا احساس یا وقت کے تعین کی صلاحیت کا تصور ہی نہیں۔ وہ پھر افق پر نمودار ہوئی ہے۔ میری نگاہ کی آخری

حد پہ کھڑی ہونے کے باوجود وہ اتنی واضح ہے جیسے عین میری نظروں کے سامنے۔ میں اس کے ماسوں سے پھوٹتا ہوا پیپ کی مانند بدہیئت اور بدبو دار پسینہ بھی دیکھ سکتا ہوں۔ پیچھے کی جانب مڑے ہوئے اس کے پاؤں زمین پر ہیں لیکن سر آسمان کو چھو رہا ہے۔ کھردرے اور خاردار رسیوں جیسے چکٹ بال ٹخنوں کو چھو رہے ہیں۔ اس کے دونوں پستان پچکے ہوئے ہیں اور اتنے لمبے ہیں کہ جب وہ دوڑتی ہوئی میری جانب بڑھ رہی ہے تو وہ اس کی رانوں سے ٹکرا کر فضا میں آگے اور پیچھے مسلسل جھول رہے ہیں۔ اس کے جسم کی کھال رنگت اور ساخت کے لحاظ سے کچھ اس قسم کی ہے جیسے تارکول کی سطح پر بنی ہوئی موٹی جھلی۔ اس کے جسم پر کسی بھی قسم کا کوئی ستر نہیں۔ پیلی آنکھوں سے چیپڑ بہہ رہی ہے اور دہانے سے باہر جھانکتے مسوڑھوں تک ننگے خون آلود لمبے نوکیلے دانتوں کی گرفت میں خود میرا جسم جکڑا ہوا ہے اور آندھی طوفان کی رفتار سے میری جانب بڑھتی ہوئی چلی آ رہی ہے۔

میرے تحت الشعور سے وہی منظر ابھر کر میرے سامنے آ گیا ہے۔ میں سات آٹھ سال کا زندگی سے بھرپور' خوبصورت' تندرست' پرجوش اور معصوم سا بچہ ہوں۔ میں ہر روز خدا سے دعا مانگتا ہوں کہ وہ مجھے اپنا دیدار کرا دے میرے دل سے ہر لمحہ یہ دعا نکلتی ہے' اے خدا! میں تجھے بس ایک بار دیکھ لوں پھر اور تجھ سے کچھ نہیں مانگوں گا۔ میں اس لمحے ننگے پاؤں ہوں۔ میرے بدن پر صرف ایک نیکر ہے۔ میں کیا دیکھتا ہوں کہ میری دعا قبول ہو گئی ہے۔ جس طرح میرے گھر کی چھت اور چوبارے کے فرش میں ایک مستطیل سا سوراخ ہوا کرتا تھا اور اس میں سے روشنی اور ہوا داخل ہوتی تھی یا بارش کے چھینٹے نچلی منزل میں پڑا کرتے تھے۔ اسی طرح ایک بہت ہی بڑا سا سوراخ آسمان میں دکھائی دینے لگا ہے۔ لیکن اس میں آہنی سلاخیں نہیں۔ مجھے آسمان کے اوپر کا منظر صاف نظر آنے لگا ہے۔ میرا خدا مجھے دیکھ کر مسکرا بھی رہا ہے اور بارش بھی برسا رہا ہے۔ مجھے جس طرح سے اس سے ڈرایا گیا تھا وہ ایسا تو نہیں۔ وہ تو بہت ہی مہربان شفیق اور خوبصورت ہے۔ ایسا حسن تو میں نے پہلے کبھی دیکھا ہی نہیں۔ وہ بہت بڑا ہے' اتنا بڑا کہ میرا ذہن اس کی بڑائی کا احاطہ کرنے سے قاصر ہے۔ لیکن میرے دل پر اس کی ہیبت نہیں چھائی۔ وہ تو مجھ پر پیار کا نور نچھاور کر رہا ہے۔ اس کے بائیں ہاتھ میں پانی سے بھری ایک دیگچی ہے۔ جو پرانی ہے' پیندا سیاہ' اس پر جابجا ڈینٹ پڑے ہوئے ہیں اور گلے کا کڑا بھی غائب ہے۔ میرا خدا اپنے دائیں ہاتھ کے چلو سے دیگچی میں سے پانی لے کر باہر چھڑکتا ہے تو

ساری دنیا پر بارش کے چھینٹے برستے ہیں۔ مجھے یہ سارا منظر مسحور کر دیتا ہے۔ میرے دل میں یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ اللہ میاں اگر اپنا ہاتھ ذرا سا نیچے کر دیں تو میں سہارا لے کر بڑی آسانی سے اوپر جا سکتا ہوں۔ جب میں یہ سوچ رہا ہوتا ہوں تو وہ مسکرا کر مجھے دیکھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ابھی میں یہاں زمین پر ہی کھیلوں' جب ضروری ہوا وہ خود مجھے اوپر بلا لیں گے۔ لیکن میں چاہتا ہوں کہ میں کوئی ایسا کام کروں جس سے وہ خوش ہوں۔ اچانک ایک جھماکے سے میرے ذہن میں یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ میں اللہ میاں کو ایک نئی دیگچی لا دوں چنانچہ میں ان سے یہ پوچھتا ہوں کہ اگر وہ قبول کریں تو میں انہیں نظام آباد میں اپنی پھوپھو کے کارخانے سے ایک نئی دیگچی لا دوں۔ اللہ میاں بڑی خوش دلی سے میری پیشکش قبول کر لیتے ہیں۔ میری نس نس میں جوش بھر جاتا ہے۔ میں اڑ کر نظام آباد پہنچ جانا چاہتا ہوں۔ میں اتنی قوت سے ننگے پاؤں بھاگنے لگتا ہوں کہ اگلے ہی لمحے میں خود کو ہوا میں اڑتا ہوا محسوس کرتا ہوں۔ میں سمجھ جاتا ہوں کہ میرے خدا نے میری مشکل آسان کر دی ہے۔ میں ایک مناسب بلندی پر اڑتا چلا جا رہا ہوں۔ میرے نیچے سڑک پر ٹریفک رواں دواں ہے اور ریلوے لائن پر ایک مسافر گاڑی برق رفتاری سے وزیر آباد کی طرف بڑھ رہی ہے۔ لاریوں اور ریل گاڑی کے مسافر کھڑکیوں میں سے اپنے آدھے دھڑ نکالے ہاتھ ہلا ہلا کر مجھے داد تحسین دے رہے ہیں۔ ریل گاڑی کا ڈرائیور ہنس بھی رہا ہے اور مجھ سے ریس بھی لگا رہا ہے لیکن میں لمحوں میں اس سے بہت آگے نکل جاتا ہوں۔ دریائے چناب کے کنارے بیلے میں چرتے ہوئے مویشی بھی بدکنے کی بجائے مجھے دیکھ کر خوشی سے چوکڑیاں بھرتے ہیں۔ چند لمحے میں پھوپھو کے صحن میں اتر جاتا ہوں۔ وہ مجھے اپنے ساتھ لپٹا کر پیار کرتی ہیں۔ میرے ماتھے گالوں اور ہونٹوں پر بوسے دیتی ہیں۔ میں ان سے اپنی آمد کا مقصد بیان کرتا ہوں تو وہ مجھے اپنے گھر سے متصل کارخانے میں لے جاتی ہیں۔ وہاں پر ہر سائز کی دیگچیوں کے مینار کھڑے نظر آتے ہیں۔ میں وہاں سے ایک بہت ہی بڑا دیگچہ اٹھا لیتا ہوں۔ اتنا بڑا کہ جیسے دیگ ہوتی ہے۔ دیگچے کو الٹا کر کے میں سر پر رکھتا ہوں تو میرا جسم اس میں گھٹنوں تک چھپ جاتا ہے۔ لیکن میری حیرت کی انتہا ہو جاتی ہے جب میں یہ دیکھتا ہوں کہ آنکھوں کے سامنے دیگچے کی دیوار ہونے کے باوجود ہر چیز مجھے صاف دکھائی دے رہی ہے۔ واپسی پر میں اڑ نہیں سکتا لیکن اتنی تیز رفتاری سے دوڑتا ہوں کہ جلد ہی اس مقام پر پہنچ جاتا ہوں۔ اللہ میاں مجھے دیکھ کر بڑی دلآویز مسکراہٹ کے ساتھ اپنا ہاتھ نیچے کر کے مجھے دیگچے سمیت اوپر لے جاتے

ہیں۔

حیرت ہے میں عقیدتوں کی چھوٹی چھوٹی راہوں میں بچھی ریت پھانکتا رہا۔ تیرے میرے مابین تو محبوبیت کا وہ بے مثال رشتہ ہے کہ جس میں کچھ حائل نہیں۔ تو میرا خالق، میں تیری مخلوق۔ تیرا میرا اٹل رشتہ۔ سب سے افضل، ازل سے ابد تک۔ یہ دکھ یہ درد و الم اور روح کا کرب مجھے عزیز از جان۔ میرا سرمایہ افتخار۔ میں اک شعر الم ہوں، فسانہ درد اور تصویر کرب ہوں۔ مجھے جس شاعر نے موزوں کیا، ادیب نے لکھا اور مصور نے پینٹ کیا، "کن" کے اس لمحے وہ تخلیق کی اک گداز رو میں تھا۔ میں کرب و الم اور دکھ درد کا شاہکار ہوں۔ کاتب لوح و قلم کا اور مصور کل کا۔ وہ پارۂ فن بے مثل ہے جسے صاحب فن لمحہ درد میں تخلیق کرے۔ وہ بے مثل ہے، بے بدل ہے۔ میں بے مثل ہوں، بے بدل ہوں۔ میں تنہا نہیں تھا۔ میں تنہا نہیں ہوں، میں تنہا نہیں ہوں گا۔ میں ننگے پاؤں، سر میں راکھ ڈالے تمام عمر تیری درگاہ میں دھمال ڈالتا رہوں۔ میں معتبر رہ کے لذت عشق سے محروم کیوں رہوں۔

کوئی بیچارگی میرے عشق کی منزل کھوٹی کیوں کرے۔ میں تو وہ خوش قسمت ہوں جس نے تجھے اپنی ہی ذات میں پا لیا۔ تو ہر دم میرے اندر، میری نظروں کے سامنے، میری سانسوں میں بسا ہوا، میرے لہو میں رچا، میری بصارت کا نور، ہر لمحہ مجھ سے اتنا قریب کہ میں خود اپنی ذات سے بھی اس قدر قریب نہ تھا۔ میری سماعتوں میں ہر لمحہ تو رس گھولتا رہا نغمہ جانفزا کی طرح۔ ایک روح پرور خوشبو کی طرح میرے مشام جان میں بسا ہوا... میں تو تیرے عشق میں شکر دوپہر دریا کنارے جلتی ریت پر آگ کا الاؤ روشن کر کے من کا سراغ پانے نکلا تھا۔ لیکن تو تو یہاں ہی تھا، میرے پاس، میرے قریب، میرے لہو لہو دل میں بسا ہوا۔

میں بھل پائی کے جبڑوں سے آزاد ہوں۔ وہ کسی زخم خوردہ چڑیل کی طرح یوں چلائی ہے جیسے آسمان کی چولیں ڈھیلی کرنے کا قصد کیے بیٹھی ہو۔ وہ قبیح صورت، ایک ہزیمت خوردہ احساس کے ساتھ بھاگتی ہوئی افق کی لکیر پھلانگ گئی ہے۔ روشنی ابھی پھیلی بھی نہیں۔ میری تسبیح کی ڈوری ٹوٹ گئی ہے اور دانے بکھر کر ڈھلان کی جانب لڑھک گئے ہیں۔ میں نیم تاریکی میں اترائی میں اتر کر گمشدہ موتی تلاش کرتا ہوں۔ لیکن یہ ایک امر محال ہے۔ میری انگلیوں کی پوریں زخمی ہو گئی ہیں میں واپس اپنے مقام پر پہنچتا ہوں تو مجھے احساس ہوتا ہے کہ میں موتی تلاش کرتے کرتے ٹوپی اور تختی بھی کھو آیا ہوں۔ لیکن یہاں تیرے عشق کے سوتے

پھوٹنے لگے ہیں۔ یہ دھرتی اس نور کی بارش سے سیراب ہو گئی ہے۔ سب چہرے دھل گئے ہیں۔ ہر چہرہ حسین ہے۔ ہر رنگ خوبصورت ہے۔ ہر آواز من پسند ہے' ہر خیال ہر بات دل کو موہ لیتی ہے۔

بلندی میں معلق میرا جسم دھڑام سے نیچے آگرا ہے۔ میں کسی غیر معمولی اونچی چارپائی پر سویا ہوا نیند کی حالت میں نیچے جا گرا ہوں۔ لیکن شعور کی روشنی میں خود کو بدستور اپنے نرم اور آرام دہ بستر پر پڑا ہوا پاتا ہوں۔ آج بار بار ایسا ہوا ہے۔ میرا جسم پسینے سے شرابور ہے۔ جیسے میں کسی خوف میں مبتلا ہوں۔ میں خفیف سا ہونے لگا ہوں۔ کہیں عشق صادق پہ میرے ایمان میں دراڑ تو نہیں پڑ گئی۔ روز اول سے میری روح تجھ سے جڑی ہوئی ہے۔ مجھے تیری جانب لوٹ کے جانا ہے۔ یہ میرا قالب' میرے گرد ایک حصار ہے۔ میں تو وہ ہوں جو اس میں قید ہوں۔ میری روح میری اصل ہے۔ میں روح ہوں۔ میں اصل ہوں۔ ایک اصل وہ ہے جو لوح محفوظ پر محفوظ ہے جس پر لکھا ہے کہ میں نے بالاخر اپنے اصل کے پاس لوٹ جانا ہے۔ وہ اصل تو ہے۔ جس نے مجھے تخلیق کیا۔ میں ایک ادنیٰ اصل اور تو اصل کل۔ باقی سب فریب ہے۔ نظر کا دھوکہ۔ میری اصل کو قالب کی قید نے اصل سے جدا کر رکھا ہے۔ میرا قالب مادہ ہے' جس کا خمیر کثافتوں سے اٹھا ہے۔ وہ کثافتیں جو تعفن ہیں' سڑاند ہیں۔ اس فریب میں میرا شعور شریک ہے۔ میں نیند کے عالم میں شعور کو غافل پا کر قالب کی قید سے نکل بھاگتا ہوں۔ لیکن فرار میں ابھی چند ساعتوں کا فاصلہ طے کرتا ہوں کہ میرا حصار' میرا قالب فنا کے خوف سے پھڑک جاتا ہے اور اس کے پھڑکنے سے ارتعاش کی جو لہریں اٹھتی ہیں وہ میرے شعور کو بیدار کر دیتی ہیں۔ میں اپنے فرار کی ناکامی پر اسی ایک ساعت کے کروڑویں حصے میں واپس قالب کی قید میں داخل ہوتا ہوں تو میرے بدن کو ایک جھٹکا سا لگتا ہے' جیسے میں کسی بلندی سے پستی میں آن گرا ہوں۔

میرے چہرے پہ پڑا آکسیجن ماسک' ایک بازو میں اترتا قطرہ قطرہ خون اور دوسرے میں ڈیکسٹراز (Dextrose Drip) میرے حصار کو ٹوٹنے سے بچا نہیں سکتا لیکن اس کے فنا ہونے سے میں تو فنا نہیں ہوں گا۔ میں تو تب بھی تھا جب یہ نہیں تھا۔ میں تب بھی رہوں گا جب یہ نہیں ہو گا۔ یہ دولت کے عوض لائی ہوئی توانائی' خیرات میں ملی زندگی مجھے نہیں چاہیے۔ یہ بھیک سے بھری تھیلیاں اتار دو۔ سانسوں بھرا کشکول ہٹا بھی دو۔ تھکن سے چور' نیند سے ستے چہرو' میری رفیق' میرے جگر گوشو' میرے اپنو! میرا راستہ چھوڑ بھی دو۔۔۔

# تہہ خانہ

ساجدہ فرحت

اس رات وہ بستر پر لیٹا تو اس نے سوچا شاید آج اسے نیند نہ آئے۔ عجب ہیجانی کیفیت تھی۔ خون میں ایک جوش سا تھا۔ سر کے گنبد میں وہ شور تھا کہ لگتا تھا جیسے وہاں بے ہنگم موسیقی کے شور میں کوئی اناڑی رقصاں ہو۔ اطمینان اور ہیجان کی سرحدوں پر جھولا جھولتے جذبوں نے نہ جانے کب اسے نیند کی وادی میں دھکیلا تھا۔ وہ سونے کے تصور سے اتنی دور تھا کہ نیند نے اچانک اس پر غلبہ پایا تھا۔ نہ وہ اس کیفیت کو سمجھ سکا نہ اس سے سنبھل سکا۔ کمرہ تاریکی میں ڈوب گیا تھا۔ چاند جب کسی گھنے درخت کے پہلو میں منہ چھپا لیتا تھا تو یونہی کمرے میں تاریکی چھا جاتی تھی۔ اور پھر چوبی زینے کے سرے پر ایک ہیولا سا نمودار ہوتا تھا۔ وہ کچھ کہے سنے بغیر اس ہیولے کے پیچھے ہو لیتا۔ زینے کے عین وسط میں پہنچ کر وہ ہیولا پلٹ کر پیچھے آتا اور وہ چپ چاپ اس میں سما جاتا۔ یہ کچھ عرصہ سے اس کا روز کا معمول تھا۔ وہ رات کے سناٹے میں زینہ اترتے ہوئے سوچتا نہ جانے وہ نیند میں چل رہا تھا یا تصور میں...... پھر کسی درز سے سیلا سا ہوا کا جھونکا آتا یا لکڑی کی کوئی پھانس پاؤں میں چبھ جاتی تو وہ جانتا کہ واقعی جسمانی طور پر پورے ارادے اور یقین کے ساتھ وہاں موجود تھا۔

پیدائش کے حساب سے اس کا برج ایسا تھا کہ وہ صحیح معنوں میں نبھانے والا آدمی تھا۔ کوئی کام شروع کرنے کا مطلب تھا اس کے ساتھ آخری مرحلے تک کی وابستگی۔ کسی کا ہاتھ تھامنے سے مراد تھی پوری زندگی کا ساتھ۔ وہ دھن کا پکا تھا۔ خاندان میں اس کی

مقاصد کے لیے کتنی مشہور تھی۔ وہ ایک شائستہ اور مہذب انسان تھا۔ بظاہر انتہائی غیر جذباتی سا آدمی...... ایک بند کتاب۔ ارفع اور زائرہ خاندان کی دو حسین ترین لڑکیاں اس کی دیوانی تھیں۔ پڑوس کی ڈاکٹر شیما کا اس پر دم نکلتا تھا۔ شیما کی اس میں دلچسپی کا یہ عالم تھا کہ اس کا بس چلتا تو اسے اغوا کر لیتی۔ وہ کر بھی لیتی کہ ہٹ کی پکی اور آہنی اعصاب کی مالک تھی لیکن اس کی ایک مجبوری تھی کہ وہ ایک اکھڑ سے روائتی بھائی کی اکلوتی بہن تھی جو اسے نہ صرف اپنی ذمہ داری سمجھتا تھا بلکہ اس مقدس ذمہ داری کو اپنی غیرت کا سوال بنائے بیٹھا تھا۔

تو خیر آس پاس کی کسی لڑکی کا حسن بھی تو اسے مائل کرنے کے لیے کافی ثابت نہیں ہوا تھا۔ اور نہ ہی کسی کی بے ساختہ اداؤں کا فسوں اس پر چل پایا تھا۔ شائد اس کی وجہ یہ ہو کہ جس روز سے اس کے دل کی دھڑکنوں نے کوئی سوال کیا تھا' جب سے اسے اپنے وجود کے خلا کا ادراک ہوا تھا۔ عین اس وقت سے رضوانہ اس کی نظروں میں سمائی ہوئی تھی اور اسے ہر سوال کا جواب لگتی تھی۔ اس میں ظاہری طور پر تو متاثر کرنے والی کوئی بات نہ تھی......بلکہ کسی بھی پہلو سے کوئی خاص بات نہ تھی۔ وہ ایک عام سی لڑکی تھی لیکن چونکہ اس نے کبھی کسی خاص لڑکی کو کسی خاص نظر سے دیکھا ہی نہیں تھا اس لیے اسے رضوانہ میں کوئی کمی نظر نہیں آتی تھی۔ بس یہی کافی تھا کہ اسے لگتا تھا کہ وہ اسی کے لیے تھی۔ رضوانہ کو حاصل کرنے کے لیے اسے خاصی تگ و دو کرنی پڑی تھی کیونکہ اس کے خاندان میں قابل' خوبصورت اور اعلیٰ حیثیت والی لڑکیاں بھری پڑی تھیں اور اس کے والدین بیٹے کی نظر سے رضوانہ کو نہیں دیکھ پائے تھے۔ سچ تو یہ تھا کہ رضوانہ کو کوئی بھی اس نظر سے نہیں دیکھ پایا تھا۔ جس طبقہ سے اس کا تعلق تھا اس میں رشتوں کا جڑنا اور ٹوٹنا ایک معمولی بات تھی اور اکثر لوگوں نے اسے یہی مشورہ دیا تھا کہ رضوانہ میں کسی خاص بات کے نہ ہونے کو بہانہ بنا کر دنیا سے اپنے حصے کی جنت سمیٹ لے...... مگر وہ "جدی" مرد تھا اس کی سمجھ میں ان مشوروں کی منطق نہیں آ سکتی تھی۔ وہ سوچ سمجھ کر راہ منتخب کرنے کا قائل تھا۔ راہ کا انتخاب اس کے لیے بہرحال ایک سنجیدہ معاملہ تھا اور بیچ راہ میں پہنچ کر پلٹ جانا اس کے نزدیک اپنا سفر کھوٹا کرنے کے مترادف تھا۔

اسے علم نہ ہو پاتا رات کب وہ کمرے میں آتی کب ساتھ آ کر لیٹتی لیٹین

بیچ شب میں جب اس کی آنکھ کھلتی تو اسے محسوس ہوتا کہ وہ حسب معمول نہائے اور دانت صاف کیے بنا بستر میں چلی آئی تھی۔ وہ چادر نیچے کھینچ کر اور کھڑکی کی طرف کروٹ لے کر گہری گہری سانسیں لینے لگتا۔ اس کے لیے یہ کوئی نئی بات نہیں تھی...... ابھی پچھلے ہی دنوں ان دونوں نے اپنی شادی کی سلور جوبلی منائی تھی۔ پچھلے پچیس برس سے وہ ان تجربات سے گذر رہا تھا۔ اس نے اس مرتبہ بھی رضوانہ کو ایک نفیس اور مدھم سا پرفیوم تحفہ میں دیا تھا.... اسے جب بھی اس کے لیے کوئی تحفہ منتخب کرنا ہوتا تو وہ اسے خوشبو ہی دیتا تھا....... خوشبو کے پیرائے میں بات کرنا اسے بہت بھاتا تھا۔ مگر رضوانہ خوشبو کے اشارے کیا سمجھتی کہ وہ شاید اس زبان سے ہی نابلد تھی۔ وہ بڑی بلند آہنگ عورت تھی۔ بہت بولتی تھی اور کم کہتی تھی۔ خون پسینہ بہا کر وہ جو کچھ مہینے بھر میں کماتا تھا دنوں میں اڑا ڈالتی تھی...... جس طرح ریت مٹھی سے فوراً نکل جاتی ہے اس طرح پیسہ اس کے ہاتھ میں ٹھہرنے سے قاصر تھا۔

صبح ناشتے کی میز پر وہ اخبار دیکھ رہا تھا...... وہ اس کے عقب میں صوفے پر بیٹھی کھٹا کھٹ ناخن کاٹ رہی تھی..... اچانک ایک میل بھرا کٹا ہوا ناخن اس کے سامنے پھیلے ہوئے اخبار پر آ کر گرا۔ اس نے نظر اٹھائے بغیر ناخن انگشت شہادت اور انگوٹھے کی چٹکی میں لے کر باسکٹ میں پھینک دیا۔ اور بظاہر اطمینان سے اخبار پڑھتا رہا۔ وہ سوچ رہا تھا...... جب وہ اس کے ساتھ کالج میں پڑھتی تھی تو ایک بار وہ اسے اپنے گھر لے کر آیا تھا اس کی دو ایک کزنز بھی اتفاق سے اس روز گھر میں موجود تھیں۔ تعارف کے بعد ان میں سے ایک نے اس کے سفید ہاتھوں کی طرف اشارہ کر کے کہا "تم نیل پالش نہیں لگاتیں......؟ میں تو جب تک نیل پالش نہ لگاؤں تو حرام ہے کہ گھر سے باہر کہیں جاؤں" اپنی کزن کی اس بات پر اس نے رضوانہ کے ہاتھوں کی طرف دیکھا تو یہ دیکھ کر اسے بڑا اچھا لگا کہ اس کے ناخن پوروں تک کٹے ہوئے تھے۔ اور صاف شفاف تھے۔ اس نے مسکرا کر اپنی کزن کو چھیڑا۔ کم از کم ان ہاتھوں کی بنی روٹی کھاتے ہوئے کسی شریف آدمی کو ابکائی تو نہ آئے گی......!"

رات آتی تو اس کا دل ولولے سے دھڑکنے لگتا..... وہ شب کی اولیں ساعتوں میں ہی بستر پر آ جاتا.... اسے سونے کی جلدی نہیں ہوتی تھی.... بلکہ نیم شب کے قریب.... گہرے سناٹے اور تاریکی میں دوبارہ جاگنے کی جلدی ہوتی تھی۔ کچھ عرصے سے اس

طرح اٹھ کر چوبی زینے سے اتر کر نیچے تہہ خانے میں اتر جانا اس کی عادت ہو گئی تھی۔۔۔۔۔ زینے پہ خاصا اندھیرا ہوتا۔ وہ آہستہ آہستہ اترتا پیچھے مڑ کر دیکھتا جاتا۔ وہ اپنی اس جستجو اور تلاش کے ایڈونچر کو راز ہی رکھنا چاہتا تھا۔ وہ سانس بھی ڈر ڈر کے لیتا۔۔۔۔ جوتوں کے بغیر زینہ اترتا اور چڑھتا۔ سب سے مشکل مرحلہ تہہ خانے کے دروازے کو کھولنے کا ہوتا۔ وہ بمشکل تمام روزانہ اسے دوسری جانب دھکیلتا لیکن اگلی شب وہ پھر چوکھٹ میں یوں دھنس جاتا کہ لگتا آج شائد یہ راہ نہ دے۔ چلتے چلتے بے دھیانی میں اسے کئی بار اپنے قدموں کی چاپ پر کسی اور کی چاپ کا گمان ہوتا۔۔۔۔ وہ ٹھٹھک کر رک جاتا۔۔۔۔ سانس روکے ہمہ تن دھیان بنا کچھ دیر کھڑا رہتا۔ اطمینان ہونے پر پھر آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا آگے بڑھنے لگتا۔ اپنے پیچھے دروازہ بھیڑ کر مڑتا تو ایک مرتبہ تو اسے اندھیرے اور سناٹے کا طمانچہ سا جیسے چونکا دیتا۔ پھر رفتہ رفتہ آنکھیں ان دونوں کی عادی ہونے لگتیں۔ جوں جوں وہ آگے بڑھتا اندھیرا گہرا ہو جاتا یہاں تک کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دیتا۔ لیکن قدم قدم پہ تجسس کے چراغ جلاتا وہ آگے بڑھتا رہتا۔ اور سناٹے کی زبان تو اب وہ بخوبی سمجھنے لگا تھا۔ سناٹے کی سطحوں اور درجوں کے ادراک سے وہ جان لیتا تھا کہ زینے کی انتہا آ پہنچی یا یہ کہ سامنے ہموار زمین تھی یا کوئی رکاوٹ تھی، دیوار تھی یا در۔

وہ سنبھل سنبھل کے قدم رکھتا آگے بڑھتا رہتا۔ وہ بہت عرصہ سے یہاں آ رہا تھا۔ یہاں آنے جانے سے اس پر بہت سی باتیں منکشف ہوتی رہتی تھیں۔ یہی کیا کم تھا کہ اس نے ایک اتنی خوبصورت صاف ستھری عمارت کے وجود میں یہ تہہ خانہ دریافت کر لیا تھا۔ جو جالوں سے اٹا ہوا تھا۔ بدبو اور سیلن سے اٹا پڑا تھا۔ جس کے درو دیوار سے بدبو پیپ کی طرح ابل رہی تھی۔ تہہ خانے کی انتہا پر ایک دیوار کے پاس کوڑے لٹھے میں کوئی چیز لپٹی پڑی تھی۔ وہ ڈرتے ڈرتے اس کی طرف جب بھی دیکھتا سوچتا کہ ہونہ ہو یہی اس تہہ خانے کی بدبو کا سرچشمہ ہے۔ اپنے بے پناہ تجسس کے باوجود وہ اسے کھول کر کبھی نہ دیکھ پایا۔ جب بھی اس نے اس کی طرف بڑھنے کی کوشش کی اس کے اندر کسی نے اسے ایسا کرنے سے روک دیا۔۔۔۔ خدا جانے یہ خوف تھا۔۔۔۔ مصلحت تھی۔۔۔۔ اس کی نفاست پسندی تھی یا کچھ اور۔

ایک شام وہ اپنے ایک پرانے دوست کے گھر مدعو تھا۔۔۔۔۔ رضوانہ بھی

اس کے ساتھ گئی تھی--- اس دوست کا سالا اس کے ساتھ رہتا تھا۔ رضوانہ کافی دیر سے غائب تھی وہ اس کے دوست کی بیوی کے ساتھ ہی سامنے کے کمرے میں داخل ہوئی تھی اور اب تک شاید وہیں تھی حالانکہ اس کے دوست کی بیوی کی آوازیں اب کچن سے آ رہی تھیں۔ آخر رضوانہ اس کمرے میں کیا کر رہی تھی۔ اس نے آہستہ سے دروازہ کھولا تو ششدر رہ گیا---- سامنے چارپائی پر حمید کا سالا رضوانہ کے ساتھ بڑا گھل مل کر بیٹھا تھا---- وہ دونوں بے حد انہماک سے ایک دوسرے کو دریافت کرنے کے عمل میں تھے۔ ان کے تعلق کی نوعیت میں کسی قسم کے شبے کی گنجائش ہی نہ تھی---- کسی گواہ کی' ثبوت کی ضرورت نہ تھی---- وہ یوں مل رہے تھے جیسے موج سے موج ملتی ہے' جیسے سورج کی کرن میں شبنم جذب ہو جاتی ہے جیسے ریت میں ریت سما جاتی ہے۔ اس منظر کے بعد اس کے وجود میں ایک تناؤ کی کیفیت پیدا ہو گئی تھی لیکن اس رات جب وہ سوتی جاگتی سی کیفیت میں تہہ خانے میں اترا تو اس کی چال میں وارفتگی کا سرور نمایاں تھا۔ اسے نیچے پہنچنے کی پہلے سے زیادہ جلدی تھی۔ اس نے ایک جھٹکے سے تہہ خانے کا دروازہ کھول دیا۔ آج اس نے پیچھے مڑ کر ایک مرتبہ بھی نہ دیکھا بلکہ جان بوجھ کر سیڑھیوں پر دھمک پیدا کرتا ہوا آ رہا تھا۔ عجب جوشیلے سے خمار میں تھا---- دھم دھم دھم---- دھک---- دھم---- دھک۔

تہہ خانے میں اترا تو بدبو کے ایک مانوس سے جھونکے نے اس کا خیر مقدم کیا۔ وہ آگے بڑھا تو کسی نامانوس وجود سے ٹکرا گیا یہ عجیب بات تھی---- یہاں پر نہ جانے چیزوں کی ترتیب کیسے بدلتی رہتی تھی۔ یہاں تو کبھی صفائی کرانے کے لیے بھی کوئی نہ آیا تھا۔ بلکہ اسے تو شبہ تھا کہ اس تہہ خانے کا گھر میں اس کے سوا کسی کو علم ہی نہ تھا۔ سچ تو یہ تھا کہ تہہ خانہ کسی عمارت کے اندرونی حصے کی بجائے بڑھتے ہوئے درخت کی طرح تھا۔ یہاں پہنچ کر اس پر عجیب کیفیت طاری رہتی تھی۔ کبھی حیرت کی زد میں ہوتا کبھی جوش اور مسرت سے ہمکنار۔ مگر یہاں وہ ذلت اور ندامت کا شکار کبھی نہیں ہوا تھا۔ بلکہ عام طور پر بے نیازی اور بے خوفی کی اس انتہا پر رہتا جہاں سے سرشاری کی کیفیت زیادہ دور نہ ہوتی---! وہ خلاف معمول ذرا تیزی سے آگے بڑھا۔ یہاں قبر کی سی تاریکی تھی۔ سامنے کورے لٹھے میں لپٹا ہوا کچھ پڑا تھا اس نے دل کڑا کر کے ایک سرے سے کپڑے کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ لیا اور لٹھے

کے رول کو زور سے جھٹکا' جیسے رول کیے ہوئے قالین کو کھولتے ہیں---- وہ رول ایک زور دار آواز کے ساتھ سامنے کی دیوار کے ساتھ ٹکرایا۔ اس نے آنکھیں پھاڑ کر دیکھا تو حیران رہ گیا---- وہ تو اس کی اپنی خواب گاہ کی دیوار تھی۔ !اسے یاد آیا آج وہ اوپر آتے ہوئے تہہ خانے کا دروازہ بند کرنا بھی بھول آیا تھا بلکہ بد احتیاطی میں اپنے ناک میں بدبو کا ایک ناخوشگوار بھبکا بھی لیتا آیا تھا۔ اب سفید کورا تھا اس کی خواب گاہ میں قالین کی طرح بچھا ہوا تھا اور ایک اکڑی ہوئی لاش اس کے قدموں کے قریب اوندھی پڑی تھی۔ اس نے جوتے کی نوک سے لاش کو دھکیل کر سیدھا کیا تو یہ دیکھ کر اسے زیادہ حیرت نہیں ہوئی کہ وہ اس کی بیوی کی لاش تھی۔ نہ جانے کتنی مدت سے یہ سڑ رہی تھی۔ اس کے خشک اڑے اڑے سے بال--- پپڑی جمے ہونٹ' پھٹی پھٹی بے جان آنکھیں جن کا نیلے نیلے سے حلقوں نے احاطہ کر رکھا تھا۔ اس کی زرد رنگت۔۔ یہ سب کس قدر ناقابل برداشت تھا--- اخ تھو---- اس نے نفرت سے لاش کے سرہانے تھوک دیا۔

○

# والدہ

تخلیق: پرویز اقبال احمد
ترجمہ: خالد سہیل

وہ رات کا کھانا کھا رہے تھے کہ فون کی گھنٹی بجی۔ ان کا بیٹا فون کا جواب دینے کے لئے لونگ روم میں گیا۔

"ابو! آپ کا فون ہے۔ کراچی سے آیا ہے۔"

صفدر بیگ نے اپنی کرسی پیچھے کھسکائی۔ پھر وہ کھڑا ہوا اور فون کی طرف بڑھا۔ وہ اس کی بہن کا فون تھا۔ وہ رو رہی تھی۔ "والدہ کا ایک گھنٹہ پہلے انتقال ہو گیا ہے۔ آج انہیں دفنا دیا جائے گا اور ان کا سوئم تین دن کے بعد ہو گا۔"

اس کی بیوی اور دو بچوں نے جو باورچی خانے کی میز پر کھانا کھا رہے تھے اس کی گفتگو اور خاموشی سنی۔ "خیریت تو ہے؟" اس کی بیوی نے پوچھا۔

"والدہ کا انتقال ہو گیا ہے" وہ بولا "نجمہ کا فون ہے۔"

اس کی بیوی نے عربی میں مرحومہ کے لئے دعائے مغفرت پڑھی۔

صفدر کو والدہ کی وفات کی خبر سن کر کوئی دکھ نہ ہوا تھا بلکہ اسے یوں محسوس ہوا تھا جیسے اس کے شانوں سے بھاری بوجھ اتر گیا ہو۔ اس نے کئی دفعہ اس خدا سے جس پر وہ ایمان نہ رکھتا تھا دعا کی تھی کہ وہ اس کی والدہ کو اٹھا لے۔ وہ اپنی بہن سے کہنا چاہتا تھا کہ اچھا ہوا والدہ فوت ہو گئیں کیونکہ اس طرح ان کے دکھوں کا سلسلہ ختم ہو گیا۔ وہ تقریباً ایک سال سے بے ہوش تھیں اور اس سے پہلے بھی وہ تقریباً چھ مہینے مفلوج رہ چکی تھیں۔ ان دنوں وہ کم از کم دیکھ تو سکتی تھیں اگرچہ باتیں نہ کر سکتی تھیں۔ وہ کہنا چاہتا تھا کہ قدرت نے والدہ پر رحم

کھایا ہے لیکن اس کی بہن اتنا پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی کہ وہ کچھ بھی نہ کہہ سکا۔ وہ اتنی غم زدہ تھی کہ وہ افسوس کا اظہار بھی نہ کر سکا۔ میں گفتگو ختم ہوئی تو وہ واپس باورچی خانے میں جانے کی بجائے لونگ روم کی تاریکی میں ہی کچھ دیر بیٹھا رہا۔ باورچی خانے سے آنے والے آوازیں بھی آہستہ آہستہ کم ہوتی گئیں اور اس دن شام کا کھانا وقت سے پہلے ہی ختم ہو گیا۔

چند منٹوں کے بعد اس کی بیوی چائے کی پیالی لے کر اس کے پاس آئی۔

"تھوڑی سی چائے پی لو" اس نے کہا "تم نے کھانا بھی ختم نہیں کیا تھا" اس نے چائے کی پیالی چھوٹی میز پر رکھی اور بجلی جلا دی۔ جب روشنی ہوئی تو وہ تاریک غار سے نکلا۔ اس نے اپنی بیوی کو بتایا کہ وہ اپنی بہن سے کیا کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن نہ کہہ سکا وہ اپنی بہن کو نہ بتا سکا کہ زندگی کتنی بے معنی اور ہٹ دھرم واقع ہوئی ہے۔ قدرت کو اس کی والدہ کے بوڑھے گلے کو ریشہ ریشہ کاٹنے میں دو سال لگے تھے۔ اس کے من میں غصے کی لہریں ابھرنے لگی تھیں۔

"اوہ؟! اس نے کتنے دکھ جھیلے تھے" وہ بولا۔

"ہاں" اس کی بیوی نے اس سے اتفاق کیا۔

"لیکن کیوں؟" اس کی آواز میں تلخی ابھر آئی تھی۔

اس کی بیوی خاموش رہی۔ اس نے اس کے باقی کلمات بھی خاموشی سے سنے اور پھر بولی "تمہیں کراچی جانا چاہیے۔"

یہ مشورہ اس کے لئے غیر متوقع تھا۔

"کیوں؟ انہیں تو آج دفن کر دیا جائے گا۔

"نہیں میں سوئم کے لیے کہہ رہی ہوں۔"

وہ اپنی بیوی کے مشورے کی منطق کو نہ سمجھ سکا۔

"کیا اسے کرۂ ارض کی دوسری طرف اس لیے سفر کرنا چاہیے تاکہ وہ ایک مردہ عورت کی جو دفنائی بھی جا چکی تھی، روایتی دعا میں شریک ہو سکے" اس کے ذہن میں یہ خیال آیا لیکن پھر بھی اس نے مزاحمت کیے بغیر اپنی بیوی کا مشورہ قبول کر لیا۔

آدھ گھنٹے کے بعد اس کے بیٹے نے اطلاع دی "آپ کی کل شام ایئر کینیڈا کی پرواز ۹۱ سے ریزرویشن ہو گئی ہے۔

"کیا" اس نے اعتراضاً نہیں بلکہ حیرت سے کہا۔

پہلے تو وہ بغیر سوچے سمجھے کراچی کے لئے تیار ہو گیا تھا پھر اس نے یہ تصور نہ کیا تھا کہ یہ سب انتظامات ایک فون کرنے سے ہو جائیں گے لیکن اب جبکہ وہ انتظامات ہو چکے تھے اس کی حیرت فرحت بخش تھی۔

وہ کینیڈا میں پچیس سال سے رہ رہا تھا۔ ایک ربع صدی ہونے کو آئی تھی۔ اس نے نہ صرف نئی دنیا کے اطوار اپناً لئے تھے بلکہ وہ اسے پسند بھی تھے اگرچہ انداز فکر اور طرز زندگی میں یہ تبدیلی آسانی سے نہ آئی تھی مثال کے طور پر اسے ٹیلی فون کی سہولت پسند تھی لیکن وہ مشینوں سے بات کرنا پسند نہ کرتا تھا اسے یوں محسوس ہوتا جیسے وہ دروازے کی ہتھی یا فرنیچر سے بات کر رہا ہو۔ یہی حال انگریزی زبان کا تھا اگرچہ انگریزی زبان میں وہ جو کام بھی کرتا تھا وہ تسلی بخش ہوتا تھا لیکن اسے اب بھی یوں محسوس ہوتا جیسے انگریزی زبان اس کے ذہن میں اوزار کی طرح ہو بازو کی طرح نہ ہو۔

اگلے دن جب وہ کالج گیا تو اسے ایک اور حیرت کا سامنا کرنا پڑا۔ اس کا خیال تھا کہ جب وہ سمسٹر کے دوران ایک ہفتے کی چھٹی مانگے گا تو چیئرمین کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات نمایاں ہوں گے کیونکہ سولہ مہینوں میں پاکستان کا یہ اس کا دوسرا دورہ تھا۔ پہلی دفعہ جب اس کی والدہ بہت بیمار تھیں تو اسے جانا پڑا تھا اور اب جبکہ وہ فوت ہو چکی تھیں۔ لیکن چیئرمین نے بڑے خلوص سے افسوس اور ہمدردی کا اظہار کیا "دس دن کی چھٹی لے لو۔ جب تم اتنی دور جاؤ گے تو کچھ دن خاندان کے ساتھ بھی گزار لینا۔ ہم تمہاری کلاسوں اور لیب (Lab) کا خیال رکھیں گے۔"

شام کو وہ ہوائی جہاز میں تھا وہ اپنے ساتھ کچھ تدریس کا کام بھی لے آیا تھا لیکن اس کا جی کام میں نہ لگا اور وہ اپنی والدہ کے جہانوں میں کھو گیا۔

وہ اپنی بیماری کی خود ذمہ دار تھیں کیونکہ انہوں نے ایک دن اپنے گھر کے صحن میں ایک آسیبی کھیل کھیلا تھا جس سے ان کی بیماری کا آغاز ہوا تھا ان کا ایک بیٹا جو کراچی کا ایک جانا پہچانا سرجن تھا لندن ایک کانفرنس میں شرکت کرنے اور اپنا ڈاکٹری معائنہ کرانے گیا تھا۔ اسے کبھی کبھار سینے میں درد ہوتا تھا اور وہاں اس کے زمانہ طالب علمی کے کئی دوست تھے جو اب ماہر امراض قلب بن چکے تھے۔

اسے ایک ہفتے میں لوٹ آنا تھا لیکن ماہرین نے اسے بتایا کہ اس کی دل کی

رگیں اس حد تک متاثر ہو چکی ہیں کہ اسے فوراً دل کا آپریشن کرا لینا چاہیے چنانچہ وہ لندن میں رک گیا۔ جب والدہ نے پوچھا کہ وہ لوٹ کر کیوں نہیں آیا تو بہانہ بنایا گیا کہ وہ اپنی ریسرچ میں مصروف ہو گیا تھا لیکن جوں جوں دن گزرتے گئے ان کی پریشانی بڑھتی گئی۔

"تم مجھ سے کچھ چھپا رہے ہو" انہوں نے رشتہ داروں سے پوچھا لیکن کسی نے اقرار نہ کیا۔

جس دن ان کے بیٹے کا آپریشن تھا اس دن انہیں یا تو کسی غیبی آواز نے بتایا تھا اور یا انہوں نے اہل خاندان کے چہرے پڑھ لئے تھے وہ اپنے پاندان کے پاس برآمدے میں دیوان پر بیٹھی تھیں کہ اچانک انہوں نے چھلانگ لگائی اور ننگے پاؤں ننگے سر صحن کی طرف بھاگیں۔ انہوں نے اپنے بازو ہوا میں بلند کئے' سر کے دوپٹے کو ایک کشکول بنا کر اپنے بازوؤں پر پھیلایا' اپنا چہرہ آسمان کی طرف کیا اور دھاڑیں مار مار کر رونے لگیں "اے مالک! میرے بچے پر رحم کر۔ میری زندگی کی قربانی قبول کر لے لیکن میرے بیٹے کو بخش دے۔"

والدہ کی چیخیں سن کر سب لوگ کمروں سے نکل آئے۔

"امی آپ کیا کر رہی ہیں" نجمہ والدہ کو اپنے بازوؤں میں لیتی ہوئی چیخی۔

"میرے بیٹے کی زندگی کا سوال ہے" انہوں نے کراہتے ہوئے کہا۔

"رشید بھائی بخیریت ہیں" نجمہ نے تسلی دی اور انہیں واپس برآمدے میں لانے کی کوشش کرنے لگی۔ والدہ لڑکھڑاتے ہوئے آگے بڑھیں اور پھر راستے میں ہی بے ہوش ہو گئیں۔

اس واقعہ سے تو گھر میں کہرام مچ گیا انہیں ہسپتال لے جایا گیا جہاں ڈاکٹروں نے بتایا کہ ان کے دماغ کی رگ پھٹ چکی تھی۔

انہیں دو دن تک ہوش نہ آیا۔ تیسرے دن جب انہیں ہوش آیا تو ان کے ہونٹوں پر یہ سوال تھا۔ "اس کی طبیعت اب کیسی ہے؟"

"وہ ٹھیک ہے" کسی نے انہیں بتایا۔ رشید کے دل کا آپریشن ہوا تھا اور وہ کامیاب رہا تھا۔

"اے مالک! میں تیرا لاکھ لاکھ شکر ادا کرتی ہوں" وہ بڑبڑائیں "لاکھ لاکھ شکر" پھر انہوں نے آنکھیں موند لیں اور سو گئیں۔ جب وہ دوسرے دن جاگیں تو اپنی گویائی کھو چکی

تھیں۔ وہ آنکھیں کھول کر دیکھ تو سکتی تھیں لیکن بات نہ کر سکتی تھیں۔ اس حادثے کے بعد ان کی حالت دن بدن بدتر ہوتی گئی اور وہ بازوؤں اور ٹانگوں کے استعمال سے معذور ہو گئیں۔

نومبر میں صفدر والدہ کی مزاج پرسی کے لئے کراچی گیا تھا۔ انہیں ہسپتال کے بستر میں سہارا دے کر بٹھایا گیا تھا۔ ان کی آنکھوں میں درد کا ایک بحر بیکراں پھیلا ہوا تھا وہ آنکھیں اسے کافی دیر تک گھورتی رہیں لیکن ان میں اپنائیت کا کوئی سایہ نہ لہرایا۔

"ماں جی! میں صفدر ہوں۔"

کوئی رد عمل نہ ہوا۔

"کیا آپ نے مجھے نہیں پہچانا۔"

وہ پھر بھی خاموش رہیں۔

ان کے صبر کا پیانہ چھلک پڑا اور وہ اپنی والدہ کی آغوش میں سر رکھ کر بچوں کی طرح بلک بلک کر روتا رہا۔ انہوں نے پھر بھی کسی قسم کے رد عمل کا اظہار نہ کیا۔ صفدر نے اپنا سر اٹھایا تو اس کی والدہ کی آنکھوں میں اس وقت بھی درد کے سائے لہرا رہے تھے۔

"کاش وہ اب مجھے کبھی نہ پہچانیں" اس نے اپنے آپ سے کہا "میری دعا ہے کہ وہ اپنی ناگفتہ بہ حالت سے غافل ہی رہیں۔"

ڈاکٹروں نے کہا کہ وہ اپنے حواس کھو چکی تھیں لیکن وہ اس جواب سے پورا مطمئن نہ تھا۔ اگر ایسا تھا تو وہ اتنی غم زدہ کیوں نظر آتی تھیں؟ کیا وہ اپنے آپ کو صلیب پر چڑھتے دیکھ رہی تھیں۔"

صفدر جب ہسپتال سے لوٹ رہا تھا تو بظاہر وہ خاموش تھا لیکن اس کے دل میں درد اور غصے کے دریا بہہ رہے تھے۔ "یہ کیسا خدا ہے جو ایک مجبور و معذور عورت کی زندگی سے کھیل رہا ہے" لیکن پھر اس نے سوچا کہ وہ ایسے خدا پر الزام لگا رہا تھا جس پر وہ ایمان نہیں رکھتا تھا۔

اس کے کراچی پہنچنے کے بعد اس کی بہن بھی بیلجیم سے آگئی جس کے ساتھ اس کا دو سال کا بچہ تھا۔ شام کو جب خاندان والے ہسپتال گئے تو اس بچے کو بھی ساتھ لے گئے۔ صفدر نے دیکھا کہ جب اس کی والدہ نے بچے کی طرف دیکھا تو ان کے آنکھوں کا درد چند لمحوں کے لئے رخصت ہو گیا وہ یہ تبدیلی دیکھ کر بڑا حیران ہوا۔

اگلے دن جب بچے نے شرارت میں ایک گالی دی جو اس کے ایک چچا نے اسے مذاق میں سکھائی تھی تو والدہ کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ اسی واقعہ کے بعد اس بچے کا ہسپتال جانا ضروری ہو گیا۔ صفدر نے سوچا کیا وہ اس بچے کو پہچانتی ہیں؟ کیا وہ اپنے آپ کو پہچانتی ہیں؟ شاید نہیں۔ شاید وہ ایک ازلی و ابدی عورت کا ایک ازلی و ابدی بچے کو دیکھ کر ردعمل تھا وہ ایک ایسے رشتے میں منسلک تھے جو انسانی شخصیتوں سے ماورا ہوتا ہے۔

وہ واپس ٹورانٹو آگیا لیکن اس کی والدہ کی صحت کی ابتری کی خبریں آتی رہیں جلد ہی اس ازلی و ابدی عورت کا ردعمل بھی عنقا ہو گیا۔ والدہ ایک دن ایسی بے ہوش ہوئیں کہ انہوں نے پھر آنکھیں نہ کھولیں ان کا جسم کام کر رہا تھا لیکن ذہن ماؤف ہو چکا تھا وہ ان کا منہ کھول کر کھانا کھلاتے اور وہ بے ہوشی میں ہی کھانا کھا لیتیں۔

اب اسے اپنی والدہ کی زندگی میں کوئی دلچسپی نہیں رہی تھی وہ ان کی موت کی دعائیں کیا کرتا۔ اسے ڈر تھا کہ ایک دن ان کے شعور کا شعلہ لپکے گا اور وہ اپنے آپ کو ایک زندہ لاش پائیں گی۔

"ماں! تم مر کیوں نہیں جاتیں" یہ الفاظ کہتے ہوئے اس کے دل میں خدا کے لئے نفرت کا طوفان امڈ آتا۔

ہوائی جہاز کراچی کے ہوائی اڈے پر اترا تو اس کا ایک بھتیجا اسے لینے آیا ہوا تھا۔ وہ خاموشی سے کار کا سفر کرتے رہے۔ آخر لڑکے نے گفتگو کا آغاز کیا۔ "نانی اماں بستر میں مری ہوئی پائی گئی تھیں۔"

وہ خاموش رہا۔

"ان کا وزن آدھا رہ گیا تھا۔ یوں لگتا تھا ہڈیوں کے پنجر پر جلد چڑھا دی گئی ہو۔"

اس نے پھر بھی کوئی جواب نہ دیا۔

وہ خوش تھا کہ وہ تجہیز و تکفین کے وقت موجود نہ تھا اور اسے والدہ کا ڈھانچہ نہ دیکھنا پڑا تھا۔

وہ شاہراہ سے اتر کر ایک رہائشی بستی کی گلیوں سے گزر رہے تھے لوگوں کے گھروں کی خستہ دیواروں پر صبح کی روشنی میں میلی لگ رہی تھی۔ اس نے تازہ ہوا کے لئے کار

کی کھڑکی کھولی۔ کبھی کبھار ماحول کی بدبو کار میں داخل ہوتی۔ چونکہ صبح کا وقت تھا اس لئے سڑک پر زیادہ ٹریفک نہ تھی البتہ چاروں طرف آوارہ کتے بے کار گھوم رہے تھے۔ ایک تو ان کی کار کے نیچے آتے آتے بچا۔ لڑکے نے کتے کو بچانے کے لئے بریکوں پر پاؤں رکھا اور کار ایک جھٹکے سے رک گئی۔ گلیوں میں مرغیاں بھی کافی تھیں جو گندگی کے ڈھیر میں کچھ تلاش کر رہی تھیں۔ اس کے حواس پر تھوڑی ہی دیر میں اتنے حملے ہو چکے تھے کہ اسے ٹورانٹو کی صاف ستھری اور پاک صاف فضا یاد آنے لگی۔ "اس پورے شہر کو ویسے ہی دھونے کی ضرورت ہے۔" اس کے مضطرب ذہن نے سوچا "جیسے لوگ میلی کاروں کو دھوتے ہیں۔"

سوئم میں کافی گہما گہمی تھی۔ تقریباً چار سو لوگ آئے ہوئے تھے۔

مردوں کے لئے ہمسائے کے ڈاکٹر کے کشادہ گھر کے احاطے میں ٹینٹ لگا دیا گیا تھا اور عورتیں گھر کے اندر تھیں۔ ان مہمانوں میں رشتہ دار بھی شامل تھے' دوست بھی اور ہمدرد بھی جو مرحومہ کے سوئم میں شامل ہو کر ثواب دارین حاصل کرنا چاہتے تھے۔ مہمانوں کو مجلد سپارے دیئے گئے جو انہوں نے آپس میں تقسیم کر لئے۔ ان کا ایمان تھا کہ جتنا زیادہ قرآن پڑھا جائے گا اتنا زیادہ ہی مرحومہ کو ثواب ہو گا۔ جب قرآن خوانی ختم ہوئی تو لوگ خورد و نوش اور آپس میں بات چیت کرنے میں مصروف ہو گئے۔

صفدر کی اپنے ایک کزن سے ملاقات ہوئی جو کراچی یونیورسٹی میں اسلامی قانون کے پروفیسر تھے۔

"السلام علیکم صفدر بھائی۔"

"ہیلو رضوان" صفدر نے جواب دیا۔

"آپ کی والدہ کی روح اس بات سے بہت خوش ہوئی ہو گی کہ آپ کینیڈا سے ان کے لئے مغفرت کی دعا کرنے تشریف لائے۔"

صفدر نے اس رائے سے اتفاق نہ کرتے ہوئے کہا "میرا نہیں خیال رضوان کہ ہمارے دعا کرنے یا نہ کرنے سے مردوں پر کوئی اثر پڑتا ہے۔ وہ ہمارے کاموں میں کوئی دلچسپی نہیں رکھتے وہ تو زندگی اور موت سے بھی بے نیاز ہوتے ہیں۔ زندگی اور موت کے بارے میں تو صرف زندہ لوگ پریشان رہتے ہیں۔ ہم یہ سب کچھ اس لئے کرتے ہیں کہ سکون دل حاصل کر سکیں خاص کر اگر موت ہماری آنکھوں کے سامنے کسی کو ہم سے چھین لے۔"

"تمہارا مطلب ہے کہ ہماری دعائیں عالم ارواح تک نہیں پہنچتیں۔" رضوان نے استفسار کیا۔

"نہیں میرا مطلب ہے کہ کوئی عالم ارواح نہیں ہے۔"

"تو پھر مردوں کی روحیں کہاں جاتی ہیں؟"

"یہ تو ایسا ہی ہے جیسے کوئی پوچھے کہ جب شمع بجھ جاتی ہے تو اس کا شعلہ کہاں جاتا ہے۔"

"یہ ایک دلچسپ خیال ہے لیکن اس کا ہمارے موضوع سے کیا تعلق ہے۔"

"کیوں نہیں۔"

"یہ ایک اچھی دلیل ہے لیکن تم نے ایمان کے عنصر کو نظرانداز کر دیا ہے۔" اس کے کزن نے کہا۔

"میں نے خوابوں کو خیرباد کہہ دیا ہے۔ صفدر نے جواب دیا۔

"لیکن ایمان خواب نہیں ہے۔ وہ زندگی کی ایک ٹھوس حقیقت ہے۔ وہ انسانی ذہن کے لئے ایک لنگر کا کام دیتا ہے۔ وہ اسے روح مطلق سے ملاتا ہے۔ وہ اسے زندگی کی بدلتی ہوئی حقیقتوں کے سمندر میں گمراہ ہونے سے بچاتا ہے۔ جو ذہن ایمان کے لنگر سے محروم ہوتا ہے۔ وہ تند و تیز موجوں کے ساتھ ہچکولے کھاتا رہتا ہے اور پھر ساحل سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جاتا ہے جس انسان کی زندگی ایمان کی دولت سے خالی ہو وہ پریشان اور خوفزدہ رہتا ہے اور اس کی زندگی بے معنی ہو جاتی ہے۔"

"رضوان! تمہارا فلسفہ حقیقت سے فرار کے علاوہ کچھ نہیں جس نے تمہارے ذہن کو مسحور کر رکھا ہے۔

"لیکن روح آئی کہاں سے؟" رضوان نے گفتگو کو از سرنو شروع کرنا چاہا۔

"جسم سے" صفدر نے کہا "جیسے روشنی کی کلی شمع کے جسم سے پھوٹتی ہے۔"

"تم مغرب میں زیادہ وقت گزار چکے ہو۔" اس کے کزن نے کہا "میرے لئے روحانی زندگی ایک واضح حقیقت ہے۔ وہ ایک ایسا آئینہ خانہ ہے جس میں منطق کی مکھیوں کو داخل ہونے کی اجازت نہیں۔ ویسے تمہاری "روشنی کی کلی" ایک خوبصورت تشبیہ ہے۔"

"تمہاری "مکھیوں" کی تشبیہ بھی بری نہیں ہے"

والدہ بھی عالم ارواح پر ایمان رکھتی تھیں اور والدہ کی والدہ بھی۔ صفدر کو وہ گفتگو یاد تھی جو اس نے دس برس کی عمر میں اپنی والدہ اور نانی کے درمیان سنی تھی۔

"بٹی کیا تم جانتی ہو کہ اس نے کیا کہا تھا۔"

"کس نے کیا کہا تھا؟"

"تمہاری نانی نے" (جنہیں فوت ہوئے پانچ سال ہو چکے تھے)

"کیا کہا تھا؟"

"وہ میرے خواب میں آئیں اور کہا 'مجھے سردی لگ رہی ہے۔"

صفدر کی نانی ہر سال سردیوں میں اپنی مرحومہ والدہ کے ایصال ثواب کے لئے دس لحاف بنوا کر غریبوں میں تقسیم کیا کرتی تھیں۔ جس سال وہ ایسا کرنا بھول گئی تھیں اس سال انہیں یاددہانی کرائی گئی تھی۔

اسی دن روئی منگوائی گئی اور روئی دھنکنے والے کو بلایا گیا۔ صفدر کو روئی دھنکنے والا بہت اچھا لگتا تھا۔ اس نے جب اپنا کام شروع کیا تو روئی کو چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں توڑا' فرش پر بچھایا اور پھر روئی دھنکنے لگا۔ روئی دھنکتے وقت خاص قسم کی آوازیں پیدا ہوتیں تن تن تن تان تن تن تن تان۔ صفدر سارا دن وہ مخصوص موسیقی سنتا رہا۔ وہ کبھی کبھار دروازہ کھول کر روئی دھنکنے والے کو دیکھتا تو اسے وہ روئی کے دھوئیں میں چھپا نظر آتا۔ اس نے اپنے منہ اور ناک پر رومال باندھ رکھا تھا اور اس کا سر اور ابرو اڑتی ہوئی روئی کے ٹکڑوں سے سفید ہو چکے تھے۔ شام تک ساری روئی دھنکی جا چکی تھی اور اس نرم و ملائم روئی کا پہاڑ بن چکا تھا۔ اگلے دن پانچ نوجوان عورتوں کو بلایا گیا جنہوں نے فنکارانہ طور پر اس روئی کو لحافوں میں ڈال کر سی دیا اور پھر وہ لحاف محتاجوں کے گھروں تک پہنچ گئے۔

اس کی والدہ کا ایمان تھا کہ دونوں دنیائیں' گوشت پوست کی عارضی دنیا بھی اور روح کی مستقل دنیا بھی خدا کے اختیار میں ہیں وہی ارض و سما کا مالک ہے اور وہی قادر مطلق ہے اسی یقین نے والدہ کی زندگی کو سہارا دے رکھا تھا۔

والدہ کی زندگی کی دوسری اٹل حقیقت اس کے بچے تھے۔ جن سے وہ محبت کرتی تھی وہ اپنے شوہر سے محبت کرنا چاہتی تھی لیکن وہ اس کی اجازت نہ دیتا تھا۔ وہ ایسے ماحول میں ہی بڑھی تھی جہاں شوہر بادشاہ سمجھا جاتا تھا اور بیوی سے توقع کی جاتی تھی کہ وہ شوہر کی

تابع فرمان رہے۔ شوہر کو مجازی خدا تصور کیا جاتا تھا۔

والدہ کے ذہن میں صرف خدا ہی بادشا اور مالک تھا وہ جانتی تھی کہ جو ہستی رات کے وقت عورت کے ساتھ سوتی ہے وہ کمزوریوں کی مالک ہے اور خدا نہیں ہو سکتی چاہے وہ دن کو کیسا ہی ڈھونگ رچائے یہ علیحدہ بات کہ اس نے خاوند کے خلاف کبھی بغاوت کا نعرہ بلند نہ کیا۔ وہ ایسا تصور بھی نہ کر سکتی تھی لیکن وہ جانتی تھی کہ ان کا رشتہ کافی کھوکھلا تھا' اس میں قربت کے رنگ پھیکے تھے اور اس میں وہ لطافتیں مفقود تھیں جو دو محبت کرنے والوں کے یکجا ہونے سے پیدا ہوتی ہیں۔ وہ دو علیحدہ علیحدہ انسان تھے جس میں ایک دوسرے کا استحصال کر رہا تھا۔ لیکن بچوں کی محبت میں ایسی قباحتیں نہ تھیں وہ انہیں جو چاہتی دیتی اور ان سے جو چاہتی لیتی۔ بچوں کے لئے اس کی محبت بے پایاں تھی جو اس پر عالم بے خودی طاری رکھتی تھی۔

والدہ ان دونوں حقیقتوں کو دل سے لگائے زندگی گزارتی رہیں حتیٰ کہ ایک دن ان دونوں حقیقتوں کا ٹکراؤ ہو گیا اور ان کے ذہن میں بھونچال آ گیا۔ صفدر کا سب سے چھوٹا بھائی فیروز جو ایک وجیہ جوان تھا اچانک فوت ہو گیا۔ وہ ایک صبح مسکراتے ہوئے ایئرفورس کے دفتر جانے کے لئے گھر سے نکلا اور چار گھنٹے کے بعد ایمبولینس اس کی مسخ شدہ لاش لے کر آئی وہ ایک حادثے کا شکار ہو گیا تھا۔

والدہ کا غم سے برا حال تھا انہوں نے بال نوچے' دیواروں سے سر ٹکرایا اور چیختے چیختے آسمان سر پر اٹھا لیا ان کی طبیعت بہتر کرنے کے لئے انہیں مسکن ادویہ دینی پڑیں۔

ان کا خاوند بھی جو ایک پکا مسلمان تھا اندر سے ایک پتے کی طرح کانپ رہا تھا لیکن اس کی آنکھ سے نہ تو کوئی آنسو بہا اور نہ منہ سے کوئی چیخ نکلی وہ ایک نابینا شخص کی طرح جائے نماز کی طرف بڑھا' اس پر بیٹھا اور پھر آسمان کی طرف ہاتھ اٹھا کر دعا کرنے لگا" اے خدا! تو ہی اس کا مالک ہے تو نے ہی اسے ہمیں ایک امانت کے طور پر دیا تھا تو نے ہی اسے واپس لے لیا۔ اے مالک! ہم تیری رضا میں راضی ہیں۔ وہ یہ کلمات بار بار دہراتا رہا۔

والدہ کے دکھ میں ہفتوں کمی نہ آئی اس کے خاوند نے جب انہیں رضائے الٰہی کے آگے سرنگوں ہونے کو کہا تو وہ کہنے لگیں "میں یہ سب کچھ جانتی اور مانتی ہوں لیکن میں ایک ماں کے دل کو کیا کروں۔"

چند مہینوں کے بعد آنسو خشک ہو گئے لیکن دل کی آہیں تیرہ سال تک نہ گئیں

"وہ مجھ سے ناراض ہے" وہ اپنے مردہ بیٹے کے بارے میں کہا کرتیں "کیونکہ وہ مجھ سے خواب میں ملنے نہیں آتا۔ وہ اوروں سے ملنے آتا ہے لیکن مجھ سے ملنے نہیں آتا" وہ سوچتیں "میں نے بہت زیادہ آہ و زاری کی ہے شاید وہ خدا کو پسند نہ آئی یہ میری سزا ہے میں نے بہت زیادہ آنسو بہا کر فیروز کے لئے اچھا نہیں کیا۔"

اور پھر وہ اقبال کی نظم "ماں کا خواب" پڑھنے لگتیں۔

اس نظم میں ایک ماں جب اپنے خواب میں بیدار ہوتی ہے تو اپنے آپ کو ایک ویران علاقے میں پاتی ہے وہ ایسے علاقے میں پہلے کبھی نہ آئی تھی وہ اپنے چاروں طرف دیکھتی ہے تو اسے کچھ فاصلے پر چراغوں کی ایک زنجیر نظر آتی ہے وہ قریب جاتی ہے تو کیا دیکھتی ہے کہ وہ بچوں کی ایک قطار ہے جو اپنے اپنے ہاتھوں میں چراغ پکڑے ہوئے ہیں اس قطار کے آخر میں ایک بچہ ایسا ہے جسے چلنے میں دقت ہو رہی ہے اس کی شمع بجھ چکی ہے اور وہ قافلے سے پیچھے رہ گیا ہے وہ جب اس بچے کے قریب جاتی ہے تو اسے پہچان لیتی ہے وہ اس کا اپنا مرحوم بیٹا ہوتا ہے وہ بھاگ کر اسے سینے سے لگاتی ہے اور اسے بتاتی ہے کہ وہ اس کی جدائی میں دن رات آنسو بہاتی رہی ہے۔ لڑکا اپنا منہ موڑ لیتا ہے اور کہتا ہے "میں جانتا ہوں کہ تم بہت آنسو بہاتی رہی ہو لیکن تمہارے آنسوؤں نے مجھے کوئی فائدہ نہیں پہنچایا دیکھو تمہارے آنسوؤں نے میری شمع بجھا دی ہے۔"

شاید والدہ وہی غلطی دوبارہ نہیں کرنا چاہتی تھیں اسی لئے انہوں نے اپنے دوسرے بیٹے کے لئے اپنے خدائے عزوجل کے حضور میں دعا مانگی تھی اور اس سے پہلے کہ موت کی تلوار ان کے بیٹے پر آ کر گرتی انہوں نے اپنے آپ کو پیش کر دیا تھا اور اس تلوار نے ان کے دو ٹکڑے کر دیئے تھے۔

جب صفدر منطق کی عینک لگا کر والدہ کی دنیا میں جھانکتا تو واقعات کی اس تفسیر کو بالکل قبول نہ کرتا لیکن وہ اپنے دل و دماغ سے ان خیالات کو مستقل طور پر نکال بھی نہ سکتا تھا وہ یادوں کے سایوں میں کہیں چھپے رہتے اور جب موقع ملتا تو سر اٹھا لیتے۔

وہ کراچی کے قیام کے آخری دن اپنی والدہ کی قبر پر حاضری دینے گیا۔ اس نے پانی چھڑکتے اور پھول بکھیرتے ہوئے کہا "ماں جی! اب آپ اس قبر میں آرام کی نیند سوئیں گی۔ اب یہاں کوئی بھی آپ کو دکھ پہنچانے نہیں آئے گا آپ کا خدا بھی نہیں۔"

صفدر کی واپسی کی پرواز پر سکون تھی۔ اس نے مسافروں سے گفتگو نہ کی۔ وہ مطالعہ کرتا رہا اور مشروبات سے لطف اندوز ہوتا رہا۔ سات سمندر پار کر کے جب وہ کینیڈا کے ساحل کے قریب پہنچا تو اس نے اگلی سیٹ کے پیچھے رکھی ہوئی کتاب اٹھائی اور اس کی ورق گردانی کرنے لگا۔ کتاب کے درمیان میں پروازوں کے رستوں کا ایک نقشہ تھا۔ سبز زمین اور نیلے سمندر پر بڑے سلیقے سے کالی لکیریں کھینچی گئی تھیں جو بہت خوبصورت لگ رہی تھیں۔

صفدر کو اچانک محسوس ہوا جیسے وہ اس کی والدہ کے روحانی سفر کا نقشہ ہو جس میں مختلف ارواح مختلف منازل کی طرف مائل بہ پرواز ہوں بعض روحیں جنت کے خوبصورت شہروں اور متبرک وادیوں کی طرف اور بعض جہنم کے مردود دیہاتوں کی طرف اڑ رہی ہوں۔

اچانک ہوائی جہاز کو ایسا جھٹکا لگا کہ وہ اپنی سیٹ میں اچھل پڑا جہاز میں "اپنی سیٹوں کے بند باندھیے" کا نشان روشن ہو گیا اس نے بیلٹ باندھ لی اور باہر دیکھنے لگا۔ وہ ایک بادل میں سے گزر رہے تھے لیکن وہ سفر ایک نہ ختم ہونے والا سفر لگ رہا تھا۔ تقریباً دس منٹ کے بعد اس کا سر چکرانے لگا اسے یوں لگا جیسے بادل نے کھڑکی پر برسنا شروع کر دیا تھا اور اس کی آنکھوں کے سامنے کے سب مناظر غائب اور سب مسافر او جھل ہو گئے تھے۔ وہ دھند میں اکیلا سفر کر رہا تھا اس کی آنکھیں کھلی تھیں وہ دیکھ سکتا تھا لیکن اس کے سامنے جو فضا تھی اس کا کوئی افق نہیں تھا کوئی سمت نہیں تھی کوئی منزل نہیں تھی اور پھر اس نے سوچا کہ اگر یہ عدم سے عدم تک کا سفر کبھی بھی ختم نہ ہوا تو پھر کیا ہو گا۔

اس موقع پر اس نے چیخ ماری "تم نے مجھے تنہا کیوں چھوڑ دیا ہے؟" ایک ایئرہوسٹس جس کی عمر تیس سال کے لگ بھگ تھی اور جو اس سے پہلے بھی صفدر سے بات چیت کر چکی تھی اس کے پاس آئی اور شانوں کو جھنجھوڑا۔ صفدر کی کھوئی ہوئی بصارت آہستہ آہستہ واپس آنے لگی اور اس نے کہا "تم نے مجھے تنہا کیوں چھوڑ دیا تھا؟"

"ہم نے تو تمہیں تنہا نہیں چھوڑا تھا" اس نے سادگی سے کہا۔

"تو پھر ہم کہاں جا رہے ہیں؟"

"ٹورانٹو۔ آپ وہیں رہتے ہیں نا۔ ہم گھر جا رہے ہیں شاید آپ نے ایک ڈراؤنا خواب دیکھا تھا۔ ٹھہریے میں آپ کے لئے ایک مشروب لے کر آتی ہوں۔"

جب ایئرہوسٹس چلی گئی تو وہ ایک دفعہ پھر اپنے ذاتی تجربے کی طرف لوٹ گیا

اور خود کلامی میں مشغول ہو گیا "تو یہ تھا جو پاسکال نے محسوس کیا تھا' جدید فضا کا خوف' سائنس نے خدا کے بازوؤں میں محفوظ کائنات کو ایک بے معنی' پر خطر' نہ ختم ہونے والے سفر میں بدل دیا تھا جہاں انسان ڈراؤنے خواب میں کھو جاتا ہے۔"

ایئرہوسٹس لوٹی تو اس نے صفدر کو مشروب پیش کیا "اسے پیئیں گے تو بہتر محسوس کریں گے۔"

اس نے گلاس سے ایک گھونٹ پیا۔ اپنی شرمندگی چھپانے کے لئے اس کے چہرے پر کھسیانی مسکراہٹ پھیل گئی۔

"مسٹر پاسکال سے کہیں کہ دوسری فضا میں سفر کرے۔ بادلوں سے اوپر کی فضا میں جہاں ہم نیلے آسمان کو دیکھ سکیں۔"

"مسٹر پاسکال کون ہیں" ایئرہوسٹس نے نرمی سے پوچھا۔

"پائیلٹ۔ کیا یہ ان کا نام نہیں ہے؟"

"نہیں۔ پائیلٹ تو کیپٹن جونسن ہیں۔"

چونکہ وہ پریشان نظر آ رہی تھی وہ فوراً بولا "معاف کیجئے گا میں مذاق کر رہا تھا۔"

"ویسے پاسکال ہیں کون؟" وہ اب متجسس تھی۔

"اوہ پاسکال۔ وہ سترھویں صدی میں فرانس میں رہتا تھا۔ وہ پہلا انسان تھا جس نے سیکولر فضا اور کائنات کو دریافت کیا تھا۔"

"سیکولر فضا" ایئرہوسٹس کے چہرے پر گھبراہٹ کے سائے پھیل گئے۔

"اس فضا میں خوف کا ڈیرا بسیرا ہے اور دوسری فضا "ممتا کی فضا ہے۔"

"اوہ" اس کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ "ماتا کے پکوان کی طرح۔"

"بالکل درست" اور وہ دونوں ہنس دیئے۔

"آپ مزاحیہ انسان ہیں مسٹر بیگ۔"

"شاید میں ہوں۔"

جانے سے پہلے ایئرہوسٹس نے نرمی سے اس کے شانے کو تھپتھپایا اور کہا "اگلی دفعہ جب ہم بادلوں میں داخل ہوں گے تو میں آپ کے لئے پہلے سے ہی ایک مشروب بنا لاؤں گی۔"

"یہ بہت عمدہ خیال ہے" اس نے جواب دیا۔ ○

معروف شاعر و ادیب
اشرف چوہدری
کی تصنیفات
آئینے بدلنے سے
شعری مجموعہ
سپنوں سے بنی تصویر
شعری مجموعہ
جلتے بجھتے دیپ
افسانے/زیر طبع
ملنے کا پتہ:
القمر انٹر پرائز اردو بازار لاہور
رابطہ مصنف:
۴- بیگم روڈ، مزنگ لاہور

## تعاون

محمد صدیق مینیجنگ ڈائریکٹر

**ایس اے برادرز پرائیویٹ لمیٹڈ**

78/77 سیکٹر آئی نائن، اسلام آباد

پاکستان
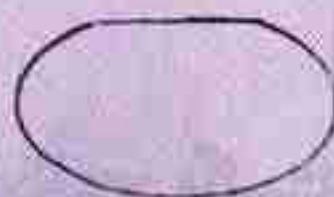
پانچ شاعر

قتیل شفائی
مظفر وارثی
شہزاد احمد
جاوید شاہین
عباس تابش

○

○

## قتیل شفائی

ساغر سے مے' بربط سے نے' اب تک عشق ہے مجھ کو
اچھی اچھی ہر اک شئے سے' اب تک عشق ہے مجھ کو

سانولی سانولی سی اک صورت تھی میری کمزوری
اسی لئے تو شام سے ہے' اب تک عشق ہے مجھ کو

سونے کی چمکار پہ جس نے پیار کی لاج لٹا دی
جانے اب تک کیوں اور کیسے اب تک عشق ہے مجھ کو

اپنے جسم کو وہ خود جانے' میں کچھ کہہ نہیں سکتا
اس کے سر سے' اس کی لے سے' اب تک عشق ہے مجھ کو

ایک تہائی صدی کے بعد بھی ایسا لگے کہ اس سے
عشق نہ ہوتے ہوئے بھی جیسے اب تک عشق ہے مجھ کو

جس کے باعث دوست تھے اپنے رند بھی اور واعظ بھی
اس میخانے سے' اس مے سے اب تک عشق ہے مجھ کو

میں نے سدا قتیل اس بت کو پوجا من مندر میں
کرتا نہیں ہوں ظاہر' ویسے اب تک عشق ہے مجھ کو

○

○

## قتیل شفائی

جاں ہر منظر کی ہے جاناں روپ ترا
شمع تصویر کی ہے جاناں روپ ترا

تاج محل کا کھویا ہوا اک ٹکڑا تو
مورت مرمر کی ہے جاناں روپ ترا

چاندنی راتوں میں یہ تیری بے چینی
موج سمندر کی ہے جاناں روپ ترا

تجھے بھی زینت بخشے مجھے بھی چین ملے
شال ترے سر کی ہے جاناں روپ ترا

اس گھر میں پریاں آنے سے گھبرائیں
رونق جس گھر کی ہے جاناں روپ ترا

تو محتاج نہیں ہے کسی بھی زیور کی
چھب ہر زیور کی ہے جاناں روپ ترا

تو گذرے تو ساری بستی مہک اٹھے
خوشبو عنبر کی ہے جاناں روپ ترا

کوئی قتیل نہاں ترے روپ کی تھاہ نہ پائے
سوچ تخنور کی ہے جاناں روپ ترا

○

قتیل شفائی

محبت وفا سے بری ہو گئی
دلوں کی بہت بستری ہو گئی

وہ اقدار میں آئیں تبدیلیاں
جو کھوٹی تھی شے وہ کھری ہو گئی

ذرا سا جو ساون کا چھینٹا پڑا
مری توبہ پھر سے ہری ہو گئی

نہ تھی اس قدر پر سرور اس کی آنکھ
مجھے دیکھ کر مدھ بھری ہو گئی

وہ چاہی گئی تو نکل آئے پر
جو پہلے تھی حور، اب پری ہو گئی

مرا دوست دشمن مرا بن گیا
اسی سے مری بستری ہو گئی

چلو آؤ لوگو سیاست کریں
محبت تو سوداگری ہو گئی

قتیل اس نے چھیڑی جو ماضی کی بات
جواں پھر مری شاعری ہو گئی

○

## قتیل شفائی

درد مرا اس کے دل تک پہنچا ہی نہیں
راہی اپنی منزل تک پہنچا ہی نہیں

دن کیا خاک بدلتے ہیں خوش فہموں کے
حال کبھی مستقبل تک پہنچا ہی نہیں

وہاں بھی کیا رکھا تھا، وہ تو خیر ہوئی
ڈوبنے والا ساحل تک پہنچا ہی نہیں

وہ ڈر تھا اک سانپ سی آنکھوں والی کا
کوئی چراغ اس محفل تک پہنچا ہی نہیں

جہاں پہنچ کر پتھر کھانے پڑتے ہیں
میں ان خاص مراحل تک پہنچا ہی نہیں

بھوک اور غیرت کا ٹکراؤ تھا، لیکن
بھیک کا ٹکڑا سائل تک پہنچا ہی نہیں

میں بھی قتیل جھپٹتا واعظ پر، لیکن
ہاتھ مرا اس جاہل تک پہنچا ہی نہیں

○

## مظفر وارثی

اک موڑ پر تمام زمانے لگے مجھے
چہرے جدید جسم پرانے لگے مجھے

تنہا میں چل رہا تھا تو خوش ہو رہے تھے لوگ
ان تک گئی جو آگ بجھانے لگے مجھے

آنکھوں میں جب تلک رہے کتنا غریب تھا
آنسو لٹا دیے تو خزانے لگے مجھے

تنہائی کو بھی پڑ گیا چسکا سنگسار کا
دیوار و در بھی آئینہ خانے لگے مجھے

آیا یہ کیسا خول چڑھا کر ستم ظریف
اندر کے داغ بھی نظر آنے لگے مجھے

سچائیوں کا زہر میں پینے چلا تو ہوں
یہ زہر پی کے نیند نہ آنے لگے مجھے

ٹپکا لہو تو ظلم کی تصویر بن گئی
ظالم اسے پلٹ کے دکھانے لگے مجھے

اونچا ہو میرا سر، یہ کوئی چاہتا نہ تھا
سولی پہ بھی چڑھا تو گرانے لگے مجھے

مانگے ہوئے حریر و جواہر کی سیج پر
سونے لگا تو پاؤں سرہانے لگے مجھے

مجھ سے ملے بغیر مظفر جو تھے خفا
میں ان سے مل لیا تو منانے لگے مجھے

○

○

## مظفر وارثی

صدائے حق کے لئے اپنی جان بھی دے گا
کوئی تو دار پہ چڑھ کر اذان بھی دے گا

خبر نہ تھی کہ بنائیں گے جس کو منصف ہم
مخالفت میں ہماری بیان بھی دے گا

سماعتیں ہی تو دیوار کا نصیب نہیں
کوئی تو حادثہ اس کو زبان بھی دے گا

پڑھا رہا ہے، اگر وہ نصاب شام و سحر
تو ہم کو حوصلہ امتحان بھی دے گا

پڑے گی صبر کی عادت، کریں گے شکر اگر
ہے جس کی دھوپ وہی سائبان بھی دے گا

بٹھاؤ تو سہی عزم سفر کو کشتی میں
ہوا کا زور کھلے بادبان بھی دے گا

یہ ملک اصل میں اللہ کی امانت ہے
امین بن گئے ہم تو امان بھی دے گا

دلوں میں بوئے گا جو شخص چاہتیں اپنی
سنا ہے اب وہ مظفر لگان بھی دے گا

○

○

## مظفر وارثی

سچ بولتے فنکار کو چپ کیسے کیا جائے
آواز کے حقدار کو چپ کیسے کیا جائے

چیخوں کو تو دفنا دیا دیوار کے نیچے
گرتی ہوئی دیوار کو چپ کیسے کیا جائے

پہنا تو گئے ہو مرے نغمات کو زنجیر
زنجیر کی جھنکار کو چپ کیسے کیا جائے

بکنے کے لئے آیا ہے ہر ایک خریدار
لٹتے ہوئے بازار کو چپ کیسے کیا جائے

آواز دبا کر مری، وہ سوچ رہا ہے
خاموشی کی للکار کو چپ کیسے کیا جائے

تکلیف سے جو چارہ گرو چیخ رہا ہو
اس چیختے بیمار کو چپ کیسے کیا جائے

جلتے ہوئے آنسو تو مظفر میں بجھا دوں
برسات کی بوچھار کو چپ کیسے کیا جائے

○

○

## مظفر وارثی

رات گئے کے شاہسوار نہ مانوں گا
چوروں کو میں شب بیدار نہ مانوں گا

اسی شکاری دنیا کا شاگرد ہوں میں
اتنی آسانی سے ہار نہ مانوں گا

ناچ ناچ کر مت بہلاؤ غریبوں کو
چیخ کو پائل کی جھنکار نہ مانوں گا

چاپ کو میں نے اندر آتے دیکھا ہے
سائے کو ہرگز دیوار نہ مانوں گا

جابر سلطانوں پر جو تنقید کرے
ایسے باغی کو غدار نہ مانوں گا

دشمن کے دکھ میں بھی شامل ہوتا ہوں
کسی اداسی کو تہوار نہ مانوں گا

پہلے نقش قدم دکھاؤ ہواؤں پر
ورنہ تمہیں سبک رفتار نہ مانوں گا

سب کا برابر حق ہے مظفرؔ دنیا پر
طاقت ور کو اجارہ دار نہ مانوں گا

○

○

## مظفر وارثی

زندہ رہنا ہے تو آواز محبت پر چلو
دیکھنا ہے پہلی شب کا چاند تو چھت پر چلو

فاصلے تنہائیوں کی سمت کرتے ہیں سفر
اس قدر بھی تو نہ راہ اجنبیت پر چلو

تم اگر چاہو تو ہنس دوں تم کہو تو رو پڑوں
میں تمہارے حکم پر تم میری سنت پر چلو

ساتھ لے لینا مری آنکھیں مرا احساس بھی
جب ہوائیں اوڑھ کر تم فرش نکہت پر چلو

آج کاٹا جائے گا فیتہ ہمارے درد کا
تم کو بھی دعوت ہے، تم بھی اس مہورت پر چلو

زندگی کو کیوں درندوں کے حوالے کر دیا
آدمی ہو تو صراط آدمیت پر چلو

اک نئے ماحول کی بنیاد رکھنے کے لئے
نکل آؤ اپنے تہ خانوں سے پربت پر چلو

عہد رفتہ سے بغاوت ظلم ہے فردا کے ساتھ
بات تو جب ہے نئے پن سے روایت پر چلو

اب لٹیروں کا تخلص ہے مظفرؔ رہ نما
راستے آتے ہیں تو اپنی ہدایت پر چلو

○

○

## مظفر وارثی

اگرچہ چہرے ہماری اڑان پر ہوں گے
اڑے بغیر بھی ہم آسمان پر ہوں گے

میں ٹھیک ٹھیک نشانے پہ ان کے خود پہنچا
مجھے خبر تھی شکاری مچان پر ہوں گے

ہر ایک زخم سے جب پٹیاں ہٹاؤں گا
بہت سے نام لہو کی زبان پر ہوں گے

تم اپنا حال بتاؤ نہ قیمتوں کی طرح
میں درد مند ہوں' تاجر دکان پر ہوں گے

کہاں سے لاؤں گواہی' کدھر سے تیر آیا
کسی کے ہاتھ تو آخر کمان پر ہوں گے

خبر نہ تھی کہ محبت بھی ایسا کانٹا ہے
چبھے گا روح میں' چھالے زبان پر ہوں گے

مظفر ان کی حقیقت سے خوب واقف ہوں
جو اعتراض مری داستان پر ہوں گے

○

○

## مظفر وارثی

کرتے ہیں دعا لوگ ستمگر کے لئے بھی
کچھ شعبدہ گر ہوتے ہیں منبر کے لئے بھی

بڑھتے ہوئے شعلوں کو بجھانے کی بجائے
وہ ڈھونڈھتا ہے آگ، سمندر کے لئے بھی

چل، شہر دکھا دوں تجھے، ویرانیٔ صحرا
تیری تو ضرورت ہے مجھے گھر کے لئے بھی

اتنی ہی محبت کا میں حق دار ہوں شاید
اس ہاتھ میں پتھر ہے مرے سر کے لئے بھی

ہر سانس پر اب ہڈیاں چبھتی ہیں بدن میں
مل جاتے ہیں کانٹے مجھے بستر کے لئے بھی

ہم منتظر وقت رہا کرتے ہیں پل، پل
اور وقت ٹھہرتا نہیں پل بھر کے لئے بھی

صرف اپنی تجوری کا شکم ہی نہیں بھرتا
وہ خون طلب کرتا ہے خنجر کے لئے بھی

دنیا کو اٹھائے ہوئے پھرتا ہے کمر پر
جینا نہیں آسان مظفر کے لئے بھی

○

○

## مظفر وارثیؔ

اب تو شاعر مجاہد ہے اور شاعری لفظ کی جنگ ہے
وقت میدان ذہن تلوار ہے زندگی جنگ ہے

جھوٹ ہر بات میں سنگ ہر ہاتھ میں آگ برسات میں
اس قدر فتنہ انگیز حالات میں امن بھی جنگ ہے

آج تک فیصلہ ہی نہیں ہو سکا کوئی اس جنگ کا
سینکڑوں مرتبہ جو لڑی جا چکی یہ وہی جنگ ہے

راستے جو قناعت کے ہیں بند ہیں سب ہوس مند ہیں
عقل بھی ہے جنوں' ہر طرف خوں ہی خوں' جنگ ہی جنگ ہے

چاہتوں میں بھی مکر و ریا کے سوا اور کیا رہ گیا
دشمنی تو ہے پھر دشمنی' دوست سے دوستی جنگ ہے

خیر و شر اور نیکی بدی بنی ہے نہ بن پائے گی
دیکھا جائے تو ہر تیرگی کے لئے روشنی جنگ ہے

بھوک کی عیش سے' امن کی ظلم سے' عدل کی جرم سے
آج سے تو مظفرؔ نہیں جب سے دنیا بنی جنگ ہے

○

○

## مظفر وارثی

وہ تیر بکف خفیہ ٹھکانے پہ کھڑا ہے
معلوم نہیں کون نشانے پہ کھڑا ہے

مہرے کی طرح چلنے لگے اہل انا بھی
اب ہر کوئی شطرنج کے خانے پہ کھڑا ہے

بارود کے انبار لئے بیٹھی ہے دنیا
انسان تباہی کے دہانے پہ کھڑا ہے

رہ سکتی ہے کیسے، کسی سر پر کوئی دستار
بالشتیا مینار کے شانے پہ کھڑا ہے

ہنگامہ گھروں میں ہے بپا اور سپاہی
ہتھیار سجائے ہوئے تھانے پہ کھڑا ہے

پہرے میں نگہبان کے ڈاکہ تو پڑے گا
وہ بھی اسی نیت سے خزانے پہ کھڑا ہے

کب جانے قدم اس کا لڑھک جائے، مظفر
ایمان بھی تسبیح کے دانے پہ کھڑا ہے

○

## مظفر وارثی

روح پر ہیں داغ چادر پر نہیں
میرے اندر دھوپ ہے سر پر نہیں

نیند کیسی اب دھواں آنکھوں میں ہے
آگ پر لیٹا ہوں بستر پر نہیں

حق تو اپنی تشنگی کا ہے مگر
آنسوؤں پر ہے سمندر پر نہیں

ملنے آتا ہے کوئی مجھ سے اگر
خود ہی کہہ دیتا ہوں، میں گھر پر نہیں

میں نے سانسوں کے قلم سے اس کا نام
پھول پر لکھا ہے پتھر پر نہیں

لوگ کیا مجھ کو توجہ سے سنیں
غار میں بیٹھا ہوں منبر پر نہیں

جسم میں مستی نہیں سوچوں میں ہے
آنکھ، آنکھوں پر ہے ساغر پر نہیں

قاتلوں سے ہو تعارف کس طرح
خون گردن پر ہے خنجر پر نہیں

یا مظفرؔ، ہم بہت بے سمت ہیں
یا زمانہ اپنے محور پر نہیں

○

## مظفر وارثی

ہر قانون نے آ کر دیکھے میرے تن کے گھاؤ
میرے خون میں تیر رہی ہے ہر منصف کی ناؤ

کون یہ سچائی' انصاف' محبت بیچنے آیا
خالی جیبوں والے آ کر پوچھ رہے ہیں بھاؤ

پیاسے مرنے والوں کے ہونٹوں تک کوئی نہ پہنچے
اپنے گھر کے آگے سب کر لیتے ہیں چھڑکاؤ

گورکنوں کے شہر میں رہنا کچھ آسان نہیں
جسم کفن سے ڈھانپو' رہنے کو قبریں کھدواؤ

بڑھتے اندھیروں پر جب تنقید کیا کرتا ہوں
رات کی چھت پر چڑھ کر تارے کرتے ہیں پتھراؤ

تہذیبوں کے سائے میں ظلم بھی کرتا رہا ترقی
یکساں رہا ہے دونوں سے ہر لمحے کا برتاؤ

جاتی ہوئی لہروں کے ساتھ مظفرؔ جاتا ہو گا
پار اتارے گی اب تم کو ڈوبنے والی ناؤ

○

○

## مظفروارثی

درد بھی ہم نے اکثر خریدا
اور سر عام لٹ کر خریدا

خون کی بوند تھی اس سے مہنگی
جتنی قیمت میں خنجر خریدا

میری بینائی نیلام کر کے
اس نے ہر ایک منظر خریدا

خود کشی آدمیت نے کر لی
جب جہالت نے منبر خریدا

حیرتیں بیچ کر زخم کھائے
آئینہ دے کے پتھر خریدا

زندگی بھر کی نیندوں کے بدلے
میں نے کانٹوں کا بستر خریدا

لاج رکھ لی مری، موت نے بھی
سولیوں نے مرا سر خریدا

جرأتیں جا چھپیں آنچلوں میں
بیچ کر تیغ، زیور خریدا

جیت سکتا تھا وہ جنگ کیسے
جس نے لشکر کا لشکر خریدا

خواہشوں پر نہ جانا مظفر
خواہشوں نے سکندر خریدا

○

○

شہزاد احمد

# کہاں تک ساتھ دے سکتی ہیں آنکھیں

کہاں تک ساتھ دے سکتی ہیں آنکھیں
یہ منظر کیسی تیزی سے بدلتے جا رہے ہیں
اگر ہم آنکھ جھپکیں
کتنے عالم بیت جاتے ہیں
اگر سو جائیں تو لگتا ہے
ہم نے ان گنت صدیاں گنوا دی ہیں
ہم نے وہ شمعیں بجھا دیں
روشنی جن کی کئی قرنوں سے آئی تھی

جہاں تک دیکھنے کی ہم میں طاقت ہے
وہاں سے بھی نئے افلاک کا آغاز ہوتا ہے
جہاں ہم ختم کرتے ہیں کہانی
اس جگہ بھی
اک نئے قصے' نئی روداد کا امکان ہوتا ہے

جہاں کچھ بھی نہیں ہوتا؟
وہاں تکوین کا سامان ہوتا ہے
کوئی ارمان ہوتا ہے
حقیقت جس کو بننے میں کوئی مشکل نہیں ہوتی

عجب اک سلسلہ ہے

سلسلہ در سلسلہ ہے

اور ہم چھوٹے سے سیارے میں بیٹھے ہیں

سمجھتے ہیں کہ ان پہنائیوں کا مدعا ہم ہیں

مگر ان وسعتوں کے سحر سے نا آشنا ہم ہیں

○

شہزاد احمد

## رہائی طلب کرنے والی ہوا

اے رہائی طلب کرنے والی ہوا

سچ بتا

تجھ کو آزاد ہونے کی خواہش کہاں سے ملی

تو نے دیکھا نہیں

آسمانوں کی بستی میں جتنے بھی اجرام ہیں

سب کے سب قید ہیں

سب کے ہاتھوں میں

محور کی ہے ہتھکڑی

اور زمین پر تو آزاد ہونے کی خواہش

فقط خواب ہے

اور یہ خواب بھی دیکھنے کی تمنا کسی کو نہیں

سب کے سب چاہتے ہیں

کہ وہ دوسروں کے اشاروں پہ حرکت کریں

کوئی سوچنا چاہتا ہی نہیں
سوچنا تو بجائے خود اتنا بڑا بوجھ ہے
جس کو سب چوم کر چھوڑ دیتے ہیں

اور چپ چاپ
ان راستوں پر سفر کرتے رہتے ہیں
جن پر ہزاروں برس سے
وہی ایک منظر نظر آ رہا ہے
جو نابود ہے

مگر دیکھتا کون ہے
یہاں ایک ذرہ بھی ایسا نہیں
جو نیا ہو!
نئے پن کی خواہش فقط وہم ہے
اور تو وہم کے بندی خانے میں ہے
اس کی دیوار' اس کی سلاخیں
ترے اپنے ہاتھوں کی تعمیر ہیں
تیری زنجیر ہیں
تیری تقدیر ہیں

اے رہائی طلب کرنے والی ہوا
سچ بتا!
اس مہیب رات میں
تجھ کو آزاد ہونے کی خواہش کہاں سے ملی؟

○

شہزاد احمد

# جسم سے باہر نکل آیا ہوں میں

ہر طرف پھیلی ہوئی ہیں چاندنی کی لرزشیں
اور ان کو دیکھ بھی سکتا ہوں میں
اس ہوا میں کیسے کیسے رنگ ہیں
یہ جان بھی سکتا ہوں میں
آئینے میں عکس کو دیکھے بغیر
آج اپنی شکل کو پہچان بھی سکتا ہوں میں

میرے سارے جسم میں بینائی ہے
اور آنکھیں وہ جہت بھی دیکھتی ہیں
جو ہمیشہ سے یہاں موجود تھی
لیکن کبھی میں نے اسے دیکھا نہ تھا

میں وہ آوازیں بھی سن سکتا ہوں
جن کی بازگشت
آنے والے ان زمانوں سے بھی آتی ہے مجھے
جن کی قسمت میں بدلنا ہی نہیں
اپنے چکر سے نکلنا ہی نہیں

دیکھتا ہوں اپنے مردہ جسم کو
اور میں حیران ہوتا ہوں

کہ اس سے کیا تعلق ہے مرا!
میں نے اس کی خواہشوں کو
کس طرح اپنا کہا؟
اب تو لگتا ہے کہ وہ شاید کبھی میرا نہ تھا
کب وہ مجھ سے آشنا تھا
کب میں اس سے آشنا
رات دن میں کیسے دھوکے میں رہا!
مدتوں اس کی وساطت سے میں پہچانا گیا
مدتوں میں خاک کا پیکر ہی گردانا گیا

لیکن اب میں کون ہوں؟
میرے جیسے لوگ جتنے
اپنے اپنے جسم سے باہر نکل آئے ہیں
آخر کون ہیں؟

میرے کانوں میں
عزیزوں کے بلکنے کی صدائیں آ رہی ہیں
اور میں ان کے قریں موجود ہوں
وہ سمجھتے ہیں
کہ اب، ہم میں ہے بے حد فاصلہ -
اور میں اب تک یہیں موجود ہوں
میں کہ ان کی ساری باتیں سن رہا ہوں
--------- اور نہیں موجود ہوں

○

شہزاد احمد

## اتنا بڑا جہاں ہے

اتنا بڑا جہاں ہے
جس کا اندازہ کرنا بھی ناممکن ہے
ہر سو لاکھوں اور کروڑوں عالم ہیں
ہر عالم میں اربوں کاہکشائیں ہیں
کاہکشاں میں سورج ہیں' سیارے ہیں
اور اس حد نظر تک پھیلی پہنائی ہیں
کتنے ہی دمدار ستارے ہیں
یہ دم دار ستارے
میلوں تک پھیلے انگارے ہیں
یہ انگارے اکثر برف میں ڈھل جاتے ہیں
اور کبھی سورج کی حدت سے
----- جل جاتے ہیں
اپنا روپ بدل جاتے ہیں

لیکن ہم
جو خود کو سب مخلوقوں سے برتر کہتے ہیں
اک چھوٹے سے سیارے سے
یوں چمٹے ہوئے ہیں
جیسے اس کے علاوہ کچھ موجود نہیں ہے

ہم نے صدیوں تک ان تاروں اور سیاروں کو
فلک کے خیمے کے رخنے ہی جانا تھا
ہم نے اس وسعت کو کب پہچانا تھا
جس کے بارے میں اب سوچ کے ڈر لگتا ہے

کیا ہم اتنے بڑے جہان میں تنہا ہیں
کیا کسی جانب کوئی اور نہیں ہے!
جس کو یہ معلوم ہو
ہم موجود ہیں
---- اس کا رستہ دیکھ رہے ہیں

کوئی صدا نہیں آتی
خود اپنی صدا بھی---- اس وسعت میں گم ہو جاتی ہے
کوئی تو بولے
کوئی تو بول کے اپنے ہونے کا احساس دلائے!
کوئی تو ہم سے پوچھے
ہم اس کرہ ء ارض پر
اتنی زیادہ گنتی میں کیوں ہیں؟

ہم جس شاخ پہ بیٹھے ہیں
اس کو کاٹ رہے ہیں
اس دھرتی پر کتنا بوجھ ہے
---- ہم انسانوں کا
یہ دھرتی کہیں ڈوب نہ جائے

اپنی تنہائی میں
اپنی شور بھری ویرانی میں

○

شہزاد احمد

## دستک بھی نہیں ہوگی

جتنے بھی دریا ہیں، الٹے بھاگ رہے ہیں
شاید وقت اپنے پیروں پر واپس لوٹ رہا ہے
دن اور رات تو اس طرح ہیں
لیکن ایک زمانے تک۔۔۔۔
پہلے دن آیا کرتا تھا
۔۔۔۔۔۔ اب رات آتی ہے

فصلیں پہلے اگ جاتی ہیں
اور مہینوں بعد کہیں بارش ہوتی ہے
پہلے کھانا پک جاتا ہے
بعد میں آگ جلائی جاتی ہے
ترک تعلق پہلے ہی ہو جاتا ہے
اور محبت برسوں بعد جنم لیتی ہے

شائد میں ایسی رفتار سے بھاگ رہا ہوں
جس کے سامنے
روشنی کی رفتار بھی کوئی چیز نہیں ہے
شاید میں وہ سارے رشتے توڑ چکا ہوں

جن رشتوں کے ہونے سے

یہ دنیا اس صورت میں موجود ہے

جو ہم دیکھ رہے ہیں

روشنی سے آگے جانا بھی

پیچھے کی جانب جانا ہے!

اور اگر میں اس رفتار سے چلتا رہا تو

وہ لمحہ بھی آ جائے گا

جس میں کچھ موجود نہ ہو گا

چاند، ستارے، سورج سب غائب ہو جائیں

اک تاریکی رہ جائے گی

لیکن میں۔۔۔۔

جو اپنے گھر کے اک گوشے میں بیٹھا ہوں

اور سوچ رہا ہوں

مستقبل میں کیا ہو گا؟

کیا ایسے ہی ۔۔۔۔

اپنے پاگل پن کی انگلی تھامے

اپنے گھر کے پاس چھوٹے سے لان میں

گھومتے گھومتے، میں تھک جاؤں گا

اور مرے دروازے پر

دستک بھی نہیں ہو گی

○

شہزاد احمد

## وہ کہتے ہیں

وہ کہتے ہیں
سماں بھی اک سمندر ہے
سمندر میں بہت سی مچھلیاں ہیں
مچھلیوں میں رنگ ہیں
اور رنگ بھی ایسے
جو پانی میں کبھی گھلتے نہیں ہیں

ہوا بھی اک سمندر ہے
ہوا میں بھی کئی لہریں سی اٹھتی ہیں
مگر ہم کو نظر آتی نہیں
پھر بھی کئی اڑتے پرندے
آسمانوں کی طرف جاتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں

پرندوں کی صدائیں
ہم کو اس عالم سے آتی ہیں
جسے ہم نے کبھی دیکھا نہیں ہے
پرندوں نے کہاں سے سیکھ لی ہیں اتنی آوازیں
کہاں سے ان پرندوں کو ملے ہیں بال و پر
کہاں سے پائی ہے اڑنے کی خواہش

اور ہم انسان
خود کو ان پرندوں سے کہیں افضل سمجھتے ہیں
سمندر کی یہ گہرائی
کہاں اس پیکرِ خاکی کو راس آئی

جہاں اندر جہاں
اس کی فضیلت کے فسانے ہیں
مگر لگتا ہے یہ قصے پرانے ہیں
وہ انساں جس کی عظمت کے ترانے گائے جاتے تھے
اسی دن مر گیا تھا
جس دن اس نے آئینہ دیکھا تھا
اور آئینے سے باہر
ہر اک شے پر حقارت کی نظر ڈالی تھی
اس دن اس نے اپنی ساری عظمت
...... روند ڈالی تھی

○

شہزاد احمد

## اے خدا پھر سے کن پکار کبھی

اے خدا پھر سے کن پکار کبھی
یہ جہاں ٹوٹنے ہی والا ہے
بنتی جاتی ہے یہ فضا ناسور
آسماں پھوٹنے ہی والا ہے

رک گئے قافلے ستاروں کے
اور سورج بھی خاک اڑانے لگا
جو تری اک صدا پہ ابھرا تھا
وہ زمانہ تو اب ٹھکانے لگا
کشتیاں اب سمندروں میں نہیں
بادباں لے گئے ہوا میں سب
رنگ چہروں کے اڑتے جاتے ہیں
مسکراتے ہیں کانپتے ہوئے لب
نیند کا سا غبار پھیلا ہے
دھند سے بھر گئے ہیں آئینے
کوئی صورت دکھائی دیتی نہیں
کیا ستم کر گئے ہیں آئینے
تیری تخلیق پاش پاش ہوئی
اور کوئی حشر بھی نہیں جاگا
جتنی آہستگی سے ٹوٹا ہے
اتنا کچا نہیں تھا یہ دھاگا
کرچیاں دور دور بکھری ہیں
کوئی شیشہ کہاں سلامت ہے
کچھ بھی اپنی جگہ نہیں ...
یہ بھی اپنی جگہ قیامت ہے
جس میں ڈوبے ہوئے تھے دونوں جہاں
ایک ایسا سراب دیکھا ہے
اب تو محسوس مجھ کو ہوتا ہے
میں نے ہونے کا خواب دیکھا ہے

○

○

جاوید شاہین

# بہت مصروف رہتا ہوں

بہت مصروف رہتا ہوں

دلوں کے سرد موسم پر

چمکتی دھوپ کا ٹکڑا بچھانے میں

محبت کے کسی ویران ساحل پر

پڑی ہے موج چھوٹی سی

اسے دریا بنانے میں

وہ اچھے دن

ابھی جو خواہشوں کی منزلوں میں ہیں

انھیں نزدیک لانے میں

گذر اوقات کرتا ہوں

میں اپنی جس خرابے میں

وہیں اک شہر کی تعمیر میں مصروف رہتا ہوں

سواد چشم میں

ٹھہرا ہوا ہے خواب جو کب سے

میں بس اس خواب کی تعبیر میں مصروف رہتا ہوں

○

جاوید شاہین

# خبر ملتی ہے جب مجھ کو

خبر ملتی ہے جب مجھ کو
کسی نیکی کے مرنے کی
کہیں انصاف بکنے کی
محبت کے اجڑنے کی
کسی سچ کو
سراسر جھوٹ میں تبدیل کرنے کی
کوئی سرسبز موسم
راہ ہی میں سوکھ جانے کی
سفیدی صبح کی لے کر اسے گلنار کرتا ہوں
پھر اس سے ان شہیدوں کے کفن تیار کرتا ہوں
بظاہر ظلم سے اک اک کا اظہار کرتا ہوں
مگر اندر سے
مردے بیچنے کا کار کرتا ہوں

○

جاوید شاہین

# کوئی آواز ہے

کوئی آواز ہے
روٹھی ہوئی جیسے نگر سے ہے
سفر میں ہے
کہ اکتائی ہوئی اپنے سفر سے ہے
پتا چلتا نہیں
آتی کدھر سے ہے
سواد شہر سے
یا شہر کا پرشور مرکز
اس کا مسکن ہے
کسی گنجان آبادی سے
یا اس کا ٹھکانہ
کوئی بن یا کوئی مدفن ہے
جو دل میں جھانکتا ہوں
تو اسے خاموش پاتا ہوں
ضمیر شہر بھی زر کے نشے سے
بے طرح مدہوش پاتا ہوں
بہت ہی غور کرنے سے گماں مجھ کو گذرتا ہے
کہ یہ آواز دن کی ہے
جو آہ سرد بھرتا ہے
اور اپنی روز کی لاحاصلی پر بین کرتا ہے

○

جاوید شاہین

## جہاں بھی ہو اداسی

جہاں بھی ہو اداسی
آ ہی جاتی ہے خبر مجھ تک
کسی تنہا مسافر کا
پہنچ جاتا ہے سب رنج سفر مجھ تک
جہاں جتنی بھی ہو تنہائی
اس کو دیکھ لیتا ہوں
چھپی ہو جس قدر زیبائی
اس کو دیکھ لیتا ہوں
میں سن لیتا ہوں
چھوٹی یا بڑی جیسی ہو خاموشی
سمجھ جاتا ہوں
موسم سے ہوا کی نرم سرگوشی
کسی ان دیکھی دنیا کے
دریچے باز کرتا ہوں
میں یہ سب جمع کر کے
نظم کا آغاز کرتا ہوں

○

جاوید شاہین

## بہت مدت گذرنے پر

سنہری بال اس کے
بن رہے تھے برف کی جھالر

وہ آنکھیں
ایک نیلی دھند جن میں تیرتی تھی
اس قدر خالی
کہ دو سوکھی ہوئی جھیلیں
وہ چہرہ
جس کی تابانی بہت برباد کرتی تھی
بنا تھا راکھ کی ڈھیری
بہت مدت گذرنے پر
اچانک دیکھ کر مجھ کو
ان آنکھوں میں
پرانی دھند جیسے پھر اتر آئی
وہ چہرہ
ایک اندر کی چمک سے جگمگا اٹھا
کسی تنہا نگر میں ہو
کسی لمبے سفر میں ہو
کہ قید عمر بھر میں ہو
محبت اپنے گھر کو یاد رکھتی ہے
وہ اک دن لوٹ آتی ہے

○

جاوید شاہین

## ڈھونڈتا رہتا ہوں

نامکمل دن بہت
بکھرے پڑے ہیں
میرے گھر کے آس پاس
شہر کے ہر کوچہ و بازار میں
روز مرہ زندگی میں

عشق کے بیوپار میں
جن کا چہرہ ہے نہ ہے کوئی سرے
ہیں اگر وہ تو
غلط کاموں پہ جیسے ہو لکیر
میں سحر ہونے کے ساتھ
ڈھونڈتا رہتا ہوں وہ لمحہ
کہ جس سے
اک مکمل دن بنانا ہے مجھے
اور وہ لمحہ نہ ملنے پر
یہ دن بھی
اس کے ہم صورت دنوں میں
پھینک آنا ہے مجھے

○

جاوید شاہین

## شہر میں بہار کا موسم

موسم سرما نے جاتے جاتے
اپنی آخری بارش سے
بھر دی ہیں
نشیبی بستیاں، ٹوٹی ہوئی سڑکیں
فضا کے ایک تازہ نیلے پن کو
کھا رہا ہے کارخانوں کا دھواں
صاف اور اجلی ہوا کا
گرد کی موٹی سی تہ سے گذرنا
کس قدر دشوار ہے
رت بدلنے کی خوشی میں

طائروں کے چہچہانے کی صدا
کھو گئی ہے گاڑیوں کے شور میں
اور پھولوں کی مہک
ہر طرف پھیلی غلاظت کی فراوانی میں گم
لوگ جس کے منتظر تھے وہ بہار
شہر کے بے برگ پیڑوں کے تلے
لیٹی ہوئی ہے بے لباس

○

جاوید شاہین

## جب ملی تھوڑی فراغت

وہ کہاں تھی
اور کیسی تھی
خبر کچھ مل ہی جاتی تھی مجھے
میرے ہونے کا
اسے بھی ملتا رہتا تھا سراغ
کچھ عجب حالات تھے
دونوں ہی بس
اپنی اپنی زندگی میں گم رہے
اپنے غم اپنی خوشی میں گم رہے
جب ملی تھوڑی فراغت
جا کے پوچھا اس کا حال
یہ فراغت ڈھونڈنے میں
لگ گئے چالیس سال

○

جاوید شاہین

# سفید اجلا خیال کوئی

سفید اجلا خیال کوئی
عجب پرندہ ہے
بیٹھا رہتا ہے میرے سر پر
پروں کو اپنے جو کھولتا ہے
تو پھیل جاتا ہے
ایک سایہ تمام گھر پر
ٹھٹھرتی راتیں ہوں سردیوں کی
کہ گرمیوں کے عذاب دن ہوں
بہار کی دلبری ذرا سی
کہ ہو خزاں کی بڑی اداسی
بڑی مزے سے
وہ بیٹھا رہتا ہے میرے سر پر
اڑے تو مجھ کو بھی ساتھ اپنے
اڑائے پھرتا ہے بحر و بر پر
پکڑنے کی میں کروں جو کوشش
ہمیشہ رہتا ہے ہاتھ بھر پر

○

جاوید شاہین

## زوالِ عمر ہے

زوالِ عمر ہے
بیٹھا ہوا ہوں
اک نئی تدبیر کرنے میں
کوئی منظر سہانا ہے
اسے تسخیر کرنے میں
کہیں اک شہر ہے
اس شہر کو تعمیر کرنے میں
مگر یہ سوچ کر
خود کو ذرا دلگیر کرنے میں
میرے لیے ہے دکھ بہت سہنا
میں کیوں اس کو بناتا ہوں
جہاں میں نے نہیں رہنا

○

○

## عباس تابش

پانی آنکھ میں بھر کر لایا جا سکتا ہے
اب بھی جلتا شہر بچایا جا سکتا ہے

ایک محبت اور وہ بھی ناکام محبت
لیکن اس سے کام چلایا جا سکتا ہے

دل پر پانی پینے آتی ہیں امیدیں
اس چشمے میں زہر ملایا جا سکتا ہے

مجھ گمنام سے پوچھتے ہیں فرہاد و مجنوں
عشق میں کتنا نام کمایا جا سکتا ہے

یہ مہتاب یہ رات کی پیشانی کا گھاؤ
ایسا زخم تو دل پر کھایا جا سکتا ہے

پھٹا پرانا خواب ہے میرا پھر بھی تابش
اس میں اپنا آپ چھپایا جا سکتا ہے

○

عباس تابش

آنکھ لگتے ہی مری نیند اڑانے لگ جائیں
خواب چڑیوں کی طرح شور مچانے لگ جائیں

ہم کہ گہرائی میں بہتے ہیں سمندر کی طرح
جانے کس وقت تری سطح پہ آنے لگ جائیں

یہ بھی ممکن ہے کوئی روکنے والا ہی نہ ہو
یہ بھی ممکن ہے یہاں مجھ کو زمانے لگ جائیں

دیکھ اے حسن فراواں یہ بہت ممکن ہے
میرا دل تنگ نہ لگے تیرے خزانے لگ جائیں

تو محبت کی غرض لمحہ موجود سے رکھ
تیرے ذمے نہ مرے درد پرانے لگ جائیں

عشق منہ بھی کسی اژدر کی طرح کھولتا ہے
اس کی صحبت میں کہیں ہم نہ ٹھکانے لگ جائیں

اسی امید پہ گذرے کئی موسم خالی
شاید اس بار شجر بور اٹھانے لگ جائیں

کار دنیا بھی عجب ہے کہ مرے گھر والے
دن نکلتے ہی مری خیر منانے لگ جائیں

○

عباس تابش

یہ جو نشہ سا طاری ہے طاری رہے رقص جاری رہے
میرے مولا یہ بے اختیاری رہے رقص جاری رہے

ہم نہیں چاہتے یہ درو بام بھی اپنے ہم رقص ہوں
یہ ہماری اذیت ہماری رہے رقص جاری رہے

ہم لہو میں نہائیں کہ جاں ہی سے جائیں تجھے اس سے کیا
شہرِ تہمت تری سنگباری رہے رقص جاری رہے

ہم نے تو جس جگہ تجھ کو رکھا وہیں آبلہ پڑ گیا
پائے وحشت تری وضعداری رہے رقص جاری رہے

ایک پاکوب سے کہہ رہا ہے پٹختا ہوا خاکداں
جتنی دیر اس جگہ تیری باری رہے رقص جاری رہے

رقص کر کے ہی اس کو منانا پڑا تو منائیں گے ہم
چاہے اس میں نہ عزت ہماری رہے رقص جاری رہے

○

○

عباس تابش

یہ ہم جو ہجر میں اس کا خیال باندھتے ہیں
ہوا کی شاخ سے بوئے وصال باندھتے ہیں

ہمارے بس میں کہاں زیست کو سخن کرنا
یہ قافیہ فقط اہلِ کمال باندھتے ہیں

یہ عہدِ جیب تراشاں کو اب ہوا معلوم
یہاں کے لوگ گرہ میں سوال باندھتے ہیں

وہ خوب جانتے ہیں ہم دعا نہادوں کو
ہمارے ہاتھ بوقتِ زوال باندھتے ہیں

سبھی کو شوقِ اسیری ہے اپنی اپنی جگہ
وہ ہم کو اور ہم اُن کا خیال باندھتے ہیں

تمہیں پتہ ہو کہ ہم ساحلوں کے پروردہ
محبتوں میں بھی مضبوط جال باندھتے ہیں

○

عباس تابش

غرق شہروں کی کہانی اور ہے
تیری میری رائیگانی اور ہے

جینے مرنے کے علاوہ بھی یہاں
ایک صورت درمیانی اور ہے

میرے گرنے کو زمانے چاہیئں
میری بنیادوں میں پانی اور ہے

گھر ٹپکتا دیکھ کر روتی ہے ماں
چھت تلے اک چھت پرانی اور ہے

اُس کی یادوں نے تن آساں کر دیا
اُس کی مجھ پر مہربانی اور ہے

کوئی آئے دل دھڑکتا ہی نہیں
یہ قیامت کی نشانی اور ہے

تم اسے اچھے دنوں میں دیکھنا
وقت کی اپنی روانی اور ہے

○

عباس تابش

زخم چھپانے کو ہم خلعت مانگتے ہیں
تم کہتے ہو اجرِ ہجرت مانگتے ہیں

کاٹھ کی روٹی باندھ کے خالی شکموں پر
لوگ محبت صرف محبت مانگتے ہیں

تو بھی عشق کی خاطر کوئی وقت نکال
ہم بھی اپنے ربّ سے مہلت مانگتے ہیں

اب تو شاید سر دے کر ہی بات بنے
جزیہ دینے والے بیعت مانگتے ہیں

میری دعا سے اور تری آمین سے کیا
اس بستی کے لوگ قیامت مانگتے ہیں

لے دے کر اک خاک نشینی باقی ہے
اس پر بھی یہ لوگ خلافت مانگتے ہیں

شام کو شکرانے کے نفل ادا کر کے
ساری رات خدا سے عزت مانگتے ہیں

تیرے دوارے پھرنے والے بے گھر لوگ
داتا تیری نگری میں چھت مانگتے ہیں

○

عباس تابش

کیسا رنگ و روشنی کا قہر ہے
دن ڈھلے بھی شہر میں دوپہر ہے

آدمی اب بھاگ کر جائے کہاں
شہر کے چاروں طرف بھی شہر ہے

مر گیا ہے چاند بھی چڑیوں کے ساتھ
جھیل کے پانی میں کتنا زہر ہے

ہجر بھی پلکیں جھپکنے لگ گیا
عشق کی دنیا میں پچھلا پہر ہے

بس یہیں تک ہے یہ دریا خون کا
اس سے آگے تتلیوں کا شہر ہے

○

عباس تابش

یار کے غم کو عجب نقش گری آتی ہے
پور پور آنکھ کے مانند بھری آتی ہے

بے تعلق نہ ہمیں جان کہ ہم جانتے ہیں
کتنا کچھ جان کے یہ بے خبری آتی ہے

اس قدر گوندھنا پڑتی ہے لہو سے مٹی
ہاتھ گھل جاتے ہیں تب کوزہ گری آتی ہے

کتنا رکھتے ہیں وہ اس شہر خموشاں کا خیال
روز اک ناؤ گلابوں سے بھری آتی ہے

زندگی کیسے بسر ہو گی کہ ہم کو تابش
صبر آتا ہے نہ آشفتہ سری آتی ہے

○

## عباس تابش

جب مجنوں سا چاہنے والا ہوتا ہے
پورے عہد کا ایک حوالہ ہوتا ہے

اپنے دکھ اپنی ہی آنکھیں روتی ہیں
ہر گھر کا اپنا پرنالا ہوتا ہے

رونے سے بھی رونق آتی ہے رخ پر
بارش سے بھی حسن دوبالا ہوتا ہے

کوئی کوئی عشق میں ہوتا ہے گمنام
کوئی کوئی عزت والا ہوتا ہے

روز ہی دل کو صاف کیا کرتا ہوں میں
روز ہی اس کونے میں جالا ہوتا ہے

کیسے دل پہ قابض ہو جاتا ہے وہ
جس کو دل سے خوب نکالا ہوتا ہے

جب میں اس کو رخصت کرنے جاتا ہوں
وہ منظر بھی دیکھنے والا ہوتا ہے

ان میں سے ہوں جن کا سارا مال متال
ایک پیالہ ایک دو شالہ ہوتا ہے

○

عباس تابش

پس غبار مدد مانگتے ہیں پانی سے
یہ لوگ تنگ ہیں مٹی کی حکمرانی سے

یہ ہاتھ سوکھ کے جھڑنے کو ہو گئے لیکن
میں دست کش نہ ہوا تیری مہربانی سے

پھر اس کے بعد پھلوں میں مٹھاس آئی نہیں
شجر نے کام لیا تھا غلط بیانی سے

کسی جزیرے پہ شاید کھلا ہے باغ کوئی
مہک گلاب کی آتی ہے بہتے پانی سے

میں تیرے وصل کا لمحہ بچا سکوں شاید
مرا تعلقِ خاطر ہے رائیگانی سے

نواحِ شہر میں پھیلی ہے موت کی خوشبو
مگر یہ لوگ کہ لگتے ہیں جاودانی سے

ترے وصال کے موسم میں اُستوار ہُوا
کوئی عجب سا تعلق جہانِ فانی سے

پہنچ چکے ہیں محبت میں اس جگہ ہم لوگ
جہاں یقیں نہیں آتا یقیں وہاں سے

تو مل گیا ہے تو اچھا ہوا وگرنہ دوست
کسے غرض تھی محبت میں کامرانی سے

یہ داغِ عشق کہ اب دل سے مٹ نہیں سکتا
کبھی یہ نقش بنایا تھا میں نے پانی سے

○

عباس تابش

زمیں پہ نصف النہار کا وقت ہو گیا ہے
کسی نئے انتظار کا وقت ہو گیا ہے

گذر رہی ہے زوال کی ساعتوں سے دنیا
دعاؤں پر انحصار کا وقت ہو گیا ہے

میں آپ اپنا دیا بجھانے پہ تُل گیا ہوں
یہاں سے میرے فرار کا وقت ہو گیا ہے

بگل کی آواز سن کے آنسو نکل پڑے ہیں
کہ پھر کسی شہر یار کا وقت ہو گیا ہے

اُدھر بھی ناؤ میں سو رہا ہے نڈھال سورج
اِدھر بھی دریا کے پار کا وقت ہو گیا ہے

ہماری پوروں سے خون رسنے لگا ہے تابش
مصیبتوں کے شمار کا وقت ہو گیا ہے

○

## عباس تابش

ٹوٹ جانے میں کھلونوں کی طرح ہوتا ہے
آدمی عشق میں بچوں کی طرح ہوتا ہے

اس لئے مجھ کو پسند آتا ہے صحرا کا سکوت
اس کا نشہ تری باتوں کی طرح ہوتا ہے

ہم جسے عشق میں دیتے ہیں خدا کا منصب
پہلے پہلے ہمیں لوگوں کی طرح ہوتا ہے

جس سے بنتا ہو تعلق وہی ظالم پہلے
غیر ہوتا ہے نہ اپنوں کی طرح ہوتا ہے

چاندنی رات میں سڑکوں پہ قدم مت رکھنا
شہر جاگے ہوئے ناگوں کی طرح ہوتا ہے

بس یہی دیکھنے کو جاگتے ہیں شہر کے لوگ
آسماں کب تری آنکھوں کی طرح ہوتا ہے

اس سے کہنا کہ وہ ساون میں نہ گھر سے نکلے
حافظ عشق کا سانپوں کی طرح ہوتا ہے

اس کی آنکھوں میں امڈ آتے ہیں آنسو تابش
وہ جدا چاہنے والوں کی طرح ہوتا ہے

○

عباس تابش

شعر لکھنے کا فائدہ کیا ہے
اس سے کہنے کو اب رہا کیا ہے

پہلے سے طے شدہ محبت میں
تو بتا تیرا مشورہ کیا ہے

سرخ کیوں ہو رہے ہیں تیرے کان
میں نے تجھ سے ابھی کہا کیا ہے

یہ بہت دیر میں ہوا معلوم
عشق کیا ہے مغالطہ کیا ہے

عشق کر کے بھی کھل نہیں پایا
تیرا میرا معاملہ کیا ہے

میرا ہم عمر صبح کا تارا
میرے بارے میں جانتا کیا ہے

اس لیے بولنے پہ ہوں مجبور
آپ سوچیں گے سوچتا کیا ہے

میں بنا تھا کھنکتی مٹی سے
میرے اندر سکوت سا کیا ہے

راہ میں کتنے موڑ آتے ہیں
تیرے گھر کا نیا پتہ کیا ہے

شور سا اٹھ رہا ہے چار طرف
کچھ گرا ہے مگر گرا کیا ہے

جسم کے اس طرف ہے گُل آباد
پھاند دیوار دیکھتا کیا ہے

میری خود سے مفاہمت نہ ہوئی
تو بتا تیرا مسئلہ کیا ہے

تجھ کو اپنا بنا کے سوچتا ہوں
اتنا کچھ کر کے بھی کیا کیا ہے

اس لیے خوش ہوں رائیگانی پر
جانتا ہوں مرا صلہ کیا ہے

سوچتے ہونٹ، بولتی آنکھیں
حیرتی کا مکالمہ کیا ہے

میں تو عادی ہوں خاک چھاننے کا
تم بتاؤ کہ ڈھونڈنا کیا ہے

میں جو مسمار شہر پر خوش ہوں
جانے اس سے مرا بنا کیا ہے

کون ہوں کس کی دھن میں رہتا ہوں
جانتا ہے تو پوچھتا کیا ہے

کیوں نہ میں تیرے جیسا ہو جاؤں
اس میں آخر مضائقہ کیا ہے

مجھ سے کوئی گلہ نہیں تجھ کو
پھر بھی مجھ سے تجھے گلہ کیا ہے

تجھ میں کیا ہے کہ مر مٹوں تجھ پر
ویسے مجھ میں بھی اب رہا کیا ہے

جی بھر آتا ہے ہنسنے والی جگہ
میرے اللہ مجھے ہوا کیا ہے

○

## عباس تابش

یہ اچانک جو سکوں سا آیا
جان نکلی ہے کہ مصرعہ آیا

قریہ چشم میں گونجا پانی
لوگ سمجھے کوئی دریا آیا

اے مجھے جیب میں بھرنے والے
میں ترے ہاتھ بھی کتنا آیا

میرے الفاظ گڑھے تھے میرے
مرے آگے میرا لکھا آیا

مجھ کو ورثے میں بھی گردش ہی ملی
مرے حصے میں پیالہ آیا

گھر کے ملبے پہ کھڑا سوچتا ہوں
مجھ کو کس بات پہ غصہ آیا

جب یہ سوچا کہ پکاروں اس کو
آئی آواز کہ آیا آیا!

پاشکستہ کا بھرم رکھنے کو
خواب میں روز مدینہ آیا

میں نے کوشش تو بہت کی تابش
پھر کبھی تت نہ اچھا آیا

○

عباس تابش

اے دوست دعا اور مسافت کو بہم رکھ
یہ میری ہتھیلی ہے یہاں پہلا قدم رکھ

ایسے تو زمانہ مجھے جینے نہیں دے گا
میں کچھ بھی نہیں تیرا مگر میرا بھرم رکھ

اس بات پہ دنیا سے مری بنتی نہیں ہے
کہتی ہے کہ تلوار اٹھا اور قلم رکھ

درکار ہے اس لیے مجھے عشرت دنیا
کچھ دن کے لئے رہن مرا خواب عدم رکھ

منہ لا کے مرے کان کے نزدیک سدھارت
آہستہ سے کہتا ہے بچا کر کوئی غم رکھ

جل جاتے ہیں الفاظ بر سطحِ زمانہ
یہ صفحۂ آتش ہے یہاں دیدۂ نم رکھ

میں جب بھی کہیں راہ میں گرنے لگا تابش
آواز سی آئی مرے قدموں پہ قدم رکھ

○

## عباس تابش

دریا کی روانی ہے روانی کے علاوہ
یہ بھید نہ سمجھا کوئی پانی کے علاوہ

دیکھو تو سہی کون لہو تھوک رہا ہے
ہو تو نہیں سکتا کوئی مانی کے علاوہ

کیا کچھ نہ میسر تھا مگر جان کے ہم نے
پایا نہیں کچھ اس کی نشانی کے علاوہ

آئی جو کسی روز تو پوچھوں گا صبا سے
کیا کرتی ہے پیغام رسانی کے علاوہ

ممکن ہے کہ اُس دل میں پہنچ پائے گا تابش
رستہ ہو کوئی نقل مکانی کے علاوہ

افسوس تو اس کا ہے کہ اس شہر کی چپ کو
کچھ بھی نہ ملا چرب زبانی کے علاوہ

میں تم سے کسی اور زمانے میں ملا ہوں
خوابوں سے اِدھر عالمِ فانی کے علاوہ

○

عباس تابش

لہو لہو ہیں مگر یہاں ہم یہ جاننے کو رکے ہوئے ہیں
یہ بانس کی کونپلیں ہیں یا اس زمیں کے ناخن بڑھے ہوئے ہیں

نہ جانے کس نے انڈیل دی شہرِ غم پہ مہتاب کی صراحی
شراب گلیوں میں بہہ رہی ہے پیالے اوندھے پڑے ہوئے ہیں

وہ رات خوباں کی یاد آئی کہ میرے حجرے میں آگ آئی
میں صبح کیا دیکھتا ہوں میرے بدن پہ چھالے پڑے ہوئے ہیں

ابھی تو خود تم نئے نئے ہو ہمیں سکھاؤ گے عشق کرنا
یہ کام ہم نے کیا ہُوا ہے یہ پانی ہم نے بھرے ہوئے ہیں

کسی نے دیکھا کسی نے پوچھا کسی نے روکا کسی نے ٹوکا
ہمیں محبت سے پیشتر بھی بڑے بڑے تجربے ہوئے ہیں

نہ اس میں آسیب آرزو ہے نہ اس میں بچوں کی ہاؤ ہو ہے
نہ جانے کیوں اس مکاں دل سے محلے والے ڈرے ہوئے ہیں

○

عباس تابش

میرا رنج مستقل بھی جیسے کم سا ہو گیا
میں کسی کو یاد کر کے تازہ دم سا ہو گیا

ایک لمحے نے مری ساری ریاضت چھین لی
وقت آنے پر سر تسلیم خم سا ہو گیا

ہم سمجھتے تھے اسے تاریخ چھوڑے گی نہیں
وہ تو ہم پر ظلم کر کے محترم سا ہو گیا

ہم مسلسل رو رہے ہیں اور کوئی عزت نہیں
کوئی دم رو کر کوئی ابر کرم سا ہو گیا

میں انشی کر رہا ہوں مصرعہ مصرعہ زندگی
ایک اک لمحہ مجھے کاغذ قلم سا ہو گیا

○

○

عباس تابش

یہ ہم کہ رات سے نجمِ سحر نکالتے ہیں
کلام کرتے ہیں یا بال و پر نکالتے ہیں

عجب بہار اثر ہے طبیعتِ عشاق
کہ پھول کھلنے کے موسم میں سر نکالتے ہیں

یہ چشمِ نم بھی ہمیں دوسرا کنارہ ہے
کہیں کا ڈوبا ہوا دل ادھر نکالتے ہیں

ہم اپنے طور سے کرتے ہیں کارِ تشنہ لبی
زمیں سے چشمہ نہیں چشمِ تر نکالتے ہیں

گلاب توڑتے ہیں ہم بہار سے پہلے
کسی کا غصہ ہے لیکن کدھر نکالتے ہیں

رگیں سی ٹوٹتی ہیں جسم میں بہ دمِ اظہار
اک ایک بات بہت کھینچ کر نکالتے ہیں

○

وہ جو ہم سے بچھڑ گئے

○

رضا ہمدانی---ادبیات سرحد کا
ایک تاریخی سفر　　　ڈاکٹر رضا مہمندی

ظہیر کاشمیری،
ایک پاکستانی کامریڈ　　　عطاء الحق قاسمی

محشر بدایونی　　　عطاء الحق قاسمی

دلدار پرویز بھٹی　　　عطاء الحق قاسمی
احمد داؤد　　　ڈاکٹر انعام الحق جاوید

○

# رضا ہمدانی۔۔۔ ادبیات سرحد کا ایک تاریخی سفر!

ڈاکٹر رضا مہمندی

پشتو ادب کو پاکستان کے دوسرے علاقوں سے متعارف کرانے کا سہرا ایک ایسے عظیم انسان کے سر ہے جو خود پشتون نہ تھا لیکن پشتونوں کے علاقے پشاور سے تعلق رکھتا تھا۔ اس کی اپنی زبان ہندکو تھی لیکن اردو میں شعرو شاعری کیا کرتا تھا اور چونکہ پاکستان کی قومی زبان اردو ہے' اس لئے اس نے مناسب سمجھا کہ اگر رحمان بابا اور خوشحال خان خٹک کی اس زبان اور پشتو ادب کو پاکستان کے کونے کونے تک پہنچانا ہے' تو اس کے لئے مناسب ذریعہ اردو زبان ہی ہے جو ملک کے چاروں صوبوں میں بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ سرحد میں پشتو اکیڈمی قائم نہیں ہوئی تھی' اور پشتو ادب و ثقافت کے متعلق بہت کم لوگوں کو علم تھا' لیکن جب اس عظیم انسان نے اپنے جیسے ایک اور مخلص دوست کے ساتھ مل کر پشتو ادب کو برصغیر کے ہر خطے سے روشناس کرانے کا بیڑا اٹھایا تو وہ دو انسان ایک اکیڈمی بن گئے اور یوں تاریخ نے دیکھا اور مانا کہ سرحد کے یہ دو جیالے تن تنہا اور حکومت کے تعاون کے بغیر وہ کارنامے سرانجام کر گئے کہ انسانی عزم و ایثار کی تاریخ میں سنہرے حروف سے لکھنے کے قابل ہیں۔ سرحد کے یہ دو عظیم انسان اور پشتو ادب کے سفیر فارغ بخاری اور رضا ہمدانی ہیں' جن میں فارغ بخاری تو بقید حیات ہیں لیکن رضا ہمدانی اس دار فانی سے رخصت ہو چکے ہیں۔

رضا ہمدانی جس کا اپنا نام رضا حسین ہمدانی ہے ۱۹۱۰ء کو پشاور شہر کے محلّہ خدا داد میں پیدا ہوئے۔ ان کا آبائی ملک ایران تھا اور شہر ہمدان سے تعلق تھا' اس لئے تخلص کے ساتھ ہمدانی لکھا کرتے تھے۔ بچپن میں فارسی اردو اور دینی تعلیم میں حدیث و فقہ کا درس لیا۔ پھر پرائیویٹ طور پر میٹرک کا امتحان پاس کیا' اور جب سرحد کی مشہور ادبی شخصیات امیر حمزہ خان

شنواری' دوست محمد خان کامل اور صنوبر حسین مہمند جیسے تاریخی لوگوں کے ساتھ مختلف ادبی تنظیموں میں مل بیٹھنے اور دوستی حاصل کرنے کی سعادت نصیب ہوئی تو پشتو کا مطالعہ بھی جاری رکھا اور یوں پشتو فاضل کا امتحان بھی ان کی راہنمائی میں پاس کیا۔ رضا ہمدانی چونکہ پشاور شہر میں پیدا ہوئے تھے اس لئے اس کی مادری زبان ہندکو تھی لیکن اپنی شاعری اردو زبان میں کیا کرتے تھے اور اردو کے علاوہ کشمیری اور پنجابی زبان سے بھی واقفیت رکھتے تھے (کیونکہ بقول احمد ندیم قاسمی ہندکو ' پنجابی زبان کی ایک شاخ ہے۔) یہی وجہ ہے کہ وہ ان تمام زبانوں کے ادب کے متعلق لکھا کرتے تھے اور خوب لکھتے تھے۔ رضا ہمدانی اپنے دور کے ایک نامور شاعر' اعلیٰ پایہ کے ادیب' نقاد' صحافی' کالم نگار اور ادبی مورخ تھے۔ ان کی ادبی زندگی کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے اردو اور پشتو ادب کے درمیان یگانگت اور ہم آہنگی کا رشتہ استوار کیا۔ انہوں نے صوبہ سرحد کی تہذیب و ثقافت' زبان و ادب اور ادبی مشاہیر کو ملک کے دوسرے خطوں کے ادبی حلقوں سے متعارف کرانے میں ایک ادبی سفیر کا فریضہ انجام دیا اور اپنی تخلیقات اور تراجم کی بدولت پشتو ادب اور ثقافت کو تمام برصغیر سے روشناس کرایا۔ ۱۹۴۸ء میں رضا ہمدانی نے فارغ بخاری کے اشتراک سے پشاور سے ایک اردو ماہنامہ جاری کیا جس کا نام تھا "سنگ میل"۔ سنگ میل تھا تو اردو رسالہ لیکن اس کے اکثر مضامین پشتو تراجم ہوا کرتے تھے اور پشتون قوم کی ثقافت کا آئینہ لگتا تھا۔ یہ رسالہ دو سال تک شائع ہوتا رہا اور سرحد کے پشتو اور اردو زبانوں کے تمام چوٹی کے ادیب اور شاعر اس کے ساتھ نہایت خلوص اور محبت سے اپنا ادبی تعاون پیش کرتے رہے' یہی وجہ ہے کہ اس گلدستہ عقیدت کا سالنامہ "سرحد نمبر" کے نام سے جب شائع ہوا تو ادب و ثقافت' شخصیات اور مشہور مقامات کے مضامین کی وجہ سے سرحد نمبر نے ایک انمول دستاویز کی حیثیت حاصل کر لی۔

رضا ہمدانی ایک شاعر اور ادیب تھے لیکن ادب برائے ادب کے قائل نہ تھے کیونکہ اگر اس مفروضے کو تسلیم کر لیا جائے تو زندگی ایک بنجر کھیت سی لگ جاتی ہے۔ جس میں اس وقت تک سرسبزی اور شادابی کے آثار نہیں ملتے جب تک کہ اسے ادب برائے زندگی کے حقیقی معنوں میں تسلیم نہ کیا جائے۔ لہذا تعلیم حاصل کرنے کے بعد جب رضا ہمدانی نے زندگی کے اس حقیقی رخ کو اپنایا تو ادب کے ساتھ ساتھ ذریعہ معاش کے لئے قالینوں کے کاروبار سے لے کر بک کیپنگ تک کا پیشہ اختیار کیا۔ لیکن جب محکمہ صحت میں ڈسپنسر کا کورس کرنے کے بعد

علاقہ بھانہ ماڑی میں اپنا مطب کھولا اور پرائیویٹ پریکٹس شروع کی' تو ۱۹۵۰ء تک اس کا یہ مطب چلتا رہا۔ یہاں میں رضا ہمدانی کے ساتھ اپنے نام کے مماثلت کے حوالے سے چند دلچسپ واقعات کا تذکرہ کرنا ضروری سمجھتا ہوں جس نے کئی بار ہم دونوں کو پریشان کر رکھا۔ ایک دفعہ محکمہ اطلاعات سرحد کی طرف سے ثقافت پاکستان کے موضوع پر پشتو مضمون نویسی کے ایک انعامی مقابلے کا اعلان ہوا۔ میں بھی اس مقابلے میں شریک ہوا اور جب اس انعامی مقابلے کے نتیجے کا اعلان ریڈیو پاکستان پشاور سے نشر ہوا تو پتہ چلا کہ متعلقہ مقابلے کا پہلا انعام رضا ہمدانی صاحب نے جیت لیا ہے۔ مجھے یہ سن کر حیرت ہوئی کہ رضا ہمدانی جسے پشتو لکھنے پر اس وقت اتنا عبور نہیں تھا اس مقابلے میں کیسے پہلا انعام لے سکتا ہے جب کہ اس مقابلے میں پشتو کے چوٹی کے رائٹرز کی تعداد تین سے تجاوز کر چکی تھی۔ لہٰذا اپنا شک دور کرانے کی غرض سے جب میں اس کے مطب میں حاضر ہوا اور انہیں اس شاندار کامیابی پر مبارک باد پیش کی' تو وہ یہ سن کر حیران ہوئے اور مجھ سے کہنے لگے کہ نہ تو میں نے اس مقابلے میں حصہ لیا ہے اور نہ کبھی ایسی خواہش کی ہے--- شاید یہ خبر غلط ہو!--- بعد میں' جب میں نے متعلقہ ریڈیو سٹیشن سے اس اعلان کی وضاحت طلب کی' تو پتہ چلا کہ وہ غلطی سے میرے نام کی بجائے رضا ہمدانی کا نام نشر کر چکے تھے' جس کی وضاحت کے لئے وہی اعلان انہیں معذرت کے ساتھ دوبارہ نشر کرنا پڑا---- کئی بار ایسا ہوا کہ ہم دونوں کے ریڈیو اور ٹی وی کے پروگراموں کے چیک غلطی سے ایک دوسرے کے نام لکھے اور ارسال کئے گئے اور جب تحقیقات کی گئی تو پتہ چلا کہ یہ سب کچھ غلط فہمی میں ہوا تھا کیونکہ ہم دونوں کے ناموں میں ماتحت عملہ کچھ فرق نہ کر سکا اسی لئے غلطی پر غلطی کرتا رہا جس کا خمیازہ ہمیں بھگتنا پڑتا تھا۔

رضا ہمدانی نے اپنی عمر کا بیشتر حصہ ادب و ثقافت کی خدمت میں صرف کیا۔ اسلام آباد میں لوک ورثہ پاکستان کے شعبے میں بطور ریسرچ آفیسر کام کیا۔ پھر وہاں سے تبدیل ہو کر لوک ورثہ کے ریجنل ڈائریکٹر مقرر ہوئے اور اسی دوران پشتو فوک لور پر کئی کتابیں لکھیں۔ رضا ہمدانی نے نظم اور نثر میں بہت کچھ لکھا اور زندگی کے آخری لمحوں تک لکھتے رہے--- وہ ایک کثیر التصانیف مصنف تھے جن کی تصانیف کی تفصیل کچھ یوں ہے:

۱) ادبیات سرحد جس میں پشتو ادب' پشتو کلاسیکی اور پشتو شعراء کا تذکرہ موجود ہے۔

۲) جمال الدین افغانی (سوانح حیات)

۳) پشتو کی رومانی داستان (جیسے آدم درخانی۔ تورول نتی۔ جلات محبوبا وغیرہ) (پٹھانوں کے رومان)

۴) پشتو افسانے (پشتو کے منتخب افسانوں کا اردو ترجمہ)

۵) بچوں کی لوک کہانیاں (پشتو اور ہندکو اردو ترجمہ)

۶) رزمیہ داستانیں (پشتو کی رزمیہ داستانیں اردو ترجمے کے ساتھ)

۷) گلہائے جعفری (پشاور شہر کے مشہور شاعر سید ضیاء جعفری کا اردو/فارسی کلام اور سوانح حیات)

۸) "ہندکو چار بیتہ" اور اس کا اردو ترجمہ

۹) سائیں احمد علی پشاوری (ہندکو زبان کے ایک مشہور شاعر کا کلام اور سوانح حیات)

۱۰) پٹھانوں کے رسم و رواج

۱۱) ستوری (پشتو زبان میں دینی ادبی و ثقافتی مضامین کا مجموعہ)

۱۲) مرآۃ الاسلام (دینی مضامین کا انتخاب)

۱۳) منٹھے رنگ (ہندکو زبان کا شعری مجموعہ)

۱۴) پشتو ادب (پنجابی زبان میں پشتو ادب کا تعارف)

۱۵) کہانیاں ہی کہانیاں (بچوں کے لئے کہانیوں کی چھ جلد)

۱۶) بازنامہ (خوشحال خاں خٹک کے ذوق شاہین پر ایک نظر)

۱۷) رگِ مینا (اردو شعری مجموعہ)

۱۸) صلیب فکر (اردو شعری مجموعہ)

"فارغ رضا" ایک ادبی اشتراک کا نام ہے جو ایک اکیڈمی کی صورت میں پشتو زبان و ادب کو برصغیر کے دوسرے علاقوں سے متعارف کرانے کا فریضہ انجام دیتے رہے جس کی خوشبو ہندوستان کے اردو نواز ادبی حلقوں تک پہنچتی رہی اور وہ بھی اپنے عقیدت کے پھول سنگ میل پر نچھاور کرتے رہے۔ اس سلسلے میں فارغ بخاری اور رضا ہمدانی نے پشتو ادب کی جو تاریخ ساز خدمات انجام دیں ہیں ان شائع شدہ تراجم اور ادبی خدمات و تالیفات کی تفصیل یہ ہے

جن پر ان دونوں دوستوں کو صدارتی ایوارڈ ملے۔

۱) اٹک کے اس پار (یہ کتاب صوبہ سرحد کے ادب و ثقافت کے بارے میں ایک معلوماتی دستاویز ہے)

۲) پٹھانوں کے رومان (مشہور پشتو رومانی داستانوں کا اردو ترجمہ)

۳) خوشحال خاں خٹک (ان کے کلام و افکار کا منظوم اردو ترجمہ)

۴) رحمان بابا (پشتو کے عظیم صوفی شاعر کے منتخب کلام کا' اردو میں منظوم ترجمہ)

۵) پشتو پہ (پشتو شاعری کی مختلف اصناف پر سیر حاصل تبصرہ اور انتخاب)

۶) منتخب ادب (اردو کے جدید شعراء کی تخلیقات کا انتخاب)

۷) پشتو ڈرامہ

رضا ہمدانی ہمہ گیر اوصاف کے مالک تھے انہوں نے ادبیات سرحد لکھ کر پشتو شاعروں اور ادیبوں کے نام اور کام سے دنیا کو روشناس کرایا۔ اس کتاب میں پشتو شعراء کے حالات زندگی اور انتخاب کلام موجود ہے جو مختلف ادوار پر مشتمل ہے۔ پشاور ٹیلی ویژن سٹیشن کے قیام کے بعد جب یہاں سے ہندکو پروگرام ٹیلی کاسٹ ہونے لگے تو اس عرصہ میں رضا ہمدانی نے ہندکو ادب کے لئے بہت کام کیا' بہت کچھ لکھا' سنایا' سنوایا اور کبھی کبھی ان پروگراموں میں شرکت بھی کی۔ لیکن جتنی خدمت انہوں نے پشتو ادب کی کی ہے اتنی اپنی مادری زبان ہندکو کی بھی نہیں کی کیونکہ وہ ایک آزاد اور خوددار پشتون لگتے تھے اور شاید خدا نے اسے اسی زبان کی خدمت کے لئے پیدا کیا تھا' کیونکہ وہ اگر کسی اخبار میں کوئی کالم بھی لکھتے تھے تو اس کے عنوان سے پشتو ادب کی خوشبو آتی تھی' جیسے حجرہ۔ قہوہ خانہ--- ہرکلہ وغیرہ اور یہی صفت اس کی انفرادیت کی پہچان ہوتی تھی۔ رضا ہمدانی ایک ترقی پسند شاعر تھے انہوں نے جو کچھ لکھا اس میں ہمیشہ انسانی اقدار کی عظمت کو روشن رکھا۔ ان کی شاعری میں انسانی عظمت کا پیغام' اقدار کا تحفظ' آزاد فضا کا تصور' عدل' دیانت' امن اور محبت کے ارمانوں کے دیئے جلتے نظر آتے ہیں:

جل بجھا خاک ہوا خاک سے اکسیر ہوا
ایک جذبہ تھا جو ہر رنگ میں تعمیر ہوا

نئے سورج نئے مہتاب تراشیں گے رضا
ہم نے ظلمت کو مٹانے کی قسم کھائی ہے

شبنم سے گھر تک میرا پیغام یہی ہے
حائل جو ہے نفرت کی وہ دیوار گرا دو

موت اک خواب گراں اک سکوت ایک جمود
زندگی ایک خلش ایک تڑپ ایک سفر

انجام جو ہوا، سو ہوا، یہ کم ہے رضا
ہم مر کے اپنے عہد کو جینا سکھا گئے!

رضا ہمدانی کے اشعار میں تجربے کی صداقت ہے، درس ہے، روشنی ہے پیغام ہے اور روایتی شان کے باوجود اپنا مخصوص طرز و اسلوب موجود ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے دور کا ایک نمائندہ شاعر بن کر سرحد کے ہر فرد کے دل کی دھڑکن بن گئے۔ ان کی اردو شاعری کا پہلا مجموعہ "رگ مینا" کے نام سے ۱۹۵۴ء میں شائع ہوا جس میں خوشحال خاں خٹک اور ممند رحمان بابا کے منتخب شعروں کا منظوم ترجمہ بھی شامل ہے۔ ۱۹۸۵ء میں ان کا دوسرا شعری ترجمہ "صلیب فکر" کے نام سے شائع ہوا جس میں مسلسل بے چینی اور اضطراب کے گرداب نظر آتے ہیں لیکن کہیں کہیں بیداری کی ایک دھیمی سی لہر بھی چمکتی ہے۔

رضا ہمدانی نے ہندکو اور فارسی دونوں زبانوں میں بھی شاعری کی ہے جن میں قدیم شعری روایات کی روشنی میں اپنی فنکارانہ صلاحیتوں سے قدیم و جدید کا خوب امتزاج پیش کیا ہے اور اپنی شاعری کو نئے ذائقوں اور معنویت سے آشنا کیا ہے۔ سرحد کے علمی و ادبی ذوق کی نشوونما اور ترقی میں رضا ہمدانی نے بڑا اہم کردار ادا کیا ہے اور ان کی تخلیقی اور تحقیقی خدمات کو ہر ادبی حلقے میں عزت اور احترام ملا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ رضا ہمدانی کو زندگی ہی میں اردو اور

پشتو کا ادبی سفیر مانا گیا اور سرحد سے باہر دنیا میں انہیں پشتو ادب کی پہچان اور ترجمان کی حیثیت سے وہ عزت اور شہرت ملی جو زندگی میں بہت کم لوگوں کو ملتی ہے۔ سرحد کے اردو اور پشتو کا یہ ادبی سفیر اپنی فنی زندگی کا طویل سفر طے کرنے کے بعد ۱۰ جولائی ۱۹۹۴ء کو اس جہان فانی سے رخصت ہوا اور پشاور شہر کے جنوب میں اپنے آبائی قبرستان "باغ زہرا" میں ہزاروں اشکبار آنکھوں کے سامنے دفن ہوا اور یوں سرحد کے ادبی آسمان کا ایک روشن ستارا گر کر خاک میں پنہاں ہو گیا!
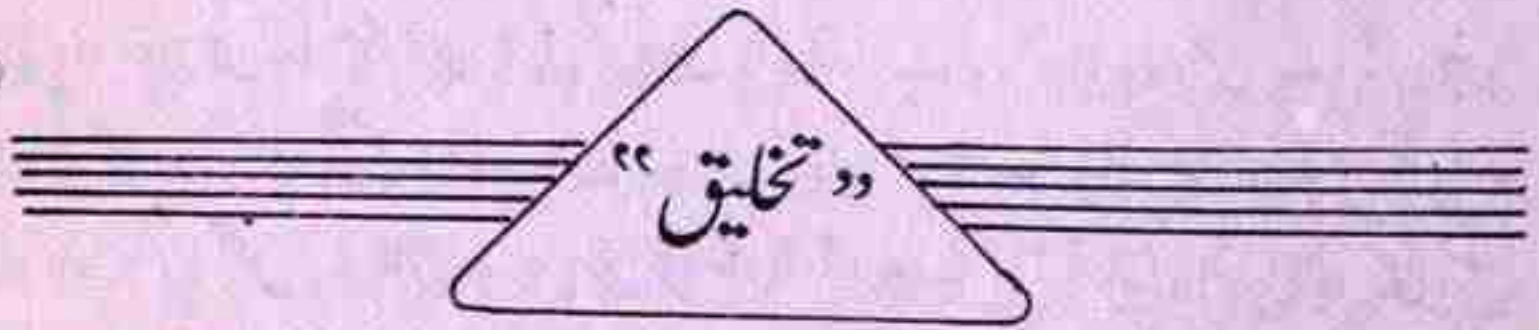
# ظہیر کاشمیری... ایک پاکستانی کامریڈ!

عطاء الحق قاسمی

سقوط مشرقی پاکستان کے سانحہ نے پاکستانیوں کے جگر چھلنی کر رکھے تھے کوئی آنکھ ایسی نہ تھی جو پرنم نہ ہو۔ لاہور کے ٹی ہاؤس میں ماسکو برانڈ دانشور جمع تھے۔ خوشی سے ان کے چہرے تمتا رہے تھے۔ ان کے زہریلے جملے اور تبصرے دلوں کو مزید زخمی کر رہے تھے۔ اتنے میں ایک سرخ و سفید شخص، سر پر ہیٹ پہنے، لڑکھڑاتا ہوا ٹی ہاؤس میں داخل ہوا۔ وہ کچھ دیر کونے میں کھڑا یہ خرافات سنتا رہا پھر اس نے انگلی سے اس مجمع کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پاٹ دار آواز میں کہا "لوگو! ان چہروں کو پہچان لو یہ تمہارے اور تمہارے وطن کے دشمن ہیں" اس پر مجمع میں کھلبلی مچ گئی۔ ایک خاتون نے اس نو وارد کو مخاطب کیا اور کہا "بہت ہو چکی اب بیٹھ جاؤ" اس شخص نے خاتون پر سرسری سی نگاہ ڈالتے ہوئے کہا "تمہاری باتوں میں کبھی نہیں آیا اب میں تمہارے کہنے سے کہاں بیٹھوں گا؟"

نام نہاد کامریڈوں کا منہ بند کرنے والا یہ شخص کامریڈوں کا کامریڈ ظہیر کاشمیری تھا جو تمام عمر سوشلزم کے نظریئے کے ساتھ وفادار رہا لیکن یہ وفاداری پاکستان کے ساتھ اس کی وفاداری میں رکاوٹ نہیں تھی۔ ایک دفعہ ریگل چوک میں کتابوں کی مشہور دکان "کلاسک" میں ظہیر کاشمیری جسے سب پیار سے بابا کہتے تھے، ایک کامریڈ سے الجھ پڑا میں نہیں جانتا کہ اس کامریڈ کا موقف کیا تھا لیکن جب میں وہاں پہنچا بابا کہہ رہا تھا "پاکستان ایک کمزور گھوڑے کی طرح ہے اسے دانہ کھلاؤ اس کی مالش کرو اسے طاقتور بناؤ اور جب یہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہو جائے اس وقت ہم اس امر پر جھگڑ لیں گے کہ اس پر سرخ کاٹھی ڈالنی ہے یا سبز؟ پولارائزیشن کا عمل اتنا تیز نہ کرو کہ کوئی کسی کی سچی بات سننے پر بھی آمادہ نہ ہو۔" وہی ظہیر کاشمیری گزشتہ پیر کے روز

ہم سے جدا ہو گئے ہیں میں نے ان کے چہرے کا آخری دیدار کیا اور اس پر وہ طمانیت دیکھی جو اپنے ضمیر کے مطابق زندگی بسر کرنے والوں کے چہروں پر ہوتی ہے۔"

ظہیر کاشمیری ایک بے پناہ عالم فاضل شخص تھے' ہمارے ہاں جن چند لوگوں کے لئے "دانشور" کا لفظ موزوں ہے ظہیر کاشمیری ان میں سرفہرست تھے۔ ان کے پاس بیٹھ کر انسان کچھ سیکھتا تھا' گنواتا نہیں تھا۔ وہ ایک عالمانہ شان کے ساتھ گفتگو کرتے تھے ان کی زیادہ تر گفتگو انگریزی میں ہوتی عام بول چال میں وہ انگریزی جملوں کا استعمال زیادہ کرتے لیکن اس کے پیچھے کوئی احساس کمتری نہیں تھا بلکہ ایک عادت تھی جو اوائل جوانی سے ان کے ساتھ چلی آ رہی تھی۔ ظہیر جس بات کو صحیح سمجھتے تھے اس کا اظہار خوف فساد خلق سے بے نیاز ہو کر کرتے تھے۔ اپنی اس عادت کی وجہ سے وہ کئی دفعہ شدید خطرات سے بھی دوچار ہوئے لیکن انہوں نے اپنی وضع نہیں بدلی۔ ایک وقت تھا کہ وہ مکمل طور پر دہریئے تھے بعد میں وہ اپنی ترقی پسندی سمیت مذہب کی طرف لوٹے اور انتہائی خوبصورت نعتیں لکھیں۔

ظہیر کاشمیری نظریاتی اختلاف کو ذاتی اختلاف میں نہیں بدلتے تھے چنانچہ ان کے دوستانہ روابط تمام مکاتب فکر کے لوگوں سے تھے' میرے خیال میں ایک سچے دانشور کا رویہ ہوتا ہی یہی ہے۔ وہ چھوٹے لوگ ہیں جو نظریاتی اختلاف کو ذاتی لڑائی بلکہ جنگ و جدل میں بدل دیتے ہیں۔ پاکستان میں تشدد اور قتل و غارت کی موجودہ لہر اسی رجحان کے پروان چڑھنے کا نتیجہ ہے۔ ظہیر کاشمیری اپنے نظریات پر قائم و دائم رہنے کے باوجود انسانی قدروں کو اپنی نظروں سے اوجھل نہیں ہونے دیتے تھے۔ چنانچہ جو ان سے اختلاف رکھتے تھے وہ بھی ان سے پیار کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جب ان کا جسد خاکی تدفین کے لئے میانی صاحب لے جایا جا رہا تھا اس نابغہ سے ہمیشہ کے لئے جدائی کے تصور سے بھی آنکھیں پرنم تھیں۔ لاہور آہستہ آہستہ ایسے زندہ و تابندہ لوگوں سے خالی ہوتا جا رہا ہے۔

ظہیر کاشمیری ترقی پسند تحریک کے ان چند شعراء میں سے تھے جو اپنی شاعری کے سفینے کو پراپیگنڈے کے بھنور سے زندہ و سلامت بچا لانے میں کامیاب ہو گئے ورنہ ان کے بہت سے ہم عصر اپنے ہی شور شرابے کی زد میں آ گئے۔ ظہیر کاشمیری نے جو شاعری کی اس میں ان کے نظریات ایک تناسب کے ساتھ پوری طرح حل ہو کر اس کے ذائقے میں اضافے کا باعث بنے ورنہ یار لوگوں نے شاعری کی ہنڈیا میں نظریات کا نمک مصالحہ اوپر اوپر چھڑک دیا اور تناسب

کا خیال بھی نہیں رکھا جس کے نتیجے میں خود تو شاید بدمزہ نہ ہوئے اپنے قارئین کو بدمزہ ضرو
کیا۔

ظہیر کے چند خوبصورت شعر،

لوح مزار دیکھ کے جی دنگ رہ گیا
ہر ایک سر کے ساتھ فقط سنگ رہ گیا

سیرت بغیر عارض و رخسار سب غلط
خوشبو اڑی تو پھول فقط رنگ رہ گیا

میں ہوں وحشت میں گم' میں تیری دنیا میں نہیں رہتا
بگولا رقص میں رہتا ہے' صحرا میں نہیں رہتا

ہمیں خبر ہے کہ ہم ہیں چراغ آخر شب
ہمارے بعد اندھیرا نہیں اجالا ہے

لیکن بابا! تمہارے جانے کے بعد کچھ دیر کے لئے تو ہم اندھیرے میں ضرور آ
گئے ہیں۔ اب ہمارے درمیان سچے کامریڈ تو کیا جھوٹے کامریڈ بھی نہیں رہے' سب امریکہ کے
یار ہو گئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمارے بابے کے درجات بلند کرے اور اسے اپنے جوار رحمت میں
جگہ دے!

# محشر بدایونی

عطاء الحق قاسمی

حضرت محشر بدایونی کے انتقال کی خبر مجھے جمعرات کے روز گوجرہ کے مشاعرے میں ملی اور پھر اس کل پاکستان مشاعرے میں سارے پاکستان سے آئے ہوئے شاعر محشر صاحب کا ذکر بہت محبت اور اداسی سے کرتے رہے۔ مشاعرے میں اس حوالے سے ایک قرارداد تعزیت بھی منظور کی گئی اور فاتحہ خوانی کا اہتمام بھی ہوا۔

محشر صاحب میرے ان بزرگوں میں سے تھے جن سے میل ملاقات کا موقع بہت کم ملتا تھا' بس کسی مشاعرے میں پل دو پل کی ملاقات ہو جاتی لیکن ان کی محبت بھری شخصیت کا اثر دیر تک دل پر رہتا اور یہ تاثر صرف میری ذات تک محدود نہ تھا بلکہ پورے پاکستان کے ادبی حلقے ان کے فن اور شخصیت کے مداح تھے اور یوں انہیں ہر طرف سے بے پایاں محبت ملتی تھی!

میرے نزدیک حضرت محشر بدایونی اس حوالے سے بہت "خوش قسمت" تھے کہ انہیں نئی نسل اور جدید حسیت کے حامل شعراء بھی عزت اور احترام کی نظروں سے دیکھتے تھے ورنہ جن ناموں کے ساتھ دہلوی' امرتسری' بدایونی اور جالندھری وغیرہ لکھا ہوتا ہے' انہیں عموماً پرانا سمجھ کر "ڈسکارڈ" کر دیا جاتا ہے جبکہ محشر صاحب "بدایونی" کہلانے کے باوجود تمام ادبی حلقوں میں بہت عمدہ شاعر تسلیم کئے جاتے تھے۔ اس کی وجہ جاننے کے لئے کسی لمبی چوڑی تحقیق کی ضرورت نہیں۔ یہ فن پہ ان کی مضبوط گرفت کے علاوہ شاعری کے جدید رویوں سے وابستگی تھی جس کی وجہ سے انہیں یہ مقام حاصل ہوا تھا۔ اس کے علاوہ ذاتی سطح پر بھی لوگ ان سے بہت محبت کرتے تھے' شاید اس لئے کہ محبت کا جواب محبت ہی سے ملتا ہے۔ محشر صاحب کے دل میں کسی کے لئے کدورت نہ تھی' میں نے انہیں کبھی کسی کے خلاف زہر افشانی کرتے نہیں

دیکھا بلکہ وہ جس کسی کا ذکر کرتے، ہمیشہ اس کے بارے میں کلمہ خیر کہتے اور یا پھر خاموشی اختیار کر لیتے!

محشر صاحب ان باتوں کے علاوہ ایک اور لحاظ سے بھی خوش قسمت ہیں۔ ہمارے ہاں جہاں سیاست اور زندگی کے دوسرے شعبوں میں باہمی مکالمہ غائب ہو چکا ہے اسی طرح ادب میں بھی یہ افسوس ناک صورت حال پیدا ہو چکی ہے۔ یہ مثبت کام ادبی پرچوں کے ذریعے ہو سکتا تھا لیکن اخبارات کے ایڈیشنوں کی طرح ادبی پرچے بھی "مقامی" ہو کر رہ گئے ہیں۔ چنانچہ ان میں عموماً انہی ادیبوں کی تحریریں شائع ہوتی ہیں جو اس خطے سے تعلق رکھتے ہیں جہاں سے وہ ادبی پرچہ نکلتا ہے۔ اس سے ایک تو باہمی مکالمے کی صورت پیدا نہیں ہوتی اور دوسرے مختلف صوبوں کے لوگ ایک دوسرے سے پوری طرح متعارف نہیں ہو پاتے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ جو ادیب اپنے علاقے میں خاصا مستند سمجھا جاتا ہے، اپنے علاقے سے باہر اسے پوری طرح جاننے والے لوگ بہت کم ہوتے ہیں تاہم محشر بدایونی کراچی کے ان بزرگوں میں سے تھے جنہیں مرحوم سلیم احمد کے بعد ملک گیر حیثیت اور پہچان حاصل تھی۔ میرے نزدیک وہ کراچی اور لاہور کے درمیان پل کا کام دیتے تھے، افسوس ہم اس خوبصورت وسیلے سے بھی محروم ہو گئے ہیں، اللہ تعالیٰ ان شخصیتوں کا سایہ ہمارے سروں پر ہمیشہ قائم رکھے جو اس وقت وہی خدمت انجام دے رہے ہیں جو سلیم احمد سے محشر بدایونی تک انجام دیتے رہے ہیں!

محشر بدایونی سے میری آخری ملاقات اسلام آباد میں حالیہ اہل قلم کانفرنس کے موقع پر ہوئی، میں نے ان کے قدموں میں موت کی لڑکھڑاہٹ دیکھی لیکن ان کی محبت میں کوئی کمی محسوس نہ ہوئی۔ وہ مجھے دیکھ کر ہر دفعہ اپنی جگہ سے اٹھتے اور "اوہ بھئی عطاء الحق! بہت خوشی ہوئی آپ کو دیکھ کر" کہتے ہوئے بغل گیر ہو جاتے، جب کانفرنس کے دوران مختلف مواقع پر وہ مجھے اسی گرم جوشی کے ساتھ بارھویں یا تیرھویں دفعہ ملے تو انہیں احساس ہوا کہ وہ مجھے پہلی دفعہ نہیں مل رہے۔ اس وقت میں یہی سمجھا تھا کہ وہ بوجہ نسیان مجھے بار بار گرم جوشی سے مل رہے ہیں لیکن اب محسوس ہوتا ہے کہ وہ اپنے پیاروں سے آخری ملاقات کر رہے تھے۔ اگر مجھے علم ہوتا کہ اپنے عہد کے اتنے خوبصورت بزرگ سے میری آخری ملاقات ہے تو میں بھی نسیان کا بہانہ بنا کر بار بار انہیں گلے لگاتا تاکہ ان کے اندر کی خوبصورتی کچھ تو میرے سینے میں بھی منتقل ہوتی لیکن کون جانتا ہے کہ کس نے کس چوراہے سے جدا ہو جانا ہے۔ محشر بدایونی ہم

سے اس وقت جدا ہوئے ہیں جب ہمیں پہلے سے کہیں زیادہ ان کی ضرورت تھی۔

جدا کب سے ہوں اب دیکھ آؤں گھر کو
کہیں گے کیا در و دیوار میرے
وہیں سورج کی نظریں تھیں زیادہ
جہاں تھے پیڑ سایہ دار میرے

○

# سب کا دلدار!

عطاء الحق قاسمی

جس دوست کے ساتھ زندگی کے پچیس سال گزارے ہوں اور دوست بھی ایسا ہو جو آپ کے سارے غم اپنے "کھاتے" میں لکھ لیتا ہو' اسے اپنے ہاتھوں سے قبر میں اتارنا کوئی آسان کام نہیں لیکن دلدار پرویز بھٹی کو دوستوں نے اپنے ہاتھوں سے لحد میں اتارا اور بہت دیر تک ان ہاتھوں کو چومتے رہے جو اس "دلدار" کے جسم سے مس ہوئے تھے جو سر سے پاؤں تک دوستی' غمگساری اور دردمندی کی خوشبو میں بسا ہوا تھا۔

لوگ دلدار کو ٹی وی پر دیکھتے تھے' محفلوں میں اس کی کمپیئرنگ دیکھتے تھے یا سڑک پر سے گزرتے ہوئے دیکھتے تھے تو اس کے لب کھلنے سے پہلے ان کے چہروں پر مسکراہٹ پھیل جاتی تھی۔ وہ قہقہوں کی علامت تھا لیکن اس کی مثال اس شخص کی سی تھی جو ایک ماہر نفسیات کے پاس گیا اور اسے بتایا کہ وہ بہت ڈپریشن کا شکار ہے' ماہر نفسیات نے اسے مشورہ دیا کہ وہ فلاں کامیڈین کا شو دیکھے' اس کی ساری افسردگی' ساری ڈپریشن ختم ہو جائے گی۔ اس شخص نے افسردہ سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا "جناب وہ کامیڈین میں ہی ہوں"۔
لوگوں میں ڈھیروں مسکراہٹیں بانٹنے والا دلدار پرویز بھٹی بھی اندر سے ایک بہت اداس شخص تھا کچھ اداسیاں تو اس کی ذاتی تھیں لیکن باقی غم اس نے خود پالے ہوئے تھے۔ مظلوموں کے غم اسے اپنے غم محسوس ہوتے تھے' یتیموں اور بیواؤں کی آہیں اس کے سینے میں شگاف ڈال دیتی تھیں چنانچہ وہ صبح سے شام تک لوگوں کے دکھ کم کرنے کے لئے دفتروں' کچہریوں اور تھانوں

کے چکر کاٹتا رہا۔ عمران خان کے ساتھ امریکہ بھی وہ اسی مشن پر گیا تھا' صرف یہی نہیں بلکہ وہ جو کچھ کماتا' اپنی ضرورت کے مطابق رکھ کر باقی رقم مستحق طالب علموں' معذور افراد اور غرباء و مساکین میں بانٹ دیتا۔ اس کے باوجود اگر کچھ سیونگ ہو جاتی تو دوستی کے روپ میں کوئی فراڈیا اس سے وہ رقم ٹھگ کر لے جاتا۔ دلدار جو دیکھنے میں بہت تیز و طرار نظر آتا تھا' درحقیقت ایک نہایت بھولا اور معصوم سا شخص تھا۔

دلدار بہت کھلنڈرا اور لاپرواہ بھی لگتا تھا لیکن یہاں بھی معاملہ اس کے برعکس تھا۔ وہ انتہائی حساس انسان تھا۔ ایک دفعہ وہ کسی اسٹیج ڈرامے میں کام کر رہا تھا۔ اس نے مجھے وہ ڈرامہ دیکھنے کی دعوت دی' میں اپنی بیگم کے ساتھ ڈرامہ دیکھنے چلا گیا' ڈرامہ شروع ہوا تو میں نے محسوس کیا کہ یہ بہت دلگیر ہے۔ چنانچہ ہم انٹرول کے وقت اٹھ کر آ گئے۔ اگلے روز دلدار صبح سویرے میرے گھر آیا اور کہا "میں جانتا ہوں تم کیوں درمیان میں اٹھ کر آ گئے تھے۔ میں ساری رات اس خیال سے سو نہیں سکا کہ میری بھابی کیا سوچ رہی ہوں گی۔ میں نے فیصلہ کیا ہے کہ میں آئندہ کسی اسٹیج ڈرامے میں کام نہیں کروں گا۔ میری بہن کو یہ بات بتا دو" اور اس کے بعد اس نے کبھی کسی اسٹیج ڈرامے میں کام نہیں کیا۔ دوسرا واقعہ قدرے مختلف نوعیت کا ہے۔ دلدار کے ساتھ جملے بازی کا تبادلہ ہوتا رہتا تھا۔ ایک دن اس نے اس خواہش کا اظہار کیا کہ وہ "نیشن" میں کالم لکھنا چاہتا ہے اور اس کے لئے اس نے مجھ سے مجید نظامی صاحب سے بات کرنے کو کہا۔ میں نے جواب دیا "میں مجید صاحب سے بات تو کر لوں گا لیکن یار مسئلہ یہ ہے کہ "نیشن" انگریزی کا اخبار ہے' چنانچہ تمہیں کالم انگریزی میں لکھنا پڑے گا!" میرا خیال تھا کہ دلدار اس جملے کو بہت انجائے کرے گا لیکن وہ سنجیدہ ہو گیا اور اتنا سنجیدہ ہوا کہ اس نے انگریزی میں شاعری کرنا شروع کر دی اور مجھے علی الصبح ٹیلی فون پر یہ شاعری سنانے کا سلسلہ بھی شروع کر دیا!

دلدار ایک عالی ظرف انسان تھا' دوستوں پہ بڑے بڑے احسان کرنے والا یہ شخص دوستوں کی ذرا سی اچھی بات کو بھی نہ صرف یہ کہ یاد رکھتا بلکہ جگہ جگہ اس کا اعلان کرتا۔ جب اس نے نوائے وقت میں کالم نگاری کا آغاز کیا تو ابتدا میں کچھ کالم مجھے دکھائے اور مجھ سے مشورہ طلب کیا۔ اس کی کالم نگاری کا آغاز ہی اتنا اچھا تھا کہ میرے مشورے کوئی معنی

نہیں رکھتے تھے۔ ایک وقت آیا کہ وہ مستند کالم نویس بن گیا لیکن جس ادبی محفل کا وہ کمپیئر ہوتا' وہ اسٹیج پر سے میرا نام پکارتے وقت "استاد محترم" کے الفاظ پوری سنجیدگی سے ادا کرتا لیکن اس پر میری ہنسی چھوٹ جاتی کہ اس کے منہ سے یہ لفظ مجھے بہت عجیب سے لگتے تھے۔ میں نے اسے کہا بھی کہ یار یوں ہر محفل میں میرا ریکارڈ نہ لگایا کرو لیکن وہ باز نہ آتا' کہتا اس میں کوئی جھوٹ نہیں ہے!

دلدار انگریزی ادب کا پروفیسر تھا' کالم نویس تھا' لٹریچر کا بہت اچھا طالب علم تھا' بطور کمپیئر بین الاقوامی شہرت کا مالک تھا لیکن تکبر نام کی کوئی چیز اسے چھو کر بھی نہیں گزری تھی' وہ اپنے سے کم تر لوگوں کو برابری کی سطح پر ملتا' ان کے دکھ درد میں شریک ہوتا' بازار میں کسی ریڑھی کے پاس کھڑے ہو کر حلیم کھاتا' بھرے بازار میں فٹ پاتھ پر بیٹھ کر لوگوں سے گپ شپ کرنے لگتا۔ البتہ بڑے لوگوں کے ساتھ اس کا رویہ قدرے مختلف ہوتا' وہ انہیں ہنساتے ہنساتے کوئی ایسی تلخ بات کہہ جاتا جو ان کے لئے نگلنا مشکل ہو جاتی۔ شاید یہی وجہ ہے کہ دلدار جن بے پناہ صلاحیتوں کا مالک تھا' ان کے مطابق اس سے کام نہیں لیا گیا۔ ٹیلی ویژن پر اسے ہمیشہ پیچھے دھکیلنے کی کوشش کی گئی اور اسے زیادہ تر پنجابی تک محدود رکھا گیا' اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ وہ ٹی وی کے کبا گروپ (کبڑا گروپ) سے تعلق نہیں رکھتا تھا اور دوسری وہی جو میں نے اوپر بیان کی ہے!

میرا دوست صرف بذلہ سنجی اور حاضر جوابی ہی میں یکتائے روزگار نہیں تھا بلکہ مشہور لوگوں کی آوازوں کی نقل اتارنے میں بھی اس کا کوئی ثانی نہیں تھا۔ مرحوم ذوالفقار علی بھٹو' مرحوم ضیاء الحق' محترمہ بے نظیر بھٹو' محترم شہباز شریف اور دوسری ممتاز شخصیتوں کی گفتگو اور تقریروں کی ایسی نقل اتارتا تھا کہ اگر اسے پردے پیچھے بٹھا دیا جاتا تو لوگ یہی سمجھتے کہ شاید ان کی ٹیپ چل رہی ہے۔ ٹی وی کے ایک پروگرام میں ٹیلی ویژن کے تخلیقی پروڈیوسر یاور حیات سکرین پر آئے تو ان سے گفتگو مشکل ہو گئی کیونکہ نہ صرف یہ کہ لوگ ہنسنا شروع ہو گئے تھے بلکہ خود یاور حیات کے لئے اپنی ہنسی پر قابو پانا ممکن نہیں رہا تھا!

گزشتہ ادوار میں منعقد ہونے والے ایک انتخاب کے حوالے سے دھاندلی کا الزام لگا تو دلدار نے بہت مزے کی بات کی۔ اس نے کہا "ٹی وی انتظامیہ نے انتخابات کے

نتائج کا اعلان کرنے کے لئے جو پینل بنایا تھا' اس میں اگر مجھے بھی شریک کر لیتے تو انتخابات کے خلاف اتنی بڑی تحریک کی ضرورت نہ پڑتی۔ حکومت بہت آسانی سے اس مشکل سچوایشن سے نکل جاتی" میں نے پوچھا "وہ کیسے؟" بولا "حکومت کو صرف یہ کہنا پڑتا کہ دلدار پرویز بھٹی نے تحمل کیا ہے' اس نے تحمل کیا تھا' ہم دوبارہ الیکشن کرا دیتے ہیں"

لوگوں کو ہنسانے والا اور ہنساتے ہنساتے کوئی گہری بات کر جانے والا' لوگوں کے دکھ درد بانٹنے والا اور اپنے غموں کو چھپانے والا یہ شخص کینسر ہسپتال کی تکمیل کے لیے عمران خان کے ساتھ نیو یارک گیا تھا لیکن جب واپس آیا تو وہ لکڑی کے ایک صندوق میں بند تھا۔ میں اسے کبھی ائرپورٹ پر لینے نہیں گیا تھا لیکن اس دفعہ اس کا آنا کیا آنا تھا کہ وی آئی پی لاؤنج کے باہر لوگ اس کے استقبال کے لئے یوں کھڑے تھے جیسے کسی حکمران کے استقبال کے لیے کھڑے ہوں' اس کی سواری بھی شاہانہ انداز سے سڑکوں پر سے گزری' سائرن بجاتی ہوئی یہ گاڑی جدھر سے گزرتی' چوک میں کھڑا سپاہی سرخ بتی کے باوجود اس کے لئے راستہ بناتا۔ دلوں پر حکمرانی کرنے والا یہ فاتح جب وحدت کالونی میں داخل ہوا تو تنگ و تاریک کوارٹروں کے دروازے کھلے اور ان میں سے بچوں' عورتوں اور بوڑھوں کا ایک ریلا سیلاب کی صورت باہر نکلا اور اسی طرح کے ایک کوارٹر میں رہنے والے اس حکمران کو اپنی محبتوں کے نرغے میں لے لیا۔ تم کیا سمجھتے ہو یہ محبت صرف فن کی وجہ سے ملتی ہے؟ یہ محبت انسان کے اندر چھپے ہوئے اس انسان کا مقدر ہوتی ہے جس کی خوشبو ان لوگوں کو بھی اپنی طرف کھینچتی چلی آتی ہے جن سے اس کا ذاتی تعارف نہیں ہوتا۔ دلدار کو ذاتی طور پر جاننے والے لوگ بہت کم ہیں لیکن اس کی موت کی خبر نے سارے پاکستان میں اس کی زندگی کی منادی کی ہے!

# احمد داؤد

## ڈاکٹر انعام الحق جاوید

کیا زمانہ آگیا ہے کہ "جنازوں کو کندھا دینا بھی نصیب میں نہیں رہا۔" یہ فقرہ احمد داؤد کے جنازے سے واپس آتے ہوئے نہ صرف میرے حواس پر چھایا رہا بلکہ میری بے بسی کو کچوکے بھی لگاتا رہا۔ میں مری روڈ کی ٹریفک میں پھنس کر قدرے دیر سے موہن پورہ پہنچا تھا چنانچہ مقامی رہنماؤں کی "مہربانی" سے رتہ امرال کے ایک دوسرے قبرستان میں انتظار کی گھڑیاں کھینچتا رہا اور لوگ احمد داؤد کو دفنا کر اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے۔

دوبئی سے وطن واپس پہنچ کر ابھی میں پوری طرح سنبھل بھی نہ پایا تھا کہ عباس شاہ نے صبح صبح ٹیلی فون کر کے دہلا دیا۔ "احمد داؤد وفات پا گئے ہیں۔" احمد داؤد کے نام کے ساتھ وفات کا لفظ سن کر نہ صرف یہ کہ اپنی سماعت پر سے اعتبار جاتا رہا بلکہ عباس شاہ پر بھی شک گزرنے لگا۔ اس صحت کے ساتھ' اس عمر میں اسے مارا تو جا سکتا تھا اس کا مرنا سمجھ میں نہیں آ رہا تھا لیکن تقدیر کے کاموں میں کسے دخل ہے۔ ہونی ہو چکی تھی۔ کیٹس اور شیلے کی طرح اردو افسانے کا یہ "کافکا" بھی بہت جلد اس دنیا سے اٹھ گیا۔ ظہیرالدین احمد' گوہر نوشاہی' غضنفر مہدی' محبوب ظفر' تصدق راجہ' حلیم قریشی' طارق شاہد الغرض جس جس نے سنا اپنے قدموں پر قائم نہ رہ سکا۔ احمد داؤد ایک خوبصورت آدمی تھا۔ ہنس مکھ' تومند' خوش طبع' خوش ذوق' خوش خوراک' خوش پوشاک' سچی بات کرنے سے کبھی نہ چوکتا اور وہ بھی پیٹھ پیچھے نہیں منہ پر۔ ساری عمر افسر شاہی کے خلاف لڑتا رہا۔ افسر شاہی بھی اسے لڑتی رہی۔ لیکن زخموں سے نڈھال ہو کر گرنا اس نے سیکھا ہی نہ تھا۔ اس نے اپنی ایک کتاب کا نام "دشمن دار آدمی" بھی شاید اسی لئے رکھا تھا لیکن اس کا جنازہ اس بات کا گواہ ہے کہ وہ دشمن دار نہیں بلکہ دوست دار

آدمی تھا۔ اصول پرست اور ایک ایسا ترقی پسند جو نظریاتی اختلافات کو ذاتی دشمنیوں میں بدلنے کا قائل نہیں تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی دوستیاں مشرق سے مغرب تک' نیچے سے اوپر تک اور دائیں سے بائیں تک پھیلی ہوئی تھیں۔ مفتوح ہوائیں اور دشمن دار آدمی کے نام سے اس کے افسانوں کی دو کتابیں چھپ چکی تھیں۔ رہائی کے نام سے ناولٹ بھی آ چکا تھا۔ "خواب فروش" ابھی زیر طبع تھی کہ وہ خود اس خواب کی تعبیر بن گیا۔ ہماری طرح وہ بھی ایک محنت کش قلمکار تھا جو قلم کے تیشے سے لفظوں کو کھود کھود کر روزانہ جوئے شیر نکالتا تھا۔ ڈرامہ اور افسانہ اس کے خاص موضوع تھے۔ سلولائیڈ میڈیا سے بھی اس کا گہرا تعلق تھا۔ اس نے کتابیں لکھیں بھی اور لکھوائیں بھی۔ ادارہ ثقافت پاکستان کی طرف سے چھپنے والی اکثر کتابیں اسی کی کاوشوں کا ثمرہ ہیں اس نے کئی کامیاب ڈرامے بھی لکھے اور بالآخر زندگی کے ساتھ بھی ڈرامہ کر گیا لیکن اس ڈرامے کا اینڈ اتنا اچانک اتنا مختلف اور اتنا چونکا دینے والا تھا کہ اس کا تصور ہی بدن پر کپکپی طاری کر دیتا ہے۔ وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ وہ شخص جو خود ایک ریفرنس بک تھا اس کے ریفرنس کے لئے ہمیں ہوٹل بک کرانا پڑے گا۔ ظہیرالدین احمد اور حسن عباس رضا اس کے اٹوٹ انگ تھے۔ جب کہ ڈاکٹر تنویر' اظہر نیاز' عابد خواجہ اور ظفر خان نیازی اس کے لنگوٹیے۔ ظہیرالدین کا کہنا ہے کہ زندگی میں بھی وہ ایسے ہی کیا کرتا تھا۔ راہ چلتے چلتے اچانک ہاتھ چھڑا کر یہ کہتا ہوا کسی گلی میں مڑ جاتا کہ تم چلو میں ابھی آ رہا ہوں اور پھر یہ "ابھی" کبھی نہ آئی۔ ظہیرالدین کا یہ کہنا اپنی جگہ بالکل بجا مگر مجتبیٰ اختر' اختر امان اور شکیل اختر کا کچھ اور کہنا ہے اور ان تینوں اختروں کا کہنا ہے کہ اس بار وہ خود ہاتھ چھڑا کر کسی گلی میں نہیں مڑا بلکہ کسی نادیدہ ہاتھ نے اُسے زبردستی اس گلی میں موڑ دیا جہاں سے کبھی کوئی مڑ کر واپس نہیں آتا۔

بلاشبہ احمد داؤد ایک خوددار شخص تھا۔ اپنی زندگی میں وہ مانگے کی جنت بھی قبول نہ کرتا لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ وہ ہماری ہی طرح ایک تنخواہ دار ملازم تھا۔ جن کے گھر والے پندرہ تاریخ سے ہی اگلی پہلی کا انتظار شروع کر دیتے ہیں اور اب تو احمد داؤد کے اٹھ جانے کے بعد اس انتظار کا موقع بھی اٹھ چکا۔ ایک بار لندن میں چند انگریز ادیبوں سے ملاقات کے دوران پاکستانی اور یورپی ادب کے تقابل کے ساتھ ساتھ دونوں ملکوں کے ادیبوں کا ذکر بھی چل نکلا تو ان میں سے ایک لکھاری نے بتایا کہ آپ کے ہاں جب کوئی ادیب گزر جاتا ہے تو جذباتی سطح پر پورے ملک کے قلمکار اس کا سوگ مناتے ہیں۔ اور اس کے بارے میں بہت کچھ لکھا جاتا ہے

لیکن اس کے پسماندگان کی طرف کوئی دھیان نہیں دیا جاتا' یہ کہاں رہیں گے۔ بچوں کی تعلیم کیسے ہو گی۔ گھر کا گزارا کیسے چلے گا۔ یہ سب سوال ادھورے چھوڑ دیئے جاتے' بس ایک دعا کی جاتی ہے کہ اللہ پاک پسماندگان کو صبر جمیل سے نوازے۔ جب کہ ہمارے ہاں جب کوئی ادیب مرتا ہے تو قریبی قلمکاروں کا گروہ فوری طور پر اس کے گھر پہنچتا ہے اور سب سے پہلے پسماندگان کی تمام ضروریات کا تخمینہ لگا کر مختلف اداروں کے توسط سے ان ضروریات کو پورا کرنے کا خاطر خواہ انتظام کیا جاتا ہے۔

خواتین و حضرات! یہ کئی برس پہلے کی بات ہے اور اب یہاں بھی حالات بہت بدل چکے ہیں پھر بھی میرا خیال ہے کہ مجھے یہ واقعہ آج کی اس تقریب میں ضرور بیان کرنا چاہئے تھا۔

(اسلام آباد میں احمد داؤد ادبی ریفرنس میں پڑھا گیا۔)

○

# مکالمہ ○...... احمد ندیم قاسمی

محمد افسر ساجد

س...... اپنی ادبی سوانح پر روشنی ڈالئے؟

ج......☆ میرے ادبی سوانح صرف اس قدر ہیں کہ جنوری ۱۹۳۱ء میں یعنی چودہ برس کی عمر میں مولانا محمد علی جوہر کی رحلت کی خبر سن کر نوحہ لکھا اور یوں شاعری کا سلسلہ شروع کیا۔ مشہور مزاح نویس' طنز نگار اور سفرنامہ نگار محمد خالد اختر میرے ہم مکتب تھے۔ انہوں نے افسانہ نگاری کی طرف راغب کیا اور میرا پہلا افسانہ اختر شیرانی کے رسالہ "رومان" میں شاید ۳۷---۱۹۳۸ء کے آس پاس شائع ہوا۔ اب تک شاعری کے سات مجموعے' افسانوں کے چودہ مجموعے اور تنقیدی مضامین کے دو مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔

س......○ آپ کے نزدیک پاکستانی ادب کا عصری بین الاقوامی ادب میں کیا مقام ہے؟

ج......☆ عصری بین الاقوامی ادب میں پاکستانی ادب کا مقام بہت نمایاں اور منفرد ہے۔ مشکل یہ ہے کہ پاکستانی ادب کو انگریزی زبان میں کم ہی منتقل کیا گیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ عصری ادب کے قارئین پاکستانی ادب سے متعارف ہی نہیں ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر پاکستان کی شاعری اور افسانے انگریزی میں منتقل ہو جائیں تو پوری دنیا پر پاکستانی ادب کی عظمت اور وسعت یوں ظاہر ہو گی جیسے طلوع آفتاب سے مشرق جگمگا اٹھتا ہے۔

س......○ ترقی پسند تحریک نے اردو ادب کو کیا فائدہ پہنچایا؟

ج......☆ ترقی پسند ادب کی تحریک نے نے اردو ادب کو حقائق حیات کو سمجھنے اور

انھیں ادب میں سلیقے سے منتقل کرنا سکھایا۔ اس تحریک نے اہل قلم کو ذات کی حوالات سے نکال کر کائنات کی خوبصورتیوں اور پہنائیوں سے روشناس کرایا اور فرد اور قوم کے درمیان محبت کے روابط قائم کئے۔ اگر خدانخواستہ ترقی پسند ادب کی تحریک نہ چلتی تو ہمارا ادب آج بھی گونگا ہوتا اور اس کی حیثیت مجذوب کی بڑ سے زیادہ نہ ہوتی۔

س......○ غالب سے فیض کے درمیان اردو شاعری کی روایت میں کن شعراء کو تخلیقی سطح پر "سنگ میل" گردانا جا سکتا ہے؟

ج......☆ خود غالب بہت بلند اور نمایاں ترین سنگ میل ہے۔ اس کے بعد حالی ہے جس نے اردو شاعری کو رعایت لفظی اور ریختی کے مداری پنے سے نکالا۔ پھر اقبال ہے جس نے شاعری کو مزید سربلندی بخشی۔ اقبال کے بعد شعراء میں سے جوش' یگانہ' فراق' راشد اور فیض اہم سنگ میل ہیں۔

س......○ آپ کے نزدیک فنی لحاظ سے ایک مکمل افسانے کی کیا تعریف ہے؟

ج......☆ مکمل افسانے کی کوئی حتمی تعریف ممکن نہیں۔ ایک کردار کی پیش کش بھی مکمل افسانہ ہو سکتی ہے۔ ایک ذہنی کیفیت کا اظہار بھی مکمل افسانہ کہلا سکتا ہے۔ ایک واقعے کی فنکارانہ کارروائی بھی مکمل افسانے کی زمرے میں آ سکتی ہے۔ ایک علامت اگر قاری پر واضح ہوتی چلی جائے تو مکمل افسانے کی بنیاد بن سکتی ہے۔ ان سب حالتوں میں بنیادی شرط یہ ہے کہ افسانے میں افسانویت.......... کہانی میں کہانی پن پوری طرح موجود ہو جو آغاز ہی سے قاری کو اپنی گرفت میں لے لے اور انجام کی طرف یوں سبک سبک چلے جیسے کھیتوں میں سے ہوائیں گزرتی ہیں۔

س......○ اردو افسانہ نگاری کے جدید ترین رویوں کا تنقیدی محاکمہ کیجئے؟

ج......☆ اردو افسانے کے جدید ترین نمایاں رویئے تین چار ہیں۔ پہلا رویہ علامت نگاری کا ہے جس نے برسوں تک افسانے کو پہیلی بنائے رکھا۔ دوسرا رویہ تجرید کا ہے جو افسانے سے زیادہ نام نہاد نثری نظم کے زیادہ قریب ہے۔ تیسرا رویہ آزاد تلازمہ خیال کا ہے جو دلچسپ ضرور ہے مگر کہانی کو کہانی نہیں بننے دیتا۔ آخری رویہ وہی حقیقت پسندی کا رویہ ہے جس نے کرشن چندر' منٹو' عصمت' بیدی' غلام عباس اور

ممتاز مفتی کے سے افسانہ نگار دیئے اور یہی رویہ ایک بار پھر سطح تخلیق پر نمایاں ہوا ہے۔

س......○ غزل کے بطور صنف شعری کیا فنی و فکری امکانات ہیں؟

ج......☆ بطور صنف شاعری غزل کے فنی اور فکری امکانات اتنے وسیع ہیں کہ ان کا ایک مختصر جواب میں احاطہ ناممکن ہے۔ یہ اردو (اور فارسی) شاعری کی ایسی صنف ہے جس کے کسی بھی عہد میں زوال پذیر ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس میں فکر و خیال کی اتنی گنجائشیں ہیں کہ مستقبل میں بھی یہ صنف اسی شان ہر دلعزیزی سے زندہ رہے گی...... بلکہ میں تو کہتا ہوں کہ جب انسان زمین سے چاند ستاروں کے سفر پر نکلے گا تو کسی غزل کا کوئی شعر ہی گنگناتا ہوا نکلے گا...... البتہ وہ شعر ایسا ہو گا جس کے بارے میں اقبال نے کہا تھا کہ اگر کوئی اچھا شعر سنو تو یقین کر لو کہ کوئی نہ کوئی عیسیٰ مصلوب ہوا ہے۔

س......○ اردو کالم نگاری میں آپ کے کالم "حرف و حکایت" کو مقام امتیاز حاصل ہے۔ آپ کا موجودہ کالم اس پائے تک کیوں نہیں پہنچ سکا؟

ج......☆ "حرف و حکایت" مزاحیہ اور طنزیہ یعنی فکاہی کالم تھا۔ آج کل میں جو کالم لکھ رہا ہوں وہ سنجیدہ سیاسی' معاشی' معاشرتی اور تہذیبی مسائل کے بارے میں ہوتے ہیں۔ ظاہر ہے میرے مزاحیہ کالم پسند کرنے والے میری سنجیدہ نگاری پر چونکتے ہیں اور آپ کی طرح اس فیصلے پر پہنچتے ہیں کہ میرے آج کل کے (سنجیدہ) کالم میرے ماضی کے (فکاہی) کالموں سے کم تر ہیں۔ بات معیار کی نہیں ہے' پسند ناپسند کی ہے۔

س......○ اردو شاعری کی ترویج میں مشاعروں کا کیا کردار رہا ہے؟

ج......☆ اردو شاعری کی ترویج میں مشاعروں نے بے پناہ مثبت کردار ادا کیا ہے بلکہ ماضی میں تو شاعری کی ترویج کا بڑا ذریعہ ہی یہ مشاعرے تھے۔ آج بھی مشاعرہ شاعری کی مقبولیت کا ایک موثر ذریعہ ہے مگر مشکل یہ ہے کہ اب مشاعرہ بیشتر تماشا بن کر رہ گیا ہے اور لوگ مشاعروں میں یوں جاتے ہیں جیسے سرکس میں جا رہے ہوں۔ اس رجحان میں اصلاح کی ضرورت ہے ورنہ مشاعرے کا ادارہ زوال پذیر ہو جائے گا۔

س......○ "فنون" اردو کا اہم ترین ادبی صحیفہ ہے۔ آپ نے انتہائی ناساعد حالات

کے باوصف اس کا تخلیقی معیار کس طرح برقرار رکھا ہے؟

ج.....☆ میں جب "فنون" کے گذشتہ تیس برسوں پر نظر ڈالتا ہوں تو حیران رہ جاتا ہوں کہ میں نے اسے کیسے جاری رکھا۔ میرے مادی وسائل نہایت محدود ہیں۔ میں کالم نگاری اور ملازمت سے جو کچھ کماتا تھا اس کا بڑا حصہ فنون کی نذر کرتا رہا۔ اشتہار آمدنی کا واحد ذریعہ ہوتے ہیں مگر یہ خانہ بھی بحیثیت مجموعی خالی رہا۔ احباب کے تعاون سے چند اشتہار مل جاتے تھے مگر ان کی مثال ہاتھی کے سامنے مٹر کے دانے کی ہے۔ ناساعدت نے مسلسل میرا پیچھا کیا ہے مگر استقامت نے میرا کبھی ساتھ نہیں چھوڑا۔ میں صرف اور صرف تخلیقی ادب پیش کرتا رہا ہوں اور پینترے بازیوں سے پوری طرح اجتناب کیا ہے۔ یوں میں نے فنون کے معیار کو کبھی گزند نہیں پہنچنے دی۔ میں عام زندگی میں معاف کر دینے اور نظرانداز کر دینے کا قائل ہوں مگر شعر و ادب کے ضمن میں بہت کٹڑ اور سخت گیر ہوں۔ "فنون" کا معیار اسی لئے اب تک برقرار ہے بلکہ مسلسل ترقی پذیر ہے۔

س.....○ ادبی گروہ بندی کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

ج.....☆ ادبی گروہ بندی ادب کے لئے زہر قاتل کا حکم رکھتی ہے۔ ادب کو اس حماقت سے ہمیشہ بلند رہنا چاہئے۔

س.....○ (عصری) اردو کی مختلف اصناف ادب میں اہم ترین نام؟ اپنی رائے کا جواز بھی دیجئے؟

ج.....☆ مختلف ادبی اصناف میں اہم ترین ناموں کی نشان دہی خطرناک کام ہے۔ ساری زندگی اس نوعیت کے خطرات کا سامنا کیا ہے اور ہدف بہتان و دشنام رہا ہوں مگر میری استدعا ہے کہ اب اس کبر سنی میں مجھے اس آزمائش میں نہ ڈالئے۔ ایک کا نام لوں گا تو دوسرے کو شکایت ہو گی جبکہ دوسرا بھی قریب قریب اسی معیار کا تخلیق کار ہو گا۔

○
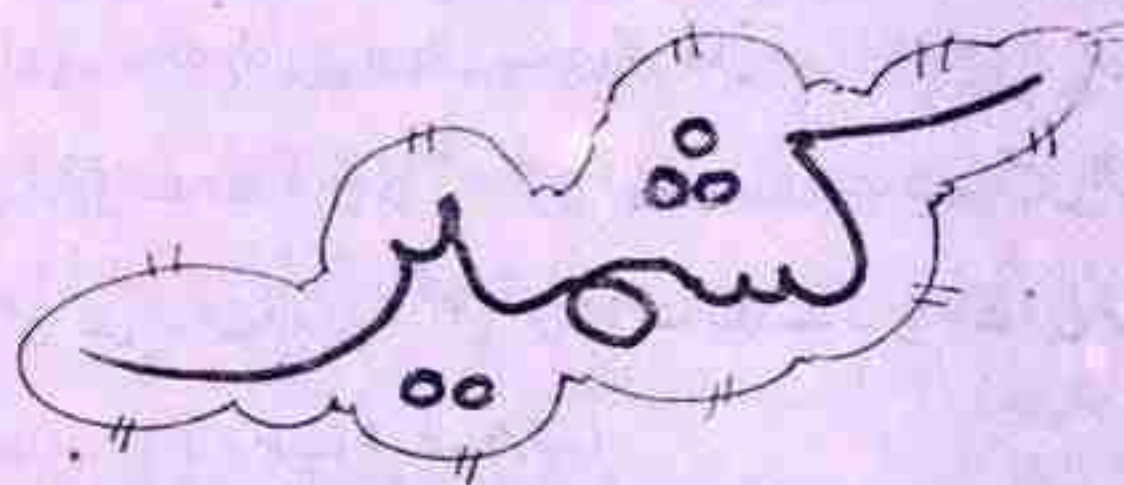
کشمیر

ہمارے نزدیک وہ تمام قائدین اور ان کے پیروکار قابلِ صد احترام ہیں جو اس وقت کشمیر کی آزادی کے لئے تاریخ کی عظیم ترین قربانیاں دے رہے ہیں۔ ہمیں اس سے کوئی غرض نہیں کہ ان مجاہدین کا تعلق کس جماعت سے ہے کہ یہ وقت اس نوع کے اختلافات سے بالا ہو کر سوچنے کا ہے۔ (ادارہ)

ظہور الدین بٹ

# سید علی گیلانی

سید علی گیلانی ۱۹۲۹ء کو وولر جھیل کے کنارے واقع گاؤں زوری منس کے ایک غریب گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد سید پیر شاہ گیلانی، نہر زینہ گیر کی کھدائی کرنے والے مزدوروں میں شامل تھے۔ وہ ابھی دو برس ہی کے تھے کہ ڈوگرہ سامراج نے سری نگری جیل میں مقید ۲۲ فرزندان توحید کو شہید کر دیا۔ ان کی پرورش اور ذہنی نشوونما ایسے ماحول میں ہوئی جو اہل کشمیر کے لئے بے کسی، بے چارگی اور غلامی کا دور تھا۔ قیام پاکستان کے بعد جب شیخ عبداللہ اور ہری سنگھ کی ملی بھگت سے کشمیر کے بھارت سے نام نہاد الحاق کا فراڈ کیا گیا، تب مسلمانوں کی مقامی قیادت کو وطن چھوڑنے پر مجبور کر دیا گیا۔ ان حالات میں انہوں نے اسلامی انقلاب کے پیغام کی اشاعت اور بھارتی سامراج سے آزادی کے پیغام کی ترویج کو اپنی زندگی کا نصب العین قرار دیا۔ ان دنوں آپ کی تقریروں کے ابتدائی جملے یہ ہوا کرتے تھے:

"میں بھارت کے ساتھ کشمیر کے نام نہاد الحاق کو نہیں مانتا، میں بھارتی سامراج کا باغی ہوں، اور اس بغاوت کے جرم میں مجھے پھانسی کا پھندا بھی چومنا پڑے تو اس کو اپنی سعادت سمجھوں گا۔"

اس بے باک لہجے کو دبانے کے لئے بھارتی حکومت نے سید علی گیلانی کو پہلی مرتبہ ۲۸ اگست ۱۹۶۲ء کو گرفتار کر کے حوالہ زنداں کیا، گیلانی صاحب ستمبر ۱۹۶۳ء کو جیل سے رہا ہوئے تو جموں و کشمیر جماعت اسلامی کے سیکرٹری جنرل منتخب ہوئے اور پھر ے مئی ۱۹۶۵ء سے مارچ ۱۹۶۷ء تک دوبارہ گرفتار کر دیئے گئے۔ یوں مختلف وقفوں کے ساتھ ۱۹۷۷ء تک زیادہ عرصہ جیل

ہی میں گزارا۔

۱۹۷۲ء میں انہوں نے جماعتی فیصلے کے مطابق کشمیر اسمبلی کے انتخابات میں حصہ لینے کا فیصلہ کیا۔ حکومتی سطح پر زبردست دھاندلی کے باوجود سید علی گیلانی چار ساتھیوں کے ساتھ رکن منتخب ہو گئے۔ اگلے انتخابات ۱۹۷۷ء میں ہوئے اس میں بھی انتخاب جیت لیا۔ پھر ۱۹۸۷ء سے ۱۹۸۹ء تک کشمیر اسمبلی میں متحدہ حزب اختلاف کے پارلیمانی قائد رہے۔ ۱۹۸۹ء میں جب بھارتی فوج نے نہتے کشمیری مسلمانوں پر بے پناہ مظالم کا پہاڑ توڑا' تب اپنے ساتھیوں سمیت اسمبلی کی رکنیت سے استعفیٰ دے کر اور تحریک کو عوامی سطح پر منظم کرنا شروع کر دیا اور "تحریک حریت کشمیر" کے نام سے وسیع تر اتحاد قائم کیا۔

سید علی گیلانی ۱۹۶۲ء سے ۱۹۹۳ء تک زندگی کے سترہ سال جیل میں گزار چکے ہیں۔ ہفت روزہ "اذان" سری نگر کی ادارت سے بھی وابستہ رہے ہیں۔ ۱۹۹۰ء سے شروع ہونے والے دور اسیری کی روداد تین جلدوں پر مشتمل ہے جس کے دو حصے چھپ چکے ہیں جبکہ تیسرے حصے کا مسودہ بھارتی فوج نے ضبط کر لیا ہے

(ادارہ)

"اپنا سامان تعیش' زیورات' کھیت و باغات یہ سب کچھ بیچ دو' اس کے بدلے بھارتی استعمار سے فیصلہ کن جنگ لڑنے کے لئے اسلحہ خریدو۔ مجھے نظر آتا ہے کہ جلد یا بدیر ہمیں اسی راستے کا انتخاب کرنا ہو گا۔ کیونکہ اس کے علاوہ آزادی کا کوئی راستہ نہیں" سید علی کی گرج دار آواز سوپور کے جلسہ میں گونج رہی تھی۔ جلسہ گاہ میں موجود لوگ دم سادھے اپنے محبوب قائد کی تقریر سن رہے تھے اور حکمران' بلند و بالا ایوانوں میں لرزہ براندام تھے۔

دبلے پتلے' نحیف و نزار جسم کے مالک سید علی گیلانی جرآت و استقامت کا ایسا ہمالیہ ہیں' ظلم و جبر کی سیاہ آندھیاں جس سے ٹکرا کر واپس ہوتی رہیں اور وہ ثابت قدم رہے۔ یہ انہی کی طاقتور آواز تھی جو اندرا عبداللہ گٹھ جوڑ کے خلاف گونج رہی تھی۔ ۱۳ فروری ۱۹۷۵ء کو سوپور میں ان کے ایک کارکن غلام محمد بلہ کو سری نگر سنٹرل جیل میں بدترین تشدد کا نشانہ بنا

کر شہید کر دیا گیا۔ تب انہوں نے بھارت اور اس کی کٹھ پتلی ریاستی انتظامیہ کے خلاف عوامی بغاوت کا طوفان اٹھایا۔

۱۹۳۱ء میں سری نگر سنٹرل جیل کے احاطے میں بائیس فرزندان توحید نے اپنے خون سے تحریک آزادی کا ابتدائی باب رقم کیا' اس وقت سید علی گیلانی دو برس کے رہے ہوں گے۔ آج سے تقریباً پینسٹھ' سڑسٹھ سال پہلے' وہ جھیل وولر کے کنارے واقع بابا شکر دین کی زیارت کے قریب واقع خوبصورت گاؤں زوری منس میں ایک مزدور پیر شاہ گیلانی کے گھر پیدا ہوئے۔ پیر شاہ گیلانی کے وہم و گمان میں بھی نہ ہو گا کہ ان کے گھاس پھوس کے جھونپڑے میں پیدا ہونے والا یہ بچہ درماندہ کشمیری قوم کے زخموں پر پھایا رکھے گا اور کاروان آزادی کا حدی خواں بن جائے گا۔ اس بچے کا نام کشمیر میں تحریک اسلامی کے اولین داعی و قائد سید علی ہمدانیؒ کے نام پر رکھا گیا۔

سید علی گیلانی نے شعور سنبھالا تو آزادی کی تحریک اپنے جوبن پر تھی۔ ڈوگرہ استعمار کے خلاف چاروں طرف تکبیر اور آزادی کے نعرے بلند ہو رہے تھے۔ انہی نعروں کی گونج اور آزادی کے ترانے سن کر انہوں نے لڑکپن گزارا۔

۱۹۴۷ء میں بھارتی فوجیں ہری سنگھ اور شیخ عبداللہ کی ملی بھگت سے کشمیر پر قابض ہو گئیں تو آزادی کی منزل' جس کے لئے کشمیری مسلمان طویل عرصہ سے قربانیاں دیتے چلے آ رہے تھے اندھیروں کی نذر ہو گئی' تب نو عمر علی گیلانی پر اس قومی سانحے کا گہرا اثر ہوا۔ شیخ عبداللہ اور اس کے حواری اگرچہ قرآن اٹھا اٹھا کر لوگوں کو یقین دلاتے رہے کہ ان کی گردن میں ڈالا جانے والا پھندہ' غلامی کا طوق نہیں آزادی کا تمغہ ہے لیکن سید علی گیلانی ان کی اس منطق کو قبول کرنے کے لئے تیار نہ تھے۔ وہ سوچتے رہتے کیا ۱۹۳۱ء کے شہیدوں نے اس لئے قربانی دی تھی کہ ڈوگرہ استعمار کی جگہ برہمنی سامراج کشمیر کو اپنی گرفت میں لے لے۔ وہ سوچتے اور کڑھتے رہے۔ بھولی بھالی قوم کے ساتھ شیخ عبداللہ اور اس کے حواریوں کا یہ دوسرا دھوکہ تھا۔ پہلا دھوکہ مسلم کانفرنس کا نیشنل کانفرنس میں انضمام اور شیخ عبداللہ اور ہری سنگھ کی ملی بھگت سے کشمیر کا بھارت سے الحاق دوسرا دھوکہ اور کھلی غداری تھی۔

کیا کشمیر دوسرا اندلس بنے گا' کیا سمرقند و بخارا کی طرح یہاں سے بھی مسلمانوں کو نکلنا پڑے گا' ان خدشات' خطرات نے سید علی گیلانی کو مضطرب کئے رکھا۔ چوہدری غلام عباس اور میر واعظ مولوی محمد یوسف جیسی قد آور شخصیات ریاست سے ہجرت کرنے پر مجبور ہو

چکی تھیں۔ ان حالات میں انہوں نے جماعت اسلامی جموں و کشمیر میں شمولیت اختیار کی۔

جماعت نے جموں و کشمیر پر بھارتی تسلط کو کبھی تسلیم نہ کیا تھا۔ حق گوئی و بے باکی کے جرم میں جماعت اسلامی کے قائدین اور کارکنوں کو بارہا جیلوں میں دھکیلا جاتا رہا۔ ان پر تعذیب و تشدد کے تازیانے برسائے جاتے رہے' انہیں دار و رسن سے گزارا جاتا رہا۔ جماعت ہر امتحان سے کندن بن کر نکلتی رہی۔ سید علی گیلانی بھی تعزیر و تعذیب کے مستحق ٹھہرے کہ انہوں نے بھارتی استعمار کو زیادہ بلند اور تیز آواز سے للکارا تھا۔ انہوں نے ہر مرتبہ دو ٹوک الفاظ میں کہا: "میں بھارت کے ساتھ کشمیر کے الحاق کو نہیں مانتا۔ میں بھارتی سامراج کا باغی ہوں اور اس بغاوت کے جرم میں مجھے پھانسی کا پھندا بھی چومنا پڑا تو اسے اپنی سعادت سمجھوں گا۔"

سید علی گیلانی کی بیباکی اور حق گوئی بھارتی سرکار کے لئے ناقابل برداشت ہو گئی تو پہلی مرتبہ ۲۸ اگست ۱۹۶۲ء کو انہیں پس دیوار زندان دھکیل دیا گیا۔ اس کے بعد جیل ان کا مسکن ٹھہرا' ہتھکڑی زیور اور زنجیر کی کھنکھناہٹ آزادی کا ترانہ بن گئی۔ جیل میں ان کی ملاقات حکیم مولانا غلام نبی (فاضل دیوبند) سے ہوئی۔ ان سے آپ نے علم حاصل کیا۔ حکیم صاحب کے علم و تقویٰ نے ان کی زندگی پر گہرے نقوش کندہ کئے۔ اسی اسیری کے دوران ان کے والد انتقال کر گئے۔ آپ کو والد کا آخری دیدار کرنے کی اجازت دی گئی اور نہ ان کے جنازے کو کندھا۔

جیل سے رہائی ملی تو سید علی گیلانی کو جماعت اسلامی جموں و کشمیر کا سیکرٹری جنرل بنا دیا گیا۔ جیل کی سختیوں اور صعوبتوں نے بھارتی تسلط کے خلاف ان کی بغاوت کے جذبات کو دو چند کر دیا۔ وہ پوری تندہی سے بھارتی استعمار سے رائے شماری کرانے کا وعدہ پورا کرنے کا مطالبہ کرنے لگے۔ آپ نے پوری شدت سے عوام کو حق خودارادیت کے حصول کے لئے بیدار اور تیار کرنا شروع کر دیا۔

۱۹۶۵ء میں "آپریشن جبرالٹر" سے کچھ عرصہ پہلے ہی ۷ مئی ۱۹۶۵ء کو سید علی گیلانی کو دوبارہ گرفتار کر لیا گیا۔ بھارتی حکمرانوں کو اپنے خفیہ اداروں سے اس آپریشن کے بارے میں پتہ چل چکا تھا۔ انہیں خطرہ تھا کہ پاکستان کے حملے کی صورت میں سید علی گیلانی پاکستانی کمانڈوز کو اندرون کشمیر مدد فراہم کر سکتے ہیں۔

سید علی گیلانی ۱۹۶۷ء میں رہا ہوئے تو انہوں نے اپنے عزم کا اعادہ کرتے ہوئے

ایک پریس کانفرنس میں فرمایا "بھارت نے کشمیر کے حق خودارادیت کو اقوام متحدہ میں تسلیم کر لیا ہے اور ہماری کوشش بھی ہے کہ اس مسئلے کو سیاسی انداز میں نمٹایا جائے۔ خود بھارت کا مفاد بھی اسی میں ہے۔ لیکن اگر بھارتی حکمرانوں نے مزید ٹال مٹول سے کام لیا تو کشمیری کسی دوسرے راستے کا انتخاب کرنے میں حق بجانب ہوں گے۔"

شیخ عبداللہ اور ان کے حواری اب رائے شماری کے مطالبے سے دستبردار ہو چکے تھے۔ اب وہ کشمیر کو بھارت کا اٹوٹ انگ قرار دینے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے تھے۔ ۱۹۷۳ء میں شیخ عبداللہ نے وزارت اعلیٰ کی کرسی کے عوض کشمیریوں کے حق خودارادیت کا سودا کیا تو سید علی گیلانی نے ببانگ دہل اعلان کیا "اگر تم نے شیخ عبداللہ اور مرزا افضل بیگ کو خرید لیا ہے تو اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کہ قوم اپنے مطالبہ حق خودارادیت سے دست بردار ہو گئی ہے۔" وہ شیخ عبداللہ اور اس کے حواریوں کو سناتے رہے، "تمہارے خیال میں اگر قوم نے بھارت کے ساتھ رہنا منظور کر لیا ہے تو یہ تمہاری بھول ہے۔ یہ بجا کہ تمہارے بھارتی آقاؤں نے جبر سے ان کے سروں کو جھکا لیا ہے، لیکن تمہارے ان الفاظ کا جواب تمہیں اس وقت ملے گا جب آج کی ماؤں کی گود میں پلنے والے بچے جوان ہوں گے اور اگر موجودہ نسل نے میرا ساتھ نہ دیا، تو وہ ضرور میرا ساتھ دیں گے۔"

سید علی گیلانی کے خلاف بغاوت کا مقدمہ چلا تو عدالت نے ان سے پوچھا: "کیا آپ کشمیر کی سرزمین پر بھارت کو غاصب اور جارح سمجھتے ہیں؟"

انہوں نے پراعتماد انداز میں کہا؟ "بالکل! جب کوئی قابض اپنی شرائط قبضہ کو پورا نہیں کرتا تو اسے غاصب اور جارح ہی قرار دیا جا سکتا ہے۔"

آپ جیل ہی میں تھے کہ فروری ۱۹۸۴ء میں دہلی کی تہاڑ جیل میں محاذ آزادی کے راہنما جناب مقبول بٹ کو پھانسی دی گئی۔ آپ نے شیخ عبداللہ کے نام ایک کھلا خط لکھا۔ اس خط کے الفاظ آپ کے حد درجہ درد و کرب کی گواہی دیتے ہیں:

"آپ کو فروری ۱۹۸۳ء میں مرحوم مقبول بٹ کے سیاہ وارنٹ پر دستخط کرنے کا حکم شاہی ملا تو آپ نے بغیر کسی چوں و چرا کے دستخط ثبت کر کے یہ ثابت کر دیا کہ ایک مقبول بٹ کیا، سارے کشمیری عوام کو جہلم برد کر کے بھی آپ کے اقتدار کی کرسی مضبوط رہ سکتی ہے تو آپ کے لئے گھاٹے کا سودا نہیں۔ مرحوم

مقبول بٹ کے طریق کار سے اختلاف ہو سکتا ہے لیکن وہ ریاست جموں و کشمیر میں بھارتی استعمار اور سامراجی تسلط کے خلاف تھے۔ آپ نے مقبول بٹ کو پھانسی پر لٹکا دیا اور پوری وادی میں دار و گیر کا سلسلہ شروع کر دیا..."

"آپ نے دہلی کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے جبر و تشدد کا وہ گھناؤنا کھیل کھیلا کہ پوری وادی میں قبرستان جیسی خاموشی مسلط ہو کر رہ گئی۔ مرحوم کی نعش ان کے وارثوں کے حوالے نہ کرنے میں بھی آپ بھارتی سامراج کی ظالمانہ کارروائی میں برابر کے شریک ہیں۔ آپ نے مرحوم کے بھائی غلام نبی بٹ کو دہلی جاتے ہوئے ایئرپورٹ سے گرفتار کرا کے یہ ثابت کر دیا کہ آپ بھارتی مظالم میں برابر کے شریک ہیں۔ آپ نے اس گھناؤنے جرم پر چپ سادھ لی' کیونکہ اپنے ہاتھوں کا خون چھپا نہیں سکتے۔"

اس مرتبہ آپ کی اسیری طوالت اختیار کر گئی۔ رہائی کے بعد پھر آپ کو جماعت اسلامی جموں و کشمیر کا امیر منتخب کر لیا گیا۔ اسی روز آپ کو دوبارہ گرفتار کر لیا گیا۔ ۱۳ جون ۱۹۸۵ء کو حکومت نے آپ کو ایڈوائزری بورڈ کے سامنے پیش کیا' جہاں چیف جسٹس آدرش سین کے سامنے آپ نے اپنے "جرائم" کا اعتراف کرتے ہوئے حق گوئی و بیباکی کا فریضہ یوں انجام دیا:

"ہم ریاست جموں و کشمیر کے بھارت کے ساتھ الحاق کو مشروط و عارضی سمجھتے ہیں۔ اس کے لئے ہمارے پاس یہ بنیاد ہے کہ ۲۷ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو مہاراجہ ہری سنگھ نے ریاست کا بھارت کے ساتھ الحاق کیا تو خود ہندوستان کے حکمرانوں نے دستاویز الحاق پر یہ شرط رکھی کہ "حالات ٹھیک ہو جانے پر" ہم ریاست کے عوام سے رائے شماری کرائیں گے کہ وہ بھارت کے ساتھ رہنا چاہتے ہیں یا پاکستان کے ساتھ اپنی قسمت وابستہ کرنا چاہتے ہیں۔ پھر بھارت نے اقوام متحدہ کی ۱۹۴۸ء' ۱۹۴۹ء کی قراردادوں کو ساری دنیا کے ساتھ تسلیم کیا ہے جن میں کشمیر کے مستقبل کے فیصلے کو کشمیری عوام کے آزادانہ استصواب رائے سے مشروط کیا گیا ہے۔"

چیف جسٹس کے سوال پر کیا آپ ریاست کو "پولیس سٹیٹ" قرار دیتے ہیں؟

سید علی گیلانی نے کہا:

"ہاں میں ریاست جموں و کشمیر کو پولیس سٹیٹ قرار دیتا ہوں۔ یہاں کے عوام پر ڈھائے جانے مظالم دیکھ کر ہر عقلمند یہی کہے گا۔"

انہیں اپنی جدوجہد کی کامیابی کا پورا یقین تھا۔ ان کی توقعات کے عین مطابق وادی کے مسلمانوں نے ان کی صدا پر لبیک کہتے ہوئے بھارتی سامراج کے خلاف جہاد شروع کر دیا۔

جماعت اسلامی نے کشمیر اسمبلی کے انتخابات میں ۱۹۷۲ء میں آزادی کشمیر کی بنیاد پر حصہ لیا۔ سید علی گیلانی کی شعلہ نوائی شیخ عبداللہ کی صورت میں غدار لیڈر شپ کو بے نقاب کرتی رہی۔ بھارتی حکمرانوں کی بے پناہ دھاندلی کے باوجود سید علی گیلانی سمیت جماعت کے چار نمائندے اسمبلی میں پہنچے۔ علی گیلانی کی رہنمائی میں یہ نمائندے اسمبلی میں جنگ آزادی لڑتے رہے۔ سید علی گیلانی ۱۹۷۲ء سے ۱۹۷۷ء پھر ۱۹۷۷ء سے ۱۹۸۲ء تک جماعت کے پارلیمانی لیڈر اور ۱۹۸۷ء میں ۱۹۸۹ء تک متحدہ حزب اختلاف کے پارلیمانی لیڈر رہے۔ اس دوران میں بھارتی لیڈر شپ کو چیلنج کرنے کا کوئی موقع انہوں نے ہاتھ سے جانے نہ دیا۔

بھارت اور اس کے ایجنٹوں نے ریاستی اسمبلی کے ایوان کو اپنے سامراجی عزائم کی تکمیل کے لئے استعمال کیا۔ اس کے برعکس سید گیلانی نے اس پلیٹ فارم کو بھارتی سامراج سے آزادی کے لئے استعمال کیا۔ ان کی کوششوں سے ۱۹۸۷ء میں وادی کی گیارہ تنظیموں نے یک جان ہو کر مسلم متحدہ محاذ کی صورت اختیار کر لی۔ انہوں نے پوری قوم کو اتحاد کی لڑی میں پرو کر ناقابل تسخیر بنا ڈالا۔

مسلم متحدہ محاذ کے رہنما اسمبلی میں اکثریت حاصل کر کے ۱۹۴۷ء کے بھارت کے ساتھ الحاق کو' جس کی توثیق ۱۹۵۴ء میں اسی اسمبلی نے کی تھی' منسوخ کر کے آزادی اور پاکستان کے ساتھ الحاق کے اعلان کا عزم رکھتے تھے۔ لیکن محاذ کی مقبولیت سے خوفزدہ ہو کر بھارتی حکومت نے انتخابات میں وسیع پیمانے پر دھاندلی کرائی کہ مسلم متحدہ محاذ کے چار نمائندوں کے علاوہ سب کو ناکام قرار دے دیا۔ اس موقع پر سید علی گیلانی نے بھانپ لیا کہ اب نوجوانوں کو عسکری بنیادوں پر منظم کرنا ہو گا۔

۱۹۸۹ء میں بھارتی فوجوں کے کشمیری عوام پر مظالم حد درجہ بڑھ گئے تو آپ نے ساتھیوں سمیت اسمبلی کی رکنیت سے استعفیٰ دے کر تحریک آزادی کو عوامی اور عسکری بنیادوں پر

منظم کرنا شروع کر دیا۔ سید علی گیلانی کے عزائم سے خوفزدہ ہو کر بھارتی حکومت نے اپریل ۱۹۹۰ء میں انہیں پھر گرفتار کر لیا۔ کئی روز تک انہیں جوائنٹ انٹیروگیشن سنٹر جموں میں ناقابل بیان تشدد کا نشانہ بنایا جاتا رہا جس کے نتیجہ میں ان کی ایک آنکھ کی بینائی جاتی رہی۔

جیل میں سید علی گیلانی سے مذاکرات کے لئے بھارتی حکومت نے بارہا کوشش کی مگر آپ نے ہر مرتبہ کشمیر سے فوجوں کی مکمل واپسی اور رائے شماری کے شیڈول کے اعلان کے بغیر کسی قسم کے مذاکرات سے انکار کر دیا' بھارتی حکمرانوں نے ریاست جموں و کشمیر کو داخلی خود مختاری دینے کی پیشکش بھی کی مگر سید علی گیلانی اور ان کے جانثاروں نے ہر بار مکمل آزادی اور پاکستان سے الحاق تک جہاد جاری رکھنے کے عزم کو بار بار دہرایا۔

سید علی گیلانی سترہ سال سے زیادہ بھارت کی مختلف جیلوں میں آزادی کی جنگ لڑتے ہوئے گزار چکے ہیں۔ اسمبلی کا ایوان ہو یا زندان کی کال کوٹھڑی وہ ہر جگہ درس حریت دیتے رہے اور قوم کو طوفانوں سے لڑنے کا سبق دیتے رہے ہیں۔ ان کی بے پناہ قربانیوں کے سبب جو لوگ کل تک شیخ عبداللہ کو "خدا کا اوتار" ماننے والے تھے آج ان کی اولاد آزادی کے لئے اپنا خون اور جانیں پیش کر رہی ہے۔ انہوں نے جسد ملت میں تازہ روح پھونک دی اور آزادی کے لئے اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کرنے والوں کی ایک کھیپ تیار کر دی ہے جو آج ایشیا کی سب سے بڑی طاقت اور فوج سے جموں و کشمیر کے چپہ چپہ پر نبرد آزما ہے۔

سید علی گیلانی بھارت کی کسی جیل میں ہوں یا جموں کے عقوبت خانے میں' وہ کشمیریوں کے دلوں میں بستے ہیں۔ ۶۷ سالہ اس مرد حر کی جرأت' بیباکی' عزیمت اور استقامت نے ملت اسلامیہ کشمیر کو جینے کا نیا انداز سکھایا ہے۔ انشاء اللہ کشمیری مسلمان عنقریب ان کی رہنمائی میں آزادی کی منزل سے ہمکنار ہوں گے۔

○

○

سید ضمیر جعفری

## جلتے چناروں کے نام

وادیٔ کشمیر کے جانباز فرزندو سلام
جہد حق میں اے خدا کے منتخب بندو سلام
سبز دھانو کو دعا' کیسر چناروں کو سلام
زندگی کے خوبصورت شالاماروں کو سلام
شب فروشوں سے یہ صبح ایشیا کی جنگ ہے
یہ فرات عصر پر پھر کربلا کی جنگ ہے
جھیل ڈل کا کھِل سلامت' چشمہ شاہی کی خیر
زعفراں زاروں کی ہر معصوم چرواہی کی خیر
کود جاتے ہو تڑپتی بجلیوں کو تھامنے
مسکراتے ہو برستی گولیوں کے سامنے
رزمگاہوں میں گھگنے کسماتے جھومتے
سامنے ٹینکوں کے ننگے بازوؤں کو چومتے

جسم پر ہر زخم کو پہنا ہے زیور کی طرح
خاک مقتل اوڑھتے ہو ماں کی چادر کی طرح

ظالموں کو ظلم ہی کی انتہا دے گی شکست
بھیم کے رتھ کو زلیخا کی ردا دے گی شکست

اپنے اسلوب تمدن کے مدینے کی یہ جنگ
اپنی چھب کے ساتھ ہر موسم میں جینے کی یہ جنگ

اللہ عزم و ایمان و صلابت کی یہ شان
مائیں خود دیتی ہیں اپنے لاڈلے بچوں کا دان

اپنے خوں کے غسل سے کیسی نکھر جاتی ہے موت
موت کا ڈر ختم ہو جائے تو مر جاتی ہے موت

○

نعیم صدیقی

## بنام کاشمیر

لگ گیا خیمہ عدو کا در دلبر کے قریب
سیل ظلمت ہے کہ پہنچا شہ خاور کے قریب
کس کے جادو کا کرشمہ ہے بتا اے ساقی
مار پیچاں ہیں ہر اک شیشہ و ساغر کے قریب

کون واعظ کو بتائے کہ ہے سرگرم خطاب
آج طاغوت خود آ بیٹھا ہے منبر کے قریب

کیسے گستاخ تنتیے ہیں، سدھائے کس نے
کیوں یہ اڑتے ہیں تری زلف معنبر کے قریب

ہم دل و جاں سے ہیں قتالہ عالم پہ فدا
رکھ دیا ہم نے "گلا" شوق سے، خنجر کے قریب

یاسمین و گل و نرگس! تمہیں معلوم ہے کچھ
چھپ کے بیٹھی ہے خزاں سرو و صنوبر کے قریب

سازشوں کے ہیں کئی جال یہاں پھیلے ہوئے
قصر عالی کے، ہر اک بام کے، ہر، در کے قریب

کاف کشمیر سے تا کاف کراچی، یارو!
ہم مسلمان ہیں پرہول مقدر کے قریب

واں تو مٹی کو پلاتے ہیں شہید اپنا لہو
ہم تقاریر میں پہنچے مہ و اختر کے قریب

ہے یہ تقدیر کا چکر، اسے سنا ہو گا
قتل ہوتا ہے برادر کا برادر کے قریب

جنہیں اسلام پسند آئے، نہ اقبال و جناح
لوگ پہنچے ہیں... وہ مستقبل بدتر کے قریب

بھیڑیوں سے تجھے چھڑوا چکے ہوتے، اے کاش!
اب تو خود ڈوبنے والے ہیں گوادر کے قریب؟!

○

## غلام علی بلبل کاشمیری (لندن)

# لمحوں کا سفر

وقت رخصت وہ بزرگوں کی دعا یاد آ گئی
چشم سلمیٰ میں وہ ساون کی گھٹا یاد آ گئی
التجائے مہر، مریم کی حیا یاد آ گئی
دست نجمہ پر عروسانہ حنا یاد آ گئی
مادر شہر وفا۔ زیب النساء یاد آ گئی
سادہ و بے تاب ماؤں کی صدا یاد آ گئی
موسم گل میں ہزاروں نو بہاروں کا ہجوم
رودباروں، چشمہ ساروں، آبشاروں کا ہجوم
مہ جبینوں، مہ لقاؤں، ماہ پاروں کا ہجوم
آب میں سایہ فگن جلتے چناروں کا ہجوم
کیف برساتی ہوئی آب و ہوا یاد آ گئی
پاک درگاہوں کی :: خاک شفا یاد آ گئی
کتنے گیسو ذہن کے آفاق پر لہرا گئے
کتنے چہرے دھند میں بھی اپنی چھب دکھلا گئے
وہ زمانے وقت کے دریا میں بہتے آ گئے
"گلمرگ" کے مست بادل مستیاں برسا گئے

جب ترے مانوس قدموں کی صدا یاد آ گئی
بھیگتی آنکھوں کی وہ روتی دعا یاد آ گئی

آہ اس رنگوں کے مامن پر بلاؤں کا نزول
نوحہ خواں اس کی ہوائیں' دل گرفتہ اس کے پھول
زرد پتوں کی طرح ہیں زرد زہرا و بتول

.............. ..............

جب ترے مانوس قدموں کی صدا یاد آ گئی!
اپنی اوجھل زندگی کی ہر ادا یاد آ گئی!

○

## نظر زیدی

# بہار میں خزاں کا رنگ

سنہری دھوپ اتری ایشیا کے سبزہ زاروں پر
پیام حریت لے کر صبا مستانہ وار آئی

وہ دور آیا کہ روشن ہو گئی دہقاں کی کٹیا بھی
وہ دن نکلا کہ جو ساعت بھی آئی زر نگار آئی

ہوئے پھر کھیت اور کھلیان اپنے لالہ زار اپنے
عروج اندر عروج آیا' بہار اندر بہار آئی

گلستاں کیا مقدر جاگ اٹھا ریگ زاروں کا
صداقت کے دریچوں سے ہوائے خوشگوار آئی

○

مگر یہ روس کے عفریت اور بھارت کے کچھ بونے
پریشاں لگ رہے ہیں ان حسیں، تازہ فضاؤں سے
مسرت کے ترانوں کی جگہ بندوق کے فائر
سنائی دے رہے ہیں ان کی گندی کارگاہوں سے
یہ واقف ہی نہیں بدلے ہوئے حالات سے شاید
ابھی تک لو، لگی ہے ظلم کے اندھے خداؤں سے
نہ ان کو امن کی خواہش، نہ ان کا عدل سے ناتہ
سہارا چاہتے ہیں سامراجی دیوتاؤں سے

○

ادھر بھارت نے کی ہے جنت کشمیر پر یورش
مسلسل آتش و آہن کی بارش ہے چناروں پر
ادھر روسی درندے چیچنیا پر حملہ آور ہیں
دھواں چھایا ہے کوہ قاف کے رنگیں نظاروں پر
یہ ڈر ہے پھر نحوست کی سیہ راتیں نہ لوٹ آئیں
خزاں کا دور پھر غالب نہ آ جائے بہاروں پر
یہ لازم ہے صفیران چمن اس ظلم کو روکیں!
اٹھیں، ہمت کریں اور پاؤں رکھ دیں ان شراروں پر

○

○

## حفیظ الرحمٰن احسن

# شب دیجور کو آخر سحر انجام ہونا ہے

جہاں میں تابشِ صدق و صفا کو عام ہونا ہے
شہیدانِ وفا کا ذکر صبح شام ہونا ہے

سحر کا نور ہے جو میری پلکوں پر لرزتا ہے
مرے سوزِ نفس کو صبح کا پیغام ہونا ہے

حسیں خوابوں کی جو تعبیر، مقصودِ تمنا ہے
اسی تعبیر کو تقدیرِ خاص و عام ہونا ہے

دلِ محزوں سے کہتی ہے ستاروں کی تنک تابی
شبِ دیجور کو آخر سحر انجام ہونا ہے

جھکانا ہے ثباتِ عزم سے بنیا سیاست کو
اسے ناکام کرنا ہے اسے ناکام ہونا ہے

دبا رکھا ہے دشتِ جبر نے جن بے نواؤں کو
کوئی دن میں انہی کو صاحبِ اکرام ہونا ہے

جو زندانِ ستم میں آج پابندِ سلاسل ہیں
کل ان کو ارمغانِ حریت، انعام ہونا ہے

مئے جور و ستم کی گردشِ منحوس رکنی ہے
صراحی ٹوٹنی ہے اور سقوطِ جام ہونا ہے

خدا کے نام پر مر مٹنے والوں کو فنا کیوں ہو
انہی کا کام رہنا ہے، انہی کا نام ہونا ہے

ابھی اک زندگی ہے اور پہلی موت کے پیچھے
فنا کے دور کو آخر بقا انجام ہونا ہے
بپا ہے آج جن میں کفر کا طوفان ابلیسی
بلند ان وادیوں میں پرچم اسلام ہونا ہے
خدا کے فضل سے پھر جائیں گے دن غم نصیبوں کے
یقیناً ان پہ لطف خاص کا اتمام ہونا ہے
زمین کاشمر اک روز احسن کامراں ہو گی
کہ پاکستان میں اس کا حسیں ادغام ہونا ہے
زمام کار بڑھ کر چھیننی ہے دست ظالم سے
اسی صورت علاج گردش ایام ہونا ہے
کلید کامرانی ہے جہاد فی سبیل اللہ
اسی راز بقاء کا تذکرہ اب عام ہونا ہے

○

منصور ملتانی

## نشاط کرب

کل شب یہ کہہ رہا تھا ستاروں کا کارواں
اب توڑ دوں میں طوق و سلاسل کو بے گماں
اک بار پھر حدیث محبت کروں بیاں

الفاظ کیسے خواب کی تعبیر بن سکیں
محبوب کے جمال کی تفسیر بن سکیں
ہر جذبہ وصال کی تصویر بن سکیں

پھر بھی میں اس کے ذکر سے سرشار ہو گیا
ہر لفظ میرے گیت کا شہکار ہو گیا
میں اس کی خوشبوؤں میں گرفتار ہو گیا

میرے بدن میں دوڑتا پھرتا لہو ہے وہ
لہجہ ہے میرا اور مری گفتگو ہے وہ
صحرائے تشنگی میں مری آبجو ہے وہ

تڑپا ہوں مدتوں میں اسی کے فراق میں
روشن ہے اس کا نام مرے دل کے طاق میں
وہ میری داستاں ہے سیاق و سباق میں

اس کے حسیں وجود کا ہر عکس بے مثال
آنکھوں کے واسطے ہیں حیات اس کے خد و خال
اس کا مرے وجود سے رشتہ ہے لازوال

وہ دلنواز و دلکش و دلدار و دل پذیر
تیرہ شبی کے ماتھے پہ روشن سی اک لکیر
اقلیم عشق کے لئے ہے حسن کا سفیر

یہ حسن بے مثال منزہ ہے پاک ہے
کشمیر جل رہا ہے مگر تابناک ہے

○

گفتار خیالی

## بشارت

سب سڑکیں گلیاں گم سم ہیں
ویران ہیں چھت' چوبارے' گھر
یہ کیا ہے ہر دروازے پر
یہ خوف کا کتبہ کیسا ہے؟
یہ موت کا پہرہ کیسا ہے؟
کشمیر مرے فردوس بریں
یہ کیا ہے سب کچھ کیا ہے یہ
ترے کاہو--- کاجو--- پھگواڑے
کیوں جلتے ہیں؟
ترے آہو--- چیتل اور پاڑے
کیوں جلتے ہیں؟
کیوں آگ ہے یہ بستی بستی یہ پھول ترے
یہ دست شاخ پہ انگارے کیوں رکھے ہیں؟
کیوں ترے فلک سے چاند ستارے غائب ہیں؟
یہ چلتی ہوا کا ماتم کیوں؟
کیوں بال کھلے ہیں پیڑوں کے؟

یہ سبزہ لیٹ کے دھرتی پر کیوں روتا ہے؟

کشمیر مرے کچھ بات تو کر تو کچھ تو بتا

میں حرص و ہوس کے زنداں میں محبوس دلوں کو کہہ دوں گا

ہر غم تیرا۔۔۔ ہر نم تیرا

ہر طول و عرض پہ دنیا کے

لے جاؤں گا میں پرچم تیرا

میں ضربت غیرت لفظوں سے

احساس کو زندہ کر دوں گا

کشمیر مرے غمگین نہ ہو

میں چاند ستارے سب تیرے

تابندہ۔۔۔ پائندہ کر دوں گا

○

## زاہد فخری

# ایک نظم جلتے ہوئے کشمیر کے لئے

زمین راتوں کا خوف اوڑھے

فلک برہنہ سیاہ پرچم

تنے ہوئے ہیں سروں کے پرچم

وہ شاخ پرچم وہ ہاتھ پرچم

مرے چناروں کی ساری شاخیں دھواں دھواں ہیں

شفاف چشموں سے خون دریا ابل رہا ہے

تمہارا کشمیر جل رہا ہے

ہمارا کشمیر جل رہا ہے

تمام کشمیر جل رہا ہے
اے میرے ساتھی ذرا ٹھہر جا
عظیم ماں کو سلام کہہ لوں
ہیں جس کے بیٹے لہو نہائے
ہے جس کا شوہر دیوار پیچھے
نہ رو رہی ہے
نہ ہنس رہی ہے (وطن کے لوگوں کو تک رہی ہے)
مگر نگاہوں میں اک اداسی
وطن کے لوگوں سے کہہ رہی ہے
وطن کے لوگو
ابھی نہ ہنسنا
ابھی نہ رونا
لبوں پہ مہر سکوت رکھنا
گرے لہو کا خراج لینے کے دن یہی ہیں
حساب لینے کے دن یہی ہیں
اے خواب زاروں میں بسنے والو
تمہیں خبر ہے
اسیر جو ہیں، وہ دیکھتے ہیں
تمہارے میلے تمہارے ٹھیلے
کہ ان کی آنکھوں کے سب دریچے کھلے ہوئے ہیں
وہ اپنی نیلی رگوں میں اٹکے
سوال لے کر
عذاب سولی پہ جھولتے ہیں
وہ اپنی وادی کے گرد پھیلی نکیلی تاروں میں جی رہے ہیں
تمام شہروں کے باسیوں کو بشارتیں دو

کہ اپنے آقا کے اونچے محلوں پہ دستکیں دیں
کمندیں پھینکیں
اسے یہ کہہ دیں اگر تمہیں یہ یقیں نہ آئے
کبھی نگاہیں اٹھا کے دیکھو
وہ اندھی آنکھوں، سلی زبانو، کٹے ہوئے بازوؤں سے
اب بھی مذاق اڑاتی عدالتوں میں ڈٹے ہوئے ہیں
وہ آج بھی یک زبان ہو کر یہ کہہ رہے ہیں
وطن کی خاطر جہاد کرنا
گنہ نہیں ہے، گنہ نہیں ہے

○

سردار اسرار ایوب (مظفر آباد)

## کشمیر کے نام

جب خون بہے دریاؤں میں
پر تیرا بدن بے رنگ رہے
جب درد بچھا ہو رستوں میں
تو محو رباب و چنگ رہے
جب شور مچا ہو دنیا میں
تو ساکت و بے آہنگ رہے
برپا ہو جنگ آزادی
تلوار پہ تیری زنگ رہے
جب ایسی ساعت آتی ہے
اک پل میں صدی کٹ جاتی ہے

○

## آل عمران

### کشمیر

اے لخت خلد --- ارض کاشمیر --- یہ بتا مجھے

تیری حسین بستیوں سے --- ادھ کھلے محبتوں کے

پھول کون لے گیا؟

بہار ساز وادیوں کے گنگناتے آبشار

وہ سبز ٹہنیاں حسیں بلند پیڑ سایہ دار

یہ گنگناتے پانیوں کے ہونٹ کس نے سی دیئے

یہ کس نے جگنوؤں کے گھر سپرد تیرگی کئے

ضیائے صبح چھین کے یہ کون شام دے گیا

یہ کون ہے جو روشنی کو شب کا نام دے گیا

یہ کون ہے جو وقت سے ہوائیں چھین لے گیا

یہ کون ہے سروں سے جو ردائیں چھین لے گیا

سنو بغور منصفو........

وہ وقت آ گیا ہے اب

قدم اکھڑ رہے ہیں دیکھ ------- نفرتوں کی دھوپ کے

چھٹے گی جب یہ دھوپ تو چمن کا روپ دیکھنا

یہ نرگس و گلاب کی پھبن سروپ دیکھنا

نئے جنم کی تتلیاں --- تمازتوں میں پرفشاں

خوشی کے گیت گائیں گی

محبتوں کی تھاپ پہ

ہوائیں جھوم جائیں گی

شہر میں مضموں نہ پھیلا...
ساقی کی غزل پر ایک دلچسپ بحث

"معاصر" کے گذشتہ شمارے میں ساقی فاروقی کی ایک غزل
پہ عروض کے حوالے سے ایک دلچسپ بحث شائع ہوئی تھی جو احمد ندیم
قاسمی، مشفق خواجہ اور ساقی فاروقی کی خط و کتابت پر مشتمل تھی۔
اب اس بحث میں خورشید رضوی بھی شامل ہو گئے ہیں
لگتا ہے یہ بحث اپنے اختتام کو پہنچنے والی ہے، تاہم اگر کوئی دوست اس
مکالمے کو آگے بڑھانے کے خواہشمند ہوں تو ان کے لئے "معاصر" کے
صفحات حاضر ہیں۔ (ادارہ)

## مکرمی جناب ساقی فاروقی صاحب'

سلام مسنون!

امید ہے مزاج گرامی بخیر ہوں گے۔ "معاصر" میں آپ کا زور قلم دیکھ کر آپ سے ملاقاتوں کی یاد تازہ ہوتی رہتی ہے۔ یہ زور اتنا ہے کہ "اور زیادہ" کی دعا مناسب معلوم نہیں ہوتی۔ تازہ شمارے میں آپ کی غزل پر عروضی بحث پڑھتے پڑھتے اونگھ گیا۔ عالم خواب میں مرزا نوشہ کی زیارت ہوئی۔ ایک لفافہ مجھے تھمایا اور مسکراتے ہوئے چلے گئے۔ آنکھ کھلی تو یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ عین وہی لفافہ' بالفعل سرہانے دھرا ہے۔ سرنامے پر اپنا نام دیکھ کر خوشی سے پھولا نہ سمایا۔ مرزا کا سواد تحریر آنکھوں سے لگایا۔ پڑھا تو بیشتر ذکر آپ کا تھا۔ اب اصل کو تو تبرک جان کر محفوظ کر لیا ہے۔ عبارت اپنے ہاتھ سے نقل کر کے رکھ لی ہے۔ اسی کا عکس آپ کی خدمت میں ارسال کر رہا ہوں۔ وصولی سے مطلع فرمایئے۔

مشفقی مشفق خواجہ صاحب کے جواب میں آپ کی بعض توجیہات سے--- (مثلاً "متموج محیط آب" کے باب میں)--- روشن ہوا کہ

ہے پر مرغ تخیل کی رسائی تا کجا

تاہم مرزا نوشہ نے آپ سے اتفاق نہیں کیا۔

مرزا کے بلیغ ارشادات کی روشنی میں میں بھی سوچ میں پڑ گیا کہ جب آپ کی غزل کی بحر--- (اردو میں غیر مروج اور نامانوس ہی سہی)--- علم العروض کے طے شدہ قواعد کے مطابق بسہولت بحر رجز میں سما سکتی ہے تو پھر اسے خواہ مخواہ بحر بسیط میں ڈالنے کی کیا ضرورت پیش آئی؟

چند ضمنی سوالات اور بھی ذہن میں پیدا ہوئے مثلاً:

(۱) بحر بسیط میں "فا ؟" کو "مفاعلن" بنانا آپ نے اپنا "اجتہاد و اختراع" تو بخوشی قرار دے لیا

لیکن اسے "تصرف و ایجاد" کہنے پر آپ کو اعتراض ہوا۔ یہ کیوں؟

(۲) لفظ "سالم" سے آپ کیا مراد لیتے ہیں؟ کوئی بحر اس وقت تک سالم کہلاتی ہے جب تک اس میں کوئی زحاف نہ آئے۔ جب آپ نے ایک خود ساختہ زحاف بحر بسیط میں ڈال ہی دیا تو پھر لازم ہے کہ اس زحاف کا کوئی نام بھی رکھیں اور اسی کی نسبت سے بحر کو بھی موسوم کریں۔ مثلاً بحر رجز (زیر بحث) میں اگر زحاف (طی) آتا ہے تو وہ "مطوی" کہلاتی ہے اور "خبن" آتا ہے تو "مخبون"۔ اسی نمونے پر اگر بالفرض آپ اسے اپنے اختراع کردہ زحاف کا نام "خبط" تجویز فرمائیں تو اسی کی نسبت سے اسے بحر بسیط مثمن "مخبوط" کہیے۔ "سالم" کہنے کا کیا جواز ہے؟

(۳) لفظ "پارس" پر "نوراللغات" کے حوالے سے روشنی ڈالنے کے بعد آپ نے "پارس و شا" کے ٹکڑے کو وزناً "مستفعلن" قرار دیا ہے اور قیامت کی آمد کا مژدہ سنایا ہے۔ بصد ادب عرض ہے کہ "پارس" میں حرف سوم کو خواہ ساکن مانئے خواہ متحرک، اس ٹکڑے کا وزن اس وقت تک "مستفعلن" نہیں ہو سکتا جب تک مشفق خواجہ صاحب کے کہنے کے مطابق عطف کی واؤ کو بھی متحرک کر کے "وشام" بروزن "کلام" نہ پڑھا جائے۔ کیا آپ اسی طرح پڑھتے ہیں؟

(۴) ایسے سوالات کی گنجائش ہوتے ہوئے آپ کا یہ ارشاد کہاں تک بجا ہے کہ "... ہماری اصلی بحث جو غزل کی بحر کے بارے میں تھی اپنے فطری اختتام کو پہنچی" (خصوصاً جبکہ بحر بسیط زبان حال سے فریاد کناں ہے کہ اس کے ساتھ جو سلوک ہوا سراسر غیر فطری ہے۔)

خیر میری کیا بساط جو ان مباحث کو طول دوں۔ علم عروض سے میرا تعلق واجبی سا ہے اور وہ بھی کسی سے زیادہ وہبی--- (آپ کی اصطلاح میں "خلقی") آپ مرزا کا خط پڑھئے۔

والسلام والاکرام

خورشید رضوی

۲۶ دسمبر ۱۹۹۴ء

نقول بنام:

(۱) مدیر "معاصر"

(۲) شرکائے بحث

## روشنی دیدہ غالب خورشید رضوی کو غالب رفتہ کی دعا پہنچے

بھائی، میں نہیں جانتا کہ تم کو مجھ سے ارادت اور مجھ کو تم سے اتنی محبت کیوں ہے۔ ظاہرا" معاملہ عالم ارواح ہے۔ اسباب ظاہری کو اس میں دخل نہیں۔ تم کو علم نہیں جب میرا کلام، اردو اور فارسی، جی لگا کر پڑھتے ہو، میں پاس کھڑا سنتا ہوں۔ اور اپنے کلام سے بڑھ کر تمہارے سر دھننے پر سر دھنتا ہوں۔ عالم ارواح میں یہی آسانی ہے۔ خود اپنی طبیعت کی موج تخت سلیمانی ہے۔ آب و گل کی زندگانی میں جس قدر سفر میں نے کئے سب گراں جانی سے عبارت تھے۔ اب جہاں چاہوں سبک جاتا ہوں۔

زہے روانی عمرے کہ در سفر گزرد

ابھی کچھ دن ہوئے لندن کی سیر دیکھی۔ کس واسطے، کہ جب سے کلکتہ گیا تھا فرنگی خوبرویوں کی عشوہ طرازیوں کی یاد پیکان شکستہ کی طرح دل میں خلش کرتی تھی۔ ساقی بزم آگہی سے میرا سوال و جواب تم کو یاد ہو گا۔

گفتم ایں ماہ پیکراں چہ کس اند
گفت خوبان کشور لندن
گفتم ایناں مگر دلے دارند
گفت دارند لیک از آہن

اب جو لندن پہنچا تو ان غارت گران ایمان و آگہی کو پہلے سے بڑھ کر دلستان و صبر آزما پایا۔ مگر تم جانتے ہو میرا مسلک یہ ہے کہ مصری کی مکھی بنو، شہد کی مکھی نہ بنو۔ گھڑی دو گھڑی جی بہلایا۔ بعد اسی کے قصد واپسی کا تھا کہ سر راہ تمہارے محبوب ثانی، محمد اقبال لاہوری سے ملاقات ہو گئی۔ یہ عزیز مجھ کو بھی بہت عزیز ہے۔ ریختہ و دری میں میری نکالی ہوئی طرز و روش کو اگر کسی نے سنبھالا تو اسی برہمن زادے نے۔ کچھ گفتگو اس کی مجھ سے فلک مشتری پر رہی تھی۔ مگر اس وقت ایک خاتون ساتھ تھی، کھل کر بات نہ ہو سکی۔ قیاس ہے کہ اب وہ کچھ کہنا چاہتا تھا کہ ناگاہ ایک دروازہ کھلا اور گورا چٹا ایک شخص اس میں سے نکلا۔ داڑھی گھٹی ہوئی، چمپئی رنگ، مجھ کو اپنی جوانی یاد آئی۔ آتے ہی قدم بوسی کی اور ایک شعر میرا اور ایک عزیز اقبال کا پڑھ کر مصر ہوا کہ اندر چلیں۔ اب اس کا گمان ہے کہ ہم نے دروازے کی گھنٹی بجائی تھی۔ **لاحول ولاقوۃ** یوں بن بلائے کی دستک کہیں شرفاء کا شیوہ ہے۔ مگر خیر آدمی دل کا برا نہیں۔ خوب خاطر مدارات

کی۔ اقبال کی گود میں اس نے ایک بلی بٹھا دی اور میرے لئے ایک جام انگریزی شراب کا لایا۔ میرا مدعائے دلی بر آیا۔ گو چھال کی شراب نے ہمیشہ مجھے مضرت کی۔ اب جو اس عزیز نے کہ ساقی کہلاتا ہے اپنے نام کی شرم کی' میرے دل سے دعا نکلی۔ لیکن سچ پوچھو تو وہ "ساقی" سے بڑھ کر "مستی" ہے۔ تم عربی کے دلدادہ ہو اسی واسطے یہ لغت "مستی" بفتح میم' بصیغہ اسم مفعول لکھ دیا۔ ورنہ عوام "ہادی" سے "مہدی" جانیں تو جانیں' "ساقی" سے "مستی" نہیں پہچانتے۔ "مستی" اس لئے کہ جس وقت میرے لئے ایک جام لایا' کم از کم دو خود چڑھا کر آیا۔ اقبال کی گود میں بیٹھی ہوئی بلی جو خواب دیکھتی تھی' عالم سرخوشی میں کچھ ویسے ہی اسے دکھائی دیئے۔ بھلا میں اور اقبال رنڈیوں اور ڈومنیوں کی باتیں یوں اپنے خوردوں سے کرتے ہیں اور یوں' راہ چلتے' ہر کس و ناکس کو خرقہ و سجادہ تقسیم کرتے ہیں۔ ایک غزل بھی سنایا گیا۔ لیکن سچ یہ ہے کہ قافیہ پیمائی تھی معنی آفرینی سے تھی۔ اقبال نے تو خاموشی اختیار کی' میں نے داد دی۔ کچھ بپاس مروت' کچھ اس لئے کہ بحر رجز مثمن مطوی مخبون' مفتعلن مفاعلن' مفتعلن مفاعلن کے عام آہنگ سے ہٹ کر مستفعلن مفاعلن' مستفعلن مفاعلن میں پانچ شعر اس نے نکالے۔ رسم و رہ عام سے ہٹنا مجھ کو ہمیشہ پسند رہا۔ تم کو معلوم ہے بحر رجز عربی الاصل ہے اور مستفعلن مستفعلن کی تکرار ہی اس کے اصلی ارکان ہیں۔ فصحائے زبان تازی کے ذوق میں مستفعلن اور مفاعلن یکجا درست ہے۔ مگر یہ بحر ان کے ہاں زنہار مثمن نہ دیکھو گے۔ یہ خاص اہل عجم کا ایجاد ہے۔ ریختہ گویوں نے انھیں سے لیا۔ مستفعلن اور مفاعلن یکجا اس میں لانے کا شعرائے فارس و ریختہ کے ہاں رواج نہیں' میں بھی نہیں لایا۔ ساقی نے شعر تازی کا آئین تازہ کیا' ہرچند کہ ساعت پر گراں گزرا' میں نے پسند نہ کیا۔ مگر اب جو اس کا یہ کہنا ہے کہ میں نے رجز میں غزل لکھی ہی نہیں' بحر بسیط مثمن سالم کے رکن فاعلن میں میم بڑھا کر مستفعلن مفاعلن' مستفعلن مفاعلن میں لکھی ہے' یہ عذر گناہ بدتر از گناہ ہے۔ واہ کہاں سے ہاتھ پھرا کر ناک پکڑی ہے۔ بھائی سیدھی بات کیوں نہیں کہتا کہ میں نے بحر رجز کے اصلی رکن مستفعلن کو برقرار رکھ کر رجز مثمن مخبون میں غزل کہی ہے' مطوی رکن نہیں لایا۔ اس پوچ اضافے سے کیا حاصل اور بحر بسیط میں غوطہ مارنا کیا ضرور۔

ہرزہ مشتاب' پے جادہ شناساں بردار

اے کہ در راہ سخن چوں تو ہزار آمد و رفت

اس روز شراب کے نشے میں میرے اور اقبال کے شعروں کو لکا لکا کر پڑھتا رہا۔ اب اس کو وہم ہو گیا ہے کہ ہم نے اسی بحر میں پڑھ کر سنایا۔ مجھ پر لعنت ہو اگر میں نے یوں پڑھا ہو۔ "بوسے کو پوچھتا ہوں میں" "مصر و حجاز" "ایسی نماز" "ایسے امام" سب کو کھینچ کھینچ کر "مستفعلن" بنایا گیا۔ حالانکہ ان سب میں حروف علت' کیا واؤ' کیا یائے تحتانی' دبے ہوئے ہیں' نہ کشیدہ۔ اور وہی مفتعلن مفاعلن کا وزن ہے۔ خیر اس کا بھی تحمل کیا۔ مگر جب اس نے میرا مصرع

موج' محیط آب میں مارے ہے دست و پا کہ یوں

پڑھا اور "موج محیط" بکسرۂ اضافت پڑھا تو میرے لئے ماہی بے آب کی طرح تڑپ کر یکایک چلے آنے کے سوا کیا چارہ تھا؟

میں مانع فسق و فجور نہیں۔ عاصی' روسیاہ' عمر بھر بادہ خواری کی۔ لیکن نہ بایں قدر کہ مضاف اور مضاف الیہ میں فرق نہ کر سکوں' اپنے خواب و خیال کو دوسروں کے سر تھوپا کروں۔ میاں الطاف حسین گواہ ہیں کہ رات کو سوتے وقت کسی قدر پیتا تھا اور ایک خاص مقدار سے زیادہ زنہار نہ پیتا تھا۔

خیر صاحب' مجھ کو کسی کی کمی بیشی سے کیا کام۔ اس سے زیادہ نہ مجھ کو علم نہ یارائے کلام۔ دعویٰ اجتہاد نہیں' بحث کا طریقہ یاد نہیں۔ جو جس کا جی چاہے کہے اور کرے۔

غالب

○

جان ساقی' خورشید رضوی

تمہیں شاید علم نہیں کہ ہندوستانی رسالوں میں ایک اور صاحب تمہارے نام سے لکھنے لگے ہیں' ان کی اکی دکی غزلیں ادھر ادھر دیکھیں مگر تمہاری غزلوں والی بات نظر نہ آئی۔ گویا اب تین "ظفر اقبال" دو "مجتبیٰ حسین" دو "سلیم الرحمٰن" اور دو "خورشید رضوی" اہل اردو کو الجھن میں ڈالنے کے لئے پیدا ہو گئے ہیں۔ ایک زمانے میں دو اختر انصاری تھے' پبلک کے بے حد اصرار پر چھوٹے نے "اکبر آبادی" کا دم چھلا بڑھا لیا تھا۔ یہ سب اس لئے لکھ رہا ہوں کہ تمہارا خط دیکھ کر ذہن دونوں طرف گیا تھا مگر "معاصر" میں تمہاری اچھی سی غزل دیکھ کر اور پتے پر لاہور دیکھ کر میں سمجھ گیا کہ تم وہی کم گو سنجیدہ لیکچرار ہو جس سے میں ۱۰' ۱۲ سال پہلے سرگودھا میں ملا تھا۔

"سب سے پہلے تو مجھے کہنے دو کہ تمہاری دلچسپ تحریر سے بہت بہت محظوظ ہوا۔ تم نے لکھا کہ "معاصر میں آپ کا زور قلم دیکھا... یہ زور اتنا ہے کہ "اور زیادہ" کی دعا مناسب معلوم نہیں ہوتی" تو میری جان' یہ بخیلی کیوں؟ آدمی اپنے چھوٹوں کو ہی نہیں بلکہ اپنے بڑوں کو بھی دعائیں دے سکتا ہے۔ اگر میرے قلم میں تھوڑی سی اور تیزی آ جائے تو اردو ہی کا فائدہ ہو گا کہ مرنے سے پہلے میں کئی مردوں کو دفنانا چاہتا ہوں۔

تم کہتے ہو "تازہ شمارے میں آپ کی غزل پر عروضی بحث پڑھتے پڑھتے اونگھ گیا۔" ادب پڑھتے وقت وہ کام نہ کیا کرو جو اپنی کلاس میں اپنے طلباء کے سامنے کرتے ہو۔ ورنہ تم میں اور انور سدید میں کیا فرق رہ جائے گا کہ وہ عزیز تیس برس سے اوندھا ہو کر اونگھ رہا ہے۔ ہاں یاد آیا۔ شاید تم مشفق خواجہ کے اس فقرے پر اونگھے "قاسمی صاحب کو خوش فہمی یا غلط فہمی ہوئی ہے" پھر تو تمہارا اونگھنا جائز ہے۔ اس لئے کہ میں تو اپنی فتح یابی میں منکسرالمزاج رہا لیکن وہ اپنی شکست میں کریم النفس نہ بن سکا۔ اصل میں سارا قصور میری ہجرت کا ہے۔ جب میں پاکستان اور ہندوستان کا دورہ کرتا ہوں تو یہ دیکھ کر بڑی خوشی ہوتی ہے کہ تمام ادباء اس کے سامنے دو زانو بیٹھے ہوتے ہیں۔ بس ایک میں ہوں جس کے سامنے یہ دو زانو بیٹھتا ہے۔ (یہ بات میں ایک خط میں اسے لکھ چکا ہوں اور اس کی کاپی احمد ندیم قاسمی کو بھیج چکا ہوں) اسی لئے اس کی عادتیں بگڑ گئی ہیں۔ میں اپریل میں کراچی جا رہا ہوں اور حسب دستور جب یہ میری دعوت کرے گا (یا اگر اس نے اجازت دی تو... جب میں اس کی دعوت کروں گا) تو اس کی زوجہ اور اپنی بہن آمنہ' اس کے بھائی طارق خواجہ' اپنی بہن شاہدہ اور اپنے بہنوئی عبدالحق کے سامنے ذلیل کرنے کی کوشش کروں گا کہ خاندانی بے عزتی ادبی بے عزتی سے بہتر چیز ہے۔ دعا کرو (کنجوسی سے کام نہ لو) کہ ناداں ڈاکٹروں نے شراب چھڑوانے کے لئے یہ جھوٹ بھی بولنا شروع کر دیا ہے کہ جگر پر ورم آ گیا ہے۔ تم سے سچ کہتا ہوں کہ مجھے تو جگر وگر کی کوئی تکلیف کبھی نہیں ہوئی۔ ہاں جب سے پائپ بحال ہوئی ہے تو کبھی کبھی دل میں اور حلق میں تکلیف ضرور ہوتی ہے۔ پچھلے دو برسوں میں یہ واقعہ ۲ بار ہوا۔ ہر دفعہ اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر میں نے نہایت بلند آواز میں ملک الموت کو ڈانٹا "واپس جا سالے' ابھی نہیں آؤں گا۔ ابھی دس بیس نظمیں اور لکھنی ہیں۔ ابھی دس بیس کی ماں بہن اور کرنی ہے۔" ہر بار وہ خوفیا کے بھاگ گیا۔ دیکھو یہ دھونس کب تک چلتی ہے۔ میں نے بھی طے کر رکھا ہے کہ جب تک بدن کا ہر عضو' (رئیس و

ضیعف) سڑ گل نہیں جاتا' لڑتا بھڑتا رہوں گا۔

تم کہتے ہو کہ "جب آپ کی غزل کی بحر علم العروض کے طے شدہ قواعد کے مطابق . سہولت .بحر رجز میں سما سکتی ہے تو پھر اسے خواہ مخواہ .بحر بسیط میں ڈالنے کی کیا ضرورت تھی؟" پھر تم نے مرزا نوشہ سے بھی کہلوایا کہ "بحر رجز عربی الاصل ہے اور مستفعلن مستفعلن کی تکرار ہی اس کے اصلی ارکان ہیں۔" گویا یہ کہ عزیزی خورشید رضوی اور مکرمی میرزا نوشہ دونوں اس بات پر متفق ہیں کہ .بحر رجز میں بھی میری غزل کے پانچوں اشعار یا دسوں مصرعے پڑھے جا سکتے ہیں۔ یہ بات تمہیں مشفق عرف محقق خواجہ کو لکھنی چاہئے تھی نہ کہ مجھے۔ خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ تم دونوں (نوشہ و خورشید) میری تائید کر کے میرے فقروں سے صاف صاف بچ گئے ورنہ ایسے لتے لیتا کہ مشفق خواجہ بنا دیتا۔ لیکن راہ فرار (Escape Route) کی تلاش میں چونکہ تم ابھی مشفق نہیں بن پائے (خورشید ہنوز اس کے برابر نہ ہوا تھا۔ غالب) اس لئے چشم پوشی اختیار کرتا ہوں۔

تم نے میرزا کو خواہ مخواہ کانٹوں میں گھسیٹا یہ کہلوانے کے لئے کہ رجز کے ہوتے ساقی نے بسیط میں کیوں پناہ لی "واہ کہاں سے ہاتھ پھرا کر ناک پکڑی ہے۔" تو اب اپنا دایاں ہاتھ پھرا کر گردن کے پیچھے سے بایاں کان پکڑو اور اس وقت تک پکڑے رہو جب تک مندرجہ پیراگراف نہ پڑھ لو۔

جب مجھے تجربہ کرنا ہی تھا تو میں رجز کیوں اختیار کرتا جس کے چاروں ارکان مستفعلن ہیں (مستفعلن مستفعلن مستفعلن مستفعلن) بسیط سے استفادہ کیوں نہ کرتا جس کا ہر دوسرا رکن فاعلن ہے (مستفعلن فاعلن مستفعلن فاعلن) پہلی صورت میں مجھے دوسرے اور چوتھے ارکان کو بالکل دربدر کر کے دونوں جگہوں پر مفاعلن کو بسانا پڑتا۔ دوسری صورت میں مجھے صرف یہ کرنا پڑا کہ پہلے اور تیسرے سباعی (ہفت حرفی) ارکان کو جوں کا توں رہنے دیا (بالکل عربی الاصل رجز کی طرح) اور دوسرے اور چوتھے خماسی (پنج حرفی) بنا دیا۔ میں نے کوئی اتنا بڑا تیر نہیں مارا تھا کہ اسے "تصرف و ایجاد" کہتا اس لئے نسبتاً کم برقی یا نیم برقی الفاظ "اجتہاد و اختراع" پر قناعت کی کہ "تصرف و ایجاد" میں انانیت کی بو ہے۔ تم نے لکھا "آپ کا یہ ارشاد کہاں تک بجا ہے کہ "ہماری اصلی بحث جو غزل کی بحر کے بارے میں تھی اپنے فطری اختتام تک پہنچی' جب کہ .بحر بسیط زبان حال سے فریاد کناں ہے کہ اس کے ساتھ جو سلوک ہوا سراسر غیر فطری ہے۔" اگر

ہو سکے تو دوبارہ (میری توجیہ کی روشنی میں) غور کرو اور اپنے فقرے کی بے بصارتی اور بے بضاعتی پر شرمندہ ہونے کی کوشش کرو۔ ہاں تمہاری یہ بات بالکل درست ہے کہ مجھے سالم نہیں لکھنا چاہیے تھا کہ میں نے ایک زحاف بڑھا دیا تھا۔ اسے سہو قلم کہو۔ مجھے صرف "بحر بسیط مثمن۔۔۔" لکھنا تھا نہ کہ "بحر بسیط مثمن سالم۔" میں نے تمہارے کہنے پر اب "سالم" نکال دیا ہے۔ تم اگر اختراع کرتے تو شاید اس کا نام "بحر بسیط مثمن منحوس" رکھتے۔ میں اسے "بحر بسیط مثمن مشروط" کہوں گا مگر اپنی کتاب میں صرف یوں کر دوں گا "بحر بسیط مثمن۔۔۔" تم نے بے وجہ انکساری برتی کہ اصول افاعیل پر تمہاری نظر شد بد سے کہیں زیادہ ہے۔ اگر تم اعتراض کی کلغی پہن کر جلد بازی میں ہد ہد نہ بن جاتے اور فقرہ اڑانے سے پہلے یہ بھی دیکھ لیتے کہ اپنے دونوں طویل خطوں میں (قاسمی کے نام' خواجہ پیا کے نام) جہاں دو تین بار "سالم" لکھ گیا ہوں وہاں دو تین بار حرف "بحر بسیط" یا "بحر بسیط' زحافات کی تبدیلیوں کے بعد" بھی لکھا ہے تو میرے دل میں تمہاری عزت اور بڑھ جاتی۔ چونکہ زحافات والی بحروں کے نام شیطان کی آنت کی طرح لمبے ہوتے ہیں اس لئے انہیں نقل کرتے ہوئے انگلیاں دکھنے لگتی ہیں۔ مثلاً یہ نام دیکھو' رونے کو جی چاہتا ہے:

بحر ہزج مثمن اخرب مکفوف مقصور محذوف

اسی عذاب سے بچنے کے لئے قاسمی صاحب شروع میں ہی بھاگ گئے۔ ہرچند کہ مشفق خواجہ (ذلیل ہونے کے لئے) اور ساقی فاروقی (ذلیل کرنے کے لئے) اس بحث میں آخر تک ڈٹے رہے۔

تم نے سوال اٹھایا ہے کہ (آپ کا ارشاد کہاں تک بجا ہے کہ ہماری اصلی بحث جو غزل کی بحر کے بارے میں تھی اپنے فطری اختتام تک پہنچی۔" تو جان من یہ حتمیت اس لئے تھی کہ دنیا کا کوئی عروض داں یہ تو ثابت کرنے سے رہا کہ ساقی سے سہو ہوا ہے۔ اگر ثابت کرنے کی کوشش کرے بھی تو منہ کی کھائے گا کہ میں منہ کی کھلاؤں گا۔ تم نے بھی یہی لکھا ہے ناکہ بحر بسیط کی کیا ضرورت تھی یہ بات تو بحر رجز سے بھی ثابت کی جا سکتی ہے۔ تو اس کے بعد مزید لکھنے کی کیا گنجائش رہ جاتی ہے۔ تم ہی بتاؤ۔۔۔؟

اصلی بحث اور فروعی بات میں تمیز ضروری ہے۔ اس لئے اصلی بحث کی سیڑھیوں سے اتر کر ضمنی توجیہ کے برآمدے (برآمدہ) میں آ پہنچا ہوں۔ اگر تم میرے خطوط کو پڑھنے میں تساہل نہ برتتے تو مجھے اپنے ہی کلیشے میں قے کرنے کی ضرورت محسوس نہ ہوتی۔ میں

اپنے کلیدی فقرے دوبارہ نقل کر رہا ہوں:۔

ا۔ غالب اور اقبال غریب خانے پر اس لئے نہیں آئے تھے کہ وہ مجھے رجز اور بسیط کا فرق بتائیں بلکہ انہیں اس لئے مدعو کیا گیا تھا کہ ان کی بحر رجز میں لکھی گئی غزلوں کے بعض مصرعوں کی تقطیع بحر بسیط میں بھی کی جا سکتی ہے' بالکل اسی طرح جس طرح بحر بسیط میں لکھی ہوئی میری غزل کے بعض مصرعوں کی تقطیع بحر رجز میں بھی کی جا سکتی ہے۔

۲۔ میں نے نہایت عیاری سے صرف انہی مصرعوں کا حوالہ دیا تھا جن کی تقطیع دونوں بحروں میں کی جا سکتی ہے۔

۳۔ یہ نہ بھولو کہ یہ مصرعے (دو غالب کے دو اقبال کے) میں نے غزلوں سے الگ کر کے نہایت چابک دستی سے اپنی مدافعت میں استعمال کئے ہیں (حالانکہ اس کی بالکل ضرورت نہ تھی کہ میں بحث میں سرخرو ہو چکا تھا مگر خوباں سے چھیڑ جائز سمجھتا ہوں۔)

آخر آخر میں تمہارا یہ فقرہ کہ "بصد ادب عرض ہے کہ "پارس" میں حرف سوم کو خواہ ساکن مانئے خواہ متحرک' اس ٹکڑے کا وزن اس وقت تک مستفعلن نہیں ہو سکتا جب تک مشفق خواجہ صاحب کے کہنے کے مطابق عطف کی واؤ کو بھی متحرک کر کے وشام بر وزن کلام نہ پڑھا جائے۔ کیا آپ اسی طرح پڑھتے ہیں؟ اس کا سیدھا جواب ہے کہ جی نہیں۔ مگر تقطیع میں چونکہ متحرک کو ساکن اور ساکن کو متحرک کر سکتے ہیں اور کر لیتے ہیں (دیکھو میرے خطوط) اس لئے یہاں واؤ کو تقطیع کے لئے متحرک بھی کیا جا سکتا ہے۔ یہ بھی یاد رکھو کہ بانیان عروض خلیل ابن احمد (پارسی) اور ابوالحسن اخفش (عربی) کی تمام موشگافیوں کے باوجود ہندی پنگل نے بھی ہماری بحروں کی رگوں میں اپنا پارا دوڑایا ہے۔

جیتے رہو کہ تم نے میرزا کی زبان میں خوب خوب شوخی دکھائی ہے۔ میری روح کی طرح ان کی روح بھی خوش ہوئی ہوگی۔

ہو سکے تو اپنی تازہ غزلیں بھیجو۔ تقطیع کے لئے نہیں توصیف اور تنقید کے لئے' خدا کرے تم خوش رہو۔

خبردار جو عروض پر بات کی کہ میں الرجک ہو گیا ہوں۔

پیار دلار

تمہارا ساقی

۹۵-۱-۱۰

مکرمی جناب ساقی فاروقی

آپ کا خط ملا۔ پڑھ کر گہری اور سچی مسرت کا احساس ہوا۔ وہ اسی لئے کہ آپ نے میرے خط کو اسی محبت سے وصول کیا جس کے اعتماد پر وہ لکھا گیا تھا۔

آپ کی صحت کی طرف سے تشویش ہو گئی۔ خدا کرے آپ سلامت رہیں اور ملک الموت پر آپ کی دھونس ہزار برس کارگر رہے۔ ڈاکٹر جھوٹے اور مکار ہی سہی لیکن آپ ان کی سن ہی لیں اور "جگر صاحب" کا بھی خیال رکھیں۔

اگرچہ آپ نے پس نوشت میں مجھے خبردار کیا ہے کہ عروض پر بات کرنے کی اجازت نہیں لیکن چند باتیں اگر نہ کروں تو یہ گفتگو اپنے فطری اختتام کو نہیں پہنچ سکتی۔ لہٰذا کروں گا خواہ آپ، ملک الموت کی طرح، مجھے بھی ڈانٹ ہی کیوں نہ پلائیں۔

۱۔ جیسا کہ خورشید و نوشہ واضح کر چکے ہیں آپ کی غزل کے دس کے دس مصرعے سونے کی تول "مستفعلن، مفاعلن، مستفعلن، مفاعلن" پر پورے اترتے ہیں۔ کوئی رکن بھی خارج از وزن چوتھے رکن سے ہمدردی تھی کہ وہ در بدر نہ ہو جائیں اور ان کی جگہ "مفاعلن" کو نہ بسانا پڑے۔ واضح رہے کہ اس کا گھر اللہ نے بسا رکھا ہے۔ یہ پہلے ہی "مستفعلن" کی جگہ لیتا رہتا ہے اور اس بحر میں لیٹا رہتا ہے۔ دراصل اس نالائق نے فقط بھیس بدل رکھا ہے۔ اصل میں یہ "متفعلن" ہے۔ یعنی "مستفعلن" کا دوسرا حرف ساکن "س" ساقط ہو گیا ہے۔ اور اس کو عروض کی اصطلاح میں "خبن" کہا جاتا ہے۔ (ان اصطلاحات پر آپ کو بجا طور پر رونا آتا ہے۔ آ عندلیب مل کے کریں آہ و زاریاں)۔ "متفعلن" کو "مفاعلن" اس لئے کہہ لیتے ہیں کہ وزن میں برابر ہے اور شکل صورت میں زیادہ معقول ہے اور اس پر رونا کم آتا ہے۔

۷۔ آپ کو شاید یہ خیال نہیں رہا کہ آپ سے جھگڑا اس "مفاعلن" کے سبب سے نہیں کیا گیا۔ بلکہ اس سبب سے کیا گیا ہے کہ آپ نے پہلے اور تیسرے "مستفعلن" کا حلیہ بگاڑ کر اسے "مفتعلن" کیوں نہیں بنایا۔

۸۔ میں صرف اس بات پر آزردہ ہوں کہ ہیرو نے یہاں کراٹے کا سیدھا ہاتھ کیوں نہیں دکھایا۔ گھر جا کر ایک بھدا سا ڈنڈا کیوں نکال لایا۔ آپ دو حرفی جواب دے کر سرخرو ہو سکتے تھے نہیں۔ لہٰذا بنیادی طور پر اس غزل پر اعتراض درست نہیں۔

۲۔ آپ کا یہ موقف بھی بجا ہے کہ اگر کسی منظومے کے چند مصرعے اس کی اصل بحر کے علاوہ کسی اور بحر میں بھی پڑھے جا سکتے ہوں تو یہ امر ہرگز محل اعتراض نہیں۔

۳۔ آپ کی غزل عروض کے مسلمہ قواعد کے تحت "بحر رجز مثمن مخبون" میں ہے جو اردو اور فارسی میں نامانوس ضرور ہے لیکن اس میں کوئی عروضی خلل نہیں۔

۴۔ آپ نے اس غزل کو ناحق بحر بسیط میں ڈالا۔ یہ عروضی اعتبار سے بالکل بے محل ہے۔

۵۔ اگر یہ اجتہاد ہے تو بے ضرورت ہے۔ یوں جیسے کوئی شخص پھر سے پہیہ "دریافت" کرے اور اس کا نام کچھ اور رکھے۔ یا جیسے آپ فیصلہ کر لیں کہ "لاہور" سے "ل" اور "ہ" خارج کر کے "پ" اور "ش" لگائیں گے اور آئندہ اسے "پشاور" کہا کریں گے۔ ظاہر ہے کوئی آپ کو ایسا کرنے سے روک تو نہیں سکتا لیکن آپ کے خطوط "پشاور (ساقی والا)" لکھنے کے باوجود "خورشید رضوی" کے بجائے (خاطر غزنوی" کو پہنچتے رہیں گے۔ (اور اگر پوسٹ ماسٹر کوئی محتاط محقق ہوا تو سیدھے ڈیڈ لیٹر آفس میں جائیں گے۔)

۶۔ اب آپ نے وضاحت فرمائی ہے کہ آپ نے ایسا اس لئے کیا کہ بحر رجز کے دوسرے اور کہ صاحبو! میں نے رکن "مستفعلن" کو اس کی اصلی حالت پر چھوڑ دیا ہے کسی کو کیا اعتراض ہے؟

۹۔ مجھے احساس ہے کہ "دھنی توجہ کے برآمدے" میں آپ کو غیر ضروری دھوپ کھانا پڑی۔ یہ تصور نہ کیجئے کہ خورشید و نوشہ پر آپ کا مدعا واضح نہیں ہو سکا۔ آپ صرف مندرجہ بالا شق نمبر ۲ کی توثیق کرنا چاہتے ہیں کہ کسی بھی غزل کے بعض مصرعے کبھی اس کی اصل بحر سے مختلف کسی اور بحر میں بھی پڑھے جا سکتے ہیں۔ لیکن جان کی امان پاؤں تو عرض کروں کہ آپ نے جو ڈرامہ ترتیب دیا اسی میں مکالمے اچھے نہیں لکھے جا سکتے۔ آپ نے علامہ اور مرزا سے یہ کہلوا کر گویا ان کے کمال کو بٹہ لگا دیا کہ "میں نے بھی اس بحر میں چند مصرعے لکھے تھے" اور "بھئی ہمارے اس بحر کے مصرعے تو سن لو عزیزو"۔ یعنی وہ خود اس بات کا اعلان فرما رہے کہ انہوں نے ایک ہی غزل واقعی دو مختلف بحروں میں لکھی ہے۔

بحر رجز میں ڈال کے بحر رمل چلے

بس اسی سبب سے مرزا نے انتقاماً اسی عیاری سے اعتراض جڑ دیا جس عیاری سے آپ نے یہ مصرعے غزلوں سے الگ کئے تھے۔ ظاہر ہے جب آپ نے ان کے کندھے پر رکھ کر بندوق چلائی

تھی تو ان کو حق تھا کہ کندھا ذرا سا اچکا دیں اور آپ کا نشانہ خطا ہو جائے۔

۱۰۔ "پارس و شام" کے بارے میں آپ کا ارشاد ہے کہ آپ اسے "وشام" بروزن "کلام" تو نہیں پڑھتے "مگر تقطیع میں چونکہ متحرک کو ساکن کو ساکن اور ساکن کو متحرک کر سکتے ہیں اور کر لیتے ہیں... اسی لئے یہاں واؤ کو تقطیع کے لئے متحرک کیا جا سکتا ہے۔"

متحرک کو ساکن کرنے کی کوئی مثال تو میرے ذہن میں نہیں آ رہی البتہ ساکن کو متحرک کر لیا جاتا ہے لیکن اس کی ضرورت اس وقت پیش آتی ہے جب "اجتماع ساکین" ہو جائے۔ یعنی آگے پیچھے دو ساکن جمع ہو جائیں۔ ایسی صورت میں' تقطیع کرتے ہوئے' دوسرے ساکن کو متحرک شمار کیا جاتا ہے۔ اس اصول کا اطلاق تو "پارس و شام" کی "ر" پر ہو سکتا ہے کہ اگر اسے بھی الف کے بعد ساکن مانا جائے تو "اجتماع ساکین" ہو جاتا ہے لہذا تقطیع میں یہ متحرک شمار ہو گی۔ گویا یہاں نوراللغات کا حوالہ --- جس سے آپ نے قیامت برپا فرمائی --- بالکل بے کار تھا کیونکہ یہاں اس کے دونوں تلفظ عروضی تقطیع میں یکساں رہیں گے۔ لیکن جہاں تک "پارس و شام" کی واؤ عطف کا تعلق ہے اسے تقطیع میں متحرک کرنے کا کوئی جواز سمجھ میں نہیں آتا کیونکہ اس سے پہلے "س" متحرک ہے اور دو ساکن جمع نہیں ہوا ہے۔ اور اگر یہ واؤ متحرک نہیں ہو سکتی تو پھر "پارس و شا" کا ٹکڑا "مستفعلن" کیونکر ہو سکتا ہے؟

چلئے "عشرہ" مکمل ہو گیا اب اس ثقیل بحث کو لپیٹ دیں۔ ویسے آپ کے کان میں ایک بات کہوں۔ "بحر بسیط مثمن مشروط" یہ نام مجھے بہت پسند آیا۔ اگر بڑا اخفش کو کوئی اعتراض نہ ہو تو مجھے بھی کوئی اعتراض نہیں۔ (ہاں' خلیل بن احمد الازدی الفراہیدی ٹھیٹھ عرب تھا۔ اسے "پارسی" کہیں گے تو اس کی روح آپ کے خلاف عربی میں خط لکھے گی۔) ایک اور لفظ "ستوی" پر بھی بہت پیار آیا۔ عرب خواہ مخواہ اسے "سداسی" کہتے ہیں۔ "محزوف" میں "ذ" کی ٹانگ کھینچ کر آپ نے اس شیطان کی آنت اصطلاح کے ساتھ مناسب سلوک کیا۔

اور کیا عرض کروں۔ اس بار یہاں کا موسم ہمارے حساب سے سخت رہا۔ بقول سودا۔

سردی اب کے برس ہے اتنی شدید
صبح نکلے ہے کانپتا خورشید

لندن کا اصلی موسم تو بڑا خوفناک ہو گا لیکن "اہل فرنگ" نے خود ساختہ

زحاف کا لحاف ڈال کر اسے خوشگوار بنا رکھا ہو گا۔ اب اپریل کا انتظار ہے کہ بہار کے ساتھ آپ نے بھی آمد کا مژدہ سنایا ہے۔ آپ نے صرف کراچی کا ذکر کیا ہے لیکن امید ہے کہ لاہور بھی ضرور آنا ہو گا۔ میرا فون نمبر ۵۳۰۰۳۹۲ ہے۔

تعمیل ارشاد میں دو غزلیں ارسال خدمت ہیں۔ اگر پسند آئیں تو موجب اعزاز ہو۔ چند غزلیں تازہ "فنون" میں بھی نظر سے گزر چکی ہوں گی۔ آپ بھی تازہ کلام سے نوازیئے۔ گورنمنٹ کالج سرگودھا میں مدّتوں پہلے آپ سے سنی ہوئی ایک غزل کے یہ شعر آج تک ذہن پر نقش ہیں:

دامن میں آنسوؤں کا ذخیرہ نہ کر ابھی
یہ صبر کا مقام ہے، گریہ نہ کر ابھی

یہ خامشی کا زہر نسوں میں اتر نہ جائے
آواز کی شکست گوارا نہ کر ابھی

دنیا پہ اپنے علم کی پرچھائیاں نہ ڈال
اے روشنی فروش! اندھیرا نہ کر ابھی

پ۔ ن۔ دوسرے شعر میں ٹھیک سے یاد نہیں آ رہا کہ "نسوں" کا ہی لفظ تھا یا کچھ اور۔

احترامات

خورشید رضوی

۲۴۔ جنوری ۱۹۹۵ء

نقول

۱۔ معاصر

۲۔ شرکائے بحث

O

جانِ ساقی، خورشید رضوی

تم نے کوشش تو بہت کی ہے کہ میں دشت افاعیل میں صور اسرافیل پھونکوں مگر اب کے تمہارے بھرے میں نہیں آ رہا خاص کر اس لئے کہ تم نے شروع کے ۹ نکات، گھما پھرا کر ہی سہی، میری ہی مدافعت میں لکھے ہیں۔ اب رہا نکتہ نمبر ۱۰، تو اس سلسلے میں صرف اتنا ہی

کہنا ہے کہ تمہاری دقت نظری اور موشگافی کی داد دینے کے بعد بھی میں اپنے ہی موقف پر قائم ہوں کہ اردو نے کی تے پر ہندوستانی پاکستانی لہجے کی چھاپ ہے اور مجھے اجتماع ساکنین کے بغیر بھی واوَ کو متحرک کرنے میں کسی الجھن کا سامنا نہیں ہوتا۔ دیکھو میرا کلیدی فقرہ "ہندی پنگل نے بھی ہماری بحروں کی رگوں میں اپنا پارا دوڑایا ہے" اپنے پہلے خط میں "پارا" کو "پارہ" لکھا تھا۔ ٹھیک کر لو۔ کوئی ۱۵ دن ہوئے عطا کو تصحیح بھیج دی تھی۔ انہوں نے درست کر لیا ہو گا۔ ظاہر ہے "محذوف" میں "ذ" ہے "حذف" والا۔ زحاف والی "ز" نہیں۔

تم صحیح کہتے ہو کہ خلیل ابن احمد عرب تھا۔ پتہ نہیں میں کس جھونک میں اسے ایرانی لکھ گیا۔ یہ وہی آدمی ہے نا جسے لغت کا بانی بھی کہتے ہیں؟ ذرا تحقیق کر کے لکھنا کہ کیا یہ عزیز ایران میں بھی ایک لمبے عرصے تک رہا تھا؟

میرے پاس خلیل ابن احمد کے بارے میں کوئی کتاب موجود نہیں ہے۔ ۴۳ سال پہلے کا ایک مضمون ذہن میں رہ گیا تھا جس میں مضمون نگار نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی تھی کہ ہرچند وہ عربی کا عالم تھا مگر اہل زبان (یعنی وہاں بھی اہل زبان ہوا کرتے تھے) پھر بھی شک کیا کرتے تھے۔ یاد رکھو کہ معرب ہونے سے پہلے بصرہ کا اصلی ایرانی نام بسرہ ہوا کرتا تھا۔ آبادی مخلوط تھی۔ ممکن ہے کہ خلیل کے والدین یا والدین کے والدین کے خون میں ایرانی ملاوٹ ہو۔ قیاس آرائی کی جا سکتی ہے کہ اس درنا سفتہ کی عالمانہ موشگافیوں نے حاسدوں کی ایک ٹولی کو جنم دیا ہو گا اور انہوں نے طرح طرح کی افواہوں کی پرورش کی ہو گی۔ مثلاً یہ واقعہ کہ خلیل نے شادی کے بعد خلوت خانہ وصال (حجرہ عروسی) کے چراغ کی طرف اشارہ کر کے اپنی منکوحہ سے کہا "اقتل السراج" اور اس سہاگن نے واویلا کیا کہ یہ آدمی تو عربی النسل ہو ہی نہیں سکتا کہ یہ عجمیوں کے "چراغ کشتن" کے لغوی ترجمے کو عربی محاورہ بنانا چاہتا ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ بہت لطف آئے اگر تم اپنے لاہور والے محمد کاظم کی سند حاصل کرو۔

غزلوں کا شکریہ۔ کھل رہے ہیں' مل رہے ہیں والی غزل کے دوسرے' تیسرے اور ساتویں شعروں نے خاص لطف دیا۔ اسی طرح' اچھا رہ جائے' بستا رہ جائے والی غزل میں تیسرے اور آخری شعر نے جی خوش کر دیا۔ مگر غالب کے بعد کسی کو پہلے مصرعے کے آخر میں لفظ "یعنی" لکھنے کی اجازت نہیں۔ اسے "ورنہ" سے بدل کر دیکھو۔

پیار دلار

ساقی

مکرمی جناب ساقی فاروقی

سلام مسنون!

عنایت نامہ موصول ہوا۔ موشگافی کی داد کا شکریہ جس سے مزید موشگافی کا حوصلہ ہوا۔ آپ فرماتے ہیں کہ:

"... اردو کی نے کی لے پر ہندوستانی پاکستانی لہجے کی چھاپ ہے اور مجھے اجتماع ساکنین کے بغیر بھی واؤ کو متحرک کرنے میں کسی الجھن کا سامنا نہیں ہوتا۔"

یہ ہوائی فائر یعنی عمومی بیان ہے یا مصرع زیر بحث:

مصر و حجاز سے گزر پارس و شام سے گزر

کے متعلق ہے؟ اس کے بارے میں تو آپ فرما چکے ہیں کہ آپ واؤ کو متحرک نہیں پڑھتے۔ ظاہر ہے کہ آپ کا ذوق اس سے اِبا کرتا ہے اور ہندوستانی پاکستانی لہجہ اس میں الجھن محسوس کرتا ہے۔ تو پھر خواہی نخواہی "مستفعلن" بنانے کی دھن میں پہلے "سین" کو ساکن کرنا پھر "واؤ" کو متحرک کرنا۔۔۔ (حالانکہ خود بھی یوں نہ پڑھنا)۔۔۔ اور اس کے بعد 'بے ضرورت' ہندی پنگل میں اس کا جواز تلاش کرنا محض ہندی کی چندی نہیں تو اور کیا ہے؟ پنگل کا اثر ہماری لے پر مسلم مگر اس کا کوئی موقع و محل تو ہو۔

ہر سخن وقتے و ہر نکتہ مقامے دارد

کچا پارا رگوں میں نہیں دوڑتا' جوڑوں میں بیٹھ جاتا ہے۔ اس عاجز کی رائے میں تو اگر آپ یہاں پنگل کو زحمت نہ دیں اور ' آمد قیامت کا اعلان منسوخ کر کے' کم از کم اس رکن کی حد تک مشفق خواجہ صاحب کی بات مان لیں تو مناسب ہو۔

آپ نے اچھا کیا کہ "پارا" کے ہجے خود ہی درست کرا دیے۔ رشید حسن خاں صاحب بہت خوش ہوں گے۔ ویسے "پارہ" کی گول "ہ" کا اپنا ہی لطف ہے کہ پارے کی گولی اس میں صاف لڑھکتی نظر آتی ہے۔

جی ہاں' خلیل بن احمد وہی ہے جسے لغت کا بانی بھی کہتے ہیں کیونکہ "کتاب العین" بالعموم اسی سے منسوب کی جاتی ہے۔ میرے خیال میں وہ ایران میں کبھی نہیں رہا اور نہ اس کے اجداد کے خون میں ایرانی ملاوٹ تھی۔

"اقتلی السراج"--- (خطاب منکوحہ سے ہے لہٰذا "اقتلی" "ی" سے بصیغہ مونث آئے گا"--- والا لطیفہ، جہاں تک میرا حافظہ کام کرتا ہے، خلیل بن احمد سے متعلق نہیں، "القاموس المحیط" کے مصنف مجد الدین فیروز آبادی کے بارے میں ہے جو ایرانی الاصل تھا۔

سید محمد کاظم صاحب سے گاہے گاہے ملاقات رہتی ہے لیکن اب کچھ دن سے رابطہ منقطع ہے۔ انشاء اللہ آپ کا سلام نیز "استفتاء" عندالملاقات، ان کی خدمت میں عرض کر دیا جائے گا۔

غزلوں کی پسندیدگی اور محبانہ مشورے کا بے حد شکریہ۔ اور کیا عرض کروں۔ ہاں مشفق خواجہ صاحب کا خط آیا تھا۔ ان کو ڈاک بہت تاخیر سے وصول ہو رہی ہے کیونکہ ان کے علاقے میں بدامنی بہت زور پر ہے۔ آپ کے گذشتہ خط کی کاپی بھی اس وقت تک انہیں نہیں مل سکی تھی۔

والسلام

خورشید رضوی

۱۵ فروری ۱۹۹۵ء

نقول:

۱۔ "معاصر"

۲۔ شرکائے بحث

۹۵-۴-۴

مائی ڈیئر خورشید

تمہارا ۱۵ فروری والا خط مجھے پہلی مارچ کو ملا کہ تم نے صرف NW لکھا تھا، NW4 ہونا چاہئے تھا۔ پھر میں اپنی گوناگوں مصروفیات (سفر، فلو، کام) کے باعث مارچ بھر ڈاک کی طرف سے غافل رہا۔ معاف کرو۔

اب ذرا فراغت نصیب ہوئی ہے تو قلم کو فروغ مے سے گلستاں کر رہا ہوں۔ سب سے پہلے تو یہ کہ "اقتلی" کا شکریہ۔ عربی گرامر آتی تو غلطی نہ کرتا۔ چونکہ اردو فارسی میں "چراغ کشتن" یا "چراغ بجھا دو" کا مخاطب، مرد یا عورت، کوئی بھی ہو سکتا ہے اس

لئے حافظے نے جھانسا دیا۔

۵-۴-۹۵

کل یہ خط شروع کیا تھا کہ خالد حسن قادری (حامد حسن قادری کے پوتے) ملنے چلے آئے۔ پوچھا "کیا کر رہے ہو" میں نے یہ صفحہ سامنے کر دیا۔ کہنے لگے "مجھے بھی ٹھیک سے یاد نہیں کہ یہ افواہ خلیل بن احمد کے بارے میں ہے یا مجد الدین فیروز آبادی کے بارے میں مگر بیوی کے واویلے کا سبب صرف یہ نہیں تھا کہ خلیل یا مجد الدین نے فارسی کا محاورہ عربی میں ترجمہ کر دیا تھا بلکہ یہ بھی تھا کہ اس نے (خلیل یا مجد الدین نے) فارسی گرامر کی رو سے "اقتل" کہا تھا " اقتلی " کی بجائے"۔ خیر جس نے بھی جو کچھ کہا ہو تمہارا بہرحال شکریہ۔

جس طرح میں اس بات پر فخر کرتا ہوں کہ میں فراق' یگانہ' راشد' فیض اور میراجی کے عہد میں زندہ رہا تمہیں اس بات پر فخر کرنا چاہئے کہ تم میرے (یا مجھ جیسے کئی اور لوگوں کے) عہد میں زندہ ہو۔ فراق' یگانہ اور میراجی سے تو مری ملاقات نہ ہو سکی مگر راشد اور فیض سے بے حد قریبی تعلقات رہے۔ اس کے باوجود ان سے گفتگو کرتے ہوئے یا انھیں خط لکھتے ہوئے میں ہمیشہ ایک احترام آمیز فاصلے پر کھڑا رہا۔ افسوس اپنے تازہ خط میں تم یہ "احترام آمیز فاصلہ" قائم نہ رکھ سکے اور نہایت حتمیت سے تم نے لکھا۔ "کچا پارا رگوں میں نہیں دوڑتا' جوڑوں میں بیٹھ جاتا ہے" اس جملے سے پہلے تمہیں لکھنا چاہیے تھا کہ "جہاں تک میرا خیال ہے" یا جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے" وغیرہ۔ مگر غلطی سے تم یہ لکھنا بھول گئے۔ خیر۔ یہ تو شاید صحیح ہو کہ "کچا پارا" اردو لکچرار یا پروفیسر کے جوڑوں اور ذہن کے خلیوں میں بیٹھ جاتا ہو مگر تخلیقی لوگوں (جن میں تم بھی شامل ہو) کی رگوں میں اس لئے دوڑتا ہے (پارا نہ کہ کچا پارا) کہ اس کی سب سے اہم خصوصیات نہایت معمولی گرمی سے سیال ہو جانا اور حرکت میں آجانا ہیں' اسی لیے اس کا استعمال Thermometers, Mercury Batteries, Barometers اور Monometers میں ہوتا ہے۔ اس تنبیہہ کے بعد اب میرے فقرے پر غور کرو کہ میں نے پارا کسی جاندار کے نہیں بلکہ بحروں کی رگوں میں دوڑایا ہے۔ وہ اصلی بحث جو میں نے اپنی غزل کی بحر کے بارے میں قاسمی صاحب اور مشفق خواجہ سے کی تھی وہ

تو ختم ہوئی اور تم نے بھی لکھ دیا کہ دسوں مصرعے بحر رجز کی رو سے بھی صدفی صد صحیح ہیں۔ مگر فروعی بات (غالب کے ایک مصرع اور اقبال کے ایک مصرعے کے بارے میں) خاصی طول کھینچ گئی ہے اس لئے اس سلسلے میں بھی اس خط کو حرف آخر سمجھو۔ اسے پڑھنے کے بعد بھی تشفی نہیں تو میں اس کے علاوہ اور کیا کہہ سکتا ہوں کہ Let us agree to disagree

۱) اس ساری بحث میں غالب اور اقبال کی غزلوں سے علیحدہ کر کے میں نے ان کے چار مصرعے اپنی مدافعت میں استعمال کئے۔

۲) مشفق اور خورشید دو مصرعوں کی حد تک (بو سے کو پوچھتا ہوں میں' منہ سے مجھے بتا کہ یوں۔ اور ایسی نماز سے گزر ایسے امام سے گزر) شروع میں غوں غاں کر کے اس لئے خاموش ہو گئے کہ ان دونوں مصرعوں کو " **مستفعلن مفاعلن مستفعلن مفاعلن** میں بھی پڑھا جا سکتا ہے۔

۳) پہلے مشفق نے پھر خورشید نے دوسرے دو مصرعوں کے سلسلے میں مجھ سے اختلاف کیا بلکہ یہ کہنا شاید زیادہ صحیح ہو کہ مجھ سے اتفاق نہیں کیا۔ وہ دونوں مصرعے' ایک غالب کا' ایک اقبال کا' یوں ہیں۔ موج محیط آب میں' مارے ہے دست و پا کہ یوں' اور مصر و حجاز سے گزر پارس و شام سے گزر۔

۴) یہ دونوں مصرعے بحر بسیط میں صرف اس صورت میں پڑھے جا سکتے ہیں کہ موج کی جیم کے نیچے اضافت لگائی جائے اور پارس کو فعلن کے وزن پر پڑھا جائے اور "واؤ" کو متحرک کیا جائے۔

۵) مشفق نے لکھا کہ پارس کا وزن صرف فعل ہے۔ میں نے لکھا کہ وہ سراسر غلط ہیں کہ آصفیہ نے اس کا وزن صرف فعلن لکھا ہے اور نوراللغات نے فعل اور فعلن دونوں لکھا ہے (آصفیہ کی سند اس وقت نہیں دی تھی' اب دے رہا ہوں) اور فعلن صرف "پارس پتھر" کے لئے نہیں بلکہ فارس کے معنی میں بھی ہے۔

۶) خورشید اپنے تازہ خط میں مجھ سے "پارس" کے تلفظ پر احتجاج نہیں کرتے ہیں کہ وہ پہلے بھی لکھ چکے ہیں کہ "ر" کو چاہے ساکن مانئے یا متحرک مگر جب تک واؤ کو بھی متحرک نہ کریں مصرعے کو **مستفعلن مفاعلن مستفعلن مفاعلن** میں نہیں پڑھ سکتے۔

۷) تس پر میں نے لکھا کہ "اجتماع ساکنین کے بغیر بھی مجھے واؤ کو متحرک کرنے میں کسی قباحت کا سامنا نہیں ہوتا کہ ہندی پنگل نے بھی ہماری بحروں کی رگوں میں اپنا پارا دوڑایا ہے۔"

۸) یہ بات ملحوظ خاطر رہے کہ بحر کی بحث میں جیت چکا۔ غالب اور اقبال کے جو چار مصرعے میں نے لکھے تھے ان میں سے ۲ پر کسی کو کچھ کہنے کی جرات نہ ہوئی۔ تیسرے مصرعے (موج محیط آب میں مارے ہے دست و پا کہ یوں) کے بارے میں بھی خورشید خاموش ہو گئے کہ شاید ان کی سمجھ میں یہ بات آ گئی ہے یا پتا مار کے انھوں نے میری یہ بات برداشت کر لی ہے کہ غزل سے الگ کر کے موج کے نیچے اضافت لگانے کا جواز بھی ممکن ہے۔

۹) اب لے دے کے جو بات خورشید سے ہضم نہیں ہو پا رہی وہ یہ ہے کہ کم از کم ایک مصرعے کی حد تک تو میں حجت نہ کروں اور اقبال کے مصرعے کے "واؤ" کو ساکن ہی رہنے دوں۔

انھوں نے یہ بھی لکھا کہ جب آپ خود بھی مصرعے پڑھتے وقت واؤ کو متحرک نہیں کرتے تو کم از کم اس رکن کی حد تک خواجہ صاحب کی بات مان ہی لیں اور ہندی پنگل کا سہارا نہ لیں

تو جان ساقی خورشید رضوی' یہ تو ہوا لب لباب ہماری آج تک کی خط و کتابت کا..... اب دوبارہ بلکہ سہ بارہ اپنا موقف سمجھانے کی کوشش کرتا ہوں۔

(ا) جب میں غالب اور اقبال کی غزلیں پڑھتا ہوں تو اسی طرح پڑھتا ہوں جس طرح مشفق یا تم یا اردو کے تمام پڑھنے لکھنے والے یعنی نہ موج کے نیچے اضافت لگاتا ہوں نہ واؤ کو متحرک کرتا ہوں نہ پارس کی رٹ پر عذاب ڈھاتا ہوں۔

(ب) مگر غزل سے الگ کر کے اپنی مدافعت میں جس طرح میں نے موج کے نیچے اضافت لگائی ہے اس کا جواز بھی دے دیا ہے۔

(ج) اسی طرح واؤ کو متحرک کرنے کا جواز (یہ نہ بھولو کہ اس مصرعے کو غزل سے الگ کر کے گفتگو کر رہا ہوں) بھی میں نے ہندی پنگل میں ڈھونڈ لیا تھا۔ مگر تم اس سے متفق نہیں ہو۔

(د) اردو بحور کے سلسلے میں میرا رویہ کٹر عروضیوں سے بالکل مختلف ہے۔
میں اس سلسلے میں حبیب اللہ خان غضنفر، گیان چند جین کے قریب ہوں جو لبرل (Liberal) ہیں۔ جس طرح ایرانیوں نے خلیل کی بحور ملی، فارسی کی جداگانہ موسیقی کے سبب زحافات کی ترویج کی اسی طرح اردو کی موسیقی نے ہندی پنگل کا سہارا بھی لیا۔ اپنے شمس الرحمن فاروقی تک نے (جو کلاسیکیت اور جدیدیت کا سنگم ہیں) ایک جگہ لکھا ہے "۔۔۔۔ ہمارے عروضیوں کے نافذ کئے ہوئے احکام بالکل بے جا، مہمل، غیر حقیقت پسندانہ اور ضرر رساں ہیں" پھر حبیب اللہ غضنفر نے لکھا "اگر کوئی شخص یہ دعوی کرے کہ اردو کا عروض بھاشا کے قواعد عروض پر جی ہے تو شاید کوئی یقین نہ کرے مگر حقیقت میں یہ دعوی بے بنیاد نہیں ہے" (غضنفر صاحب میرے استاد بھی تھے) گیان چند جین نے اور آگے جا کر یہ تک ثابت کیا ہے کہ "مصرعے کے بیچ دو ساکن حروف والا لفظ ہو تو آپ دوسرے ساکن حرف کو خواہ ساکن پڑھیئے خواہ متحرک، وزن میں کوئی فرق نہیں پڑتا" میں نے ایک قدم آگے جا کے یا پیچھے ہٹ کے اجتماع ساکنین کے بغیر بھی "واؤ" کو متحرک کر دیا تو کون سا ہوائی فیر کیا۔ تمہیں اچھی طرح معلوم ہے کہ میں گولی ضائع نہیں کرتا اور کٹ حجتوں کے دماغ کو ہدف بناتا ہوں اور میرا نشانہ کبھی چوکتا نہیں۔

میں مصرعہ زیر بحث کو (اقبال والا) ہندی پنگل کے سہارے ۳۶ ماتراؤں کے ساتھ بھی پڑھتا ہوں اور اردو ہندی موسیقی مجھے کلیجے سے لگا کر خوشی ہوتی ہے۔۔۔ بالکل اسی طرح جیسے اپنے ہم عصر منیر نیازی (جو اپنے آپ کو دس سال سے دہرا دہرا کے عیش کر رہا ہے۔۔۔ دیکھا تم نے میں اپنے دوستوں کو کس آسانی سے ناخوش کرتا ہوں) کا مصرعہ گاہے گاہے میں ہندی میں لنک سے پڑھتا ہوں "کل دیکھا اک آدمی، اٹا سفر کی دھول میں۔ اور پڑھتے ہوئے آدمی کے "دال" کو اور دھول کے "لام" کو متحرک کر دیتا ہوں۔

اپنے نام میرے تینوں خطوط اپنے طلبا کو سنا دو تا کہ وہ تمہارے کلاسیکی ذہن کے علاوہ Alternative view سے بھی واقف ہو جائیں۔ میرے خطوں میں جو گالیاں آئی ہیں وہ "بیچ بیچ سنانا" ورنہ تمہاری نرم سی مزاج پارہ پارہ ہو جائیگی۔

اپریل کا سفر اب نومبر کا سفر ہو گیا ہے، مشفق خواجہ نے کراچی آنے پر پابندی لگا دی ہے (خون خرابے کے سبب)

یہ خط رجسٹری سے عطاء الحق قاسمی (معاصر) کو بھیج دیا۔ تم اپنی کاپی لے

لینا۔ اور ندیم قاسمی صاحب اور مشفق خواجہ کی کاپیاں بنوا کے انھیں بھیج دینا۔۔

ساقی فاروقی

مکرمی جناب ساقی فاروقی

اس بار تادیر جب آپ کا جواب نہ آیا تو مجھے خیال ہوا کہ یہ خاموشی آپ کی آمد کا پیش خیمہ ہے۔ کیونکہ آپ نے اپریل میں پاکستان آنے کا مژدہ سنایا تھا۔ اب معلوم ہوا کہ یہ سفر نومبر کا سفر ہو گیا ہے۔ خیر وہ موسم لندن سے نکلنے کے لیے زیادہ مناسب ہو گا۔ خدا کرے اس وقت تک کراچی کے حالات بھی سازگار ہو چکے ہوں۔

میرے جملے "کچا پارا رگوں میں نہیں دوڑتا جوڑوں میں بیٹھ جاتا ہے" سے اگر آپ کو سوء ادب کی بو آئی تو میں معذرت خواہ ہوں۔ اس کے بعد بصد ادب ایک وضاحت۔ آپ نے فرمایا ہے کہ "میں نے پارا کسی جاندار کے نہیں بلکہ بحروں کی رگوں میں دوڑایا ہے" حاشا وکلا میری مراد بھی بحروں کے سوا کچھ نہ تھی۔ مدرس آدمی ہوں اور بقول آپ کے "کلاسیکی ذہن" کا۔ اگر آپ کو ان کے بے جوڑ ہونے پر اصرار ہو تو مجھے جوابا اصرار نہیں۔

آپ نے حکم دیا ہے کہ اب اس بحث کے بارے میں آپ کے خط کو حرف آخر سمجھا جائے۔ مجھے اس میں کوئی تامل نہیں۔

جب ترا حکم ملا ترک محبت کر دی

لیکن اس کے بعد آپ نے بحث کو recapitulate کرنا ضروری سمجھا ہے۔ اس حوالے سے اتنا عرض کرنے کی اجازت چاہتا ہوں کہ بحر رجز کو بسیط کہنے، خود مرزا اور علامہ سے ناموزوں مکالمہ کہلوانے اور "پارس و شام" کی واؤ کو مصرع زیر بحث میں متحرک کرنے کے بارے میں مجھے آپ سے جو اختلاف آغاز سے تھا، علی حالہ قائم ہے جس کے سلسلے میں اپنا موقف تفصیلا بیان کر چکا ہوں۔ آپ کے اس قول سے البتہ مجھے اتفاق ہے کہ

"اسے پڑھنے کے بعد بھی تشفی نہ ہو تو میں اس کے علاوہ اور کیا کہہ سکتا ہوں کہ

"Let us agree to disagree"

آپ کی ہم عصری کے تشرف سے میں کیونکر منکر ہو سکتا ہوں۔ تاہم ہن کی تقویم میں "عصر" کی ایک dimension وہ بھی ہے جس کا اظہار مدتوں پہلے اس فقیر کی ایک غزل میں یوں ہوا تھا۔

جن لوگوں میں رہتا ہوں میں ان میں سے نہیں ہوں
ہوں کون، مجھے اپنا زمانہ نہیں ملتا

خدا کرے آپ بہمہ وجوہ خیریت سے ہوں۔

ہاں، حافظ کے مصرعے میں سہواً میں نے "مکانے دارد" کی جگہ "مقالے دارد" لکھ دیا۔ ریکارڈ درست فرما لیجئے۔

خورشید رضوی

خورشید میری جان، ابھی ابھی عطاالحق کا محبت اور روشنی سے لبریز خط آیا۔ اس نے لکھا ہے کہ تمہارے نام میرے آخری خط سے تمہیں دکھ پہنچے گا اور چونکہ تم اپنی تمام دوسری خوبیوں کے علاوہ "اپنی اعلیٰ انسانی صفات کی وجہ سے بہت احترام کی نظروں سے دیکھے جاتے ہو" اور لوگ بھی، میرا جملہ پڑھ کر، میرے بارے میں اچھی رائے قائم نہیں کریں گے" اس جملے میں تین باتیں ہیں۔

ا۔ عطاالحق کا گہرا لگاؤ (Genuine concern) مجھ سے۔

۲۔ عطاالحق کی اٹوٹ چاہت تم سے۔

۳۔ خود عطاالحق کی شرافت اور اس کی شخصیت کا حسن۔

مجھ سے جو دلداری عطا کو ہے وہ یک طرفہ نہیں اور یہ اس بدمعاش کو معلوم ہے کہ دونوں طرف ہے آگ برابر لگی ہوئی۔ میں لاہور میں ہوتا تو تمہیں، امجد کو، عطا کو اور دوسروں کو بھی (بڑے قاسمی سے توڑ تاڑ کر اپنے حلقے میں (کہ تم تینوں سے عمر میں بڑا ہوں اور بڑائی کا فائدہ اٹھا رہا ہوں) شامل کر لیتا۔ خود بڑے قاسمی سے جوڑ توڑ کر کے ان کے حلقے میں شامل رہتا اور یوں ایک طرح کے سلسلہ مدارج (Hierarchy) کی ترویج کرتا۔ تو یہ آرزو بھی خاک شدہ و ہلاک شدہ۔ خیر۔

اے میرے دلدار اور نوجوان دوست خورشید رضوی، اصل میں مجھ فاروقی

کے اندر ایک طرح کا ڈنک (in-built-censor) چھپا ہوا ہے اور وہ ہر اس بات پر آئی آپ جوابی حملہ کرتا ہے جو اسے ناگوار لگتی ہے۔ جیسا کہ تمہیں معلوم ہو گا کہ ہر تیسرے مہینے نا محرموں کے خطوط اور فنون (فون کی جمع) آتے رہتے ہیں جو عموماً رنگ برنگی گالیوں (پتھروں) سے بھرے ہوتے ہیں۔ ان پر مرے اندر والا محتسب بالکل حرکت نہیں کرتا مگر جب کوئی رمز آشنا مجھے گلاب کے پھول سے بھی مارتا ہے تو مجروح ہو جاتا ہوں کہ اپنی تمام فوں فاں کے باوجود نہایت تنہا اور نازک ہوں۔

عطا کی یاد دہانی پر جب اپنے جملے پر غور کیا تو یادوں میں تمہاری شخصیت کی مٹھاس اور آنکھوں میں تمہاری نومنتی مزاج دوڑ گئی۔ اگر میرا فقرہ انور سدید' وزیر آغا اور احمد فراز جیسے جاہلوں پر ہوتا تو ٹھیک تھا۔ اس کا رخ تمہاری طرف ہرگز ہرگز نہیں ہونا چاہیے تھا۔ میں دوسروں کے لیے اپنی تلوار سہی تم جیسوں کے لیے ریشم کی طرح نرم ہوں۔ بڑا قلق ہے' معاف کردو (مشفق نے میرا موازنہ یگانہ سے کیا ہے مگر ان کی شخصیت کی سب سے بڑی خامی یہ تھی کہ انھیں اپنی غلطی پر پچھتانے (یاس پچھتانا نہیں آتا) کی عادت نہیں تھی۔ میں ساٹھ کا ہونے کو آیا مگر سوچ رہا ہوں کہ برٹش لائبریری میں کارل مارکس کی طرح بیٹھ جاؤں اور تحقیق شعار کروں۔ ظاہر ہے میرا مقصد تحقیق میں جگمگانا نہیں ہو گا' میرا واحد مدعا خواجہ پیا کے چراغ کو گل کرنا ہو گا۔

یہ خط عطا کو رجسٹری سے اس لئے بھیج رہا ہوں کہ فوراً تمہیں بلائے اور تمہارے سامنے بیٹھ کے وہ فقرہ (یا وہ فقرے) کاٹ دیں جس سے تمہاری دل آزاری ہوئی ہے (یا ہونے کا ذرا بھی خدشہ ہے) میں تم سے محبت کرتا ہوں اور تمہارا دل دکھا کے بہت بے چین ہوں۔ میری طرف سے عطا سے یہ بھی کہہ دو کہ وہ میرا یہ خط بھی "معاصر" میں چھاپ دیں تاکہ لوگوں کو معلوم ہو کہ

"-----It is reason, the mainstay of justice,
that must govern the world-------" Pablo Neruda

عطا نے لکھا ہے کہ "معاصر" میں وہ میرا گوشہ نکالنے والے ہیں۔ میری شرط یہ ہے کہ وہ گوشہ صرف اس صورت میں نکلے کہ اس میں تمہارا مضمون بھی ہو اور تم پر یہ پابندی لگا رہا ہوں کہ میرے خلاف ہو اور میری شاعری کا ایسا سخت محاسبہ ہو کہ لوگ وزیر

آغا پر میرا مضمون بھی بھول جائیں۔

لاہور کے تمام باسیوں کو پیار

ساقی فاروقی

مکرمی و محترمی جناب ساقی فاروقی

سلام مسنون!

چند روز قبل آپ کے خط کا جواب لکھ چکا ہوں۔ امید ہے ملا ہو گا۔ آج عطا الحق صاحب کی معرفت آپ کا ایک اور عنایت نامہ موصول ہوا۔ محبت سے اس قدر لبریز کہ مجھے شرمندگی محسوس ہونے لگی۔ آپ قطعاً یہ خیال نہ فرمائیں کہ آپ کے گزشتہ مکتوب سے میری دل آزاری ہوئی یا ہونے کا امکان ہے یا اس میں سے کچھ حذف کرنا ضروری ہے۔ عطاالحق صاحب نے جو کچھ محسوس کیا یہ ان کی اپنی محبت ہے جس کا آپ نے بہت مکمل تجزیہ کیا ہے۔ مجھے تو صرف اتنا محسوس ہوا تھا کہ میں جس اعتماد پر آپ سے (خلاف عادت) Liberties لے رہا ہوں شاید اس کی حد بندی میں مجھ سے کوتاہی ہوئی ہے لہٰذا احتیاط کے قلعے کی طرف پسپائی لازم ہے۔ لیکن آپ کے تازہ مکتوب نے تازہ ہوا کے جھونکے کی طرح ان اندیشوں کو باطل کر کے میرے اعتماد کو نیا حوصلہ بخشا۔ آپ سے ملاقاتوں کے دوران آپ کی خوش دلی اور کشادہ ظرفی کا جو تاثر ذہن پر ثبت ہو گیا تھا اسی نے ان شوخیوں کی رخصت دی جو میں آپ کے نام خطوط میں کرتا رہا۔ لیکن شوخی اور شوخ چشمی میں فرق کو ملحوظ رکھنا بہرحال ضروری سمجھتا ہوں۔ لہٰذا ایک بار پھر معذرت خواہ ہوں اور درخواست کرتا ہوں کہ اب تک کی مراسلت میں جو جو بات بھی گراں گزری ہو ازراہ کرم معاف فرما دیجئے۔

"تنہا اور نازک" ہونے کے حوالے سے آپ نے جو بات کہی اس نے میرے دل پر گہرا اثر کیا۔ آپ لاکھ اپنے "ڈنک" کا ذکر کیا کریں لیکن دل میں اگر "شہد" بھرا ہوا نہ ہو تو ایسا خط نہیں لکھا جا سکتا۔ اللہ تعالیٰ آپ کو خوش اور سلامت رکھے۔

خورشید رضوی

غیر ملکی نظمیں

جرمن

بریخت Bertolt Brecht

ترجمہ : ڈاکٹر سعادت سعید

## پہیہ بدلنا

میں سڑک کے کنارے ایک مینڈھ پر بیٹھا ہوں
ڈرائیور پہیہ تبدیل کر رہا ہے
مجھے وہ جگہ پسند نہیں جہاں سے میں آیا ہوں
مجھے وہ جگہ پسند نہیں ہے جہاں مجھے جانا ہے
تو پھر میں بے صبری سے
اسے پہیہ بدلتے کیوں دیکھ رہا ہوں؟

یونان

سی پی کوافی C.P. Kavafy

ترجمہ : ڈاکٹر سعادت سعید

# شمعیں

ہمارے مستقبل کے دن ہمارے سامنے ایستادہ ہیں
چھوٹی روشن شمعوں کی قطار کی مانند
سنہری' حرارت بھری' اور سانس لیتی چھوٹی شمعیں'

گزرے دن ہمارا تعاقب کرتے ہیں
جل بجھی شمعوں کی ایک سوگوار قطار
قریب ترین میں سے ابھی تک دھواں اٹھ رہا ہے
سرد شمعیں' پگھلی اور خمیدہ

میں انہیں دیکھنا نہیں چاہتا؛ ان کی صورت مجھے اداس کرتی ہے'
اور یہ مجھے اتنا اداس کرتی ہے کہ میں ان کی پہلی روشنی کو یاد کرتا ہوں'
میں اپنے سامنے اپنی روشن شمعوں کو تکتا ہوں

میں پیچھے کی جانب نہیں مڑنا چاہتا' مبادا کہ میں دیکھوں اور تھرتھراؤں
کہ تیرہ و تار قطار کتنی جلدی لمبی ہوتی ہے
کتنی جلدی جل بجھی شمعوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا ہے

# تامل نظم

## ستارے

جی۔ سندرا راج ○ ترجمہ:۔ محمد صفدر خاں

یہ میری نظروں میں
ستارے ہیں، کہکشائیں ہیں
یا محض نقطے پھیلے ہوئے
کچھ سمجھ میں نہیں آتا
شاید یہ آسمانی دوشیزہ کے گالوں پر خوب صورت نشان ہیں
ہو سکتا ہے کہ یہ سرخ انگارے
سورج نے اپنے وجود سے جدا کئے ہوں!
یہ تو مجھے مٹی کے دیئوں پر
حلق سے باہر نکلی ہوئی زبان کی مانند
شعلے معلوم رہتے ہیں
ایسا لگتا ہے کہ کوئی اداس بھکارن جھانک رہی ہے
اور آسمان پر پھیلی میلی چادر پر خیرات کے روشن سکے دھرے ہیں!
نہیں .... نہیں .... ایسا بھی نہیں
یہ تو "جنرل مرخ" کی قیادت میں بادلوں کی فوج نے
آسمان کے سینے میں چھید کر دیئے ہیں
یا پھر مشعل بردار مظاہرین انسان پر انسان کے ظلم کے خلاف
سرگرداں ہیں!
شاید یہ وہ دہکتے آنسو ہیں
جو آسمان نے ہماری حالت زار پر بہائے!!

# تامل نظم

## سورج

سبرامنیا بھراتی ○ ترجمہ :۔ محمد صفدر خاں

سورج!
تم نے تاریکی کے ساتھ کیا کیا ہے؟
تم نے اسے بھگا دیا
یا اسے اپنی روشنی میں چھپا لیا ہے؟
کیا تاریکی تمہاری دشمن ہے
یا وہ تمہاری خوراک ہے؟
یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ تم سے محبت کرتی ہو!
کہیں ایسا تو نہیں کہ
وہ رات بھر تمہارے انتظار میں رہی
اور جب تم افق پر نمودار ہوئے
تو وہ اپنا وجود کھو کر تمہاری چمک میں جذب ہو گئی!
شاید تم دونوں بہن بھائی ہو
اور تمہاری ماں تم سے باری باری دنیا کی رکھوالی کراتی ہے
بھلا یہ تو بتاؤ کہ تمہیں کبھی موت نہیں آئے گی
کیا تم واقعی لافانی ہو؟
میری دعائیں تم دونوں کے ساتھ ہیں
شاباش...... شاباش!!

تامل نظم

# بادل

سرادا ○ ترجمہ :۔ محمد صفدر خاں

تم بادل نہیں اک عورت ہو

سمندر سے گلے ملتی ہو

اور اپنے بطن میں پانی سمیٹ لاتی ہو!

اونچے پہاڑوں میں سوتی ہو

اور وہاں سے ملنے والی دولت ہم میں تقسیم کر دیتی ہو

ٹھنڈک پہنچاتی ہو

اور سورج کی گرمی ختم کر دیتی ہو

لیکن کیا تمہارے لیے مور رقص کریں گے؟

اور شہد کی مکھیاں گنگنائیں گی؟

جواب دو......جواب دو!!

خاکے، طنز و مزاح

○

سرخیلِ قبیلہ یگانہ — مشتاق احمد یوسفی

فالتو آدمی — انتظار حسین

ابا — محمد کبیر خان

حکیم جی — اشفاق احمد ورک

ضرورت ہے — محمد عارف

○

# سرخیلِ قبیلۂ یگانہ

مشتاق احمد یوسفی

BCCI نے جن ادیبوں اور شاعروں کو خراب و خوار و خجل اور خوش حال کیا' ان میں افتخار عارف کا تیسرا نمبر ہے۔ دوسرے نمبر پر محبی و مشفقی جناب الطاف گوہر ہیں جو دورانِ قیامِ لندن' اپنے آقائے سابق الانعام فیلڈ مارشل ایوب خاں کے کارناموں کو بزبان انگریزی رقم کر چکے ہیں۔ وہ اردو کے مانے ہوئے ادیب ہونے کے علاوہ عاقل و دور اندیش بھی ہیں۔ گمان غالب ہے کہ کتاب اردو میں اس لئے نہیں لکھی کہ اندیشہ تھا کہ پڑھنے والے سمجھ جائیں گے------اور پھر سمجھ لیں گے۔ ایسے نازک موضوعات پر ہاتھ قلم کروائے بغیر نثر میں کچھ کہنا مصنف کی چالاکی کے علاوہ جلاد کی نالائقی اور فرائض سے 'غفلت' کا دستاویزی ثبوت ہے۔ اگر خدانخواستہ ہاتھ قلم ہو جاتے تو پھر ہم جیسے عقیدت مندانِ قدیم اور افتخار عارف جیسے بیعت کنندگانِ جدید مرشد کے ہاتھ کی بجائے پیر کو بطور تبادل بوسہ گاہ چومتے۔ مگر وہ غلام اسحاق خاں کے خلاف "مسلم" میں دستخطی اداریئے کیسے لکھتے۔ وہ ہمارے لائق ترین اور واحد بیوروکریٹ ہیں جس کو یہ فخر حاصل ہے کہ اس نے دو Presidents کو جو اس کے باس رہ چکے تھے' ٹھکانے لگایا۔ ایک کو مخالفت کر کے اور دوسرے کو حمایت کر کے۔ جو خنجر و شمشیر سے نہ مرا' اسے Kiss of Death (بوسہ مرگ) سے سلا دیا۔

اب اس خجل و خوش حال گھرانے کا پہلا نام کیا بتائیں اور کیسے بتائیں۔ زبان پہ آتے آتے رہ جاتا ہے۔ کسرِ نفسی "ہیں! ہیں!!" کرتی ہوئی منہ پہ ہاتھ رکھ دیتی ہے۔ اس کے علاوہ شہرتِ عام اور رشکِ خواص و عوام کا اندیشہ بھی ہے۔ یوں بھی تعلّی شاعرانہ کا رواج اب صرف سیاسی تقریروں تک محدود ہے۔ جسے داغ کہتے ہیں دوستو' اسی روسیاہ کا نام ہے۔

اگر آپ اس وقت لحاظ کر کے خاموش بھی رہے تو باہر نکلتے ہی، مجھ سے نہیں تو افتخار عارف سے ضرور پوچھیں گے کہ ان باتوں کا "حرف باریاب" سے کیا تعلق؟ اس تعلق خاص کی وضاحت ذرا آگے چل کر کروں گا۔ پہلے خوشحالی کی اس شاخ ثمردار کی ایک جھلک دکھانے کو جی چاہتا ہے، جس کی باجماعت خوشہ چینی کا شرف حاصل ہو چکا ہے۔ BCCI کے دو سینئر افسروں کا انتقال ہوا تو بینک کے سیاہ و سفید و سرمئی کے مالک جناب آغا حسن عابدی نے ان کی بیواؤں کے نام ایک ایک ملین ڈالر کے مکانات منتقل کرنے کا اہتمام کیا۔ اس کے علاوہ ایک ایک ملین ڈالر نقد ادا کیے گئے۔ یعنی ہر دو مدات ملا کر، دونوں کو چھ چھ کروڑ روپے اور ایک ایک مرسڈیز کار ملی۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ سہاگنیں ان بیواؤں کو رشک کی نگاہ سے اور اپنے زندہ شوہروں کو قہر بھری نظروں سے دیکھنے لگیں۔

اے رو سیاہ تجھ سے تو یہ بھی نہ ہو سکا

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ان دنوں ہم دونوں یعنی افتخار عارف اور فقیر شرمندہ شرمندہ سے پھرتے تھے کہ مرنا اگر یہی ہے تو جینا فضول ہے۔ BCCI کے در و دیوار زبان حال سے جان پر کھیلنے کی دعوت دیتے رہے:

اے مرد ناتواں تجھے کیا انتظار ہے؟

صاحبو! بروقت اور منفعت بخش موت ہر کس و ناکس کے مقدر میں نہیں ہوتی۔ یہ تمہید ہم نے برنائے تفنن نہیں باندھی۔ BCCI نے بیرون ملک جو وسیلۂ روزی و رسوائی فراہم کیا، اس کی سہولتوں اور فراغت فراواں کے طفیل ہمیں تین کتابوں کی سوغات ملی۔ افتخار عارف کی "مہر دو نیم"۔ الطاف گوہر کی "ایوب خاں۔"

اور تیسری کتاب ایک بار پھر افتخار عارف کی "حرف باریاب" جس کا معتدبہ حصہ لندن کے روز و شب کے جلی و خفی حوالوں سے بھرا ہوا ہے۔ میں اس مجموعے کے ایک ایسے دلچسپ پہلو کی طرف آپ کی توجہ مبذول کرانی چاہوں گا جس کی طرف غالباً ابھی تک کسی کی توجہ نہیں گئی۔ ظاہر سی بات ہے، ان کی شاعری ان کی واردات قلبی ہے اور کیوں نہ ہو۔ لیکن کم لوگوں کو علم ہو گا کہ ان کے بظاہر عشقیہ اشعار سے بھی BCCI کی تاریخ ولادت و فضیحت و وفات کے مادے نکلتے ہیں۔ ان کی اور عاجز کی آپ بیتی میں اس کی "باپ" بیتی کی طرف اشارے ملتے ہیں۔ افتخار عارف تیرہ سال BCCI سے متعلق و منسوب اور وظیفہ یاب رہے۔

اس کی داستان لذیذ بھی ہے اور سبق آموز بھی۔ اس میں کچھ بالانشینوں کے نام بھی آتے ہیں۔ مگر ہم اس کو کسی نامناسب موقع کے لئے اٹھا رکھتے ہیں۔ ہم ایک جملے کے کوزے میں اس بحیرۂ تلخاب کو یوں بند کریں گے کہ بینک کو چلانے والوں نے پبلک ڈپازٹ کو منافع سمجھا اور منافع کو اپنا ماہانہ معاوضہ سمجھ کر کھا گئے۔

افتخار عارف کو ایک لحاظ سے BCCI او اس کے آقایان ولی نعمت اور غزنویان عالی مرتبت کا فردوسی کہا جا سکتا ہے۔ شعر اگر ہمارا وسیلہ اظہار جلال و ملال ہوتا تو ہم بھی اپنے لئے یہی لقب تجویز کرتے۔ فرق اتنا ہے کہ روایت کے مطابق فردوسی نے انتقاماً" محمود غزنوی کی ہجو اس وقت کی جب اسے حسب وعدہ "شاہنامہ" لکھنے کے صلے میں اشرفیاں نہیں ملیں۔ لیکن افتخار عارف اور ہم فردوسی سے زیادہ چالاک نکلے کہ ہم نے شاہ اور اس کے مصاحبوں' حواریوں اور درباری مداریوں کی مدح لکھے بغیر پوری اشرفیاں ماہ بماہ وصول کیں اور ہجو بھی کی۔ اشرفیاں ہمارا حق محنت تھا۔۔۔۔ وہ محنت جو تازہ بتازہ ہجو کہنے میں ماہ بماہ اور سال بسال کرنی پڑتی ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ جب محمود غزنوی کے گماشتے فردوسی کے گھر اشرفیوں کے توڑے لے کر پہنچے تو اس کا جنازہ نکل رہا تھا۔ لیکن موجودہ کیس میں جنازہ خود ممدوح کا نکلا۔ اس ضمن میں منتخب اشعار ہم آگے چل کر سنائیں گے۔

افتخار عارف اور ان کی شاعری پر میں تیسری بار مضمون پڑھ رہا ہوں۔ بظاہر اب صرف ایک کی اور گنجائش رہ گئی ہے۔ پرانے دوستوں کے بارے میں ہر بار اوریجنل اور سچی بات کہنا صرف اس صورت میں ممکن ہے کہ ان سے دشمنی ہو جائے۔ میں نے ۱۹۸۳ء میں اردو مرکز لندن اور پھر ۱۹۹۲ء میں کراچی جم خانہ میں افتخار عارف کے بارے میں جو کچھ پڑھا' اسے ان کے دوستوں نے مدحیہ اور دشمنوں نے مزاحیہ سمجھا اور دونوں خوش خوش گھر لوٹے۔ خود افتخار عارف یہ دیکھ کر محظوظ ہوئے کہ بچھو اپنے پیاروں کو پیار بھی اپنے ڈنگ ہی سے کرتا ہے۔

اس دفعہ بھی وقت کی کمی اور اپنے تساہل غیر عارفانہ کے سبب' میں جہاں تہاں سے انہی مضامین سے اقتباسات' نئی ترامیم اور تازہ اضافوں کے ساتھ' پیش کروں گا جنہیں آپ اس طرح سماعت فرمایئے جس طرح پرانی گھسی پٹی فلم کے شائقین اس کا نام نہاد نیا پرنٹ دیکھتے ہیں جس میں یہ تک نظر نہیں آتا کہ اسکرین پر جو دو سائے نظر آ رہے ہیں ان میں سے ہیروئن کون ہے اور ہیرو کون۔۔۔۔ تخیل کی آنکھ پہ حسرت کی عینک لگا کر ان کو یعنی اپنے ہی ماضی کو

دیکھتے ہیں۔ جیسے دو سائے تمنا کے سرابوں میں ملیں۔

سرقے کی بدترین اور سب سے پھوہڑ شکل اپنے ہی فقروں کی تکرار اور اپنی ہی تحریر کی چوری ہے' جو صرف اس صورت میں جائز ہے کہ مصنف کو اللہ کی رحمت اور حاضرین کے حافظے کی کمزوری پر یقین کامل ہو۔ سو اسی اعتراف اور امید کے ساتھ گذارشات نو میں پرانی تحریر کے پیوند جا بجا لگائے ہیں۔ یہ نہ مقالہ ہے' نہ خطبہ عالمانہ' بلکہ سادہ پانی کا وہ گلاس ہے جو ریستوراں میں اچھی چائے سے پیشتر مفت ملتا ہے۔ آپ "رسما" چند گھونٹ لے لیں تو میں خود اسے اٹھا کر علیحدہ رکھ دوں گا۔ پھر بادۂ عارفانہ کا دور چلے گا۔

جب کسی شخص کے دشمنوں کی تعداد میں یکایک اور بلاوجہ زبردست اضافہ ہو جائے تو جاننا چاہیے کہ اس نے زندگی میں قابل ذکر اور قریبی دوستوں کے لئے ناقابل برداشت ترقی کی ہے۔ یعنی اس کی اپنی تمنا سے کم' مگر حاسدوں کی تاب سے زیادہ۔ جب یہ منزل آجائے تو ترقی کی رفتار کو مخالفین کے رشک و حسد کے درجہ شدت سے ناپا جا سکتا ہے۔ سو افتخار عارف اس دوست آزما مرحلے سے زخمی مگر سربلند گزرے ہیں۔ انداز ان کا فاتحانہ کم' فدویانہ زیادہ ہے۔ یہ ان کی شائستگی کا تقاضا' منصب کی مجبوری اور طبیعت کا ڈسپلن ہے۔ وہ مشاعروں میں جم کے پڑھتے ہیں اور کسی کو جمنے نہیں دیتے۔ اتنی کم مدت میں اتنی شہرت کمانے کے بعد کوئی شاعر اپنے ہم چشموں کا ہیرو نہیں بن سکتا۔ وہ خود کہتے ہیں کہ انہیں شہرت تو بہت ملی مگر اس کے نتیجے میں ملا کیا؟

اک خلعت دشنام و کلاہ سخن بد

قصور ان کا صرف اتنا ہے کہ اچھا شعر کہتے ہیں اور اس طرح پڑھتے ہیں کہ سمجھ میں نہ آئے تو دگنا مزہ دیتا ہے۔ محترمی ظفر اقبال صاحب نے کہ آشنائے رموز شعر و شہرت و دشنام ہیں' ایک منہ بولتی ردیف میں کیا حسب حال شعر نکالا ہے:

گمنام جو بھی رہتا ہے' عزت اس کی ہے
مشہور ہوئے گا' تو بہت خوار ہوئے گا

شعر لاجواب ہے' مگر ظفر اقبال صاحب کو گمنامی کا ذاتی تجربہ نہیں۔ ہم کہ یکے از انبوہ گمنامان پاکستان ہیں' اپنے تجربے کی بناء پر عرض کریں گے کہ بے عزتی تو گمنامی میں بھی ہوتی ہے' مگر اس طرح جیسے ایک روزہ دار دوسرے روزہ دار کو گالی دے۔

انہیں جو مقام، شہرت اور ستائش بال سفید ہونے سے پہلے ملی، وہ اردو شاعروں کو بالعموم مرنے کے بعد نصیب ہوتی ہے۔ یادش بخیر! تحسین سروری ایک معروف ادیب گزرے ہیں۔ آخری ایام میں مفلسی نے گھر میں ڈیرے ڈال دیئے تھے۔ کچھ اس کا سبب حالات تھے اور کچھ، بلکہ بہت کچھ، وہ خود ––– احباب نے مشورہ دیا کہ رائٹرز گلڈ سے رجوع کرو۔ تحسین سروری نے اپنی درخواست میں لکھا کہ رائٹرز گلڈ میری وفات کے بعد، حسب ضابطہ و دستور، میری بیوہ کو ایک ہزار روپے ماہوار وظیفہ دے گی۔ میری استدعا ہے کہ مجھے اس کا نصف یعنی پانچ سو روپے زندگی میں ہی دے دیئے جائیں تاکہ میں مرنے سے اور گلڈ دگنی زیر باری سے بچ جائے۔

افتخار عارف کو بھی حکومت برطانیہ نے قبل از پیری، پنشن کا حقدار تسلیم کر لیا ہے۔

وہ بڑے رکھ رکھاؤ کے آدمی ہیں۔ جو لوگ کسی لحاظ سے واجب الاحترام نظر نہیں آتے، انہیں بھی ––– بلکہ ادبدا کے انہیں کو تعظیم دیتے ہیں جس شخص سے افتخار عارف غیر معمولی تواضع و تکریم سے پیش آئیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اسے مافوق الفطرت حد تک نالائق سمجھتے ہیں۔ پہلے پیر چھوا کرتے تھے، اب گھٹنے کو ہاتھ لگاتے ہیں۔ خدا وہ دن جلد لائے جب ان کی گردن پکڑ سکیں۔ کہتے ہیں:

مٹی، پانی، آگ، ہوا، سب اس کے رفیق
جس کو اصول فرق مراتب آتا ہے

چار عناصر تو ان کے رقیب ہو گئے، مگر ان سب کا مجموعہ شوریدگی ––– انسان ––– نہ کبھی کسی کا ہوا، نہ ہو گا۔ ہر ایک سے تپاک اور گرم جوشی سے ملنے کا نتیجہ یہ نکلا کہ جن کے دلوں میں خود کھوٹ ہے ان کو یار کے پیار میں بھی P.R نظر آتا ہے۔ خود کو دنیوی اعتبار سے چوکس اور ہوش مند ثابت کرنے کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ دوسروں کی مروّمروت کو منافقت سے تعبیر کیا جائے۔

کوئی سادہ ہی اس کو سادہ کہے
ہمیں تو لگے ہے وہ عیار سا

افتخار عارف کے ذوق اور مزاج کا تھوڑا بہت اندازہ ان کی پسند و ناپسند کی

قطعیت اور تنوع سے ہوتا ہے۔ آیئے' پہلے ان کی چڑ پر نظر ڈالیں۔

عقس آدمی' شعر ناشناس باس' پینکرز' ہر قسم کی دال اور سبزی' صحیح سائز کی قیمض' بدن کی ہر وہ جنبش اور حرکت جس پر ورزش کا گمان ہو' چھوٹی بحر اور پختہ عمر والوں کی صحبت سے پرہیز کرتے ہیں۔

اب ذرا ان کی مرغوبات ملاحظہ ہوں:

پہلے نمبر پر سیخ کباب' دوسرے نمبر پر شامی کباب' تیسرے پر بہاری کباب' پھر کسی بھی قسم کا کباب جو دستیاب ہو۔ اس کے بعد بریانی جس میں چاول برائے نام ہوں' تیز مرچیں اور گرم مصالحہ اور اسی خاصیت کے تازہ ترین اسکینڈل۔ ہر قسم کا میٹھا جس میں شکر کے ساتھ کسی اور چیز کی ملاوٹ نہ ہو۔

نہ چھوٹے مجھ سے لندن میں بھی آداب شکر خوری

مرزا کہتے ہیں کہ یوروپین "میٹھے" ذیابیطس کے مریضوں نے ایجاد کئے تھے۔ سیاہ رنگ بھی پسند ہے بشرطیکہ غلط جگہ نہ لگا ہوا ہو۔ مطلب یہ کہ چہرے پر نہ ہو۔ کتاب سے عشق ہے۔ چنانچہ وہ چہرے بھی پسند ہیں جو اس سے مشابہت رکھتے ہوں۔ یعنی کتابی ہوں:

کہ دیکھیں جن کو یورپ میں تو دل ہوتا ہے سیپارہ

ان کے برعکس مرزا کو کتابی چہرے سے چڑ ہے' مگر اینگلوپیل خاتون کو قدر و شیفتگی کی نگاہ سے دیکھتے ہیں' بشرطیکہ وہ کسی اور کے نکاح میں ہو۔ تین "خ" کو دیکھ کر ان کی آنکھوں میں خون اتر آتا ہے۔ Triple "خ" مخفف سے مراد ہیں: خوبصورت خواتین کے خاوند۔ واضح رہے کہ یہ بات ہم نے مرزا کے بارے میں کہی ہے اور صرف یہ دکھانے کے لئے کہ چڑ کی کوئی معقول وجہ نہیں ہوا کرتی۔ افتخار عارف کو رات گئے تک گپ' بند گلے کا سفید کوٹ' سرخ موزے' جوانی کے مجروح جذبات سے میچ کرتی ہوئی ٹائی' یعنی لہولہان لال۔ زردی مائل سلک کی قمیض انہیں بھاتی ہے' اور سچ تو یہ ہے خوب پھبتی ہے۔

زرد رنگ پر یاد آیا کہ ایک دن ہمارے دوست پروفیسر قاضی عبدالقدوس نے اپنی جمالیاتی ترجیحات کا اعلان کرتے ہوئے فرمایا کہ انہیں بسنتی رنگ' گدرایا ہوا سڈول پن' چکنی جلد اور گداز Contours بہت پسند ہیں۔ اس پر مرزا عبدالودود بیگ بولے کہ یہ پانچوں خوبیاں "بدرجہ اتم" کراچی کے پپیتے میں پائی جاتی ہیں۔

کیسی شاعری اچھی ہوتی ہے اور کون سی بری' اس کی وضاحت' مولانا حالی کی طرح' بعض شاعر اپنے مقدمے میں کر دیتے ہیں اور بعض اپنے ہی اشعار سے یہ فرق ذہن نشین کروا دیتے ہیں۔ افتخار عارف نے نہ کمزور اور ڈھیلا شعر کہا' نہ ہماری طرح اپنا مقدمہ آپ لکھا کہ دوسرے تعریف کرنے میں بخل سے کام لیتے ہیں۔ ان کے پہلے شعری مجموعے "مہر دو نیم" کی ابتداء دو معرکتہ الآرا مقدموں سے ہوتی ہے۔ پہلے مقدمے میں فیض صاحب نے ان کی انفرادیت' آہنگ و عروض' لغت اور محاورے میں اجتہاد' ظلم و تعدی' جبر و زباں بندی کے خلاف احتجاج اور رزق کے اسیروں کی محتاجی اور تذلیل پر بڑے جامع اختصار کے ساتھ تبصرہ کیا ہے۔ اس مختصر مگر خوبصورت مقدمے کے ہوتے ہوئے' مخدومی و محبی پروفیسر گوپی چند نارنگ کے عالمانہ اور بھاری بھرکم مضمون کی' بحیثیت مقدمہ ثانی' چنداں ضرورت نہ تھی۔ چنانچہ بعض ادبی حلقوں میں اس پر چہ میگوئیاں بھی ہوئیں۔ جس کی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ ان حلقوں کو دونوں ممتاز بزرگوں کی متفقہ تعریف نے بے مزہ کیا۔ لیکن معترضین یہ بھول جاتے ہیں کہ افتخار عارف اپنی وضع احتیاط اور رکھ رکھاؤ کو کبھی ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ لکھنؤ میں یہ دستور تھا کہ بہو بیٹیاں' بالخصوص نئی نویلی دلہن' ڈولی میں بیٹھ کر کہیں جاتیں تو رستے میں کہاروں کو کندھا نہیں بدلنے دیتی تھیں اور روانہ ہونے سے پہلے ڈولی میں ایک پتھر رکھوا دیتی تھیں تاکہ کہاروں کو اصل وزن کا اندازہ نہ ہو سکے۔ بعض کمزور دل والے فقط وزن پر ہی عاشق ہو جایا کرتے تھے۔ سو محب گرامی قدر پروفیسر گوپی چند نارنگ کا مقدمہ وہ بھاری پتھر ہے جو چوم چوم کر چھوڑنے کی بجائے ساتھ رکھنے کے لائق ہے کہ ہما شما کی نظر بد سے بچاتا ہے۔

یہ ڈولی میں پتھر والی بات جب لندن سے سینہ اور سینہ بہ سینہ دلی پہنچی تو ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے بہت برا مانا۔ حالانکہ' خدا گواہ ہے' ہمارا مقصد صرف یہ واضح کرنا تھا کہ ایسی شاعری کسی سرٹیفکیٹ کی محتاج نہیں۔ عزیزم افتخار نے منہ سے تو کچھ نہ کہا کہ وہ ہماری محبت' خلوص نیت اور پھوہڑ پن پر یقین کامل رکھتے ہیں' مگر اس واقعے کے بعد ہم نے دیکھا کہ ہم کوئی مضمون پڑھ رہے ہیں تو ایسی گونگی تالی بجانے لگے جس میں دونوں ہاتھ تو ملتے ہیں' آواز بالکل نہیں نکلتی۔ آج صبح ہم نے برادرم مشفق خواجہ سے اپنی الجھن اور دونوں عزیز دوستوں کی آزردگی کا ذکر مشورۃً کیا تو فرمایا کہ ان سے کہہ دیجیے کہ میں اب ڈولی سے یہ پتھر اس وقت تک نہیں نکال سکتا جب تک تم کسی دوسرے پردہ نشین کی ڈولی کا پتہ فراہم نہ کرو جس میں یہ پتھر

رکھ سکوں۔

لندن کی اس خوبصورت اور یادگار تقریب میں میں نے اعتراف کیا تھا کہ میں نے کبھی شعر نہیں کہا' اور از بسکہ میرے کام نثر سے اچھے خاصے نکل جاتے ہیں' اس لئے آئندہ شعر کہنے کا کوئی احتمال بھی نہیں۔ میں نقاد بھی نہیں کہ اچھے اور برے شعر میں تمیز کر سکوں۔ نہ میری صحت اس کی اجازت دیتی کہ کسی بھی برے شاعر کو اس کے صحیح مقام سے آگاہ کر سکوں۔ غالباً کیا' یقیناً' ان ہی خامیوں کی بناء پر آپ نے مجھے اظہار رائے کی دعوت دی ہے۔ میں نے اس دن یہ بھی عرض کیا تھا کہ دراصل مجھ جیسے نثر نگار کا فیض صاحب کے سامنے شعری محاسن پر گفتگو کرنا ایسا ہی ہے جیسے کوئی بکری کچھار میں جا کر شیر کو Vegetarianism کے فوائد و فضائل پر لیکچر دے۔ میرا خیال ہے کہ اس ضمن میں افتخار عارف ہی سے رجوع کرنا چاہیے کہ وہ اچھا شعر کہنے کے علاوہ شعر اور شاعر کے پارکھ بھی ہیں۔ وہ خراب شعر' نیم گرم دوستی' صحیح سائز کی قمیض اور ٹھنڈا کباب برداشت نہیں کر سکتے۔ خراب شعر' نثری نظم اور بے رس نثر لکھنے والوں کے بارے میں ایک زمانے میں افتخار عارف کا عقیدہ تھا کہ ان کی نماز جنازہ حرام ہے۔ یہ بھی پرانی تہذیب کی شائستگی' اور موجودہ کلچر کی مجبوری ہے کہ بد کو جس نے خلق خدا کی زندگی عذاب کر دی ہے' کبھی زندگی میں روکتے تھے' نہ ٹوکتے تھے۔ اس کے غسل میت اور تجہیز و تکفین کے بعد اس کا جنازہ سامنے رکھا جاتا اور لوگ ہر طرح سے اطمینان کر لیتے کہ اب یہ اٹھ کر ذلیل نہیں کر سکتا تو پہلی بار اس کے بارے میں سچ بولتے تھے' اور نماز جنازہ حرام ہونے کا فتویٰ دیتے تھے۔ پہلے ہم موت سے نہیں ڈرتے تھے' مگر اب ہمیں محض افتخار عارف کے فتوے کی وجہ سے موت سے ڈر لگنے لگا ہے۔ اس لئے کہ پشتو محاورے کے مطابق ہم اپنا مردہ خراب نہیں کروانا چاہتے۔

اس زمانے میں خراب شاعر کے لئے افتخار عارف نے ایک اصطلاح وضع کر رکھی تھی "بکری شاعر"۔ شعر و شاعری سے بیزاری کی وجہ تو ہماری سمجھ میں بھی آتی ہے لیکن بکری میں ہمیں پہلی نظر میں اس کے علاوہ کوئی خرابی نظر نہیں آتی کہ افتخار عارف اس کے کباب بڑے شوق سے کھاتے ہیں۔ واد افتخار عارف خراب شعر کی بھی دیتے ہیں کہ یہ ان کی شائستگی اور آداب سماعت کا تقاضا ہے۔ مگر اتنے فرق کے ساتھ کہ اچھے شعر پر سینہ پہ ہاتھ رکھ کر سبحان اللہ' سبحان اللہ! کہتے ہیں۔ برا شعر سنتے وقت ان کے منہ سے کچھ عجیب و غریب

آوازیں نکلتی ہیں جو داد سے مشابہ ضرور ہوتی ہیں، مگر ڈکشنری میں نہیں ملتیں۔ لگاتار خراب شعر سننے پڑیں تو وہ سر پیٹنے کی بجائے دائیں ہاتھ سے بار بار اپنا زانو پیٹتے ہیں۔ اگر شعر بہت ہی خراب ہو تو اٹھ کر اپنے مخصوص انداز میں شاعر کے گھٹنے پکڑ لیتے ہیں جس کی بظاہر یہی وجہ معلوم ہوتی ہے کہ کہیں وہ شعر سنا کر بھاگ نہ جائے اور یہ اسے اپنی تازہ غزل بھی نہ سنا سکیں۔

افتخار عارف ایک لطیفہ ایک ذہین اور منہ پھٹ شاعر کے حوالے سے سناتے ہیں۔ اس نے ایک شاعر سے جو ۵۰ سال سے بڑی لگن اور مستقل مزاجی سے شعر کہہ رہے تھے، پوچھا "کیا آپ کو کبھی یہ خواہش نہیں ہوتی کہ میں بھی اچھے شعر کہہ سکتا!

افتخار عارف لندن میں کوئی چودہ سال مشاعرے لوٹتے رہے۔ امریکہ، کینیڈا اور یورپ میں بھی برابر شبخون مارتے رہے۔ لندن میں ہم نے ان کی پذیرائی اور مقبولیت کا یہ عالم دیدہ رشک و حیرت سے دیکھا کہ جب ان کے اہل خانہ و خاندان لندن میں نہیں ہوتے تھے تو روزانہ ان کے فلیٹ کے دروازے پر کوئی فین، ٹفن کیریئر یا Plastic Container میں تازہ کھانا رکھ جاتا تھا۔ کبھی ایک سے زیادہ گھر سے آیا ہوا ڈبہ بھی دیکھا گیا۔ یہ غیبی سلسلہ مہینوں جاری رہتا۔ یہ تو ہم نے سن رکھا تھا کہ حضرت موسیٰ کی ناشکری امت پر آسمان سے من و سلویٰ اترا کرتا تھا، اور یہ بھی سنا تھا کہ اللہ شکر خورے کو شکر دیتا ہے۔ لیکن یہاں تو شکر، مع شکر دانی نازل ہو رہی تھی! ایک دفعہ ہم بھی تنہائی اور غذائی قلت کا شکار ہوئے تو ایک بھرا ہوا ٹفن کیریئر، سرخ ربن اور Scented پرچی سمیت، جو ان کی دہلیز پہ رکھا تھا، چپ چپاتے اٹھا لائے کہ بھوک اور دوستی میں خیانت مجرمانہ جائز ہے۔ کیا عرض کریں، ہر خانے میں ایک لذیذ ڈش اور ہر ڈش سے کھانے کی خوشبو کے علاوہ بوئے وفا کی لپٹیں بکثرت آئیں۔ شعر کی داد، نرگسی کوفتے اور شاہی ٹکڑے سے ملتی ہم نے اس سے پہلے نہیں دیکھی تھی۔ ہم لکھنے کے باب میں نہایت کاہل اور ست رفتار واقع ہوئے ہیں۔ بارہ سال بعد ہماری ایک کتاب آئی ہے۔ لیکن ہماری نثر کی تعریف میں اگر کوئی ہمیں ارد کی دال سے بھی نواز دے تو ہم روزانہ لکھنے کے لئے تیار ہیں۔ ہمارا مطلب شکریے کا خط لکھنے سے ہے۔ اس پر یاد آیا کہ دال نہ صرف یہ کہ افتخار عارف کبھی نہیں کھاتے، گھر میں پکنے بھی نہیں دیتے کہ بگھار کی بو سے شعر کا نزول بند ہو جاتا ہے۔ سبزی کو صرف ہمارا اور چوپایوں کا حق سمجھ کر چھوڑ دیتے ہیں۔

انہوں نے اپنی ایک مشہور نظم میں خود کو بارہواں کھلاڑی کہا ہے جو اس انتظار

میں بیٹھا گیندیں گنتا رہتا ہے کہ کوئی کھلاڑی زخمی ہو تو اس کے عوض اسے بھی کھیلنے کا چانس ملے۔ یہ بھی ان کی کسرِ نفسی ہے۔ ہمیں تو وہ کسی طرف سے بارہویں کھلاڑی نظر نہیں آتے۔ ہر لحاظ سے جاوید میانداد ہیں۔

جہاں تک ان کے شعری شجرے کا تعلق ہے' انہوں نے اپنا سلسلہ کرامت اکابرین ثلاثہ تک پہنچایا ہے:

انیس' آتش' یگانہ محرمان عالم حرف

اور اب اس سلسلے کی آبرو ہم سے رہے گی

ایک اور سیاق و سباق میں' حریف حرف باریاب کو متوجہ کرتے ہیں:

مرے مہربان! کبھی اک نظر مرا سلسلہ بھی تو دیکھیے ہم انہیں ان کی پسند کے عروضی اور معنوی رشتے جوڑنے سے منع نہیں کرتے لیکن ہمارا خیال ہے کہ اچھے شاعر کا سلسلہ خود اس سے شروع ہو کر اسی پر ختم ہو جاتا ہے۔ افتخار عارف اپنے منفرد ڈکشن اور لہجے کی بناء پر اسی قبیلہ خود فگن و خود نسبتی سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ امر ان کے لئے باعث فخر ہونا چاہیے کہ وہ بے استادے' بے پیرے اور ادبی اعتبار سے غیر مقلد ہیں۔ غالب نے ایک خط میں مکتوب الیہ کے کلام کی اصلاح کرنے سے معذرت کرتے ہوئے بڑی خوبصورت تاویل پیش کی تھی۔ کہنا یہ چاہتے ہیں کہ ضعیف ہو گیا ہوں۔ ہاتھوں میں ہی نہیں آنکھوں میں بھی دم نہیں رہا۔ تم بھی اصلاح کے محتاج نہیں رہے۔ لکھتے ہیں: "شیر اپنے بچے کو ایک مدت تک آئین شکار سکھاتا ہے۔ جب وہ جوان ہو جاتا ہے تو خود بے اعانت شیر شکار کیا کرتا ہے۔" اسی استعارے کو جاری رکھتے ہوئے عرض پرداز ہوں کہ افتخار عارف جوان ہونے سے پہلے ہی شکار کھیلنے لگے تھے۔ اور شکار بھی بے اعانت شیر۔ بے اعانت شیر اس لئے کہ خود شیروں کا شکار کرنے لگے تھے۔ چنانچہ اب انہی کی کھال پہ بیٹھ کے فکر سخن' یاد خدا اور ذکر بتاں کرتے ہیں۔

رہا اس سلسلے کی آبرو سلامت رہنے اور رکھنے کا سوال' تو اس میں کلام نہیں کہ افتخار اپنے سلسلہ عارفانہ اور منفرد طرز تغزل کی آبرو ہیں۔ اور اس آبرو کو بچانے کی خاطر ہی وہ ایک ہاتھ سے اپنی دستار تھامے رہتے ہیں اور دوسرے سے دشمن کا گھٹنا سہلاتے ہیں۔ اگر تیسرا ہاتھ ہوتا تو اس سے بھی ضرور کچھ کام لیتے۔

حرف کو شائستہ شعر بننے میں بہت سے جانگسل مرحلوں سے گزرنا پڑتا ہے۔

فرجام سخن گوئی، یعنی شعر گوئی کے کمال کو غالب نے رگ گفتار سے خون جگر کشید کرنے سے تشبیہ دی ہے۔

خون جگر است از رگ گفتار کشیدن

علامہ اقبال نے مولانا گرامی کے نام اپنے ایک خط میں لکھا ہے کہ "جہاں اچھا شعر دیکھو، سمجھ لو کہ کوئی نہ کوئی مسیح مصلوب ہوا ہے۔"

افتخار عارف، اپنے فن کے آداب اور ہنر کے ڈسپلن سے بخوبی واقف ہیں۔ وہ بے اختیار آہ کو آمد اور ریاض کو آورد نہیں سمجھتے۔ جذباتی اعتبار سے بھی انہوں نے کچھ منزلیں طے اور معرکے سر کئے ہیں۔ کوئز پروگرام "کسوٹی" والا جوان جو اپنی معلومات عامہ اور کتابی علم کی مار سے بڑے بڑوں کو چت کر دیتا تھا اور بیس سوالوں میں شخصیت کا تیا پانچہ کر کے رکھ دیتا تھا، اب سیانا ہو کر خود بڑے بڑے سوال اٹھانے لگا ہے۔ وہ اکہرے بدن والا سانولا سلونا جوان جو اپنی پیشانی پر بڑی محنت سے بکھیرے ہوئے بالوں کو بار بار گردن کے جھٹکے سے بظاہر درست، مگر فی الحقیقت مزید بکھیرتا چلا جاتا تھا، وہ ہمیں اس لئے اور بھی یاد ہے کہ ہمارے سر پر اس زمانے میں بھی فالتو بکھیرنے کے لئے تو بہت بعد کی بات ہے، کنگھا تک کرنے کے لئے بال نہیں تھے۔ اب اس جوان کے بال زندگی کی دھوپ میں سفید ہو چلے ہیں۔

میں نے کہیں اور عرض کیا ہے کہ افتخار عارف کے پہلے مجموعے "مہر دو نیم" اور "حرف باریاب" کے درمیان دس سال، ایک بر اعظم، ہزاروں میل کی مسافتیں، چند چاند چہرے ایک خواب نیم روز اور خود افتخار عارف حائل تھے۔ یہاں تک پہنچنے میں انہیں دنیا کا سب سے لمبا سفر طے کرنا پڑا۔ یعنی حصار ذات سے نکل کر زندگی کو دیکھنے، سمجھنے اور پرکھنے اور جو کچھ دیکھا ہے وہ دوسروں کو دکھانے کی سعی مسلسل جو فنی اظہار و ابلاغ کی اصل غایت ہے۔ اس سفر نے ان کے لہجے کو نئی تاب و توانائی بخشی ہے۔ وہ اپنی بات جم کے کہتے ہیں۔ پورے یقین کے ساتھ کہتے ہیں اور خوب کہتے ہیں۔ کہیں کہیں طیش و ملال سے آواز بھر آتی ہے، مگر اس کی گونج اور گمک نہیں جاتی۔ عجز کا اظہار بھی کرتے ہیں تو اپنی کلاہ کو کج ہی رہنے دیتے ہیں۔ مزاجاً ان کا ادبی رشتہ یگانہ سے ملتا ہے۔ وہ عزت نفس اور سربلندی کے شاعر ہیں۔ ان کا آہنگ رجزیہ اور لہجہ احتجاجی ہے۔ ان کے ہاں صرف تراکیب اور دلکشی کا شکوہ ہی نہیں، لہجے کا شکوہ اور ایک شائستہ فن شگفتگی اور ہمہ بھی ہے۔ ان کا لہجہ ان کے حرف کا اعتبار اور سمپورن نجات ہے۔

جب لفظ اپنی چھل بل دکھا کر اپنا جانا پہچانا مفہوم بیان کرنے کے بعد ہاتھ باندھے چپ کھڑے ہو جاتے ہیں، تب لہجہ بولنے لگتا ہے۔ پھر اس کے اتار چڑھاؤ، گونج گرج اور مدھم نکھاٹ اور گندھار سے معانی اور اشارت کے نئے سوتے اور نئی دھیان دھارائیں پھوٹ نکلتی ہیں۔ پھر شاعر اپنے باغ معانی کی بہار دکھاتا ہے۔

شعر ملاحظہ ہوں:

جو ہوا کے رخ پہ کھلے ہوئے ہیں، وہ بادباں تو نظر میں ہیں
وہ جو موج خوں سے الجھ رہا ہے، وہ حوصلہ بھی تو دیکھتے
یہ گلو گرفتہ و بستہ رسن جفا، مرے ہم قلم
کبھی جابروں کے دلوں میں خوف مکالمہ بھی تو دیکھتے

صاحبو! یہ افتخار عارف ہی کا ہنر اور حوصلہ ہے کہ اتنی اضافتیں لگانے کے باوجود بیس بیس ہزار سامعین والے مشاعرے لوٹ لیتے ہیں۔

"مہر دو نیم" والا ناسٹلجیا جو انھیں ہر تیسری غزل اور نظم میں رہ رہ کر ستاتا تھا، اب سال بسال، کوچہ بکوچہ، چہرہ بہ چہرہ، یار بہ یار اور یاد بہ یاد کم ہو رہا ہے اور بڑی تیزی سے کرب حال اور فرحت امروز کو جگہ دے رہا ہے۔ ہجرو فراق کے میٹھے میٹھے درد اور احساس محرومی و خود رحمی کی جگہ اب وہ کھل کر سرشاری شب گذشتہ اور نشاط وصل کی بات کرتے ہیں:

وہ بدن کہ بوسہ آتشیں میں جلا بھی پھر بھی ہرا رہا
وہ بدن کہ لمس کی بارشوں میں دھلا بھی پھر بھی نیا رہا
وہ بدن کہ وصل کے فاصلے پہ رہا بھی پھر بھی مرا رہا

ہمارے ہاں جسم کوئی تقدس نہیں رکھتا۔ بدن کے شور انگیز تقاضوں کو غیر شاعرانہ، اسفل اور ناپاک سمجھا جاتا رہا ہے۔ وصل کے خیال سے معشوق کو اتنی خفت نہیں ہوتی جتنی کہ خود عاشق صادق کو۔ اس کے کئی سبب ہو سکتے ہیں۔ مثلاً خوف الٰہی و اہلیہ، شدت شرافت بسبب غلبہ پیری و ضرورت شری۔ یہ نکتہ قابل غور ہے کہ ہمارے ہاں بزرگوں کی موت اور محبوبہ سے ملاپ کے لئے ایک ہی لفظ استعمال ہوتا ہے۔۔۔۔ وصال!

افتخار عارف آج سے سترہ برس قبل جب لندن وارد ہوئے تو ان کی بیاض میں ایسے مچلتے بلکتے شعر بھی تھے:

تجھ سے بچھڑ کر زندہ ہیں
جان! بہت شرمندہ ہیں

یہ Adolescent شعر سمجھ دار مردوں اور ناسمجھ خواتین میں بہت "ہٹ" گیا۔ اگر "بچھڑ" کی بجائے "بچھڑ" پڑھا جائے (تجھ سے بچھڑ کر زندہ ہیں) تو شعر ایک اور ہی مزہ دے گا۔ رہی شرمندہ ہونے کی بات' سو لندن کا ایک سفر اس شرمندگی کو دور کر دیتا ہے۔ ہم جیسے سادہ دل ادیبوں اور افتخار جیسے شاعروں کے عالم حیرت کا اندازہ کیجیے جب وہ پہلے پہل ایسا نظارہ دیکھتے ہیں جو عزائم کی بجائے:

جرائم کو سینے میں بیدار کر دے
نگاہ مسلماں کو تلوار کر دے

دو سفر اور ایک سفرنامے کے بعد تو قلب ایسا گداز ہو جاتا ہے کہ پھر کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ:

میموں کو شکایت ہے' کم آمیز ہے مومن

لیکن ملاحظہ کیجیے' یہی شاعر پندرہ برس بعد کیسے نازک مرحلے سے کس فنکارانہ ضبط سے گزر جاتا ہے:

مرا خوش خرام بلا کا تیز خرام تھا
مری زندگی سے چلا گیا تو خبر ہوئی

یہ شعر صرف وہی شاعر کہہ سکتا ہے جو اس مرحلے سے گزرا ہو اور اس کی داد بھی وہی "بے خبرے" والا دے گا جس کا شہر بھنبھور لٹ چکا ہو۔

ان کے ہاں سیاسی واقعات و حوادث پر بھی گہرا' جامع اور اداس کر دینے والا کمنٹ ملتا ہے:

وہی ہے خواب جسے مل کے سب نے دیکھا تھا
اب اپنے اپنے قبیلوں میں بٹ کے دیکھتے ہیں

اس پر مرزا عبدالودود بیگ کا کمنٹ بھی سن لیجیے۔ کہتے ہیں' ملک کی تعمیر و ترقی کے کام کے لئے بڑی محنت اور ذہانت درکار ہے۔ ملک بنانا اور اسے مضبوط کرنا تو بہت بڑی بات ہے' ہمارے بعض سیاست داں تو اتنے نالائق ہیں کہ ملک توڑ بھی نہیں سکتے جس کی وہ برسوں سے برابر کوشش کر رہے ہیں۔

افتخار عارف کا ذکر ہمارے یار طرح دار اور البیلے شاعر ساقی فاروقی کو درمیان میں لائے بغیر مکمل نہیں ہوتا۔ ان کے مناقشے کا شمار اردو ادب کے تاریخی معرکوں مثلاً انشاء و مصحفی، نیازمندان لاہور اور دہلوی گروپ، جوش ملیح آبادی اور شاہد احمد دہلوی میں ہونا چاہیے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ معرکہ یک طرفہ تھا۔ افتخار عارف شاعری میں مزاحمتی انداز اور رجزیہ لہجہ اختیار کر لیتے ہیں، لیکن مزاج ان کا جنگجویانہ نہیں ہے، جب کہ ساقی فاروقی اپنے آپ سے بھی جنگ کرتے رہتے ہیں۔ خود کو کئی بار دنداں شکن شکست دے چکے ہیں۔ بطور تعارف اتنا بتا دینا کافی ہو گا کہ ساقی اردو کے ایک نہایت خوبصورت، حد درجہ اوریجنل اور غالباً سب سے بڑے جلالی شاعر ہیں۔ غالباً کی پخ اس لئے لگانی پڑی کہ ہم نے کسی اور جلالی شاعر سے مات اور مار نہیں کھائی۔ پچیس تیس برس سے لندن میں مقیم اور دوستوں سے برسرپیکار ہیں۔ جس کو دوست رکھتے ہیں، اسے پھر کہیں کا نہیں رکھتے۔ بلکہ وہ پھر ان کے لائق بھی نہیں رہتا۔ جدید مغربی شاعری اور ادبی رجحانات سے جو براہ راست واقفیت ساقی رکھتے ہیں وہ کسی اور کے حصے میں نہیں آئی۔ خالص اور تازہ ترین مغربی Contemporary Diction کے اگر وہ تنہا شاعر نہیں تو سب سے ممتاز شاعر ضرور ہیں۔

ساقی اپنی آسٹرین بیگم کو پیار میں گنڈی اور Rottweiler کتے کو کامریڈ کے نام سے پکارتے تھے۔ کتا تو اپنے نام اور ساقی کے پیار کی تاب نہ لا کر جاں بحق ہو گیا۔ مینڈک، کتے، بلی، خرگوش، مکڑے، بلے وغیرہ پر بہت خوبصورت اور خیال انگیز نظمیں لکھی ہیں۔ چار ٹانگوں سے کم کے کسی ذی روح سے ساقی محبت نہیں کر سکتے۔ جب سے انہوں نے اعلان کیا ہے کہ وہ ہم سے محبت کرتے ہیں، ہم راتوں کو اٹھ اٹھ کر اپنی ٹانگیں ٹٹول ٹٹول کر گنتے ہیں کہ کہیں ہم اپنے بارے میں کسی مغالطے میں تو مبتلا نہیں رہے ہیں۔ جس دن سے وہ ہم پر مہربان ہوئے ہیں، انہوں نے زمین پر قدم رکھنا چھوڑ دیا ہے۔ مطلب یہ کہ ان کا ہر قدم ہماری دستار فضیلت پر پڑتا ہے۔ نازک مزاج ایسے کہ بور آدمی، کلیشے، خراب شعر اور نیک چلن عورت کو ایک منٹ بھی برداشت نہیں کر سکتے۔ جن دوستوں کو بہت عزیز رکھتے ہیں ان کو خطوں میں القاب کے بجائے گالیاں لکھتے ہیں۔ ان کے مکتوب الیہم ان سڑی گالیوں کے اس درجہ عادی ہو گئے ہیں کہ ساقی اگر شریفانہ لہجے میں گفتگو کریں تو دونوں ہی اجنبیت محسوس کرتے ہیں۔ چنانچہ ایک دفعہ محبی و مشفقی اسد محمد خاں صاحب نے ساقی کے نام اپنے خط میں بڑے دکھ بھرے لہجے میں شکایتاً"

لکھا کہ سور! تم نے پچھلے خط میں مجھے گالیاں کیوں نہیں لکھیں! اس کی وجہ ہمیں تو یہی معلوم ہوتی ہے کہ اس زمانے میں ساقی سور پر ایک نظم لکھ رہے تھے جو شائع ہو چکی ہے۔

اب ذرا شعر دیکھئے اور شاعر کے تیور دیکھئے:

سفر میں رکھ' مجھے میری جدائیوں سے پرکھ
فراق دے' مجھے خاک وصال میں نہ ملا
مجھ میں سات سمندر شور مچاتے ہیں
ایک خیال نے دہشت پھیلا رکھی ہے

جو شخص ایسا شعر کہہ سکتا ہے اس پر سات خون معاف ہیں۔ اس سے ہماری مراد سات خود کشیاں ہیں کہ اس غضب کے اور غضب ناک شاعر کے ہاتھ اپنے ہی جیتے جیتے خون میں رنگے ہوئے ہیں۔

چھ سات برس پہلے تک گلے میں چھوٹے بڑے' رنگ برنگے موتیوں اور منکوں کی مالا پہن کر ساقی گھن گرج کے ساتھ شعر پڑھتے تو لوگ شاعری سے چکاچوند ہو کر موتی گننے لگتے۔

حسن شعر خوانی میں جب جلالی لہجے اور اعلیٰ درجے کے اسکاچ وہسکی کی ملاوٹ ہو جائے تو شعر سہ آتشہ ہو جاتا ہے۔ پڑھت اس قیامت کی کہ ایک ایک لفظ کو زندہ کر کے سامنے لا کھڑا کرتے ہیں۔ خرگوش' کیڑے یا مینڈک پر نظم پڑھتے ہیں تو بالکل وہی بننے کی بڑی کامیاب کوشش کرتے ہیں۔ ایسی ڈرامائی طرز ایجاد کی ہے جس میں اپنے تمام اعضاء استعمال کر کے سننے والے کے پانچوں حواس پر چھا جاتے ہیں۔ جیسے ڈوب کے شعر کہتے ہیں' اسی طرح ڈوب کر پڑھتے ہیں' اور بعض اوقات اتنی گہرائی یعنی شاعر ڈباؤ گہرائی میں اتر جاتے ہیں کہ خود تو نکل آتے ہیں مگر ہم جیسے مداحوں کو یہ کہہ کر وہیں چھوڑ آتے ہیں کہ برادر عزیز! جہاں بھی' خوش رہو!

تو یہ ہیں ہمارے یار طرح دار ساقی فاروقی جن کی سرد جنگ افتخار عارف سے کوئی دس برس سے چلی آتی ہے۔ ایک دن بیٹھے بیٹھے نہ جانے کیا جی میں آئی کہ اپنے دوست یعنی افتخار عارف کو ایک ۳۶ صفحوں کا خط لکھ مارا جس میں ان کی مبینہ بشری کمزوریاں ایک ایک کر کے گنوائیں اور اس فرد جرم کی ڈیڑھ دو سو کاپیاں انگلستان' پاکستان اور ہندوستان احباب کو

ارسال کر دیں۔ اگر ۳۶ صفحوں کے خط میں آپ ایک خطائی صفحہ بھی فرض کر لیں تو ہم جیسا تجربہ کار بینکر بھی انگلیوں پر حساب لگا کے بتا سکتا ہے کہ کتنی خطائیں ہوئیں۔

خط اتنا پر تاثیر تھا کہ جس نے پڑھا یہ جانا کہ یہ خرابی تو مجھ میں بھی ہے۔ بعضوں نے عزیزم افتخار عارف کو رشک و حسد کی نگاہ سے دیکھا کہ فلاں گناہ ہم سے کیوں نہ سرزد ہوا۔ سب لذائذ عزیزم ہی کے حصے میں کیوں آ گئے۔ افتخار عارف نے جواباً اپنے حریف پر حملہ نہیں کیا۔ نہ الزامات کی تردید کی۔ نہ کوئی بیان اپنی صفائی میں دیا۔ وہ اب بھی ساقی سے ملتے اور انہیں ساقی بھائی کہتے ہیں۔ البتہ پھبتیوں کا تبادلہ ہم جیسے مشترک و مخلص دوستوں کے توسط سے ہوتا رہتا ہے۔ کبھی جنگ بندی ہو بھی جاتی ہے تو یار لوگ اپنی طرف سے پھبتیاں گھڑ کے دبی ہوئی چنگاریوں کو پھر سے ہوا دیتے ہیں۔ یہ واقعہ ہم نے ذرا مفصل تعارف و پس منظر کے ساتھ اس لئے نقل کیا کہ اس سے افتخار عارف کے مزاج و ردعمل اور رکھ رکھاؤ پر روشنی پڑتی ہے۔

ان کے بعض اشعار کی شان نزول خود نوشت کا پتہ دیتی ہے۔ عشقیہ اشعار کی شرح وہ خود کریں کہ اپنی واردات قلبی میں وہ بزرگوں کی شرکت کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتے۔ سردست 'بی سی سی آئی--- باعث رسوائی--- سے سروکار ہے۔ افتخار عارف کے ذاتی تعلقات بینک کے ارباب حل و عقد سے ہمیشہ مخلصانہ و برادرانہ رہے لیکن ان کے متکبرانہ انداز اور ادارے کے خوشامدانہ اور تملق ساز ماحول سے وہ ہمیشہ بیزار اور شاکی ہی نظر آئے۔ لندن کے ابتدائی دور کا ایک شعر ہے جو افتخار سلمہ نے بڑی جرأت سے ان کی موجودگی میں بھی سنایا جن کے بارے میں کہا تھا:

روز اک تازہ قصیدہ نئی تشبیب کے ساتھ
رزق برحق ہے' یہ خدمت نہیں ہو گی ہم سے

پھر رفتہ رفتہ وہ اس ماحول کو گوارا کرنا سیکھ لیتے ہیں۔ دل گرفتہ نظر آتے ہیں' مگر گلو گرفتہ نہیں۔ لیکن اب شکایت اپنے آپ سے ہے:

ہوس لقمہ تر کھا گئی لہجے کا جلال
اب کسی حرف کو حرمت نہیں ملنے والی

اب انہیں یہ ملال ہے کہ:

آسودہ رہنے کی خواہش مار گئی ورنہ
آگے، اور بہت آگے تک جا سکتا تھا میں

ان کی انا کو اس ملازمت سے زبردست دھچکا لگا:

بیچ آئے سر قریہ زر جوہر پندار
جو دام ملے ایسے مناسب بھی نہیں تھے

البتہ دوسرے مصرعے سے ہمیں اتفاق نہیں۔ حق کا اعلان لازم ہے۔ بی سی سی آئی نے سب کو، جن میں خاکسار بھی شامل ہے، دام جو مناسب تھے، ان سے بھی زیادہ دیئے، اور فارن ایکسچینج میں دیئے۔ بی سی سی آئی نے اپنے نمک خواران قدیم کی انا کا جنازہ ہمیشہ انہی کی بہت بڑی مرسیڈیز پر نکالا اور مرحومین کو ان کی گوری سکریٹریوں نے بچشم بے اشک قبر میں اتارا۔ عجب آزاد مرد تھے۔ حق شاید ان کی مغفرت کر دے۔ پاکستان اور پاکستانی کبھی معاف نہیں کریں گے۔

لندن کے تیسرے اور آخری دور میں "نان و نمک و وعدۂ دیوار تحفظ" کا سلسلہ ختم ہو جاتا ہے۔ کھوکھلی دیوار زر اپنے زیر سایہ پناہ گزینوں پر گرتی ہے کہ اسے ایک نہ ایک دن گرنا تھا۔ لیکن وہ مرثیہ نہیں کہتے۔ ایک حقارت کے ساتھ وقائع نویسی کرتے ہیں:

قیمت خلعت زر بر سر بازار گری
جس کے ہر پیچ میں نخوت تھی وہ دستار گری

کوئی دو برس قبل جب ہم بی سی سی آئی سے رخصت ہوئے تو انہوں نے یہ شعر پہلے پہل سنایا تھا:

ایک درویش خوش اقبال کے جانے کی تھی دیر
پھر تو وہ دھوپ کا بوجھ آیا کہ دیوار گری

پھر تو یہ احوال ہوا کہ بی سی سی آئی سے جو بھی گناہ گار نکالا گیا، اس نے یہی سمجھا کہ وہ درویش میں ہی ہوں۔

اور بھی بہت سے اشعار جو میں اس لئے نہیں پڑھوں گا کہ افتخار عارف کی آواز اور لہجہ کہاں سے لاؤں۔

ان کا مزاج کلاسیکی اور ڈکشن جدید ہے۔ المیہ کربلا اور اس سے متعلق امیجری کو انہوں نے بڑی پرکاری، توانائی اور تازگی کے ساتھ استعمال کیا ہے۔ مزاجاً" وہ ایک مذہبی آدمی

ہیں۔ یہی روایت اور اس سے وابستہ تلمیحات اور تمثیل کاری ان کے شعر کی زرتار بنت میں بار بار ابھرتی ہیں۔ وہ جب عمرے پر جانے لگے تو ہم نے انہیں دو نصیحتیں کی تھیں جن پر انہوں نے عمل بھی کیا۔ اول یہ کہ جس دوست یا واقف کار کا نام عمرے کی عبادات و مناسک کے دوران میں اتفاقاً بھی یاد آ جائے اس کے حق میں دعائے خیر ضرور کرنا۔ انہوں نے پختہ عہد کیا۔ ان کا بیان ہے کہ خانہ کعبہ کے ملتزم پر وہ گریہ و زاری کے ساتھ دعا مانگ رہے تھے کہ اچانک دو ایسے شاعروں کے نام یاد آ گئے جن سے ان کے تعلقات اس قدر کشیدہ تھے کہ ایک دوسرے کا مصرع اٹھانا چھوڑ دیا تھا۔ افتخار یہ بھی فیصلہ نہیں کر سکتے تھے کہ ان حضرات کا کلام زیادہ خراب ہے یا کردار۔ اتفاق سے وہ دونوں شاعر ان دنوں بیمار تھے۔ جیسے ہی ان کے نام ذہن میں آئے' لرز گئے' قدرے تامل کیا' پھر دعا مانگی کہ بار الہا! تو ان کی صحت تو بہتر کر دے' مگر کلام کو ویسا ہی رہنے دے۔

دوسری نصیحت ہم نے یہ کی تھی کہ عزیزم! جب بھی عمرے پر جاؤ کم از کم ایک گناہ سے توبہ کرو اور توبہ پر سختی سے عامل رہو۔ ایک گناہ سے تائب ہو کر پہلے عمرے سے بہت خوش خوش لوٹے۔ لیکن دوسرے عمرے کے بعد کچھ بجھے بجھے۔ حسرت زدہ اور ہم سے شاکی سے لگے۔ اللہ جانے گناہ پہلے ختم ہوئے یا فارن ایکسچینج' تیسری مرتبہ عمرے پر نہیں گئے' کہتے ہیں ابھی میری عمر ہی کیا ہے۔

(یہ مضمون "حرف بارِیاب" کی رسم اجراء میں شیرٹن میں ۷ مئی ۱۹۹۴ء کو بحیثیت مہمان خصوصی پڑھا گیا۔) (چیدہ چیدہ حصے)

# فالتو آدمی

انتظار حسین

اپنے پاک ٹی ہاؤس کے نصیب اچھے ہیں۔ وضع داروں سے کبھی خالی نہیں رہتا۔ خیر اس کا وہ زمانہ تو گذر گیا جب دیوانے اس کے کھلنے کے ساتھ صبح کرتے تھے اور اسے بند کرا کے رخصت ہوتے تھے۔ مگر اس گئے گذرے زمانے میں بھی اس کی مٹھی میں کم از کم ایک دانہ تو ایسا ہے کہ روز بلاناغہ وقت مقررہ پر بغل میں ایک کتاب داب کر گھر سے نکلتا ہے اور کچھوے کی چال چلتا کرشن نگر سے ہوتا ہوا نولٹن مارکیٹ کے سامنے سے گذرتا ہوا اپنے صحیح وقت پر ٹی ہاؤس میں داخل ہوتا ہے۔ یہ دن میں دو وقت کا وظیفہ ہے۔ صبح کے اوقات دس سے گیارہ بجے تک' شام کو چھ بجے سے آٹھ بجے تک۔ موسم سرما میں ساڑھے پانچ سے ساڑھے سات تک۔ آمد کے اوقات اٹل ہیں۔ رخصت کے اوقات میں ضرورت کے مطابق کمی بیشی ہو سکتی ہے۔

ڈپٹی نذیر احمد کے متعلق روایت ہے کہ روز بلاناغہ وقت مقررہ پر گھر سے چل کر بارڈنگ لائبریری پہنچتے تھے۔ اس معاملہ میں آدمی کیا تھے گھڑی کی سوئی تھی کہ ادھر لائبریری میں قدم رکھا اور ادھر چاندنی چوک میں کھڑے گھنٹہ گھر نے ٹن ٹن چار بجائے۔ کہتے ہیں کہ چاندنی چوک کے دکاندار انہیں دیکھ کر اپنی گھڑیاں درست کیا کرتے تھے۔ انہیں اپنے گھنٹہ گھر سے زیادہ ڈپٹی نذیر احمد پر اعتبار تھا۔ اب اگر کرشن نگر کا بازار مقررہ اوقات میں اپنے بیچ سے گذرتے ایک پیدل کو خاطر میں نہیں لاتا اور نولٹن مارکیٹ کے دکاندار اسے دیکھ کر اپنی گھڑیاں

درست نہیں کرتے تو اس کی کچھ وجہ تو یہ ہے کہ یہ زمانہ بے وضع ہے۔ وضع داروں کی کیا قدر کرے گا۔ مگر اس میں کچھ خطا زاہد ڈار کی بھی ہے۔ وہ کہتا تو یہی ہے کہ وقت آنے پر اس کے قدم خود ہی ڈیوڑھی ناگھتے ہیں اور جسم آپ ہی آپ ٹی ہاؤس کی طرف حرکت کرنے لگتا ہے اور کیا باون تولے پاؤ رتی حرکت کرتا ہے کہ بالکل صحیح وقت پر ٹی ہاؤس میں داخل ہوتا ہے۔ مگر وقتاً" فوقتاً" یوں ہوتا ہے کہ کشور ناہید کا فون آجاتا ہے اور تب یہی جسم خود بخود اقبال ٹاؤن کی طرف حرکت کرنے لگتا ہے۔ یوں وظیفہ میں کھنڈت پڑتی ہے اور سالہا سال کی ریاضت پر تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد پانی پھرتا رہتا ہے۔ مگر یہ تو وہ مقام ہے جہاں رشیوں منیوں کی تپسیا پر پانی پھرتے دیکھا گیا ہے۔ زاہد ڈار تو پھر زاہد ڈار ہے۔ مطلب یہ ہے کہ وہ آخری ہاؤس ہی کا رشی ہے۔ ہمالہ پربت کے رشیوں سے اس کا موازنہ زیادتی کی بات ہے۔ ویسے دیکھا جائے تو ٹی ہاؤس میں تپ کرنا زیادہ کٹھن ہے۔ ہمالہ پربت کی کی گپھاؤں میں کون قدم رکھتا تھا۔ دور دور تک آدمی نہ آدم زاد۔ کبھی بھولے بسرے کوئی اپسرا ہی آکر وظیفہ میں کھنڈت ڈالے تو ڈالے۔ مگر ٹی ہاؤس کی گپھا میں تو زاہد ڈار اس طرح ہوتا ہے جیسے بتیس دانتوں کے درمیان زبان۔ کتنے دنوں کتنے برسوں تک یہ ہوتا رہا کہ ادھر زاہد ڈار نے کتاب کھولی اور ادھر ہر قماش کا آدم میز پر اکٹھا ہوتا چلا گیا۔ زاہد ڈار کے لئے ان حالات میں اس کے سوا اور کیا چارہ تھا کہ چائے بیچ میں چھوڑ کر اٹھ کھڑا ہو اور ٹی ہاؤس کے باہر فٹ پاتھ پر کھمبے سے لگ کر کھڑا ہو جائے۔ تھک جائے تو فٹ پاتھ کے جنگلے کے ڈنڈے پر بیٹھ جائے۔ کتنی شامیں اس عزیز کی اس طور برباد ہوئی ہیں۔ مگر اب وہ اپنے گرد حصار باندھنے میں کامیاب ہو گیا ہے۔ ٹی ہاؤس کی اس دانشور مخلوق نے جو کسی بھلے مانس کو میز پر اکیلا بیٹھا نہیں دیکھ سکتی زاہد ڈار کی جان کو صبر کر لیا ہے۔ زاہد ڈار نے حصار کھینچا ہی اس طرح ہے کہ کوئی بد روح اسے توڑ کر میز پر نہیں آسکتی۔ ہاں نیک ارواح کے لئے کوئی حصار نہیں ہے۔ مگر اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ جو آج نیک روح ہے کل بھی اس کا نیک روحوں میں شمار رہے گا۔ کوئی بھی نیک روح اپنی کسی لغزش کے باعث کسی بھی وقت بد روحوں کی صف میں دھکیلی جا سکتی ہے۔ یا نئے محاورے میں یوں سمجھئے کہ کوئی بھی پسندیدہ آدمی کسی بھی وقت اپنی کسی بھی حرکت کی وجہ سے پرسونا نان گریٹا قرار دیا جا سکتا ہے۔ یوں یاروں پر دروازے کھلتے بند ہوتے رہتے ہیں۔

فرق اس طرح بھی تو پڑا ہے کہ پہلے زاہد ڈار یاروں کی بچی ہوئی میز پر آکر

بیٹھتا تھا' اب یار اس کی اجاڑ میز پر آ کر بیٹھتے ہیں۔ یعنی اب زاہد ڈار نے ٹی ہاؤس میں اپنا ایک مقام پیدا کر لیا ہے اور اپنی میز الگ کر کے اس کے لئے حق خود اختیاری حاصل کر لیا ہے۔ اس میز کی وہ جمہوری روایات نہیں ہیں جو مثلاً قیوم نظر کی میز کی تھیں اور جن روایات کو ناصر کاظمی نے بھی تھوڑی حد بندیوں کے ساتھ اپنائے رکھا۔ مگر یہاں تو اچھا خاصا جما جمایا آدمی ونعتاً" اکھڑ جاتا ہے۔ ویسے تو یہ وضاحت کرنا بہت مشکل ہے کہ زاہد ڈار کے لئے آدمی کس طرح برے سے اچھا اور اچھے سے برا بن جاتا ہے۔ یہ ایک پیچیدہ اور پراسرار عمل ہے۔ بہرحال آدمی کے اچھا بنے رہنے کے لئے ایک شرط تو لازمی ہے' کشور ناہید کے بارے میں اس کے خیالات نیک پاک رہنے چاہئیں۔ منجملہ اور اسباب کے ایک اس سبب سے بھی اس میز پر یاروں کا عروج و زوال ہوتے دیکھا گیا ہے۔

مگر یہ کیا بات ہے کہ زاہد ڈار کا مقہور ہونے کے بعد آدمی یاروں کی نظروں سے بھی گر جاتا ہے۔ واقعہ یوں ہے کہ زاہد ڈار کو کردار کشی کے فن میں کمال حاصل ہے۔ اپنے شکار میں وہ اس نفاست سے عیب تلاش کرتا ہے اور اس سلیقہ سے اپنی مہم جاری رکھتا ہے کہ اس کے سامعین اور حاضرین نادانستہ اس کے ہم خیال بنتے چلے جاتے ہیں۔ پھر جب شخص مذکور کی بوجوہ بحالی ہو جاتی ہے تو اسی سلیقہ کے ساتھ عیبوں کی پردہ پوشی ہوتی چلی جاتی ہے۔

عروج و زوال کے سارے واقعات کا جائزہ مقصود نہیں۔ مگر دیکھنے والے کے پاس اگر دیدۂ عبرت نگاہ ہے تو وہ کم از کم انور سجاد کے واقعہ سے چشم پوشی نہیں کر سکتا۔ اس یار کا سالہا سال سے یہ طور چلا آتا تھا کہ صبح کے اوقات میں چونا منڈی میں واقع اپنے کلینک کی طرف جاتے جاتے وہ ٹی ہاؤس میں جھانکتا۔ گھنٹہ آدھ گھنٹہ بیٹھ کر زاہد ڈار سے گپ شپ کی' اخبار پڑھا' چائے پی اور پھر چونا منڈی کی راہ لی۔ لیکن رفتہ رفتہ انور سجاد نے یہ محسوس کیا کہ چونا منڈی کی حدیں تو اب ٹی ہاؤس سے شروع ہو جاتی ہیں۔ یہ کہ زاہد ڈار خالی شاعر اور محض دوست نہیں فرضی یا اصلی ایک مریض بھی ہے۔ بجا محسوس کیا۔ زاہد ڈار نے شوق سے تو دو ہی روگ پالے ہیں عشق اور پیچش۔ شاعری کے روگ کی حیثیت تو ثانوی ہے۔ ویسے تو وہ اپنا مسلک زندگی برائے شاعری بتاتا ہے۔ یہ گویا اس کی طرف سے ادب برائے زندگی کے نظریئے کا جواب ہے۔ یہ مسلک برحق مگر واقعہ یوں ہے کہ زاہد ڈار کی تنظیم اشیا میں شاعری کا نمبر پیچش اور عشق کے بعد آتا ہے۔

پیچش کی ایک پیٹنٹ دوا لوموٹل زاہد ڈار پچھلے ساڑھے گیارہ سال سے استعمال کر رہا ہے۔ میں نے پوچھا "تمہیں پیچش اب بھی ہے۔"

"نہیں اب نہیں ہے۔ ساڑھے گیارہ سال پہلے ہوئی تھی۔ میں نے لوموٹل استعمال کی۔ اس سے تکلیف جاتی رہی۔"

"پھر یہ دوا کیوں استعمال کئے جا رہے ہو۔"

"استعمال چھوڑوں گا تو پھر ہو جائے گی۔"

"چھوڑ کے دیکھا تو ہوتا۔"

"دیکھا تھا۔"

"پھر کیا ہوا۔"

"اب سے چھ برس پہلے میں نے ایک دن کا ناغہ کیا تھا۔ فوراً ہی مجھے احساس ہو گیا کہ اگر میں نے دوا چھوڑ دی تو پیچش پھر ہو جائے گی۔"

رفتہ رفتہ بات میری سمجھ میں آ گئی۔ دوسرے دوست خصوصاً نئی شاعری والے دوست اس صورت حال کو نہ سمجھ سکیں۔ میں سمجھ گیا ہوں۔ داستانوں میں مختلف بلاؤں سے بچنے کے لئے احتیاط کی جو مدت مقرر کی گئی ہے وہ بارہ سال ہے۔ سو زاہد ڈار کے لئے اگلے چھ ماہ سخت ہیں۔ اگر اس نے یہ چھ ماہ لوموٹل کے استعمال کے ساتھ خوش اسلوبی سے گذار لئے تو پیچش کو گیا سمجھو۔ مگر سوال یہ ہے کہ پیچش اگر چلی گئی تو پھر زاہد ڈار کیا کرے گا۔ پھر تو خالی شاعری اور عاشقی ہی پر گذارہ کرنا پڑے گا۔ ہمیں آپ کو اس سوال سے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ زاہد ڈار نے متبادل بیماریوں کا انتظام کر رکھا ہے۔ وہ مختلف بیماریوں کے متعلق نئی تحقیقات کا مطالعہ کرتا رہتا ہے اور پھر اپنے جسم پر تحقیق شروع کر دیتا ہے کہ کون کون سی بیماریوں کی علامات اس میں پائی جاتی ہیں۔

ابھی پچھلے برسوں کی بات ہے کہ زاہد ڈار کو پیشاب کی تکلیف ہو گئی۔ اس نے انور سجاد سے ذکر کیا۔ انور سجاد نے اخبار پڑھتے پڑھتے بے اعتنائی سے کہا "پانی زیادہ پیو۔"

"بہت تکلیف ہے یار۔"

"بہت سارا پانی پیو۔" اور پھر اخبار پڑھنے میں منہمک ہو گیا۔

انور سجاد نے تو مرض کی تشخیص میں کوئی مدد نہیں کی۔ خود زاہد ڈار نے اپنے

عمیق طبی مطالعہ کے زور پر یہ تشخیص کی کہ اس کے گردے میں پتھری ہے۔

"یار انور میرے گردے میں پتھری ہے۔"

"پانی زیادہ پیو۔"

زاہد ڈار کو انور سجاد کے افسانوں کا اختصار تو پسند تھا۔ مگر اپنے سلسلہ میں یہ اختصار پسند نہیں آیا۔ ہوتے ہوتے یہ بات کشور ناہید کے کانوں تک پہنچی۔ اس نے جھٹ پٹ ہسپتال میں داخل کرا دیا۔ بیمار دوستوں کو ہسپتال میں داخل کرانا' ان کی عیادت کرنا' خلقت کو ان کی عیادت پر مجبور کرنا' یہ تو اس بی بی کا مخصوص مشغلہ ہے۔ سو زاہد کو ہسپتال میں داخل کرا کے ایک ایک دوست کو فون کیا گیا کہ زاہد سخت بیمار ہے' جا کر اس کی عیادت کرو۔

ہسپتال میں زاہد ڈار کے سارے ٹیسٹ ہو گئے۔ گردے میں پتھری کا دور دور تک پتہ نہیں ملا۔ زاہد ڈار پھر ٹی ہاؤس میں آن بیٹھا۔ پیشاب کی تکلیف کی شکایت اب بھی جاری تھی۔ آخر اس نے اپنے طبی مطالعہ سے یہ دریافت کیا کہ اصل میں اسے سوزاک کی تکلیف ہے۔

"یار انور' مجھے سوزاک کی تکلیف ہے۔"

پانی زیادہ پیو۔"

انور سجاد نے تو سادگی سے پھر وہی شافی علاج تجویز کر دیا مگر ہم سب دوست اب واقعی فکرمند تھے۔ ایک دوست نے تشویش سے کہا کہ "پیچش اور گردے کی تکلیفیں تو سمجھ میں آتی ہیں مگر اسے یہ موذی بیماری کس خوشی میں ہوئی ہے۔"

واقعہ یہ ہے کہ ہم سب دوست اس بیماری کی خبر سن کر پریشان بھی تھے اور حیران بھی تھے۔ افسوس بھی کرتے تھے کہ یار عزیز ناکردہ گناہ پکڑا گیا۔ پھر انور سجاد نے تو کچھ نہیں کیا۔ پھر کشور ناہید ہی آڑے آئی۔ ایک مرتبہ پھر بیمار عزیز کو ہسپتال میں داخل کرایا گیا اور شہر کے سب سے نامور ڈاکٹر کی سپردگی میں دیا گیا۔ معائنے ہوئے' رنگ رنگ کے ٹیسٹ ہوئے' سوزاک نام کی بیماری کا کوئی سراغ نہیں ملا۔ زاہد ڈار مایوس ہو کر پھر اڈے پہ آ گیا۔

اب زاہد ڈار سخت پرہیز کر رہا تھا۔ ہر قسم کی غذاؤں سے اجتناب' نمک مرچ بالکل بند' زاہد ڈار سے کھانے کے بارے میں جب بھی پوچھا یہی جواب ملا کہ کشور لوکی کی بھجیا بنا کر فریج میں رکھ گئی ہے اس پر گذارہ ہے۔ مہینہ گذرا' دو مہینے گذرے' بھجیا تھی کہ ختم ہونے

ہی میں نہیں آ رہی تھی۔ کھانے میں ایسی برکت کہ کتنا ہی کھاؤ ختم ہونے میں نہ آئے اب تک تو سری کرشن جی سے منسوب چلی آتی تھی۔ مگر خیر ایک دن یہ لوکی کی بھجیا ختم ہو گئی۔ کئی وقت کے فاقے کے بعد زاہد نے بالآخر بھابی کی پکائی ہوئی تیز مرچوں والی ہنڈیا سے فاقہ توڑا۔ دوسرے دن ٹی ہاؤس میں آ کر کہا "یار میں ٹھیک ہو گیا۔"

"مگر کیسے؟"

"میری بھابی نے ہنڈیا میں بہت مرچیں ڈالی تھیں۔ مجھے بھوک لگ رہی تھی' کیا کرتا' کھا لیا' اس کے بعد میں بالکل ٹھیک ہو گیا۔"

ادھر نئی طبی تحقیق سے بھی مرچوں کے فوائد کا کچھ پتہ مل گیا۔ سو زاہد ڈار نے ایک اعتماد کے ساتھ پھر سے مرچوں والا سالن کھانا شروع کر دیا۔ صحت اچھی خاصی بحال ہو چکی تھی کہ "ٹائم" کی کسی اشاعت میں شوگر کی بیماری کے متعلق نئی طبی تحقیق کا تذکرہ شائع ہوا۔ زاہد ڈار نے اس آرٹیکل کو توجہ سے پڑھا۔ پھر اپنے حال پر غور کیا۔ اور اس نتیجہ پر پہنچا کہ اصل میں اسے شوگر ہے۔ انور سجاد سے ذکر کیا۔ وہاں مرغے کی وہی ایک ٹانگ کہ خوب پانی پیئو۔ مگر خیر اس مرتبہ اس نے بلڈ ٹیسٹ اور یورن ٹیسٹ بھی کرا دیئے۔ شوگر کا کہیں نام و نشان نہیں تھا۔ زاہد ڈار نے انور سجاد کو سمجھایا کہ نئی طبی تحقیق یہ کہتی کہ شوگر بعض صورتوں میں اس طرح خون میں شیر و شکر ہو جاتی ہے کہ کسی قسم کے ٹیسٹ سے اس کا پتہ نہیں چلتا۔ انور سجاد نے اس تحقیق پر کوئی کان نہیں دھرا۔ دوسرے کتنے ڈاکٹروں سے زاہد نے یہ بات کی۔ مگر انہوں نے بات کو سنی ان سنی کر دیا۔ بس اس کے بعد زاہد کی نظروں میں لاہور کے نامی گرامی ڈاکٹروں کی قیمت دو کوڑی کی رہ گئی۔ باقی ڈاکٹروں پر تو اس کا بس نہیں چلا۔ مگر انور سجاد پر تو بس چلتا تھا۔ کہا کہ مغرب کے فکشن میں جو نئے تجربے ہوئے ہیں ان کا تو انور سجاد کو پتہ ہے مگر وہاں میڈیکل سائنس میں جو نئے تجربے ہو رہے ہیں ان کا اس شخص کو خاک پتہ نہیں ہے۔ اور جب دوسرے دن میں ٹی ہاؤس پہنچا تو وہ افسوس کر رہا تھا کہ انور سجاد اگر مغرب کے الٹرا ماڈرن ڈرامہ اور فکشن پر وقت ضائع کرنے کی بجائے میڈیکل سائنس کی نئی ریسرچز کا تھوڑا مطالعہ کرتا تو اسے بھی فائدہ ہوتا اور اس کے مریضوں کو بھی فیض پہنچتا۔

انور سجاد نے جلدی ہی بھانپ لیا کہ ہوا الٹے رخ چلنے لگی ہے۔ یاروں کی سادہ دلی دیکھو' وہ سمجھتے ہیں کہ انور سجاد عاشقی میں گمراہ ہو کر ٹی ہاؤس کا رستہ بھول گیا ہے۔

باقی رہا اس مرد بیمار کی بیمار ذہنیت کا معاملہ تو اس کے متعلق جتنا کہا جائے کم ہے۔ ترقی پسندوں کی باتوں پر مت جایئے وہ تو اس شے کو اتنا سستا سمجھتے ہیں کہ مجھ ایسے لکھنے والے کو بھی بیمار ذہنیت کا ادیب بتا دیتے ہیں۔ واقعہ یوں ہے کہ وہ نادر شے جسے ترقی پسند محاورے میں بیمار ذہنیت کہتے ہیں۔ میراجی کے بعد ہماری ادبی روایت میں کہیں پروان چڑھی ہے تو وہ زاہد ڈار کی ذات ہے۔ اس شے سے اپنا شغف ہی تو ہے کہ میں زاہد ڈار سے نباہ کئے چلا جا رہا ہوں۔ ورنہ دیکھ لو کہ صفدر میر نے اسے کتنی جلدی دھتا بتائی تھی۔ صفدر کا رد کیا ہوا مال میں نے بلا تکلف سنگھوا لیا۔ زاہد ڈار سے میرا پہلا تعارف صفدر ہی کے واسطے سے ہوا تھا۔ تعارف کیا اس نے تو اپنے حسابوں اپنے سر کی بلا میرے سر ڈال دی تھی۔ ایک منحنی بے ڈھنگے سے لڑکے کو میری طرف دھکیلا۔ کہا کہ لو اس نوجوان سے ملو۔ اس شہر میں یہ ایک بیوقوف ہے جو تمہارے افسانوں کی کتاب خرید کر پڑھتا ہے اور پسند بھی کرتا ہے۔ یہ کہہ کر صفدر نے اپنا روایتی قہقہہ لگایا اور ہم دونوں کو چھوڑ کر اپنی لمبی سیر پر جس کا اُن دنوں اسے بہت شوق تھا نکل گیا۔ پھر اس نے مڑ کر زاہد ڈار کی طرف نہیں دیکھا۔ اگرچہ زاہد یہ کہتا ہے کہ وہ صفدر کے پاس اس وقت تک جاتا رہا جب تک صفدر نے اس کی گردن پکڑ کر اسے اپنے کمرے سے نہیں نکال دیا۔ مگر خود کردہ را علاجے نیست۔ زاہد ڈار کی بیمار ذہنیت کی ذمہ داری کچھ صفدر میر پر بھی ہے۔ اصل میں صفدر میر کا معاملہ بھی اورنگ زیب عالمگیر کا سا رہا ہے۔ کہتے ہیں کہ اس شہنشاہ نے لوگوں کے لئے حافظ کی شاعری ممنوع قرار دے رکھی تھی۔ مگر خود اس کے تکئے کے نیچے دیوان حافظ رکھا رہتا تھا۔ صفدر میر نے یوں تو ہمیشہ صحت مند ادب کی وکالت کی۔ مگر خود اس کی کتابوں کی الماری میں سب سے اوپر کے خانے میں بادیلیئر کی "Flowers of Evil" رکھی رہتی تھی۔ تو ہوا یوں کہ جو ذہین نوجوان صفدر میر کے اثر میں آتا صفدر میر اسے صحت مند ادب پیدا کرنے کے لئے تیار کرتا مگر وہ ذہین نوجوان صحت مند ادب کی پیداوار کا کام صفدر میر کے غبی چیلوں کے لئے چھوڑتا اور خود "فلاورز آف ایول" بغل میں داب یہ جا وہ جا۔ صفدر میر کے ساتھ پہلے یہ واردات سعید محمود نے کی تھی' پھر زاہد ڈار نے کی۔

زاہد ڈار صفدر میر کی صحبت سے اٹھنے یا اٹھائے جانے کے بعد ٹی ہاؤس میں آ بیٹھا۔ ہنوز بیٹھا ہوا ہے۔ ستائیس اٹھائیس برس گذر گئے مجال ہے ذرا بھی جنبش کی ہو۔ اس کے لئے حیات ذوق جمود کے سوا کچھ اور نہیں۔ علامہ اقبال کے فلسفہ عمل کی مکمل نفی۔ عمل تو ہم

آپ سب ہی کر رہے ہیں۔ ہم سب ہی زندگی کی دوڑ میں شامل ہیں۔ ہانپ رہے ہیں مگر دوڑ رہے ہیں۔ ہمارے بیچ بس ایک زاہد ڈار ہے کہ گھس بیٹھا ہے۔ زمیں جنبد نہ جنبد گل محمد۔ اس تہذیبی ناداری کے زمانے میں یہ ایک دم غنیمت ہے۔ اچھے زمانوں میں ہماری تہذیب ایسے کرداروں سے مالا مال ہوا کرتی تھی۔

اصل میں کسی بھی تہذیب کی بقاء اور فروغ کے ضامن تو ایسے بھی بے عمل لوگ ہوا کرتے ہیں۔ غالب نے خواہ مخواہ تو نہیں کہا تھا کہ۔

جی ڈھونڈھتا ہے پھر وہی فرصت کے رات دن

بیٹھے رہیں تصور جاناں کئے ہوئے

بس زاہد ڈار سے اس شعر کو سمجھنے میں ایک چوک ہوئی ہے۔ اس نے اس شعر میں بیٹھے رہیں کو لفظا" لے لیا حالانکہ یہاں یہ محاورتا" استعمال ہوا ہے۔ ناصر کاظمی کو میں نے دیکھا ہے کہ زمین کا گز بنا ہوا تھا۔ شہر کی گلیاں اس کے قدموں کی زد میں تھیں۔ رہی پابندی اوقات تو اس پراگندہ طبع آدمی نے اس لعنت کو کبھی اپنے قریب نہیں پھٹکنے دیا۔ مگر وہی ناصر کاظمی شادی کے بعد ایک دن چائے کی میز سے اس عذر کے ساتھ اٹھا کہ دفتر کو دیر ہو رہی ہے۔ ناصر کی فرصت شوق میں دفتری اوقات کی دخل اندازی' میں بس اسے ایک سانحہ ہی کہہ سکتا ہوں۔ ویسے میراجی نے تو شروع ہی سے غم عشق کے ساتھ غم روزگار کو اپنا رکھا تھا۔ سو ادبی رسالوں کے دفتر میں بیٹھ کر لکھنے کی مزدوری کی' ریڈیو میں نوکری کی' فلمی دنیا میں جا کر خوار ہوئے۔ زاہد ڈار شاعر کے طور پر میراجی و نیز ناصر کاظمی کے برابر آتا ہو یا نہ آتا ہو بلکہ واقعہ یوں ہے کہ نہیں آتا مگر بے عملی کے میدان میں ان سے کوسوں آگے ہے۔ اس نے اپنے غم عشق کو غم روزگار سے کبھی آلودہ نہیں ہونے دیا۔ اے کاش میراجی کو بھی ایسے بھائی بہن مل جاتے جیسے زاہد ڈار کو ملے ہیں۔ مگر یہ دیکھئے کہ غم عشق اور غم روزگار کے گھپلوں کے باوجود وہ دیوانہ نظم و نثر میں مضامین نو کے کتنے انبار لگا گیا۔ زاہد ڈار کے کان میں جانے کس طرح یہ بات پڑ گئی کہ شاعری بھی ایک قسم کا عمل ہے۔ سو وہ یاں سے بھی بھاگ کھڑا ہوا۔

یاد آیا کہ میں اپنی کسی پچھلی تحریر میں زاہد ڈار کے لئے گونچروف کے کردار اوبلوموف کی مثال لایا تھا۔ اوبلوموف ماقبل انقلاب روسی فکشن میں پروان چڑھنے والے بے عمل معاشرے سے نچڑے ہوئے اس کردار کا ایک مثالی روپ ہے جسے اس فکشن کے نقادوں

نے Superfluous man یا فالتو آدمی کا نام دیا تھا۔ اور مجھے یاد آ رہا ہے کہ ان دنوں جب روسی فکشن سے میرا اور مظفر علی سید کا مشترکہ عشق چل رہا تھا تو اس یار نے نہ صرف فالتو آدمی کے عنوان سے ایک ناول لکھنے کی ٹھانی تھی بلکہ بنفس نفیس فالتو آدمی بننے کا عزم باندھا تھا۔ مگر فالتو آدمی تو ناصر کاظمی بھی نہیں بن سکا۔ مظفر کی بات تو جانے ہی دو کہ اسے تو آگے چل کر ونگ کمانڈر بننا تھا۔ فالتو آدمی کا اعزاز تو ہمارے ذرا بعد میں آنے والے ایک پراگندہ طبع شخص کے لئے محفوظ تھا۔ زاہد ڈار کو دیکھ کر کتنی مرتبہ مجھے احساس ہوا ہے کہ یہ شخص گوگول، گونچروں، لرمنتوف اور دوستوفسکی کے کرداروں کی تلچھٹ ہے۔

ملا کی دوڑ مسجد تک۔ گھر سے نکلے ٹی ہاؤس، ٹی ہاؤس سے واپس ہوئے گھر۔ فون آ گیا تو کشور ناہید کے گھر کی راہ لی۔ محفل میں شرکت کی۔ تک دیکھ لیا، دل شاد کیا اور چل نکلے۔ نے غم دنیا نے غم کالا۔ نہ کوئی کام نہ کاج۔ فرصت ہی فرصت۔ مگر سخت مصروف۔ بڑی مصروفیتیں دو ہیں۔ کتابوں کا مطالعہ اور شہر کا اندیشہ۔ اول الذکر مصروفیت کا احوال کیا پوچھتے ہو۔ جیسے ضحاک کے کاندھوں پر بیٹھے ہوئے دو سانپ روز کھانے کے لئے دو انسانی کھوپڑیاں مانگتے تھے ویسے زاہد ڈار کی دو آنکھیں پڑھنے کے لئے روز ایک کتاب مانگتی ہیں۔ اچھی ہو بری ہو کتاب ملنی چاہیے۔ اچھی کتاب مل جائے تو سبحان اللہ، ردی کتاب ہو تو بھی کوئی مضائقہ نہیں۔ اسے بھی اسی یکسوئی سے پڑھا جائے گا جس یکسوئی سے کسی بڑے شاعر کا مجموعہ کلام یا کسی اہم ناول نگار کا ناول پڑھا جاتا ہے۔ اور کچھ پتہ نہیں ہوتا کہ کب کسی اچھی بھلی کتاب کو ردی قرار دے دیا جائے اور کب کسی ردی کتاب پر داد کے ڈونگرے برسنے لگیں۔

موخرالذکر مصروفیت کا احوال یہ ہے کہ یوں اس عزیز کو دنیا کا کوئی غم نہیں ہے مگر فکر جہاں بہت ہے۔ موٹروں کی بہتات آخر کہاں جا کر رکے گی۔ جنگل اسی طرح کٹتے چلے گئے تو انسان کیسے جئے گا۔ ایٹمی تجربے اسی طرح ہوتے رہے تو کرۂ ارض پر انسانی زندگی کا کیا بنے گا۔ ایٹمی جنگ ہو گئی تو خلقت پر کیا گذرے گی، وغیرہ وغیرہ۔ پہلے دو غموں میں تو میں بھی شریک ہو جاتا ہوں۔ لیکن باقی غموں میں تو اس کا شریک برٹرنڈ رسل ہی ہو سکتا تھا جو اب اس دنیا میں نہیں ہے۔ بہرحال اندیشہ کائنات سے لے کر اندیشہ شہر تک کتنے اندیشے ہیں جو زاہد ڈار کو دبلا کرتے چلے جا رہے ہیں۔ موٹر سواروں کا کیا ہے وہ بے فکرے تو موٹروں میں فراٹے بھرتے پھرتے ہیں، یہ فکر تو زاہد ڈار کو ہے کہ اگلے دس برسوں میں ٹریفک کے بڑھتے ہجوم میں یہ

موٹریں کیسے چلیں گی اور کہاں کھڑی ہوں گی۔

ان غموں فکروں سے ذرا فراغت ہوتی ہے تو پھر زاہد ڈار مسلم اخلاقی قدروں' عقیدوں' روایتوں کے ذکر سے اپنا جی بہلاتا ہے جن سے وہ بالعموم بیزار نظر آتا ہے۔ یہ گفتگو مسئلہ اس وقت پیدا کرتی ہے جب شہرت بخاری جیسا کوئی میز پر ہوتا ہے۔ خون کے سے گھونٹ پیتا رہتا ہے لیکن تا بکے؟ ایسے دوستوں کو مجھ سے شکایت رہتی ہے کہ میں اچھا بھلا صاحب عقیدہ ہوتے ہوئے ایسی باتیں کیسے سن لیتا ہوں۔ مگر میرے پاس اس کا جواز موجود ہے۔ جنرل ضیاء الحق کے گیارہ سالہ دور میں' میں نے اپنے اردگرد ایسے ایسے ملحد دانشور کو مشرف بہ اسلام ہوتے دیکھا کہ مجھے یہ فکر پڑ گئی کہ سارا کفر مٹ گیا تو اسلام کی رونق کہاں سے آئے گی۔ وہ دور گذر گیا مگر اب بھی میں یہ سوچتا ہوں کہ ایسی باتوں سے ذرا معاشرہ کی ذہنی صحت درست رہتی ہے اور قوت برداشت پیدا ہوتی ہے۔ مگر دقت یہ ہے کہ زاہد ڈار سالہا سال سے بس دوستوں ہی کی ذہنی صحت کا ضامن چلا آ رہا ہے۔ قوت برداشت اس نے پیدا کی ہے مگر ٹی ہاؤس کی ایک چائے کی میز کی حد تک۔ میں نے کتنی بار پھسلایا کہ اپنے ان خیالات عالیہ کو قید تحریر میں لاؤ۔ مگر زاہد ڈار دیوانہ ہوتے ہوئے بھی سیانا ہے۔ میری باتوں میں نہیں آتا۔ احمد مشتاق نے اپنی ایک حماقت سے اسے اور چوکنا کر دیا۔ جب وہ چائے کی میز پر اس کی زبان بندی نہیں کر سکا تو اس نے کرشن نگر کے اوباش لڑکوں کو جا کر بتا دیا کہ زاہد ڈار کتنے فاسد خیالات رکھتا ہے۔ زاہد ڈار نے ہمیں یہ تو بتایا کہ ان لڑکوں نے اسے گھیر لیا تھا۔ مگر یہ نہیں بتاتا کہ وہ ان سے بچ کر کیسے نکلا۔ بہرحال آدمی سیانا ہے۔ اسے یہ پتہ ہے کہ لاہور اپنے تہذیبی مزاج کے اعتبار سے لکھنؤ سے لاکھ مختلف ہو مگر سواری کے لئے گدھا یہاں بھی آسانی سے میسر آ سکتا ہے۔ زاہد ڈار کے ہاتھ میں اینٹ تو ہے مگر پھینکنے سے پہلے وہ دائیں بائیں آگے پیچھے دیکھ لیتا ہے۔ واقعہ یوں ہے کہ وہ دیوانہ ہے ہی نہیں۔ دیوانہ تو یگانہ چنگیزی تھا' میراجی تھا' وہ بس فالتو آدمی ہے۔

راوی اس مقام پر پہنچ کر خاموش ہو جاتا ہے اور اپنی دانست میں تذکرہ کو تمام کرتا ہے۔ مگر تذکرہ تمام نہیں ہوا۔ اس میں خطا کچھ میری ہے' کچھ زاہد ڈار کی۔ میری خطا یہ ہے کہ مضمون لکھ کر دراز میں ڈال دیا اور نچنت ہو گیا۔ اب کئی سال بعد اسے میں نے دراز میں بھرے کاغذوں کے بیچ سے برآمد کیا ہے تو سوچ رہا ہوں کہ ادھر تو آدمی ہی کچھ سے کچھ ہو گیا۔ تو اب کیا کیا جائے۔ کہتے ہیں کہ جب مولانا حالی اپنی مسدس لکھ چکے تو سرسید احمد خاں نے

اسے سن کر پسند بھی بہت کیا مگر اعتراض کیا کہ اس سے مایوسی ٹپکتی ہے۔ تو پھر مولانا حالی نے مسدس کا ایک ضمیمہ لکھا جس کا عنوان تھا "امید"۔ مگر میں جو ضمیمہ لکھنے لگا ہوں اس کا عنوان ہے ناامیدی۔

زندہ آدمی کے متعلق لکھنے میں یہی تو خطرہ رہتا ہے کہ کیا پتہ ہے کہ کب بدل جائے۔ ادھر آپ سمجھ رہے ہیں کہ آپ نے اسے نبٹا دیا ادھر تذکرہ ختم ہوتے ہوتے اس نے کینچلی بدل لی اور آپ حیران ہو رہے ہیں کہ یہ رنگ کون سا ہے۔ ایسا آدمی تو مشکل ہی سے دستیاب ہوتا ہے کہ اردگرد سب کچھ بدل جائے مگر وہ نہیں بدلتا۔ اب جیسے اپنے شیخ صلاح الدین ہیں۔ چھٹے چھے ماہے بھولے بھٹکے کبھی ملاقات ہو جاتی ہے تو بس یہی احساس ہوتا ہے کہ وہ جو ۵۲ء یا ۵۳ء میں ایک بحث ادھوری رہ گئی تھی اس وجہ سے کہ رات کے ڈھائی بج رہے تھے اور میٹرو کی بتیاں گل ہونے لگی تھیں تو شیخ صاحب نے بات کو وہیں سے پکڑا ہے اور بحث کو اب اختتام تک پہنچانا چاہتے ہیں۔ مگر ایسا دیدہ ور چمن میں روز روز تو پیدا نہیں ہوتا۔ یہ میری سادگی تھی کہ میں نے سمجھ لیا تھا کہ زاہد ڈار کو اب کیا بدلنا ہے۔ یہ بھول گیا کہ جیسا بھی ہے آخر انسان ہے، پیالہ و ساغر نہیں ہے۔

دائم پڑا ہوا ترے در پر نہیں ہوں میں
خاک ایسی زندگی پہ کہ پتھر نہیں ہوں میں

تو کہاں تو ادھر سے آنے والا فون کوہ ندا کا حکم رکھتا تھا کہ بس جسم خود بخود حرکت کرنے لگتا تھا اور اقبال ٹاؤن کی طرف کھنچا چلا جاتا تھا۔ کہاں یہ ہوا کہ فون آیا مگر جسم نے حرکت کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ بس پھر سارا سماں ہی بدل گیا۔ نہ وہاں سے پیام نہ یہاں سے سلام۔ بس واسوخت لکھی جانے لگی۔

یار اس نیرنگی زمانہ پر پہلے حیران ہوئے، پھر خوش ہوئے۔ اور پھر دل سے یہ دھڑکا نکل گیا کہ یاں کہیں گے اور واں خبر ہو جائے گی۔ چلو یہاں تک تو خیر ہی کا پہلو تھا۔ چائے کی میز پر غیبت کی آزادی تو ہونی ہی چاہیے۔ نقصان اصل میں کسی اور سطح پر ہوا تھا۔ ایک سوال جو مجھے ستاتا رہتا ہے وہ یہ ہے کہ آخر ہمارے یہاں مجنوں اور فرہاد پیدا ہونے کیوں بند ہو گئے ہیں۔ کیا یوں سمجھا جائے کہ قدریں اب بدل گئی ہیں۔ افادیت اور مقصدیت کے تصورات نے عشق کی قدر کو ملیامیٹ کر دیا۔ جو بھی وجہ ہو بہرحال آشفتہ سروں کا نایاب ہو جانا کسی بھی

تہذیب کے لئے اچھا شگن نہیں ہے۔ ڈوبتے کو تنکے کا سہارا۔

ایسے زمانے میں جب۔

دشت میں قیس نہیں کوہ پہ فرہاد نہیں

زاہد ڈار کا وجود بھی غنیمت نظر آتا تھا۔ وفاداری بشرط استواری کا نمونہ کسی رنگ تو دیکھنے میں آیا۔ لیکن اس بے وضع زمانے نے اس رنگ وفا کو بھی بدرنگ کر دیا۔ زمانے کی خرابی اور تہذیب کے بنجرپن سے قطع نظر اس میں مجھے زاہد ڈار کا بھی زوال نظر آ رہا ہے۔ عجب ستم ظریفی ہے کہ عین اس وقت جب شہر میں اس کی آشفتہ سری کی خوشبو پھیلنی شروع ہوئی تھی اس کی آشفتہ سری کو گھن لگ گیا۔ صاحب آپ کیا پوچھتے ہیں' ان دنوں شہر کی کلچرڈ خواتین میں زاہد ڈار کی بہت پوچھ ہے۔ کوئی کلچرل تقریب ہو' محفل یاراں ہو' اور زاہد ڈار نظر نہ آئے تو ہم جیسوں سے پوچھا جاتا ہے کہ زاہد ڈار کہاں ہے۔ گویا یہ ہماری ذمہ داری ہے کہ ہم اسے لے کر آئیں۔ اور اگر ساتھ ہے تو پھر ایسی تقریب میں جہاں ٹکٹ لگا ہو۔ مثلاً تھیٹر میں وہاں ٹکٹ خریدنے کی ضرورت نہیں۔ گیٹ پر کھڑی بیبیاں آگے بڑھ کر خود ہی لپک لیتی ہیں۔

پچھلے دنوں کشور کے یہاں ایک محفل تھی۔ رنگ رنگ کا آرٹسٹ اور بھانت بھانت کا انٹلکچوئل اکٹھا تھا۔ ایک خاتون داخل ہوئیں۔ مجمع پر طائرانہ نظر ڈالی۔ پھر کہنے لگیں "کیا بات ہے' کشور کی محفل میں جو لوگ ہوا کرتے تھے وہ نظر نہیں آ رہے۔"

میں نے کہا "آپ یہ کیسے کہہ رہی ہیں۔ آج تو نئے پرانے سب ہی موجود ہیں۔"

بولیں "زاہد ڈار دکھائی نہیں دے رہے۔"

میں کیا کہتا۔ داغ کے ایک مصرعہ سے بات کو ٹالنا چاہا۔

خانہ برباد نے مدت ہوئی گھر چھوڑ دیا

"اچھا' کیوں۔"

میں کیا جواب دیتا۔ پھر میں نے یہ کیا کہ الٹا ان سے پوچھ لیا کہ "کیا بات ہے' ادیب' آرٹسٹ' انٹلکچوئل اور بھی ہیں۔ بیبیاں خاص طور پر زاہد ڈار کو کیوں پوچھتی ہیں۔"

اس کا ان کے پاس کوئی معقول جواب نہیں تھا۔ ویسے ایک بات یہ ہے کہ نئی عقل والی بیبیوں میں دیوانوں کی ڈیمانڈ ہمیشہ سے رہی ہے۔ زندگی تو بہرحال فرزانوں ہی کے ساتھ

بسر کرنی ہے کہ اس میں آرام بہت ہے۔ لیکن رومانٹک طبیعت کا تقاضا ہوتا ہے کہ آس پاس کوئی دیوانہ بھی نظر آنا چاہیے۔ ایک زمانے میں اور اس زمانے کو زیادہ عرصہ نہیں گذرا دیوانے ہماری سوسائٹی میں اچھی خاصی تعداد میں ہوا کرتے تھے' ادب میں' آرٹ میں' سیاست میں' تعلیم کے شعبہ میں' زندگی کے اور شعبوں میں۔ ذرا مولانا حسرت موہانی' مجاز' میراجی' منٹو کے زمانے کو تصور میں لایئے۔ اب میدان صاف ہے۔ زاہد ڈار اور نہیں تو کم از کم دیوانے کا ایک تاثر تو دیتا ہے۔ فی زمانہ یہ بھی بہت ہے۔ مگر دقت یہ آ پڑی ہے کہ جب سے زاہد ڈار کی دیوانگی کی شہرت ٹی ہاؤس سے باہر پھیلنی شروع ہوئی ہے اسی وقت سے اس کی جھوٹی سچی دیوانگی کا گراف نیچے ہی آتا چلا جا رہا ہے۔ اب لازم نہیں کہ زاہد ڈار اپنے مقررہ اوقات میں اپنی میز پر کتاب میں غرق اکیلا ٹوڑوں ٹوں بیٹھا نظر آئے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ آپ ٹی ہاؤس میں داخل ہوں تو اس کی میز خالی نظر آئے اور برابر والی میز پر اس کا ہمزاد بیٹھا نظر آئے۔ ہاں یہ تو میں نے آپ کو بتایا ہی نہیں تھا کہ ٹی ہاؤس میں ہمیشہ سے ایک دو بیچ بچ کے پاگل بھی بیٹھتے رہے ہیں۔ بھلے دنوں میں جب ٹی ہاؤس کے سامنے پیپل کے سائے تھے ایک نلکا ہوا کرتا تھا تو مال کے اس وقت کے پر سکون فٹ پاتھ پر ایک پاگل چلتے چلتے اس نلکے پر پڑاؤ کرتا' پانی پیتا' اپنے کپڑوں پر پڑی ہوئی اصلی یا فرضی چھینٹوں کو محنت سے دھوتا' پھر ٹی ہاؤس کی طرف رخ کر کے جو بھی ادیب نظر آتا اس کا منہ چڑاتا اور بڑبڑاتا ہوا آگے چلا جاتا۔ پچھلے برسوں میں ایک جوان العمر یورپین بی بی نے ٹی ہاؤس کو مہینوں آباد رکھا۔ ماری ماری بڑاڑی ایک گٹھڑ اٹھائے ٹی ہاؤس میں داخل ہوتی۔ چندے قیام کرتی اور پھر گٹھڑ اٹھا کر کہیں آگے نکل جاتی۔ کبھی پتہ نہ چلا کہ اس گٹھڑ میں کیا ہے۔ اب ایک ڈیڑھ سال سے وقتاً" فوقتاً" ایک صاحب دیکھے جاتے ہیں' جون جولائی سخت گرمی میں تھری پیس سوٹ پہنے ہوئے' ایک بڑا سا سوٹ کیس اٹھائے یہاں آتے ہیں' چائے پیتے ہیں' ویٹر سے انگریزی میں تبادلہ خیال کرتے ہیں اور چلے جاتے ہیں۔ مگر باقاعدگی سے جو صاحب آتے ہیں اور گم سم بیٹھے رہتے ہیں وہ زاہد ڈار کے ہم نام بتائے جاتے ہیں۔ انہیں اوقات میں آ کر بیٹھتے ہیں جو اوقات زاہد ڈار کے ہیں۔ کسی سے بات نہیں کرتے۔ اگر کسی سے اکا دکا بات ہوتی ہے تو صرف زاہد ڈار سے۔ ولی را ولی می شناسد۔ ایک ڈاکٹر صاحب ہیں جو پاکستان کے مسائل کا حل آئینی بادشاہت میں دیکھتے ہیں۔ اپنے ہیرو پیدا کرنے کے شوق میں ٹی ہاؤس آتے ہیں۔ عرق ریزی سے لمبے لمبے مضمون لکھتے ہیں۔ روسو پر' ہیگل پر' نطشے پر۔ باقی ادیبوں کو فوٹو سٹیٹ کاپیاں

ڈاک کے ذریعہ بھیجتے ہیں۔ خطوط بنفس نفیس زاہد ڈار کے حوالے کرتے ہیں۔ ہاں تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ قطعی ممکن ہے کہ آپ ٹی ہاؤس جائیں تو زاہد ڈار کا کوئی ہمزاد نظر آئے' خود زاہد ڈار غائب ہو۔ کاؤنٹر سے پتہ چلے کہ چند بیبیاں آئی تھیں۔ ان کے ساتھ چلے گئے۔ پھر کسی ایئرکنڈیشنڈ ریستوران میں بیبیوں کی تواضع چائے سے یا آئس کریم سے کرتا نظر آئے۔

ایک روز میں آیا' میز کو خالی پایا' کاؤنٹر پر پوچھا' پتہ چلا کہ وہ تو اسلام آباد گئے ہیں۔ اسلام آباد؟ مجھے حیران ہونا ہی تھا۔ زاہد ڈار سے زندگی میں صرف ایک سفر منسوب ہے جو کچھ لیجنڈری قسم کا ہے۔ ایک دن منہ اٹھا تو واہگہ کی طرف چل پڑا۔ سرحد کو کسی نہ کسی طرح عبور کیا اور پیدل چلتا چلتا لدھیانہ جا پہنچا۔ اپنے سکھ دوست کے گھر پر دستک دی۔ دو تین دن قیام کیا۔ اور پھر پیدل واپس۔ تو ایک تو وہ سفر تھا اور اب یہ اسلام آباد کا سفر۔ بس جیسے اہل دنیا سفر کیا کرتے ہیں۔

باقی رہا زاہد ڈار کا لبرلزم اور سیکولرزم تو مجھے لگتا ہے کہ اس میں بھی تھوڑی فرسودگی پیدا ہو چلی ہے۔ ویسے ہمارے یہاں سیکولر دانشوروں کے ساتھ ایک حادثہ بالعموم گذرا ہے۔ اسے ملا سے بہت لڑنا پڑا۔ خیر پاکستان کی تاریخ میں سیکولر دانشور نے ملا کو کبھی علانیہ اس طرح تو نہیں للکارا مثلاً جیسے اپنے وقت میں اقبال نے للکارا تھا لیکن اس کی ذہنی جنگ اس سے رہی ہے۔ اس جنگ میں اکثریوں ہوا کہ ملا کسی نہ کسی راستے اس کے اندر نفوذ کر گیا اور پھر اس کے رویوں میں بھی ایک ملائیت کا رنگ آ گیا۔ تو ہمارے یہاں ملاؤں کے پہلو بہ پہلو سیکولر ملا بھی پیدا ہو گئے۔ اسی طرح کے طے شدہ رد عمل' اسی طرح کا اڑیل پن۔ اب دیکھئے شروع میں یہ بات کتنی دلچسپ لگتی تھی کہ شہرت بخاری اپنی روایتی جذباتیت کے ساتھ اپنی مذہبی عقیدت کا اظہار کر رہا ہے اور زاہد ڈار چپکے سے غبارے میں اپنے الحاد کی سوئی چبھو دیتا ہے۔ میں بتا ہی چکا ہوں کہ اپنے مذہبی احساس کے باوجود میں نے اس حرکت کو کبھی ناپسندیدہ نہیں جانا کیونکہ ایک بات کا میں بڑی شدت سے قائل ہوں کہ کفر کچھ چاہیے اسلام کی رونق کے لئے اور اگر اقبال پرستی کے اس دور میں کوئی چھوٹا موٹا اقبال شکن پیدا ہو جائے تو بھی کیا مضائقہ ہے۔ آخر ہم نے یگانہ کی غالب شکنی کو بھی برداشت کیا ہی تھا۔ شہرت بخاری سے کہو تو وہ جواب دے گا کہ وہ تو یگانہ تھا۔ زاہد ڈار چہ پدی چہ پدی کا شوربہ۔ یہ بھی صحیح ہے مگر آخر مولے کو بھی تو کبھی کبھی شہباز سے دو دو چونچیں کرنے کا حق ملنا چاہیے۔ یہاں تک تو بات میری سمجھ میں آتی

ہے۔ جو بات میری سمجھ میں نہیں آتی وہ یہ ہے کہ آدمی محض علامہ اقبال کی کد میں سردار عبدالقیوم خاں کا قائل ہو جائے۔ یہ اس برس کا ذکر ہے جس برس اوسلو میں ہونے والی یوم اقبال کی تقریب میں سردار عبدالقیوم اپنے جوش ملائیت میں ڈاکٹر جاوید اقبال سے الجھ پڑے تھے۔ مجھے ساری بات تو یاد نہیں مگر کچھ اس طرح کی بات تھی کہ ڈاکٹر جاوید اقبال نے اقبال کے واسطے سے اسلام کی ایسی تعبیر کی جو ملاؤں کو بالعموم پسند نہیں آتی۔ سو سردار عبدالقیوم جوش میں ایسے آئے کہ جاوید اقبال سے اُلجھتے الجھتے اقبال پر برس پڑے۔ وہ مقالہ اور وہ تقریر دونوں پہلو بہ پہلو "نوائے وقت" کی ایک اشاعت میں شائع ہوئے۔ مجھے اتنا یاد ہے کہ وہ تقریر پڑھ کر میں بہت محظوظ ہوا تھا۔ بات یہ ہے کہ اگر اقبال پر یوں اعتراض کیا جائے کہ علامہ صاحب کہاں کے مسلمان تھے' پنجگانہ نماز تو پڑھتے ہی نہیں تھے تو بھلا آدمی اس پر ہنس ہی سکتا ہے۔ مگر اسی صبح میں کہیں ٹی ہاؤس میں جا نکلا اور زاہد ڈار کو سردار عبدالقیوم خاں کی شان میں رطب اللساں پایا۔ "میں تو سمجھتا تھا کہ یہ بس سیاسی آدمی ہے۔ مگر اُس نے تو اقبال کا بہت گہرا مطالعہ کیا ہے۔"

"تم نے یہ کہاں سے نتیجہ اخذ کیا۔"

"اس کی یہ تقریر پڑھو۔ جو شعر اس نے اقبال کے ہاں سے نکالے ہیں۔"

"مگر یہ شعر تو اتنے معروف ہیں کہ تانگہ والوں کو بھی یاد ہیں۔"

مگر زاہد ڈار کا اصرار تھا کہ سردار عبدالقیوم خاں نے گہرے مطالعہ کے بعد اقبال پر بات کی ہے اور بت شکنی کا فریضہ ادا کیا ہے۔ میری ساری بحث بیکار گئی۔ زاہد ڈار جب ایک مرتبہ ایک موقف اختیار کر لے تو پھر اسے آپ کسی صورت اس موقف سے ہلا نہیں سکتے۔ کم از کم یہ ایک صفت ہے جس پر اس نے ابھی تک آنچ نہیں آنے دی ہے۔

مگر یاروں کا پاس وضع دیکھو کہ سب کچھ دیکھتے ہیں' سنتے ہیں' سہتے ہیں' مگر اسے چھوڑتے نہیں۔ بے شک وہ بیزاری کا مظاہرہ کرتے ہوئے ان کے بیچ سے اٹھ کر برابر والی کسی میز پر کتاب کھول کر بیٹھ جائے۔ مگر دوسری شام جب وہ ٹی ہاؤس آئیں گے تو پھر اسی کے پاس آ کر بیٹھیں گے۔ اور مظفر علی سید کے خلاف تو اس نے کردار کشی کی مہم بھی چلا کر دیکھ لی۔ علم کا طعنہ تو یاروں کی طرف سے مظفر علی سید کو ہمیشہ ہی ملا۔ بس اسے بھی قسمت کی خوبی جانیے کہ جو بات دوسروں کے لئے طرۂ امتیاز ہوتی ہے یہاں آ کر عیب بن گئی۔ مگر زاہد ڈار نے اس

میں ایک کلی اور ٹانک دی۔ مظفر علی سید بنیاد پرست عالم ہے۔ اس مہم میں اسے مظفر کے ایک دو کے بھی کھانے پڑ گئے اور شاید آدھی پونی گالی بھی۔ مگر زاہد ڈار نے اسے بھی اپنے حق میں جانا اور وٹیل کے طور پر استعمال کیا کہ دیکھ لو، بنیاد پرستوں میں جو تشدد پسندی ہوتی ہے وہ یہاں بھی موجود ہے۔ لیکن کیا مظفر علی سید اور کیا دوسرے یار۔ ہر پھر کر پھر اسی میز پر اور۔

پھر اسی بے وفا پہ مرتے ہیں

کیا یہ خالی یاروں کی وضع داری یا پاس وفا ہے۔ نہیں صاحب نہیں۔ اس شخص میں کوئی ایسی بات ہے کہ یار اس سے بدکتے ہیں، بچھڑ نہیں سکتے۔ وہ کیا بات ہے، میں اس کا ٹھیک سے تعین نہیں کر سکتا۔ بہرحال ایک بات تو ہے۔ وہ دیوانہ آدمی نہ سہی، فالتو آدمی تو بہرصورت ہے۔ اور اس کم بخت زمانے میں جس کا وظیفہ ہے، کام، کام، کام اور پیسہ، پیسہ، پیسہ ہمارے بیچ ایک فالتو آدمی کا موجود ہونا بہت غنیمت ہے۔ اور بے شک وہ دیوانہ نہ سہی، مگر دیوانہ ہونے کا اس پر دھوکا تو ہوتا ہے۔ یہ بھی اس زمانہ بہت ہے۔

دل میں نظر آتی تو ہے اک بوند لہو کی

○

# ابا

محمد کبیر خان

چہرہ سوکھا سڑا۔۔۔ جسم منحنی سا' قمیض بیڑوں بٹنوں کے تکلف سے آزاد' جوتے' پالش اور تسموں کے تردد سے بے نیاز۔ ایک ایڑی اندر سے دوسری باہر کی طرف سے مکمل گھسی ہوئی۔ شلوار کا ایک پائنچہ تبلیغی نصاب کے عین مطابق' دوسرا گھسی ہوئی ایڑی کے ساتھ گھسٹتا ہوا۔ ایک ٹی کوزی سی جسے آپ موقع محل کی مناسبت سے کبھی از رہ افتخار "مخالص مردانی" قراقلی' کبھی از رہ انکسار "نمناکیپ" قرار دیتے ہیں۔ قطع نظر اس کے کہ وہ خالص مردانی قراقلی یا جناح کیپ کی تعریف پر پورا اترتی ہے یا نہیں' لیکن آشفتہ سری کو لمبی لوؤں تک ڈھانپنے کے لئے بہرحال کافی و شافی ہے۔

آپ کی چال میں ایک الگ سا بانکپن پایا جاتا ہے۔ "سلو مارچ" یعنی آہستہ روی میں بالکل عام انسانوں کی طرح پھدک پھدک کر چلتے ہیں۔ جلدی میں ہوں (جیسا کہ عموماً ہوتے ہیں) تو "کوئک مارچ" کرتے ہیں۔ ایسے میں خاصا جھک کر لڑاکا جیٹ کی طرح اسٹارٹ لیتے ہیں۔ کوب بڑھ کر دوگنا اور گھٹی ہوئی گردن گھٹ کر نصف رہ جاتی ہے۔ عام حالات میں چھڑی موہنڈے پر ہوتی ہے۔ تیز قدمی کا ارادہ فرمالیں تو چھڑی اپنے مقام اور رتبے سے نیچے اتر آتی ہے۔ دونوں ہاتھوں میں مضبوطی کے ساتھ تھام کر چھڑی کو دم کر لیتے ہیں۔ اونچی نیچی راہوں اور پگڈنڈیوں پر دم وفاداری بشرط استواری کرتی چلی جاتی ہے۔ ہموار کچے میں آنے والی نسلوں کے لئے نقش کف پا چھوڑنا مقصود ہو تو اجوائن اور ہینگ کی ملی جلی مہک کی لکیر کے علاوہ دم سے ویسا ہی زگ زیگ ڈرا کرتے چلے جاتے ہیں جیسا جابر بیوی کی موجودگی میں مطیع و فرمانبردار شوہر کا اسی جی۔ پختہ سڑک پر چل رہے ہوں تو گپ اندھیری راتوں میں بھی پتہ چل جاتا ہے کہ ابا آیا

جا رہے ہیں۔ بجتا ہوا چوبی جلترنگ سن کر کتے اور چور اچکے ہی نہیں چوکیدار بھی ہشیار ہو جاتے ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ آج تک ہمارے گراں محلے میں کوئی جوڑا لذت کام و دہن یعنی بوس و کنار کرتے ہوئے پکڑا نہیں گیا۔۔۔ تھانے کے روزناچوں کا پیٹ بھرنے کے لئے نہ لذیذ خبروں کے رسیا قارئین کے منہ کا ذائقہ بدلنے کے لئے۔

کہتے ہیں ابے کو بچپن سے شکار کھیلنے کا بڑا ہی شوق رہا ہے۔ سرما میں جب چڑیوں اور کڑیوں کی ڈاریں خالی کھیتوں میں علی الترتیب دانے اور گھونٹے چننے کو اترتیں تو آپ اپنے قد سے دوگنی لمبی کانٹے دار پھانٹ دم کی طرح لگا اور دبا کر کھیتوں کھلیانوں کی منڈیروں کی اوٹ میں دوہرے ہو ہو کر دوڑتے چلے جاتے۔ اور پھر مناسب فاصلے پر پہنچ کر پہلے منہ سے "خاہ" کی آواز نکال کر ایک طرح کا ہانکا لگاتے اس کے فوراً بعد گھما کر پھانٹ چھوڑ مارتے۔ کبھی دو چار چڑیاں پھانٹ کی لپیٹ میں آ جاتیں کبھی ایک دو کڑیاں۔ تب کی (چھڑی کی) دم دبا کر اور جھک چھپ کر چلنے کی عادت راسخ ہو چکی ہے۔ چنانچہ آج بھی اس دور کی کڑیاں چڑیاں ابے کو دیکھ لیں تو ادھر ادھر دبک جاتی ہیں اور اس وقت تک کنجوں کابکوں سے باہر نہیں نکلتیں جب تک خطرہ پوری طرح ٹل نہ جائے۔

ابا یوں تو بے حد چڑچڑے اور اکھڑ واقع ہوئے ہیں۔ لیکن ہیں منصف مزاج۔ ہم نے انہیں ہمیشہ بلا لحاظ رنگ و نسل، عمر و جنس سب کو ایک آنکھ سے تاکتے اور ایک ہی چھڑی سے ہانکتے دیکھا ہے۔ ابے کی بائیں آنکھ پر مستقلاً" سبز رنگ کا ایک شٹر گرا رہتا ہے جو صرف خاص خاص موقعوں پر اٹھاتے ہیں اور جلدی سے آنکھ مار کر پھر گرا دیتے ہیں۔ ان کی اس عادت کے بارے میں بھی مختلف روایات بیان کی جاتی ہیں۔ جن میں سے معتبر ترین اور گفتنی ان کے ایک ہم عصر سے مروی ہے۔ کہتے ہیں اوائل جوانی سے دوچار برس پہلے تک بالکل نارمل تھے۔ پھر ماتھے پر پہلے دانے کے ساتھ ہی ان کے ایک قریب ترین پڑوسی اپنی دور پار کی ایک منہ بولی بیوی کو لے کر آ گئے۔ پڑوسن تو کچھ ہی دنوں بعد بڑے میاں کو تڑپتا بلکتا چھوڑ دن دیہاڑے موقع پا کر ایک پھیری والے کے ساتھ فرار ہو گئی۔ بے قراری، بے اختیاری اور آنکھ کی چاند ماری کی لت نشانی کے طور پر ابے کو سونپ گئی۔ ابے نے نشانی کو ایسے گلے لگایا کہ آج تک جی جان کے ساتھ سنبھال رکھا ہے۔ کہنے والے تو یہاں تک کہتے ہیں کہ آئے دن کی شرمندگیوں سے تنگ آ کر بیٹوں نے موتیا کے بہانے ابے کو ٹیکسلا کے آئی ہاسپٹل میں جمع کروایا تو

عالم بے ہوشی میں بھی متاثرہ رہے۔ نرس نے تو کوئی نوٹس نہ لیا لیکن سرجن نے پپوٹے کو موی دھاگے کا ایسا جوڑ کے ٹانکا لگایا کہ آنکھ کے ساتھ ابے کا منہ بھی ورطہ حیرت میں کھلے کا کھلا رہ گیا۔۔۔ مستقلاً "مگر تا بہ کے۔۔۔ منہ زور آنکھ کے آگے موی ٹانکا کچا دھاگہ ثابت ہوا اور ایک روز مقامی گرلز کالج کے قریب چٹاک سے ٹوٹ گیا۔ اس کے بعد پانچوں سعودیہ پلٹ بیٹوں نے باجماعت منت زاری کر کے سبز شرپر حج کا یہ موٹا قفل ڈلوا دیا۔ سعادت حج کے بعد ابا تائب ہو گئے۔ گالی نکالنا اور جوان پاٹھیوں کو آنکھ مارنا یکسر ترک کر دیا۔ اب کبھی آنکھ پھڑک اٹھے تو راہ چلتی ادھیڑ عمروں سے موشے دایانی کر لیتے ہیں اور بس۔

○

"تیری ماں..."

ٹھوکر تھی ہی اس قدر اچانک اور شدید کہ آنکھوں کے آگے تارے ناچ گئے۔ گالی کا کھٹا پانی اچھل کر منہ میں آ گیا۔ سوت کی لگام پڑا چشمہ لٹکے کانوں اور طوطے کی چونچ جیسی ناک سے کھسک کر گلے پڑ گیا۔ ٹی کوزی سرک کر کھلاہی پر اتر آئی' چھڑی دور جا پڑی۔ سنبھالا لیتے لیتے ابے کی نظر کھیت کی منڈھیر پر پھنکارتی بھینس پر پڑی تو مرغوب گالی کا بقیہ نگل گئے۔

"ڈک سورنی کو۔۔۔ کچا ٹانڈا مار گئی تو تیری چاچی کو پتلا پڑے ہی پڑے۔ پھر جان لے کہ تو تخت ہزارے گیا کہ گیا۔"

ابے نے تیر تو تاک کر ہی چھوڑا لیکن اس وقت رانجھا زد میں تھا نہ چاچی ان کے نشانے پر۔۔۔ کیونکہ جسے وہ اپنی پھنکارتی بھینس سمجھے تھے' کسی اور کی چیز تھی۔ وہ تو خیر گذری کہ انجن کے شور میں ابے کی آواز دب گئی ورنہ منڈھیر پر کھڑا زود رنج ٹریکٹر ڈرائیور اسی وقت' بلا تاخیر چلا جاتا۔ بیجے کھیت چڑیاں چگ جاتیں' محلے والے ایک بار پھر ابے کی جان کو روتے اور ٹریکٹر کی راہ تکتے رہ جاتے۔۔۔۔

آجا وے تینوں اکھیاں اوڈیک دیاں

ابے کو بچارے چھلو سے خدا واسطے کا بیر تھا تو محض اس لئے کہ چاچی نے اسے بھینس کی رکھوالی کے لئے رکھا ہوا تھا۔ اور چاچی نے بھینس پوتے پوتیوں کو گھر کا دودھ مکھن مہیا کرنے کے لئے خریدی تھی۔ بھینس تو پہلے بھی اس گھر میں رہی لیکن جب سے ایک ایک کر کے ابے کے پانچوں بیٹے سعودی عرب چلے گئے' چاچی نے دودھ بیچنے سے انکار کر دیا۔

"مسری کے سارا کھا پی جاتے ہیں' ایک گھونٹ نہیں چھوڑتے" دراصل ابے کو غصہ اس بات کا تھا کہ ان کا روزگار مارا گیا۔ جب سے بیٹے سمندر پار گئے' بیس روپے فی گواہی والا دھندا رہا نہ پانی میں دودھ ملا کر بیچنے کا کاروبار۔ گواہی کی کمائی تو پھر چوری چھپے کر لیتے لیکن دودھ کے خزانے پر چاچی سانپ بنی بیٹھی تھیں۔

ابے کا تعلق ابوں کی اس نسل سے ہے جن کا نام تھانے کچہریوں والے جانیں تو جانیں' باہر کی دنیا نہیں جانتی۔ یہی حال چاچی کا --- کہ اہل دیہہ انہیں پانچ کی ماں یا چاچی کے نام سے جانتی پہچانتی ہے اور بس۔ چاچی کہاں سے اس گراں موہڑے میں آئیں؟ کسی کو معلوم نہیں --- سوائے اس کے کہ وہ بھی کسی مقدمے کے سلسلہ میں تاریخیں کاٹنے' پیشیاں بھگتنے کچہری آیا جایا کرتی تھیں۔

"خدا راہ ابا اب تو گواہیاں دینا چھوڑ دیں" بڑے بیٹے نے ساٹھ ہزار کا ڈرافٹ ابے کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے کہا "ساری زندگی بیس روپے کے نرخ پر بتا دی۔ آخر آپ کو ملا کیا---؟ کیا کمایا سوائے جگ ہنسائی کے؟؟"

"تمہاری چاچی---" ابا بولے "یہ گوائی---' حق حلال کی یہ کمائی نہ ہوتی تو تمہاری مائی بھی نہ ہوتی--- پھر کیا تم پتھر سے پھوٹتے؟"

بڑا بیٹا کچھ تو اپنی طبعی شرافت کی وجہ سے اور کچھ صاحب اولاد ہونے کے باعث لاجواب ہو جاتا لیکن تیسرے نمبر کا اڑ گیا۔ "اب تو آپ کو یہ دھندا چھوڑنا ہی ہو گا--- ہم سے مزید جگ ہنسائی برداشت نہیں ہوتی۔" باقیوں نے بھی منجھلے کی تائید کی اور یوں آہستہ آہستہ بیٹوں نے ابے کی سرگرمیوں کا احاطہ اس قدر تنگ کر دیا کہ وہ حج کرنے پر آمادہ ہو گئے۔ حج کے بعد ابا باقاعدگی کے ساتھ نہ صرف نماز جمعہ ادا کرنے لگے بلکہ سہ روزوں پر بھی جانے لگے۔ ابے کی زندگی میں زبردست تبدیلی آگئی اور دھیرے دھیرے وہ گاؤں کے معتبرین میں اٹھنے بیٹھنے اور شمار ہونے لگے لیکن جب سے ابے سے وہ حاجی ابا بنے' ان کا اٹ کھڑکا چاچی سے بڑھ گیا۔

"نماز نہ روزہ' کام نہ کاج--- اری مرنے جوگی قبر کنارے بیٹھی ہو' اگلے جہاں کیا منہ دکھاؤ گی..."

"وہی---' جس پر تم اپنے دست مبارک سے مسکہ مکھن اور کیا کہتے ہیں---

ہاں--- پوڈر، کھسودار پوڈر ملبا کرتے تھے۔ پھر صدقے واری جایا کرتے تھے۔" چاچی تڑاخ سے جواب دیتیں۔ "جانتی ہوں تیری نمازاں زکاتاں کو--- اٹھارہ بیس رکاتاں گھڑی چھٹ میں مکا کے وہ پرے..."

"آتی جو ہے---" ابا چھاتی ٹھاپ کے کہتے "ورنہ بڑے بڑوں کو دیکھا ہے، دو رکعتیں پڑھنی پڑ جائیں تو گھنٹوں مصلے پر کھڑے جھورتے رہتے ہیں" چاچی لاجواب ہو جاتیں۔

بیٹے بڑی حد تک ابے کی زندگی میں رونما ہونے والی اس تبدیلی سے مطمئن تھے مگر چاچی کے ساتھ ان کے حسن سلوک سے اب بھی نالاں۔ آئے دن کی چخ چخ نے گھر کا امن سکون تباہ کر دیا۔ معمول کی جھڑپیں اگر ابے اور چاچی کی نظریاتی سرحدوں تک رہتیں تو بات بھی تھی لیکن خانہ جنگی نے بہوؤں کو بھی لپیٹ میں لے لیا۔ بہویں حالات اور جھگڑے کی نوعیت کے لحاظ سے معرکے میں کودتیں۔ وہ اکثر پارٹیاں بدلتی رہتیں۔ جو بہو صبح چاچی کے ناک کا بال ہوتی، وہی شام کو ابے کی منظور نظر ہو کر چاچی کا ناک میں دم کر دیتی۔ اور وائس ورسا۔ یوں گھر پر اسمبلی ہونے کا گمان گزرنے لگتا۔ بسا اوقات بحث عام نوعیت کی الزام بازی سے نکل کر ٹھوس دلائل کے مراحل میں داخل ہو جاتی۔ ایک لوٹا ادھر سے چھوٹتا دوسرا کوزہ ادھر سے پھوٹتا۔ تھالی کا کوئی بینگن مغرب سے لڑھکتا تو چکلا بیلن مشرق سے کھڑکتا۔ کسی کی آنکھ مضروب کسی کا کان مجروح۔ آخر کار تنگ آ کر بیٹوں نے اقوام متحدہ یعنی ریاست ہائے متحدہ کا کردار ادا کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ خاندان کی تقسیم کا فارمولا تیار کیا گیا۔ چاچی نے بڑے اور منجھلے کے ساتھ رہنے کا فیصلہ کیا، ابے نے بادل نخواستہ دوسرے اور چوتھے بیٹے کے ساتھ۔ حالانکہ وہ چھوٹے کے ساتھ رہنا چاہتے تھے--- کہ--- انھیں اس سے بہت پیار تھا۔ لیکن وہ بیچارہ ہنوز خود فری لانسر تھا۔ ابھی اس کی شادی نہیں ہوئی تھی دراصل وہ اپنی پسند کی شادی کرنا چاہتا تھا، اور اس کی پسند ابھی زیر تعلیم تھی۔ شادی سے پہلے وہ اپنا زیر تعلیم مکان بھی مکمل کرنا چاہتا تھا۔ مکان کی تکمیل اور پسند مذکوریہ کی گریجوایشن میں پورے دو سال لگ گئے۔

اس عرصے میں بڑے بیٹے نے شہر میں مکان خرید لیا اور چاچی سمیت وہاں منتقل ہو گیا۔ تقسیم خاندان کے بعد اگرچہ ابے اور چاچی کے مابین بلاواسطہ ٹاکرہ کم کم ہی ہوتا لیکن پڑوسیوں اور پوتے پوتیوں کے ذریعے نامہ و پیام یعنی دشنام رسانی کا سلسلہ کسی نہ کسی طرح قائم رہا۔ اب جو چاچی شہر منتقل ہوئیں تو رہا سہا رابطہ بھی ٹوٹ گیا۔ زبان پر الی کی تہہ جم گئی---

ابے کی بیسہ جا تالو سے چپک گئی۔ اڑوس پڑوس اور رشتہ دار جو پہلے ابے کی زبان درازیوں سے خائف رہا کرتے تھے' اب ان کی چپ سے ڈرنے لگے۔ کوئی خواہ کتنی ہی اہم بات کیوں نہ کرے' ابا زیادہ سے زیادہ ہاں ہونہہ میں جواب دیتے اور بس۔ وہ کسی حد تک تارک الدنیا ہو گئے۔ خانگی امور میں ان کی دلچسپی صفر ہو کر رہ گئی۔ جاننے والے حیران تھے کہ یہ کایا کلپ کیسے ہو گئی۔ حج کے بعد ابا کبھی کبھار سہ روزوں پر جایا کرتے تھے' اب وہ سلسلہ بھی موقوف ہو گیا۔ ابے کی زندگی میں ایک تبدیلی یہ بھی آئی کہ بلاناغہ داڑھی مونڈنے کا شوق یکسر ختم ہو گیا۔ کئی کئی دن شیو بناتے' منہ دھوتے نہ کپڑے بدلتے۔ یوں گاؤں کے واحد چاء خانہ میں شاموں کو بپا ہونے والے غیبت بیٹھکوں کی رونقیں بھی ابے کی مسلسل غیر حاضریوں سے بری طرح متاثر ہونے لگیں۔ ہونے کو تو گاؤں کے جملہ ازکار رفتہ بزرگوں کا نمائندہ اجتماع اب بھی ہوتا۔۔۔۔ مگر بے نتیجہ۔ گھر گھر فتنہ و فساد برپا کروانے کی تمام تر ذمہ داریوں کا بوجھ اب گاؤں کی اکلوتی مائی سکھاں کے نازک کاندھوں پر آن پڑا۔ وہ تو دھن جگرا ان کا کہ طلوع آفتاب سے غروب تک محنت کرتیں' تب کہیں جا کر رات کے وقت دو چار گھروں میں رونق لگتی ورنہ تو گاؤں اجڑ ہی چلا تھا۔

ابا سارے سارے دن دھوپ میں منجی ڈالے' چہرے پر ٹی کوزی اوڑھے پڑے رہتے۔ اللہ جانے یہ خبر ان تک کیسے پہنچی کہ قریبی دیہاتوں کی عورتیں دم درود دھاگے تعویز کی غرض سے جوق در جوق "حاجی ابا" کے پاس آنے لگیں۔ پہلے پہل تو ابا لیٹے لیٹے ٹی کوزی سرکا کر سائلوں اور غرض مندوں کو چہرۂ انور کی ریاضت کروا دیتے تھے' پھر جب "حاجی ابا" زیادہ رش لینے لگے تو ٹی کوزی ہٹائے بغیر چھوٹی موٹی گالی سے نواز دیتے۔ اکثر حاجت مندوں کی بھینسوں' گائیوں کے تھنوں میں دودھ اترنے لگے۔ دو تین بے اولادوں کے پیر بھی بھاری ہوئے۔ ایک دو کی ساسیں مریں۔ نذر نیاز سے بے نیاز حاجی ابے کی منجھی تلے دودھ کے ڈولوں سے لے کر کشمش بادام تک کے ڈھیر لگنے لگے۔ ابے کو ان چیزوں سے کوئی غرض تھی نہ ان گیارھویں سے کوئی سروکار جو بے طلب ہی ان کے چکٹ میلے سرہانے تلے صبح تا شام جمع ہونے لگی تھیں۔

اس صورت حال کو باقی بیٹوں نے تو قبول نہ کیا لیکن چھوٹا' کہ جو ابے سے بہت پیار کرتا تھا' کسی طور بھائیوں کے خیال سے اتفاق نہ کر سکا تو اس کا خیال تھا کہ ابے کی چپ کے اسباب سراسر روحانی ہیں اور یہ کہ کرامات کا ظہور محض اتفاق نہیں۔ لوگوں کی باتوں

اور جگ ہنسائی کے خوف سے بڑے بیٹے نے شہر سے آ کر ابے سے بات کی کہ کہیں تو چاچی کو واپس گاؤں بھیج دوں۔ "آپ کی تنہائی دیکھی نہیں جاتی۔"

"خبردار جو اس کا نام لیا تو..." ابے کو جیسے کرنٹ لگ گیا۔ اس تنبیہہ کے بعد دوسرے بیٹے بھی چھوٹے بھائی کے استدلال کے قائل ہو گئے کہ ہو نہ ہو ابے کو دنیاداری سے کوئی شغف نہیں رہا۔ اور بات غلط بھی نہ تھی۔ ابا دنیا کے معاملات سے اس حد تک لاتعلق ہو گئے کہ اپنے لاڈلے بیٹے کی شادی کے موقع پر بھی کنج تنہائی میں پڑے رہے۔ برات کے ساتھ جانا تو دور کی بات' ڈولی والوں کی پذیرائی کو بھی نہ اٹھے۔ دولہا کے پیہم اصرار پر صرف ایک منٹ کے لئے بیٹھک میں آئے' سمدھی سے مصافحہ کیا اور پھر جا منجی پر دراز ہو کر ٹی کوزی اوڑھ لی۔ مہمانوں کے رخصت ہو جانے کے بعد پانچوں بیٹے با جماعت حاضر ہوئے تو ان کی ضد پر اٹھے' حجلہ عروسی تک گئے' ایک طائرانہ نگاہ دولہن پر ڈالی خفیف سی مسکراہٹ کے ساتھ نئی بہو کے سر پر ہاتھ پھیرا اور لوٹ کر منجی پر۔

ابے کا کمرہ عروسی کمرے کے متصل تھا۔ شب بھر وقفے وقفے سے کھانستے رہے۔ بیٹے کو تشویش ہوئی تو دوبارہ دروازے پر جا کر طبیعت پوچھی "ٹھیک ہوں—— میری فکر نہ کر" دونوں بار ابے نے بیٹے کو دروازے سے لوٹا دیا۔

دیہی رواج کے مطابق دلہن پو پھٹے اٹھی' قریبی باؤلی پر جا پانی کی گاگر بھر لائی۔ دہی بلویا اور لسی کا گلاس لے ابے کے حضور جا کھڑی ہوئی۔ ابے نے بہو کو دیکھا تو بے اختیار ان کا ہاتھ سبز شرٹ کی جانب اٹھ گیا۔ نئی نویلی دلہن پدرانہ شفقت کے اس مظاہرے پر جھینپ گئی۔ لسی کا گلاس میز پر رکھا اور پلٹ کر تیزی کے ساتھ باہر نکل گئی۔

طلوع آفتاب کے ساتھ اٹھ کر بیٹا حسب معمول ابے کو سلام کرنے گیا تو ابا کمرے میں نہ تھے۔ وہ برآمدے میں کرسی ڈالے بیٹھے تھے۔ سہ منزلہ ٹھوڑی سمیت پورے چہرے پر جابجا اخباری کاغذ کی چپیاں چپکی ہوئی تھیں۔ ابے کی چوہا دم مونچھیں کاک کھولنے والے اسکریو کی مانند اکڑی اینٹھی ہوئی تھیں۔ ٹی کوزی پرے پڑی تھی اور ابے کے سر پر جابجا چھوٹے بڑے جزیرے ابھرے ہوئے تھے—— جیسے راتوں رات بحر اسود میں کہیں سے میلی برف کے گلیشیر آن گرے ہوں۔ وہ نیا جوڑا جو گزشتہ روز باوجود منت سماجت کے ابے نے پہننے سے انکار کر دیا تھا' کرسی کی پشت پر پڑا تھا۔ بیٹے پر نظر پڑتے ہی ابے نے جھٹ سبز شرٹ اٹھایا اور پھر

فوراً گرا دیا۔ شٹر کے ساتھ تین چار چپیاں بھی گر پڑیں۔ ابے کے لاڈلے بیٹے کے اندر بھی کچھ گرا اور چھناکے سے ٹوٹ گیا۔ لیکن چھناکا اس کے چہرے پر سنائی نہ دیا۔ سنبھل کر وہ نپے تلے قدموں سے اپنے کمرے کو چل دیا۔ جھریاں ابے کے گالوں پر یوں اکٹھی ہوئیں جیسے کسی نے پردے کی ڈوری جھٹکے ساتھ کھینچ لی ہو۔ بیٹے کے پیچھے ڈوری دیر تک اور دور تک کھنچی رہی۔ اسی دوپہر کو وہ اپنی دلہن کو میکے چھوڑ کر واپس سعودی عرب روانہ ہو گیا۔

# حکیم جی

اشفاق احمد ورک

حکیم جی، تو ہم انہیں مجاز مرسل کی رو سے کہتے ہیں۔ وگرنہ حکمت، سیاست، اروی، انگریزی لباس، بدچلن مرغیوں کے انڈے، نیک چلن پڑوسیوں سے بول چال، قرض خواہ دوستوں، غریب رشتہ داروں، ہندوستان اور گھر کا کھانا چھوڑے انہیں اتنا عرصہ ہو چکا ہے کہ اب ان میں سے بیشتر کی وجوہات ترکیہ بھی حافظے کو خدا حافظ کہہ چکی ہیں۔ ہماری ان سے راہ رسم تو وادیِ ہوش میں قدم رکھنے کے بعد ہوئی البتہ ان کے احسانات کا سلسلہ ہماری پیدائش سے پہلے ہی شروع ہو چکا تھا۔ اور وہ آج بھی موقع بے موقع ہماری یادداشت کی بے وفائی کے خوف سے اپنے اس احسان عظیم میں نئے رنگ بھرتے رہتے ہیں کہ "میاں تمہارے والد کو بڑی مشکل سے شادی پر راضی کیا تھا۔"

جسمانی قد کا عام لوگوں میں وہی تناسب ہے جو لفظ "قد" کا باقی لفظوں میں۔ مادری زبان کئی نسلوں سے اردو ہے۔ کبھی کبھار "اشتیاقاً" یا "ضرورتاً" پنجابی بول رہے ہوں تو لگتا ہے عارف لوہار سے اردو بولنے کا بدلہ لے رہے ہیں۔ انسانیت سے زیادہ نسائیت کے قائل ہیں۔ لوگوں کی بیوی کے لئے "جیتی رہو" اور اپنی کے لئے "جوتی رہو" کے مقولے پر عرصے سے کاربند ہیں۔ سولہ سالہ تک وطن مالوف میں زیر تعلیم رہے۔ پھر تعلیم کو زیر کرنے کے لئے مغربی ممالک کا رخ کیا۔ مرحوم کرشن چندر اپنے نام کے ساتھ "ایم۔ اے" لکھا کرتے تھے۔ حکیم جی اپنے نام کے ساتھ "ایم۔ اے پاس" لکھتے ہیں۔

کبھی مزاج کے ٹھہراؤ اور گھیراؤ کا یہ عالم تھا کہ "اک پلیٹ" کو بھی "اک پل لیٹ" کہا کرتے تھے اور تلفظ و تلفت کی یہ کیفیت تھی کہ "قزلباش" کو "کج لباس" کہہ کے

زبان کی لغزش کے مزے لوٹا کرتے تھے۔ گردش زمانہ نے اس قدر نڈھال کر دیا ہے کہ اب کوئی آ کے یہ بھی کہہ دے کہ "سو چلیں" تو فرماتے ہیں۔ "سوچ لیں۔" نظر ایسی ہے کہ اب کسی مقدمے میں چشم دید گواہ کی بجائے چشمہ دید گواہ بنتے ہیں۔ برے سے برا کام بھی اتنے اعتماد سے کرتے ہیں کہ احساس گناہ ختم ہو جاتا ہے۔ اخلاقی نقطہ نظر کے اس شدت سے قائل کہ فرماتے ہیں انگریزی میں "شی" کے ساتھ "Has" کا استعمال فحاشی بلکہ بے حیائی کے زمرے میں آتا ہے۔

عہد جوانی میر کی طرح رو رو کر کاٹنے کی بجائے مومن خان مومن کی طرح دوائے دل بیچتے بتائی۔ اطبا کے اس طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ جو کنواری لڑکی کی نبض پر بندھے دھاگے کے لمس سے نازنین کی عمر' کردار' مرض' پسندیدہ فلمی ہیرو' میٹرک میں ریاضی کے نمبر' معاشرتی اور خون کا گروپ اور سر تا پا سریے کے جملہ ناپ منہ زبانی بتا دیا کرتے تھے۔ اس مریض کو کلینک میں نہیں گھسنے دیتے تھے' جس کا عین اور قاف کا مخرج درست نہ ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ اہل زبان مریضوں کے فقدان کے باعث' ہوتے ہوتے ان کا حلقہ مراضت صرف ایک محلے تک محدود ہو کے رہ گیا۔ وہاں بھی ایک بائی دل کے اتنا پاس آ گئی کہ ان کے اپنے دل کا بائی پاس کروانا پڑا۔ طرفہ ستم ان کی فیس تھی جسے سنتے ہی مریض دام کی بجائے یہ کہتے ہوئے دم دے دیتا تھا کہ۔

جمع کرتے ہو کیوں طبیبوں کو
میں نہ اچھا ہوا برا نہ ہوا

میرزا غالب سے اس قدر متاثر ہیں کہ زندگی کے جس شعبے میں بھی کسی شخص کی اداؤں یا کج ادائیوں پر دل آ جائے اسے اس شعبے کی "مرزا غالبی" سونپ دیتے ہیں۔ غالب پسندی کی انتہا یہ ہے کہ حقوق والدین کی ادائیگی میں بھی والدہ مرحومہ کی صفات بیان کرتے ہوئے تان اسی بات پر توڑتے ہیں کہ "میاں امی حضور کے ضمن میں مزید لب کشائی کیا کروں۔ آپ یوں سمجھ لیں کہ وہ تمام ماؤں کی میرزا غالب تھیں۔" آئینہ دیکھنے کی لت انہوں نے کبھی نہیں پالی۔ جب بھی دکھایا دوسروں نے ہی دکھایا۔ چہرے پر موٹے شیشوں کی عینک' جس کے شیشے اتنے دبیز اور غلیظ ہیں کہ ان کے اندر سے تو اچھے برے کی تمیز ختم ہو جاتی ہے۔ جس کے ثبوت کے طور پر ان کی گذشتہ چونتیس سالہ عینکانہ زندگی کو عین اعتماد سے پیش کیا جا سکتا ہے۔

دوستی میں کچھ یاراں جنت اور کچھ یاراں دوزخ کے قائل ہیں۔ عہد اور عہدے کی آج تک پاسداری نہیں کی۔ معاملہ فہم ایسے کہ ان کے محلے کی مسجد میں مختلف فرقوں کے درمیان آئے دن جھگڑا رہتا ایک فرقہ کہتا کہ نماز کی نیت باندھتے وقت ہاتھ کانوں تک اٹھانے چاہئیں۔ جبکہ دوسرا فرقہ ان کے کندھوں سے تجاوز کرنے کو بزور بازو روکنا چاہتا تھا۔ حکیم جی نے یہ کہہ کے معاملہ رفع دفع کروا دیا کہ ہمیں نیت کے لئے ہاتھ اٹھاتے وقت کانوں کو کندھوں کے قریب لے آنا چاہیے۔ ان کے ایک دوست نے کپڑے کی دکان کھولی تو ان سے مشورہ لینے آ گئے کہ کوئی منفرد سا نام بتاؤ۔ کہنے لگے "بھیا زیادہ منفرد نام رکھنا چاہتے ہو تو "فطری لباس ہاؤس" رکھ لو۔" ایک دن میں ان کے ہمدم دیرینہ لالہ رفیق سے ملنے جانے لگا تو فرمانے لگے کہ وہاں چلے ہو تو اس تک میرے خیرسگالی کے جذبات پہنچا دینا مگر "خیر" اور "س" نکال کے۔

حکیم جی اتفاق سے چند ایکڑ اراضی کے بھی مالک ہیں۔ اپنی زمین اور زبان کی زرخیزی ثابت کروانے کے لئے ایک روز بتانے لگے کہ "یہ اس وقت کا ذکر ہے جب حکمرانوں کو دیہی و ذاتی ترقی کا نیا نیا خیال آیا تھا۔ الیکشن اور بہار کا موسم تھا کہ واپڈا والے ہماری زمینوں میں لوہے اور سیمنٹ کے کھمبے نصب کر گئے مگر جب چند روز بعد بقیہ سامان اور ہدایات لے کر پہنچے تو ان فولادی کمانیوں سے پھوٹی لش گرین کونپلیں ان کا منہ چڑا رہی تھیں۔"

ہم حکیم جی کے لئے احتراماً" یا شاید اخلاقاً" جمع کا صیغہ استعمال کرتے ہیں۔ وگرنہ زوجین کی صحت بلکہ بد صحتی کا یہ حال ہے کہ اگر ہماری اردو گرامر مقدار کی بجائے معیار پہ توجہ دیتی تو یہ میاں بیوی مل کے بھی صیغہ واحد عبور نہ کر پاتے۔ جب سے شوگر کی تشخیص ہوئی ہے صبر کرنا بھی چھوڑ دیا ہے کہ اس کے میٹھے پھل سے گھبراتے ہیں۔ ایک بار اخبار میں نئی آسامیوں کا اشتہار دیکھ رہے تھے۔ جس میں قابلیت سے زیادہ تجربے پہ زور دیا گیا تھا۔ فرمانے لگے "یہ تو ایسا ہی ہے جیسے کنواری لڑکی کا رشتہ طے کرتے ہوئے تجربہ کار بر کی تلاش پر زور دیا جائے۔"

ان کے جذبہ ترحم کی صورت ملاحظہ ہو کہ گذشتہ برس ایک دماغی مریض پر ہزاروں روپے خرچ کر ڈالے۔ ہر روز اسے ڈاکٹر کے پاس لے کے جاتے۔ متعدد ماہرین نفسیات سے مشورے کئے۔ پیروں فقیروں کے مزاروں پر اس کی تندرستی کے لئے منتیں مانیں۔ ان کے

اس انتہائی جذبہ اخلاقی سے متاثر بلکہ مرعوب ہوتے ہوئے ایک دن ہم نے دریافت کیا کہ "اس سے آپ کا کیا رشتہ ہے؟"

کہنے لگے "میرا دنیا فیلو ہے۔"

"ہم نے ان کے روایتی ابہام کے خاتمے کے لئے مزید دست استفہام دراز کیا کہ "کوئی دوست ہیں؟"

"بالکل نہیں۔"

"کوئی سسرالی مجبوری؟"

"الحمداللہ ہرگز نہیں۔"

"کوئی تعلق دار؟"

"جی نہیں۔"

"تو پھر یہ سب کس مد میں؟"

"کہنے لگے "شد و مد میں۔"

ہم نے ابہام کا یہ سلسلہ شب ہجراں کی مانند دراز ہوتے دیکھا تو ہمیشہ کی طرح ہار مانتے ہوئے ڈور کا سرا تلاش کرنے کے لئے وضاحت کی درخواست کی تو یوں گویا ہوئے۔

"اصل میں اس شخص نے ایک سال پیشتر بیرون شہر جاتے ہوئے مجھے گالی دی تھی۔ اس وقت میں بھی جلدی میں تھا۔ جب اس سے دوبارہ ملاقات ہوئی تو یہ کسی سانحے یا بیماری کی وجہ سے اپنا دماغی توازن کھو چکا تھا۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ اس سے بھرپور بدلہ لینے کے لئے اسے اصلی حالت میں لانا ضروری ہے۔"

نظریاتی اعتبار سے مسلم لیگی ہیں ان کی حالت دیکھ لیں تو لگتا ہے مسلم لیگ ہیں۔ وطن دوستی کا انداز بھی نرالا ہے۔ ایک دن ہم دیر تک دوسرے ممالک کی ترقی' ایجادات اور ٹیکنالوجی اور وطن عزیز کی حالت زار کا رونا روتے رہے۔ تمام باتیں سننے کے بعد حسب روایت پورے اطمینان و اعتماد سے گویا ہوئے۔ "میاں ایک بات تمہیں بتائے دیتے ہیں کہ کل کلاں کو اگر تمہاری یہ دنیا کسی عالمی جنگ' سیلاب یا طوفان وغیرہ سے دوچار ہوئی تو سب سے کم نقصان تمہارے اسی وطن عزیز کا ہو گا۔"

ان کی زندگی کا بیشتر سفر پالنے سے لے کے پاؤں پاؤں چلنے تک محدود ہے۔ عمر

کے اس حصے میں آ کے ایک عدد موٹر سائیکل خرید بیٹھے۔ جب تک جو قوائے جسمانی مضمحل ہونے سے بچ رہے تھے۔ ان کا موٹر سائیکل کی ڈرائیونگ سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ اس لئے نتیجہ بالکل ہی حسب امید نکلا اور شہر کے اکثر لوگوں نے سوار اور سواری کو "اپنے اپنے مقام پر کبھی "تم" نہیں، کبھی "ہم" نہیں۔" والی کیفیت میں دیکھا۔ بلکہ دو ایک بار تو معاملہ بالکل ہی برعکس رہا۔ بالآخر کچھ دوستوں کے بیچ بچاؤ کرانے پر حکیم جی نے موٹر سائیکل بیچ کر جان و عزت بچائی۔ آج بھی فرماتے ہیں کہ "ہونڈا موٹر سائیکل کی پک اپ ایسی زبردست ہے کہ اس کو کنٹرول کر لینے کے بعد خود سر سے خود سر نفس پر قابو پانا آسان ہو جاتا ہے۔"

حکیم جی کی ایک پرانی عادت ہے کہ کوئی بھی بات ہو رہی ہو بیچ میں اپنے والد مرحوم کو گھسیٹ لاتے ہیں جیسے ان کے باپ کی ہو۔ ہمیں آج تک بتاتے آ رہے تھے کہ "میں بہت بڑے باپ کا بیٹا ہوں۔" ایک دن ہم سے نہ رہا گیا اور پوچھ ہی بیٹھے کہ "موصوف کرتے کیا تھے؟" فرمانے لگے "وہ تھے تو پوسٹ مین مگر عمر میں ہم سے بہت بڑے تھے۔" پھر تذکرۂ پدری میں بار بار ان کے نام کے ساتھ "مرحوم" یا "رحمت اللہ علیہ" کے الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ حالانکہ جیسے جیسے تعرنامے ان کے ساتھ منسوب کر رکھے ہیں۔ لگتا ہے ان کو مرحومی کے میرٹ تک لانے کے لئے رحمت خداوندی کو جوش میں لانا ضروری ہے۔

حکیم جی بتاتے ہیں کہ "والد مرحوم کی اولاد سے محبت کا یہ عالم تھا کہ اکثر محلے والوں کے گھر جا جا کے شکایت کرتے تھے کہ تمہاری کھڑکیوں کے شیشے ہمارے بچوں کی گیندوں سے ٹکراتے ہیں۔ پڑوسیوں کو حق ہمسائیگی جتا کے ان کے دسترخوان کو رونق بلکہ بے رونقی بخشنا تو خیر معمول کی بات تھی۔ ایک دفعہ تو ایک پھل فروش کی محض اس بناء پر پٹائی کر دی کہ اس نے ان کی چہیتی مسمیوں کو شریر کینوؤں کے نیچے والے خانے میں رکھا ہوا تھا۔ دروغ برگردن راوی۔ ہم نے تو یہ بھی سنا ہے کہ مرحوم نظم و ضبط کے اس قدر قائل تھے کہ اخبار کو بھی جلد کروا کے پڑھتے تھے۔

حکیم جی بتاتے ہیں کہ جب میں پیدا ہوا بلکہ کیا گیا تو آس پڑوس کے لوگ خوشی کی خبر سن کر آن جمع ہوئے۔ مبارکبادوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ایک محلے دار بیچارے یہ پوچھ بیٹھے کہ "خیر سے برخوردار کس پر گیا ہے؟" اسی وقت عزیز مذکور کو بازو سے پکڑ کر گھر بدر کرتے ہوئے فرمایا کہ "ابھی معصوم پوری طرح سے آیا بھی نہیں تم اس کے جانے کی بات کرتے ہو۔"

مرحوم اس بات پر اکثر کڑھا کرتے تھے کہ موجودہ پانی میں ان کے دور والی تاثیر باقی نہیں رہی کہ وہ سب تو واپڈا والوں نے بجلی کی صورت نکال لی ہے۔ حکیم جی کا بیان ہے کہ بزرگوار کے احتیاط کا یہ عالم تھا کہ کسی تقریب میں بوٹی کو ہاتھ لگانے سے پہلے بکرے کا چال چلن اور محلے کی بکریوں سے اس کے تعلقات کی نوعیت و مدت بالتفصیل دریافت فرماتے۔ لالہ رفیق کا کہنا ہے کہ "بیچارے بکروں کو ان کی بے زبانی مار گئی وگرنہ وہ یہی شرط اگر اپنے کھانے والوں سے متعلق عائد کر بیٹھتے تو والد مرحوم و مغفور عمر بھر حسرت لحم ہی میں اس دار فانی سے کوچ کر جاتے۔"

عموماً کہا جاتا ہے کہ ہر فنکار کے اندر ایک بچہ ہوتا ہے۔ حکیم جی کا خیال ہے کہ ہمیں ایسا کہنے سے گریز کرنا چاہیے کیونکہ فنکار عورت یا لڑکی بھی ہو سکتی ہے اور وہ لڑکی کنواری بھی ہو سکتی ہے۔ فرماتے ہیں کہ "عورت کو دنیا کی سب سے بڑی حقیقت کے طور پر پیدا کیا گیا ہے۔"

"اور مرد؟" ہم نے ہمیشہ کی طرح استفسار کیا۔

"اس حقیقت کی تصدیق کے لئے۔"

یورپ کی بے حیائی پر اکثر کڑھتے رہتے ہیں۔ ایک دن بولے کہ "وہاں تو عریانی و فحاشی کا یہ عالم ہے کہ فلم میں محض غسل آفتابی ہی میں پوری کی پوری ہیروئن طشت ازبام کر دیتے ہیں۔ جبکہ ہمارے ہاں رکھ رکھاؤ کا آج بھی یہ انداز ہے کہ پہلے اس کے جسم کا نچلا حصہ دکھانے کے لئے ہیروئن کو سوئمنگ پول کے کنارے کھڑا کیا جاتا ہے اور پھر باقی دھڑ کی نمائش کی خاطر باتھ روم والے غسل کا تردد کیا جاتا ہے۔

زیادہ سگریٹ پینے والے کو چین سموکر کہا جاتا ہے تو بہت زیادہ پینے والے کو بے چین سموکر کہا جا سکتا ہے حکیم جی کا شمار بھی بلا تامل دوسری قسم کے لوگوں (یا اگر کوئی تیسری بھی ہے) میں کیا جا سکتا ہے۔ ان کی اسی عادت کے پیش نظر ایک دن ہم نے انہیں سگریٹ کیس میں سے ایک سگریٹ نکال کے پیش کیا۔ کیونکہ ان کی طرف پورا پیکٹ بڑھانے کو وہ پورا پیکٹ ہی سمجھتے ہیں۔ لیکن اب کے معاملہ بالکل ہی الٹ نکلا' فرمانے لگے۔

"سگریٹ چھوڑ دی بھئی۔"

"سگریٹ... چھوڑ... دی...؟ میں نے حیرانی میں لت پت ہوتے ہوئے انہی کے

الفاظ کے کش لگاتے ہوئے دریافت کیا۔

"جی ہاں، میں کوئی فرانسیسی تو نہیں بول رہا۔"

"لیکن ہم نے تو سنا تھا کہ چھٹتی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی۔ پھر یہ معجزہ کیسے ہو گیا؟"

"بس ہو گیا، اس نے مجبور کر دیا۔"

"کون ہے وہ مسیحا؟"

"ایک ڈاکٹر ہے۔"

"کہاں ہے وہ ڈاکٹر؟ اور کیسے ہو گیا یہ سب؟"

"ڈاکٹر تو اپنے محلے کا ہے اور میں گیا بھی اس سے کھانسی کی دوا لینے تھا۔ دوران تشخیص اس نے پوچھ لیا۔ "سگریٹ پیتے ہیں؟"

"الحمد اللہ باذوق ہوں۔" میں نے عرض کی۔

اس پر اس نے بڑے ڈرانے والے انداز میں مجھے بتایا کہ "شاید آپ نہیں جانتے کہ سگریٹ ایک دن میں آدمی کی ایک منٹ زندگی کم کر دیتے ہیں۔" میں نے وہیں بیٹھے بیٹھے انگلیوں کی پوروں پہ حساب لگایا تو عمر کی اس کٹوتی کا تناسب برے سے برے آدمی کی نیکیوں سے بھی کم بنتا تھا۔ یعنی ایک سو بیس برس میں فقط ایک مہینہ۔ میں سگریٹ جیسی عظیم چیز کی اس قدر تذلیل برداشت نہ کر سکا۔ اور ویسے بھی کس کے پاس اتنا وقت ہے کہ وہ محض ایک عدد موت کو گلے لگانے کے لئے صدیوں زندگی کو سینے سے لگائے رکھے۔ لہٰذا میں نے سگریٹ سے کنارہ کشی کر کے افیون کا آغاز کر دیا ہے۔"

جب بھی اپنی حرام کہانی لے کے بیٹھتے ہیں تو ماضی کی یادداشتائیں ایک ایک کر کے قطار اندر قطار کھڑی کرتے چلے جاتے ہیں۔ ان کی یورپی "داشتان" سننے کے بعد محسوس ہوتا ہے کہ ہندوستان میں شاید ہی کوئی ناری ان کی نظر بد کی زد میں آئے بغیر جوانی کی دہلیز پہ قدم رکھ پائی ہو۔ غرضیکہ ان کی مبینہ جوانی کا لب لباب یہ ہے کہ جہاں بھی گئے داشتہ چھوڑ آئے۔

وہ خود فرماتے ہیں کہ "نی" کا لفظ لڑکی یا عورت کے لئے لفظ تخاطب ہے اور اگر جوانی میں سے یہ "نی" نکل جائے تو پیچھے جوا ہی جوا رہ جاتا ہے۔ چنانچہ اپنی اسی کثیرالمقاصد جوا ــــ نی کے اسرار و رموز آشکار کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ "اس وقت عقابی نظروں کا یہ عالم

تھا کہ گھر کی منڈیر پہ کھڑے ہو کر چاند پہ بیٹھی دوشیزہ کے ناک میں پہنی نسلی کے تمام نگ گن لیا کرتے تھے۔"

مسٹر الو نے حسب عادت لقمہ دیا کہ "حکیم جی کچھ تو خدا کا خوف کریں' ہم آج تک سنتے آئے ہیں کہ چاند پہ بیٹھی بڑھیا چرخہ کات رہی ہے۔ یہ دوشیزہ کو آپ خواہ مخواہ زحمت دے رہے ہیں۔"

چہرے پر من و گرز و میدان و افراسیاب والی کیفیت طاری کرتے ہوئے گویا ہوئے۔"

"ابے او الو کے چرخے تم کبھی کبھار عضو رئیسہ کو بھی زحمت دے لیا کرو کہ میں آج سے چالیس پچاس سال پہلے کی بات کر رہا ہوں۔ جب یہ خاتون نہ بڑھیا تھی اور نہ کسی چرخے یا الو کے چرخے سے اسے کوئی سروکار۔ بلکہ سارا دن گنتے لتے پہنے کسی ان دیکھے پردیسی کی راہ تکا کرتی۔"

علامہ اقبال نے کہا تھا کہ "عمل سے زندگی بنتی ہے" حکیم جی کا دعویٰ ہے کہ حمل سے زندگی بنتی ہے۔ لالہ نے حسب سابق مداخلت کی کہ "حمل بھی تو ایک عمل ہی ہے۔" حکیم جی نے باقاعدہ وضاحت کی کہ "حمل عمل نہیں نتیجے کا نام ہے۔" نتیجے سے یاد آیا کہ ایک دن ایک صاحب مجھ سے پوچھنے لگے کہ "مغلیہ حکومت کی دو بڑی خصوصیات بتاؤ۔" میں نے کافی غور و خوض کے بعد بتایا کہ "عشق اور عمارات" جھٹ کہنے لگے "عشق ہی عشق ہے۔ عمارات تو اس کے نتیجے میں وجود میں آ گئی ہیں۔ پچھلے دنوں حکیم جی بیٹھے ہوئے تھے کہ میرے ایک چچا زاد ملنے آ گئے۔ میں نے تعارف کرواتے ہوئے کہا "یہ میرے کزن ہیں" فرمانے لگے "زبان کی نزاکتوں کے معاملے میں تم بھی نرے بدھو ہو۔" ہم نے وضاحت طلب نظروں سے حکیم جی کو دیکھا تو بولے کہ "اس تین حرفی لفظ کا دو تہائی زبان حال سے پکار پکار کے کہہ رہا ہے کہ اس پر صرف صنف نازک کا حق ہے۔ تم خواہ مخواہ اس میں مونچھوں والے چچا زاد کو گھسیٹ رہے ہو۔"

باقی تمام معاملات کی طرح ادب کے متعلق بھی ان کا ایک اپنا نقطہ نظر ہے۔ بلکہ اگر غور سے دیکھیں تو پتہ چلتا ہے کہ اس میں نکتے زیادہ ہیں اور نظر کم۔ فرماتے ہیں کہ "ادب ایک ایسا جنگل ہے جس میں کئی بکرے میڈیا کے سینگ لگا کر بارہ سنگھے بنے بیٹھے ہیں۔ جب یہ وقت کے خار زار سے گزریں گے تو حقیقت سب پر واضح ہو جائے گی۔ باتوں باتوں میں

ایک روز مزاح نگاری کا تذکرہ چھڑ گیا تو کہنے لگے۔ "کامیاب مزاح پارہ وہ ہوتا ہے جسے نصاب میں شامل کرنا مشکل ہو جائے۔ ہم نے مشتاق احمد یوسفی کا نام لیا تو ہاتھ کے اشارے سے منع کر دیا۔ کہنے لگے "اس کم بخت کا نام نہ لو۔ اس کا ایک مضمون پڑھ لوں تو کئی مہینے تک لکھنا بھول جاتا ہوں۔"

ہم نے ان کو ٹھنڈا کرنے کے لئے عطاء الحق قاسمی کا ذکر چھیڑ دیا کہ "دیکھتے ہی دیکھتے ان کے اتنے زیادہ مجموعے منظرعام پر آ گئے ہیں کہ اتنی کتابیں تو اوپر سے دیکھ کر بھی نہیں لکھی جا سکتیں۔" "لیکن بھئی ایک بات ماننی پڑے گی (ہماری بات کو بیچ میں ٹوکتے ہوئے بولے) کہ اس نے تیز آنچ پہ بھی ہمیشہ میٹھا ہی پکایا ہے۔"

"یونس بٹ" میرے منہ سے نکلا۔ جھلا کر کہنے لگے "بھئی وہ بھی عجب گھپلا ہے کہ وہ ڈاکٹر بھی ہے اور ادیب بھی۔ مگر مصیبت یہ ہے کہ وہ ہسپتال میں مریضوں کا ادب کرتا ہے اور تحریروں میں لفظوں کی سرجری۔" کسی نوجوان مزاح نگار کا ذکر ہوا تو بولے "اس بیچارے کو مزاح کا کیا پتہ، ہمارا ایک دوست بڑا اچھا مزاح نگار ہے۔ جو چھوٹی چھوٹی چیزوں سے مزاح پیدا کرتا ہے۔" ہم نے پوچھا مثلاً؟ کہنے لگے "ابھی پرسوں اس نے میرے سامنے ایک مچھر کی دم پر سوئی چبھو کر مزاح پیدا کیا تھا۔ اب تم ہی بتاؤ بھلا مچھر اور سوئی سے چھوٹی کوئی چیز ہوتی ہے؟"

ایک روز کسی نے پوچھا یہ اپنے اشفاق احمد کو کیا ہو گیا ہے۔ اچھی بھلی داستان سرائی کرتے ہوئے صوفی ازم میں پڑ گئے ہیں۔ کہنے لگے "اس کے سر پر تو تصوف ایسا سوار ہے کہ اس کا بس چلے تو خواتین کو بھی داڑھی رکھوا دے۔" ایک دن ادب میں جنس نگاری پر بات ہو رہی تھی کسی نے سوال کیا کہ پرانے اور نئے جنس نگاروں میں کیا واضح فرق ہے؟" حکیم جی نے بتایا کہ "پہلے ادیب جنسی مسائل کی بات کرتے تھے اور موجود ادیب جنسی وسائل کی۔"

اردو شاعری اور شاعروں کے متعلق بھی حکیم جی کی اپنی رائے ہے بلکہ اکثر شعراء کے بارے میں تو ان کی رائے اتنی عارضی ہوتی ہے کہ ربنا رائے لگتی ہے۔ اور روایتی قسم کے شاعروں سے تو حکیم جی کو خدا واسطے کا بیر ہے۔ کہتے ہیں "ان کی کنجوسی بلکہ تھڑولی کا یہ عالم ہے اور گناہ بے لذت کے ایسے شوقین ہیں کہ خیالی پلاؤ بھی پکائیں تو مصالحے ڈالتے ہوئے جان نکلتی ہے۔ مثلاً اپنی شاعری میں اگر محبوب کو گھر کی نوید بھی سنائیں گے۔ تو چھوٹے سے گھر کی۔ محبوب نہ ہوا، مرغی کا بچہ ہو گیا۔ یہ گھر بھی انہوں نے لفظوں اور استعاروں میں بنانا ہوتا

ہے۔ اس پر بھی خست کا یہ انداز جیسے ابھی چونے سیمنٹ کی پے منٹ کرنے والے ہوں۔"

لالہ رفیق نے شعراء کی مدافعت میں وضاحت کرنا چاہی کہ "حکیم جی! گھر جتنا چھوٹا ہوتا ہے۔ فاصلے اتنے ہی کم ہوتے ہیں۔ اور گھروں کی کشادگی آپس کے فاصلوں اور دوریوں کا بھی سبب بن جاتی ہے۔" حکیم جی' لالہ کی اس غیر تسلی بخش توجیع پر حسب سابق چڑھ دوڑے۔" بھاڑ میں جائیں تم اور تمہارے بے فاصلہ شاعر۔ انھیں کہہ دو کہ اگر فاصلے بہت زیادہ کم کرنے ہیں تو آئندہ اس طرح کے گانے لکھا کریں۔

ہم تم اک ڈربے میں بند ہوں

یہ شاعر حضرات بھی اتنے گھامڑ اور غبی ہوتے ہیں۔ (انہوں نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا) کہ جن زلفوں کی مدح سرائی میں یہ بادلوں اور گھٹاؤں تک کو خاطر میں نہیں لاتے۔ اگر وہی بدقسمت محبوب ان کی چکنی چپڑی باتوں میں آکر مرحلہ قبولیت طے کر جائے۔ اور اس کے بعد شب دیجور جیسی انہی زلفوں میں سے محض ایک عدد بال بریانی کی پلیٹ سے برآمد ہو جائے تو یہ بال بلکہ محبوب کی کھال کھینچنے پر اتر آتے ہیں۔ موجودہ چھپنے والی شاعری کی کتابوں کے ناموں پر ان کی خاص نظر رہتی ہے۔ پچھلے دنوں ہمارے دوست باقی احمد پوری جن کی دو کتابیں "اب دل ہی نہیں لگتا" اور "اب شام نہیں ڈھلتی" منظرِعام پر آچکی ہیں۔ سر راہ مل گئے۔ انہیں مشورہ دینے لگے کہ "بھئی ابھی جو جو کچھ تم سے نہیں ہو پا رہا۔ اس کی مناسبت سے مجموعے چھپواتے جاؤ اور جب کلیات کی باری آئے تو اس کا نام رکھنا۔ "اب کچھ بھی نہیں ہوتا" ہم نے بتایا نصیر احمد ناصر کی کتاب کا نام ہے "دسمبر اب مت آنا" کہنے لگے اکیلے نصیر ناصر کا کیا ذکر اب تو کوئی بھی شریف آدمی کپڑوں کی دکان پر گرم کپڑوں کا بھاؤ پوچھنے کے بعد یہی کہے گا۔"

فیصل آباد کے شاعر اشرف یوسفی کے مجموعے "ایک پیالہ پانی" کا ذکر آیا تو بولے "ادب میں ایسے ناموں کا بڑا فائدہ رہتا ہے کہ باقی کتابوں کے نام باآسانی رکھے جاسکتے ہیں مثلاً "دو پیالی چائے" "تین عدد روٹیاں" "چار درجن کیلے" "پانچ کلو گھی" وغیرہ وغیرہ۔

کسی نے ناہید شاہد کی پہلی کتاب "پتن" کی طرف توجہ دلائی تو یوں گویا ہوئے۔" اگر اس کی حب الوطنی اور شرافت اسی طرح برقرار رہی تو اگلی کتاب کا نام "پاک پتن" ہو گا۔"

"منیر نیازی کی نئی کتاب آئی ہے "اک دعا جو میں بھول گیا تھا""؟"

"آپ آ جائے گی" "اک کتاب جو میں بھول گیا تھا۔"

خاقان حیدر غازی کی "بند گلی میں شام" کا نام آیا تو کہنے لگے کہ "بند گلی میں تو اب شام ہی ہو گی۔ یہ کوئی بند گلا تو ہے نہیں کہ بند ہونے پر بھی اس کی روشنیاں جینا حرام کر دیں۔"

ایک دوست نے نوجوان شاعر ایوب کے بارے میں رائے مانگی تو بولے "میں ایسے شخص کے بارے میں کیا رائے دے سکتا ہوں جو "الف" سے شروع ہو کے "ب" پہ ختم ہو جائے۔"

"اور نوشی گیلانی؟"

"ہاں بھئی ہمارے بھری ادب میں بڑا خوبصورت اضافہ ہے۔"

حکیم جی کچھ عرصہ تک ٹیلی ویژن سے بھی وابستہ بلکہ پیوستہ رہے ہیں۔ آج بھی کبھی کبھی عہد رفتہ کو آواز دیتے ہوئے بتاتے ہیں کہ وہاں میں نے بڑے بڑے جید علماء کو میک اپ کروا کے سادگی کی فضیلت پہ درس دیتے سنا ہے۔ کہتے ہیں کہ "ایک بار ایک پروڈیوسر سر پکڑے بیٹھا تھا۔ میں نے وجہ پریشانی دریافت کی تو اشک آلود آنکھوں سے بولا کہ مجھے موسیقی کا پروگرام ریکارڈ کرنا ہے۔ آج میں نے حساب لگایا تو معلوم ہوا کہ یہ پروگرام رمضان المبارک میں آن ایئر جائے گا۔ مگر جو گیت موصول ہوئے ہیں' وہ عام پروگرام کے ہیں۔ پھر کیا تھا میں نے وہیں بیٹھے بیٹھے تمام شاعری کو اسلامی کر دیا۔ مثلاً "آنکھوں میں ہے رانی" والے مطلع کو "آنکھوں میں حیرانی" میں بدل دیا اور ایک گانا جس کے بول تھے۔

ندیا میں دھیرے دھیرے سورج ڈوبا جائے
پیا نہیں آئے مورے پیا نہیں آئے

میں نے جھٹ دوسرے مصرع کو یوں مبدل کیا کہ۔

روزہ کھلوائے کوئی روزہ کھلوائے

موسیقی کا شوق تو ویسے بھی حکیم جی نے ورثے میں پایا ہے۔ لالہ اس شوق کو میراث میں پانے والوں کے لئے بڑا غیر مہذب لفظ استعمال کرتے ہیں۔ اور یہی لالہ و حکیم کے درمیان سب سے بڑی وجہ نزاع ہے۔ ایک دن موسیقی کی بات چھڑی تو میں نے پوچھ لیا کہ "آپ کا پسندیدہ گلوکار؟"

کہنے لگے "اخلاق احمد۔"

"ہاں اچھا گاتا ہے مگر آج کل بیچارہ کینسر میں مبتلا ہے۔ کسی کو فکر تک نہیں۔"

میری نہیں میں نہیں ملاتے ہوئے بولے "یہاں پورے معاشرتی اخلاق کو کینسر ہوا پڑا ہے۔ اس کی کسی کو فکر ہے جو اس کی ہو گی؟"

ایک بار کسی نے امیر خسرو کے معروف کلام "چھاپ تلک سب چھین لی رے موسے نیناں ملائی کے۔" کے متعلق ان سے دریافت کیا کہ یہ پاکستان اور انڈیا دونوں جگہوں پر بالترتیب ناہید اختر اور لتا منگیشکر نے گایا ہے۔ دونوں کے انداز گائیکی کے متعلق کچھ فرمائیں۔ کہنے لگے "ناہید اختر کی کیا بات ہے۔ اس سے یہ کلام سن کے یوں لگتا ہے جیسے ابھی ابھی کوئی چھاپ چھین کے گیا ہے۔ ظالم کے ہاں جھگڑیا کا درد صاف نظر آوے ہے۔ اور رہی لتا منگیشکر کی بات تو اس بی بی نے تو اسے اتنے سکون اور دھیمے انداز میں گایا ہے کہ صاف معلوم پڑتا ہے کہ چھاپ چھینی نہیں گئی بلکہ اس نے خود اتار کے دے دی ہے۔"

حکیم جی ہی کا قول ہے کہ "بد ذوق آدمی کی پہچان یہ ہے کہ اس سے کسی فلم کی کاسٹ پوچھی جائے تو وہ مرد اداکاروں کے نام گنوانا شروع کر دے" یہی وجہ ہے کہ ان کے ساتھ کبھی فلم کا پروگرام بنے تو سب سے پہلے ہیروئن اور اس کی تمام سہیلیوں کے نام حروف تہجی کے اعتبار سے بتانا پڑتے ہیں۔ ہیروئن نئی ہو تو اس کا نام بتاتے ہوئے یہ وضاحت بھی کرنا پڑتی ہے کہ "لڑکی ہے" کیونکہ موصوف چنکی پانڈے' انوپم کھیر' ایڈی مرفی' ادیتہ پنچولی اور انتھونی کوئن کا نام پہلی بار سننے کے بعد تین تین گھنٹے ٹی۔ وی سکرین کے سامنے مصلوب دیکھے گئے ہیں۔ اب تو احتیاط کا یہ عالم ہے کہ ہیروئن کے لڑکی کنفرم ہو جانے کے بعد بھی مطمئن نہیں ہوتے اور نتیجتہً انہیں کسی بھی فلم کے لئے قائل کرنے کے لئے تمام خاتون فنکاروں کے تصویری یا تحریری لوز کریکٹر سرٹیفکیٹس فائل میں لگا کر پیش کرنا پڑتے ہیں۔

مختصر یہ کہ حکیم جی کا بچپن ہنستے کھیلتے' لڑکپن کرکٹ کھیلتے' جوانی کھل کھیلتے اور بڑھاپا گل کھلاتے گذرا ہے۔ اپنے عہد غفلت (یاد رہے کہ وہ اس تمام عرصے کو جس میں ان سے کسی کی بھلائی کا معمولی کام بھی سرزد ہو گیا' عہد غفلت سے تعبیر کرتے ہیں) کی یادیں یا شاید حسرتیں شمار کرتے ہوئے اپنی کرکٹ چیتا پر یوں روشنی ڈالتے ہیں کہ "آج کے لونڈوں کو والدین و اساتذہ کو انگلیوں پر نچانے اور لڑکیوں کے اشاروں پر ناچنے ہی سے فرصت نہیں۔ ایک میں ہوں

کہ ابھی بچپن کا بے چین زمانہ پوری طرح گذرنے بھی نہ پایا تھا کہ کرکٹ کی گیند میری انگلیوں سے نکلنے کے بعد کسی نوخیز رقاصہ کی مانند اٹھلاتی بل کھاتی تھی اور بیٹسمین کو تگنی کا ناچ نچاتی تھی۔ اپنی لیگ سپنگ کو مزید فاش کرتے ہوئے بتاتے ہیں کہ ہاتھ سے نکلنے کے بعد گیند کا چال چلن موجودہ دور کے سیاست دانوں سے بھی زیادہ مشکوک ہوا کرتا تھا۔ کبھی دائیں بازو تو کبھی بائیں بازو اور بعض اوقات تو گیند کے یہ تیور ہوتے تھے کہ پہلا ٹپہ کھانے کے بعد بیٹسمین کو لفٹ کرائے بغیر بال واپس باؤلر کی جانب گھوم جایا کرتی تھی۔"

اب مصیبت یہ ہے کہ حکیم جی جن لوگوں کو اپنے مبینہ کارناموں کا چشم دید گواہ بتاتے ہیں۔ ان میں سے بیشتر کو زندگی جیسی نعمت سے ہاتھ دھوئے زمانہ بیت چکا ہے۔ پچھلے دنوں اتفاق سے ایک ایسے بزرگ سے ملاقات ہو گئی۔ جن کا نام حکیم جی کی اسی فہرست میں شامل تھا۔ بیتے ہوئے زمانے کے شدائد اس کے چہرے سے صاف پڑھے جا سکتے تھے۔ جبکہ اس بزرگ کے بقول وہ صورت اور صورت حال زمانے کی ستم کاریوں سے زیادہ حکیم جیسے دوستوں کی "کرم فرمائیوں" کا نتیجہ تھی۔ ہم نے باتوں باتوں میں حکیم جی کی باؤلنگ کے سنے سنائے خصائص کی زبان غیر سے تصدیق چاہی تو وہ بزرگ یوں گویا ہوئے کہ "میں اس بات کا چشم دید گواہ ہوں کہ ان کی اکثر گیندیں پہلا ٹپہ کھانے کے بعد واپس باؤلر کی جانب سفر کرتی تھیں مگر یہ ٹپہ گراونڈ کی پچ پر نہیں بلکہ پویلین کے چھجے پر پڑا کرتا تھا۔"

سچی بات تو یہ ہے کہ ایسے رنگین مزاج، پراگندہ طبع اور متنوع الجہات لوگ دنیا میں صدیوں بعد پیدا ہوتے ہیں بلکہ کبھی کبھی تو پیدا ہی نہیں ہوتے۔

# ضرورت ہے

محمد عارف

زندگی امتحان ہے۔ شاید اس لیے کہ سارا سال ہی امتحان ہوتے رہتے ہیں۔ امتحانات کی قربت سے امیدواروں میں کھلبلی مچی رہتی ہے کہ وہ نہیں جانتے کہ "ہو گا کیا؟" مگر ہمیں معلوم ہے کہ "ہو گا کیا؟" آخر کرنے کرانے والے کارکنان قضا و قدر ہم ہی تو ہیں۔

ہم نے لاعلمی کی تاریک راہوں کو آگہی کی چنگاری سے روشن کرنا ہے۔ انشاء اللہ علم کا چراغ ہماری ہی پھونکوں سے جل اٹھے گا۔ ہماری مدد کیجئے۔ ہمیں "بوٹی ایجنٹوں" کی اشد ضرورت ہے۔ کام ہی اتنا پھیل گیا ہے کہ ہم جتنے بھی ہیں' کم پڑ گئے ہیں۔ ہمارا ہاتھ بٹائیے۔

ہم کیا ہیں؟ ہم وہ ہیں۔ انجام تعلیم جن کی مٹھی میں ہے۔ جب چاہیں' اسے رہا کریں۔ جب چاہیں' اسیر کر لیں۔ جب چاہیں عزت بخشیں اور جب چاہیں ذلت دیں' تاہم' آپ نہ ڈریں۔ آپ کو ہم عزت بخشنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ اور بہت زیادہ رکھتے ہیں' مگر سادہ سی ایک ہی شرط ہے۔ تعاون۔

## آپ کوئی بھی ہوں ہم سے تعاون کریں!

اگر طالب علم ہیں تو ہم سے رجوع کریں۔ اپنے جملہ کوائف درج کرائیں۔ اپنا امتحانی مرکز بتائیں۔ کمزوریوں کی نشاندہی کریں۔ اپنی خواہش کا اظہار فرمائیں۔ "کتنے نمبر یا کون سا درجہ مطلوب ہے"۔ اپنی مالی حالت کا دستاویزی ثبوت پیش کریں۔ اگر آپ خدا کے خاص بندے ہیں تو بتائیں کہ اس نے آپ کے کتنے چھپڑ پھاڑ کر آپ کو کتنا دولت مند بنایا ہے۔

نوٹ:۔ جو امیدوار معیاری نہیں، گویا ہماری خدمات کا مناسب معاوضہ پیش کرنے سے قاصر ہیں۔ ہم ان پر از راہ خدا ترسی رعایتی شرح کا اطلاق کر دیں گے۔ البتہ وہ امیدوار جو دو چار سال میں محض کتابیں رٹ کر کرم کتابی بننے میں کامیاب ہوئے ہیں، امتحانی مرکز تشریف لانے کی زحمت گوارا نہ فرمائیں۔ گھر پر انہیں کچھ نہیں کہا جائے گا۔

اگر وہ کنگال ہیں تو امیدوار بننے کی جسارت ہرگز نہ کریں۔ ہمارا مشورہ مانیں۔ اس سال بوٹی ایجنٹ بن جائیں اور پیسے کما کر اگلے سال امیدوار بننے کے امکانات روشن کر لیں، ورنہ وہ ہیں اور تاریک راہوں کی مرگ ناگہاں۔

## اگر آپ امتحانی عملہ ہیں؟

تو سن لیں کہ آپ کی عزت آپ کے ہاتھ اور آپ کی جان ہمارے ہاتھ۔ مانا کہ آپ لوگ بہت بااختیار نہیں، مگر اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔ ہمارے ہاتھ لمبے ہیں۔ اور ان میں کلاشن کوف ہے۔ اگر آپ شادی شدہ ہیں تو اچھے شوہر ثابت ہوں۔ ہم آپ کی دلہن کے لیے طلائی چوڑیاں حاضر کریں گے۔ اگر آپ والد ماجد ہیں تو آپ کے بچے کے لیے ہانڈا 70 پیش خدمت ہے۔ اگر آپ نوجوان بچی کے باپ ہیں تو جہیز کی کمی دور ہو سکتی ہے۔ اگر آپ ہنوز فرزند ارجمند ہیں تو آپ کے بوڑھے والدین کا آپریشن ممکن ہو جائے گا یا آپ کی شادی خانہ آبادی .... ورنہ .... خانہ بربادی اگر آپ چھاپہ مار پارٹی ہیں؟ تو بھی ہم آپ کے سیوک ہیں۔ آپ کی پروموشن ہو سکتی ہے یا جو بھی آپ کے من کی مراد ہے۔ بر آئے گی۔ بس ہم سے تعاون کریں۔ آپ نے کاغذات پہ محض دستخط ہی تو کرنے ہیں۔ آنکھیں اور منہ بند کر کے اور بس۔

## امیدواروں کی تلاشی ہم لیں گے

امتحانی عملہ کو ناظم کی سربراہی میں امیدواروں کی طرف پیٹھ کر کے بیٹھنے کی اجازت ہے۔ آپ دیکھیں کہ بذریعہ دست غیب خورد و نوش کا جملہ سامان حاضر ہوتا رہے گا۔ بس آپ کھانے کی زحمت کرتے رہیں۔ ہم امیدواروں کی تلاشی لیں گے۔ ان کی جیبوں سے قائد

اعظمؒ والے نوٹ بطور تبرک نکال لیں گے۔ اور ان کی جگہ دوسری قسم کے نوٹ رکھ دیں گے۔ اگر کسی جیب سے قائد اعظمؒ والا نوٹ برآمد نہ ہوا تو اسے نظریہ پاکستان کا منکر قرار دیتے ہوئے قرار واقعی سزا دی جائے گی۔

نوٹ:۔ جس دن تمام امیدواروں کی جیبیں خالی پائی گئیں۔ امتحانی عملہ کی تلاشی لی جائے گی۔ اور ان کی جمع پونجی بحق سرکار من ضبط تصور ہو گی۔

## بوٹی ایجنٹ کی تعیناتی اور فرائض منصبی

بوٹی ایجنٹ کی تقرری اس کے حسب توفیق ہو گی۔ اگر توفیق کم ہے تو' طلبہ کا میزان' مضامین کا حساب' کس کو کتنے جواب صحیح اور کتنے غلط فراہم کرنے ہیں پرچہ کب اور کس سے چھین کر کیسے دینا ہے۔ امیدواروں کے چال چلن اور دیانت داری کا چارٹ اپ ٹو ڈیٹ رکھنا ہے۔ جیسے امور ان کے فرائض منصبی میں شامل ہونا ہے۔ متوسط درجے کی مالی حالت کی صورت میں تقرر' امتحانی عملہ میں کرایا جائے گا۔ اگر بوٹی ایجنٹ کی حیثیت آئیڈیل ہے تو اسے بورڈ ر یونیورسٹی کی کام کی برانچ میں کلرک لگوایا جائے گا۔

نوٹ:۔ انتہائی موزوں شخصیت کو اعلیٰ منصب پر بھی فائز کرایا جا سکتا ہے۔

## حروف آخر

ہمیں عامل کامل بابا کی سرپرستی حاصل ہے۔ ان کی بدولت ہم وی آئی پی امیدواروں کی خدمت کرنے کی اہلیت بھی رکھتے ہیں۔ امتحانی پرچوں کا کشف قبل از امتحان ہو جاتا ہے۔ وی آئی پی امیدوار جہاں بھی ہوں' گھر میں' کار میں یا ہوٹل میں' بے شک ملک ہی سے باہر ہوں' کام بہرحال ہو جاتا ہے۔ پرچہ بروقت حل ہو جاتا ہے۔ اور بروقت ہی بورڈ ر یونیورسٹی کو بطریق احسن روانہ کر دیا جاتا ہے۔

اگر کسی کا خیال ہے کہ ہم کبھی اپنے کیے پر نادم ہوتے ہیں تو یہ اس کی بھول ہے۔ ہمیں کوئی پشیمانی نہیں' پشیمان ہوں ہمارے مخالفین جو وقت کا ساتھ نہیں دے سکتے اور نظام

تعلیم کو فرسودہ طریقوں سے چلتا دیکھنا چاہتے ہیں۔

ہم شاندار روایات کے جنم داتا ہیں:۔ کیونکہ:۔

اولاً" غریب' غرباء کو ڈگریاں محض اس بناء پر عطا کرنا کہ وہ پڑھاکو ہیں سستی رومانیت کے سوا کچھ بھی نہیں اور اس روش کے نتائج تباہ کن ہیں' کیونکہ وہ میلے کپڑے پہنے مرجھائے چہرے لٹکائے جب ملازمت کے لیے ڈگری کو بطور کشکول استعمال کرتے ہیں تو علم و دانش کی توہین ہے۔

ثانیاً" یہ کہ ہم چاہتے ہیں۔ صاحب حیثیت خاندان' اہل ثروت گھرانوں کے چشم و چراغ ڈگریوں کے مالک بنیں۔ یہ لوگ ملازمت سے بے نیاز' وڈیروں' تاجروں' سرمایہ داروں اور فضل یافتہ افسروں کی آنکھوں کے تارے اور راج دلارے ہوتے ہیں۔ اعلیٰ منصب انہیں کے پاس ہوتا ہے۔ اور پہلے سے ہوتا ہے۔ ڈگری کو ان کے دامن میں آ کر پناہ ہی نہیں' عزت بھی ملتی اور منصب بھی۔ یوں ڈگری یافتہ بے روزگاروں میں اضافہ بھی نہیں ہوتا اور علم کی آبرو بچ جاتی ہے۔ غرضیکہ ہم علم کے دروازے ان پر کھولتے ہیں۔ جو شہر علم میں داخل ہونے کا وہ دعوت نامہ رکھتے ہیں' جسے ہم جاری کرتے ہیں۔

امتحانی نظام کو گڑبڑ سے پاک رکھنے والے دستے فوجی پیمانے پر جو چاہے کرلیں' ہمارا مفتوحہ و مقبوضہ علاقہ ہم سے واگزار نہیں کرا سکتے اور اگر کرائیں گے بھی تو کب تک؟ ہم ان تھک ہیں اور صاحب بصیرت بھی۔

بوقت ضرورت کھلی جنگ چھوڑ کر گوریلا جدوجہد بھی شروع کرنے کے اہل ہیں۔ پسپائی کی حکمت عملی اختیار کرتے ہوئے بڑے بڑے شہر چھوڑ کر قصبہ' قصبہ' دیہی مراکز کا رخ کیا جا سکتا ہے۔

کوئی ہمارا کچھ بگاڑ نہیں سکتا بگڑنے میں ہم خود کفیل ہیں۔

○
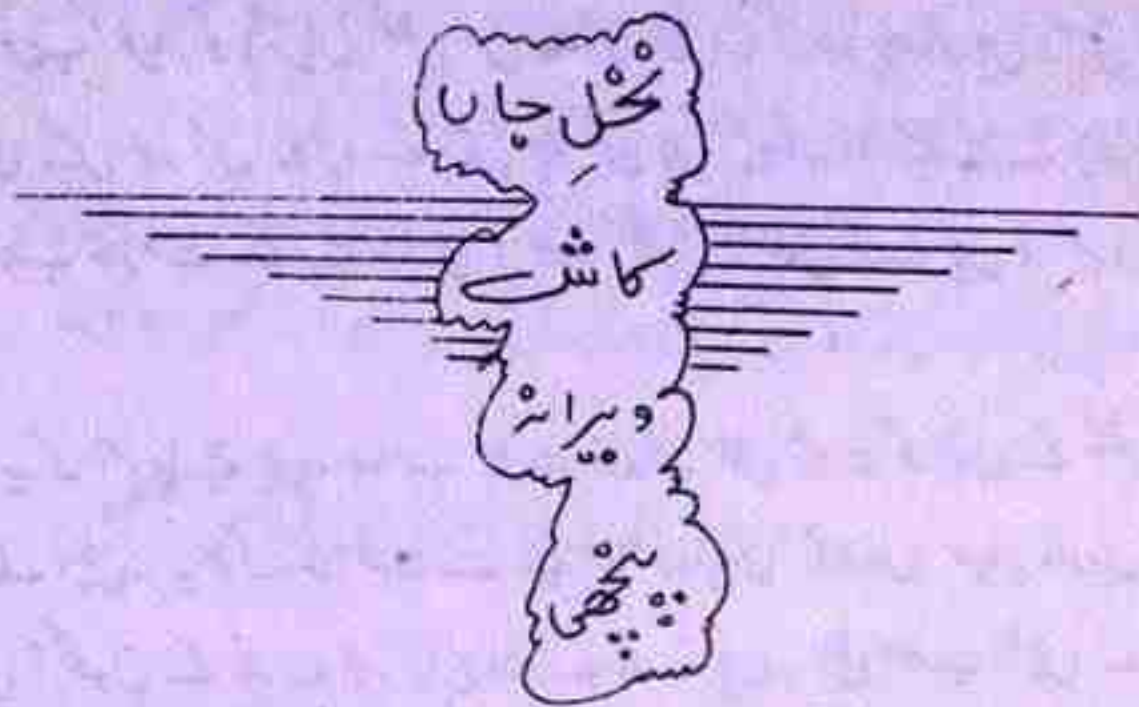
نخلِ جاں
کاش
ویرانہ
پنچھی
کے بعد
اسلم کولسری کے
نئے شعری مجموعے
نیند
اور
جیون
شائع ہو گئے ہیں
القمر انٹر پرائزز غزنی سٹریٹ اردو بازار - لاہور

ایک شاعر کا کلام ___ اسلم کولسری
۹

○

## اسلم کولسری

کسی کی یاد کو دل سے بھلاتے رہتے ہیں
ہم اپنے جسم پہ شعلے بجھاتے رہتے ہیں

اسے پکارتے رہتے ہیں رات بھر یونہی
اور اپنی جیبھ پہ کانٹے اگاتے رہتے ہیں

اس آفتاب کے زرکار دھیان میں کھو کر
بدن کی راکھ سے جگنو بناتے رہتے ہیں

کریدتے ہیں جو خنجر سے اپنی شہ رگ کو
تو کچھ سلوک ہمیں یاد آتے رہتے ہیں

بھٹکتے رہتے ہیں بے چین روح کی صورت
اگرچہ اپنے فرائض نبھاتے رہتے ہیں

ستارے ٹوٹتے رہتے ہیں کس لیے آخر
چلو چراغ تو بجھتے بجھاتے رہتے ہیں

○

○

## اسلم کولسری

سرِ شام ساگر میں سورج کا سونا پگھلنے لگا ہوئے ہوئے
تو پھر پانیوں پر ابھر آیا مٹی کا اک چاند سا ہوئے ہوئے

اب اس گھر میں چاروں طرف جابجا ثبت ہیں میری خاموش چیخیں
مہکتا تھا جس میں کبھی دم بدم اس کا رنگِ نوا ہوئے ہوئے

محبت کی امید اکثر اچانک چمکتی ہے خالی دلوں میں
مگر لازمی ہے کہ بجھتا ہے پھر یہ لرزتا دیا ہوئے ہوئے

وہ شیشہ سا چہرہ تو بستی کی پکی سڑک پر کہیں گر پڑا تھا
کسے کھوجتی ہے گھنے جنگلوں میں بھٹکتی ہوا ہوئے ہوئے

تو یہ بھی کھلا آنسوؤں کے تسلسل میں ہوتی ہے قوت نمو کی
مرے پھیلے ہاتھوں پہ اگنے لگی ہے مٹی کی دعا ہوئے ہوئے

میاں یہ تو پھر اک دھڑکتا ہوا دل ہے — دل آرزوؤں کا مسکن
غمِ یار سے تو منور ہو مارِ سیہ کی گپھا ہوئے ہوئے

زمیں پر نئی زندگی کے چلن سے بظاہر تو لگتا ہے اسلم
سمٹنے کو ہے نیلگوں آسماں کی پرانی ردا ہوئے ہوئے

○

## اسلم کولسری

راستے میں اچانک ملے ہو
اب مرا حال کیا پوچھتے ہو!

بدلا بدلا سا میں لگ رہا ہوں
اور یہ بات تم کہہ رہے ہو!

جب گہن میں کبھی چاند آئے
تم بھی میری طرح سوچتے ہو!

اپنی یادوں کے زینے پہ چڑھ کر
کیا کبھی آسماں سے گرے ہو!

جب کہ جوبن پہ ہو کوئی محفل
ہنستے ہنستے کبھی رو دیے ہو!

کوئی شے ٹوٹ جاتی ہے دل میں!
بات کرتے ہوئے بھولتے ہو!

روشنی جزوِ جاں ہو گئی ہے!
کیا اندھیروں سے ڈرنے لگے ہو!

کتنی مدت ہوئی نیند آئے
تم بھی کیا رات دن جاگتے ہو!

کیا اچانک کسی نے یہ پوچھا
کن خیالوں میں کھوئے ہوئے ہو!

کیا کبھی تیز بارش میں تم بھی
ایک شعلے کی صورت جلے ہو!

چاندنی جب دریچے میں اترے
دفعتاً راکھ میں ڈھل گئے ہو!

کیا اکیلے میں کرتے ہو باتیں
انجمن میں کبھی بُت بنے ہو!

پھر کہا ایک پتھر نے اسلم
راہ میں کیوں اکیلے کھڑے ہو

○

○

اسلم کولسری

ساتھ جب ہم سفر تھا کوئی
راستہ مختصر تھا کوئی!

گفتگو میں اثر نہیں ہے
خامشی میں اثر تھا کوئی!

دل میں بستا تھا اور بظاہر
واقعی بے خبر تھا کوئی!

ہاں اسی آسماں کے نیچے
اک بھلا سا نگر تھا کوئی

آنکھ میں زخم آ گیا ہے
آئینے میں شرر تھا کوئی!

دور جا کر بھی پاس رہنا
مہرباں اس قدر تھا کوئی

چاندنی میں بھی اُجلا پن تھا
اور اُدھر بام پر تھا کوئی
شاعری سے عیاں ہے اسلم
اپنے اندر کھنڈر تھا کوئی

○

اسلم کولسری

مری فضاؤں سے وہ چاند کیا گیا
زمیں پہ آسمان ہی گرا گیا

عذاب ہو کیا تھا سکتۂ سخن
خوشی ہوئی کہ وہ مجھے رلا گیا

دلا! تیری شگفتگی بھی خوب ہے
کہ سیل خوں مرے لبوں تک آ گیا

شعاعیں اس کے اختیار میں نہ تھیں
مگر وہ شخص آئینے بجھا گیا

وہیں وہیں پہ خدوخال رہ گئے
جہاں جہاں سے مڑ کے دیکھتا گیا

دیا گیا ادھر پیام خامشی
ادھر مری منڈیر سے دیا گیا
یہیں کہیں تھا اسلم دریدہ جاں
نہ جانے کون سی طرف چلا گیا

○

## اسلم کولسری

دل ویراں کو ترا لمس نظر یاد آیا
دھوپ کے دشت میں پانی کا شجر یاد آیا

کہیں بجلی سی گری سوکھے ہوئے جنگل میں
شہر کے شور میں جب گاؤں کا گھر یاد آیا

اور جب لوٹ گیا، لوٹنے والا خالی
تب کہیں جا کے ہمیں رخت سفر یاد آیا

مطمئن تھے کہ شب ہجر بھی کٹ جائے گی
یہ تو سوچا ہی نہیں تھا کہ اگر یاد آیا

ایک تنکا سا بگولے میں پھنسا ہو جیسے
اپنی حالت بھی وہی کب ہے، مگر یاد آیا

ناؤ میں پاؤں جو رکھا تو اچانک اسلم
لہلہاتے ہوئے پانی کو بھنور یاد آیا

○

اسلم گورسری

جب ہوں کالا من کا، میلا تن کا
مجھ پر کیسے بھید کھلے ساجن کا

سارے ذرے دھرتی کے بیگانے
تارا تارا بیری نیل گگن کا

سوکھے پتے گرتے ہیں آنکھوں میں
جب بھی مکھڑا دھلتا ہے گلشن کا

اور تو کوئی بات نہیں کرنے کی
رستہ پوچھنا تھا اپنے مدفن کا

ہر سو اتنی آگ برستی کیسے
سورج شاید آنسو ہے برہن کا

تم بھی سنتے ہو سسکی خوشبو کی!
تم پر بھی کھلتا ہے زخم کرن کا!

جس کو بھی دیکھا میٹھی نظروں سے
گھٹا ہی نکلا ہے کڑوے پن کا

اسلم کی تو، خیر، اوقات ہی کیا ہے
ساری دنیا تنکا ہے ایندھن کا

○

اسلم کولسری

اک صورت مہتاب سی
پیار کے پہلے خواب سی

لہجے میں خاموشیاں
بھیگے ہوئے گلاب سی

ہونٹ چمکتے دیپ سے
آنکھیں بھرے چناب سی

تن جیسے بے جان ہو
جان مگر بے تاب سی

بولا اس انداز سے
بننے لگی شراب سی

زلفیں مست بہار کے
گیت نگار سحاب سی

پلک جھپک میں چار سو
بکھری ہیر کتاب سی

سوچا، چھو کے دیکھیے
برسی دھوپ عذاب سی

کھلی حقیقت تھی مگر
نکلی عجب سراب سی

اسلم صاحب رہ گئے
کہنے کو "غزلاب" سی

○

اسلم کولسری

اجزا اجزا منظر تھا
پھر بھی اپنا منظر تھا

اس کی جھیل سی آنکھوں میں
اور کسی کا منظر تھا

خط کے خالی کاغذ پر
کیسا کیسا منظر تھا

بادل ٹیلے لگتے تھے
کتنا صحرا منظر تھا

آخری بار ملے تھے جب
دیکھنے والا منظر تھا

ہر جانب انگارے تھے
بھیگا بھیگا منظر تھا

سوچوں میں، دیواروں پر
بھولا بسرا منظر تھا

رکتا کیسے پل دو پل
اک آوارہ منظر تھا

سورج اترا آنکھوں میں
خواب میں اچھا منظر تھا

وہ بھی تو اب یاد نہیں
ایک حوالہ منظر تھا

ہر اک سوکھے پتے پر
جیسے اپنا منظر تھا

اس شب جیسے چاند میں بھی
جلتا بجھتا منظر تھا

پینا ہی تھا نظروں سے
ایک پیالہ منظر تھا

حاوی سارے لفظوں پر
حاوی سارے لفظوں پر
گونگا بہرا منظر تھا
اسلم نئی غزل میں بھی
وہی پرانا منظر تھا

○

اسلم کولسری

یہ عرصۂ عذاب کہاں شاعری کہاں
بارود کے دھوئیں میں اڑاؤ نہ تتلیاں

بہتا ہے روشنی کی جگہ خوں چراغ سے
آخر یہ کس دیار میں اترا ہے کارواں

اخبار سے نگاہ اٹھائی تو یوں لگا
آنکھیں لہو لہو ہیں تو منظر دھواں دھواں

آخر کہا تھا کس نے کہ دیکھ اپنے آپ کو
ہونے لگا ہے خود پہ اگر غیر کا گماں

سینے میں جس طرح کسی انساں کے درد ہو
محسوس کر رہی ہیں کھنڈر دل میں بستیاں

کہنے کو اب بھی پاؤں دھرے ہیں زمین پر
اور دیکھنے کو اب بھی سروں پر ہے آسماں

اچھا تو گویا اس طرح بستے نگر کے لوگ
بنتے ہیں رفتہ رفتہ لہو رنگ داستاں

حیرت ہے جن پہ بار ہے ذرے کی آبرو
دیوانے ہو رہے ہیں، کھلے ان پہ کہکشاں

پھر دیکھنے لگا ہوں درختوں کی چھال کو
پھر سوچنے لگا ہوں وہی غار کے مکاں

یا پھر عجب نہیں کہ زمیں چاند میں ڈھلے
ڈھونڈے سے بھی ملے نہ کہیں زیست کا نشاں

اسلم غزل کے نام پہ بربادیٔ غزل
شاید کسی نے ذہن میں بھر دی ہیں کرچیاں

○

## اسلم کولسری

پل پل، یونہی، رنگ بدلنا، چلنا سنگ ہوا کے
کس بیری سے تم نے سیکھے یہ انداز وفا کے

من خالی ہے، لیکن گھر کی ساری دیواروں پر
آڑھی ترچھی سطریں ہیں یا الٹے سیدھے خاکے

پھول ہے تو پھر دھیرے دھیرے آنکھوں سے مس کرنا
اور اگر پتھر ہے تو پھر ہاتھ ذرا لہرا کے

کوئی بات نہیں ہے لیکن دل کا حال تو دیکھو
جیسے کوئی لوٹ گیا ہو دروازے تک آ کے

ایک چمک سی پیدا ہوتی ہے سنسان فضا میں
پھر سناٹا چن لیتا ہے ٹکڑے مری صدا کے

اور کسی کی خاطر جگراتوں کا مارا ہو گا
ورنہ کاہے کو چھپ جاتا میری نیند چرا کے

اندر باہر اتنی گہری تاریکی ہے اسلم
اپنے آپ کو ڈھونڈ رہا ہوں، خود کو آگ لگا کے

○

اسلم کولسری

عجیب سی مہک رواں ہے خطِ خوشگوار میں
گلاب کس نے رکھ دیئے نظر کی آبشار میں

تمہارا کوئی خواب ہے کہ میرا اضطراب ہے
کئی طرح کے رنگ ہیں وجود کے غبار میں

اور اب جہاں کہیں رہوں، رہوں بھی یا نہیں رہوں
نظر اسی نواح پر ہے دل اسی دیار میں

گذر گیا وہ یونہی مسکرا کے جس کی اوٹ سے
چمک رہے ہیں آج تک چراغ اس چنار میں

○

اسلم کولسری

جو بن پڑے تو اک ذرا مری نظر سے دیکھیے
چمن چمن لگی ہوئی آگ سی بہار میں

نظر میں اس کے خدوخال بھی نہیں رہے تو پھر
گہر کہاں سے آ گئے ہیں چشمِ اشکبار میں

اگرچہ زخم جانگداز تھے فریب یار کے
مگر عجیب لطف سا تھا خوئے اعتبار میں

چھپی ہوئی ہے برف میں کہیں پہ برق جس طرح
اسی طرح سے اضطراب ہے مرے قرار میں

جو اہل اختیار و عقل درپئے حیات ہیں
کبھی تو کاش جھانکتے وہ چشمِ شیر خوار میں

پھر آج رات چاندنی کو زخم زخم دیکھ کر
مری تو انگلیاں الجھ کے رہ گئیں ستار میں

جہاں سے بوند کو خنک طراوتیں عطا ہوئیں
وہیں سے آئی ہے تپیدہ روشنی شرار میں

اگر ملا تو اسلم اس سے یہ ضرور پوچھنا
کہ میری عمر کٹ گئی ہے کس کے انتظار میں

○

اسلم کولسری

اب اس کو بھول جائیے' دل کا خیال ہے
ممکن تو یہ نہیں ' مگر اچھا خیال ہے

ہم نے کہا کہ خیر' مقدر میں ہجر تھا
فرما دیا کہ یہ بھی پرانا خیال ہے

پھر خواب چیخنے لگے، دشت خیال میں
پھر کاروبار دہر میں الجھا خیال ہے

آخر اسے ہمارا خیال آ ہی جائے گا
ویسے تو یہ بھی صرف ہمارا خیال ہے

آتا ہے یہ خیال بھی اکثر کہ دہر میں
جو پایا واہمہ ہے جو کھویا خیال ہے

کڑوی حقیقتوں کی کڑی دھوپ ہو تو پھر
بھیگے ہوئے درخت کا سایہ خیال ہے

اپنی تو زندگی ہی خیالوں میں کٹ گئی
سیدھا خیال ہے کبھی الٹا خیال ہے

سلجھا ہوا دماغ بھی مسکن خیال کا
قلب دریدہ کا بھی سارا خیال ہے

اب کھو نہ جائیں اس کے سہانے خیال میں
اسلم غزل یہ چھوڑ نہ دیں، کیا خیال ہے

○

اسلم کولسری

یونہی کبھی کبھی ملنے کا کرو مسافر، وعدہ
لیکن تم کچھ جلدی میں ہو، اچھا تو پھر وعدہ!

صدیاں گذریں لیکن آج بھی من کے ویرانے میں
اس کے مرقد پر بیٹھا ہے ایک مجاور وعدہ

میری سانسوں تک وعدے پہ وعدہ کرتے رہنا
اس کے بعد اگر اصرار کیا تو کافر..... وعدہ

ایسا کیا لازم ہے اتنی گہری سوچ میں کھونا
لوگ انجانے میں بھی کر لیتے ہیں آخر وعدہ

پھول سے نازک ہونٹوں کی اک ہلکی سی جنبش سے
سارے صدمے ساکت کر دیتا ہے ساحر وعدہ

منہ تکتے رہ جاتے ہیں خوابوں کے سارے مہرے
ایسی چال بھی چل جاتا ہے اکثر شاطر وعدہ

اشک، تبسم، شعر، خموشی، رنج، خوشی، حل، حیرت
کیسے کیسے رنگوں میں ہوتا ہے ظاہر وعدہ

اسلم جی اب تم اپنے دل کی سنجیدگی دیکھو
پہلے اس نے چاہا تھا، وعدے کی خاطر وعدہ

○

اسلم کولسری

تذکرہ تھا خود آگہی کا
اڑ گیا رنگ ہر کسی کا

طور قبل از مسیح جیسے
شور اکیسویں صدی کا

خنجروں سے اٹا ہوا ہے
راستہ اب بھی راستی کا

جیسے سورج بھی لکھ رہا ہو
نوحہ، کرنوں سے زندگی کا

ماند پڑنے لگے ستارے
چاند بھی لگ رہا ہے پھیکا

آدمی تنگ آدمی سے
آدمی سنگ آدمی کا

روح میں بھر گئے شرارے
خواب دیکھا تھا روشنی کا

راکھ اڑنے لگی ہے اسلم
دیکھ انجام سرخوشی کا

○

## اسلم کولسری

چاند سے اس کی باتیں کرنا، چلنا دھیرے دھیرے
یونہی شام کا پچھلی رات میں ڈھلنا دھیرے دھیرے

جنگل میں لہرانا، بانسریا کے مست سُروں کا
اور سوکھے پتوں کا رنگ بدلنا دھیرے دھیرے

گاؤں میں جس دم بہنے لگیں نیندوں بھری ہوائیں
دور کھنڈر میں ایک دیے کا جلنا دھیرے دھیرے

رات کو جب صحرا میں بونا آنکھیں بھیگی بھیگی
ٹھنڈی ریت کا دیپ اور سیپ اگلنا دھیرے دھیرے

اپنے ہی سائے میں اس کا عکس فروزاں پا کر
بے تابانہ گرنا، اور سنبھلنا دھیرے دھیرے

ندی کنارے جا سلگانا، کوئی گیت پرانا
نئے چاند کا آدھی رات نکلنا دھیرے دھیرے

یاد ہے اسلم اس کا چہرہ سوچ میں روشن کر کے
بند آنکھوں پر پھول کی پتی ملنا دھیرے دھیرے

○

اسلم کولسری

خاموشی کہرام ہوئی ہے
شاید پھر سے آنکھ لگی ہے

کوئلیا کی خیر خدایا
ویرانے میں کوک گری ہے

ایک سے ہیں جانے انجانے
جانے یہ کیسی بستی ہے

زرد ہوئی ہے تن کی رنگت
کہتے ہیں سرسوں پھولی ہے

دلدل سے گذرا ہے جگنو
اپنی تو یوں عمر کٹی ہے

تنہائی اور خاموشی سے
بارے تھوڑی سی بنتی ہے

میرے پیچھے پیڑ کے نیچے
دھوپ بھی چھپ کر آ بیٹھی ہے

سائے کو اک ساتھی سمجھا
نا سمجھی سی نا سمجھی ہے

کاش مجھے معلوم تو ہوتا
آخر یہ وحشت کیسی ہے

شاخوں پر کیوں شعلے آئے
آگ تو سینے میں بھڑکی ہے

رات کے پچھلے پہر کھنڈر میں
آندھی کس کو ڈھونڈ رہی ہے

کون مرے پہلو سے گزرا
پہلو سے کچھ راکھ اڑی ہے

کس کی یاد آئی ہے اسلم
دل میں بجلی سی چمکی ہے

○

## اسلم کولسری

کیا ہے اپنی شعر گری اور کیا ہے اپنا فن
شیشے کے بازار میں کچی مٹی کا برتن

ایک ذرا سی ٹھوکر سے مٹی بھر خاک ہوئے
ایک ذرا سا میٹھا لہجہ کر جائے گلشن

کھیتوں کے اس پار تھی شرمیلی سی ایک سڑک
جس پر خوشبو چھڑکائے تھا شوخ شریر چمن

اور چمن سے تھوڑی دور اک چھاؤں بھرا جنگل
اس جنگل کی آگ تھی گویا راگ بھری جوگن

ناگن کی زہریلی خوشبو پی کر اک جوگی
رنگ برنگے انگاروں سے بھرتا تھا دامن

خیر یہ ایک پرانا قصہ ہے اس کو چھوڑو
وقت گئی کو ذہن میں لاؤ گاؤں کا اجلا پن

جس کی نیلی سڑکوں پر چاند مہکتے تھے
جس کی گہرائی گلیوں میں پھرتے تھے ساون

گاؤں کی بغل ہی میں اپنا چھوٹا سا گھر تھا
کچے کوٹھے، گھاس کا چھپر اور کھلا آنگن

جوگن کے جلتے ہونٹوں سے لگی ہوئی بیناں
بیناں کی آواز کے پیچھے بل کھاتی ناگن

آنگن میں ٹھنڈی بیری تھی اور جلتا کیکر
جن کے کانٹے چھلنی کر دیتے تھے ہر الجھن

الجھن سے یاد آیا صبح کو دفتر جانا ہے
مجبوری کی بھینٹ چڑھانا ہے اپنا تن من

رفتہ رفتہ راکھ ہوئی تخیل کی خواب گری
دھیرے دھیرے دھول ہوا دل کا دیوانہ پن

سر، سوچوں کی ہنڈیا گہری چپ سے ڈھکی ہوئی
سینے کے چولھے میں سلگے یادوں کا ایندھن

خیر اب جیسا بھی ٹوٹا پھوٹا ہے اسلم جی
یونہی جلتے بجھتے یار بتانا ہے جیون

○

# مظفر وارثی کی تصانیف

| | | | |
|---|---|---|---|
| برف کی ناؤ | (غزل) | ستاروں کی آبجو | (قطعات) |
| بابِ حرم | (نعت) | کھلے دریچے بند ہوا | (غزل) |
| لہجہ | (غزل) | کعبۂ عشق | (نعت) |
| حصار | (نظم) | ظلم نہ سہنا | (عوامی نظمیں) |
| الحمد | (حمد و ثنا) | دل سے درِ نبیؐ تک | (نعت) |
| نورِ ازل | (نعت) | راکھ کے ڈھیر میں پھول | (غزل) |
| لہو کی ہریالی | (گیت) | زمیں کے چاند | (بچوں کے گیت) |

(زیرِ اشاعت)

قلم قتلے (اخباری قطعات)

میرے اچھے رسولؐ (نعت)

ارژنگ (کلیات)

لحہ لحہ زندگی (سوانحِ حیات)

اور

قرآنی قطعات

کسی بھی اچھے بک اسٹال سے طلب کریں۔

خاتمہ گیس ٹربل
یونانی ادویات
رحمانیہ دواخانہ
بازار کلاں۔ راولپنڈی
کشمیر مصالحہ جات
جامعہ مسجد روڈ
راولپنڈی

مقالے

مغربی میڈیا، انسانی حقوق، اسلامی بنیاد پرستی اور ہم — ڈاکٹر صفدر محمود

گم گشتہ علمی خزانے کا نوحہ — ازہر منیر

# تغیر و حرکت سے ارتقاء تک

...ں پانی پتی

روایت کے بارے میں ایک غلط فہمی بہت عام ہے اور وہ یہ کہ روایت حرکت کی نفی کرتی ہے۔ اس لیے بالعموم اسے جمود اور بے حرکتی کے مترادف سمجھا جاتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ایک خیال یہ بھی ہے کہ روایت' تغیر اور تبدیلی کے خلاف اور ترقی و ارتقاء کی دشمن ہے۔ روایت کے بارے میں اس قسم کے خیالات کا ایک نمونہ پچھلے دنوں ہمیں اپنے عزیز دوست اور مشہور ترقی پسند نقاد جناب احمد ہمدانی کے ایک اخباری انٹرویو میں نظر آیا۔ اس انٹرویو میں انہوں نے ترقی پسند تحریک کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے جہاں ایک طرف اس تحریک کو کائنات میں جاری و ساری عمل ارتقاء سے متعلق بتایا اور اس طرح اس کی زندگی کا دامن عمل' ارتقا کے دامن دراز سے باندھ کر اس کی زندگی کے ساتھ ساتھ اس کی درازی عمر کا یقین بھی دلانے کی کوشش کی وہاں دوسری طرف روایتی فکر اور سائنسی عہد کی جدید فکر کو ایک دوسرے کی ضد قرار دیتے ہوئے تغیر و حرکت اور ترقی و ارتقاء کے بارے میں ان دونوں کے تضاد کو بھی نمایاں پیش کیا۔ خیر جہاں تک روایت اور جدیدیت کے فکری رویوں کا تعلق ہے۔ ہمیں ہمدانی صاحب سے پورا پورا اتفاق ہے کہ یہ دونوں ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ مگر انہوں نے ان دونوں کے تضاد کو جس طور پر ابھار کے پیش کیا ہے۔ اس میں مثبت کی جگہ منفی اور منفی کی جگہ مثبت نے لے لی ہے۔ اس لیے ہم چاہتے ہیں کہ اس مضمون کے ذریعہ مثبت کی جگہ مثبت اور منفی کی جگہ منفی کو رکھ کر روایت اور جدیدیت کے موقف کو ان کے صحیح تناظر میں پیش کرنے کی کوشش کریں۔ لیکن اس سے پہلے ضروری ہے کہ روایتی فکر اور جدید فکر کے موقف کو جس طور پر ہمدانی صاحب نے بیان کیا ہے اسے آپ کے سامنے پیش کر دیا جائے۔

سو پہلی بات تو انہوں نے یہ کہی ہے کہ یہ کائنات مسلسل حرکت میں ہے اور حرکت کا لازمی نتیجہ تغیر یا تبدیلی ہے۔ لہٰذا جدید سائنسی عہد میں حرکت کو حقیقت اور کائنات کا اصل اصول سمجھا جاتا ہے۔ جبکہ روایتی فکر حرکت کی بجائے سکون کو کائنات کا اصل

اصول قرار دیتی ہے اور حرکت کو التباس سمجھتی ہے۔ اور دوسری بات انہوں نے یہ کہی کہ کائنات میں لحہ بہ لحہ ہونے والی حرکت اور اس کے نتیجہ میں واقع ہونے والی تبدیلیوں کو آج کے سائنسی عہد میں ارتقا یا ترقی کی طرف سفر خیال کیا جاتا ہے جبکہ روایتی فکر کے نزدیک زمانے میں ہونے والی تبدیلیاں معاشرے کو زوال کی طرف لے جاتی ہیں۔ اچھا یہ تو ہوا حرکت و تغیر اور ترقی و ارتقا کے بارے میں روایتی فکر اور جدید فکر کا تضاد۔ لیکن اس تضاد کو پیش کرنے کے ساتھ ساتھ ہمدانی صاحب نے ایک اور بات یہ بھی بتانی ضروری سمجھی کہ تغیر و حرکت اور ترقی و ارتقا کے بارے میں روایتی تصورات جدید سائنسی عہد میں اپنی مقبولیت اور کشش کھو چکے ہیں۔ جبکہ انسانی تجربہ جدید فکر کو حقیقت سے زیادہ قریب بتاتا ہے۔ اس لیے کہ سائنس اور ٹیکنالوجی کی پیش رفت نے بیل گاڑی کے مقابلہ میں جہاز کے سفر کو کہیں زیادہ بہتر اور آرام دہ بنادیا ہے۔ اس طرح رسل و رسائل کے جدید ذرائع کی وجہ سے بھی جو سہولتیں ہمیں آج میسر ہیں ان کا تصور بھی پہلے زمانے میں ممکن نہ تھا۔ اس سے ظاہر ہے کہ زمانہ واقعی ترقی کی طرف سفر کر رہا ہے۔

خیر جہاں تک ہمدانی صاحب کا تعلق ہے۔ ہمیں معلوم ہے کہ وہ جس مکتبہ فکر سے تعلق رکھتے ہیں اس کے نزدیک حقیقت مادہ ہے اور مادہ کوئی ساکت و جامد شے نہیں بلکہ حرکت میں ہے۔ نہ صرف حرکت میں ہے بلکہ ہر لحظہ تبدیل ہو رہا ہے اور اس تبدیلی کے نتیجہ میں ارتقا بھی کر رہا ہے۔ لہٰذا ان کا حرکت کو حقیقت سمجھنا یا کائنات کا اصل اصول قرار دینا اور حرکت کے نتیجہ میں ہونے والی تبدیلیوں کو ترقی اور ارتقاء کی طرف سفر بتانا ان کے مسلک کے عین مطابق ہے۔ لیکن روایت کے بارے میں جس قسم کے خیالات کا اظہار انہوں نے کیا ہے وہ کچھ انہی کی ذات یا صرف انہی کے مکتبہ فکر سے مخصوص نہیں بلکہ ان خیالات کی گونج تو ہمیں ان کے اپنے مکتب فکر سے باہر بھی عہد جدید میں ہر کہیں سنائی دیتی ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ہمدانی صاحب نے روایتی فکر کو اپنے مخصوص مکتبہ فکر کی بجائے سائنسی عہد کی جدید فکر کے تقابل میں رکھ کر دیکھنے اور دکھانے کو ترجیح دی ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب بہرحال نہیں ہے کہ روایتی فکر کے حوالے سے جدید فکر اور ترقی پسند فکر کے رویوں میں کوئی فرق یا اختلاف پایا جاتا ہے۔ جی نہیں۔ اس کے برعکس واقعہ یہ ہے کہ اس

حوالے سے دیکھنے پر تو یہ حقیقت اور بھی زیادہ کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ اپنے اپنے طور پر خواہ ان دونوں کے باہمی اختلافات جو بھی ہوں مگر روایتی فکر کے مقابلہ میں دونوں مل کر ایک ہوجاتے ہیں۔ کیوں؟ اس لیے کہ اپنے بنیادی موقف کے اعتبار سے اصل میں دونوں ایک ہیں۔ رہا ان کا باہمی اختلاف تو وہ محض فروعی اختلاف ہے جس کی حقیقت باپ بیٹے کے اختلاف سے زیادہ نہیں۔ بہر حال یہ بات تو یونہی ضمناً درمیان میں آگئی۔ ورنہ ہمیں تو دراصل کہنا یہ تھا کہ ہمدانی صاحب نے چونکہ روایتی فکر کو اپنے مخصوص مکتبہ فکر کی بجائے جدید فکر کے تقابل میں رکھ کر دیکھنے کو ترجیح دی ہے اس لیے ہم بھی ان کے خیالات کو اس تناظر میں دیکھنے کی کوشش کریں گے۔ بالفاظ دیگر ہم ان کے خیالات کو ایک فرد واحد کے خیالات کی حیثیت سے نہیں بلکہ فکر جدید کے ایک نمائندے کی حیثیت سے دیکھیں گے۔ اس لیے کہ ہمارے نزدیک یہ خیالات صرف و محض ہمدانی صاحب ہی کے خیالات نہیں بلکہ عہد جدید کی عام ذہنیت کے ترجمان ہیں۔ اسی لیے ان کی باز گشت ہمیں عہد جدید میں ہر جگہ اور ہر طرف سنائی دیتی ہے۔ البتہ ایک فرد واحد کی حیثیت سے تو ہم اپنے دوست کا شکریہ ہی ادا کریں گے کہ انہوں نے ہمیں ان خیالات کی قدر و قیمت کو پرکھنے اور ان کے حوالے سے عہد جدید کی ذہنیت کا جائزہ لینے کا موقع فراہم کیا۔

اچھا۔ اب آئیے ہمدانی صاحب کے بیان پر۔ ان کا کہنا ہے کہ کائنات مسلسل حرکت میں ہے اور اس حرکت کے نتیجہ میں تبدیلی بھی واقع ہو رہی ہے۔ لیکن روایتی فکر اس حرکت اور تبدیلی کو التباس قرار دیتی ہے۔ اور حرکت کی جگہ سکون کو کائنات کا اصل اصول سمجھتی ہے۔ لیکن ہماری گزارش اس ضمن میں یہ ہے کہ ان کا یہ بیان روایت کے فکری موقف کی درست ترجمانی نہیں کرتا۔ اس لیے کہ التباس کا مطلب ہے دو چیزوں کے درمیان ظاہری یکسانیت کے سبب ایک پر دوسری چیز کا گمان ہونا۔ جیسے سراب پر پانی کا یا رسی پر سانپ کا۔ لیکن ہمدانی صاحب کے بیان سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ زیر بحث مسئلہ میں وہ دو چیزیں کونسی ہیں جن کے درمیان ظاہری یکسانیت یا مشابہت کے سبب ایک پر دوسری کا گمان کیا جارہا ہے۔ اگر مراد یہ ہے کہ روایتی فکر کے نزدیک حرکت حقیقی چیز نہیں بلکہ سکون حقیقی چیز ہے تو اسے التباس کہنا درست نہیں۔ اس لیے کہ حرکت اور سکون۔ ان دونوں کے درمیان

کسی قسم کی ظاہری مشابہت نہیں کہ ایک پر دوسری چیز کا گمان ہو سکے۔ اور یہی حال تبدیلی کا ہے۔ یہاں بھی دو ایسی چیزیں موجود نہیں جن کے درمیان ظاہری مشابہت کے سبب ایک پر دوسری کا گمان کیا جاسکے۔ لہٰذا یہ بات تو سرے سے ہی غلط قرار پائی کہ روایتی فکر حرکت اور تبدیلی کو التباس قرار دیتی ہے۔ اب رہی دوسری بات۔ یعنی یہ کہ روایتی فکر کے نزدیک حرکت حقیقی چیز نہیں بلکہ سکون حقیقی چیز ہے۔ یا یوں کہیے کہ حرکت غیر حقیقی اور سکون حقیقی شے ہے۔ تو اس کا صاف اور سیدھا مطلب یہ ہوا کہ روایت حرکت کی نفی کرتی ہے۔ سو اس سلسلہ میں بھی ہم اس کے سوا کیا عرض کریں کہ یہ دوسری بات بھی اتنی ہی نادرست ہے جتنی کہ پہلی تھی۔ اس لیے کہ روایتی فکر نہ تو حرکت کی نفی کرتی ہے اور نہ ہی اسے غیر حقیقی قرار دیتی ہے۔ دراصل ایسی تمام باتیں عہد جدید میں عام غلط فہمی کے سبب روایتی فکر سے منسوب کی جاتی ہیں ورنہ حقیقت یہ ہے کہ ایسی باتوں کا روایتی نقطہ نظر سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔

اچھا تو پھر سوال یہ ہے کہ حرکت و سکون اور تغیر و ثبات کے بارے میں روایت سے ملتبہ فکر کا صحیح موقف کیا ہے اور اس کے ساتھ بلکہ اس سے بھی پہلے ایک اور بنیادی سوال یہ ہے کہ حرکت و تغیر اور سکون و ثبات۔ ان دونوں چیزوں میں کون سی چیز بنیادی ہے اور کس کو کس پر فوقیت حاصل ہے۔ اس سوال کے جزو ثانی کا ایک بہت صاف اور سیدھا جواب ہمیں سلیم احمد کے ہاں ملتا ہے۔ جنہوں نے علامہ اقبال کے حوالے سے اس مسئلہ پر بات کرتے ہوئے بتایا ہے کہ مابعد الطبیعیات کے نقطہ نظر سے سکون و ثبات کا مقام تغیر و حرکت سے بلند ہے۔ کیوں؟ اس لیے کہ حرکت اور تغیر مادے کی صفت ہے اور مادے کا تعلق طبیعیات سے ہے۔ مابعد الطبیعیات سے نہیں جبکہ مابعد الطبیعیات اس عالم سے تعلق رکھتی ہے جو ماورائے مادہ ہے اور سکون و ثبات کا تعلق بھی چونکہ اسی عالم مابعد الطبیعیات سے ہے اس لیے ان کا درجہ حرکت و تغیر سے بلند ہے۔ اب اس سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ وہ تمام جدید فلسفے جو حرکت و تغیر ہی کو زندگی کی حقیقت اور کائنات کا اصل اصول مانتے ہیں اور کسی ایسی حقیقت تک نہیں پہنچتے جو حرکت و تغیر سے ماوراء ہو وہ سب کے سب دراصل مادہ پرست فلسفے ہیں جو اپنی بنیادی سرشت کے اعتبار سے عالم مادی سے اوپر نہ اٹھ

سکنے کے سبب مابعد الطبیعیات اور عالم مابعد الطبیعیات سے تعلق رکھنے والی ہر حقیقت کا انکار کرتے ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ سکون و ثبات کی حقیقت بھی ان فلسفوں کے نزدیک فریب نظر سے زیادہ نہیں۔ چنانچہ علامہ اقبال جب یہ کہتے ہیں کہ

فریب نظر ہے سکون و ثبات
تڑپتا ہے ہر ذرہ کائنات

تو وہ بھی مابعد الطبیعیات کے نقطہ نظر سے دور اور طبیعیات کے نقطہ نظر سے قریب ہو کر مادہ پرستوں سے آملتے ہیں۔

لیکن حرکت و تغیر کے بارے میں ایک بہت اہم اور ضروری سوال تو رہ ہی گیا۔ اور وہ سوال یہ ہے کہ جو حرکت ہمیں کائنات میں ہر چہار سمت نظر آتی ہے اس کی علت یا اس کا منبع اور سرچشمہ کہاں واقع ہے۔ اگر جواب یہ ہو کہ حرکت کی علت بھی اسی عالم مادی میں کہیں واقع ہے تو پھر یقیناً اصل حقیقت وہ علت ہی قرار پائے گی نہ کہ اس کا معلول یعنی حرکت۔ اور یہی بات تغیر پر بھی صادق آتی ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ حرکت اور تغیر کے ماننے والے ایسے کسی بھی جواب کے قائل نہیں۔ لہٰذا اس کے بعد دوسرا متبادل جواب یہی ہو سکتا ہے کہ اس کائنات کی تمام تر حرکت اور تبدیلی کا سرچشمہ اس کائنات سے ماوراء کسی بلند تر سطح وجود میں پایا جائے۔ یہ بات یوں بھی ماننے کے قابل ہے کہ اصولاً ہر شے کی وجہ جواز اس شے سے ماوراء کسی بلند تر سطح وجود ہی سے وابستہ ہوتی ہے نہ کہ خود اس کی اپنی سطح وجود سے۔ سو ظاہر ہے کہ یہ جواب ہمیں مادیات اور طبیعیات کے عالم سے اوپر اٹھا کر مابعد الطبیعیات کے عالم میں لے جاتا ہے۔ یعنی وہی عالم جسے حرکت و تغیر کو زندگی کی حقیقت اور کائنات کا اصل اصول ماننے والے تمام فلسفے رد کرتے ہیں اور اس تردید و انکار کے ساتھ ہی عالم مادیات میں محصور و محدود ہو کر رہ جاتے ہیں۔ اس کے برعکس روایت کا تعلق چونکہ بنیادی طور پر مابعد الطبیعیات سے ہے۔ اس لیے ہمیں اپنے سوال کا جواب بھی روایت ہی کے نقطہ نظر سے ملتا ہے جو ارسطو کی طرح حرکت کے لیے ایک غیر متحرک اصول حرکت کو لازم قرار دے کر حرکت و تغیر کو سکون و ثبات کے تابع رکھنے پر زور دیتا ہے۔ اس کے برعکس جدید سائنسی عہد مطلق اور بے قید حرکت کا قائل ہے اور روایت کی سکون پرستی کو جمود اور

بے حرکتی کے مترادف سمجھتا ہے۔ یعنی اس کا خیال ہے کہ روایت کے ماننے والے اس کائنات میں حرکت کی موجودگی سے انکار کرتے ہیں۔ لیکن جیسا کہ ہماری بات سے ظاہر ہے یہ ایک بالکل بے بنیاد بات ہے۔ اس لیے کہ روایت پرستوں کی کائنات اگر سکونی کائنات ہے تو اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ وہ اس کائنات میں حرکت کی موجودگی سے انکار کرتے ہیں۔ بلکہ مطلب صرف یہ ہے کہ جس طرح ارسطو نے حرکت کے لیے ایک غیر متحرک اصول حرکت کو لازم قرار دیا تھا۔ اسی طرح روایت کا مکتبہ فکر بھی اس کائنات سے ماوراء ایک ایسی حقیقت عظمیٰ کو مانتا ہے جو خود بے حرکت رہتے ہوئے اس کائنات کی ہر حرکت کا منبع اور ہر تبدیلی کا سرچشمہ ہے۔ روایتی اسلام میں یہ حقیقت عظمیٰ باری تعالیٰ کی اس ذات پاک سے عبارت ہے جس کے ہاتھ میں زمانے کی باگ ڈور ہے اور جو زمانے کی گردش اور کائنات کی حرکت کا واحد اور آخری سبب ہے۔ اب اس سے یہ بات بھی واضح ہوجاتی ہے کہ روایت پرستوں کی کائنات کو سکونی کائنات دراصل ان کے تصور حقیقت کی نسبت سے کہا جاتا ہے۔ اس لیے نہیں کہ وہ کائنات میں حرکت کی موجودگی سے انکار کرتے ہیں۔ بالکل اسی طرح جس طرح کہ مادہ پرست اپنی کائنات کو حرکی کائنات اس لیے کہتے ہیں کہ ان کے نزدیک اصل حقیقت مادہ ہے اور مادہ کوئی سکونی نہیں بلکہ حرکی شے ہے' لہٰذا اسی نسبت سے ان کی کائنات بھی حرکی کائنات کہلاتی ہے۔

لیکن اگر اس بات پر اصرار کیا جائے کہ تغیر و حرکت کسی ایسے اصول کے تابع نہیں ہو سکتے جو ان کی اپنی سطح وجود سے ماوراء کسی بلند تر درجہ کا حامل ہو تو پھر ان کا سراسر بے جواز اور بے معنی ہو کر رہ جانا یقینی امر ہے۔ اور ایسی بے اصولی اور بے جواز حرکت کا نتیجہ بھی انتشار اور پراگندگی کے سوا کچھ اور برآمد نہیں ہو سکتا۔ مغرب میں قرون وسطیٰ کی تہذیب سے جو انحراف نشاۃ ثانیہ کے دور میں کیا گیا وہ بھی دراصل ایک بااصول باجواز حرکت سے بے اصول اور بے جواز حرکت کی طرف اقدام کے مترادف تھا۔ بالفاظ دیگر مغرب نے روایت کے مرکزی نظام اور اس کے بنیادی دھارے سے کٹ کر اپنی جدید تہذیب کی بنیاد جس بے اصول اور بے جواز نظریہ حرکت پر رکھی اس کا لازمی نتیجہ وہ بحران ہیں جن سے یہ تہذیب انفرادی اور اجتماعی سطح پر آئے دن دوچار رہتی ہے۔ انفرادی بحران اپنی شخصیت کے

مرکز سے گریز کے نتیجہ میں اور اجتماعی بحران روایت کے مرکزی اصول سے انحراف کے نتیجہ میں پیدا ہوتے ہیں۔ اور یہ اس تہذیب کے بحرانی مزاج ہی کا کرشمہ ہے کہ مغرب میں کسی خیال کسی نظریے یا کسی رجحان کو زیادہ دیر تک ٹکنے کا موقع نہیں ملتا۔ مختلف نظریے اور مختلف رجحانات جس زور شور اور تیزی سے آتے ہیں اسی زور و شور اور تیزی سے گزر بھی جاتے ہیں۔ مغرب کا تلون پسند مزاج ہر نئے رجحان سے چند دن جی بہلاتا ہے اور اس کے بعد کسی اکتائے ہوئے بچہ کی طرح اسے ایک بیکار کھلونا سمجھ کر توڑ دیتا ہے۔ کیوں؟ اس لیے کہ اس کی کوئی **مستقل** بنیاد نہیں۔ یہ ایک ایسا قلعہ ہے جو ہوا میں بنا ہوا ہے اور جس کے در و دیوار ہوا کے ہر جھونکے کے ساتھ بدل جاتے ہیں۔ دراصل بنیادی تو وہ چیز ہے جو تبدیل نہیں ہوتی۔ لیکن مغرب کی جدید تہذیب کسی ایسی چیز کو تسلیم نہیں کرتی۔ وہ تغیر بلکہ غیرمختتم تغیر کی قائل ہے۔ اس کے نزدیک زندگی صرف حرکت کا نام ہے۔ لیکن حرکت کا اصول یہ ہے کہ وہ اپنے نقطہ آغاز سے جس قدر آگے بڑھتی ہے اسی قدر اس کی رفتار میں اضافہ بھی ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مغرب میں پہلے جو چیزیں تبدیل ہونے میں سو پچاس سال لیتی تھیں۔ وہ اس کے بعد بیس پچیس سال میں بدلنے لگیں۔ اور اب تو عالم یہ ہے کہ چھ چھ مہینے میں زندگی کا پورا نقشہ ہی بدل جاتا ہے۔ مگر مغرب کو اس بات کی کوئی پرواہ نہیں کہ اس کی یہ تغیر پسندی بالآخر اسے کہاں لے جا کر چھوڑے گی۔ مطلق اور بے قید تغیر و حرکت اسے اپنے ایمان کی طرح عزیز ہے۔ خواہ اس کا نتیجہ بے سود ہلچل اور بے معنی شورش کے سوا اور کچھ نہ ہو۔ لیکن لطف کی بات یہ ہے کہ جدید ذہنیت اس صورت حال سے اس حد تک مانوس ہو چکی ہے کہ اب اسے اس کی لامعنیت کا ذرہ برابر بھی احساس نہیں ہوتا۔ اور یہی وجہ ہے کہ اب وہ سکون و ثبات کو صرف اپنے ہی لیے نہیں بلکہ دوسروں کے لیے بھی ناپسندیدہ قرار دیتی ہے۔ اس کی مثال ایک ایسے شخص کی ہے جو زندگی میں خود تو توازن سے محروم ہو کر اسے دوبارہ حاصل کرنے کے ناقابل ہو چکا ہو لیکن اپنی نااہلیت کو تسلیم کرنے کی بجائے خود توازن ہی کے حصول کو ناممکن اور ناپسندیدہ قرار دے دے۔ نہ صرف اپنے لیے بلکہ دوسروں کے لیے بھی۔

اس کے برعکس اسلام کی روایتی تہذیب کی بنیاد جس اصل اصول پر ہے

وہ الان کما کان یعنی ایک ایسی غیر متغیر اور قائم و دائم حقیقت ہے جس کا ظہور زمان و مکان میں ہر آن ایک نئی شان کے ساتھ ہوتا ہے۔ کائنات میں تغیر اور تبدیلی کی جو بھی خصوصیات نظر آتی ہیں وہ سب اس کی اس شان ظہور سے عبارت ہیں۔ اور یہی بات دوسری روایتی تہذیبوں پر بھی صادق آتی ہے۔ یہ اس بات کو دوسرے لفظوں میں یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ روایتی تہذیبوں کا تصور حقیقت ایک حرکت آفریں سکون یا ایک تغیر ثبات سے عبارت ہے۔ اور چونکہ اس حقیقت کی بنیادی خصوصیت ثبات ودوام ہے اس لیے تمام روایتی تہذیبیں اپنے اصل اصول سے وابستہ رہنے کے لیے ثبات و دوام پر زور دیتی ہیں اور تغیر و حرکت کو ثبات دوام کے تابع رکھتی ہیں۔ اس کا مطلب بھی یہی ہے کہ وہ کائنات میں حرکت کا انکار نہیں کرتیں بلکہ اسے ایک غیر متحرک اصول حرکت کے تابع رکھ کر زندگی میں توازن اور اعتدال پیدا کرنے پر زور دیتی ہیں۔ وہ اس حقیقت کو اچھی طرح جانتی ہیں کہ زندگی میں دو اصول کام کرتے ہیں۔ ایک حرکت کا دوسرا سکون کا۔ ایک تغیر کا دوسرا ثبات کا۔ اور ان دونوں کے توازن پر ہی انسانی زندگی کا انحصار ہے۔ اور ساتھ ہی یہ بھی جانتی ہیں کہ یہ توازن مطلق اور بے قید حرکت سے نہیں بلکہ سکون کو حرکت کے اور تغیر کو ثبات کے تحت رکھنے ہی سے پیدا ہوتا ہے۔ چنانچہ اس توازن کا نتیجہ وہ ثبات و استحکام ہے جو روایتی تہذیبوں کی عام خصوصیت ہے۔ لیکن عہد جدید میں روایتی تہذیبوں کے ثبات و استحکام ہے جو روایتی تہذیبوں کی عام خصوصیت ہے۔ لیکن عہد جدید میں روایتی تہذیبوں کے ثبات و استحکام کو بالعموم ان کی کمزوری یا خامی سمجھا جاتا ہے۔ کیوں؟ اس لیے کہ جدید تہذیب کے نزدیک یہ چیزیں ترقی کے منافی ہیں۔ اپنے گینوں کا کہنا ہے کہ ان چیزوں کو ترقی کے منافی سمجھنا تو خیر ایک بات ہے۔ مگر ثبات و استحکام کو روایتی تہذیبوں کی کمزوری یا خامی تصور کرنا صرف انہی لوگوں کے لیے ممکن ہے جو ترقی کے جدید تصور پر ایمان رکھتے ہوں ترقی کے اس تصور کی حقیقت ہمارے نزدیک کیا ہے اس پر تو خیر ہم آگے چل کر بات کریں گے۔ یہاں تو ہمیں روایتی تہذیبوں کی مبینہ کمزوری کے بارے میں صرف یہ وضاحت پیش کرنی ہے کہ ان کا ثبات و استحکام ان کی کسی کمزوری یا خامی کی علامت نہیں بلکہ ان کے ایمان کی اس قوت اور پختگی کا مظہر ہے جو ان کے اندر اپنے غیر متغیر اصول حقیقت سے وابستہ رہنے کی کوشش میں تغیر و حرکت کو سکون و ثبات

کے تابع رکھنے سے پیدا ہوتی ہے۔ جبکہ جدید تہذیب کا بحرانی مزاج اک انتشار و اختلال اصول ثبات کو نظر انداز کرنے اور کس غیر متغیر حقیقت کو نہ ماننے کا لازمی نتیجہ ہے۔

اسی طرح روایتی تہذیبوں کے غیر متغیر اصول حقیقت کو جمود اور بے حرکتی کے مترادف سمجھنے کی غلط فہمی بھی عہد جدید میں عام ہے۔ کیوں؟ اس لیے کہ سمجھا یہ جاتا ہے کہ غیر متغیر ہونے کا مطلب تغیر اور تبدیلی کے خلاف ہونا ہے۔ جبکہ اس کا مطلب تغیر اور تبدیلی کے خلاف ہونا نہیں بلکہ تغیر اور تبدیلی سے ماوراء ہونا ہے۔ بالکل اسی طرح جس طرح کہ ماورائے عقل ہونے کا مطلب عقل کے خلاف ہونا نہیں بلکہ ایک ایسے مرتبہ سے متعلق ہونا ہے جو مرتبہ عقل سے بلند تر ہے۔ اب ظاہر ہے کہ ان دونوں باتوں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ لیکن عہد حاضر کی جدید ذہنیت چونکہ اس فرق کو سمجھنے سے قاصر ہے اس لیے وہ اس حقیقت کو جو تغیر و تبدل سے ماوراء ہے تغیر و تبدل کے خلاف سمجھ کر جمود اور بے حرکتی کے مترادف سمجھنے پر اصرار کرتی ہے۔

یہاں اس بات کی طرف اشارہ کرنا بھی بے محل نہ ہو گا کہ جو لوگ حرکت و تغیر کو زندگی کی حقیقت اور کائنات کا اصل اصول سمجھتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ زندگی ایک متغیر اور متحرک قوت کا نام ہے جو ہر لحظہ بدل رہی ہے اور بدل کر کچھ سے کچھ ہو رہی ہے۔ سینما کی متحرک تصویروں کی طرح زندگی کی اسٹیج پر ہر آن ایک منظر کے بعد دوسرا منظر آموجود ہوتا ہے۔ زندگی کی اس تماشا گاہ میں کسی بھی منظر کو قیام نہیں۔ بقول اقبال زندگی ہر دم رواں دواں ہے اور کاروان ہستی کسی بھی مقام پر رکنے کا نام نہیں لیتا۔ چنانچہ ان لوگوں کی طرف سے کبھی کبھی روایت کے نقطہ نظر کو رد کرنے کے لیے اقبال کا حوالہ بھی دیا جاتا ہے جو ان کے بقول کائنات میں اصل چیز حرکت و تغیر کو مانتے تھے اور سکون و ثبات کی حقیقت فریب نظر سے زیادہ نہیں سمجھتے تھے۔ بلکہ دور کیوں جائیے یہ بات تو خود ہمارے ہمدانی صاحب نے بھی اپنے بعض مضامین میں علامہ اقبال کے حوالے سے کہی ہے کہ وہ حرکت و تغیر ہی کو زندگی کا اصل اصول کہتے تھے۔ بہرحال جو لوگ ایسا کہتے ہیں وہ ان کے بعض اشعار بھی اپنے موقف کی تائید میں پیش کرتے ہیں۔ مثلاً ان کا یہ شعر جسے گویا اس باب میں قول فیصل کی حیثیت حاصل ہے کہ

سکوں محال ہے قدرت کے کارخانے میں
ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں

لیکن اس کے برعکس خطبات میں تو ہم یہی دیکھتے ہیں کہ علامہ اقبال نے اسلام کے تصور حقیقت کے بارے میں لکھا ہے کہ:

"اسلام کے نزدیک حیات کی روحانی اساس ایک قائم و دائم وجود ہے جسے ہم اختلاف اور تغیر میں جلوہ گر دیکھتے ہیں۔"

اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کے نزدیک یہ قائم و دائم وجود جو ثبات و دوام سے عبارت ہے جب زمان و مکاں کے تعینات میں جلوہ گر ہوتا ہے تو اس میں تغیر و حرکت کی شان نظر آتی ہے۔ اسی طرح اپنی شاعری میں بھی وہ قرآن پاک کے حوالے سے ایک جگہ کہتے ہیں کہ

ظاہر او انقلابے ہر دمے
باطن او از تغیر بے غمے

اور خطبات ہی میں اوپر والی عبارت کے تسلسل ہی میں وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ:

"اسلامی معاشرہ حقیقت مطلقہ کے اس تصور پر مبنی ہے تو یہ بھی ضروری ہے کہ وہ اپنی زندگی میں ثبات اور تغیر دونوں خصوصیات کا لحاظ رکھے۔ اس کے پاس کچھ تو دوامی اصول ہونے چاہئیں جو حیات اجتماعیہ میں نظم و ضبط قائم رکھیں۔ کیونکہ مسلسل تغیر کی اس بدلتی ہوئی دنیا میں ہم اپنا قدم مضبوطی کے ساتھ جما سکتے ہیں تو دوامی اصولوں ہی کی بدولت۔"

ان کی اس عبارت سے بھی صاف ظاہر ہے کہ وہ تغیر کو ثبات کے تابع رکھتے ہوئے اسلامی معاشرہ کی زندگی میں ایک ایسا توازن پیدا کرنا چاہتے تھے جو ان دونوں اصولوں کو ان کے اپنے صحیح مقام پر رکھے بغیر پیدا ہونا ممکن نہیں۔ اس کے باوجود ہم یہ دیکھ کر حیران رہ جاتے ہیں کہ ایک بار ثبات اور تغیر ان دونوں اصولوں کی اہمیت کو تسلیم کرنے کے بعد آگے چل کر وہ ثبات و دوام کا اصول جیسے بھول ہی جاتے ہیں۔ اور تغیر و حرکت پر

اس قدر زور دینے لگتے ہیں کہ ان کے ہاں تغیر و حرکت ہی کائنات کی سب سے بڑی حقیقت نظر آنے لگتی ہے۔ علامہ اقبال ایسا کیوں کرتے ہیں۔ یہاں ہمیں اس پر بحث کرنے کی ضرورت نہیں۔ لیکن ہمیں ان کے بارے میں کم از کم اتنی بات ضرور جاننی چاہئے کہ ان کی فکر کوئی ایسی بنی بنائی شے نہیں جسے ہم دو اور دو چار کی طرح فارمولوں میں ڈھال کر آسانی سے سمجھ سکیں۔ بلکہ اس کی تعمیر و تشکیل ان کی پوری زندگی کے دوران ہوتی رہی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس میں گاہے گاہے تبدیلیاں بھی ہوتی رہی ہیں۔ اسی لیے بعض اوقات ان کے ایک دور کے نتائج فکر دوسرے دور کے نتائج فکر سے مختلف نظر آتے ہیں۔ بلکہ ایک ہی دور کی فکر بھی تضاد و تخالف سے خالی نہیں ہوتی۔ اور دوسری بات ہمیں یہ بھی معلوم ہونی چاہیے کہ وہ کسی ایک متحد اور سالم کلچر کی پیداوار نہیں تھے بلکہ ایک ایسے کلچر کی پیداوار تھے جو اندر سے دو لخت ہو چکا تھا۔ وہ ایک ایسے زمانے میں پیدا ہوئے جب مغربی کلچر ہمارے کلچر میں داخل ہو کر اپنے اثرات اس پر ڈال رہا تھا۔ علامہ اقبال کی فکری نشوونما میں ان اثرات کا بڑا ہاتھ ہے۔ اور اسی وجہ سے ان کے قلب و ذہن میں ایک ایسی کشمکش پیدا ہوئی جس سے وہ ساری زندگی نجات حاصل نہ کرسکے۔ یہ کشاکش فکر اقبال میں اتنی اہم ہے کہ اسے پوری طرح سمجھے بغیر ہم ان کے بارے میں کوئی وقیع بات نہیں کرسکتے۔ خود علامہ نے اس کشمکش کو

مری دانش ہے افرنگی مرا ایماں ہے زناری

کہہ کر واضح کیا ہے۔ چنانچہ یہ ان کی دانش افرنگی ہی کا کرشمہ ہے کہ وہ سکون و ثبات کی حقیقی اہمیت سے واقف ہونے کے باوجود آگے چل کر سکون و ثبات کو فریب نظر قرار دینے لگے۔ اور تغیر و حرکت کے اس حد تک قائل ہوئے کہ اسلام کے جس تصور حقیقت کو انہوں نے پہلے ایک قائم و دائم وجود کہا تھا' اب انہیں اس میں تغیر اور تبدیلی کی شان نظر آنے لگی۔ روایتی اسلام کے عقیدے سے یہ اتنا بڑا انحراف اور خود ان کی اپنی فکر کا اتنا بڑا تضاد تھا کہ اور تو اور خود ڈاکٹر خلیفہ عبد الحکیم جیسے اقبال پرست بھی اس کا نوٹس لیے بغیر نہ رہ سکے۔ چنانچہ انہیں علامہ اقبال پر اپنے ایک مضمون میں صاف طور پر کہنا پڑا کہ :

"حقیقت یہ ہے کہ اقبال کے ہاں وجود سرمدی کا تصور عام توحید پرستوں

سے بہت کچھ الگ ہوگیا ہے۔ خدا الان کما کان بھی ہے اور کل یوم ہو فی شان' بھی۔ لیکن اقبال نے خدا کا لاتبدیل سرمدی پہلو نظر انداز کردیا۔" ۱

اقبال نے جب سکون و ثبات کو فریب نظر قرار دیا اس وقت تو خیر مغرب ہمارے اندر کافی دور تک سرایت کر چکا تھا۔ لیکن اقبال سے پہلے یعنی ہمارے معاشرے میں جدید تہذیب کے روایت کش اثرات کی مداخلت سے قبل ہماری اردو اور فارسی شاعری میں ایسے اشعار کی مثالیں بکثرت ملتی ہیں جن کے ذریعے ہمارے شعراء نے روایتی تہذیب کے اصول و اقدار کو معاشرے کے شعور میں ہمیشہ زندہ رکھنے کی کوشش کی۔ غالب کو ہمارے ہاں جدیدیت کا سب سے پہلا اور سب سے بڑا شاعر سمجھا جاتا ہے لیکن غالب جیسے جدید شاعر کے ہاں بھی روایتی تصورات و خیالات کو دخل اس حد تک ضرور ہے کہ اس نے ایک طرف تو روایت کے تصور حقیقت کی تغیر ناپذیری کو ہر قسم کے شک و شبہ سے بالاتر قرار دیتے ہوئے کہا ہے کہ

ہستی محض تغیر نہ پذیرد زنہار
حرف الان کما کان ازیں صفحہ بخواں

اور دوسری طرف کائنات کی حرکت کی تاویل بھی اسی ہستی محض کے حوالے سے اس طور پر کی کہ

ہے کائنات کو حرکت تیرے ذوق سے
پرتو سے آفتاب کے ذرے میں جان ہے

سلیم احمد کہتے ہیں کہ غالب کے ہاں روایتی معاشرے کی بہت سی قابل قدر چیزیں غائب ہو گئیں۔ لیکن غالب سے سلیم احمد تک آتے آتے گو کہ ہمارا پرانا روایتی معاشرہ اس حد تک بدلا کہ خود سلیم احمد جیسے کلاسیکی غزل گو کے لیے محمد حسن عسکری کی رہنمائی کے باوجود ایک مقام پر جا کر روایتی غزل کہتے رہنا ناممکن ہو گیا۔ پھر بھی جب ہم حرکت اور سکون کے موضوع پر ایک نئے شاعر کا یہ شعر سنتے ہیں کہ

میں گردش میں ہوں مانند شب و روز
وہ مثل آسمان ٹھہرا ہوا ہے

(معین الدین احمد)

تو روایتی معاشرے کی تمام تر شکست و ریخت کے باوجود روایتی تہذیب کے اصول و اقدار پر ہمارا ایمان ایک بار پھر تازہ ہونے لگتا ہے۔

اچھا۔ اگر زندگی صرف تغیر و حرکت ہی سے عبارت ہے تو پھر سوال یہ ہے کہ اسے کسی دائمی اور غیر متغیر اصول کے تحت رکھنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ اگر زندگی میں حرکت و تغیر ہی سب کچھ ہے تو پھر اس حرکت و تغیر کا تقاضا تو یہ ہے کہ ہم وقت کے بہتے ہوئے دھارے میں اپنی جگہ مضبوطی کے ساتھ قدم جما کر کھڑے رہنے کی بجائے اپنے آپ کو اس کی تند و تیز لہروں کے سپرد کردیں تاکہ وہ ہمیں اپنے ساتھ جدھر چاہیں بہا کر لے جائیں۔ لیکن ظاہر ہے کہ ہم ایسا نہیں کرتے۔ اس لیے کہ ہم جانتے ہیں۔ ایسا کرنا دیدہ و دانستہ موت کے منہ میں جانے کے مترادف ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ زندگی میں صرف حرکت و تغیر ہی سب کچھ نہیں بلکہ سکون و ثبات کی بھی اپنی ایک اہمیت ہے۔ اور یہ اہمیت حرکت و تغیر کی اہمیت سے کسی بھی طرح کم نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ زمانے اور وقت کی تیز سے تیز تر ہوتی ہوئی گردشوں کے درمیان ہم اس تغیر کدے میں کوئی نہ کوئی نقطہ ثبات تلاش کرنے کی کوشش ضرور کرتے ہیں۔ اب چاہے ہم اپنی کوشش میں کامیاب ہوں یا نہ ہوں لیکن ہماری روایتی تہذیبیں اس راز سے بخوبی واقف تھیں کہ حرکت و تغیر اور سکون ثبات۔ ان دونوں اصولوں کے تال میل ہی سے زندگی میں وہ توازن پیدا ہو سکتا ہے جو وقت کے تلاطم خیز سمندر میں ہماری کشتی کو ڈوبنے سے بچا کر اسے صحیح سلامت اپنی منزل مقصود تک پہنچا سکے۔ عہد جدید سے پہلے ساری روایتی تہذیبوں کی زندگی بالعموم حرکت و سکون اور ثبات و تغیر کے اسی توازن پر قائم تھی۔ لیکن عہد جدید میں حرکت و تغیر ہی کو سب کچھ سمجھ بیٹھنے کی وجہ سے یہ توازن بگڑ گیا۔ اب اس توازن سے محروم ہو کر ہم ادھر ادھر بے مقصد ڈولتے پھر رہے ہیں۔ یا شاید اصل بات کچھ یوں ہے کہ اس توازن کے بگاڑ ہی نے ہمیں حرکت و تغیر کو زندگی اور کائنات کی سب سے بڑی حقیقت کہنے پر مجبور کر دیا ہے۔ بہر صورت' بات چاہے جو بھی ہو۔ لیکن نتیجہ اس کا یہ ہے کہ انسانی تہذیب و تمدن کے بنیادی ڈھانچے آج جس سب اصول تغیر و حرکت کی زد میں ہیں۔ اس کے پیش نظر اگر آج کا انسان اس وسعت آفاق میں

اپنے لیے کوئی ایسی جنت تلاش نہیں کرتا جو اسے غیر تغیر کی اقلیم سے وابستہ کر کے زندگی میں اپنا کھویا ہوا توازن پھر سے بحال کرنے میں مدد دے سکے تو یقین کیجے کہ پھر اس کا وقت کے سیلاب میں تنکے کی طرح بہ کر رہ جانااور اس کے ساتھ ہی انسانی تہذیب و تمدن کی بلند و بالا عمارت کے اس پورے ڈھانچہ کا جس کی بنیادیں پہلے ہی متزلزل ہیں زمیں بوس ہو کر رہ جانا گویا پہلے ہی سے مقدر ہو چکا ہے۔

اب رہی یہ بات کہ جدید فکر کے نزدیک حرکت اور اس کے نتیجہ میں واقع ہونے والی تبدیلیوں کا سفر ہمیشہ ارتقا یا ترقی کی طرف ہوتا ہے جبکہ روایتی فکر کے نزدیک زمانے میں ہونے والی تبدیلیاں معاشرے کو زوال کی طرف لے جاتی ہیں۔ سو جہاں تک روایتی فکر کا تعلق ہے اس کا موقف تو آگے چل کر خود ہی واضح ہوجائے گا۔ لیکن اس سے پہلے ہمارا بنیادی سوال یہ ہے کہ جدید فکر کے نزدیک حرکت اور اس کے نتیجہ میں واقع ہونے والی تبدیلیوں کا رخ ارتقا یا ترقی ہی کی طرف ہونا کیوں ضروری ہے۔ کیا ان تبدیلیوں کا رخ تنزل اور انحطاط کی طرف نہیں ہو سکتا؟ اس لیے کہ ہمارے نزدیک تو یہ ایک مسلمہ اصول ہے کہ حرکت یا تو کمتر سے بہتر کی طرف ہوتی ہے یا بہتر سے کمتر کی طرف۔ اس سے معلوم ہوا کہ حرکت و تغیر کے نتیجہ میں یا تو کوئی چیز اس سے اچھی بنتی ہے جیسی کہ وہ ہے یا اس سے خراب بنتی ہے جیسی کہ وہ ہے۔ بہتر بننے کو ترقی کہتے ہیں اور خراب بننے کو تنزل یا انحطاط۔ لہٰذا حرکت و تغیر کے نتیجہ میں ہونے والی تبدیلیاں کسی معاشرے کو ترقی و ارتقاء کی طرف بھی لے جا سکتی ہیں اور تنزل و انحطاط کی طرف بھی۔ یہ دونوں امکانات برابر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ایسی صورت میں جدید فکر کے پاس یہ فرض کرنے کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ حرکت اور اس کے نتیجہ میں واقع ہونے والی تبدیلیاں کسی معاشرے کو لازمی طور پر ترقی و ارتقاء ہی کی طرف لے جاتی ہیں۔ لیکن جدید فکر کے پاس ہمارے اس سوال کا کوئی جواب نہیں سوائے اس کے کہ وہ اپنی بات کی صداقت پر نظریہ ارتقا کی گواہی پیش کرے۔ سو نظریہ ارتقا کو اگرچہ عہد جدید میں بالعموم کسی مذہبی عقیدے کی طرح ہر قسم کے شک و شبہ سے بالاتر سمجھا جاتا ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ اس کی بنیاد سائنسی حقائق پر کم اور مفروضات پر زیادہ ہے۔ لہٰذا اس

کی حیثیت نظریے سے زیادہ **فرضیے** (Hypothesis) کی سی ہے۔ یوں بھی نظریہ ارتقا کی گواہی اگر انیسویں صدی میں پیش کی جاتی تو خیر ایک بات تھی' مگر آج بیسویں صدی کی آخری دہائی میں تو اس نظریے کا دامن خود سائنسدانوں ہی کے ہاتھوں تار تار ہو چکا ہے۔ چنانچہ اب کئی ایک سائنسدان اس حقیقت کو صاف طور پر تسلیم کرتے ہیں کہ اس نظریے کی صداقت کا کوئی ٹھوس سائنسی ثبوت ان کے پاس نہیں۔ علاوہ ازیں بہت سے معلوم حقائق بھی اس نظریے کی تردید کرتے ہیں۔ اس کے باوجود سائنس اس نظریے کو مسترد نہیں کرتی۔ بلکہ اس کی لیپا پوتی کرکے کسی نہ کسی طرح اسے قائم رکھنے کی کوشش کرتی ہے۔ ڈارون نے اس نظریہ کو حیاتیات کے ضمن میں پیش کیا تھا۔ لیکن اس کے بعد اسپنسر نے اسے حیاتیات سے اٹھا کر پوری دنیا پر پھیلا دیا۔ اور اس کے ذریعہ آفاقی حیاتیاتی اخلاقی اور سماجی عوامل کی تشریح کا کام لیا۔ چنانچہ اپنی جدید شکل میں اس نظریہ کو اسپنسر ہی سے وابستہ سمجھنا چاہیے۔ یوں بھی اس نظریے کی عالمگیر شہرت اور مقبولیت میں اسپنسر کا بڑا ہاتھ ہے۔ بہر حال ارتقا کے جدید تصور کا اطلاق اب دنیا کی ہر چیز پر کیا جاتا ہے۔ چنانچہ آج جسے دیکھو وہ کسی نہ کسی چیز کے ارتقا کا حوالہ دیتا نظر آتا ہے۔ کائنات کے ارتقاء انسان کے ارتقا اور تہذیب کے ارتقا سے لے کر اوقاف و اعراب تک کے ارتقاء کی باتیں اب بالکل بے دھڑک انداز میں کی جاتی ہیں۔ کیوں؟ اس لیے کہ اس نظریے کی تہ میں یہ خیال موجود ہے کہ ہر چیز ایک ہی متعینہ رخ پر یعنی کمتر سے بہتر کی طرف حرکت کر رہی ہے۔ چنانچہ جہاں تک نظریہ ارتقا کی گواہی کا تعلق ہے تو بھی ہمیں اس سے زیادہ کچھ نہیں بتاتی کہ ارتقا کے قانون کی رو سے ہر چیز ایک ہی متعینہ رخ پر یعنی کمتر سے بہتر کی طرف حرکت کرتی ہے۔ اور کوئی حادثہ یا اتفاق اس کے رخ کو بدل نہیں سکتا۔ لیکن یہی تو وہ بنیادی دعوی ہے جس پر ہمیں اعتراض ہے۔ لہذا خود دعوے ہی کو بطور دلیل کے پیش کرنا تحصیل حاصل کے مترادف ہے۔

بہر نوع نظریہ ارتقا کی رو سے کیونکہ ہر چیز ایک ہی متعینہ رخ پر حرکت کرتی ہے اسلیے اس نظریے کی تہ میں دوسرا بنیادی خیال یہ بھی موجود ہے کہ کائنات میں کوئی ایسا عمل بروئے کار نہیں جسے ارتقا کی ضد یا اس کا مخالف قرار دیا جا سکے۔ یعنی ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ ارتقا کے مقابلہ میں زوال یا انحطاط کا بھی کوئی عمل کائنات میں موجود ہے۔ حالانکہ ہم

زندگی میں روزانہ ہر قدم پر زوال و انحطاط کے مظاہر کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ لیکن نظریہ ارتقا ہمارے مشاہدے کی اس بین حقیقت کو جھٹلاتا ہے شاید اس لیے کہ ہمارے مشاہدے کو سائنس کی تصدیق یا تائید حاصل نہیں۔ اچھا اگر سائنس کی تصدیق و تائید کے بغیر کوئی بات معتبر نہیں مانی جاسکتی تو کم از کم غالب کے اس قول کو تو معتبر ماننا ہی پڑے گا کہ

ہیں زوال آمادہ اجزاء آفرینش کے تمام
مہر گردوں ہے چراغ رہگذار باد یاں

اس لیے کہ یہ بات تو خود سائنس بھی مانتی ہے کہ سورج کی حرارت آہستہ آہستہ کم ہو رہی ہے اور مستقبل بعید میں ایک وقت ایسا آنا لازمی ہے جب سورج کی حرارت اس درجہ گھٹ جائے گی کہ وہ اس کرہ خاکی کے لیے سامان حیات فراہم کرنے کے قابل نہ رہے گا اور اس کے ساتھ ہی بالآخر شمع حیات بھی گل ہو کر رہ جائے گی۔ علاوہ ازیں نظریہ ارتقا کا مخالف بلکہ اس کی عین ضد تو خود سائنس کے اپنے ہی گھر میں اصول ناکارگی (Law of Entropy) جیسے مستحکم سائنسی قانون کی صورت میں بھی موجود ہے جس کے مطابق کائنات میں توانائی کے انتشار یا تضیع کا عمل نہ جانے کب سے جاری ہے۔ چنانچہ بعض سائنسدانوں کے نزدیک کائنات ایک ایسی گھڑی کے مانند ہے جو رفتہ رفتہ ناکارہ ہوتی جارہی ہو۔ گویا سائنس کا اپنے ہی گھر کی گواہی کے مطابق تو خود گھر کا بھیدی ہی ارتقائی تصور کی لنکا ڈھانے پر تلا ہوا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ پی۔ ڈی آسپنسکی (P.D.Ouspensky) جیسے ماہر ریاضیات اور فلسفی کے نزدیک ارتقا ایک ناکام نظریے کا نام ہے اس لیے کہ یہ حقیقت کی صحیح تعبیر پیش کرنے سے قاصر ہے۔ آسپنسکی کا کہنا ہے کہ نظریہ ارتقا ترقی کے مظاہر کی توجیہ تو کرتا ہے مگر تنزل کے مظاہر کی توجیہ نہیں کر سکتا۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ کائنات میں مختلف قسم کے عوامل سرگرم ہیں جو ہمیشہ آپس میں ایک دوسرے کو کاٹتے اور تبدیل کرتے رہتے ہیں۔ اس کے نزدیک ان مختلف عوامل کی دو بنیادی اقسام ہیں۔ ایک تخلیقی عوامل اور دوسرے تخریبی عوامل۔ وہ کہتا ہے کہ یہ دونوں قسم کے عوامل برابر کی اہمیت رکھتے ہیں۔ کیونکہ اگر تخریبی عوامل نہ ہوں تو تخلیقی عوامل بھی پیدا نہیں ہو سکتے اس لئے کہ تخریبی عوامل ہی تو تخلیقی عوامل کے لئے

مواد فراہم کرتے ہیں۔ لہٰذا کوئی نظریہ جو ان حقائق کو تسلیم نہیں کرتا وہ حقائق کی صحیح توجیہ پیش نہیں کر سکتا۔ چنانچہ اس کا کہنا یہ ہے کہ جدید فکر جس نے نظریہ و ارتقاء کو پیدا کیا' تخریبی عوامل کو نظر انداز کر کے ایک زبردست غلطی کی مرتکب ہوئی ہے۔

اچھا۔ انفرادی اشیاء کی سطح پر تو ہمارا مشاہدہ ہمیں یہی بتاتا ہے کہ حرکت و تغیر کے نتیجہ میں اشیاء صرف ترقی و کمال ہی کے مدارج طے نہیں کرتیں بلکہ اس کے بعد زوال آمادہ ہو کر فنا بھی ہو جاتی ہیں۔ یہ ہمارے روزمرہ مشاہدے کی بات ہے لہٰذا اس کے لیے کسی ثبوت یا دلیل کی ضرورت نہیں۔ چنانچہ انفرادی اور کائناتی سطح کے بعد اب ذرا جدید فکر کے موقف کو تہذیبی سطح پر بھی پرکھ کر دیکھ لیجیے۔ جدید فکر کا دعویٰ ہے کہ زمانے میں رونما ہونے والی تبدیلیاں معاشرے کو ترقی و ارتقا کی طرف لے جاتی ہیں۔ مگر ہم کہتے ہیں کہ اس دعوے کی تصدیق تاریخی شواہد سے ہرگز نہیں ہوتی۔ مثال کے طور پر ان تبدیلیوں کو لیجیے جو مغربی معاشرے میں نشاۃ ثانیہ کے آس پاس ظاہر ہو کر عہد جدید کی مغربی تہذیب کے ظہور کا باعث بنیں۔ اس دعوے کی رو سے ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ قرون وسطیٰ کی عیسوی تہذیب مذکورہ تبدیلیوں کے نتیجہ میں ترقی کر کے جدید مغربی تہذیب کی صورت اختیار کرتی۔ مگر حقیقت اس کے برعکس یہ ہے کہ جدید تہذیب قرون وسطیٰ کی تہذیب سے ترقی کر کے نہیں بلکہ اس کی نفی سے ظہور میں آئی ہے۔ گویا عہد جدید ماضی کے بطن سے ایک صحت مند انسانی بچہ کی طرح پیدا نہیں ہوا بلکہ بچھو کے ان بچوں کی طرح پیدا ہوا ہے جو اپنی ماں کا پیٹ پھاڑ کر پیدا ہوتے ہیں اور جن کی پہلی غذا ان کی ماں کا مردہ جسم ہوتا ہے۔ اس کے باوجود اس تہذیب کو پوری انسانیت کے سفر ارتقا کا حاصل بتایا جاتا ہے۔ یعنی یہ باور کیا جاتا ہے کہ انسانیت من حیث الکل ابتدا سے لے کر آج تک کسی پس و پیش کے بغیر ایک ہی سمت میں ترقی کرتی چلی آتی ہے۔ اور جدید مغربی تہذیب اس ترقی کا حاصل ہے۔ لیکن یہ دعویٰ سراسر بے بنیاد اور بے جواز ہے اس لیے کہ اس کی بنیاد تاریخی حقائق پر نہیں محض مفروضات پر ہے۔ جبکہ حقیقت دراصل یہ ہے کہ جدید تہذیب دنیا کی دوسری تہذیبوں کے درمیان کسی ارتقائی سفر کا نتیجہ نہیں بلکہ نفی کے عمل کا نتیجہ ہے۔ یعنی بات کچھ یوں ہے کہ عہد جدید سے پہلے دنیا کی تمام بڑی تہذیبیں قرون وسطیٰ کی دینوی تہذیب سمیت روایتی تہذیبیں تھیں۔ جبکہ جدید

تہذیب ایک غیر روایتی تہذیب ہے۔ جس کی اصل اساس روایتی اصول و عقائد کے انکار پر قائم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس تہذیب میں ہر چیز روایتی تہذیبوں کے برعکس مختلف متضاد سمت میں حرکت کرتی ہے۔ روایتی تہذیبوں کے سفر کا رخ اگر نیچے سے اوپر کی جانب روحانی بلندی کی طرف تھا تو جدید تہذیب کی سمت سفر اوپر سے نیچے یعنی مادیت کی پستی کی جانب ہے۔ روایتی تہذیبوں کا اصل اصول اگر ایک غیر متحرک اور غیر متغیر اصول حرکت تھا جو خود بے حرکت رہتے ہوئے ہر حرکت اور تبدیلی کو جنم دیتا تھا تو جدید تہذیب اس اصل اصول کی نفی کرتے ہوئے خود تغیر و حرکت ہی کو زندگی کا اصل اصول مانتی ہے۔ غرض یہ کہ یہ تہذیب اپنی بنیادی سرشت اور مزاج کے اعتبار سے ہر معاملے میں روایتی تہذیبوں کی عین ضد ہے۔ لہٰذا ان کے درمیان حقیقتاً اگر کوئی نسبت ہو سکتی ہے تو وہ تضاد اور تخالف ہی کی نسبت ہے نہ کہ ترقی و ارتقاء کی۔ یہی وجہ ہے کہ یہ تہذیب دنیا کی جن دوسری تہذیبوں پر اثر انداز ہوتی ہے وہ بھی اس اثر کے ذریعہ ترقی نہیں کر رہی ہیں بلکہ فنا ہو رہی ہیں۔ بلکہ اس حقیقت کو تو ہم خود اپنی آنکھوں سے دیکھ کر ذاتی تجربہ سے جانتے ہیں کہ جدید تہذیب کس طرح ہماری پرانی روایتی تہذیب کو اپنے ہلاکت آفریں لمس سے فنا کے گھاٹ اتار رہی ہے۔ لہٰذا اسے ارتقائی نقطہ نظر کی رو سے انسانیت کے تہذیبی ارتقا کا حاصل قرار دینا گویا جان بوجھ کر تاریخی حقائق کی الٹی تعبیر پیش کرنے کے مترادف ہے۔

اس کے برعکس ہمارا کہنا یہ ہے کہ ترقی یا ارتقا کا عمل کوئی ایسا یک رخا عمل نہیں جو ہمیشہ ایک ہی سمت میں کسی پس و پیش کے بغیر آگے بڑھتا ہے۔ بلکہ اس عمل کا ترقی و تنزل اور عروج و زوال کے کم و بیش ویسے ہی مراحل سے گزرنا لازمی ہے جس کا مشاہدہ ہم انسانی زندگی کے مختلف ادوار میں بچپن شباب اور بڑھاپے کے دوران کرتے ہیں۔ چنانچہ تاریخ اس بات کی شہادت دیتی ہے کہ انسانی زندگی کی طرح تہذیبیں بھی اپنے بچپن، شباب اور بڑھاپے کے دور سے گزرتی ہیں۔ بالفاظ دیگر انہیں بھی اپنے درجہ کمال تک پہنچنے کے بعد بالآخر زوال و انحطاط سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ علاوہ ازیں کوئی بھی تہذیب زندگی کے تمام شعبوں میں بیک وقت مطلق طور پر ترقی نہیں کرتی بلکہ اگر کوئی تہذیب کسی ایک شعبہ میں ترقی کرتی ہے تو دوسرا شعبہ تنزل کا شکار بھی ہو سکتا ہے اور یہ دونوں عمل بیک وقت مختلف

سمتوں میں واقع ہوسکتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ مختلف تہذیبوں کی دم سے دم باندھ کر انہیں شاہراہ ارتقا پر گامزن ہوتے ہوئے دکھانا جدید فکر کا کتنا ہی محبوب مشغلہ سہی۔ لیکن یہ عمل دراصل تہذیبوں کے عروج و زوال کے فطری قوانین کو نظر انداز کر کے ان کے ارتقا کا ایک ادھورا اور یک رخا تصور پیش کرنے کے مترادف ہے۔

اچھا۔ اگر ارتقائی نقطہ نظر واقعی سائنسی نقطہ نظر ہے۔ تو چونکہ سائنس کا کام واقعات کو جھٹلانا نہیں۔ لہٰذا اسے ماننا چاہئے کہ نسل انسانی کی ترقی یا ارتقا بھی دراصل ترقی کے ایک ایسے ہی دور سے عبارت ہے جس کے نقطہ عروج پر پہنچنے کے بعد تنزل اور انحطاط کے دور کا شروع ہونا لازمی ہے۔ لہٰذا یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ نسل انسانی اپنے ارتقا کے عروجی دور کے بعد پہلے ہی تنزل و انحطاط کے نزولی دور میں داخل ہو چکی ہو۔ دبستان روایت کے ایک معتبر نمائندے کا کہنا ہے کہ یہ امکان جس سوال کی صورت لئے ہوئے ہے وہ اپنے انتہائی دور رس اور گہرے تاریخی تہذیبی اور انسانی مضمرات کے اعتبار سے اس قدر اہم ہے کہ اسے آج ارتقائی فلسفہ کا سب سے اہم سوال ہونا چاہئے۔ لیکن اگر یہ سوال ارتقائی فلسفہ کی تاریخ میں پہلے کبھی نہیں اٹھایا گیا تو آج ضرور اٹھایا جانا چاہئے۔ ان کا کہنا ہے کہ اگر کبھی ارتقائی فلسفوں کو اس سوال سے دوچار ہونا پڑا تو یقیناً ان میں سے اکثر اپنے نظریے کو بالکل اسی طرح دفعتہً جھٹک کر پھینک دیں گے جس طرح کسی دہکتے ہوئے کوئلے کو غلطی سے ہاتھ میں پکڑنے والا شخص اسے فوراً ہی ہاتھ سے جھٹک کر پھینک دیتا ہے۔

ان توضیحات سے ظاہر ہے کہ جدید فکر زندگی کی حرکت کا ایک ایسا یک رخا اور ادھورا تصور رکھتی ہے جس کے مطابق حرکت کا رخ ہمیشہ ایک ہی سمت میں یعنی ترقی و ارتقا کی طرف رہنا ضروری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ترقی و ارتقاء کے فلسفے تو بہت گھڑ سکتی ہے۔ مگر زوال و انحطاط کے جو عوامل کائنات میں برسرکار ہیں ان کی کوئی توجیہہ پیش نہیں کر سکتی۔ اس کے برعکس اپنے گینوں کے نزدیک زندگی کا سفر محض یک رخی حرکت ہی سے عبارت نہیں بلکہ اس میں بیک وقت دو رخی حرکت پائی جاتی ہے۔ ایک حرکت وہ ہے جو کسی شے کو اس کی اصل یا اس کے مرکز سے دور لے جاتی ہے اور دوسری وہ جو اسے واپس اپنے مرکز کی طرف کھینچتی ہے۔ پہلی حرکت مرکز گریز Centrifugal اور دوسری حرکت مرکز جو

Centripetal کہلاتی ہے۔ اور یہ دونوں حرکتیں بیک وقت متضاد سمتوں میں واقع ہوتی ہیں۔ گویا جس طرح ہمیں ایک قدم آگے بڑھانے کے لئے دوسرا قدم پیچھے ہٹانا پڑتا ہے۔ بالکل اسی طرح فطرت بھی آگے بڑھنے اور پیچھے ہٹنے کے دوگونہ عمل کو ظاہر کرتی ہے اور اس دوگونہ عمل کے ذریعہ زندگی کا توازن برقرار رکھتی ہے۔ زندگی کی دو رخی حرکت کا یہ تصور جسے روایتی تہذیبوں میں دل کی دھڑکن یا نفس کی آمد و شد کے دہرے عمل کے مماثل سمجھا گیا ہے دراصل حرکت کا ایک ایسا متوازن اور حقیقت پسندانہ تصور ہے جو کائنات میں ترقی و کمال کے ساتھ ساتھ زوال و انحطاط کے مظاہر کی توجیہ بھی بخوبی پیش کر سکتا ہے۔ لیکن اس توجیہ کے بیان سے پہلے ہمیں حرکت و تغیر کے بارے میں ایک بات یہ بھی واضح طور پر جان لینی چاہئے کہ حرکت و تغیر کا مطلب یہ ہے کہ ایک چیز اپنی اصل میں جو کچھ ہے وہ حرکت و تغیر کے مسلسل عمل کے نتیجہ میں اس سے مختلف کچھ اور بنتی چلی جاتی ہے جو کچھ کہ وہ دراصل ہے۔ گویا ہر وہ چیز جو متحرک اور متغیر ہے ہر آن اپنی اصل سے دور ہو رہی ہے۔ اور اپنی اصل سے دور ہو کر کچھ سے کچھ بنتی چلی جارہی ہے۔ لیکن اگر حرکت و تغیر ہی زندگی کا واحد اصول ہو تو اس عمل کا لازمی نتیجہ یہ ہونا چاہئے کہ زندگی میں کوئی چیز بھی اپنی اصلیت پر قائم نہ رہے۔ اور حرکت و تغیر کے ہاتھوں ہر آن اپنی اصل سے دور ہو کر بدلتے بدلتے اپنی ماہیت اور اپنا ذاتی تشخص تک زائل کر بیٹھے۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ زندگی میں ایسا نہیں ہوتا۔ بلکہ ہر آن حرکت و تغیر کے عمل سے گزرنے کے باوجود ہر شے اپنی ماہیت برقرار رکھتی ہے۔ ترقی ہو یا تنزل، عروج ہو یا زوال اشیاء کا ذاتی تشخص ہر حالت میں برقرار رہتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ تغیر کے ساتھ ساتھ ثبات کا اصول بھی زندگی میں کارفرما ہے۔ اور یہی وہ اصول ہے جو زندگی میں افراد و اشیاء کے ذاتی تشخص کو قائم رکھنے کا ذمہ دار ہے۔ لیکن جدید فکر ثبات کے اس اصول کو تسلیم نہیں کرتی۔ کیونکہ اس کے نزدیک تو تغیر کے سوا زمانے میں کسی بھی شے کو ثبات حاصل نہیں۔ اس کے برعکس روایتی فکر کے نزدیک چونکہ تغیر کے ساتھ ساتھ ثبات کا اصول بھی زندگی کی ایک ناقابل تردید حقیقت ہے اس لئے روایتی تصور حرکت میں تغیر اور ثبات دونوں اصولوں کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ چنانچہ روایت کا نقطہ نظر اپنے گینوں کے بقول یہ ہے کہ مرکز گریز حرکت کے ذریعہ عالم ظہور میں آنے والی ہر شے بتدریج تیز سے تیز تر

گردش کرتی ہوئی اپنی تخلیق کے اصل اصول یا مرکز سے دور ہوتی جاتی ہے۔ اور گو کہ یہ حرکت ایک حد تک اشیاء کے وجود کی توسیع یا ترقی کے لئے ضروری ہے لیکن اگر یہ حرکت بغیر کسی روک ٹوک کے مسلسل ایک ہی سمت میں جاری رہے تو کوئی بھی چیز اپنی اصلیت پر قائم نہ رہ سکے۔ بلکہ اپنی اصل سے دور ہوتے ہوتے اتنی دور چلی جائے کہ بالآخر اس کی ماہیت بھی بدل کر رہ جائے۔ یہی وجہ ہے کہ مرکز جو حرکت ہر شے کو واپس اپنے مرکز کی طرف بھی کھینچتی رہتی ہے اور یوں اس کی ماہیت کو تبدیل نہیں ہونے دیتی۔ گویا دورخی حرکت کا یہ عمل ثبات اور تغیر دونوں اصولوں کا لحاظ رکھتے ہوئے اشیاء کے وجود کی توسیع یا ترقی کے ساتھ ساتھ ان کے ذاتی تشخص کو برقرار رکھنے کا سبب بھی بنتا ہے۔

علاوہ ازیں زندگی کی مرکز گریز اور مرکز جو حرکتوں کے سلسلہ میں روایت کا ایک اور اصول یہ بھی ہے کہ مرکز گریز حرکت زمانے کے ساتھ ساتھ تیز ہوتی جاتی ہے۔ اوراس کے مقابلہ میں مرکز جو حرکت سست پڑجاتی ہے۔ مرکز جو حرکت کی سست روی کے مقابلہ میں مرکز گریز حرکت کی تیز روی کسی چیز کے درجہ کمال تک پہنچنے کے لئے ایک حد تک ضروری ہے۔ لیکن حد کمال کو چھولینے کے بعد مرکز گریز حرکت کا تیز سے تیز تر اور مرکز جو حرکت کا سست سے سست تر ہوتا ہوا قدم کسی شے کے زوال و انحطاط کا باعث بنتا ہے۔ حتیٰ کہ ایک وقت وہ بھی آجاتا ہے جب مرکز جو حرکت بالکل ختم ہو کر رہ جاتی ہے۔ اور یہی وقت اس شے کے خاتمہ کا وقت ہوتا ہے۔ اب اس وضاحت سے یہ بات بھی باسانی سمجھ میں آسکتی ہے کہ مرکز جو حرکت کا خاتمہ انفرادی سطح پر اشیاء کی موت اور تہذیبی سطح پر تہذیبوں کے خاتمہ سے عبارت ہے جبکہ کائناتی سطح پر یہی وقت وہ وقت ہوگا جسے ہمارے مذہب کی زبان میں قیام قیامت کا وقت کہا گیا ہے۔

اب رہی یہ بات کہ تغیر و حرکت کے بارے میں روایتی تصورات اپنی مقبولیت اور کشش عہد جدید میں کھوچکے ہیں. تو اگرچہ یہ بات بڑی حد تک درست ضرور ہے مگر اس کے باوجود ہم پوچھتے ہیں کہ کیا زمانے کی مقبولیت اور کشش صداقت کی کوئی ایسی مسلمہ کسوٹی ہے جسے تصورات و خیالات کے کھرے کھوٹے کی جانچ کا واحد اور آخری معیار سمجھا جا سکے۔ ہمارے سوال کا جواب اگر اثبات میں ہو تو پھر ہم اتنا ضرور کہیں گے کہ عہد

جدید کے آغاز سے پہلے روایتی تصورات کی مقبولیت. اور کشش کا دائرہ تو جدید تصورات کی حالیہ مقبولیت اور کشش کے نسبتاً بہت چھوٹے دائرے کے مقابلہ میں زمانی پھیلاؤ کے اعتبار سے کہیں زیادہ بڑا تھا۔ لیکن ہم چونکہ زمانے کی مقبولیت اور کشش کو صداقت کی کوئی غیر متنازعہ اور مسلم کسوٹی نہیں سمجھتے اس لئے یہ نکتہ ہم نے محض الزامی جواب کے طور پر پیش کیا ہے ورنہ ہمارے نزدیک تو روایتی تصورات کی صداقت زمانے کی مقبولیت یا غیر مقبولیت سے کہیں بالاتر ہے۔

اس طرح ترقی و ارتقا کے سلسلہ میں سائنس اور ٹیکنالوجی کی پیش رفت کے حوالے سے بیل گاڑی کے مقابلہ میں جہاز کے آرام دہ سفر اور رسل و رسائل کے جدید ذرائع کی بدولت میسر آنے والی سہولتوں کو زمانے کی ترقی کی دلیل کے طور پر پیش کرتے ہوئے جدید فکر کو انسانی تجربہ کی رو سے حقیقت کے زیادہ قریب بتایا گیا ہے۔ لیکن حقیقت کا تصور چونکہ روایتی فکر اور جدید فکر دونوں میں ایک دوسرے سے مختلف ہے اس لئے حقیقت کی بنیاد پر تو دونوں کے درمیان یہ فیصلہ ممکن نہیں کہ دونوں میں سے کون حقیقت سے زیادہ قریب ہے۔ رہا انسانی تجربہ تو سائنس اور ٹیکنالوجی کی پیش رفت کے ذریعہ میسر آنے والی تمام تر سہولتوں کے باوجود انسانی تجربے کی ایک گواہی وہ بھی تو ہے جو ہیروشیما اور ناگا ساکی کی تباہی کی صورت میں ہمارے سامنے موجود ہے اور دوسری گواہی ماحولیاتی آلودگی کے سنگین ترین مسئلہ کی صورت میں بھی موجود ہے اور تیسری گواہی وہ بھی ہے جو ہمیں یہ بتاتی ہے کہ آج کے مشینی دور میں انسان کس طرح مشین ہی کا ایک پرزہ بنتا جارہا ہے۔ غرض کہ انسانی تجربہ کی گواہیاں تو اور بھی بہت سی ہیں جو عہد جدید کی ترقی کے دعوے کے خلاف جاتی ہیں۔ بلکہ علامہ اقبال آنند کمار سوامی اور اشپنگلر سے لے کر ڈاکٹر سوروکن اور اپنے گینوں تک مشرق و مغرب کے کتنے ہی بڑے لوگ ایسے ہیں جو اس بنیاد پر عہد جدید کی مغربی تہذیب کو روبہ زوال تصور کرتے ہیں۔ لیکن فی الحال ہم ان سب سے قطع نظر کرتے ہوئے صرف اتنی بات کہنے پر اکتفا کریں گے کہ بے شک سائنس اور ٹکنالوجی کی پیش رفت نے انسانی آسائش اور سہولت کا جو انتظام اس دور میں کیا ہے وہ انسان کو اس سے پہلے کبھی میسر نہ تھا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ انسان اس کے باوجود پہلے سے زیادہ دکھی مجبور اور بے بس کیوں ہے۔ ہوائی جہازوں نے آج

کے دور میں دنیا کو ایک تو بے شک کر دیا مگر انسانوں کے درمیان خود غرضی اور نفس پرستی کی دیواریں پہلے سے زیادہ اونچی کیوں ہو گئی ہیں۔ سائنس اور ٹکنالوجی کی پیش رفت اپنی جگہ مسلم مگر ہم پوچھتے ہیں کہ جو پیش رفت انسانیت کے دکھ درد کا مداوانہ کر سکے اس کی بدولت اگر ہم ترقی کر کے مریخ پر بھی پہنچ جائیں تو اس انسانیت کو کونسے سرخاب کے پر لگ جائیں گے۔

مقالات کلیم جلد دوم: اقبالیات مرتبہ شاہد حسین رزاقی (ص ۱۹۳)

○

# مغربی میڈیا، انسانی حقوق، اسلامی بنیاد پرستی اور ہم

ڈاکٹر صفدر محمود

موجودہ دور میڈیا کا دور ہے۔ غور کیا جائے تو محسوس ہو گا کہ مغرب محض موثر اور طاقتور میڈیا کے ذریعے ہمارے ذہنوں پر حکومت کر رہا ہے۔ یہاں ہم سے مراد صرف پاکستان ہی نہیں بلکہ پاکستان جیسے وہ ممالک بھی اس فہرست میں شامل ہیں جہاں سیاسی شعور کا فقدان ہے، جہالت عروج پر ہے اور تعلیم یافتہ ہر قسم کی راہنمائی کے لئے مغرب کی جانب دیکھتا ہے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ یہ ایک طرح سے ہمارے پڑھے لکھے طبقے کا احساس کمتری ہے کہ وہ مغرب کے ایجاد کردہ ہر لفظ، اصطلاح اور محاورے کو یوں قبول کر لیتا ہے جیسے یہ الہامی بات اور مقدس لفظ ہو۔ چنانچہ اس طرح مغربی میڈیا وقتاً" فوقتاً" نئے نئے شوشے چھوڑتا رہتا ہے جن کا مقصد ہماری سوچ کو متاثر کرنا اور ہماری فکر کو ایک خاص رخ پر ڈالنا ہوتا ہے۔ یاد رکھیے کہ یہ دور جسمانی غلامی کا نہیں، ذہنی غلامی کا ہے۔ ماضی میں جب ضعیف قوموں کو غلام اور کمزور ملکوں کو تجارتی مقاصد کے لئے کالونی بنایا جاتا تھا تو مغربی ممالک نے پسماندہ اقوام کی ایک بڑی تعداد کو اپنا غلام بنا رکھا تھا۔ اس دور میں انسانی حقوق کا کہیں ذکر نہیں تھا کیونکہ انسانی حقوق کا فلسفہ مغربی استعمار کے مفادات کے منافی تھا بلکہ مغربی استعمار کی نفی کرتا تھا۔ اس طرح مغربی ممالک کئی صدیوں تک پسماندہ ممالک کو اپنی کالونیاں بنا کر ان کے وسائل کو اپنی صنعتی و تجارتی ترقی کے لئے استعمال کرتے رہے۔ اگر آپ لندن، پیرس اور روم جیسے خوبصورت شہروں کی بڑی بڑی شاہراہوں، عمارات اور صنعتی مراکز کی بنیادوں میں جھانکیں تو ان میں سے آپ کو اپنے بزرگوں کے خون اور پسینے کی خوشبو آئے گی۔

جب ان استعماری قوتوں کو آزادی کی تحریکوں کے سامنے ہتھیار ڈال کر غلام

ممالک سے رخصت ہونا پڑا تو اس کے ساتھ ہی انہیں جمہوری اقدار اور انسانی حقوق کا خیال آیا۔ چنانچہ انسانی حقوق کے دفاع کے لئے عالمی سطح پر انجمنیں بنائی گئیں۔ کل تک انسانوں کو حیوانوں سے کم تر سمجھنے والے چند ہی برسوں میں انسانی حقوق کے ٹھیکے دار بن گئے۔ گویا پرانا شکاری نیا جال لے کر آ گیا۔ اس وقت بعض ممالک میں یہ انجمنیں بہت مفید کام کر رہی ہیں لیکن لطف یہ ہے کہ جن ممالک میں اولاد آدم کو مغربی اقوام کی ملی بھگت سے کچلا جا رہا ہے وہاں بھی انسانی حقوق کی انجمنیں موجود ہیں جو بے کار ہیں اور غیر موثر ہیں۔

گزشتہ چند برسوں سے اولاد آدم کے انسانی حقوق کی حفاظت کی اجارہ داری امریکہ کے پاس ہے۔

ادھر مغربی میڈیا نے انسانی حقوق کو ایک آئیڈیالوجی بلکہ مذہب کا درجہ دے دیا ہے جس سے امریکہ کو یہ استحقاق حاصل ہو گیا ہے کہ وہ کسی بھی ایسے ملک کے اندرونی معاملات میں دخل دے سکتا ہے بلکہ اسے دہشت گرد قرار دے کر سزا کا حقدار ٹھہرا سکتا ہے' جہاں انسانی حقوق پر زد پڑتی ہو۔ کس ملک میں انسانی حقوق پامال ہو رہے ہیں؟ اس کا فیصلہ بھی امریکہ ہی کرے گا۔ چنانچہ امریکہ عراق پر بمباری کر کے سینکڑوں معصوم شہریوں کو موت کی نیند سلا دے تو وہ انسانی حقوق کے حوالے سے درست اقدام قرار دیا جاتا ہے لیکن بوسنیا میں ہزاروں معصوم مسلمان سربیائی ظلم کی بھینٹ چڑھ جائیں تو امریکہ کے ضمیر میں خلش نہیں ہوتی کیونکہ بوسنیا مسلمان ملک ہے۔ اس طرح پاکستان اگر کشمیر کے مظلوم مسلمانوں کی اخلاقی مدد کرے تو وہ سزا کا مستحق ہے لیکن بھارت اگر ہزاروں مسلمانوں کو گولی کا نشانہ بنا دے' تو اس سے چشم پوشی برتی جائے گی۔

انسانی حقوق کے حوالے سے مجھے ایک دلچسپ واقعہ یاد آیا۔ جون ۱۹۹۱ء میں ایک بین الاقوامی سیمینار کے ضمن میں مجھے سان فرانسسکو جانے کا موقع ملا۔ اس سیمینار میں ایشیائی ممالک کے سکالرز کے علاوہ مختلف امریکی یونیورسٹیوں سے بھی ممتاز پروفیسر صاحبان بلائے گئے تھے۔ سیمینار کے آغاز سے ایک روز قبل میں نے ٹیلی ویژن آن کیا تو ایک دلچسپ خبر مع تبصرہ سننے کو ملی۔ کیلی فورنیا کی ریاست میں جنگلات کے وسیع ذخیرے پائے جاتے ہیں۔ کیونکہ وہاں عمارات کی تعمیر میں لکڑی بہت زیادہ استعمال ہوتی ہے اس لئے سال بھر ان جنگلوں میں کٹائی کا عمل جاری رہتا ہے۔ خبر یہ تھی کہ کٹائی کے دوران ماہرین جنگلات کو اچانک پتہ چلا کہ اس جنگل

میں ایک الو صاحب نے اپنا مستقل "گھر" بنا رکھا ہے اور جب سے درختوں کی کٹائی کا سلسلہ شروع ہوا ہے الو صاحب اداس رہنے لگے ہیں۔ الو کی اداسی کی خبر سے اس علاقے میں احتجاج ہوا اور کیلی فورنیا کی حکومت نے جنگل کی کٹائی روک دی جس سے لکڑی کی قیمت میں اضافہ ہو گیا اور گھروں کی تعمیر قدرے مہنگی ہو گئی۔ میں نے یہ ساری خبر اور اس پر تبصرہ ٹیلی ویژن پر سنا اور گہری سوچ میں ڈوب گیا۔

اگلے دن سیمینار کے دوران چائے کا وقفہ ہوا تو میں نے ممتاز امریکی پروفیسر صاحبان سے اس خبر کا تذکرہ کیا۔ وہ پہلے ہی اس سے آگاہ تھے لیکن جب میں نے ان سے ذکر کیا تو ان کے چہرے خوشی سے گلاب کی مانند کھل گئے۔ اس صورت حال سے فائدہ اٹھاتے ہوئے میں نے یہ سوال داغ دیا "کہ آپ نے ایک پرندے کی اداسی کی خاطر جنگل کی کٹائی روک کر لکڑی کی قیمت میں اضافہ برداشت کر لیا لیکن چار پانچ ماہ قبل جب عراق کے معصوم شہریوں پر بموں کی بارش کی جا رہی تھی تو آپ کیوں خاموش رہے کہ کیا آپ کو ایک جانور مسلمان کی زندگی سے زیادہ عزیز ہے؟" میرے اس سوال سے چہروں کے رنگ اڑ گئے۔ اس ایک واقعے سے آپ امریکہ کی انسانی حقوق سے کمٹ منٹ کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔

بات یہاں سے چلی تھی کہ آج کا دور میڈیا کا دور ہے۔ میڈیا بدقسمتی سے یہودیوں کے قبضے میں ہے اور یہودیوں کا نشانہ بہرحال اسلام اور مسلمان ہیں۔ اب جبکہ مغربی ممالک غیر ترقی یافتہ ممالک سے بوریا بستر لپیٹ کر رخصت ہو چکے ہیں تو انہوں نے ان ممالک پر حکمرانی کا ایک نیا طریقہ وضع کیا ہے اور وہ طریقہ ہے میڈیا کے زور پر ذہنوں پر حکومت کرنا۔ نصف صدی قبل جسمانی غلامی کا دور تھا جبکہ موجودہ زمانہ ذہنی غلامی کا زمانہ ہے۔ جسمانی غلامی بھی ہمارا مقدر تھی اور ذہنی غلامی بھی ہماری ہی قسمت کا حصہ ہے۔ سوچیے تو سہی کہ اس کی وجوہ کیا ہیں؟

اسی پس منظر میں مغربی میڈیا جب چاہتا ہے کوئی نئی اصطلاح اور کوئی نیا شوشہ چھوڑ دیتا ہے۔ دنیا کے بہترین رسائل جن میں ادبی' تحقیقی اور سیاسی پرچے شامل ہیں' مغربی ممالک سے شائع ہو کر ساری دنیا میں پھیل جاتے ہیں۔ ان رسائل میں اکثر اوقات ایک خاص نقطہ نظر پیش کیا جاتا ہے جو مغربی دنیا کے مفادات کے عین مطابق ہوتا ہے۔ ہم سب جانتے ہیں کہ عالمی شہرت کے رسالے ٹائم' اکانومسٹ اور نیوز ویک پر یہودی لابی غالب ہے۔ یہ رسالے ہر

ہفتے بین الاقوامی سیاست پر تبصرے کرتے اور تجزیے شائع کرتے ہیں جنہیں ہم من و عن مقدس تحریر سمجھ کر یوں قبول کر لیتے ہیں کہ ان کے سیاق و سباق پر غور ہی نہیں کرتے۔ پھر ہر محفل میں ان کے حوالے دے کر حاضرین محفل کو متاثر کیا جاتا ہے۔ لطف یہ ہے کہ خود حاضرین بھی ان تبصروں کو ٹائم اور نیوز ویک کے حوالے سے حرف آخر سمجھ کر قبول کر لیتے ہیں۔ ہم نے کبھی یہ سوچنے کی زحمت نہیں کی کہ عراق ہو' ایران ہو یا بوسنیا' یہ رسائل اپنے تجزیوں میں ڈنڈی ضرور ماریں گے اور کسی نہ کسی طرح اسلام اور مسلمان سے اس طرح چٹکی ضرور لیں گے کہ قاری کو محسوس بھی نہ ہو اور الفاظ اپنا کام بھی کر جائیں۔ عراق کویت جنگ اور انقلاب ایران کے دوران ان رسائل نے اپنا بھرپور کردار سرانجام دیا اور عالمی رائے عامہ کو اپنی ضروریات کے سانچے میں ڈھالا۔ صرف میڈیا ہی کا کمال ہے کہ کوئی بھی اسلامی ملک اپنے موقف میں کتنا ہی حق بجانب کیوں نہ ہو عالمی سطح پر معذرت خواہانہ رویہ اختیار کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے اور وہ سربراہان حکومت جو مغربی مفادات کے خلاف کام کرتے ہیں انہیں تمسخر کا نشانہ بنا دیا جاتا ہے۔ غور کیجئے تو محسوس ہو گا کہ یہ ایک طرح سے ہماری غلامانہ ذہنیت کی علامت ہے۔

کبھی کبھی یوں بھی ہوا ہے کہ جب کسی ناقابل قبول حکمران کو بدلنا مقصود ہوتا ہے تو میڈیا سے ہراول دستے کا کام لیا جاتا ہے وہ اس طرح کہ مغربی میڈیا بڑی طاقتوں کی خفیہ ایجنسیوں کی ملی بھگت سے ایسے حکمرانوں کی ذاتی زندگی اور قومی کردار کے بارے میں من گھڑت کہانیاں شائع کرتا ہے اور آزادی اظہار کے نام پر ان شخصیات کی اس طرح کردار کشی کی جاتی ہے کہ نہ ہی صرف عالمی سطح پر ان کا امیج خراب ہوتا ہے بلکہ خود ان ممالک کے عوام بھی اپنے حکمرانوں سے نفرت کرنے لگتے ہیں۔ آپ نے اکثر مشاہدہ کیا ہو گا کہ بڑی طاقتوں کے لئے "ناپسندیدہ حکمرانوں" کے بارے میں عجیب و غریب خفیہ داستانیں پھیلائی جاتی ہیں جبکہ اپنے حواری اور پسندیدہ حکمرانوں کی ایسی حرکات چھپائی جاتی ہیں۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ موجودہ دور میں میڈیا کا کردار فیصلہ کن حیثیت اختیار کر گیا ہے اور جو مقاصد ماضی میں فوجی یلغار سے حاصل کئے جاتے تھے وہ مقاصد اب میڈیا کی یلغار سے حاصل کئے جا سکتے ہیں۔

مغربی میڈیا کی مہربانی سے ایک مردہ اصطلاح میں جان ڈالی گئی اور دیکھتے ہی دیکھتے ایک متروک اصطلاح پوری دنیا میں مقبول ہو گئی۔ وہ اصطلاح ہے "فنڈا مینٹالزم" یعنی "بنیاد پرستی"۔ امریکہ اور انگلستان میں شائع شدہ انگریزی لغات کے مطابق "فنڈا مینٹالزم" کا

مطلب ہے "عیسائیت کے پرانے اعتقادات پر یقین رکھنا"--- "موجودہ عیسائیت جو سائنس سے متاثر ہے' اس کے مقابلے میں پرانی تعلیمات اور بائبل کے اصل الفاظ کو ماننا"--- عیسائیت میں تو بنیاد پرستی سمجھ میں آتی ہے" کیونکہ عیسائیت میں وقت کے ساتھ ساتھ خاصی تبدیلی آئی ہے بلکہ خود بائبل بھی اصلی حالت میں موجود نہیں رہی لیکن جہاں تک اسلام کا تعلق ہے ہمارا ایمان ہے کہ اسلام بدلا ہے نہ قرآن اور نہ ہی قرآن قیامت تک بدلے گا۔ اسلام کے بنیادی عقائد وہی ہیں جو ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بتائے تھے۔ اگرچہ اسلام میں مذہبی فرقوں کی کمی نہیں لیکن اختلاف تفصیلات پر ہے نہ کہ بنیادی عقائد پر۔ چنانچہ اسلام میں دراصل بنیاد پرستی کا تصور اس طرح موجود نہیں جس طرح عیسائیت میں ہے لیکن مغربی میڈیا نے اسلام میں بنیاد پرستی کی اصطلاح ایجاد کر کے ان مسلمانوں کو نفرت اور تضحیک کا نشانہ بنایا ہے جو عملاً مسلمان ہیں۔ میرے نزدیک اسلام میں بنیاد پرستی کا مطلب اسلام کے بنیادی عقائد پر عمل کرنا ہے یعنی ہر وہ مسلمان جو نماز پڑھتا ہے' روزے رکھتا ہے اور زکوۃ ادا کرتا ہے' اسے مغربی میڈیا بنیاد پرست مسلمان کہے گا۔ ہمارے ایک بزرگ دوست کے بقول اگر مسلمان نماز پڑھتا ہے تو وہ بنیاد پرست ہے لیکن اگر وہ تہجد پڑھتا ہے تو پھر وہ بہرصورت "دہشت گرد" ہے۔

کیا آپ نے کبھی غور کیا کہ یہ اصطلاح چند برس قبل افغانستان کی جنگ کے حوالے سے استعمال ہونی شروع ہوئی اور چند ہی برسوں میں اس نے دنیائے اسلام کو معذرت خواہانہ رویہ اختیار کرنے پر مجبور کر دیا۔ مغربی میڈیا نے نہایت ہوشیاری سے بنیاد پرستی کا مطلب' جاہل' ترقی دشمن' دہشت گرد' دقیانوسی اور کٹر نظریات کے مفہوم کے طور پر پیش کیا بلکہ اس قدر زور و شور سے اس کا شور مچایا کہ ہر مسلمان ہاتھ باندھ کر کہنے لگا کہ حضور میں بنیاد پرست نہیں ہوں حالانکہ بنیاد پرستی کا مطلب فقط اسلام کے بنیادی عقائد پر عمل کرنا ہے' اور اس کا مطلب ہرگز دہشت گردی یا دقیانوسی نہیں۔ چنانچہ اب جب بھی کوئی مغربی صحافی اسلامی ممالک میں جاتا ہے اور سربراہان حکومت یا دوسری اہم ملکی شخصیات سے یہ سوال پوچھتا ہے کہ کیا آپ بنیاد پرست ہیں تو جواب ملتا ہے کہ ہم بالکل بنیاد پرست نہیں۔ ہم اس پر لعنت بھیجتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہم اسلام کے بنیادی ارکین پر یقین رکھتے ہیں نہ عمل کرتے ہیں۔

خود مغربی میڈیا بنیاد پرستی کا لیبل لگانے میں کس قدر انصاف سے کام لیتا ہے

اس کا اندازہ صرف اس ایک مثال سے لگایئے کہ جب تک گلبدین حکمت یار افغانستان میں روسی قبضے کے خلاف لڑ رہا تھا جس سے امریکی مفادات حاصل ہوتے تھے' تو وہ جنگ آزادی کا ہیرو تھا لیکن جب روس کی شکست کے بعد اس نے امریکی لائن پر چلنے سے انکار کیا تو مغربی میڈیا نے اسے بنیاد پرست کہہ کر مسترد کر دیا۔ گویا مغربی ممالک اپنے میڈیا کو ایک طرح سے ہتھیار کے طور پر استعمال کر رہے ہیں جو ایٹم بم سے کم خطرناک نہیں ہے۔

مغربی میڈیا نے اسلامی بنیاد پرستی کے تصور کو جس طرح مسخ کیا ہے اور اس کا مفہوم بدل کر دنیائے اسلام کو معذرت خواہ بنا دیا ہے اس کی ایک تازہ مثال پاکستان کے کمیشن برائے انسانی حقوق کی وہ رپورٹ ہے جس کا ایک حصہ بعض اردو اخبارات میں شائع ہوا ہے۔ مجھے یہ رپورٹ پڑھنے کا موقعہ نہیں ملا لیکن اس کے ایک فقرے نے مجھے چونکا دیا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ کمیشن نے اپنی رپورٹ میں اپنی اس تحقیق کی وضاحت کی ہو اور اپنے نتائج کے حق میں دلائل دیئے ہوں لیکن بہرحال یہ فقرہ قابل غور ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ میڈیا کس طرح اسلامی بنیاد پرستی کا حلیہ بگاڑ رہا ہے۔

اخبارات کے مطابق رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ "خواتین کے ساتھ ہونے والی زیادتیوں کی وجہ اسلامی بنیاد پرستی کا بڑھتا ہوا رجحان ہے۔" اب ذرا اس کا تجزیہ کیجئے کہ اسلامی بنیاد پرستی کے رجحان کا مطلب کیا ہے۔ اسلامی بنیاد پرستی کا مطلب انسان کا مذہبی ہونا اور شریعت کا پابند ہونا ہے۔ گویا اس رپورٹ کے مطابق پاکستان میں مذہب کا رجحان بڑھ رہا ہے جس کے سبب عورتوں سے زیادتی کے مقدمات میں اضافہ ہو رہا ہے۔ غور کیجئے کہ کس قدر خطرناک ہے یہ بات۔

اس کے برعکس ہم سمجھتے ہیں کہ صحیح اور سچا مسلمان' جسے عاقبت کا خوف ہو' جو شریعت کا پابند ہو اور جسے یوم حساب کا احساس ہو وہ ایسا فعل کرنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا کجا یہ کہ اس میں برائی کا رجحان بڑھے۔ اسی طرح وہ اسلامی ممالک جہاں اسلامی شرعی سزائیں نافذ ہیں اور جنہیں بنیاد پرستی کا طعنہ دیا جاتا ہے ان معاشروں میں عورت جس قدر محفوظ ہے اس کا تصور بھی مغرب کے آزاد معاشرے میں نہیں کیا جا سکتا۔ سعودی عرب میں عورتوں سے زیادتی کے واقعات بہت ہی کم ہوتے ہیں' جبکہ نیویارک میں ہر پانچ منٹوں کے بعد عورت سے زیادتی کی واردات رپورٹ ہوتی ہے۔ کیا امریکہ بھی بنیاد پرست ہے کہ وہاں عورتوں سے زیادتی کے

واقعات میں اضافہ ہو رہا ہے۔ اگر ایسا نہیں تو مغربی ممالک میں تمام تر مادر پدر آزادی کے باوجود عورتوں سے زیادتی کے واقعات اتنی بڑی تعداد میں کیوں ہوتے ہیں؟

میں اسی پہلو پر مزید لکھ کر رپورٹ کے بارے میں غلط فہمیاں پیدا نہیں کرنا چاہتا۔ مقصد فقط یہ ثابت کرنا تھا کہ موجودہ دور میڈیا کا دور ہے' میڈیا کی لگام مغرب کے ہاتھ میں ہے اور وہ میڈیا کے زور پر ہمارے ذہنوں پر چھایا ہوا ہے۔ بنیاد پرستی کا پراپیگنڈہ اسی مہم کا حصہ ہے حالانکہ سچی بات یہ ہے کہ مغرب اسلام کے احیاء اور اسلامی ممالک میں عوامی سطح پر ابھرتی ہوئی مذہبی لہر سے خوفزدہ ہے جس کا مقابلہ کرنے کے لئے مغربی میڈیا نے بنیاد پرستی کے خلاف محاذ کھول رکھا ہے لیکن افسوس یہ ہے کہ ہمارا پڑھا لکھا طبقہ مغرب سے اس قدر متاثر ہے کہ وہ مغربی نظریات' تصورات اور اصطلاحیں آنکھیں بند کر کے قبول کر لیتا ہے۔ گویا ہم نے مغرب سے جسمانی غلامی سے تو نجات حاصل کر لی ہے لیکن ذہنی غلامی سے نہیں---- ذہنی غلامی سے نجات حاصل کرنے کے لئے بھی اسی طرح تحریکیں چلانے کی ضرورت ہے جس طرح ہم نے آزادی کے حصول کے لئے تحریکیں چلائی تھیں۔

○

ازہر منیر کا یہ مضمون گفتگو کے بہت سے دروازے وا کرتا ہے۔ ہم اس موضوع پر موصول ہونے والے مضامین کا خیر مقدم کریں گے۔ (ادارہ)

# گم گشتہ علمی خزانے کا نوحہ

ازہر منیر

ایک زمانہ تھا جب یورپ کے کچھ حصوں (یونان اور روم) میں تہذیب، علم، فلسفے اور سائنس کی حکمرانی تھی اور وہاں ہر طرف ان کی روشنی پھیلی ہوئی تھی جبکہ ایشیا، امریکہ اور افریقہ کے بیشتر ممالک جہالت کی تاریکی میں ڈوبے ہوئے تھے۔ پھر ایک دور آیا جب عرب یا مسلم دنیا میں اسی علم، فلسفے اور سائنس کی روشنی پھیلی جبکہ خود (مسیحی) یورپ جہالت کی تاریکی میں ڈوب گیا۔ وقت بدلا اور یورپ ایک بار پھر اس روشنی سے منور ہو گیا جبکہ مسلم دنیا دوبارہ تاریکیوں میں غرق ہو گئی۔

ہمارا مسلمان مورخ، مولوی اور دانشور اس بات کو ذرا مختلف انداز میں بیان کرتا ہے وہ اولیں دور میں یورپ (یا دنیا کے کسی اور خطے) میں علم کی روشنی کا تذکرہ سرے سے گول کر دیتا ہے اور بات عرب اور مسلم دنیا سے شروع کرتا ہے اور بتاتا ہے کہ وہاں علم اور حکمت کی روشنی کیونکر پھیلی اور حکمت، دانائی، فلسفے اور سائنس کے کیسے کیسے عالم اور نابغہ روزگار پیدا ہوئے۔ وہ اس کی وجہ یہ بیان کرتا ہے کہ یہ سب دین اسلام اور قرآن کا اعجاز تھا کہ

مسلمانوں نے سائنس اور فلسفے کے میدانوں میں اس قدر ترقی کی۔ پھر وہ اس بات پر افسوس کا اظہار کرتا ہے کہ مسلم دنیا آج علم کی اس روشنی سے محروم ہے جبکہ یورپ اور پوری مغربی دنیا اس کی ضیاء سے منور ہے۔ وہ اس تبدیلی کی جو وجوہ بیان کرتا ہے ان کے مطابق یورپ ہم سے یہ علم چرا یا چھین کر لے گیا ہے' وہ ہمارے ہی افکار کی خوشہ چینی کر رہا ہے اور اس کی تمام تر ترقی ہماری اور ہمارے اسلاف کی مرہون منت ہے جبکہ جبر یا مکاری سے اس نے ہم کو ہمارے اس ورثے سے محروم کر دیا ہے اور ہمیں مسلسل اس حالت میں رکھ رہا ہے۔ یہ بیان کرنے کے ساتھ وہ اقبال کا یہ شعر دوہراتا ہے:

مگر وہ علم کے موتی' کتابیں اپنے آباء کی
جو دیکھیں ان کو یورپ میں تو دل ہوتا ہے سی پارہ

اس کے خیال میں اس شعر میں اسی نظریے' خیال یا ادعا کو دوہرایا گیا ہے یعنی مغرب ہم سے ہمارا ورثہ چھین کر لے گیا ہے۔ اور یہ شعر کہتے ہوئے علامہ کے ذہن میں ٹھیک ٹھیک یہ خیال نہ ہو تو بھی ان کا عام قاری اس کا یہی مطلب لیتا ہے اور اسے اسی مفہوم میں بیان کرتا ہے۔

کیا بات اسی قدر سادہ ہے اور صورت حال یہی ہے جو ہمارا مذہبی پیشوا' مورخ اور دانشور بیان کرتا ہے؟ اس بات کے جواب کے لئے ہمیں واقعات اور وجوہ کو گہرائی میں جا کر اور غور سے دیکھنا اور پرکھنا ہو گا تاکہ ایک طرف ہم ان اسباب کے بارے میں جان لیں جن کی بدولت عالم اسلام کا ورثہ اور قسمت پسماندگی' جہالت اور ترقی معکوس رہ گئی ہے جبکہ دوسری طرف اگر ہم اس صورت حال کو بہتر بنانے کی تدابیر سوچنا چاہیں تو ایسا کر سکیں۔ صورت حال کو سمجھنے کے لئے ہمیں ایک نظر اس ماحول پر ڈالنا ہو گی جس میں ان علوم نے مختلف خطوں میں ترقی کی اور اس کے ساتھ اس ماحول پر بھی جو انہیں خطوں میں ان کے زوال یا خاتمے کا سبب بن گیا۔

جن مختلف ادوار میں یورپ (یونان بعد ازاں روم) مسلم (عرب) دنیا اور پھر یورپ یا پوری مغربی دنیا ان علوم سے فیض یاب ہوئی اور اس کی بدولت وہاں ذہنی اور مادی ترقی ہوئی ان خطوں میں اس دور کی سب سے بڑی خصوصیت روشن خیالی' کشادہ نظری اور بے تعصبی تھی اور اس کے ساتھ وہاں سیکولر فضا کا ہونا بھی۔ سیکولر کا مطلب بے دین یا ملحد نہیں جیسا کہ

خیال کیا جاتا ہے یا کچھ لوگ جان بوجھ کر اور حقائق کو مسخ کرتے ہوئے اس کا یہ مفہوم بیان کرتے ہیں نہ سیکولر ازم کا مطلب بے دینی اور الحاد ہے تاہم چونکہ اس بارے میں میرے ایک اور مضمون (سیکولر ازم کیا ہے) میں تفصیلاً" بحث کی جا چکی ہے اور اس کا یہاں اعادہ اس مضمون کی بے جا طوالت کا باعث بن جائے گا اس لئے یہاں فقط اس قدر بیان کر دوں کہ سیکولر کا مطلب بے دین نہیں نہ اس کا کسی دین یا مذہب سے کوئی تضاد یا تصادم ہے۔ تاہم اگر اس کا مطلب بیان کرنے کے لئے دین کا لفظ لانا ضروری ہو تو اس صورت میں یہ لا دین نہیں "ہر دین" ہے یعنی ایسی ریاست یا خطہ جس میں تمام ادیان کے ماننے والوں کو اپنے عقائد پر چلنے کی آزادی حاصل ہو اور کسی سے اس کے عقیدے کی بناء پر امتیاز نہ برتا جائے۔ اور علمی لحاظ سے سیکولر فضا کا مطلب وہ صورت حال ہے جس میں کوئی مولوی' پنڈت' پادری یا ربیائی ان معاملات میں دخل دینا اور ان کو مذہبی نقطہ نظر سے پرکھنا شروع نہ کر دے یا ان کے بارے میں فیصلے اور فتوے صادر نہ کرنے لگے جن کا مذہب سے کسی نوع کا کوئی تعلق یا واسطہ نہیں' نہ وہ مذہب اور مذہبی پیشوا کے دائرہ کار یا اختیار میں آتے ہیں۔ مثلاً ریاضی' طبیعیات' کیمیا' حیاتیات' ارضیات وغیرہ سیکولر علوم ہیں اس لئے کہ ہمیں ان کا علم کسی مذہبی صحیفے یا کتاب کے ذریعے نہیں بلکہ صدیوں کے انسانی غور و فکر' تجربات اور جستجو کے ذریعے حاصل ہوتا ہے اور اگر مذہبی پیشوا (مولوی' پادری' پنڈت یا ربیائی) ان کے بارے میں خاموش رہتے ہیں اور خوانخواہ اس معاملے میں دخل اندازی نہیں کرتے (کیونکہ یہ ان کے دخل اور دائرہ اختیار سے باہر ہیں) تو اسے ہم علمی لحاظ سے سیکولر فضا کہیں گے۔

جن ادوار میں یونان' عرب (مسلم) دنیا اور پھر دوبارہ یورپ میں فلسفہ اور سائنس کے علوم نے عروج حاصل کیا اور اس کی بدولت ان خطوں میں بسنے والی اقوام نے ذہنی اور مادی حوالوں سے ترقی کی ان ادوار میں ان خطوں کی علمی فضا سیکولر تھی۔ یونان (اور روم) میں بھی' عرب (مسلم) دنیا میں بھی اور پھر جدید عہد کے یورپ میں بھی۔

یونان اور روم کی علمی ترقی کا زمانہ وہ ہے جب مسیحیت نے ابھی وہاں قدم رنجہ نہیں فرمایا تھا اور نہ ابھی وہاں مذہب اور سیاست کی یکجائی کا تصور پہنچا تھا۔ یہ تصور تو بہت بعد میں پادریوں کے ورود مسعود کے ساتھ وہاں گیا۔ اس زمانے میں مذہب وہاں معبدوں تک محدود تھا اور اگرچہ اس کے بیان کردہ اخلاقی اصول زندگی کے ہر شعبے میں کارفرما تھے تاہم یہ فلسفے اور

سائنس کے اصولوں کو مذہب کے حوالے سے پرکھنے اور ان کے بارے میں فتوے جاری کرنے کا کام نہیں کرتا تھا۔ چنانچہ اس فضا میں فلسفیوں' سائنس دانوں اور سیکیولر علوم کے دیگر علماء اور ماہرین کے لئے اپنے افکار و خیالات کے اظہار' بحث مباحثے اور سائنسی تجربات کرنے کے لئے مواقع موجود تھے۔ اسی طرح مسلم دنیا میں یہ دور عرب میں عباسی (اور سپین میں اموی) خلفاء کا ہے جب مذہبی پیشواؤں کا امور مملکت کے معاملے میں کوئی دباؤ یا دخل نہیں تھا اور تھا تو بس اس قدر کہ جو خلیفہ کی منشاء ہو اس کے مطابق فتویٰ جاری کر دیں (جن مذہبی پیشواؤں نے خلیفہ کی منشاء کے خلاف فیصلے دیئے یا اس کی رضا کے برعکس خیالات کا اظہار کیا ان کا حکومت میں نہ صرف یہ کہ کسی قسم کا کوئی دخل یا خلیفہ پر کوئی دباؤ نہیں تھا بلکہ اس کے برعکس وہ بیشتر خلیفہ کی ناپسندیدگی اور غضب کا شکار رہے۔)

یہ مکمل سیکیولر (بے تعصب) فضا نہیں تھی کیونکہ مسلم دنیا میں اس وقت شہنشاہیت اور آمریت کا دور دورہ تھا اور لوگوں کو خیالات کے اظہار کی مکمل آزادی حاصل نہیں تھی۔ تاہم یہ فضا اس حد تک سیکیولر ضرور تھی کہ جب فتوحات کے بعد یونانی (اور کچھ ہندوستانی' بابلی' مصری اور ایرانی بھی) فلسفہ اور سائنسی علوم کی کتابوں کے ترجمے کے نتیجے میں وہاں پہنچے تو اس فضا کی بدولت ان علوم کی تعلیم و تحصیل اور اس کے حوالے سے تجربات' بحث مباحثے یا خیالات کے آزادانہ اظہار پر کوئی پابندی نہ لگائی گئی۔ چنانچہ یہ علوم وہاں خوب پھلے پھولے اور مسلمانوں نے ان میں اچھے خاصے اضافے کیے اور انہیں ترقی دی۔

یورپی ممالک میں یہ علوم دوبارہ اس وقت پہنچے جب وہاں چرچ کی حاکمیت ختم ہو چکی تھی اور ان علوم کی تعلیم و ترقی کے لئے فضا ہموار ہو رہی تھی۔ یا یوں کہیے کہ مذہبی پیشواؤں کی حاکمیت کے خاتمے نے ان علوم کی (اضافوں کے ساتھ) واپسی اور ترقی کے لئے راہ ہموار کی۔ چنانچہ وہاں ان علوم نے بے پناہ ترقی کی اور اب تک کر رہے ہیں اور ان کی بدولت ان اقوام نے نہ صرف اس دنیا کے ممالک کی امامت کا منصب سنبھالا بلکہ خلا میں پرواز کی اور چاند کی سطح پر اور اس سے بھی آگے تک جا پہنچیں۔

لیکن اس معاملے کا ایک اور پہلو بھی ہے۔ یہ کہ جن علاقوں میں یہ علوم پرورش پاتے رہے تھے وہاں سے یہ یکسر ختم اور غائب کیوں ہو گئے؟ سب سے پہلے ہم یورپ کو لیتے ہیں۔ ان علاقوں میں ایک عرصہ تک سیکیولر علمی فضا اور فلسفے اور سائنس کی حکمرانی رہی۔

اس کے بعد جوں جوں مذہبی حلقوں کی حکمرانی کا سلسلہ بڑھتا گیا اور پاپائیت آتی گئی یہ سیکولر فضا ختم ہوتی چلی گئی اور اس کے ساتھ ہی فلسفے اور سائنس کے علوم کی تعلیم اور ترقی کے مواقع بھی ختم ہوتے چلے گئے۔ یہاں تک کہ وہ دور آ گیا جب ان علوم کی تعلیم کفر کے مترادف اور قابل گردن زدنی قرار دی جانے لگی۔ ظاہر ہے اس فضا میں یہ علوم وہاں زندہ نہیں رہ سکتے تھے چنانچہ رفتہ رفتہ وہ اس خطے میں دم توڑنے لگے اور صرف کتابوں میں زندہ رہ گئے۔۲۔

لیکن خوش قسمتی سے دوسری طرف مسلم دنیا میں عباسی خلفاء (یا سپین کے اموی خلفاء) کے دور میں وہ سیکولر علمی فضا پیدا ہو گئی جس کی بدولت وہاں ان علوم کی تعلیم و تحصیل کے مواقع پیدا ہو گئے چنانچہ اس دور میں مسلمانوں نے ان علوم کی نہ صرف تعلیم حاصل کی بلکہ ان کو ترقی بھی دی۔ تاہم جوں جوں خلیفہ سیاسی لحاظ سے کمزور اور بے اختیار ہوتا چلا گیا اور اقتدار پر اس کی گرفت کمزور ہونے لگی' مذہبی پیشواؤں کے اقتدار اور حکومتی معاملات میں ان کے اثر و رسوخ میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ یوں وہ علمی فضا ختم ہوتی چلی گئی جس میں یہ علوم زندہ رہ سکتے تھے۔ جبکہ دوسری طرف یورپ میں مذہبی پیشواؤں کے اقتدار کے زوال کے ساتھ وہاں دوبارہ سیکولر علمی فضا پیدا ہوئی اور فلسفے اور سائنس کی تعلیم اور ترقی کے مواقع پیدا ہوتے چلے گئے۔ بعد میں امریکہ' جاپان اور چین میں بھی مناسب اور موزوں حالات پیدا ہوئے اور ان تمام خطوں میں سائنس اور فلسفے کے علوم کی تعلیم اور ترقی کے لئے صورت حال سازگار ہو گئی جس کے بعد ان خطوں میں بھی یہ علوم خوب پھلے پھولے اور ان کی مدد سے انہوں نے بے پناہ ترقی کی۔

آگے چلنے سے پیشتر اس بات کا جائزہ لینا ضروری ہے کہ سائنس اور فلسفے کی تعلیم کے لئے سیکولر علمی فضا کیوں ضروری ہے اور یہ علوم ایسے ماحول میں کیوں نہیں پنپ سکتے جس میں معاملات پر مذہبی پیشواؤں کا کنٹرول اور بالادستی ہو؟ اس کی وجوہ متعدد ہیں۔ اول یہ کہ سائنس اور فلسفے کے متعدد نظریات اور انکشافات ایسے ہیں جو مذہبی حلقوں کے مطابق مذہب کی تعلیمات کے خلاف ہیں اور ان کی بدولت مذہبی پیشواؤں کے بیان کردہ کسی نہ کسی مذہبی عقیدے پر ضرب لگتی ہے۔ مثلاً چرچ کے دعوے کے مطابق زمین ساکن ہے لیکن جب سائنس دان کہتے ہیں کہ یہ ساکن نہیں بلکہ متحرک ہے اور پھر تجربات کے ذریعے وہ اپنے اس دعوے کو سچ بھی ثابت کر دیتے ہیں تو ظاہر ہے اس کے نتیجے میں اس مذہبی عقیدے کو ضرب تو لگتی ہے۔

لیکن کیا محض کسی عقیدے کو ٹھیس لگنے سے بچانے کے لئے حواس اور تجربات کے حوالے سے ثابت شدہ علم اور سچائی کو رد کر دیا جائے؟ فلسفیوں' سائنس دانوں اور علماء کا جواب نفی میں ہے جبکہ مذہبی پیشواؤں (مولویوں' پنڈتوں' پادریوں' ربیائیوں) کا جواب صاف نہ سہی مگر بالواسطہ طور پر اثبات میں ہے۔ اگرچہ وہ اس بات کو اپنی مخصوص منطق اور لفاظی میں لپیٹ کر بیان کریں گے۔ یوں مذہب اور سائنس میں نزاع پیدا ہوتا ہے اور اگر کسی معاشرے میں علم کے حصول یا خیالات کے اظہار پر اور قوانین کے اجراء اور حکومتی امور کی انجام دہی کے سلسلے میں مذہبی پیشواؤں کو بالادستی حاصل ہو جائے تو ایسے معاشرے میں سائنس اور فلسفے کا زندہ رہنا ممکن نہیں رہتا۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ چند عشروں یا صدیوں سے نہیں' بلکہ ہزاروں برس سے مذہبی پیشوا کسی نہ کسی صورت اقتدار میں موجود رہے ہیں اور حکمرانوں اور عوام پر ان کا اثر اور دباؤ بلکہ تسلط رہا ہے۔ اس کی وجہ ان کا یہ دعویٰ ہے کہ علم پر صرف اسی ایک حلقے کی اجارہ داری ہے اور عالم سے مراد صرف مذہبی عالم ہیں۔ یہ ادعا اسی صورت قائم رہ سکتا ہے جب مذہبی پیشواؤں کا یہ دعویٰ بھی موجود رہے کہ علم فقط دین کا علم ہے اور اس کے علاوہ علم کی ہر شکل جہالت و گمراہی کا دوسرا نام ہے لیکن اگر مذہبی علم کے علاوہ کسی اور علم کا سچ ہونا بھی ثابت ہو جائے تو پہلے مرحلے کی سلطنت پر مذہبی پیشواؤں کی بلا شرکت غیرے حکمرانی قائم نہیں رہ جاتی اور دوسرے مرحلے پر علم عوام اور اقتدار و صاحبان اقتدار پر ان کے اثرات اور بالادستی میں کمی آ جاتی ہے۔ اور جوں جوں سیکولر یا سائنسی علوم ترقی کرتے اور اپنی سچائی ثابت کرتے جاتے ہیں توں توں مذہبی حلقوں کا اقتدار' بالادستی اور اثر و رسوخ کم سے کم تر ہوتا چلا جاتا ہے۔ اس صورت حال سے بچنے کے لئے مذہبی حلقے ابتداء ہی سے فلسفے' سائنس اور دیگر سیکولر علوم کی مخالفت کرنا شروع کر دیتے ہیں جس کی بدولت ان علوم کی صداقت و افادیت کو منوانا اور ان کی تعلیم و ترقی کے لئے سازگار حالات پیدا کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔

اب آیئے اس طرف کہ وہ کون سے حالات ہیں جو مذہبی حلقوں کے عروج کا باعث بنتے ہیں' ان میں سرفہرست تعلیم یافتہ لوگوں کی شرح میں کمی اور عوام کی جہالت ہے۔ جہالت کا اندھیرا جس قدر گہرا ہو گا مذہبی پیشوا کے لئے عوام کو قابو میں رکھنا اسی قدر آسان ہو گا۔ اور جوں جوں علم کی روشنی پھیلتی جائے گی اسی رفتار سے مذہبی پیشواؤں کے اقتدار میں کمی

آتی چلی جائے گی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی طرف سے دینیات کی تعلیم کے علاوہ باقی تمام علوم کی تعلیم کی مخالفت کی جاتی ہے اور اگر وہ بادل نخواستہ اس کی اجازت دیتے بھی ہیں تو اس شرط کے ساتھ کہ اس کے لئے راہنمائی دین سے حاصل کی جائے۔ جس کا مفہوم یہ بنتا ہے کہ یہ راہنمائی دینی پیشوا سے حاصل کی جائے۔ اب صورت حال یہ ہے کہ سائنس اور فلسفے کے علوم کی ترقی ممکن ہی صرف اس صورت میں ہے جب تمام تعصبات کو بالائے طاق رکھ کر سائنسی تحقیق کی جائے اور تحقیق کرنے والے کے پاؤں کسی عقیدے کی زنجیر سے نہ بندھے ہوں۔ سائنس اور فلسفے کے علوم کی تو بنیاد ہی شک پر ہے یعنی ابتداء ہی میں فیصلہ سنا نہیں دیا جاتا بلکہ اس بارے میں تحقیق کی جاتی ہے اور اس کے بعد حقیقت اور سچائی تک پہنچا جاتا ہے۔

سائنسی تحقیق کے پہلے مرحلے پر مفروضہ قائم کیا جاتا ہے۔ جس کے بعد غور و فکر اور تجربات کئے جاتے ہیں۔ ان تجربوں کے بعد جس نتیجے پر پہنچیں اس کو کلیہ تسلیم کر لیا جاتا ہے۔ تاہم حرف آخر یہاں بھی نہیں ہے بلکہ اگر کوئی دوسرا شخص اس کلیے کی صداقت کو چیلنج کرے اور پھر تجربات سے اپنے دعوے کو سچ بھی ثابت کردے تو اب نیا کلیہ بن جائے گا جسے نہ صرف دوسرے لوگ بلکہ وہ سائنس دان بھی سچ تسلیم کرلیں گے جنہوں نے پہلا کلیہ بنایا تھا۔ یہ ہے سائنسی طریق کار جس کے نتیجے میں سچ نکھر کر سامنے آجاتا ہے اور اس میں کسی قسم کے تعصب کی گنجائش نہیں۔

لیکن اگر اس ریسرچ کو کسی عقیدے سے جوڑ دیا جائے اور تجربات سے پیشتر یعنی پہلے ہی مرحلے پر کلیے اور اصول وضع کرلئے جائیں جیسا کہ مذہبی پیشواؤں کا منشاء اور مطالبہ ہے تو اس کے نتیجے میں اور سب کچھ ہو سکتا ہے مگر سائنس کی تعلیم اور ترقی ممکن نہیں رہتی' نہ ہی اس کے ثمرات سے کسی طور فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ یہ مذہبی پیشواؤں کے عروج اور اقتدار پر ان کے قبضے کا نتیجہ ہے جو جہالت کی تاریکی میں زیادہ اثر و رسوخ حاصل کرلیتے ہیں۔

ان حلقوں کو اس وقت بھی عروج ملتا اور اقتدار میں شراکت حاصل ہو جاتی ہے جب حکمران سیاسی یا انتظامی لحاظ سے کمزور ہوں یا انہیں عوام کی حمایت حاصل نہ ہو۔ ایسی صورت حال میں ان حکمرانوں کا اقتدار ڈانواں ڈول رہتا ہے اور انہیں ہر قدم پر دھڑکا لگا رہتا ہے کہ وہ اقتدار سے اب محروم ہوئے کہ تب۔ ایسے میں وہ کسی بھی طبقے یا گروہ کی مخالفت مول لینا پسند نہیں کرتے۔ نتیجتاً" جاگیردار' تاجر پیشہ' موروثی نواب اور امراء اور ان کے ساتھ ساتھ

مذہبی پیشوا یہ سب طبقے طاقت پکڑ لیتے ہیں۔ ان میں بھی سب سے زیادہ طاقت مذہبی حلقوں کو حاصل ہو جاتی ہے۔ اس لئے کہ حکمرانوں کے علاوہ دوسرے طبقے بھی صورت حال کو جوں کا توں رکھنے (Status Quo) کے خواہش مند ہوتے ہیں اور اس کام میں ان کی مدد مذہبی پیشوا ہی کر سکتے ہیں اور ان کے کام آ سکتے ہیں۔ اور یہ کام کرتے بھی ہیں۔ اس سلسلے میں تاریخ میں بہت سی مثالیں موجود ہیں جب مذہبی پیشواؤں نے عوامی حمایت سے محروم غاصب حکمرانوں کے اقتدار کی ڈولتی کشتی کو سہارا دیا۔ تاہم طوالت کے خوف سے انہیں یہاں درج نہیں کیا جا رہا۔ مختصراً عوامی حمایت سے محروم اور کمزور آمرانہ مارشلائی حکومتیں اس طبقے کی حمایت سے برسراقتدار رہتی ہیں اور خود ان کی خوشنودی کے حصول کے لئے مشائخ کانفرنسیں منعقد کراتی اور اس طبقے کے لوگوں کو زیادہ سے زیادہ مراعات دیتی ہیں۔ جس کے بدلے میں وہ ان کے اقتدار کو مذہبی تقدس عطا کرتے اور انہیں خدا کا سایہ قرار دے دیتے ہیں۔

مذہبی پیشواؤں کی سرپرستی کرنے اور ان کی خوشنودی کے حصول کے علاوہ عوامی حمایت سے محروم یہ آمرانہ حکومتیں خود بھی فلسفے، سائنس اور دیگر علوم کی تعلیم، تحصیل اور ترویج کی حوصلہ شکنی کرتی ہیں بلکہ بیشتر صورتوں میں لوگوں کو جبراً اس کام سے روکتی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ علم کے حصول اور آزادانہ بحث مباحثے کے نتیجے میں عوام باشعور ہوتے چلے جاتے ہیں اور اب اس عقیدے پر ایمان لانے سے انکار کر دیتے ہیں کہ سربراہ حکومت ظل الٰہی ہے جو خدا کے حکم اور اس کی رضا سے ان کے سروں پر مسلط ہے اور وہ جو کچھ کر رہا ہے خدا کی تائید و حمایت سے کر رہا ہے۔ چونکہ اس کا نتیجہ ان حکومتوں کے خاتمے کی صورت میں نکل سکتا ہے سو وہ علم کے حصول کی حوصلہ شکنی کرتی ہیں اور فلسفیوں اور سائنس دانوں کو اپنے افکار کے اظہار سے جبراً روکتی ہیں۔ تاہم یہ حکومتیں جب یہ کام کرتی ہیں تو اس وقت نہ صرف یہ کہ انہیں مذہبی پیشواؤں (علمائے سو) کی پوری پوری تائید و حمایت حاصل ہوتی ہے بلکہ فلسفیوں اور سائنس دانوں کی تکفیر و تضلیل کے فتوے جاری کرنا اور انہیں واجب القتل قرار دینا یہ سب کام بھی مذہبی پیشواؤں ہی کے ذریعے سرانجام پاتے ہیں۔ جس کے نتیجے میں یہ طبقے خود بخود طاقتور ہوتے چلے جاتے ہیں۔

پھر صنعتی معاشرے کی نسبت زرعی معاشرے میں بھی ان حلقوں کو زیادہ عروج اور ترقی حاصل ہوتی ہے۔

تاہم مذہبی پیشواؤں کی یہ ترقی اور عروج کسی بھی وجہ اور سبب سے ہو اس کا نتیجہ بالآخر یہ نکلتا ہے کہ اس قوم اور معاشرے میں وہ سیکولر علمی فضا باقی نہیں رہ جاتی یا قائم نہیں ہو سکتی جس میں سائنس اور فلسفہ پنپ سکیں اور ترقی پا سکیں۔

یہ علمی فضا ایسے معاشروں میں بھی کم یا سرے سے مفقود ہو جاتی ہے جن میں مذہبی حلقوں کے علاوہ کسی اور قسم کا جبر ہو۔ مثلاً ایک ایسا سوشلسٹ معاشرہ جس میں آمریت اور جبر کی فضا ہو ایسے معاشرے کے میدانوں میں ترقی کی رفتار کم ہو جاتی ہے اور لوگوں کو کئی شعبوں میں تحقیق کرنے کی اجازت نہیں ہوتی یا تحقیق کے لئے گائیڈ لائن سرکار کی طرف سے دی جاتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مذہبی حلقوں کے جبر پر قائم معاشرہ ہو یا مذہب دشمن ریاست دونوں سیکولر ازم کے خلاف ہیں اور دونوں اقسام کے معاشرے میں سیکولر علمی فضا کا قیام ممکن نہیں رہ جاتا۔ چنانچہ سابق سوویت یونین میں بھی کچھ شعبوں میں ایسا تھا۔ مثلاً طبیعیاتی سائنس کی ایک برانچ سبر نیٹکس (Cybernetics) ہے جسے سوویت دانشوروں اور حکمرانوں نے اس بناء پر رد کر دیا کہ یہ ایک بورژوا سائنس ہے۔ تاہم وقت نے ثابت کر دیا کہ یہ سائنس اور اس کے نتائج درست ہیں۔ جس کے بعد خود سوویت دانشوروں اور حکام کو بھی اس کی صداقت کو تسلیم کرنا پڑا۔ مگر اس سے قبل اس کے بارے میں ان کا رویہ اور طرز عمل ٹھیک وہی تھا جو مذہبی پیشواؤں کا ہوتا ہے۔ چنانچہ انہوں نے اسے بورژوا سائنس کہہ کر مسترد کر دیا۔ حالانکہ کوئی سائنس بورژوا اور پرولتاری' مسیحی اور غیر مسیحی' ہندو اور غیر ہندو یا اسلامی اور غیر اسلامی نہیں ہوتی۔ نہ سائنس کا کوئی خطہ' قوم' مذہب اور عقیدہ ہوتا ہے۔ مختصر الفاظ میں بیان کیا جائے تو سائنس فطرت کے مطالعے' اس کے اصولوں کی دریافت اور پھر اس دریافت کے ذریعے ایجادات و اختراعات کا نام ہے۔ اور جہاں تک فطرت کا تعلق ہے تو اس کا کوئی مذہب' عقیدہ' قوم یا خطہ نہیں ہوتا اس سے ہر وہ شخص فائدہ اٹھا سکتا ہے جو اس کے بارے میں جستجو اور تحقیق کرے چاہے وہ کسی بھی مذہب یا قوم سے تعلق رکھتا ہو۔ یہ ایک سیدھی سی حقیقت ہے جو ثابت شدہ ہے۔ تاہم جبر پر قائم معاشروں میں یہ بات تسلیم نہیں کی جاتی۔ وہاں سائنس کو مسیحی اور غیر مسیحی' اسلامی اور غیر اسلامی یا بورژوا اور پرولتاری سائنس کہہ کر قبول یا رد کر دیا جاتا ہے چنانچہ وہاں وہ علمی فضا بھی پیدا نہیں ہو سکتی جسے سیکولر فضا کہا جائے اور جو سائنسی تحقیق کرنے کے لئے بے حد ضروری ہے۔

جبر کی فضا کسی مذہب دشمن معاشرے میں بھی ہو سکتی ہے جیسا کہ سوویت یونین کی مثال سے واضح ہے تاہم یہ فضا اس معاشرے میں اپنے عروج پر ہوتی ہے جس میں مذہبی پیشوا (پادری' مولوی' پنڈت' ربیائی) مقتدر ہوں۔ اور مسلم دنیا کا المیہ بھی یہی ہے کہ ایک مختصر سے عرصے کے سوا باقی عرصہ یہاں مذہبی پیشواؤں کی (براہ راست نہ سہی بالواسطہ ہی سہی) حکمرانی رہی ہے اور اب بھی ہے۔

اگرچہ مسلم دنیا میں مذہبی حلقوں کے اقتدار کی کبھی بھی وہ صورت یا شان و شوکت نہیں رہی جو تاریک صدیوں کے دوران یورپی پادریوں کے اقتدار کی تھی۔ مگر انہیں اقتدار میں جس قدر حصہ بھی ملا یا سرکاری معاملات میں ان کا جتنا اثر و رسوخ بھی تھا وہ مخالفین کی زبانیں بند کرنے' انہیں "ناپسندیدہ سرگرمیوں" (فلسفے اور سائنس کی تعلیم دینے اور اس کے حوالے سے تجربات کرنے) سے روکنے اور سائنسی خیالات و افکار کی بیخ کنی کے لئے بہت کافی تھا اور ہے۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مسلم دنیا میں فلسفیانہ اور سائنسی علوم کی تعلیم رفتہ رفتہ ختم ہوتی چلی گئی۔ جبکہ دوسری طرف یورپ میں جب مذہبی پیشواؤں کا اقتدار اور اثر و رسوخ کم ہونے لگا تو وہاں انہیں علوم کی تعلیم و ترقی کے لئے فضا ہموار ہونے لگی۔ جس نے بعدازاں ان قوموں کی تیکنیکی' دفاعی اور دوسرے شعبوں میں دنیا کی دوسری قوموں کا امام بنا دیا۔ یہ وہی علوم تھے جو کبھی یورپ (یونان) سے عرب میں آئے تھے اور چند صدیاں پیشتر تک عربوں کی "ملکیت" تھے مگر اس کے بعد یہ واپس یورپ میں پہنچ کر ان کی "ملکیت" بن گئے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ علم کسی شخص' قوم' ملک یا خطے کی میراث نہیں ہوتا' نہ اس پر کسی کی اجارہ داری ہوتی ہے۔ علم تو اسی شخص کی ملکیت ہے جو اسے حاصل کر لے۔ وہ علم جو ایک زمانے میں ہندوستان' مصر یا یونان کے باشندوں کی ملکیت تھے جب عربوں (مسلمانوں) کے پاس پہنچے تو ہندوستانیوں' مصریوں یا یونانیوں کا ان پر کوئی حق یا اجارہ نہ رہا اور یہ اب گویا عربوں اور مسلمانوں کی ملکیت اور میراث بن گئے۔ لیکن بعدازاں جب یہی علوم یورپی ممالک میں پہنچے تو ان کی "ملکیت" ان کے نام منتقل ہو گئی۔

مگر علم کے ان موتیوں کو مسلم دنیا سے یورپ منتقل کرنے میں یورپ کا کمال اور ہنر تو ہے اس سے زیادہ "کریڈٹ" خود ہمیں اور ہمارے مذہبی پیشواؤں کو جاتا ہے جنہوں نے وہ فضا اور ماحول ختم کر دیا جو علم کی پرورش اور ترقی کے لئے ضروری ہوتا ہے۔ تنگ نظری'

سائنس دشمنی' کفر کے فتوے' مذہب کی عجیب و غریب تعبیریں اور اسے زندگی کے ہر معاملے پر لاگو کرنے کی کوشش' مذہب سے باہر کسی علم اور حکمت کے وجود کو تسلیم نہ کرنا اور مخالفین پر جبر و تشدد' معاشی پابندیاں اور ان کا سماجی مقاطعہ (سوشل بائیکاٹ) ایسے اقدامات ہیں جن کی بدولت ہم سے ہمارا سرمایہ علم چھن گیا۔ اس سے پیشتر سرمایہ یورپ کے پاس تھا اس لئے کہ اس وقت وہاں اس کی پرورش اور تحصیل کے لئے موزوں فضا موجود تھی جب وہاں یہ فضا نہ رہی تو یہ علم بھی نہ رہا بلکہ عربوں (مسلمانوں) کے پاس آگیا جن کے پاس یہ فضا موجود تھی لیکن جب یورپ نے دوبارہ وہ موزوں صورت حال پالی تو ان علوم کو دوبارہ حاصل کر لیا جبکہ مسلم دنیا یہ فضا کھو دینے کی بدولت ان علوم سے بھی محروم ہو گئی۔

بو علی سینا کی "القانون فی الطب" اور "اشارات" یا ابوبکر رازی کی "الطب المنصوری" اور "سرالاسرار" کو یورپ میں دیکھ کر ہمارا دل "سی پارہ" تو ہوتا ہے مگر ہم یہ بات فراموش کر دیتے ہیں کہ ہم ان کتابوں سے خود اپنی کوتاہیوں کی بدولت محروم ہوئے اور آج بھی اسی چیز کی بدولت ان سے محروم ہیں ورنہ ان کی واپسی یا دوبارہ حصول پر تو کوئی پابندی نہیں۔

کوئی قوم کتابوں کی چوری' کتب خانوں کی بربادی' ملکی حالات درست نہ رہنے' طوائف الملوکی' معاشی یا معاشرتی بدحالی وغیرہ کی بناء پر علم سے محروم نہیں ہو جاتی جیسا کہ ہمارے ہاں خیال کیا جاتا ہے اور ہمارے دانشور مسلم قوم کے زوال کی یہ وجہ بیان کرتے ہیں اور ہمیں بتاتے ہیں کہ ہلاکو کے حملے' خلافت کی کمزوری اور معاشی بدحالی نے ہمیں ان علوم اور اس کے ساتھ ساتھ ترقی و خوشحالی سے محروم کر دیا۔ حقیقتاً صورت حال اس سے بہت مختلف ہے۔ کسی قوم کے علم سے محروم ہو جانے کی وجہ سے اس قوم اور معاشرے میں علمی فضا کا خاتمہ ہوتا ہے نہ کہ اس کی معاشی و سیاسی بدحالی۔ اگرچہ آخرالذکر وجوہ کی اہمیت کو بالکل نظرانداز نہیں کیا جا سکتا تاہم پہلی وجہ کے مقابلے میں ان کا رول بہت کم ہوتا ہے اور یہ علمی فضا اور علم کی حوصلہ افزائی کا رویہ ہوتا ہے جو کسی قوم کو علم اور اس کے نتیجے میں ترقی و خوشحالی سے سرفراز کرتا ہے چاہے اس پر کتنے ہی مصائب کیوں نہ آئیں یا اس کی کتنی ہی تباہی اور بربادی کیوں نہ ہو جائے۔ اگر اس میں سیکولر علمی فضا اور علم کی حوصلہ افزائی کا رجحان موجود ہے تو کوئی چیز بھی اسے تباہ نہیں کر سکتی۔

زمانہ حال میں اس کی مثال جرمنی اور جاپان ہیں جو دوسری جنگ عظیم میں بری

طرح تباہ و برباد ہو گئے۔ یہ تباہی ہلاکو کے بغداد پر حملے سے کئی گنا زیادہ شدید تھی کہ اس کے نتیجے میں ان ممالک کی ہر چیز تباہ ہو گئی۔ اور جاپان کے دو شہروں کو تو ایٹم بم کے ذریعے بالکل برباد کر دیا گیا اس کے باوجود ان دونوں ممالک کے عوام نے اپنے اپنے ملک کی نہ صرف نئے سرے سے تعمیر کی بلکہ سائنس' ٹیکنالوجی اور معیشت کے میدانوں میں قابل رشک ترقی بھی کی۔ اس لئے کہ ان ممالک میں باقی سب کچھ بے شک تباہ ہو گیا تھا مگر علم دوستی اور اس کی پرورش کے لئے وہ سیکولر علمی فضا قائم رہی تھی جس نے ہزاروں عالموں کے ختم ہونے کے بعد لاکھوں مزید ایسے عالم پیدا کر دیے جنہوں نے نہ صرف ان تمام علوم پر دسترس حاصل کی جو انہیں ورثے میں ملے بلکہ نئی دریافتیں اور ایجادات بھی کیں۔ معاملہ اگر صرف کتابوں کی چوری کا ہوتا تو مسلم دنیا سے یورپ کو گئی ہوئی "چوری شدہ" کتابیں تو نہ صرف اسی حالت میں بلکہ مزید ترقی اور اضافوں کے ساتھ واپس مل سکتی ہیں۔ مثلاً اس وقت کوئی مسلم ملک جس مغربی ملک سے جو کتاب چاہے بے جھجک اور بغیر کسی رکاوٹ کے خرید سکتا ہے تو وہ ایسا کر کے سائنس کا علم حاصل کیوں نہیں کر لیتا؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ بات صرف کتابوں کے حصول' دولت یا سیاسی و معاشی استحکام کی نہیں' بات اس سیکولر علمی فضا کی ہے جس کے بغیر سائنس کے علم کا حصول اور اس کی ترقی ممکن نہیں۔ علم کے موتی' اپنے آباء کی کتابیں کھونے کا مفہوم یہ ہے کہ اب اس قوم میں وہ علمی فضا نہیں رہی جس کی موجودگی میں یہ علوم ترقی کر سکتے ورنہ کتابوں کی واپسی یا ان کا حصول تو ظاہر ہے کسی طور کوئی مسئلہ نہیں ہے۔

جوزف براڈسکی نے ایک بہت دلچسپ اور فکر انگیز بات کہی ہے۔ وہ کہتا ہے:

"ہم کتابوں کے نذر آتش کرنے کے واقعات کی مذمت تو کرتے ہیں لیکن ہم اس وقت کیوں کچھ نہیں کرتے جب علم دشمنی کی انتہا ہوتی ہے یعنی جب لوگ کتابیں پڑھنا ترک کر دیتے ہیں کہ علم کے حوالے سے بدترین صورت حال تو یہی ہے کہ لوگ کتابیں پڑھنا چھوڑ دیں۔"

ہم مسلمان اور پاکستانی بھی کتابوں کے نذر آتش کئے جانے اور ان کے یورپ میں پہنچ جانے پر نوحہ خواں تو ہوتے ہیں لیکن اس سیکولر علمی فضا کے قیام کے لئے کچھ سوچنے یا کوشش نہیں کرتے جو سائنس اور فلسفے ہی نہیں ادب' شاعری' موسیقی' ڈرامے' مصوری اور دیگر تمام علوم کی ترقی کے لئے بھی نہ صرف اہم بلکہ بے حد ضروری اور لازمی ہے اور جس کی

عدم موجودگی میں سائنسی میدان میں کسی قسم کی کوئی ترقی ہونا ممکن نہیں۔ چاہے ہم اپنی علمی میراث کے کھو جانے پر کتنے ہی آنسو کیوں نہ بہائیں یا اپنی پسماندگی، جہالت اور غربت پر کتنا ہی کڑھتے رہیں۔

## حواشی

(۱) مضمون کا آغاز یونان، روم اور یورپ میں تہذیب اور علم کی ترقی اور عروج سے کیا گیا ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ میرے نزدیک تہذیب اور علم کا آغاز ہی یونان یا روم سے ہوتا ہے۔ یقیناً اس سے پہلے بھی بہت تہذیبیں گذر چکی تھیں اور علم کے بہت سے مراکز رہ چکے تھے۔ تاہم چونکہ اس مضمون کا مقصد تہذیب و علم کے مراکز کی تاریخ بیان کرنا نہیں بلکہ ان عوامل اور وجوہ کا جائزہ لینا ہے جن کی بناء پر کوئی قوم علمی لحاظ سے ترقی کرتی یا تنزل کا شکار ہو جاتی ہے اس لئے ان سب مراکز کا بیان کرنا ضروری بھی نہیں تھا اور کئے جانے کی صورت میں یہ خطرہ بھی موجود تھا کہ اس کے نتیجے میں مضمون بہت طویل ہو جائے گا اور ہم اپنے اصل موضوع سے ہٹ جائیں گے۔

(۲) یہ یورپ کے ان ممالک کا احوال تھا جو بعدازاں مقدس رومی (مغربی رومی) سلطنت کا حصہ بنے۔ جہاں تک ان ممالک کا تعلق ہے جو بعد میں مشرقی رومی (بازنطینی) سلطنت کا حصہ بنے تو وہاں بھی صورت حال کچھ ایسی قابل فخر نہیں تھی۔ بازنطینی عہد میں آزاد جستجو کی یونانی روایت کا گلا گھونٹ دیا گیا۔ اسکندریہ کے بشپ تھیا فیلس نے سراپین کے عظیم الشان کتب خانے کو جسے سلسلہ بطلمویہ کے تاجداروں نے قائم کیا تھا منہدم کرا دیا۔ سینٹ سائرل اور اس کے ساتھی پادریوں نے ہائی پیشیا (Hypatia) کی ہڈیاں توڑ کر اور پھر اسے بھڑکتی ہوئی آگ میں پھینک کر لوگوں کو یہ پیغام دے دیا کہ جو شخص اپنے تن پر سر سلامت دیکھنا چاہتا ہے وہ اپنے ذہن میں صرف انہیں خیالات کو جگہ دے سکتا ہے جن کی اجازت کلیسا کے حکام دیں۔ شہنشاہ جسٹینین نے ۵۲۹ء میں ایتھنز کے یونانی مدارس کو بند کرا

دیا جس کے نتیجے میں فلسفی اور سائنس دان خصوصاً" وہ جن کا تعلق
سطوری فرقے سے تھا ایران کو ہجرت کر گئے اور اپنے ساتھ ہیلینی اور
یونانی علوم بھی لے گئے۔

# سرسید تحریک اور اس کے مضمرات

پروفیسر محمد عارف

یقیناً سرسید احمد خاں اور ان کی تحریک کے اسلامیان ہند پر بے حد احسانات ہیں، تاہم، اس کا یہ ہرگز مطلب نہیں کہ ہم ان پر تنقیدی و تحقیقی انداز میں نگاہ نہ ڈالیں۔ کوئی بھی فرد واحد غلطی سے مبرا ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ خود سرسید کو بھی اس امر کا اعتراف ہے، لہٰذا، ہم نے جسارت کی ہے کہ سرسید تحریک کو تاریخی و سیاسی پس منظر کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کریں اور اس سلسلے میں چھپے حقائق و نتائج سے قطع تعلق کرتے ہوئے معروضیت کی مدد سے کسی منزل پر پہنچیں۔

ہمارے خیال میں سرسید کے طرز احساس میں کجی اس لیے پیدا ہوتی ہے کہ وہ اقتصادیت کی اہمیت کو تسلیم کرتے ہوئے قومی تشخص سے روگردانی کر جاتے ہیں۔

قومی تشخص آج بھی ہمارے لیے مسئلہ بنا ہوا ہے۔ ہم پاکستانی اقتصادیات کی بات تو کرتے ہیں تاہم پاکستانی قومیت کو مسلم امہ کے تشخص سے الجھا دیتے ہیں۔ یہ یوں ہی ہے جیسے کوئی گھر بنائے بنا اہل خانہ کہلانے کی کوشش کرے۔ بدقسمتی سے تہذیب و تمدن کے دور میں جب دنیا اکیسویں صدی کو رواں ہے ہم خانہ بدوشوں کی طرح بے جہت اور بے مکاں ہیں اور میں سمجھتا ہوں کہ اس روش کی جڑیں ماضی قریب و بعید تک پھیلی ہیں، سو ہماری کوشش یہی ہے کہ خرابی جہاں تک بھی جاتی ہے ہم عہد رفتہ میں وہاں تک اس کا سراغ لگائیں۔

سرسید نے انگریزوں کو باور کرایا کہ ان کی طرح مسلمان بھی باہر سے آئے اور یہاں کے اصلی باشندوں سے ان کا کوئی تعلق نہیں۔ انگریز اگر ان پر حکومت کرنا چاہیں تو مسلمانوں کو بھلا کیا اعتراض ہے بس انہیں تو باعزت روزگار ملنا چاہیے وہ بھی سپاہ میں ہو تو بہتر ہے کہ سو پشت سے ہے پیشہ آبا سپہ گری (غالب)۔ گویا سرسید حکمران طبقوں کی ترجمانی تو کر جاتے ہیں تاہم عوام کہاں جائیں؟ ان کی بقا و بہبود تو ایک دھرتی سے وابستگی میں

مضمر ہے۔ دیکھیں! سرسید اور ان کی تحریک کے پاس اس سوال کا جواب ہے یا نہیں؟

واسکوڈی گاما کا بحری بیڑہ 1498 میں ہند کے ساحلوں میں لنگر انداز ہوا اور تب سے اہل مغرب کی یلغار ایک تسلسل کے ساتھ جاری رہی اور بالآخر 1857 میں اس یلغار کے مقاصد پورے ہوگئے جب مغل شہنشاہ بہادر شاہ ظفر انگریز تاجروں کا قیدی بنا اور اس کے شہزادے زندگی کی قید سے ہمیشہ کے لئے رہا ہوئے۔

بقول شخصے یہ آٹھویں صلیبی جنگ تھی جو فیصلہ کن طریقے سے انگریزوں نے جیت لی اور مسلمان شکست سے دوچار ہوئے۔ یہی شکست علیگڑھ تحریک کا موجب و محرک ٹھہری۔ لہٰذا' ضروری ہے کہ ہم 1857ء کی جنگ آزادی کا پس منظر بیان کریں کہ علیگڑھ تحریک کا تقاضہ بھی ہے کہ ہر تاریخی واقعہ کو تقدیر کے کھاتے میں ڈال کر سوچ کے دروازے بند نہ کیے جائیں بلکہ باور کیا جائے کہ تاریخ ایک تسلسل ہے اسباب و نتائج کا۔ مگر تمام اسباب سے پیدا ہونے والے نتائج حتمی نہیں اضافی ہوتے ہیں کیونکہ وہ دیگر نتائج کو جنم دیتے ہوئے اسباب و نتائج کی نہ ختم ہونے والی لڑی بنتی ہے جسے تاریخ کہتے ہیں۔ ہم تاریخی واقعات کے بارے میں اپنی صدابدید کو زیادہ دخیل کر دیتے ہیں اور یوں ان واقعات کو احاطہ شعور میں لاتے ہیں جن سے ہمیں فخر و انبساط کا سامان فراہم ہوتا اور ان واقعات کو نذر طاق نسیاں کرتے ہیں جن سے ندامت اور عبرت کے باب وا ہوتے ہیں۔ ہم کوشش کریں گے کہ تاریخ کا آئینہ جو بھی عکس دکھاتا ہے وہ دیکھنے کی تاب پیدا کریں۔

سوچنے کی بات یہ ہے کہ صلیبی جنگوں میں پورا یورپ مل کر ملت اسلامیہ سے برسرپیکار ہونے کی جرات کرتا تھا مگر انیسویں صدی میں ایک چھوٹا سا ملک انگلستان نہیں بلکہ اس کی ایک عدد تجارتی کمپنی اتنے بڑے ملک ہندوستان پر قابض ہو جاتی ہے' تو کیونکر اگر وہ قابض ہو ہی گئی ہے تو آئندہ کی راہیں کیا ہیں اور وہ کدھر کو جاتی ہیں؟ علیگڑھ تحریک انہی سوالات کو سمجھنے کی کوشش ہے اور ان کا جواب دریافت کرنے کی سعی۔

سلطنت مغلیہ کو سلطنت اسلام کہنے کی روایت اب تک دم نہیں توڑ سکی۔ لیکن تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ جتنا نقصان اسلام کو مغلوں نے پہنچایا ہے اتنے کی توفیق اس روئے زمین پر کسی اور قوت کو ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ بغداد مرکز اسلام تھا منگولوں نے

اسے تاراج کیا اور اتنا گیا کہ بعد ازاں کبھی خلافت اسلامیہ قوت نہ پکڑ سکی۔ ہند میں اچھی بھلی سلاطین دہلی کی حکومت چل رہی تھی وہ تیمور کی نظرِبد کا ہمیشہ سے شکار رہی اور بالاخر آل تیمور نے مسلمانوں کی سلطنت دہلی تباہ کر کے مغلیہ سلطنت قائم کر کے دم لیا۔ جنوب کی ساحلی ریاستوں پہ آئے دن یلغار کرنے کی آخر کیا ضرورت تھی؟ اورنگزیب تک مغل حکمران اسی تگ و دو میں لگے رہے کہ جنوبی ہند کی مسلم ریاستیں سلطنت مغلیہ میں ضم کریں ان کی نظریں ماضی کے ہند و حکمرانوں کی طرح کبھی سمندروں کی طرف نہیں اٹھیں کہ وہاں اہل مغرب کے بحری بیڑوں کے طوفاں امڈ رہے تھے تجارت اور جہاز رانی پر صدیوں سے مسلمانوں کی اجارہ داری تھی۔ اہل مغرب کو یہ حقیقت ایک آنکھ نہ بھاتی تھی۔ سو' بغداد کی طاقت کے ختم ہونے کے بعد مسلمانوں کا مرکز لخت لخت ہوگیا۔ اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ نہ مصر موثر رہا اور نہ ہی ترکوں میں دم خم بچا۔ سو' ترکی بیڑہ کو بحر ہند میں 1538 میں اہل مغرب کے ہاتھوں عبرت ناک شکست ہوئی۔

اس شکست کے بعد مسلمانوں کی طرف سے یوروپی اقوام کو کوئی خاص چیلنج نہ رہا اور یوں ولندیزی ' فرانسیسی اور برطانوی بحر ہند سے برصغیر کے دروازوں پر دستک دیتے تھے۔ پہلے انہوں نے شریفانہ و تاجرانہ انداز اپنایا اور بعد ازاں جارحانہ

بحر ہند میں طوفان آچکا تھا مگر مغل حکمرانوں کو کوئی خبر نہ تھی۔

**پرتگیزیوں** نے گوا پر قبضہ کر کے تمام مسلم آبادی کو تہ تیغ کر دیا تھا۔ مگر سلطنت مغلیہ کا وقار بلند تھا۔ کیونکہ **پرتگیزی** ' ولندیزی اور آخر کار برطانوی مغل شہنشاہ اور صوبیداروں کو نادر تحفے تحائف اور نذریں پیش کرتے تھے مجرا بجا لاتے اور دیگر آداب سلطانی پر پورے اترتے تھے۔

اورنگزیب کے انتقال کے فوراً بعد صوبیداروں میں جانشینی کی جنگیں جاری ہوگئیں۔ سکھ ' مرہٹے ' جاٹ 'روہیلے سب اٹھ کھڑے ہوئے اور مرکزی حکومت کی رہی سہی ساکھ کو نادر شاہ اور احمد شاہ کے حملوں نے برباد کر دیا۔

بیچارے مغل تاجدار کو جب بنگال ' بہار اور اڑیسہ سے عوام کے ٹیکسوں کی وصولی معطل ہو گئی کیونکہ ہر حملہ آور رعایا سے جگا ٹیکس وصول کرتا تھا تو بادشاہ سلامت

نے چند لاکھوں (۲۶ لاکھ) کے عوض متذکرہ بالا صوبوں کی دیوانی کے اختیارات انگریزوں کے سپرد کر دیئے۔

اب موقع آگیا کہ انگریز ایک عیار شاطر کی طرح ہندوستان کی بساط کو بھائی کو بھائی کے خلاف پیادوں کی طرح استعمال کریں اور شہ مات دینے کو امید رکھیں۔

جنگ پلاسی جیتنے کے بعد انگریزوں نے بنگال میں وہ لوٹ مچائی کہ تجارت اور سیاست کی تمام اخلاقی حدود ٹوٹ گئیں۔ انگلستان سے کم عمر آوارہ لونڈے ہندوستان آنے لگے اور دولت سے مالا مال ہو کر واپس جانے لگے تاکہ نئی کھیپ آسکے (۲) زمینوں کی نیلامی ہونے لگی۔ اور نئے زمیندار کسانوں سے منہ مانگا لگان وصول کرنے لگے۔ یوں کسان کی حالت پتلی ہو گئی۔ ادھر دستکاروں کو کپڑا بننے کی ممانعت کر دی گئی تاکہ انگلستان کا کپڑا بک سکے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اناج پیدا کرنے والا کسان بھوکا اور کپڑے کا کاریگر ننگا ہوگیا ڈھاکہ شہر کی آبادی لاکھوں سے ہزاروں تک گر گئی اور وہ ہاتھ بیکار ہوگئے جو عجیب و غریب ململ تیار کرتے تھے۔ گویا ہندوستان کے وہ ہاتھ کٹ گئے جو اسے اپنا لباس پہناتے تھے۔

جنوبی ہند میں ہندو سیٹھوں کا ایک طبقہ انگریز تاجر کے دلال کے طور پر اس کا شریک کار ہوچکا تھا۔ جنگ پلاسی میں اس طبقہ کا انگریز کی کامیابی میں اہم رول تھا۔ سو بعد ازاں اس طبقے کو بہت بونس ملا۔ انگریز حاکموں کی گھر گرہستی چلانے کا منصب ان سیٹھوں کو حاصل ہونے لگا اور اعلیٰ انگریز اہلکار اسی دلال طبقے کے ذریعے جائدادیں بنانے لگے۔ گورنر جنرل وارن ہیسٹنگز تک کو پتی اسی طبقے کے ذریعے ملنے لگی۔

انگریزوں کا نیا حکمران طبقہ برطانوی اشرافیہ پر مشتمل نہیں تھا بلکہ اس کا تعلق کمین و رزیل نو دو لیتے قسم کے لوگوں سے تھا جو راتوں رات کروڑ پتی بننے کے لئے ہر طرح کی دھاندلی اور ظلم روا رکھتے ہیں۔ برصغیر میں پرانا حکمران طبقہ جب اقتدار اور جاگیروں سے محروم ہونے لگا تو عوام بالخصوص مسلمانوں پر ملازمتوں کے دروازے بند ہونے لگے اور بحالت مجبوری جب وہ کمینے فرنگیوں کی نوکری کرتے۔ تو بقول سر سید احمد خاں ان کے جذبات یوں ہوتے کہ "اس نوکری سے گھاس کھودنی بہتر ہے۔ جسے ان سب باتوں کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ برصغیر بے عمل اور بے جان لاش تھا جسے جو چاہتا نوچتا نہیں وہ زندہ تھا۔ اس میں

تڑپ تھی۔ مرغ بسمل کی طرح تو وہ خیر 1857 میں جا کر تڑپا مگر بالاقساط جو وہ تڑپتا رہا اس کی چیدہ چیدہ جھلکیاں کچھ یوں ہیں۔

شاہ ولی اللہ سے متاثر علما نے تحریک جہاد کا آغاز کیا۔ ان کے اندر احیائے اسلام کی تڑپ بھی تھی۔ مگر بڑا مسئلہ ان کا یہ بنا کہ مغلوں کے جانے کے بعد وہ بھی محروم اقتدار ہو رہے تھے کیونکہ فتاوی عالمگیری کے مطابق اب تک وہ مغل حکمرانوں کے ساتھ شریک اقتدار رہے تھے۔ لہٰذا' وہ جاگیردارانہ عہد کے سابق حکمرانوں کی بحالی بھی چاہتے تھے اور ان کا مقصد عوام کو استحصالی طبقوں سے نجات دلانا بھی تھا خصوصا بنگال وغیرہ کے نئے ہندو زمینداروں اور سیٹھوں سے ۔ بنگال میں فرائضی تحریک نے بہت زور پکڑا۔ اسی ہزار فرائضیوں کی جماعت جو کامل مساوات کا دعوی کرتی تھی ادنی طبقوں کے لوگوں پر مشتمل تھی اس کا ٹکراؤ نئے ہندو اور مسلمان امرا اور انگریز فارم مالکوں اور کارخانہ داروں سے ہوا۔ 1838' 1841' 1844' 1846 کو تصادم ہوئے۔ مگر 1857 میں اس تحریک کے قائد ودود میاں کو گرفتار کر لیا گیا (۴)

سید احمد بریلوی کی قیادت میں جن مسلمانوں نے پنجاب میں سکھوں کے خلاف جہاد کیا۔ انگریزوں نے ان کی بہت حوصلہ افزائی کی ۔ کیونکہ اس جہاد نے سکھوں کی طاقت کو بہت زک پہنچائی اور بالاخر انگریزوں نے باسانی پنجاب و سرحد کو فتح کر لیا اور مجاہدین کو باغی قرار دے دیا اور انہیں وہابی کہا اور وہابی کو گالی بنا دیا۔ سو 1857 کی جنگ آزادی میں ان مجاہدین کا جو رول ہو سکتا تھا وہ نہ ہوا۔ کاش وہ غیر پہلے ملکی غیر مسلم طاقت انگریز سے محاذ آرائی کرنے کے بعد سکھوں کی طرف رجوع کرتے۔

سلطان ٹیپو نے ایک عظیم مدبر کی طرح صحیح صورت حال کا جائزہ لیا اور اس نے واضح طور پر اعلان کیا کہ اہل ہند کا ایک ہی دشمن ہے اور عوام و خواص کا فرض ہے کہ وہ اسے ہندوستان سے مار بھگائیں۔ ٹیپو انقلاب فرانس سے متاثر ہوا اور سرنگاپٹم میں ایک باقاعدہ انجمن جمہور قائم کی گئی اور ایک رات ٹیپو سمیت انجمن کے اراکین نے رسمی طور پر بادشاہت کے تمام نقوش کو جلا دیا اور اس کے بعد ایک دوسرے کو شہری کہہ کر مخاطب کرنے لگے۔ (۵)

ٹیپو نے اپنی افواج کو نپولین کے فن حرب کے مطابق منظم کیا۔ اور مغل

شہنشاہ شاہ عالم سمیت ہندوستان کی تمام سیاسی قوتوں کو متحدہ محاذ بنانے کی دعوت دی۔ مگر شاہ عالم نے عملاً سندھیا کا وظیفہ خوار ہونے کی وجہ سے تعاون سے انکار کر دیا۔ بہرحال برصغیر کی منتشر قوتیں باہم برسرپیکار رہیں مگر ٹیپو انگریز کے خلاف ڈٹا رہا۔ اس نے عمر بھر سمجھوتہ نہ کیا اور 1799 میں جب وہ شہید ہوا تو تلوار اس کے ہاتھ میں تھی۔ شاید یہی تلوار تھام کر بعد ازاں 1857 کی جنگ لڑنے والوں نے لڑی اور یہ حقیقت ہے کہ 1857 میں سرنگا پٹم کے مسلمانوں نے دہلی کے باغیوں کی کامیابی کے لیے سلطان ٹیپو کے مقبرہ پر باقاعدہ جا کر دعا مانگی۔

(۲)

1857 جنگ آزادی یا غدر ـــ جو کچھ بھی ہو اس کے واقعات کی تفصیل بتانے کی ضرورت نہیں ہے سب جانتے ہیں۔ یہاں پر قابل غور امور حسب ذیل ہیں۔

(۱) 1857 کے واقعات انگریز حکمرانوں کی غلط سیاسی حکمت عملی کا نتیجہ ہیں

(۲) 1857 کی جنگ آزادی کی ناکامی کا سبب مجاہدین آزادی کی غلط حکمت عملی ہے۔

(۳) علیگڑھ تحریک درست اور صحیح حکمت عملی کی طرف رہنمائی ہے۔

1843 میں امیران سندھ سے سندھ کی چھین لیا گیا۔ 1849 میں پنجاب سر حد سمیت غصب کر لیا گیا۔ 1853 میں برار کو حیدر آباد سے الگ کر کے ایسٹ انڈیا کمپنی نے براہ راست اپنے قبضے میں کر لیا۔ 1856 میں یہی سلوک ریاست اودھ سے ہوا۔ ستارہ' ناگپور' جھانسی جیت پور' سنبھل وغیرہ ریاستوں کو قانون استقراض کی آڑ میں ختم کر دیا گیا۔ جس کا مطلب تھا کہ لے پالک کی بجائے کسی صاحب جائداد کی جائیداد اور جاگیردار یا راجہ کی جاگیر کی وارث کمپنی ہوگی۔ اس قانون نے صاحب جائداد طبقوں میں سخت اضطراب اور عدم تحفظ کا احساس پیدا کیا۔ اور یہ احساس پایا جانے لگا کہ انگریز تمام دیسی لوگوں کو بے مایہ اور کنگال بنانا چاہتا ہے۔ ریاستوں کی افواج پہلے ہی بر طرف کر دی گئی تھیں اور سمجھا گیا تھا کہ مزاحمت کے تمام راستے بند کیے جا چکے ہیں۔ مگر اسی خسارے میں اہل ہند کے لیے ایک برکت بھی پنہاں تھی اور وہ یہ کہ مذہب ملت کے امتیاز سے قطع نظر تمام اہل ہند انگریز کے خلاف دوش بدوش اٹھ کھڑے ہوئے۔ ایسا انگریزوں کی سیاسی حماقت کی وجہ سے ہوا جس کا انکشاف ڈزرائیلی نے

برطانوی پارلیمنٹ میں یوں کیا۔

"گزشتہ دس سال تک ہندوستان میں برطانوی سلطنت کی بنیاد "پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو" پر قائم تھی۔ لیکن اس اصول کو مختلف قومیتوں کا احترام کرتے ہوئے جن پر ہندوستان مشتمل ہے۔ ان کے مذہب میں مداخلت کیے بغیر اور ان کی اراضیات کا تحفظ کر کے عملی جامہ پہنایا گیا۔ ملک کی مضطرب روح کو جذب کرنے کے ایسے دیسی سپاہیوں کی فوج نے محافظوں کا کام کیا لیکن آخری برسوں میں ہندوستان کی حکومت نے ایک نیا اصول اختیار کیا' قومیت کو تباہ کرنے کا اصول۔ اس اصول پر عملدرآمد مقامی راجوں کو بزور تباہ کر کے' جائیداد کے بندوبست میں خلل ڈال کر اور عوام کے مذہب میں مداخلت کر کے کیا جارہا ہے۔" (۷)

گویا ڈزرائیلی تسلیم کرتا ہے کہ 1857 کو گڑ بڑ ہندوستانی سپاہیوں تک محدود نہ تھی بلکہ اس کا تعلق پوری ہندوستانی قوم سے تھا۔ اور انگریز کا مفاد اس میں تھا کہ ہندوستانی قومیت کے جذبے کی بجائے مذہب ملت اور نسل کی بنیاد پر چھوٹی چھوٹی قومیتیں اپنا اپنا الگ تشخص محسوس کریں۔

ڈزرائیلی نے بار بار مذہب میں مداخلت کا ذکر کیا ہے۔ اس کا مفہوم کیا ہے؟ اس کا مطلب عیسائی مشنریوں کی جارحانہ سرگرمیاں ہیں۔ نہ صرف وہ حضرت مسیح کی عظمت کا بیان دیتے ہیں بلکہ دوسرے مذاہب سے تعلق رکھنے والی برگزیدہ ہستیوں کا مذاق بھی اڑاتے ہیں۔ ہندوستان میں مشنری سکولوں اور ہسپتالوں کا جال بچھایا گیا اور روحانیت کے علاوہ روٹی روزگار کے وسیلے عیسائی پادریوں کے ہاتھ آگئے۔

1857 کی فتح کے بعد انگریز موقع غنیمت جانتے ہوئے غیر عیسائی رعایا کا قلع قمع کرنے لگے۔ پہلے انہوں نے ہسپانیہ میں مسلمانوں کا نام و نشاں مٹایا تھا۔ اب وہ مذہبی جنون کے ساتھ یہی کام ہندوستان میں کرنا چاہتے تھے۔ نہتے باشندوں کا شکار کھیلتے پھرتے تھے اور تخمینہ لگایا گیا ہے کہ ہر انگریز کے عوض میں کم و بیش ایک ہزار دیسی مارے جاتے ہیں۔" (۸)

ایسٹ انڈیا کمپنی کے تاجر اور اہلکار ان مہربانیوں کا حق ادا کر رہے تھے جو حضرت عیسیٰ نے ان پر کی تھیں۔ صلیبی جنگوں کے دوران یورپ کی بکھری قوموں کو ایک ہی مذہبی اور تجارتی راستے پر ڈال دیا تھا۔ نئی شاہراہیں اور نئی منڈیاں کھل گئی تھیں اور یوں عین

الاقوامی تجارت کا سلیقہ نصاریٰ کو بھی آگیا تھا۔ اسی راستے پر چلتے چلتے یہ تاجر ہندوستان پہنچے تھے سو یہاں تجارت اور مذہب کو جدا کیسے کرتے۔

لیکن ڈزرائیلی جیسے دانشور سمجھتے تھے کہ ہندوستان یورپ نہیں کہ وہاں چند لاکھ باشندوں کو ختم کر کے کسی مذہب کے ماننے والوں کا نشان مٹایا جاسکتا ہے' ہندوستان کی کروڑوں کی آبادی کو تہ تیغ نہیں کیا جاسکتا اور اگر کر بھی لیا گیا تو استحصال اور لوٹ کھسوٹ کے لیے کون بچے گا۔ لہٰذا' مذہبی جنون ختم ہونا چاہئے جو غلطیاں ہوچکی ہیں ان کا ازالہ کیا جانا چاہئے نہ کہ انہیں دہرایا جائے۔ اگر ایسا کیا گیا تو نتائج تباہ کن ہوں گے۔

اہل ہند سے کیا غلط سیاسی حکمت عملی سرزد ہوئی۔ اولاً تو یہ کہ مسلمان علما نے برصغیر کو دارالحرب قرار دے دیا مگر جہاد کے لیے مرکز ڈھونڈنے پنجاب سرحد کے شمال مغربی علاقوں کا رخ کیا جہاں سکھوں کی دیسی حکومت تھی۔ انگریزوں نے اس جہاد میں بھرپور تعاون کیا۔ جب لوگ جنوبی اور وسطی ہند سے شمال کی طرف کوچ کرتے تو انگریز حکام ہر طرح کا تعاون پیش کرتے۔ قائدین جہاد کو شروع ہی میں اندازہ لگا لینا چاہئے تھا کہ ان کی جدوجہد انگریز کے مفاد میں ہے اور وہ انگریز کو قدم جمانے کا موقع دے رہے ہیں اور ایسی توانائی کمتر دشمن پر صرف کر رہے ہیں جو انگریزوں کا بھی دشمن ہے۔ انگریزوں کو نکال لینے کے بعد اگر وہ سکھ حکومت کا خاتمہ کرتے تو یہ مجاہدین کے مفاد میں ہوتا۔ مگر انہوں نے اس کے برعکس عمل کیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۸۵۷ میں مجاہدین کو بچی کھچی قوت کے ساتھ لڑنا پڑا۔ جبکہ بین الاقوامی طور پر مسلمانوں کی حالت عجیب و غریب ہوچکی تھی۔

اگر برصغیر میں جہاد جاری ہو اور ہندوستان دارالحرب ہو اور ترکی میں ملت اسلامیہ کا امیر المومنین موجود ہو تو ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ خلافت کی فوجیں ہندوستانی مجاہدین کی مدد کو آتیں یا کم از کم انگریزوں کی بحری ناکہ بندی کر کے مزید کمک ہی کو روکتیں۔ مگر ایسا ہونا ممکن نہیں تھا۔ ترکی نے ۲۳ ستمبر ۱۸۵۳ کے دن سے روس کے خلاف اعلان جنگ کر کے جنگ کریمیا کا آغاز کر دیا تھا۔ اور اس کا نتیجہ یہ تھا کہ اس کا بحری بیڑہ ۳۰ نومبر ۱۸۵۳ تک تباہ و برباد ہوچکا تھا۔ اور فرانس اور برطانیہ کو اس جنگ میں روس کے خلاف کودنا پڑا تھا اور یوں ترکی کی بقا کا امکان یکم فروری ۱۸۵۶ کو فرانسیسیوں اور انگریزوں کی مدد سے ممکن ہوا۔ اس میں

شک نہیں کہ یہ جنگ انگریز کے اپنے مفاد میں بھی تھی مگر اس کا ٹھوس نتیجہ یہ تھا کہ خلافت عثمانیہ اخلاقی طور پر انگریزوں سے اتنی دبی ہوئی تھی کہ کسی محاذ پر وہ اس کا سامنا کرنے کی جسارت نہ کرتی اور مادی طور پر بھی اس کے لئے ایسا کرنا ممکن نہ تھا۔ لہذا' انگریزوں کو دہلی فتح کرنے کی غرض سے مزید تازہ دم کمک بھیجنے سے کون روک سکتا تھا جبکہ بین الاقوامی طور پر بھی مجاہدین یک و تنہا تھے۔

جنگ جیتنے کے بعد انگریز نے اہل ہند بالخصوص، مسلمانوں پر بہت مظالم کیے۔ اولا اس لیے کہ وہ سمجھتے تھے کہ مسلمان حریف ہی سے انہوں نے حکومت چھینی ہے لہذا' جنگ کا فریق مخالف وہی ہے۔ ثانیا مسلمان علما نے جہاد کا فتوی دیا تھا اور ہندوستان کو دارالحرب ٹھہرایا تھا۔ ان تمام باتوں کے پیش نظر ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کو سرکشی و بغاوت کا نام دے کر اس کا ذمہ دار انگریزوں نے مسلمانوں کو قرار دیا (۹) اور اس بغاوت میں ہندوؤں کی شرکت کو محض ایک عارضی لغزش سے تعبیر کیا۔ (۱۰)

فاتح کی تہذیب کا امتحان فتح کے بعد ہوتا ہے مگر مہذب انگریز نے کامیابی کے بعد ہندوستان کے ہر گوشے میں ایک ہی منظر پیش کیا۔

وہی قتل عام' وہی لوٹ مار' وہی موت اور کالے پانی کی سزائیں' تنوع اگر نظر آتا تھا تو شقاوت اور قسی القلبی کے نئے نئے طریقوں میں جیسے پھانسی کے لیے درختوں پر لٹکانا' سولی پر چڑھانا' ایک دوسرے کو بد فعلی پر مجبور کرنا' سور کی کھال میں سی کر جلا دینا' توپ سے باندھ کر اڑا دینا بستیوں کو جلا دینا وغیرہ"۔ (۱۱)

اب سوال یہ تھا کہ مکمل طور پر ایک شکست خوردہ قوم اپنی بقاو بہبود کے لیے کیا کر سکتی ہے؟ سرسید نے اس سوال کا جواب ڈھونڈ نکالا۔ اس نے باور کرایا کہ فلاح کی راہ مصالحت کی راہ ہے۔ مگر مصالحت کی راہ تو برابر کے فریقین میں ہوتی ہے۔ مفتوح کو تو صرف معافی مل سکتی ہے؟ جو ملکہ وکٹوریہ نے ایسٹ انڈیا کمپنی کو ہند کی حکومت سے سبکدوش کرتے ہوئے اپنی نئی رعایا کو مرحمت کر دی۔ مگر مصالحت کیسی؟

مصالحت کی گنجائش تھی۔ وہ یوں کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے اہل کاروں کے خلاف انگلستان کی اشرافیہ میں وہی نفرت موجود تھی جو نودولتیوں کے ساتھ ہر جگہ ہوتی ہے۔

اگر انگلستان کے اشرافیہ اور مسلمان اشرافیہ کے درمیاں قدر اشتراک دریافت کر لی جائے تو اس کا نتیجہ نہ صرف مصالحت ہو گا بلکہ اس سے بڑھ کر مکالمہ بھی ہو سکتا ہے۔ جبکہ ہندو نودولتیا اور ہندوراج مہاراج اور مہارانیاں بھی انگریزوں کو آنکھیں دکھانے لگی تھیں۔ سرسید نے اسباب بغاوت ہند میں کہا

"مسلمان اس ملک کے رہنے والے نہیں ہیں۔ اگلے بادشاہوں کے ساتھ بوسیلہ روزگار ہندوستان میں آئے اور یہاں تو طن اختیار کیا اس لیے سب کے سب روزگار پیشہ تھے اور کمی روزگار سے ان کو زیادہ تر شکایت بہ نسبت اصلی باشندوں کے تھی۔ عزت دار سپاہ کا روزگار جو یہاں کی جاہل رعایا کے مزاج سے زیادہ تر مناسبت رکھتا ہے ہماری گورنمنٹ میں بہت کم تھا۔ اس سبب سے رعایا کو حد سے زیادہ قلت روزگار تھی ۔ اس کا نتیجہ ہوا کہ جب باغیوں نے لوگوں کو نوکر رکھنا چاہا' ہزار ہا آدمی نوکری کو جمع ہو گئے اور جیسے بھوکا آدمی قحط کے دنوں میں اناج پر گرتا ہے' اسی طرح یہ لوگ نوکریوں پر جاگرے۔ (۱۴)

سو پشت سے ہے پیشہ آبا سپہ گری (غالب)

غالب جیسے کئی لوگ نجیب الطرفین سپاہ گری کا پیشہ کرتے تھے جو بھی کرالے۔ انگریز نے بیشتر سپاہ پیشہ مسلمانوں کو نوکر نہ رکھا کسی ہندو راج رانی نے رکھ لیا وہ وہیں ملازم ہو گئے۔ ان کا تعلق پیشے سے تھا پیسے سے تھا مذہب اور وطن سے نہ تھا۔ انگریز کی طرح وہ بھی ملک ہندوستان کا باشندہ نہیں۔ اور مکالمے (understanding) کی بات سرسید یوں کرتے ہیں کہ باہر سے آئے مسلمان حکمران طبقے یہاں کے دیسی باشندوں کو کس طرح قابو میں رکھتے تھے۔

"جبکہ نادر شاہ نے خراسان پر فتح پائی اور ایران اور افغانستان دو مختلف ملک اس کے قبضے میں آئے اور اس نے برابر کی دو فوجیں آراستہ کیں۔ ایک ایرانی قزلباش دوسرے افغانی۔ جب ایرانی فوج کچھ حکم عدولی کا ارادہ کرتی تو افغانی فوج اس کو دبانے کو موجود تھی اور جب افغانی فوج سرتابی کرتی تو قزلباشی اس کے تدارک کو موجود ہوتی ۔ ہماری گورنمنٹ نے یہ کام ہندوستان میں نہیں کیا۔ اگر ہندو اور مسلمان دونوں قوموں کی پلٹن اس طرح پر آراستہ ہوتیں کہ ایک پلٹن مسلمانوں کی ہوتی جس میں کوئی ہندو نہ ہوتا تو آپس کا اتحاد

اور برادری نہ ہونے پاتی اور تفرقہ قائم رہتا اور میں خیال کرتا ہوں کہ شاید مسلمان پلٹنوں کا کارتوس کاٹنے میں بھی کچھ عذر نہ ہوتا۔ (۱۳)

سرسید نے کہا ہم مسلمان انگریزوں کی طرح کہیں اور سے آئے ہیں پیسے کے لئے اور سپاہ گری پیشہ کرتے ہیں تو غالب نے اس سے بڑھ کر انگریزوں کی خوشنودی یوں حاصل کرنے کی کوشش کی

اپنے گھر میں بیٹھا ہوا تھا کہ ۔۔اتنے میں شور مچ گیا کہ اندرون قلعہ صاحب ایجنٹ بہادر قتل کر دیئے گئے۔ ہر طرف سے پیادوں اور سواروں کے دوڑنے کی آوازیں بلند ہونے لگیں۔ زمین ہر طرف گل اندامون (انگریزوں) کے خون سے رنگین ہوگئی باغ کا ہر گوشہ ویرانی اور بربادی کے سبب سے بہاروں کا مدفن بن گیا ۔۔۔۔۔ صد افسوس کہ پری چہرہ نازک بدن خاتونیں جن کے چہرے چاند کی طرح چمکتے تھے اور جن کے بدن سیال چاندی کی طرح دمکتے تھے ۔۔۔۔ (۱۴)

غالب اپنے بھائی کی بے بسی کی موت پر اتنا نہیں رویا جتنا افسوس اس نے فرنگی خواتین اور حضرات کے مرنے پر کیا یوں لگا کہ مسلمان انگریز تابع محض سپہ گری کا نہیں عشق کا پیشہ اختیار کرنے کو بھی سعادت خیال کرتے۔

"ملکہ وکٹوریہ کی ضیا بخشی اور کرم بے دریغ کا یہ فیض ہے کہ یہ سورج روشن ہے اور بادل میں برسنے کی صلاحیت ہے" (۱۵)

دستنبو 1858 میں مکمل ہوئی جبکہ نئے منگول ہندوستان کی لاشوں کے مینار پر کھڑے ہو کر اپنے قد اونچے کر رہے تھے۔ مرزا غالب ان کی فیاضیوں کے گیت گا رہے تھے۔

## حواشی

(۱) ایسٹ انڈیا کمپنی

(۲) بزک بحوالہ ۱۸۵۷ ۔ ادب، سیاست اور معاشرہ مرتبہ احمد سلیم لاہور ۱۹۹۱، ص ۱۵

(۳) سر سید احمد خاں' اسباب بغاوت ہند مشمولہ کتاب مذکورہ بالا ص ۱۸
(۴) کے ایم اشرف ' احیائے اسلام کے حامی اور ۱۸۵۷ کا انقلاب ' لاہور
۱۹۹۱ ص ۳۷
(۵) کے ایم اشرف ' احیائے اسلام کے حامی اور ۱۸۵۷ کا انقلاب ' لاہور
۱۹۹۱ ص ۳۵
(۶) کے ایم اشرف ' احیائے اسلام کے حامی اور ۱۸۵۷ کا انقلاب ' لاہور
۱۹۹۱ ص ۳۶
(۷) بحوالہ کارل مارکس ' "ہندوستانی سوال" "نیویارک ڈیلی ٹریبون"
شمارہ ۵۰۱
(۸) ہاشمی فرید آبادی "تاریخ مسلمانان پاکستان و بھارت" جلد دوم ص
۳۳۱
(۹) ٹامس و گیرٹ' ہندوستان میں برطانوی راج کا عروج و تکمیل انگریزی
ص ۴۴۳'لندن 1934
(۱۰) ٹامس و گیرٹ' ہندوستان میں برطانوی راج کا عروج و تکمیل انگریزی
ص ۴۴۳
(۱۱) خورشید مصطفیٰ رضوی' جنگ آزادی ۱۸۵۷ ص ۴۹۰ تا ۵۷۵
(۱۲) سر سید احمد خاں' اسباب بغاوت ہند ' لاہور ص ۲۶' ۲۵
(۱۳) سر سید احمد خاں' اسباب بغاوت ہند ' لاہور ص ۲۷
(۱۴) اسد اللہ خان ' غالب' دستنبو ' لاہور ص ۷۹
(۱۴) اسد اللہ خان ' غالب' دستنبو ' لاہور ص ۱۰۶

○

# یاسؔ یگانہ چنگیزی

امجد اسلام امجد

کلاسیکی شعراء کے انتخاب اور تنقیدی مضامین کا سلسلہ ۱۹۷۰ء سے شروع ہو کر ۱۹۹۰ء میں مکمل ہوا اور ۹۱ء میں یہ کتاب "نئے پرانے" کے نام سے چھپ گئی۔ ابتدا میں میرا ارادہ ہر شاعر کے ساتھ ایک تعارفی مضمون لکھنے کا تھا مگر پھر کچھ ایسے حالات ہوئے کہ صرف پہلی صف کے آٹھ شعراء پر ہی مضمون لکھے جا سکے اور بقیہ نو کے انتخاب پر ہی اکتفا کیا گیا۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ ان شاعروں میں یگانہ بھی شامل ہوتا کہ اس کا انتخاب کلام میں ۱۹۷۱ء میں مکمل کر چکا تھا اور صرف اس کا مسودہ کاتب یا ناشر کے حوالے کرنا تھا۔ غالب اور اقبال کے درمیانی عرصے کے شعراء میں سے حالیؔ، شیفتہ اور داغ انتخاب میں شامل تھے لیکن اس کے باوجود شعراء کی ایک طویل فہرست تھی جن سے صرف نظر بہت مشکل تھا کیونکہ ان میں سے اکثر شعراء اقبال کی زندگی میں معروف اور مقبول ہو چکے تھے مثال کے طور پر

امیر مینائی، شاد عظیم آبادی، یگانہ چنگیزی، اکبر الہ آبادی، جوش، حفیظ، اصغر، فانی، حسرت، جگر اور فراق گورکھپوری۔ یہ سب ایسے لوگ تھے جو کسی نہ کسی حوالے سے اس بات کے حق دار تھے کہ ان کے کلام کو بھی کلاسیکی شاعری کے آخری دور کے طور پر دیکھا جاتا۔ خاص طور پر شاد، یگانہ اور اکبر الہ آبادی کو چھوڑنا تو بہت ہی مشکل تھا۔ سو ہوا یوں کہ شاد اور اکبر کا انتخاب کلام بوجوہ ممکن نہ ہو سکا اور اس چکر میں یگانہ بھی رہ گیا۔ یہ تفصیل میں نے اس لئے بیان کی ہے تاکہ ریکارڈ درست ہو سکے اور یہ بات واضح ہو جائے کہ یگانہ

میرے نزدیک ابتدا سے ہی ایک اہم اور غیر معمولی شاعر تھا اور اس کا "نئے پرانے" میں شامل نہ ہونا محض ایک حادثہ تھا۔

بیسویں صدی کی اردو غزل میں یگانہ کا ایسے بلند مقام کا حامل ہونے کے باوجود اس طرح نظر انداز کیا جانا اپنی جگہ پر ایک بہت دلچسپ اور الجھا ہوا سوال ہے۔ اس صورت حال کی عمومی وجوہات کچھ یوں بیان کی جاتی ہیں۔

۱۔ غالب شکنی کا جنون

۲۔ فطری سنکی پن

۳۔ ناقدری زمانہ

۴۔ غیر مروج اور انوکھے موضوعات

۵۔ زبان و بیان کے سلسلے میں مخصوص رویہ

۶۔ خودپرستی

اب اگر غالب شکنی کے جنون اور اس فطری سنکی پن سے درگذر کر لیا جائے جس نے اقبال کو بھی اپنے مقابلے میں بڑا شاعر ماننے سے انکار کر دیا تھا تو باقی چاروں باتیں ایسی ہیں جو کم و بیش ہر اہم شاعر میں پائی جاتی ہیں۔ سو یگانہ کے اس ٹیڑھے پن کی اتنی بڑی سزا یقیناً محل نظر ٹھہرتی ہے' بلکہ انصاف کی بات تو یہ ہے کہ یہ سزا بہت زیادہ ہے۔ یگانہ یقیناً اس سے کہیں بہتر سلوک کا مستحق تھا اور ہے جو اس کے ساتھ روا رکھا گیا ہے۔

مجھے تو پوری اردو شاعری میں کم از کم زبان ' اس کے استعمال' ذخیرہ الفاظ اور انوکھے قوافی کے حوالے سے نظیر' انشا اور کسی حد تک اکبر الہ آبادی کے سوا کوئی شاعر یگانہ کا ہم پلہ نظر نہیں آتا۔ زبان کے ضمن میں طاقتور اور تخلیقی انداز کے حامل شاعروں میں میر' غالب' انیس' اقبال اور جوش سمیت بہت سے اساتذہ کا نام لیا جا سکتا ہے لیکن یہاں معاملہ زباندانی کا نہیں بلکہ زبان کے اس انوکھے اور جرات مندانہ استعمال کا ہے جو مروجہ شعری لغات سے باہر کسی اور منطقے کے باشندے ہیں۔

یگانہ کو اپنے قبیلے کے بقیہ تین ہم سفروں یعنی نظیر' انشا اور اکبر پر بھی ایک فوقیت حاصل ہے۔ اور وہ یہ کہ اس کی زبان اور ذخیرہ الفاظ نامانوس اور مختلف ہونے کے

باوجود روایتی معنوں میں "عوامی" نہیں ہے۔ وہ اس بلا کا خود پرست ہے کہ خواص اور عوام ہر دو سے مختلف نظر آنا چاہتا ہے۔ مثال کے طور پر یہ چند شعر دیکھئے' ان کا رنگ اردو غزل کی پوری روایت سے کہیں بھی ملتا نظر نہیں آتا

میر کے آگے زور کچھ نہ چلا
تھے بڑے میرزا یگانہ' دبنگ

مجھ سے معنی شناس پر جادو
حسن صورت حرام کیا کرتا

جفائے پنجۂ خونخوار سے جو بس نہ چلے
تو بن کے خشک نوالہ گلے' میں پھنستا جا

میں سمجھ لوں گا دوست ہے' تو کون!
مجھے رہ رہ کے تاننے والا

سر بزم پیاسے ہی مر جایئے
کہ تلچھٹ سے دامن بھگویا تو کیا!

کون دیتا ہے ساتھ مردوں کا
حوصلہ ہے تو باندھ ٹانگ سے ٹانگ

خواہ پیالہ ہو' خواہ نوالہ ہو
بن پڑے تو جھپٹ لے' بھیک نہ مانگ

بانسری نے دلوں کو موہ لیا
کون سنتا ہے منجگانہ بانگ!

پٹم کیوں نہ ہوجائے مانگے کی آنکھ
کہ عینک سے دھاگا پرویا تو کیا!

یہیں سے سیر کر لو یاس' اتنی دور کیوں جاؤ
عدم آباد کا ڈانڈا ملا ہے کوئے قاتل سے

منہ زوریوں کا حوصلہ سرکار حسن سے
آخر پڑی وہ مار کہ چہرہ ادھڑ گیا

مثالیں اور بھی بہت سی ہیں لیکن میں اس مشتے از خروارے پر اکتفا کروں گا کیوں کہ حصہ انتخاب میں اور بہت سے شعر یقیناً آپ کی نظر سے گزریں گے۔

یگانہ کی جس خوبی نے مجھے سب سے زیادہ متاثر کیا ہے وہ اس کا انسانی فطرت کا وسیع مشاہدہ اور ذہن انسانی کے فکری پھیلاؤ کا بے مثال شعور ہے جن کی مدد سے وہ ایسی کیفیات کو شعر کے دو مصرعوں میں انتہائی سہولت اور فن کاری سے محدود کر دیتا ہے جنھیں سمیٹنے میں بڑے بڑے نامور شاعروں کو دانتوں پسینہ آ جاتا ہے۔

زیادہ مثالوں سے گریز کرتے ہوئے صرف تین شعروں کا حوالہ دوں گا۔ اس سے ملتی جلتی کیفیات کے شعر ممکن ہے آپ کی نظر سے گزرے ہوں مگر یگانہ کا ڈھب یگانہ کا ہی ہے

سمجھتے کیا تھے مگر سنتے تھے ترانۂ درد
سمجھ میں آنے لگا جب تو پھر سنا نہ گیا

امید و بیم نے مارا مجھے دوراہے پر
کہاں کے دیر و حرم گھر کا راستہ نہ ملا

لو لگا کے شہیدوں میں ہو گئے داخل
ہوس تو نکلی مگر حوصلہ کہاں نکلا

اردو غزل میں لہجے کا تیکھا پن بھلے ہی یگانہ سے شروع نہ ہوا ہو لیکن انا، تکبر، خودی اور خود پسندی کے پہلو بہ پہلو گھومتے دائروں کے اندر یگانہ کی شخصیت محو رقص رہی ہے۔

ان پر بغور نظر ڈالی جائے اور ان سے تشکیل پانے والے مخصوص مزاج کو سمجھنے کی کوشش کی جائے تو یہ بات اظہر من الشمس ہو جاتی ہے کہ یگانہ وہ بہادر سپاہی ہے جس کی قسمت میں ایک ہارے ہوئے لشکر کا حصہ بننا لکھ دیا گیا تھا یعنی اگر ہار جیت کے روایتی اور مروجہ تصورات سے ہٹ کر دیکھا جائے تو وہ یقیناً ایک منفرد، انوکھا، توانا اور غیر معمولی شاعر کہلانے کا حق دار ہے اور اردو شاعری کے شہر صد رنگ میں اقبال کے بعد داخلے کے جن نئے دروازوں کا اضافہ ہوا ہے ان میں یگانہ کا بنایا ہوا راستہ یقیناً انتہائی ممتاز اور منفرد نظر آتا ہے۔

یہ مساوات تحفتہ ناچیز
وہ یگانہ کے نام کیا کرتا

عجب کیا ہے ہم ایسے گرم رفتاروں کی ٹھوکر سے
زمانے کے بلند و پست کا ہموار ہو جانا

کیوں آنے لگے شاہد عصمت سربازار
کیا خاک کے پردے میں چھپا بھی نہیں جاتا

آئنہ ہے وہ زیارت گاہ جس کے سامنے
خود پرستوں کے لئے سجدہ روا ہو جائے گا

سراپا راز ہوں میں کیا بتاؤں کون ہوں کیا ہوں
سمجھتا ہوں مگر دنیا کو سمجھانا نہیں آتا

آئینہ رکھ کے آپ بھی سجدے میں جھک گئے
اب کیا کہیں گے کافر و دیندار دیکھ کر

کجا طرز یگانہ اور کجا انداز بیگانہ
بجا ہے رشک تم جیسوں کو ایسے صاحب فن پر

ذات میں اپنی کیا نہیں موجود
عشق سا زہر عقل سا تریاک

مستانہ رقص کیجئے گرداب حال میں
بیڑا ہے پار ڈوب کر اپنے خیال میں

مزا جب ہے کہ رفتہ رفتہ امیدیں پھلیں پھولیں
مگر نازل کوئی فضل الٰہی ناگہاں کیوں ہو!

مرا دشمن خود اپنی موت تو نے تو نہیں مارا
کوئی مرد عمل جھوٹی خوشی پر شاداں کیوں ہو

اپنے دم کی ہے روشنی ساری
دیدہ دل تو وا کرے کوئی

یگانہ آپ کی بالا روی کے کیا کہئے
مجال کیا ہے جو دامن پہ گرد رہ بیٹھے

یگانہ تو ہی جانے اپنی حقیقت
تجھے کون تیرے سوا جانتا ہے

تو حسن کا ہے دیوتا میں عشق کا پیمبر
دیکھیں تو کون اپنے سانچے میں ڈھالتا ہے

بزم دنیا میں یگانہ، ایسی بیگانہ روی
میں نے مانا عیب ہے، لیکن ہنر میرے لئے

میں پیمبر نہیں یگانہ سہی
اس سے کیا کسر شان میں آئی

یگانہ وہی فاتح لکھنؤ ہیں
دل سنگ و آہن میں گھر کرنے والے

ایسے ہنگامہ زار ہستی میں
ایک اللہ کا نام کیا کرتا

اک معنئی بے لفظ ہے اندیشۂ فردا
جیسے خط قسمت کہ پڑھا بھی نہیں جاتا

ورد مندوں کی کہانی پر دل بے دسترس
ہاتھ مل کر فرض سے اپنے ادا ہو جائے گا

اصلاح کی مجال نہیں ہے تو کیا ضرور
بے ربطئی نوشتۂ تقدیر دیکھنا

فلک ہے دونوں طرف کا نگاہباں جب تک
نہ اپنی آنکھ اٹھے گی نہ پردہ محمل کا

دکھایا گور سکندر نے بڑھ کے آئینہ
جو سر اٹھا کے کوئی زیر آسماں نکلا

ماتم سرائے دہر میں کس کس کو روئیے
اے وائے درد دل نہ ہوا درد سر ہوا

دل آگاہ نے بیکار میری راہ کھوٹی کی
بہت اچھا تھا انجام سفر سے بے خبر ہونا

شانہ ہلا کے موت نے چونکا دیا مجھے
محو طلسم بندئی اسرار دیکھ کر

خدا معلوم اس آغاز کا انجام کیا ہو گا
چھڑا ہے ساز ہستی مبتدائے بے خبر ہو کر

اے خزاں پروردہ دل فکر چمن سے باز آ
اپنے اوپر رحم کر اے دشمن جان بہار

اپنے اپنے رنگ میں اور اپنے اپنے حال میں
کوئی حیران خزاں کوئی پشیمان بہار

سمجھ کا پھیر ہے یا وقت کا تقاضا ہے
وہی برے نظر آنے لگے بھلے کیوں کر

بتاؤں کیا تمہیں بازار کا اتار چڑھاؤ
بنا رہے گا یہی بھاؤ دن ڈھلے کیوں کر

کہتے ہیں اپنے فعل کا مختار ہے بشر
اپنی تو موت تک نہ ہوئی اختیار میں

لیلی کجا، کجا یہ طلسمات عنصری
کیا ڈھونڈتا ہے پردہء گرد و غبار میں

دنیا سے پاس جانے کو جی چاہتا نہیں
واللہ کیا کشش ہے اس اجڑے دیار میں

عمر بیداریٔ موہوم کے دھوکے میں کٹی
اب جو چونکے ہیں تو آپ اپنا گلہ کرتے ہیں

صورت نہ پکڑے جلوہ بے معنئی حباب
قطرہ اگر اسیر طلسم ہوا نہ ہو

بے گنہ وار ایک ہی رخ سے نہ دیکھئے
دنیا کے ہر مشاہدہ ناگوار کو

صبح و شام زندگی خواب پریشاں ہی سہی
کچھ حقیقت کا بھی جلوہ، جلوہ باطل میں ہے

ہاتھ آئے کوئی چاند ستارہ تو جانئے
ہے عرش پر دماغ فلاطوں، ہوا کرے

رفتار زندگی میں سکوں آئے کیا مجال
طوفاں ٹھہر بھی جائے تو دریا بہا کرے

یہ کیا صفت ہے کہ ایک ایک خاک کا پتلا
جہاں میں آپ ہی اپنی مثال ہوتا ہے

آ رہی ہے یہ صدا کان میں ویرانوں سے
کل کی ہے بات کہ آباد تھے دیوانوں سے

آنکھ اٹھا کر نہ کسی سمت قفس سے دیکھا
موسم گل کی خبر سنتے رہے کانوں سے

موت کی یاد میں نیند اور بھی اڑ جاتی ہے
نیند آ جائے تو کچھ موت کا ساماں ہو جائے

فلک نے بھول بھلیوں میں ڈال رکھا تھا
ہم ان کو ڈھونڈتے یا اپنی جستجو کرتے

ازل سے جو کشش مرکزی کے تھے پابند
ہوا کی طرح وہ کیا سیر چار سو کرتے

بہارستان عبرت میں یہ گل کیا' خار کیا' خس کیا
سراپا سب کے سب آلودہ رنگ خزاں آئے

رات دن شوق رہائی میں کوئی سر پٹکے
کوئی زنجیر کی جھنکار سے دیوانہ بنے

بتوں کو دیکھ کے سب نے خدا کو پہچانا
خدا کے گھر تو کوئی بندہ خدا نہ گیا

داور حشر کچھ نہ پوچھ دور شباب کا مزا
شہد بہشت تھا مگر دست بخیل کا دیا

سجدہ صبح و شام کیا کرتا
غائبانہ سلام کیا کرتا

امانت میں تیری خیانت نہ کی
مگر مفت کا بوجھ ڈھویا تو کیا

پہنا دیا ہے طوق غلامی تو ایک دن
میری طرف بھی مالک تقدیر دیکھنا

مبارک نام آزادی' سلامت دام آزادی
دعائیں دوں کسے یا رب اسیر بال و پر ہو کر

اس طرف سات آسماں اور اس طرف اک ناتواں
تم نے کروٹ تک نہ لی دنیا کو برہم دیکھ کر

داور حشر ہوشیار' دونوں میں امتیاز رکھ
بندہ ناامید میں اور بندہ بے نیاز میں

صدمے دیئے تو صبر کی دولت بھی دے گا وہ
کس چیز کی کمی ہے سخی کے خزانے میں

موت مانگی تھی خدائی تو نہیں مانگی تھی
لے دعا کر چکے اب ترک دعا کرتے ہیں

پچھلا پہر ہے کاتب اعمال ہوشیار
آمادہ گناہ کوئی جاگتا نہ ہو

ذرہ بھی ہے اک عالم انوار الٰہی کا
ادنیٰ ہی سہی لیکن نسبت تو ہے اعلیٰ سے

سوچتا ہوں جب تو میں ہی میں ہوں اور کوئی نہیں
ہو نہ ہو، کچھ بھید اس اندیشہ باطل میں ہے

خدا ایسے بندے سے کیوں پھر نہ جائے
جو بیٹھا دعا مانگتا جاتا ہے

کیسے کیسے خدا بنا ڈالے
کھیل بندے کا ہے، خدا کیا ہے

حق میں اوروں کے تری ذات سراپا احسان
وائے قسمت کہ مری ضد سے تو عادل ہو جائے

اپنی ضد اپنی مشیت پہ جو آ جائے کوئی
یاس سب حسن عمل دفتر باطل ہو جائے

نکل ہی جاتا ہے مطلب تری قسم کھا کر
تو بندگان ضرورت کا آفریدہ سہی

نہ چلی کچھ تو بدعا ہی سہی
دہن بے لگام کیا کرتا

وقت جس کا کٹے حسینوں میں
کوئی مردانہ کام کیا کرتا

الٹی سیدھی سنتا رہ اپنی کہہ تو الٹی کہہ
سادہ ہے تو کیا جانے بھانپنے کا ہے ڈھب کیا

پڑ چکے بہت پالے ڈس چکے بہت کالے
موذیوں کے موذی کو فکر نیش عقرب کیا

میرزا یگانہ واہ' زندہ باد' زندہ باد
اک بلائے بے درماں جب تم کیا تھے اور اب کیا

اندر ہی اندر کیوں کھپ رہے ہو
کر بیٹھے کوئی ناکردنی کیا

الٹی تھی مت زمانئہ مردہ پرست کی
میں ایک ہوشیار کہ زندہ ہی گڑ گیا

علاج اہل حسد زہر خند مردانہ
ہنسی ہنسی میں تو ان احمقوں کو ڈستا جا

تمہیں بھی مزا اس کا چکھنا پڑا
یگانہ کو ہاتھوں سے کھویا تو کیا

دوا کا اور دعا کا امتحاں منظور تھا ورنہ
بھلے چنگے گوارا تھا کسے بیمار ہو جانا

مجھے دل کی خطا پر یاسؔ شرمانا نہیں آتا
پرایا جرم اپنے نام لکھوانا نہیں آتا

مصیبت کا پہاڑ آخر کسی دن کٹ ہی جائے گا
مجھے سر مار کر تیشے سے مر جانا نہیں آتا

پیالہ خالی اٹھا کر لگا لیا منہ سے
کہ یاسؔ کچھ تو نکل جائے حوصلہ دل کا

شاید خدانخواستہ آنکھیں دعا کریں
اچھا نہیں نوشتۂ تقدیر دیکھنا

باد مراد چل چکی لنگر اٹھاؤ یاسؔ
پھر آگے بڑھ کے خوبیٔ تقدیر دیکھنا

ہاتھ الجھا ہے گریباں میں تو گھبراؤ نہ یاسؔ
بیڑیاں کیونکر کٹیں! زنداں کا در کیونکر کھلا!

مبارک کباد

## زندگی

لذت

کل کی کیا فکر؟ ہر چہ بادا باد

فلک کو دیکھتا ہوں اور زمیں کو آزماتا ہوں
مسافر دروطن خانہ بدوش رہگذر ہو کر

کہیں پتھر بھی ہو سکتا ہے پانی
دعاؤں کی رسائی ہو چکی بس!

پڑے ہو کون سے گوشے میں تنہا
یگانہ کیوں خدائی ہو چکی بس!

میں کہاں اور کہاں کے پست و بلند
ایک ٹھوکر میں تھا بکھیڑا پاک

خواب شیریں کی ہوس کیا خواب بد کا خوف کیا
آچکی اب نیند اپنے دیدہ بیدار میں

حضرت دل ہیں عجب ظالم مظلوم نما
گھر جلا کر کف افسوس ملا کرتے ہیں

جو غم بھی کھائیں تو پہلے کھلائیں دشمن کو
اکیلے کھائیں گے ایسے تو ہم گنوار نہیں

کھٹکا لگا نہ ہو تو مزا کیا گناہ کا
لذت ہی اور ہوتی ہے چوری کے مال میں

دل اپنا جلاتا ہوں کعبہ تو نہیں ڈھاتا
اور آگ لگاتے ہو کیوں تہمت بے جا سے

جس کی تلوار کا ہو لوہا تیز
حجت ناتمام کیا کرتا

پیٹ کے ہلکے لاکھ بڑ ماریں
کوئی کھلتا ہے جاننے والا

منہ سے نہ بولو سر سے تو کھیلو
ہے ماجرائے ناگفتنی کیا!

کیا عجب ہے جو حسینوں کی نظر لگ جائے
خون ہلکا ہے بہت آپ کے دیوانے کا

شریک حال ہوا ہے جو فقر و فاقہ میں
گڑے گا ساتھ ہی کیا اپنے سمھاں اپنا

منہ جو تکتی ہو مرگ دشمن کا
ایسی تلوار پر خدا کی مار

چلتی ہے کس طرف کی ہوا پچھلی رات سے
جی سن سے ہو گیا رخ بیمار دیکھ کر

مجال تھی کوئی دیکھے تمہیں نظر بھر کر
یہ کیا ہے آج پڑے ہو ملے دلے کیوں کر

مرے فرشتے بھی شائد ہیں آپ کے جاسوس
کہ آہ کرتے ہی پرچہ لگے خبر گذرے

## رباعیات

دنیا میں کوئی اور حسیں ہو بھی تو کیا
پردہ میں کوئی پردہ نشیں ہو بھی تو کیا
عالم میں جدھر دیکھئے میں ہی میں ہوں
حسن اپنے سوا اور کہیں ہو بھی تو کیا

مہماں ہے تو صاحب خانہ ہوں میں
آئینہ حسن جاودانہ ہوں میں
مجھ سا کوئی دوسرا نہ تجھ سا کوئی
یکتائے جہاں تو ہے یگانہ ہوں میں

بخشش کسے کہتے ہیں عنائت کیسی
ملک اپنا ہے مال اپنا اجازت کیسی

قدرت کا خزانہ ہے تصرف کے لئے
تقدیر کے ٹکڑوں پہ قناعت کیسی

بادل کو لگی کھلتے برستے کچھ دیر
دل کو نہ لگی اجڑتے بستے کچھ دیر
بچوں کی طرح موم ہوا ہوں ایسا
روتے کچھ دیر ہے نہ ہنستے کچھ دیر

کعبہ کی طرف دور سے سجدہ کر لوں
یا دیر کا آخری نظارہ کر لوں
کچھ دیر کی مہمان ہے جاتی دنیا
ایک اور گنہ کر لوں کہ توبہ کر لوں؟

دن کو دن سمجھے اور نہ رات کو رات
وقت کی قدر جاننے والا
کار مرگ کے دن کا تھوڑی دیر کا جھگڑا
دیکھنا ہے یہ ناداں جینے کا ہے کرتب کیا!

چار دن کی زندگی ہے کاٹ دو ہنس بول کر
دل لگا لو پھر قفس ہی آشیاں ہو جائے گا
کوئی طوفان آیا یا ہمارے کان بجتے ہیں
ذرا اے بندگان نا خدا ہشیار ہو جانا

کیوں نقش قدم دیکھ کے کھاتے ہو پچھاڑیں
کیا قافلہ سے کوئی بچھڑ کر نہیں ملتا
مجھے اے نا خدا آخر کسی کو منہ دکھانا ہے
بہانہ کرکے تنہا پار اتر جانا نہیں آتا

رہائی کا خیال خام ہے یا کان بجتے ہیں
اسیرو بیٹھے کیا ہو گوش برآواز در ہو کر
زمانے بھر کا منہ تکتے ہیں کیوں، اپنی طرف دیکھیں
بسر کرنا ہے جن کو رنگ و بوئے رائیگاں ہو کر

اٹھو اے سونے والو سر پہ دھوپ آئی قیامت کی
کہیں یہ دن نہ ڈھل جائے نصیب دشمناں ہو کر
ہوشیار اے چشم نرگس اے نگہبان بہار
ہے زوال رنگ و بو دست و گریبان بہار

چھوڑ کر جائیں کہاں اب اپنے ویرانے کو ہم
کون سی جا ہے جہاں حکم خزاں جاری نہیں
اسیر حال نہ زندوں میں ہیں نہ مردوں میں
زبان کٹتی ہے آپس میں گفتگو کرتے

## رباعیات

بے درد ہو کیا جانو مصیبت کے مزے
ہیں رنج کے دم قدم سے راحت کے مزے

دوزخ کی ہوا تو پہلے کھالو صاحب
کیا ڈھونڈتے ہو ابھی سے جنت کے مزے

دنیا سے الگ جا کے کہیں سر پھوڑو
یا جیتے ہی جی مردوں سے ناتا جوڑو
کیوں ٹھوکریں کھانے کو پڑے ہو بیکار
بڑھنا ہے بڑھو نہیں تو رستا چھوڑو

ارمان نکلنے کا مزا ہے کچھ اور
اور رشک سے جلنے کا مزا ہے کچھ اور
ہاں یاد ہے دوست سے لپٹنا لیکن
دشمن کو کچلنے کا مزا ہے کچھ اور

کیا کیجئے رام رام کرتے ہی بنی
جائز نہ سہی یہ کام کرتے ہی بنی
چاہا تو بہت بتوں سے منہ پھیر چلوں
جھکتے ہی بنی سلام کرتے ہی بنی

بیداری موہوم کا پردہ نہ ہٹا
کہنے کے لئے وقت بہت خوب کٹا
کیا جانئے کل سے آج تک کیا گذری
پانی کتنا بہا ہے پل کتنا گھٹا

وہ حسن ہی کیا ہے جو گلے کٹوائے
فتنے برپا کرے قیامت ڈھائے

دیکھا ہو گا مگر نہ دیکھا ہو گا
وہ حسن جسے دیکھ کے چپ لگ جائے

رہنے کا نہیں بند در آزادی
دیتی ہیں ہوائیں خبر آزادی
دروازہ زنداں در توبہ تو نہیں
ہاں المدد اے درد سر آزادی

کس دھن میں کوہکن نے تیشہ باندھا
سر پھوڑ کے خود موت کا آگا باندھا
قدموں سے لپٹ گئی حیات ابدی
کیا عشق کے سر اجل نے سہرا باندھا

جاگتے کو جگائے کون ایسے کو گدگدائے کون
لیجیے آگئی ہنسی، دیکھیے وہ جگا دیا

کدھر چلا ہے ادھر ایک رات بستا جا
گرجنے والے گرجتا ہے کیا برستا جا

بقدر ذوق تماشائے حسن نا ممکن
ترسنے میں بھی ہے اک کیفیت، ترستا جا

کسی کے روپ میں تم بھی تو اپنے درشن دو
جہاں میں شاہ و گدا رنگ لائے ہیں کیا کیا

خدا بچائے کہ نازک ہے ان میں ایک سے ایک
تنک مزاجوں سے ٹھہرا معاملہ دل کا

کسی کے ہو رہو اچھی نہیں یہ آزادی
کسی کی زلف سے لازم ہے سلسلہ دل کا

ہوش اڑ نہ جائیں صنعت بہزاد دیکھ کر
آئنہ رکھ کے سامنے تصویر دیکھنا

حضور دوست یگانہ کچھ ایسے غائب تھے
زبان گنگ تک آیا نہ ماجرا دل کا

اپنے ہی سائے سے بھڑکتے ہو
ایسی وحشت پہ کیوں نہ آئے پیار

تمہی نہ چاہو لپٹنا تو بس چلے کیوں کر
ہنسی ہنسی میں لگا لے کوئی گلے کیوں کر

نگاہ کیوں نہ کوئی عیب بے وفائی کا
بلائے حسن ہو نازل تو پھر ٹلے کیوں کر

جبھی تو اپنی طرف دیکھتا ہوں حیرت سے
پڑا ہے عشق مرا آپ کے گلے کیوں کر

گھل گئے، جیسے موم کی مرہم
کیوں بڑھایا تھا دل جلوں سے تپاک!

یوسف کو لے اڑے نہ کہیں بوئے پیرہن
اخفائے حسن و عشق نہیں اختیار میں

دیوانے بن کے ان کے گلے سے لپٹ بھی جاؤ
کام اپنا کر لو پاس بہانے بہانے میں

مفت میں سن لی یگانہ کی غزل
ان سنی کر دی جو مطلب کی کہی

صورت ہی ایسی پیاری دیکھو تو رال ٹپکے
فطرت کا اقتضا ہے بندے کی کیا خطا ہے

نشّہ حسن کو اس طرح اترتے دیکھا
عیب پر اپنے کوئی جیسے پشیماں ہو جائے

حسن وہ حسن کبھی جس کی حقیقت نہ کھلے
رنگ وہ رنگ جو ہر رنگ میں شامل ہو جائے

ہے جان کے ساتھ اور اک ایمان کا ڈر بھی
وہ شوخ نہیں دیکھ نہ لے مڑ کے ادھر بھی

حسن کیا خواب سے ہوا بیدار
جان تازہ، جہان میں آئی

بات ادھوری مگر اثر دونا
اچھی لکنت زبان میں آئی

یہ غنچہ کیسا کہ دیکھنے سے دل دھڑکتا ہے
ارے یہ ایک ہی فتنہ ہے نودمیدہ سہی

نگاہ حسن سے اب تک وفا ٹپکتی ہے
ستم رسیدہ سہی پیرہن دریدہ سہی

مری نظر کی خطا ہو گی یا گلوں کی خطا
تمہارے راج میں کانٹے ہی برگزیدہ سہی

چتونوں سے ملتا ہے کچھ سراغ باطن کا
چال سے تو کافر پر سادگی برستی ہے

آنکھوں آنکھوں میں لے لیا وعدہ
کانوں کان ایک کو خبر نہ ہوئی

کروں تو کس سے کروں دردِ نارسا کا گلہ
کہ مجھ کو لے کے دلِ دوست میں سما نہ گیا

خوشی میں اپنے قدم چوم لوں تو زیبا ہے
وہ لغزشوں پہ مری مسکرائے ہیں کیا کیا

ہوائے کوچۂ قاتل سے بس نہیں چلتا
کشاں کشاں لئے جاتا ہے ولولہ دل کا

بس ایک سایۂ دیوار یار کیا کم ہے
اٹھا لے سر سے مرے سایہ آسماں اپنا

کدھر سے آتی ہے یوسف کی بوئے مستانہ
خراب پھرتا ہے جنگل میں کارواں اپنا

کیسے کیسے دل زدہ آوارہ صحرا ہوئے
روئے لیلی جس طرح محمل میں تھا محمل میں ہے

کوئی ضد تھی یا سمجھ کا پھیر تھا
من گئے وہ میں نے جب الٹی کہی

درد کا قحط ہو دل کا کوئی گاہک نہ رہے
وائے بر عشق کہ بازیچۂ طفلاں ہو جائے

سلامت رہیں دل میں گھر کرنے والے
اس اجڑے مکاں میں بسر کرنے والے

خودی کا نشہ چڑھا آپ میں رہا نہ گیا
خدا بنے تھے یگانہ مگر بنا نہ گیا

ہنسی میں وعدہ فردا کو ٹالنے والو
لو دیکھ لو وہی کل آج بن کے آ نہ گیا

گناہ زندہ دلی کہیئے یا دل آزاری
کسی پہ ہنس لیئے اتنا کہ پھر ہنسا نہ گیا

سمجھتے کیا تھے مگر سنتے تھے ترانۂ درد
سمجھ میں آنے لگا جب تو پھر سنا نہ گیا

چلو بھر میں متوالی، دو ہی گھونٹ میں خالی
یہ بھری جوانی کیا، جذبۂ لباب کیا

پہاڑ کاٹنے والے زمیں سے ہار گئے
اسی زمین میں دریا سمائے ہیں کیا کیا

بلند ہو تو کھلے تجھ پہ راز پستی کا
بڑے بڑوں کے قدم ڈگمگائے ہیں کیا کیا

ہوا کے دوش پہ جاتا ہے کاروان نفس
عدم کی راہ میں کوئی پیادہ پا نہ ملا

امید و بیم نے مارا مجھے دوراہے پر
کہاں کے دیر و حرم گھر کا راستہ نہ ملا

بڑھتے بڑھتے اپنی حد سے بڑھ چلا دست ہوس
گھٹتے گھٹتے ایک دن دست دعا ہو جائے گا

اسیر و شوق آزادی مجھے بھی گدگداتا ہے
مگر چادر سے باہر پاؤں پھیلانا نہیں آتا

جرس نے مژدہ منزل سنا کے چونکایا
نکل چلا تھا دبے پاؤں کارواں اپنا

زیست کے ہیں یہی مزے واللہ
چار دن شاد، چار دن ناشاد

کون دیتا ہے داد ناکامی
خون فرہاد برسر فرہاد

تو بھی جی اور مجھے بھی جینے دے
جیسے ہے آباد گل سے پہلوئے خار

صبر کرنا سخت مشکل ہے تڑپنا سہل ہے
اپنے بس کا کام کر لیتا ہوں آساں دیکھ کر

کون سمجھائے کہ دنیا گول ہے
آپ نے جیسی سنی ویسی کہی

بھڑکتی جاتی ہے شوق فنا میں شمع کی لو
نسیم صبح سے اور اشتعال ہوتا ہے

بہار عمر گزشتہ پہ بھیجئے صلوٰۃ
خزاں میں ذکر خزاں حسب حال ہوتا ہے

ازل سے کشتی امید ، تھی یگانئہ ساحل
جہاں پایاب ہے دریا وہاں بھی تہہ نشیں ہوتی

ہوا کے ساتھ پھرے چار سمت آوارہ
قدم اٹھائے جو رفتار پر زمانے کی

پلٹ کے گل میں نہ آئے گی بوئے مستانہ
نکل کے روح رواں منہ نہیں دکھانے کی

اب اپنے ختم سفر میں کچھ ایسی دیر نہیں
جو دیر ہے تو فقط تھک کے بیٹھ جانے کی

دیکھے کوئی جاتی ہوئی دنیا کا تماشا
بیمار بھی سر دھنتا ہے اور شمع سحر بھی

دنیا کی ہوا راس نہ آئے گی کسی کو
ہر سر میں ہوائے عدم آباد رہے گی

ہر شام ہوئی صبح کو اک خواب فراموش
دنیا یہی دنیا ہے تو کیا یاد رہے گی

ایسی آزاد روح اس تن میں
کیوں پرائے مکان میں آئی

یہ کنارہ چلا کہ ناؤ چلی
کہیے کیا بات دھیان میں آئی!

علم کیا، علم کی حقیقت کیا
جیسی جس کے گمان میں آئی

کارگاہ دنیا کی نیستی بھی ہستی ہے
اک طرف اجڑتی ہے ایک سمت بستی ہے

صلح کر لو یگانہ، غالب سے
وہ بھی استاد تم بھی اک استاد

## رباعیات

دیکھوں کب تک گلوں کی تشنہ لبی
فطرت کا گلہ کروں تو ہے بے ادبی

پیاسے تو ہیں جان بلب مگر ابر کرم
دریا پہ برستا ہے زہے بوالعجبی

وہ دل جسے لاگ ہو کسی سے نہ لگاؤ
اس خاک کا ڈھیر ہے جہاں چونپ نہ چاؤ
ٹھنڈی مٹی کا اک انوکھا پتلا
پہلو میں بھی ہو تو دیکھ لو دور نہ جاؤ

آئینہ حق ہوں خود پسندی کیسی؟
دیوانہ ہو اپنا ہوش ، مندی کیسی؟
عالم میں جدھر دیکھئے میں ہی میں ہوں
پستی کسے کہتے ہیں بلندی کیسی؟

مہماں نہ سہی ایک مسافر ہی سہی
دل رکھ لے بلا سے بار خاطر ہی سہی
ساقی دکن ہم بھی ترے دور میں ہیں
اول نہ سہی سب سے آخر ہی سہی

گھر بولتا ہے آج دلدر بھاگا
دکھ درد کے ماروں کا نصیبہ جاگا
دن کاٹے ہیں گن گن اسی دن کے لیے
ساجن آتے ہیں راستہ دے کاگا

کیا بھانپتا ہے بھانپنے والے باز آ
حیران ہے کیوں ناپنے والے باز آ
کھنچتی جائے گی اور دور سے دور
آفاق کی حد ناپنے والے باز آ

ان عقل کے اندھوں میں ہے یہ غل کیسا
میں جز ہوں وہ کل ہے یہ تعقل کیسا!
کل ہی کل ہے کہاں کا جز کیسا جز!
جز کل سے الگ ہوا تو پھر کل کیسا!

ان مردہ پرستوں کا ہے مذہب کیسا
ہر حال میں بد حال یہ مشرب کیسا
کل تک تو اس کل سے آزردہ تھے
گزرے ہوئے کل کا ذکر خیر اب کیسا

ممکن نہیں اندیشہ فردا کم ہو
ہاں نشہ غفلت ہو تو ایذا کم ہو
ٹلنے کی نہیں قیامت اچھا نہ ٹلے
منہ پھیر لو اپنا کہ یہ دھڑکا کم ہو

کرشن کا ہوں پجاری علی کا بندہ ہوں
یگانہ شان خدا دیکھ کر رہا نہ گیا

کانوں میں آ رہی ہے کیا دور کے ڈھول کی صدا
خواب نظر فریب نے سر تو نہیں پھرا دیا

جسے چاہا بنا لیا دیوتا
بندہ بے امام کیا کرتا

کوئی ایسا بھی ہے جاننے والا
جان کر تجھ کو ماننے والا

آندھیاں رکیں کیونکر، زلزلے تھمیں کیونکر
کارگاہ فطرت میں پاسبانی رب کیا

اپنی بستی میں بھی کچھ دنگ آ پڑا
علم کا سودا بہت مہنگا پڑا

قیامت تک یہ کالے کوس روشن ہو نہیں سکتے
عبث ہے ہر کتاب کافر و دیندار ہو جانا

امتیاز صورت و معنی سے بیگانہ ہوا
آئنہ کو آئنہ، حیراں کو حیراں دیکھ کر

مر گھٹے کے لیے ہے وقت کتنے کے لیے
مفت دن گننے کو ہم پکڑے گئے بیگار میں

شش جہت میں ہے ترے جلوہ بے فیض کی دھوم
کان مجرم ہیں مگر آنکھ گنہگار نہیں

آواز بازگشت پہ دیتے ہو کیا صدا
کس سے الجھ رہے ہو جواب و سوال میں

ایک جھلک ہی دکھلا دے تو دور سے جھک کے سلام کروں
اس پار جگت کے ہو گا کوئی اس پار نہیں تو کچھ بھی نہیں

اس کی نگاہ شوق کے قربان جائیے
مجھ ایسے بے نشاں کو جو پیدا کرے کوئی

خدا میں شک ہے تو ہو موت میں نہیں کوئی شک
مشاہدے میں کہیں احتمال ہوتا ہے۔۔۔!

آگ میں ہو جسے جلنا تو وہ ہندو بن جائے
خاک میں ہو جسے ملنا وہ مسلماں ہو جائے

کیا وعدہ دیدار کو سچ جانتے ہو یاس
لو فرض کرو آئی قیامت کی سحر بھی

حسن بے تماشا کی دھوم کیا معمہ ہے
کان بھی ہیں نا محرم آنکھ بھی ترستی ہے

بندہ خاص پہ مرا مولا
نگہ فیض عام کیا کرتا

تو کہاں اور کہاں وہ جلوہ پاک
دل بے باک تیری آنکھ میں خاک

ہوتا ہے بند ایک در کھلتے ہیں صد ہزار در
اپنی طرف سے شک نہ کر نیت کار ساز میں

یادِ خدا کا وقت بھی آئے گا کوئی یا نہیں
یادِ گناہ کب تلک شام و سحر نماز میں

کافر و دیندار میں ہے رشتہ واحد وہی
سب کے سب جکڑے ہوئے ہیں ایک ہی زنجیر میں

کیا بتاؤں کیا ہوں "میں" قدرت خدا ہوں میں
میری خود پرستی بھی عین حق پرستی ہے

## رباعیات

ہنگامۂ عیش جان جوکھم ہی سہی
آخر میں بلا سے تلخئ غم ہی سہی
عید اپنی منا لیتے محرم ہی سہی
مل جاتے کہیں آپ جہنم ہی سہی

دیکھے ہیں بہت چمن اجڑتے بستے
کیا کیا گل پیرہن لٹے ہیں سستے
اے زندہ دلان باغ اتنا نہ ہنسو
آنسو بھی نکل آتے ہیں ہنستے ہنستے

سورج کو گہن میں نہیں دیکھا شاید
ہاں چاند کو گہن میں نہیں دیکھا شاید
اے حسن دو روزہ پہ اکڑنے والو
یوسف کو کفن میں نہیں دیکھا شاید

ہوں صید کبھی اور کبھی صیاد ہوں میں
کچھ بھی نہیں **بازیچۂ** اضداد ہوں میں
مختار مگر اپنی حدوں میں محدود
ہاں وسعتِ زنجیر تک آزاد ہوں میں

ہم ایسوں کا درد رکھنے والا تو کون
یہ لذتِ تلخ چکھنے والا تو کون
کیا دل کو ٹٹولتا ہے اندھوں کی طرح
ٹوٹا ہی سہی پرکھنے والا تو کون!

## رباعیات

واللہ یہ زندگی بھی ہے قابلِ دید
اک طرفہ طلسم، دید جس کی نہ شنید
مستی کی دھن میں جھومتا جاتا ہوں
پیچھے تو اجل ہے آگے آگے امید

یارو نہیں کوئی جلتے رہنے کے سوا
سانچے میں فنا کے ڈھلتے رہنے کے سوا
اے شمع تری حیات فانی کیا ہے!
جھونکے کھانے سنبھلتے رہنے کے سوا

واللہ یہ دنیا بھی عجب دنیا ہے
ہر رنگ میں وہ کشش کہ دل کھنچتا ہے
منہ بولتی جیتی جاگتی تصویریں
اعجاز ہنر ہے یا کوئی دھوکا ہے

☆

ہنس بھی لیتا ہوں اوپری دل سے
جی نہ بہلے تو کیا کرے کوئی

کیا خبر تھی یہ خدائی اور ہے
ہائے میں نے کیوں خدا لگتی کہی

آغوش میں اب ان کو کیا کھینچتی ہے دنیا
بیگانگی نے جن کو اپنا بنا لیا ہے

گلا نہ کاٹ سکے اپنا وائے ناکامی
پہاڑ کاٹتے ہیں روز و شب مصیبت کے

وطن تو کیا ہے ہوائے وطن سے ہیں بیزار
لپٹ رہے جو بگولوں سے دشت غربت کے

نا آشنائے حسن کو کیا اعتبار عشق
اندھوں کے آگے بیٹھ کے رویا نہ کیجئے

کیا کوئی پوچھنے والا بھی اب اپنا نہ رہا
درد دل رونے لگے پاس جو بیگانوں سے

یوں اجل ہے کوئی ایسا کہ مرا منہ سی دے!
بات اپنی نہیں بننے کی تو اچھا نہ بنے

وہ محروم ازل ہیں دھیان میں لاتا نہیں کوئی
محبت کیا، نکموں سے عبادت تک نہیں ہوتی

دل کو لہراتا ہے ہنگامۂ زندان بلا
شورِ ایذا طلبی وجد میں لاتا ہے مجھے

ننگِ محفل مرا مردہ، مرا زندہ بھاری
کون اٹھاتا ہے مجھے کون بٹھاتا ہے مجھے!

نہ انتقام کی عادت نہ دل دکھانے کی
بدی بھی کر نہیں آتی مجھے کجا نیکی

کوئی بندہ عشق کا ہے کوئی بندہ عقل کا
پاؤں اپنے ہی نہ تھے قابل کسی زنجیر کے

یاس سر سے پاؤں تک امید ہی امید تھے
فرد جب تک ہاتھ میں تھی کاتبِ تقدیر کے

چونکائے گی رہ رہ کے تو غفلت کا مزہ کیا
ساتھ اپنے اجل صورتِ ہمزاد رہے گی

ہنسی میں لغزشِ مستانہ اڑ گئی واللہ
تو بے گناہوں سے اچھے گناہگار رہے

خزاں کے دم سے مٹا خوب وحشت کا جھگڑا
چلو یہ خوب ہوا گل رہے نہ خار رہے

یگانہ حال تو دیکھو زمانہ سازوں کا
ہوا میں جیسے بگولا خراب و خوار رہے

مزاج آپ کا دنیا سے کچھ کشیدہ سہی
فریب کھاؤ گے پھر بھی فریب دیدہ سہی

فریب ابر کرم بھی بڑا سہارا ہے
بلا سے نخل تمنا خزاں رسیدہ سہی

قریب ہوں مگر اتنا کہ جیسے کوسوں دور
مجھے نہ دیکھ سکو گے زمانہ دیدہ سہی

خضر راہ اپنا ہوں اپنی راہ چلتا ہوں
میرے حال پر دنیا کیا سمجھ کے ہنستی ہے

کیا کہوں سفر اپنا ختم کیوں نہیں ہوتا
فکر کی بلندی یا حوصلہ کی پستی ہے

ٹکرا کے دیکھیں تم کیا ہو ہم کیا
جیتے تو جیتے ہارے تو ہارے

اندھیرے اجالے کہیں تو ملیں گے
وطن سے ہمیں در بدر کرنے والے

مانگنے دیتا نہیں پانی دل ایذا طلب
خون بہا کیا مانگنے دے گا یہ قاتل سے مجھے

○

غزلیں

○

## احمد ندیم قاسمی

سہارا ہے مجھے جس کے محیط کبریائی کا
اسی سے مجھ کو شکوہ ہے دعا کی نارسائی کا

مری فرد عمل پر گر فرشتے معترض ہوں گے
تو الزام ان پہ دھر دوں گا غرور پارسائی کا

سحر سورج کے رودنور سے بچ کر نکلتی ہے
کہ ہے ہر خوبصورت چیز کو حق خود نمائی کا

وہ میرے پاس آئے اور جانا بھول ہی جائے
خدایا! آج کی شب تو بھرم رکھ لے خدائی کا

مرے سب درد تیری یاد کی لو میں چمکتے ہیں
سو اب تک معترف ہوں میں تری درد آشنائی کا

میں اس ویرانۂ احساس میں آسودہ خاطر ہوں
کہ تنہائی کی جنت اجر ہے تیری جدائی کا

○

○

## احمد ندیم قاسمی

جیسے لفظوں کو تراشا گیا انگاروں سے
اب تو بارود کی بو آتی ہے اخباروں سے

قصرِ سلطاں کی فلک بوس فصیلوں پہ نہ جا
انقلاب آئیں تو رکتے نہیں، دیواروں سے

نکہتیں ہو نہیں سکتیں کبھی رنگوں کی اسیر
قدغنیں پھاند کے آجاتی ہیں گلزاروں سے

روحِ فرہاد نہ ہو کوہ کنی میں مصروف
یہ جو تیشے کی صدا آتی ہے کہساروں سے

حسن بے ساختہ پن سے ہی نمو پاتا ہے
کلیاں گلشن میں چٹکتی نہیں تلواروں سے

ہم نے سجدہ کیا صرف ایک خدا کے در پر
ہم سرافراز گزرتے رہے درباروں سے

فاختائیں بھی ہیں اس دور کی آشفتہ مزاج
شاخِ زیتون گرا دیتی ہیں منقاروں سے

ظرف چھلکیں تو بجھو دیتے ہیں محفل ساری
ویسے ہم کو تو کوئی کد نہیں مے خواروں سے

سامنے جن کے، نکالا گیا جنت سے ندیم
جھانکتے ہیں وہی قدسی اسے سیاروں سے

○

## اختر ہوشیار پوری

جو مجھ کو دیکھ کے کل رات رو پڑا تھا بہت
وہ میرا کچھ بھی نہ تھا پھر بھی آشنا تھا بہت

میں اب بھی رات گئے اس کی گونج سنتا ہوں
وہ حرف کم تھا بہت کم مگر صدا تھا بہت

زمیں کے سینے میں سورج کہاں سے اترے ہیں
فلک پہ دور کوئی بیٹھا سوچتا تھا بہت

مجھے جو دیکھا تو کاغذ کو پرزے پرزے کیا
وہ اپنی شکل کے خاکے بنا رہا تھا بہت

میں اپنے ہاتھ سے نکلا تو پھر کہیں نہ ملا
زمانہ میرے تعاقب میں بھی گیا تھا بہت

شکست ریخت بدن کی اب اپنے بس میں نہیں
اسے بتاؤ کہ وہ رمز آشنا تھا بہت

بساط اس نے الٹ دی نہ جانے سوچ کے کیا
ابھی تو لوگوں میں جینے کا حوصلہ تھا بہت

عجب شریک سفر تھا کہ جب پڑاؤ کیا
وہ میرے ساتھ نہ ٹھہرا مگر رکا تھا بہت

سحر کے چاک گریباں کو دیکھنے کے لئے
وہ شخص صبح تلک شب کو جاگتا تھا بہت

وہ کم سخن تھا مگر ایسا کم سخن بھی نہ تھا
کہ سچ ہی بولتا تھا جب بھی بولتا تھا بہت
ہوا کے لمس سے چہرے پہ پھول کھلتے تھے
وہ چاندنی سا بدن موجہ صبا تھا بہت
پس دریچہ دو آنکھیں چمکتی رہتی تھیں
کہ اس کو نیند میں چلنے کا عارضہ تھا بہت
کہانیوں کی فضا بھی اسے تھی راس اختر
حقیقتوں سے بھی عہدہ برآ ہوا تھا بہت

○

○

## اختر ہوشیار پوری

ایک چہرہ دکھائی دیتا ہے
کون مجھ سا دکھائی دیتا ہے

میری آنکھیں ابھی سلامت ہیں
مجھ کو رستہ دکھائی دیتا ہے

خالی گھر کی اداس چوکھٹ پر
ایک بچہ دکھائی دیتا ہے

اذن پرواز مجھ سے لیتا ہوا
اک پرندہ دکھائی دیتا ہے

اپنے قدموں کی چاپ سنتا ہوں
دن گزرتا دکھائی دیتا ہے

سر ساحل ہجوم طفلاں ہے
ایک میلہ دکھائی دیتا ہے

آؤ اب جا کے اس سے مل آئیں
آج تنہا دکھائی دیتا ہے

کون چھت پر چڑھا ہے دیکھو تو
ایک سایہ دکھائی دیتا ہے

موڑ پر روشنی سی پاتا ہوں
کوئی آتا دکھائی دیتا ہے

جب میں خود سے بچھڑنے لگتا ہوں
کون بیٹھا دکھائی دیتا ہے
پس دیوار کون ہے اختر
اک دریچہ دکھائی دیتا ہے

○

## اختر ہوشیار پوری

آواز دے کے بیٹھ رہیں خامشی سے ہم
مایوس اس قدر بھی نہیں زندگی سے ہم

اے باد تند و تیز تری کاوشوں کی خیر
لے آئے ہیں چراغ اک اجڑی گلی سے ہم

زخم انا سے سارا بدن چور چور ہے
اب اپنا حال کہہ نہ سکیں گے کسی سے ہم

دیواروں میں وہ شور تھا کل پچھلی رات کو
تصویریں دیکھنے لگے دیوانگی سے ہم

سر پر ہمارے رات کی ظلمت ہو دن کے بعد
باز آئے آفتاب کی اس روشنی سے ہم

وابستہ بھی رہے ہیں شکایت گزار بھی
جو شخص کشتنی تھا اسی آدمی سے ہم

شاید کہ شہر دوست سے آئے کوئی پیام
ملتے ہیں مسکرا کے ہر اک اجنبی سے ہم

اس کی قبا نے ایسا مذاق نظر دیا
پھولوں کو تکتے رہتے ہیں آشفتگی سے ہم

ہر چند چھت پہ قدموں کا اختر بہت تھا شور
گھر کو مگر سجاتے رہے چاندنی سے ہم

○

## اختر ہوشیار پوری

کورے کاغذ کے اجلے خاکوں میں
نقش ابھرے ہیں رت کے خوابوں میں
ایک قندیل جلتی رہتی ہے
سامنے ادھ کھلے دریچوں میں
کوئی گزرا کہ آنے والا ہے
ہے بہت خامشی پرندوں میں
جیسے کوئی تماشا ہونا ہے
بھیڑ سی لگ گئی ہے شہروں میں
اب پتنگوں کی راہ دیکھتے ہیں
ڈور کیا آئی اپنے ہاتھوں میں
ایک پیکر دکھائی دیتا ہے
مجھ کو جلتے ہوئے چراغوں میں
دھوپ کے راز فاش کرتی ہیں
زردیاں پھیل کر درختوں میں
آتے جاتے کو روکتا تھا بہت
کیا خبر کون تھا کواڑوں میں
کوئی شب بھر دکھائی دیتا ہے
سرد آنگن میں بند کمروں میں
اور کیا چاہیے تجھے اختر
تیرا سایہ ہے تیرے قدموں میں

○

○

## راحت نسیم ملک

اشک خالی ہاتھ پر گر کر سمندر ہو گیا
کرچیاں چنتے ہوئے میں آئینہ گر ہو گیا

وقت یاور تھا تو اس کے نام کا سکہ چلا
پھر کیا بدلی نگر میں شاہ بے زر ہو گیا

اس نے بخشا دل کو زرخیزی کا پہلا ذائقہ
یہ علاقہ پھر اسی کے نم سے بنجر ہو گیا

سچ لکھا کچھ سوچ کر خود ہی قلم زدہ کر دیا
مجھ پہ ہی اترا صحیفہ میں ہی منکر ہو گیا

پہلے دن تو بس مرے منہ میں زباں پتھر ہوئی
اور اب یوں ہے کہ سارا شہر پتھر ہو گیا

ہر دعا محصور ہو کر رہ گئی جیسے نسیم
ہوتے ہوتے ہر مکاں بستی کا بے در ہو گیا

## خادم رزمی

فقط یہ بات کہ تو خود سفر پسند نہیں
زمیں سے ورنہ کوئی آسماں بلند نہیں

گرفت شاخ ہی کمزور پڑ گئی، ورنہ
ہوا کا شور فقط شور ہے کمند نہیں

میں نفرتوں کا ڈسا ہوں اے کم نظر واعظ!
مرا علاج محبت ہے، تیری پند نہیں

بجائے دل جو بدن کو اسیر کرتا ہے
مری نگاہ میں وہ شاہ، فتح مند نہیں

کھلی نہیں ہے اگر راہ اوج قصر تو کیا
صلیب و دار کا رستہ تو ہم پہ بند نہیں

مجھے خبر ہے! جو حالت ہے اہل بستی کی
بدن انند سہی، دل مگر انند نہیں

تری غزل جو حقیقت کا زہر ہے رزمی!
پسند کون کرے گا اسے یہ قند نہیں

○

## خادم رزمی

مرے خلاف مری مخبری کا حق بھی ہے
وہ دوست تھا تو اسے دشمنی کا حق بھی ہے

نہ چھین خواب تو خوش حالیوں کے تو مجھ سے
کہ اس قدر تو مری مفلسی کا حق بھی ہے

دکھوں کے "ہار" ہی مجھ پر اتارنے والے!
مرا، کہیں کوئی سکھ ساونی کا حق بھی ہے؟

تری عطا ہے یہ گردن تو کیوں جھکاؤں اسے
دیا یہ سر تو مجھے خود سری کا حق بھی ہے

ملے ملے، نہ ملے اور بات ہے لیکن
مکاں کی آس مری بے گھری کا حق بھی ہے

تمام عمر اندھیروں میں کس طرح کاٹیں
خدائے نور! ہمیں روشنی کا حق بھی ہے

ہم اہل عشق برا مانتے ہیں کب رزمی!
حسیں ہے وہ تو اسے بے رخی کا حق بھی ہے

○

○

## خادم رزمی

بجا! بادل' ترے دریا بہت ہیں
مگر ہم آج بھی تشنہ بہت ہیں
قیامت کی طرف کیا دھیان جائے!
کہ ہنگامے یہیں برپا بہت ہیں
عیاں ہے' شہر کے اس شور و غل سے
یہاں کے لوگ بھی تنہا بہت ہیں
بتائیں کیا تمہیں اپنے نگر کی
یہاں بیدار کم' خفتہ بہت ہیں
یہی مطلب ہے ان خاموشیوں کا
اسیر مصلحت گویا بہت ہیں
ہمیں معلوم ہے باطن بھی ان کا
وہی جو بات میں شستہ بہت ہیں
اٹے خاک و پسینہ میں یہ چہرے!
یہاں اپنے بھی ہم پیشہ بہت ہیں
نگاہوں میں جچے کوئی تو پھر ہے
نگر میں گو' پری چہرہ بہت ہیں
ڈبو دے آنسوؤں میں ان کو رزمی!
تری آنکھیں اگر تشنہ بہت ہیں

○

○

## خادم رزمی

یہ غلط ہے کہ سبھی آب رواں بولتے ہیں
ریت کو ریت بھی کچھ تشنہ لباں بولتے ہیں
خامشی شہر کا دستور بنانے والو!
جب مکیں مہر بلب ہوں تو مکاں بولتے ہیں
وہ جہاں شور قیامت کی ضرورت ہے وہیں
اب بھی کچھ لوگ خموشی کی زباں بولتے ہیں
یہ تو پوچھو! کسی دہشت بھرے، سناٹے سے
ہم کہاں رہتے ہیں چپ، اور کہاں بولتے ہیں
عشق کو ایک ہمیں نفع بتائیں، ورنہ
اہل دنیا تو اسے کار زیاں بولتے ہیں
ہم وہاں نقد گل و لالہ پہ شاہد مانگیں!
وہ جہاں دھوپ کی لو کو بھی دھواں بولتے ہیں
دیکھنا! اب کے بھی، انجام نہ ہو پہلے سا
پھر وہی رت ہے، وہی بے خبراں بولتے ہیں
کیا کریں، صورت حالات ہی کچھ ایسی ہے
ہم یقیں سوچتے ہیں اور گماں بولتے ہیں
اک سبب یہ بھی خرابی کا ہے اس شہر کے لوگ
وہ جہاں چپ کی ضرورت ہو، وہاں بولتے ہیں
تم بہت دیر میں آئے ہو ادھر، رزمی! اور
لوگ اس شہر کے اب اور زباں بولتے ہیں

○

○

## روحی کنجاہی

کیا کریں شکوے زمانے سے فضول
ہم کو لے ڈوبے ہیں اپنے ہی اصول

ہم تہی داماں ہیں یہ بات اور ہے
ورنہ صحرا بھی تھے اب کے پھول پھول

ہاتھ پھیلانا تمہیں آتا نہیں
کھول کر بیٹھے رہو باب قبول

رنگ آخر رنگ ہے اڑ جائے گا
سب دھرے رہ جائیں گے زریں اصول

آتے جاتے موسموں سے بے نیاز
کھل رہی ہے دل میں یادوں کی ببول

اپنی محرومی کا رونا روئیں کیا
تیرا دامن بھی نہیں ہے پھول پھول

ذہن ہے گویا سراب اندر سراب
ہو رہا ہے پیاسی سوچوں کا نزول

دل کہاں مانے گا روحی کوئی بات
سب دلیلیں رائیگاں بحثیں فضول

○

## روحی کنجاہی

کبھی آنے کی جلدی ہے، کبھی جانے کی جلدی ہے
ہمیں ہر حال میں ہر کام نمٹانے کی جلدی ہے

سبھی باتیں سمجھ جائے گا وہ آہستہ، آہستہ
ہمیں بھی کون سی ہر بات سمجھانے کی جلدی ہے

بھلا بیٹھا ہے جو آداب الفت جوش الفت میں
ہماری رائے میں یہ ایک دیوانے کی جلدی ہے

ہمارا اجتماعی فائدہ کس میں ہے، سوچے کون!
ہمیں نقصان اک دوجے کو پہنچانے کی جلدی ہے

بہار اب کے بھی اپنا دور پورا کر کے جائے گی
گلوں کو جانے کیوں خوشبوئیں پھیلانے کی جلدی ہے

ہماری جلد بازی ایک دن ہم کو ڈبو دے گی
ہمیں ہر وقت سب کچھ کھو کے کچھ پانے کی جلدی ہے

عناصر میں بھی کچھ ہونے لگا ہے انتشار اب کے
بساط زندگی ہم کو بھی الٹانے کی جلدی ہے

زمانہ تیز رفتاری سے آگے بڑھتا جاتا ہے
ہمیں ہر گام پیچھے کی طرف جانے کی جلدی ہے

کوئی تاریخ سے عبرت پکڑتا ہی نہیں روحی
سبھی کو خامیاں ہر بار دہرانے کی جلدی ہے

○

## روحی کنجاہی

پہلا پیار اور پہلی چاہت ہو

تم سے ہو بھی تو کیا شکایت ہو

تم کو دیکھے بغیر چین کہاں

تم تو اب میری ایک عادت ہو

ہے نگہ کو بھی حسن کا لپکا

اور کچھ تم بھی خوبصورت ہو

روز ملنے میں کیا برائی ہے

تم جو ملتے رہو' عنایت ہو

حسن اور اس پہ حسن آرائش

تم قیامت پہ اک قیامت ہو

پھول جسم اور چاندنی پوشاک

تم بہرحال نور و نکہت ہو

تم ہو مجموعہ سات رنگوں کا

کوئی صورت ہو' کوئی حالت ہو

تم کوئی خواب ہو سہانا سا

یا کوئی تلخ سی حقیقت ہو

نظر انداز کیا کروں گا کبھی
تم مری آنکھ ہو، بصارت ہو
میں کوئی عشق کی ادا ہوں اور
تم کوئی حسن کی شرارت ہو
اور کس سے کروں توقع کچھ
اک تمہیں واقف طبیعت ہو
اور سب صورتیں ہیں مرگ آسا
اک تمہی زندگی کی صورت ہو
تم کو شاید نہ علم ہو، روحی
میری کتنی بڑی ضرورت ہو

○

○

## روحی کنجاہی

خوابوں کا ایک شہر بسایا ہوا تو ہے
کاغذ پہ ایک نقشہ بنایا ہوا تو ہے

خوشبو لئے ہوئے ہیں ہواؤں کے قافلے
موسم کہیں بہار کا آیا ہوا تو ہے

قلب و نظر میں ایک سمندر ہے موجزن
دریاؤں کو گلے سے لگایا ہوا تو ہے

ہر زاویے سے دیکھنا اور سوچنا تجھے
اک مقصد حیات بنایا ہوا تو ہے

آرائش چمن کے لئے شاخ شاخ پر
کاغذ کا پھول سجایا ہوا تو ہے

شہ زور آندھیوں کو جلانے کے واسطے
ننھا سا اک چراغ جلایا ہوا تو ہے

کیا سوچ کے خموش، نقیبان شہر ہیں
منصور وقت سامنے آیا ہوا تو ہے

روحی مہک رہی ہیں فضائیں نگاہ میں
باغ آرزو کا دل میں لگایا ہو ا تو ہے

○

○

## روحی کنجاہی

کب ہوں صرف اپنی بے کلی کے خلاف
میں ہوں ہر طرز خود کشی کے خلاف

ایک پتھر بھی ہے عزیز مجھے
ہوں فقط اس کی بے حسی کے خلاف

ہو چکا ہوں لہو لہان مگر
لڑ رہا ہوں میں بے کسی کے خلاف

سر سے پا تک اک احتجاج ہوں میں
تیرے انداز بے رخی کے خلاف

بت زمیں کے اگر زمیں پہ رہیں
کون کافر ہو بندگی کے خلاف

کس توقع پہ کوئی کیا جانے
ہو گیا ہوں میں ہر خوشی کے خلاف

ایک جگنو سہی کسی کی یاد
پر ہے دیوار تیرگی کے خلاف

پھول تارے کبھی کبھی روحی
ہو گئے میری بے دلی کے خلاف

○

○

## روحی کنجاہی

غرض اس سے نہیں کل کیا کہا تھا
مجھے تم نے کبھی اپنا کہا تھا

وہ بارش کا تھا پہلا قطرہ گویا
مجھے جب تم نے "پھر کہنا" کہا تھا

نگاہوں نے نگاہوں کی زبانی
کہا تھا جو بھی برجستہ کہا تھا

ابھی تک سامنے ہیں ساری باتیں
سنا کیا کیا تھا اور کیا کیا کہا تھا

تمہاری بات ہی کیا تھی کہ تم نے
مری ہر بات پر اچھا کہا تھا

مرے خوابوں کی دنیا دیکھتے ہی
حسیں ہے کتنا ہر سپنا کہا تھا

سمٹ آیا تھا جیسے مجھ میں عالم
مجھے یوں حاصلِ دنیا کہا تھا

مری سرشاریاں تھیں قابلِ دید
مجھے جب جان سے پیارا کہا تھا

مجھے اچھی طرح ہے یاد روحی
غزل سن کر بہت اچھا کہا تھا

○

○

## زخمی کانپوری

کاروان غم پنہاں کو گزر جانے دے
دل ٹھہر جائے گا، تو فکر نہ کر جانے دے

نہیں اچھی ہوس سطوت و زر جانے دے
فقر و فاقہ میں گزرتی ہے گزر جانے دے

کوٹ میں اپنے سجانے کے لئے پھول نہ توڑ
یہ اگر شاخ پہ بکھرے تو بکھر جانے دے

عمر بھر کام نہ آیا، ترے کس کام کا تھا
وہ جو دل لے کے مکرتا ہے، مکر جانے دے

ابھی طوفان ہے، بے راہروی کا ہر سمت
کیسی تہذیب، ذرا اس کو ٹھہر جانے دے

زندگی، مجھ سے، ترا حق تو ادا ہو نہ سکا
یہی بہتر ہے، کہ اب تو مجھے مر جانے دے

نہ سہی، اپنے وطن میں جو ٹھہرنا ہے محال
جائیں گے، گردش ایام، جدھر جانے دے

○

○

## حفیظ الرحمٰن احسن

غم بے دلی سے ایسا بڑھا ارتباط اپنا
کسی کام پھر نہ آیا دل بے نشاط اپنا

کہیں تو مآل کیا ہو' نہ کہیں تو حال کیا ہو
کہیں دم ہی گھٹ نہ جائے دم احتیاط اپنا

ہیں تری گریز پائی کو یہاں ہزار رستے
کہیں میل ہو گیا تو سر پل صراط اپنا!!

دم موسم مخالف وہ خزاں نے زور باندھا
کہ بہار اٹھا کے چل دی سبد نشاط اپنا

ترے دل زدوں کی خاطر سر شام کھولتا ہے
فلک ستارہ برکف در انبساط اپنا!

نہ بڑھے ہم اپنی حد سے شب قرب میں بھی احسن
شب ہجر کام آیا یہی انضباط اپنا!

○

○

## حفیظ الرحمٰن احسن

ہے ترجمان وفا کون چشم تر کے سوا
اور اس کے پاس بھی کچھ ہے اک اثر کے سوا

اسی سے کاٹنا ہے ظلمتوں کا کوہ گراں
کچھ اپنے پاس نہیں تیشہ نظر کے سوا

سواد منزل جاناں سے لوٹ آئے ہیں
نہ کچھ نصیب ہوا کلفت سفر کے سوا

یہ حال ہے تو عروج و کمال کیا معنی
کچھ اپنے پاس نہیں دست بے ہنر کے سوا

کشود عقدہ ہستی یہ طالب عرفاں
گرہ میں عقل کی، رکھا ہے کیا، خبر کے سوا

مقام دیدہ تر سے ہو کیا اسے نسبت
صدف کے ظرف میں رکھا ہے کیا گہر کے سوا!

عجب ہے نقشہ تعمیر میرے خوابوں کا
کہ اس دیار میں سب کچھ ہے بام و در کے سوا

فقط فسانہ ہے احسن چمن کی شادابی
کف شجر میں ہے کیا شاخ بے ثمر کے سوا!

○

○

## حفیظ الرحمن احسن

میری ناکام تمنا، آ مجھ کو آغوش میں لے لے
تیری خاطر برسوں میں نے آشاؤں کے دکھ ہیں جھیلے

بگڑا جب سے کار محبت، در پے ہے آزار محبت
خلوت دل ہے سونی سونی، بزم میں ہم بیٹھے ہیں اکیلے

پت جھڑ بیتے، موسم بدلیں، لاکھ بہاریں آئیں، لیکن
ہم کو بہاروں سے کیا لینا، دل کے زخم ہیں نئے نویلے

رگ رگ میں زہراب جفا ہے، دشمن جاں آشوب وفا ہے
کون سنے احوال محبت، کون بھلا شعلوں سے کھیلے!

اک اک اس کی ڈوری ٹوٹی، دل کی رام کہانی چھوٹی
کیسی اب سپنوں کی رم جھم، ویراں ہیں انکھیوں کے بیلے

اس کا تصور عالم عالم، اس کی تمنا دنیا دنیا
آنکھوں سے دل کی راہوں تک ہر ہر گام لگے ہیں میلے

چاروں اور دکھوں کے سائے، کون اب من کی جوت جگائے
ہر پل میں ایک نیا بکھیڑا، ہر ساعت ہیں نئے جھمیلے

بچپن بیتا، گئی جوانی، پلٹی کایا جیون رت کی
بھول گئے سب کھیل کھلونے، بسرے سارے میلے ٹھیلے

دکھ سکھ کے دن سب اک جیسے، کشتی اپنی کھینچتے جاؤ
کیا خوشیوں کی موجیں احسن، کیسے دکھ اور درد کے ریلے!

○

## رب نواز مائل

یہ ہر خیال، امیدوں کو جو بڑھائے نہیں
ہمیں حیات سے کچھ بھی وہ راس آئے نہیں

تمام عمر ہر اک کا کچھ ایسے ساتھ دیا
کہ مجھ سے پا کے بھی ہر شے وہ کچھ دلائے نہیں

تو جیسے ان میں ہر اک محو شغل اس سے تھا
خوشی ہو پانے کی ایسی کہ شے کو پائے نہیں

خوشی سے مر ہی نہ جائیں ہدف کو پا کے قریں
یہ وسوسہ کہیں گل اور ہی کھلائے نہیں

وہ دن گنائے نہ میرے حساب میں کوئی
جو پیار یاد بھی آئے مگر اڑائے نہیں

خلاف عقل نہ یہ بات بھی کہی جائے
جو دل سے میں یہ کہوں غم کوئی کھلائے نہیں

○

## نجیب احمد

دکھ پہیلی نہ کیا، ہجر اشارہ نہ کیا
تو نے جاتے ہوئے ملنا بھی گوارا نہ کیا

رنگ میں رنگ ملا سکتے تھے لیکن ہم نے
آبِ سادہ کو کسی زہر سے کھارا نہ کیا

عمر بھر تیری عطاؤں کا بھرم رکھا ہے
ثبت سینے پہ مگر داغ خسارا نہ کیا

تیرے ابرو کے اشارے پہ رہے گرمِ سفر
سفرِ عشق میں کچھ فکر ستارا نہ کیا

یار بھر پائے فقط ایک محبت سے نجیب
ایسے بھر پائے کہ پھر پیار دوبارہ نہ کیا

○

## نجیب احمد

نفس نفس یہی دھڑکا لگا رہا مجھ کو
لگا نہ دیں کہیں داؤ پہ رہنما مجھ کو

چراغ طاق' یہ سازش نہ تھی تو پھر کیا تھا
سحر سے پہلے یہ کس نے بجھا دیا مجھ کو

خود اپنے ہاتھ سے دیوار و در بنائے تھے
ملا نہ گھر سے نکلنے کا راستہ مجھ کو

کچھ ایسا خواب کسی شاخ پر کھلا کب تک
ہوائیں دیکھ نہ پائیں ہرا بھرا مجھ کو

فقیہہ شہر کو تو زعم زہد تھا لیکن
نجیب کس کی انا کا تھا آسرا مجھ کو

## سلیم کوثر

چھپے ہوئے ہیں جو منظر انہیں ابھارتا ہوں
میں آئینوں سے تحیر کی گرد اتارتا ہوں

مہ و نجوم کی گردش کا بوجھ اپنی جگہ
جہانِ یار کے موسم بھی میں سہارتا ہوں

گزر رہی ہے اندھیروں سے کائنات کی رو
مگر میں دن کے اجالے میں شب گزارتا ہوں

مجھے بگاڑنے والے تو آ کے دیکھ ذرا
ترے خیال کو میں کس طرح سنوارتا ہوں

عجیب ضد مری مٹی میں ہے کہ جیت کے بھی
میں اس زمیں کے لئے آسماں کو ہارتا ہوں

ہر ایک عشق میں محسوس یہ ہوا ہے مجھے
کہ جیسے پچھلی محبت کا قرض اتارتا ہوں

زمانہ گوش بر آواز ہو گیا ہے سلیم
اسے خبر ہی نہیں ہے جسے پکارتا ہوں

## غلام حسین ساجد

آنکھ بھر کر بھی نہ اب اس کی طرف دیکھوں گا
اپنی وحشت پہ بہر طور نظر رکھوں گا

باغ نوروز مرے پاؤں کی ٹھوکر پر ہے
کیا میں اک گل کے لئے شہر میں رسوا ہوں گا

خواہش وصل مری نیند کی دشمن ہے فقط
آج کے بعد میں اب اور نہیں جاگوں گا

اتنا مایوس کیا ہے مجھے میرے دل نے
خود سے چاہوں گا نہ اب غیر سے کچھ مانگوں گا

کوئی آوارہ کہیں اس کا پتہ لے نہ اڑے
شعر کو اس کا حوالہ نہیں بننے دوں گا

موت کے بعد اگر جینے کی پابندی ہے
جان من! میں بھی تجھے بار دگر چاہوں گا

اپنی خاطر اسے برباد کروں کیوں ساجد
اس کو سینے سے لگاؤں گا نہ لب چوموں گا

○

## غلام حسین ساجد

عشق کے خواب کی تعبیر نہیں کر سکتا
کوئی تقدیر کو زنجیر نہیں کر سکتا!

آج شب اس سے بہر طور مجھے ملنا ہے
کام ایسا ہے کہ تاخیر نہیں کر سکتا

مدح غالب ہے کہیں حسن طلب غالب ہے
کوئی اس شعر کی تفسیر نہیں کر سکتا

سخت مشکل ہے کسی اور کا ہو رہنا بھی
اور بچاؤ کی بھی تدبیر نہیں کر سکتا

تخت کی اس کو طلب ہو یا مرے سر کی ہو
تنگ اس پر دم شمشیر نہیں کر سکتا

کوئی قدغن نہیں اس شوخ کی آزادی پر
میں اسے شامل جاگیر نہیں کر سکتا

بار پائے گا نہ وہ شخص مری محفل میں
اپنے دشمن کی جو توقیر نہیں کر سکتا

ایک گھر جو تری تنویر سے خالی نہ رہے
سوچ تو سکتا ہوں، تعمیر نہیں کر سکتا

تیری ہر بات پہ میں صاد کیے جاؤں گا
جان من! میں تجھے دلگیر نہیں کر سکتا

ناز کیا اپنے سخن پر مجھے ہو گا ساجد
جب تلک خاک کو اکسیر نہیں کر سکتا

○

○

## ضیاء الحق قاسمی

پہلے آنکھوں کو تو خوابوں کے سفر میں رکھا
عمر بھر پھر انھیں تعبیر نگر میں رکھا

رات اک شاخ پہ آ بیٹھا تھا زخمی طائر
اس کی خاطر کسی جگنو کو شجر میں رکھا

اس کی ٹھوکر سے وہ خود بھی تو ہوا ہے گھائل
جس نے پتھر کوئی اک راہ گذر میں رکھا

صرف اس شخص نے اس شہر میں عزت پائی
جس کو ہم نے ہی فقط اپنی نظر میں رکھا

اک مسیحا کی یہ رائے تھی جراحت ہو جائے
ہم نے ناسور کو مستور جگر میں رکھا

زندہ رہنا تھا غم ہجر میں کتنا مشکل
ہم نے اس شوخ کو پھر اپنے ہی گھر میں رکھا

گھر کے باہر کے وہ ماحول سے واقف ہی نہیں
جب کہ ہر شخص نے روزن بھی ہے در میں رکھا

○

○

## ضیاء الحق قاسمی

ہوا چلی ہے رات بھر دیا مگر بجھا نہیں
سلگ رہا تھا دل مرا دھواں مگر اٹھا نہیں

جو کاروان شوق دشت دل میں تھا رواں دواں
بہت چلی ہیں آندھیاں مگر کہیں رکا نہیں

ملا تھا مجھ کو ایک بار وہ جو ایک بزم میں
کہاں ملے گا اب مجھے کوئی اتا پتہ نہیں

مجھے ملی ہے ہر خوشی میں کتنا خوش نصیب ہوں
مگر عجیب بات ہے میں آج تک ہنسا نہیں

خطوط دوستوں کے نام آئے ہیں جو گاؤں سے
کسی بھی خط میں نام کو بھی میرا تذکرہ نہیں

ہمیشہ سچ کی جیت ہے یہاں اسی کا ہے چلن
کہیں بھی سکہ جھوٹ کا تو آج تک چلا نہیں

میں اپنی خود کلامیوں میں اس قدر ہوں بے خبر
دیئے پہ ہاتھ رکھ دیا تو ہاتھ بھی جلا نہیں

خدا کرے ہو خیریت سے قاسمی جہاں بھی ہو
وہ مدتوں سے یار بے ریا مجھے ملا نہیں

○

○

حسن رضوی

پیار کرنے والوں کا بس یہی فسانہ ہے
اک دیا تو روشن ہے اک دیا جلانا ہے

ان کو بھول جائیں ہم دیکھ بھی نہ پائیں ہم
یہ بھی کیسے ممکن ہے ایسا کس نے مانا ہے

بارشوں کے موسم میں ہم کو یاد آتے ہیں
وہ جو اب نہیں ملتے ان کو یہ بتانا ہے

بس انھیں پہ مرتے ہیں جن سے پیار کرتے ہیں
پیار کرنے والوں کو جانتا زمانہ ہے

اس طرح تو ہوتا ہے پیار کرنے والوں میں
اک کو یاد رکھنا ہے اک کو بھول جانا ہے

صبح کے پرندے بھی اب تو لوٹ آئے ہیں
شام سر پہ آئی ہے اور گھر بھی جانا ہے

شام کے اجالے میں کیوں اداس پھرتے ہو
آج سخت سردی ہے رت بھی عاشقانہ ہے

گیت ہم سناتے ہیں روز وہ بلاتے ہیں
ان سے بات کرنے کا بس یہی بہانہ ہے

روشنی نبھانے کا اب یہی سلیقہ ہے
ایک بات کرنی ہے ایک کو چھپانا ہے

میری زندگانی کو دکھ بھری کہانی کو
وہ جو رو دیے سن کر ان کو اب سنانا ہے

پیار کا زمانہ بھی کیا حسنؔ زمانہ تھا
اس غزل کے مقطع میں بس یہی بتانا ہے

○

○

حسن رضوی

تیرے جانے کے بعد یہ کیا ہوا ہرے آسماں کو ترس گئے
گھرے ہم بھنور میں کچھ اس طرح کھلے بادباں کو ترس گئے

مرے شہر کے جو چراغ تھے انہیں آندھیوں نے بجھا دیا
چلی ایسی اب کے ہوائے دل کہ مکیں مکاں کو ترس گئے

یہ عجیب خوف و ہراس ہے' کوئی دور ہے' کوئی پاس ہے
وہ جو آشیاں کے تھے پاسباں' وہی آشیاں کو ترس گئے

جنہیں پیار پر رہی دسترس' وہی دور ہم سے ہیں اس برس
اے بہار تیری بہار میں غم دوستاں کو ترس گئے

تھے جو کل تلک مرے آشنا' سبھی یار نکلے وہ بے وفا
سدا خوش رہیں مرے خوش نوا' بھلے ہم زباں کو ترس گئے

وہ جو جان سے بھی عزیز تھے' وہی لوگ میرے رقیب تھے
جلا کیسے اپنے نصیب تھے' ترے آستاں کو ترس گئے

نہ ہی تذکرہ یہاں میر کا' نہ ہی ذکر **مصرعہ** میر کا
حسن ایسے کتنے ہی بے نوا شب داستاں کو ترس گئے

○

○

حسن رضوی

بس دنیا کی بات سنو خاموش رہو
دل کی دل میں رہنے دو خاموش رہو

ایک ذرا سی بات پہ غصہ کاہے کا
تم ہی اب کچھ ہوش کرو خاموش رہو

جو ملتا ہے ایک ہی بات وہ کہتا ہے
بس تم میری بات سنو خاموش رہو

یہ دنیا تو گورکھ دھندہ صدیوں کا
دنیا سے مایوس نہ ہو خاموش رہو

اک نہ اک دن خاموشی بھی بولے گی
کچھ دن تو اب صبر کرو خاموش رہو

ایک نگر کی خاموشی کچھ کہتی ہے
اس کی بھی تم بات سنو خاموش رہو

روز حسن سے وعدہ کر کے کہتا ہے
کل تک بس خاموش رہو خاموش رہو

○

## یاسمین حمید

سبک ہوتی ہوا سے تیز چلنا چاہتی ہوں
میں اک جلتے دیئے کے ساتھ جلنا چاہتی ہوں
غبار بے یقینی نے مجھے روکا ہوا ہے
زمیں سے پھوٹ کر باہر نکلنا چاہتی ہوں
میں خود سہمی ہوئی ہوں آئینے کے ٹوٹنے سے
بہت آہستہ سطح دل پہ چلنا چاہتی ہوں
نمود صبح سے پہلے کا لمحہ دیکھنے کو
اندھیری رات کے پیکر میں ڈھلنا چاہتی ہوں
میں شہر شب کو آنکھوں کی دعا دینے سے پہلے
در و دیوار کا چہرہ بدلنا چاہتی ہوں

○

## نوشی گیلانی

عشق کرو تو یہ بھی سوچو عرض سوال سے پہلے
ہجر کی پوری رات آتی ہے صبح وصال سے پہلے

دل کا کیا ہے دل نے کتنے منظر دیکھے لیکن
آنکھیں پاگل ہو جاتی ہیں ایک خیال سے پہلے

کار محبت ایک سفر ہے جس میں آ جاتا ہے
ایک زوال آثار سا رستہ باب کمال سے پہلے

کس نے ریت اڑائی شب میں آنکھیں کھول کے رکھیں
کوئی ایک مثال تو دو نا اس کی مثال سے پہلے

عشق میں ریشم جیسے وعدوں اور خوابوں کا رستہ
جتنا ممکن ہو طے کر لیں گرد ملال سے پہلے

○

○

## منصور ملتانی

کب اندمال زخم جاں تلاش کر رہا ہوں میں
نیا بہانۂ فغاں تلاش کر رہا ہوں میں

ادھر تو مہر و ماہ بھی بنے ہیں گرد کارواں
ادھر چراغ کا دھواں تلاش کر رہا ہوں میں

وہ ایک سوچ وہ صدا نوید جو سحر کی دے
ستمگروں کے درمیاں تلاش کر رہا ہوں میں

نقیب وقت کی صدا کہاں ہے اتنی معتبر
ابھی تو صبح کے نشاں تلاش کر رہا ہوں میں

گرا شجر تو بچے اس کی شاخیں توڑنے لگے
کہاں ہے میرا آشیاں تلاش کر رہا ہوں میں

مری نگاہ کیوں الجھتی جا رہی ہے آگ سے
اگر جمال گل رخاں تلاش کر رہا ہوں میں

بس اپنی ہی تلاش میں ہوا نہیں ہوں دربدر
تجھے بھی زیر آسماں تلاش کر رہا ہوں میں

○

○

## منصور ملتانی

بلا رہی تھی رہ گذر یہ رات آ گئی ہے کیوں؟
تمام کب ہوا سفر یہ رات آ گئی ہے کیوں؟
بجھا' بجھا سا دن بھی تھا تھکن سے چور میں بھی ہوں
یہ سب تو ٹھیک ہے مگر یہ رات آ گئی ہے کیوں؟
کئی خلا کے مرحلے فضا کی حد نئے ہیں ادھر
تھکے نہیں ہیں بال و پر یہ رات آ گئی ہے کیوں؟
ابھی تو کسمساہٹوں میں آنکھ بھی کھلی نہ تھی
ابھی تو آئی تھی سحر یہ رات آ گئی ہے کیوں؟
تلاش رزق کے سبب پڑے ہیں خالی آشیاں
ہیں انتظار میں شجر یہ رات آ گئی ہے کیوں؟
مرے وجود کی طرح کسی کے انتظار میں
سلگ اٹھے ہیں بام و در یہ رات آ گئی ہے کیوں؟
کوئی دیا نہیں جلا فراز دار پر ابھی
بجھی بجھی سی ہے نظر یہ رات آ گئی ہے کیوں؟

○

## محمد ممتاز راشد (دوحہ) قطر

تنہائی کے ویران بیابان میں رہتے

ہم اس سے خفا ہو کے تو نقصان میں رہتے

رکھتے جو نگاہوں میں سدا اپنی خطائیں

ہر روز نہ ہم نت نئے بحران میں رہتے

شمعیں جو نہ بجھتیں کبھی ایمان و یقیں کی

خدشے نہ کبھی اس طرح اذہان میں رہتے

اغیار کی باتوں میں نہ آتے تو یقیناً

نظروں میں نہیں آپ مری جان میں رہتے

اب قصہ ہو راشد کسی رنگین زمیں کا

اک عمر ہوئی قریہ ویران میں رہتے

## جان کاشمیری

کچھ نہ ملا تو چل پڑی باد صبا ملال کی
اس کا فسانہ بن گیا بات جو خال خال کی

میری جفا پہ ہنس دیا دل نہ کبھی برا کیا
وہ تھا بشر کمال کا اس نے وفا کمال کی

ایک نظر ہے دیکھنا اہل جنوں کا مشغلہ
خوف نہیں جواب کا فکر نہیں سوال کی

خون رگوں میں جم گیا سانس کا زور تھم گیا
دل کا دیا بجھا گئی سرد ہوا شمال کی

کہنے کی شان رکھتے ہیں منہ میں زبان رکھتے ہیں
مار گئی حیا مگر ایک حیا خصال کی

جانے وہ کیسا راز تھا دونوں کو جس پہ ناز تھا
اک نے جفا کمال کی اس نے وفا کمال کی

خوب ملا اسے صلہ حال برا ہے قبر کا
جس نے گنا کے جان کو رسم وفا بحال کی

○

## جان کاشمیری

صدق طلب کا وقت ہے صدق طلب اچھال بھی
دل میں ترے جو وہم ہے دل سے اسے نکال بھی

وقت عجیب موڑ پر چھوڑ کے اس کو چل دیا
بھول گیا فراق بھی بھول گیا وصال بھی

ایک نظر بھی خامشی اپنا بھرم نہ رکھ سکی
دیکھا تمہیں تو آ گئے لب پہ کئی سوال بھی

ذات خدا پہ متفق سارے بشر نہ ہو سکے
ملتا نہیں تو کیا ہوا تیرا مرا خیال بھی

بخت رسا کی کیا کہوں بخت رسا بھی کچھ نہیں
بچ نہ سکے شکست سے اس کو بنا کے ڈھال بھی

میری سمجھ سے ماورا دونوں رہے ہیں عمر بھر
دیکھا ترا جلال بھی دیکھا ترا جمال بھی

جان انا کی جنگ میں فتح تمہیں جو چاہیے
اپنی سپہ کے ساتھ ساتھ دیکھ عدو کی چال بھی

○

○

## اے جی جوش

تارے تو نکلتے ہیں اجالا نہیں کرتے
جوبن مری دھرتی کا دوبالا نہیں کرتے

کرتے ہیں اگر عشق تو کیوں جگ سے چھپائیں
دنیا سے کوئی کام نرالا نہیں کرتے

رکھتے ہیں سدا یاد ہر اک دوست کی خوبی
ہم یار کے عیبوں کو اچھالا نہیں کرتے

کرنا ہے تو کر لو ابھی اقرار محبت
عاشق کو شش و پنج میں ڈالا نہیں کرتے

دل زندہ ہے جب تک کبھی ارمان نکالو
سینے میں یونہی حسرتیں پالا نہیں کرتے

روداد غم دل انہیں کیوں جوش سناؤں
جو لوگ کبھی دکھ کا ازالہ نہیں کرتے

○

اے جی جوش

اس عشق نے آخر ہمیں دن یہ بھی دکھائے
جب بھی ہوئے بے خود تو تری بزم میں آئے

ان اشکوں کی قیمت کوئی کیا جان سکے گا
انمول گہر ہم نے ہیں پلکوں پہ سجائے

کب جانے کروں چاک گریبان میں کس کا
اس ڈر سے کبھی پھرتے ہیں دامن کو بچائے

مانا کہ نہیں تجربہ کچھ کوہ کنی کا
تیشہ تو مگر کاندھے پہ ہم بھی ہیں اٹھائے

اے جوش انھیں توڑ کے اب دور نکل جا
وہ دائرے جو حرص و ہوس نے ہیں بنائے

○

## سید عارف

برق تخلیقات بھی بھول گئی ہے چال تک
کون سا نام دوں اسے اس کی نہیں مثال تک

کتنا کٹھن تھا مرحلہ کتنا طویل تھا سفر
دشت شب فراق سے جلوہ گہ وصال تک

ہیں پس مرگ بھی بہت عکس مرے وجود کے
کس نے کہا کہ میں ہوں بس گردش ماہ و سال تک

سطوت تاج و تخت کیا فاصلہ ایک قدم کا ہے
روشنئ عروج سے تیرگئ زوال تک

مری مسافتیں تمام ختم ترے وجود میں
مرے تمام سلسلے وقف ترے جمال تک

مرے لئے وہ ایک شخص حاصل زندگی رہا
اس کی تمام خواہشیں منصب و جاہ و مال تک

وہ بھی تھا کچھ گماں پرست میں بھی تھا کچھ انا مزاج
ربط کے سلسلے تمام رہ گئے قیل و قال تک

○

## ندیم شعیب

تجھے پانے کی خواہش میں وفائیں ساتھ رکھتا ہے
بہت کچھ ہار کر بھی کچھ دعائیں ساتھ رکھتا ہے

یہ کیسا اہتمام پیش بندی ہے طبیعت میں
سفر سائے میں کرتا ہے' ردائیں ساتھ رکھتا ہے

یزید عصر کے دربار میں بولا ہے سچ جس نے
سمجھ لو' بین کرتی کربلائیں ساتھ رکھتا ہے

کسی کے سامنے بھی ہاتھ پھیلاتے نہیں دیکھا
وہ مفلس ہے مگر اپنی انائیں ساتھ رکھتا ہے

محبت کا تقاضا ہے' اسے مشکل میں مت ڈالیں
وہ بھی انسان ہے' اپنی خطائیں ساتھ رکھتا ہے

○

## نازیہ رحمٰن ناز سندھو

ابر نہیں اور بارش کا امکان بہت ہے
موسم کے اس روپ پہ دل حیران بہت ہے

جس کی خوشبو سے مہکا تھا دل کا آنگن
یادوں کا وہ گلشن بھی ویران بہت ہے

اس کی آنکھوں میں قربت کے رنگ ملے ہیں
وہ جو بظاہر لگتا ہے! انجان بہت ہے

کیا کرنا یہ سارے شہر کے چہرے لے کر
دل کی آبادی کو اک انسان بہت ہے

گلی گلی میں بکھرے ہیں اس دور کے عاشق
اپنی دل آزاری کا سامان بہت ہے

دل کو اپنی نگرانی میں لئے ہوئے ہوں!
جانے! اس شیشے کا اب کیوں دھیان بہت ہے

پیار بھرے لہجے میں مجھ سے بات ہی کر لے
میرے لیے تو اتنا بھی احسان بہت ہے

ٹھیک ہے اس کی ساری باتیں ہی میٹھی ہیں
ناز! مگر یہ تیرا دل نادان بہت ہے

○

○

## جواز جعفری

اب کے میدان رہا لشکر اغیار کے ہاتھ
گروی اس پار پڑے تھے مرے سالار کے ہاتھ

سایہ سوزی میں تو ہم لوگ تھے سورج کے حلیف
اب ہدف ٹھہرے کہ جب جل گئے اشجار کے ہاتھ

اب سر قریہ بے دست' پڑا ہے کشکول
روز کٹ جاتے تھے اس شہر میں دو چار کے ہاتھ

ذہن اس خوف سے ہونے لگے بنجر کہ یہاں
اچھی تخلیق پہ کٹ جاتے ہیں معمار کے ہاتھ

ہم سر شاخ سناں قریہ بہ قریہ مہکے
ہم نے اس جنگ میں سر جیت لیے' ہار کے ہاتھ

لوٹ کچھ ایسی مچی شہر کا در کھلتے ہی
ہر طرف سے نکل آئے در و دیوار کے ہاتھ

○

○

## ڈاکٹر ایم شفیع کوثر، گلاسگو

فریب اہل خرد آشکار کرتے رہے
ہم اپنے واسطے سامان دار کرتے رہے

یقیں تھا راس نہ آئے گی فصل گل ہم کو
دعائیں پھر بھی برائے بہار کرتے رہے

رفاقتوں کا بھرم ٹوٹ جائے گا اک دن
سماعتوں پہ اگر اعتبار کرتے رہے

ہم اپنے کاندھوں پہ اپنی صلیب اٹھائے ہوئے
جنوں کا رقص سر کوئے یار کرتے رہے

خزاں نصیب خود اپنے لہو کے چھینٹوں سے
قفس کو رشک عروس بہار کرتے رہے

ترے خیال سے فرصت ملی تو اے کوثر
فغاں کہ شرح غم روزگار کرتے رہے

○

## شفیق آصف

اس کے لہجے کا کہیں بھی بانکپن ملتا نہیں
شہر بھر میں وہ کسی سے عادتاً ملتا نہیں

جس کی خوشبو کے تعاقب میں ہے تنہائی کی شام
انجمن میں بھی وہ جانِ انجمن ملتا نہیں

مل تو جاتی ہے دکھاوے کی شناسائی بہت
اس جہاں میں پیار لیکن قیمتاً ملتا نہیں

جب سے اترا ہے گلوں پر زرد موسم کا عذاب
ہم کو سارے گلستاں میں گلبدن ملتا نہیں

کب سے اپنی خواہشوں کے بن میں آوارہ ہوں میں
میری سوچوں کو صدا کا پیرہن ملتا نہیں

وہ عجب فنکار ہے کہ شہرِ احساسات میں
اے شفیق اس کا رویہ اس کا فن ملتا نہیں

○

○

## شفیق آصف

ہے میرے دل کے آئینے میں اک تصویر مٹی کی
مرے مٹی کے خوابوں کو ملی تعبیر مٹی کی

نجانے کن جزیروں میں بھٹکتا پھر رہا ہوں میں
کہ اپنے پاؤں میں ڈالے ہوئے، زنجیر مٹی کی

تکلف برطرف آنکھوں میں میری جھانک کر دیکھو
نظر آئے گی تم کو اپنی ہی تصویر مٹی کی

ابھرنا اور رنگوں میں اتر آنا دھنک بن کر
یہ انداز محبت ہے نئی تفسیر مٹی کی۔

مجھے دشمن کا ڈر کیسا مجھے اپنوں سے خطرہ ہے
مرے سب تیر مٹی کے مری شمشیر مٹی کی

محبت خاک کے پتلوں کے دل بھی جوڑ دیتی ہے
شفیق اپنی متاع زیست ہے جاگیر مٹی کی

○

○

## تسنیم عابدی

دشت غربت میں میری آوارگی ایسی نہ تھی
میں بھٹکتی تھی مگر آوارگی ایسی نہ تھی

آہوئے دل جس طرح خود سے گریزاں ہو چلا
فصل گل میں بھی کبھی وارفتگی ایسی نہ تھی

آگہی کے دشت میں ہے خود فریبی کا سراب
جب سمندر سامنے تھا تشنگی ایسی نہ تھی

گردش دوراں سے پہلے بھی تعارف تھا مرا
جانتی تو تھی مگر وابستگی ایسی نہ تھی

سنگ اٹھایا خود پہ تو بے ساختہ دل نے کہا
اے جنوں ساماں! تری لاچارگی ایسی نہ تھی

○

○

## سحر سیال

شام کی پروائیوں کو دیکھنا
پھر مری تنہائیوں کو دیکھنا
پہلے اپنی نیک نامی دیکھ لے
پھر مری رسوائیوں کو دیکھنا
نغمگی کے شہر سے گذرو اگر
بے صدا شہنائیوں کو دیکھنا
چاندنی راتوں کے تنہا ہم سفر
چاند کی انگڑائیوں کو دیکھنا
تم کنارے پر کھڑی ہو کر سحر
جھیل کی گہرائیوں کو دیکھنا

○

○

## سحر سیال

جب ناتمام خواہشیں تقدیر ہو گئیں
یادیں تمہاری سوچ کی جاگیر ہو گئیں

کچھ دل بھی ان کے شہر سے مانوس ہو گیا
کچھ چاہتیں بھی پاؤں کی زنجیر ہو گئیں

کچھ آئینے تھے چاند سے چہروں کے آس پاس
کچھ صورتیں تھیں سوچ میں تصویر ہو گئیں

کچھ رتجگے تھے حرمت احساس بن گئے
کچھ لغزشیں تھیں باعث تعمیر ہو گئیں

چہرے سے پڑھ لیا تھا ترے دل کا اضطراب
آنکھیں ہی تیرے کرب کی تفسیر ہو گئیں

سب چوڑیاں ہی ٹوٹ کے آخر بکھر گئیں
محرومیاں کچھ ایسے بغلگیر ہو گئیں

بھولوں گی کیسے لفظ محبت کو میں سحر
سوچیں تمہاری ذہن پہ تحریر ہو گئیں

○

○

## محمد مختار علی

انا کی قید سے نکلا نہیں ہوں
ابھی میں ہر طرف گونجا نہیں ہوں

مرے رستے کی تو منزل ہے لیکن
تری منزل کا میں رستہ نہیں ہوں

سمندر کیا کرے سیراب مجھ کو
میں صحرا کی طرح پیاسا نہیں ہوں

بلا کا ضبط ہے جذبوں میں میرے
میں غم کی رو میں بہہ سکتا نہیں ہوں

تمنا تو بہت ہے گل کی لیکن
ابھی کانٹوں سے میں الجھا نہیں ہوں

عجب آزار ہے خود آگہی بھی!
میں اک پل چین سے رہتا نہیں ہوں

ہوائیں کیا بجھا پائیں گی مجھ کو
میں جگنو ہوں کوئی شعلہ نہیں ہوں

○

○

## محمد مختار علی

قرار جاں بھی میں، آزار بھی میں

خود اپنی راہ کی دیوار بھی، میں!

انا پرور بھی، عجز آثار بھی میں

بہت آسان بھی، دشوار بھی میں

تماشا گاہ عالم میں بھی موجود

تماشاہ گہ کے اس پار بھی میں

کبھی میں جیت بھی جاتا ہوں خود سے

کبھی جاتا ہوں خود سے ہار بھی میں

ازل سے بن رہا ہوں، مٹ رہا ہوں

مگر قدرت کا اک شہکار بھی میں

امیر شہر کو بھی جانتا ہوں

غریب شہر کا غمخوار بھی میں

بباطن دسترس میں اک نفس "نہیں"

بظاہر تو ہوں خود مختار بھی میں

○

○

## محمد مختار علی

یہ دھڑکن ضرب قاتل ہے کئی دن سے
اسیر ابتلا دل ہے کئی دن سے
مرے اندر جو اک انسان بستا ہے
مرے مد مقابل ہے کئی دن سے
تری خاطر یہ دل بے چین رہتا ہے
تو کیوں اس دل سے غافل ہے کئی دن سے
کئی دن سے اسے دیکھا نہیں میں نے
جو آسانی تھی، مشکل ہے کئی دن سے
تری آنکھیں جو نغمہ گنگناتی ہیں!
مری دھڑکن میں شامل ہے کئی دن سے
یقیناً کوئی طوفاں آنے والا ہے
بڑا خاموش ساحل ہے کئی دن سے
چلو مختار لوٹ آؤ، تمہارے بن
بڑی ویران محفل ہے کئی دن سے

○

○

## جمشید چشتی

رکا ہوا تھا جو لمحہ، گذر گیا چپ چاپ
مہک کے ساتھ ہی غنچہ بکھر گیا چپ چاپ
نگل گیا ہوں میں جذبات کے تلاطم کو
عجیب شور سا مجھ میں اتر گیا چپ چاپ
قدم اٹھایا، تو دہلیز کانپ اٹھی گھر کی
یہ برگ خشک یہاں کون دھر گیا چپ چاپ؟
غروب مہر کا نظارہ کر رہا تھا میں!
خبر نہیں، مرا سایہ کدھر گیا چپ چاپ
میں کس کو گھور رہا تھا، مجھے خبر نہ ہوئی
خلا سے کوئی مری آنکھ بھر گیا چپ چاپ
تمام جذبے اگر اس سے منسلک ہیں مرے
تو مجھ کو دیکھ کے وہ کیوں گذر گیا چپ چاپ
سنبھلنے والے مجھے ڈھونڈتے رہے جمشید
بھنور کو لے کے میں تہہ میں اتر گیا چپ چاپ

○

○

## احمد حسین مجاہد

بینائی کے چولہے میں دبی راکھ سے نکلا
میں کوکھ جلی آنکھ کی پوشاک سے نکلا

منسوب سمجھتا تھا جسے اپنی بقا سے
فردا کا وہی خواب مری خاک سے نکلا

محروم ہوا خود سے میں ہستی میں جب آیا
آگاہ ہوا خود سے تو افلاک سے نکلا

قائم ہے تسلسل مرا معیار وفا سے
میں جس میں ہوا جذب اسی خاک سے نکلا

میں جسم لئے پھرتا تھا کس زعم سے احمد
لے دے کے زر زخم ہی املاک سے نکلا

○

○

## احمد حسین مجاہد

جذبوں کے ابلاغ میں سچا لفظ ہوں میں
بھید بھری آنکھوں سے گہرا لفظ ہوں میں

جس میں غم کی خوشبو صاف دکھائی دے
ایسی ہر تحریر کا پہلا لفظ ہوں میں

سب احباب پہ واجب ہے تعظیم مری
عشق کتاب میں دکھ کا تنہا لفظ ہوں میں

مجھ پہ گونگی انگلی ہے اک اندھے کی
دنیا کیسے جانے کیسا لفظ ہوں میں

اپنی روح پہ کندہ کر اے دوست مجھے
ماں کی ممتا جیسا پیارا لفظ ہوں میں

صدیوں بعد بھی احمد وقت کے ہاتھوں سے
جو متروک نہ ہو اک ایسا لفظ ہوں میں

○

## غضنفر ہاشمی

کبھی تعمیر ہونا ہے، کبھی مسمار ہونا ہے

دل خوش کن! مجھے ہر حال میں سیار ہونا ہے

گرانا ہے کبھی اونچے در و دیوار کو پہلے

پھر اس کے بعد ہی رستہ کوئی ہموار ہونا ہے

کبھی اے زندگی! زنہار جاں میں بھی سکونت کر

تجھے بھی تو خبر ہو کس قدر دشوار ہونا ہے

تو اپنے آپ سے ہی مطمئن لگتا نہیں ورنہ

بھلا اب اور کیا مجھ سے بڑا شہکار ہونا ہے

ابھی آنکھیں خد و خال کرن کیسے بنائیں گی

ابھی ہم کو مجسم روزن دیوار ہونا ہے

غضنفر جیتنا اس کو بہت آسان ہے لیکن

ابھی خود سے مسلسل برسر پیکار ہونا ہے

○

## تصدق شعار

میرے چراغ شب کا گلا کاٹتی گئی
پھر اپنے ہاتھ موج ہوا کاٹتی گئی

میں بھی نہ اس کے سامنے پلکیں اٹھا سکا
اندر کہیں اسے بھی حیا کاٹتی گئی

ہم بھی جڑے ہوئے تھے اسی کائنات سے
پھر ہر معاملے کو انا کاٹتی گئی

اس رات میرے سوختہ خیمے میں کچھ نہ تھا
سائل کی دل خراش صدا کاٹتی گئی

اس کی ہتھیلیوں پہ کھلا خون آرزو
شاید ہتھیلیوں کو حنا کاٹتی گئی

○

○

## ناصر بشیر

جو دیا، ٹھیک دیا، مجھ کو خدا نے میرے
بس یہی درد کے لمحے ہیں خزانے میرے

ایک لمحے کی ملاقات ہوئی کیا اس سے
جاگ اٹھے ہیں کئی درد پرانے میرے

میں نے صدیوں کی ریاضت سے کئے جو روشن
وہ چراغ آج بجھائے ہیں ہوا نے میرے

جس سے ملتا ہوں، وہ پہلے ہی ملا ہوتا ہے
شہر میں عام ہوئے اتنے فسانے میرے

ہاتھ اٹھاتے ہی ہٹا غار کے منہ سے پتھر
کام الجھے ہوئے سلجھائے دعا نے میرے

گر نہیں حرف مکرر میں بقول غالب
کس لئے مجھ کو مٹاتا ہے زمانے میرے

○

○

## ناصر بشیر

آؤ اب ترک تمنا کا ارادہ کر لیں
زندگی الجھی ہوئی ہے، اسے سادہ کر لیں

اب ملیں گے تو مری جان! کسی خواب میں ہم
آ کہیں بیٹھ کے ہم آج یہ وعدہ کر لیں

تو چلا ہے تو ہمیں یونہی خیال آیا ہے
آج بادہ نہ سہی حسرت بادہ کر لیں

ہر طرف راستے بنتے ہی چلے جاتے ہیں
ہم سے درویش اگر خواہش جادہ کر لیں

آج موسم کا اشارہ ہے کوئی آئے گا
گھر کا آنگن نہ سہی، دل ہی کشادہ کر لیں

اپنی آنکھوں کا لہو دے کے بھی ہم سوچتے ہیں
لو چراغوں کی کسی طور زیادہ کر لیں

کوئی عریانی کا طعنہ تو نہ دے گا ناصر
آؤ اڑتی ہوئی مٹی کو لبادہ کر لیں

○

## رعنا ناہید رعنا

آنکھوں میں محبت کی چمک چھپ نہیں سکتی
ہو دھوپ میں بارش تو دھنک چھپ نہیں سکتی

جھنکار دلوں کی ہے نگاہوں کا تصادم
ٹکرائیں جو شیشے تو کھنک چھپ نہیں سکتی

مژگاں ہوں کہ رخسار ہوں دامن ہو کہ آنکھیں
سیال ستاروں کی چمک چھپ نہیں سکتی

چہرے پہ بکھر جاتے ہیں ہر لمحہ کئی رنگ
پیدا ہو اگر دل میں کسک چھپ نہیں سکتی

انساں نے کیا ہے جسے صدیوں میں فراہم
یہ روشنی اب حشر تلک چھپ نہیں سکتی

پھولوں میں نمائش کا جنوں عام ہے رعنا
پھولوں میں تو پھولوں کی چمک چھپ نہیں سکتی

○

## رعنا ناہید رعنا

بس ایک بار توجہ سے اس کو دیکھا تھا
پھر اس کے بعد ہر اک چہرہ اس کا چرا تھا

رفاقتوں کے بھرم کھل گئے تمازت میں
جو میرے ساتھ رہا بس وہ میرا سایا تھا

اندھیرے شکوہ بلب کیوں نہ ہوں کہ دنیا میں
وہاں چراغ جلایا جہاں اجالا تھا

شکستگی در و دیوار کی تھی اپنی جگہ
سکوں نواز بہت تھا کہ گھر تو اپنا تھا

میں چاہتی ہوں مرا عکس مجھ کو لوٹا دے
وہ آئینہ جسے اک بار میں نے دیکھا تھا

کلام مجھ سے کیا جب سکوت صحرا نے
کھلا یہ مجھ پہ کہ میرا سکوت صحرا تھا

محبتوں کا سفر تھا کہ ایک لمحے میں
نہ جانے کتنے مہ و سال وقت ٹھہرا تھا

وفا کے نام پہ اک حرف آ گیا رعنا
چمن میں نکہت و گل کا عجیب رشتا تھا

○

○

## ناہید قمر

فائدہ کیا اداس رہنے سے اس طرح شاعری نہیں آتی
زخم جب تک نہ دل کے جل اٹھیں حرف میں روشنی نہیں آتی

دوریوں کی جڑیں دلوں میں اگر کہیں نیچے تک اتر جائیں
پھر سفر ایک ساتھ کر کے بھی فاصلوں میں کمی نہیں آتی

فصل گل کھڑکیوں پہ دستک دے تو سماعت کے در کھلے رکھنا
سوچ لینا کہ زندگی میں یہ رت پھر دوبارہ کبھی نہیں آتی

رابطوں کو بحال کر کے بھی آئینے کب دلوں کے صاف ہوئے
ورنہ پہلے تو میری آنکھوں میں بے وجہ یوں نمی نہیں آتی

میری ساری مسافتوں کے سرے تیری دہلیز تک پہنچتے ہیں
کوئی بھی رہگزر نہیں ایسی جس میں تیری گلی نہیں آتی

دل سے گرد ملال اترے تو خود سے آگے بھی کچھ دکھائی دے
دھند آنکھوں میں ہو تو رستوں کی کچھ سمجھ واقعی نہیں آتی

خوش گمانی کی عمر میں سچ کو جاننا سہل تو نہیں ہوتا
خواب کے شہر جلنے سے پہلے ذہن تک آگہی نہیں آتی

خواہشیں ہوں نہ ہوں پہ جینے کا کرب تو جھیلنا ہی پڑتا ہے
راہ میں تھک کے رکنے والوں کو ڈھونڈنے زندگی نہیں آتی

○

○

## اسد مصطفیٰ

اک پہاڑی سلسلہ تھا' راستہ تھا اور ہم
برف کی پوشاک تھی وہ قافلہ تھا اور ہم

وہ دسمبر کی سنہری دھوپ کی پہلی کرن
گفتگو کا سلسلہ تھا' ناشتہ تھا اور ہم

چاہتوں میں قرب تھا اور سردیوں کی شام تھی
کانپتے جسموں کا وہ اک ضابطہ تھا اور ہم

اسقدر دوری بھی قربت کے اثر میں کم رہی
اپنے لب پر دوسرے کا ذائقہ تھا اور ہم

راستہ کچھ دور جا کر منقسم آیا نظر
اپنے دل پر اک عجب سا سانحہ تھا اور ہم

○

## اسد مصطفیٰ

اپنے ہونے کا فلسفہ سوچیں
اپنی سوچوں سے ماورا سوچیں

دم گھٹے کائنات میں اپنا
اب رہائی کا راستہ سوچیں

سبز لکڑی سے حادثہ ٹھہرا
آگ میں شور بولتا سوچیں

آج بھی چاند بے وفا نکلا
آسماں رو رہا ہے کیا سوچیں

قرب کی انتہا تو ہے لیکن
دو گھروں کا بھی فاصلہ سوچیں

منجمد سب روایتیں توڑیں
جدتوں کا بھی ذائقہ سوچیں

○

## ریاض احمد قادری

لفظ رخصت کے مری اپنی زباں سے نکلے
پھر بھی اے دوست نہ ہم تیرے جہاں سے نکلے

سوچ لو خوب مرے پاس کوئی ڈھال نہیں
اس سے پہلے کہ کوئی تیر کماں سے نکلے

دل میں موجود نہیں جذبۂ الفت جبکہ
نغمۂ مہر و وفا کیسے زباں سے نکلے

کل خزاؤں میں کوئی ساتھ نہیں تھا اپنے
اب بہاروں میں یہ سب لوگ کہاں سے نکلے

اب وفاؤں کا زمانہ ہوا معدوم یہاں
پیار کے جذبے کبھی اپنے گماں سے نکلے

جانے والی کوئی رت اب کے نہ لوٹے گی ریاض
ڈوبے سورج نہ کبھی شب کی اماں سے نکلے

○

○

## افضل گوہر

تنگ اتنا لگ رہا ہے شہر کا دامن مجھے
مختصر کرنا پڑے گا گھر کا بھی آنگن مجھے

تو مجھے مالِ غنیمت سے کوئی خلعت نہ دے
زیب دیتا ہے فقط اپنا ہی پیراہن مجھے

کاش چھوڑ آئے مقامِ عہدِ رفتہ تک کوئی
ڈھونڈتا ہوگا کھلونوں میں مرا بچپن مجھے

میں بہت بھوکا ہوں یہ اعلان کرنے کے لیے
اب بجانا پڑ رہا ہے ہاتھ کا برتن مجھے

اس سے کہنا زندگی ملتی ہے گوہر ایک بار
جنگ پر اکسا رہا ہے کیوں مرا دشمن مجھے

○

○

## افضل گوہر

اب لڑائی میں بچانی ہے تری ذات مجھے
تو نے تو بھیج دیئے کر کے قلم ہاتھ مجھے

میں وہ پودا کہ تری جڑ سے نکل آیا ہوں
مجھ کو معلوم ہے کتنا ہے ترے ساتھ مجھے

دن میں لوگوں نے مرا نور کیا اتنا کشید
میں کہ سورج تھا سرشام ہوئی رات مجھے

جیسے سید ہوں نکل آتے ہیں کشکول سے سانپ
راس آتی ہی نہیں مانگ کے خیرات مجھے

بار ہا درد سے رونے لگے افضل گوہر
اپنی روداد سناتے ہوئے کھنڈرات مجھے

○

○

صائمہ اسماء شاہد

کیوں بپا جشن طرب ہے نیا سن آتا ہے
میرے لوگوں پہ نیا دور محن آتا ہے

کیا جو ہر ایک روش راکھ بناتا جائے
نہیں اس کو ہنر زیب، چمن آتا ہے

ڈوبنا چاہیں بھی تو ڈوب نہیں پائیں گے
جنھیں دریاؤں میں پیراکی کا فن آتا ہے

کوئی شکوہ ہی کریں، نوبت غم خواری آئے
کیوں ہمیں شکر گزاری کا چلن آتا ہے

شہر میں اہل جنوں، دشت میں واعظ بن کر
ہو برا دل کا ہر اک طرز سخن آتا ہے

چاند چہرہ ہو کہ سورج کا سراپا اسماء
ساتھ لے کر مرے آنگن میں گہن آتا ہے

○

○

## ذیشان اطہر

جو آواز اٹھانے والا ہوتا ہے
روکھی سوکھی کھانے والا ہوتا ہے

سچی بات نہ لکھنا، اس کا حشر یہاں
منٹو کے افسانے والا ہوتا ہے

گھر سے نکلتے ہیں تو سامنے ہر رستہ
اس کی جانب جانے والا ہوتا ہے

سبز رتوں کے خواب جلیں جب آنکھوں میں
آنسو آگ بجھانے والا ہوتا ہے

اس احساس کو زندہ رکھا مرنے تک
جیسے کوئی آنے والا ہوتا ہے

دل دیوار کے سائے میں جو بیٹھتا ہے
وہ دیوار گرانے والا ہوتا ہے

اس کی آنکھ کا ایک اشارہ کتنوں کو
منزل پہ پہنچانے والا ہوتا ہے

وہ موقع کی تاک میں رہتا ہے ذیشان
زہری سانپ خزانے والا ہوتا ہے

○

○

## مجید اختر

سرائے کوچۂ جاناں میں جب بھی ٹھہرے گا
ہمیں خبر ہے کہ دل بے سبب بھی ٹھہرے گا

بہت طویل سہی مدت جدائی مگر
وہ آئیگا تو مرے گھر میں اب بھی ٹھہرے گا

ہمارا خون کہ بکھرا ہے یوں شفق کی طرح
کسی کے حق میں یہ تمہید شب بھی ٹھہرے گا

کھلی نہ شاخ تمنا بھی اور دل میں میرے
غم جراحت سنگ طلب بھی ٹھہرے گا

مری مثال کہ استادہ ہوں شجر کی طرح
کوئی تو آئیگا جو بے سبب بھی ٹھہرے گا

کہ دن کا بوجھ بھی ہم دفتروں میں ڈھوتے رہے
ہمارے شانوں پہ اب بار شب بھی ٹھہرے گا

کبھی تو حلقۂ یاراں میں ہوگی فکر سحر
کہیں تو قصۂ تحسین شب بھی ٹھہرے گا

○

مجید اختر

ہر قصہ غم اس کو سنانے کا نہیں تھا
تھا رشتہ الفت سو جتانے کا نہیں تھا

ہم ملتے رہے اس سے اسی خندہ جاں سے
موسم بھی کہیں روٹھ کے جانے کا نہیں تھا

صدمہ تھا کہ وہ بھی تو رہا راندہ درگاہ
افسوس ہمیں اپنے ٹھکانے کا نہیں تھا

دوری سے تری خوش بھی نہ تھے کچھ مرے دن رات
صدمہ بھی تجھے چھوڑ کے جانے کا نہیں تھا

ہم شہر تمنا سے بھی پلٹے تہی دامن
یارا بھی کسی غم کے اٹھانے کا نہیں تھا

ہم دل میں لئے اس لئے پھرتے رہے اس کو
جو زخم تھا سینے پہ سجانے کا نہیں تھا

جلدی بھی کچھ ایسی ہمیں مرنے کی نہیں تھی
مصرف بھی کوئی دیر سے جانے کا نہیں تھا

کچھ اپنی طبیعت بھی نہ مائل ہوئی اختر
کچھ شوق بھی اپنوں کو ہرانے کا نہیں تھا

○

○

فرخ چودھری

بچھڑ کر اس سے رہنا پڑ رہا ہے
یہ مشکل کام کرنا پڑ رہا ہے

نہیں کچھ زور میرا روز و شب پر
جہاں کے ساتھ چلنا پڑ رہا ہے

گزرنا تھا ہمیں مل کر جہاں سے
مجھے تنہا گزرنا پڑ رہا ہے

بھر آئی ہیں بوقت وصل آنکھیں
خوشی کے وقت رونا پڑ رہا ہے

بہت سے خواب تھے جن سے کسی کو
ابھی محروم ہونا پڑ رہا ہے

تمہارے ساتھ رہنا چاہتے تھے
بچھڑ کر تم سے رہنا پڑ رہا ہے

○

○

## نگار سجاد ظہیر

اتنی جذبات کی شورش تھی میرے دل کے قریب،
راستہ بھول گئی آن کے منزل کے قریب

فیصلہ کون کرے عقل و جنوں کے مابین
کون ہے برسرِ حق کون ہے باطل کے قریب

ناخدا ہو جو تنگ ظرف تو اے ہم سفرو
ڈوب جاتے ہیں سفینے ، کبھی ساحل کے قریب

خلوتِ غیر سے آپ آئے نہیں مان لیا
بائیں رخسار پہ سرخی جو ہے اک تل کے قریب؟

تو نے جو خود کو جہانگیر بنا رکھا تھا
پابجولاں ہے مری سلطنتِ دل کے قریب

اس کی قیمت کو کسی طور گھٹانا ہے محال
ہر طرف سنگ ہوں گو جوہرِ قابل کے قریب

ایک پیغام سنا جاتا ہے ہر شام نگار
اک ننھا سا ستارا مہِ کامل کے قریب

○

○

## خالد معین

مسافرانِ رہِ عشق کو خبر ہے میاں
یہ دشت اور ہے یہ اور ہی سفر ہے میاں

صبا کی تیز خرامی کو کچھ خبر ہی نہیں
کہ دل زدوں کا بھی اک حلقۂ اثر ہے میاں

جو عہد ٹوٹ رہا ہے خلش اسی کی ہے
جو زخم بھرنے لگا ہے اسی کا ڈر ہے میاں

اسی کے لمس کی خوشبو نفس نفس مہکے
اسی کی یاد کا سایہ شجر شجر ہے میاں

جو اہلِ دل ہیں وہی لوگ جان سکتے ہیں
یہ دور اپنے رویوں میں بے ثمر ہے میاں

جو ہے سو حرفِ ملامت کے دائرے میں ہے
تمہی کہو کہ یہاں کون معتبر ہے میاں

○

○

## خالد معین

بہت دن بعد پھر ایسا ہوا ہے
کہ ہم سے آئینہ روٹھا ہوا ہے

ہمارے ہونے کے امکاں سے آگے
نہ ہونے کا خلا پھیلا ہوا ہے

عجب کیا ہے کبھی تعبیر مل جائے
ابھی تو خواب سا دیکھا ہوا ہے

تمہارے جیت جانے سے زیادہ
ہماری ہار کا چرچا ہوا ہے

بہت گھل مل کے بھی دنیا سے ہم نے
ذرا سا فاصلہ رکھا ہوا ہے

بھٹکتا ہے انا کے دائرے میں
مسافر راستہ بھولا ہوا ہے

سمیٹو بادباں اور خواب اپنے
سمندر شام سے بپھرا ہوا ہے

○

○

## شباب صفدر

یہ ممکن ہے اگر جینے کی صورت ڈھونڈتا ہے
مگر تو خواب جیسی اک حقیقت ڈھونڈتا ہے

مجھے اس کی پریشانی کا اندازہ تو ہے کچھ !!
مگر یہ دل محبت میں سہولت ڈھونڈتا ہے

یہ صدیوں کی غلط فہمی کا حاصل ہے کہ اب تک
درندوں میں، زمانہ آدمیت ڈھونڈتا ہے

اسے کہئے وہ اپنی راہ لے یا کچھ نہ بولے
جو اس بیداد نگری میں عدالت ڈھونڈتا ہے

کہیں جلدی میں اکثر بھول جاتا ہے مجھے وہ
ضرورت کی گھڑی میں پھر بعجلت ڈھونڈتا ہے

یہ شاخ صبر جس پر پھول بھی آئے نہیں ہیں
اسے اک شعلۂ برق عداوت ڈھونڈتا ہے

○

○

شہاب صفدر

عمر کے جس حصے میں تم ہو ایسا ہوتا ہے
حسن تکلف پر بھی پیار کا دھوکا ہوتا ہے

بستر سے باہر نکلوں تو ، میرا بانکا سپنا
اندیشے کی چادر اوڑھے سویا ہوتا ہے

آہستہ آہستہ کھولو یاد کی بند الماری
جلدی میں تو دھول سے منظر دھندلا ہوتا ہے

کون کسی کی آئی اپنے سر لیتا ہے ہنس کر
لیکن اے دل جس سے درد کا رشتہ ہوتا ہے

سال کا آخری سورج دیکھ کے' تنہا' سندھ کنارے
دل بھی شہاب اک گہری سوچ میں ڈوبا ہوتا ہے

○

## شہاب صفدر

وفا کے کھیل میں کیسے مسابقت کرتا
اگر میں ہار نہ جاتا تو معذرت کرتا

کوئی ثبوت تو ہو میرے زندہ ہونے کا
میں اس گماں سے نہیں اپنے غم غلط کرتا

یہ تیرے سر پہ جو دستار، خوش گمانی ہے
ہر ایک شخص نہیں اس کی منزلت کرتا

خدا نہ تھا، مری قسمت مگر بدل جاتی
جو عرضداشت پہ وہ شخص دستخط کرتا

نہ رکھتے ایک ستارہ اگر نظر میں ہم
تو یہ اندھیرا مسافت کو بے جہت کرتا

دمِ طلوع، خفا اس لیے ہوئے شب زاد
کہ آفتاب چراغوں سے مشورت کرتا

ہدف بنا ہوں اکیلا میں دو طرف کا شہاب
تنی کمانوں میں سعیِ مفاہمت کرتا

عطاء الحق قاسمی

دھوپ چمکتی ہے تو بادل یاد آتا ہے
شہر سلگتے ہیں تو جنگل یاد آتا ہے

میں سمجھا تھا بھول چکا ہوں لیکن وہ تو
یاد آتا ہے اور مسلسل یاد آتا ہے

ساون کی رم جھم راتوں میں اس کو بھی کیا
بھیگی سڑکیں اور وہ پاگل یاد آتا ہے؟

یاد کریں تو یاد نہیں آتا وہ سانول
بھولنا چاہیں تو وہ سانول یاد آتا ہے

آج بھی جب میں ڈار سے کونج بچھڑتی دیکھوں
اس کی آنکھیں، اس کا کاجل یاد آتا ہے

لوٹ آتی ہیں بھول بھلیوں سے جب آنکھیں
عطا کو بھولا بسرا پل پل یاد آتا ہے

○

## عطاء الحق قاسمی

عید قریب ہے اور اس کا خط آیا ہے
وہ خود کیوں نہیں آیا دل پہ بوجھ سا ہے

وہ کہتا ہے کل مل لیں گے آج ذرا
کچھ ملنے والوں کو گھر پہ بلایا ہے

جس کی کرنیں مشرق میں اور مغرب میں
دل آنگن میں ایسا سورج اترا ہے

اس کے بدن کے رستے بھول بھلیاں سے
ان رستوں سے لوٹ کے پر کون آیا ہے؟

تم کیا سمجھو، تم کیا جانو بے خبرو!
رات کو سورج، دن کو چاند نکلتا ہے

ان آنکھوں کے سحر سے نکلو جلد عطا
ان آنکھوں سے جھوٹ بھی سچ سا لگتا ہے

○

○

## عطاء الحق قاسمی

یادوں کا ایک سلسلہ پھیلا ہوا تو ہے
اس یار بے وفا سے یہی رابطہ تو ہے

یہ مت کہو کہ اس سے تمہیں کچھ نہیں ملا
اس نے تمہیں یہ درد انوکھا دیا تو ہے

ایسا نہیں کہ اس نے بھلا ہی دیا مجھے
کہنے لگا کہ آپ کو دیکھا ہوا تو ہے

شاید کبھی مری طرح رستہ وہ بھول جائے
میں نے دیا منڈیر پہ رکھا ہوا تو ہے

جس فاصلے سے بڑھتی ہیں نیس کی قربتیں
وہ بے تجابیوں میں بھی رکھا ہوا تو ہے

محشر میں اب عذاب سے انساں کو ہو نجات
دنیا میں ہر عذاب سے گذرا ہوا تو ہے

○

○

## عطاء الحق قاسمی

طوفاں گذر گیا ہے تو پتوار ہیں بہت
دل بجھ گیا تو دل کے طلبگار ہیں بہت

آنکھوں میں کوئی خواب ہے یا خواب کا اثر
ان ظلمتوں میں صبح کے آثار ہیں بہت

عصمت مآب پردہ نشینوں کے باب میں
ہم کیا کہیں کہ ہم تو گنہ گار ہیں بہت

چاروں طرف ہیں جہل و عداوت کی صورتیں
یہ صاحبان جبہ و دستار ہیں بہت

شام سیہ قبا ہوئی مسند نشین صبح
سچ پوچھئے تو اس کے طرفدار ہیں بہت

ان سے کہو وہ زحمت آزار مت کریں
میرے لئے تو صبح کے اخبار ہیں بہت

○

○

## عطاء الحق قاسمی

اک امتحاں کے بعد اور امتحان آ گیا
زمین مہرباں ہوئی تو آسمان آ گیا

ہم ایک دوسرے کی شکل دیکھنے سے بھی گئے
یہ کون میرے اور تمہارے درمیان آ گیا

ترے بغیر زندگی گذر رہی تو ہے مگر
جو بے دھیانیوں میں ہم کو تیرا دھیان آ گیا؟

نگر دھواں دھواں سا تھا فضا بجھی بجھی سی تھی
پر اس کے بعد یوں ہوا وہ مہربان آ گیا

ہم اہل دل عجیب مخمصوں میں مبتلا رہے
کبھی یقین آ گیا، کبھی گمان آ گیا

سب اپنی اپنی خواہشوں کی دھوپ میں بھی مطمئن
ہمارے درمیاں یہ کون خوش بیان آ گیا؟

جھلس رہے تھے دھوپ میں ترس رہے تھے سائے کو
نگر میں رات ہو گئی تو سائبان آ گیا

○

○

عطاء الحق قاسمی

کہیں گلاب میں ہوں اور کہیں ببول میں ہوں
کسی کی یاد میں ہوں اور کسی کی بھول میں ہوں

مری تلاش میں نکلیں نہ قافلے والے
دکھائی دوں گا اسی راستے کی دھول میں ہوں

بندھا ہوا ہے مرا دل حفیظ تائب سے
پڑا ہوا میں در عاشق رسول میں ہوں

میں وہ دعا ہوں عطا جو ہر ایک لب پہ ہے
بس اتنا ہے کہ ابھی عرصۂ قبول میں ہوں

○

○

## عطاء الحق قاسمی

مرے وجود میں ہلچل نئی مچا دینا
مرے خدا مجھے ایسا ہی رت جگا دینا

بہت اداس سا پھرتا ہے زخم خوردہ ء عشق
اسے بھی بزم ہوس میں ذرا جگہ دینا

اک آسمان سروں پہ سدا رہے قائم
اک آسمان سروں سے مگر ہٹا دینا

تمہی کو آتے ہیں یہ کھیل دلفریبی کے
تم اپنا نقش مرے دل سے خود مٹا دینا

سماعتوں کی حدوں سے نکل بھی جائے اگر
سکوت شہر کو تم مژدہ ء صدا دینا

جسے پکارنا سرگوشیوں کی رم جھم میں
اسے عجیب سا لگتا ہے یوں صدا دینا

میں مر بھی جاؤں جو دیدہ وران شہر وفا
مری زمین میں آنکھیں مری اگا دینا

○

○

عطاء الحق قاسمی

منزل پہ پہنچتے ہی کے ارماں نہیں ہوتے
رستے تو کبھی بے سروساماں نہیں ہوتے

آئینے تو اس شہر میں ہیں اور بھی لیکن
سارے تو تجھے دیکھ کے حیراں نہیں ہوتے

یہ سوچ کے بے لوث تری سمت چلا ہوں
منزل سے کبھی وعدہ و پیماں نہیں ہوتے

اس بار ملا مجھ سے تو پوچھوں گا یقیناً
کیا عشق کے دل میں کوئی ارماں نہیں ہوتے؟

ان آنکھوں میں تم ڈوب نہ جانا کہ عطاؔ جی
وہ ڈوبنے والوں کے بھی پرساں نہیں ہوتے

○

○

عطاالحق قاسمی

شکوۂ جور و جفا بھی ہونا
دعویٔ صبر و رضا بھی ہونا

کاش میں نے کبھی سوچا ہوتا
ایک دن تجھ سے جدا بھی ہونا

سامنے رکھنا ہواؤں کے چراغ
اور ہواؤں سے بچا بھی ہونا

دونوں لمحے ہیں قیامت یا رب
اس سے ملنا بھی، جدا بھی ہونا

قید بھی اس کی بہت سخت مگر
اس کی زلفوں سے رہا بھی ہونا

اس سے رکھنا نہ تعلق کوئی
اور رستے میں پڑا بھی ہونا

آج مائل بہ کرم وہ بت بھی
آج تو میرا کہا بھی ہونا

○

○

## عطاء الحق قاسمی

پھولوں سے بھری راہگذر یاد نہ آئے
اب دل کو کوئی اچھی خبر یاد نہ آئے

مرہم بھی تو رکھو کہ مسیحائے جہاں ہو
کیوں تم کو مرے زخم جگر یاد نہ آئے؟

راتوں کو اترتا ہے وہ اک خواب سہانا
دن بھر میں کروں یاد، مگر یاد نہ آئے

کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں سمجھ دار مسافر
جب دھوپ سے نکلیں تو شجر یاد نہ آئے

اس عمر میں اس شخص سے کیا ربط بڑھائیں
اک بار ملے، بار دگر یاد نہ آئے

سوچا تھا کریں گے اسے زنجیر ہنر سے
وہ سامنے آیا تو ہنر یاد نہ آئے

یہ ٹھیک ہے چھوڑا تھا اسے اپنی رضا سے
یہ کیا کہ ہمیں اب وہ مگر یاد نہ آئے

کیا ایسے سفر کا لکھیں احوال عطا ہم
تصویر بھی دیکھیں تو سفر یاد نہ آئے

○

عطاالحق قاسمی

اسے اب بھول جانے کا ارادہ کر لیا ہے
بھروسہ غالباً خود پر زیادہ کر لیا ہے

ہمارے دوستوں نے بے لبادہ موسموں میں
ہمارے نام کو اپنا لبادہ کر لیا ہے

مبارک ہو کشادہ دل حریفوں نے بھی اب کے
جناب شیخ سے کچھ استفادہ کر لیا ہے

ہمیں تقسیم ہونے سے عطا نفرت بہت تھی
تبھی تو ہم نے اپنا ملک آدھا کر لیا ہے

○

برزخ
ساتواں در
فشار
ذرا پھر سے کہنا
اور
"اس پار" کے بعد

سفرنامہ

# امریکہ سے امریکہ! (۱)

وحید قیصر

ہمارا طیارہ لاہور سے پرواز کرنے کے بعد فرینکفرٹ تو کسی نہ کسی طرح پہنچ گیا لیکن اب اس سے آگے نیویارک تک اس کی پرواز کافی مشکوک نظر آ رہی تھی۔ چنانچہ بہت سے مسافروں نے تو اس طیارے پر مزید سفر سے انکار بھی کر دیا اس لئے کہ آگے کا تمام سفر یعنی یورپ سے امریکہ تک کی آٹھ گھنٹے کی پوری پرواز سمندر کے اوپر تھی۔ اب تک جو کچھ ہوا سو ہوا۔ اللہ اللہ کر کے سفر کا پہلا مرحلہ تو مکمل ہوا۔ ابھی کچھ مسافر پی آئی اے کے عملے سے بات کرنے ہی والے تھے کہ خود عملے کی طرف سے اعلان کرایا گیا کہ تمام مسافر فرینکفرٹ میں اس وقت تک ٹھہریں گے جب تک طیارے کی دیکھ بھال اور چیکنگ مکمل نہیں کر لی جاتی۔ اس میں کتنی دیر لگے گی اس کا کسی کو کچھ پتہ نہ تھا۔ مزید معلوم ہوا کہ طیارے کے ہائیڈرالک نظام میں خرابی پیدا ہو چکی ہے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ پی آئی اے کی ایئربس ۱۱۰ (Air Bus 110) پرواز شروع کرتے ہی اپنی چال بھول کر دلکی چلنے لگی تھی۔ لاہور سے ہمیں ٹکٹ خریدتے وقت مژدہ سنایا گیا تھا کہ نیویارک کے لئے ایک نئی سروس شروع کی جا رہی ہے۔ اور جب طیارے میں سوار ہونے لگے تو طیارے کی سیڑھیوں کے قریب ایئرلائنز کے مقامی حکام گلاب کے پھولوں کے ہار ہمارے گلے میں مسکرا مسکرا کر ڈالنے کے لئے بے چین کھڑے تھے۔ کیا بات ہے فاروقی صاحب! میں نے دور سے ہی سوال اچھال دیا۔ "بھئی اوپننگ فلائٹ ہے اس لئے آپ کو ہار پہنا کر رخصت کر رہے ہیں۔" "اچھا تو اس کا مطلب ہے چڑھ جا بچہ سولی پر۔" میرا ماتھا ایک دم ٹھنکا اور مجھے ۱۹۶۰ء کی پی آئی اے کی قاہرہ کی اوپننگ فلائٹ اور اس کے بعد ابھی پچھلے سال کی گلگت اوپننگ سروس کا حشر یاد آ گیا۔ جس میں پھولوں کے ہار پہننے والے کئی سو بے گناہ

مسافروں کو ایک ایسی منزل کو روانہ کر دیا گیا تھا جہاں جا کر کوئی واپس نہیں آتا۔

"خدا خیر کرے" میرے ہونٹوں سے اچانک یہ الفاظ ادا ہو گئے اور ہم چار و ناچار پر تپاک الوداعی ریسپشن لے کر بادلِ ناخواستہ اپنی نشستوں پر آ کر بیٹھ گئے۔ اس کے بعد سفر شروع ہوا اور ہم پر بہت جلد واضح ہو گیا کہ ہمیں کیوں گلاب کے ہار پہنا کر اتنے لمبے سفر پر اللہ حافظ کہا گیا۔ فاروقی صاحب نے بتایا تھا کہ چھوٹا جہاز ہے اس میں نوے بانوے کے قریب سیٹیں ہیں جبکہ نیویارک کی عام فلائٹ میں عموماً ساڑھے چار سو مسافروں کی جگہ ہوتی ہے تاہم اس میں بہت سی تبدیلیاں کی گئی ہیں اور نئے ساز و سامان سے آراستہ کیا گیا ہے۔ بہت سی تبدیلیوں کا تو ہمیں کچھ علم نہ ہوا البتہ نیا ساز و سامان صرف اس حد تک تھا کہ جہاز کے اندر مسافروں کے سامنے ٹی وی کی صورت میں راڈار سکرین لگی تھی جس پر اس علاقے کا نقشہ بنا تھا جس پر طیارہ پرواز کر رہا تھا اور نقشے پر طیارے کی پرواز ظاہر کر رہی تھی کہ وہ اب کس علاقے پر سے گزر رہا ہے۔ اس طرح پائیلٹ کو کچھ بتانے کی ضرورت نہ تھی۔ مسافروں کو خود ہی معلوم ہو جاتا تھا کہ جہاز کی رفتار اور بلندی کیا ہے۔ طیارے کے باہر اور اندر کیا ٹمپریچر ہے اور تھوڑی دیر تک ہم کس ملک کی فضائی حدوں میں داخل ہونے والے ہیں۔ یہ سسٹم بہت مفید اور دلچسپ تھا پاکستان کی سرحدوں سے افغانستان میں داخل ہوتے ہی برف پوش بلند پہاڑی سلسلہ شروع ہو گیا۔ کابل و قندھار سب برف کی دبیز چادروں میں چھپے ہوئے تھے اگرچہ ہمیں بخوبی علم تھا کہ ان دبیز برفانی پردوں کے پیچھے افغان خانہ جنگی پوری گھن گرج کے ساتھ جاری ہو گی اور دوستم اور حکمت یار کے توپخانے کابل کے جنگ سے تباہ شدہ شہر کی اینٹ سے اینٹ بجا رہے ہوں گے کیونکہ یہ بھی تو آخر مسلمان ہی ہیں جو بڑی آسانی سے دشمن کا آلہ کار بن جاتا ہے اور بھول جاتا ہے کہ عیار دشمن جب اس کو خود ختم کرنے میں ناکام رہتا ہے تو اسے آپس میں لڑا دیتا ہے۔

کابل پر سے نکلتے ہی ہم وسطی ایشیا کے علاقے پر پہنچ گئے اور اس کے کچھ دیر بعد ماسکو کی طرف محو پرواز تھے۔ ہمارا چھوٹا سا طیارہ اب بڑے بڑے جھٹکے لے رہا تھا اور یوں محسوس ہو رہا تھا کہ باہر غالباً کوئی برفانی طوفان چل رہا ہے۔ جس کے سامنے یہ چھوٹا سا طیارہ بالکل بے بس ہے۔ مسافر ابھی تک صبر و شکر کی حالت میں تھے کہ پائیلٹ نے بتایا "ہم طیارے کی غیر متوازن پرواز کو درست کرنے کے لئے اب ۳۵ ہزار فٹ کی بلندی پر جا رہے ہیں۔" اس کے بعد بھی غیر متوازن پرواز غیر متوازن ہی رہی اور فرینکفرٹ تک پوری آٹھ نو گھنٹے کی پرواز میں

کوئی سکون کا لمحہ نہ آیا۔

مرتے کیا نہ کرتے۔ بچے خوف کے مارے روتے رہے اور مائیں سہمی ہوئی طیارے کی سلامتی کی دعائیں کرتی رہیں' بالآخر خوف اور تجسس کے یہ ملے جلے لمحات بھی کٹ ہی گئے۔ فرینکفرٹ میں صبح کا وقت تھا اور طیارے سے اس کے شہروں کا منظر بالکل متاثر کرنے والا نہ تھا۔ معلوم ہوا کہ درجہ حرارت منفی سات ہے۔کشادہ دیہاتی ماحول میں دریائے رائن خاموشی سے بہہ رہا تھا۔

فرینکفرٹ میں اترے تو قطعاً" یہ علم نہ تھا کہ یہاں گھنٹوں کے حساب سے رکنا پڑے گا۔ عام طور پر یہاں طیارے میں تیل بھرنے کے لئے چالیس پینتالیس منٹ رکنا ہوتا ہے اور اس عرصے میں مسافروں کو ٹرانزٹ لاؤنج میں جانے کی اجازت دے دی جاتی ہے۔ جب ایک دو گھنٹے ٹرانزٹ لاؤنج میں گھومتے گزر گئے تو پی آئی حکام سے پوچھا گیا۔ حضور کب دوبارہ پرواز کا ارادہ ہے۔ ابھی کچھ پتہ نہیں۔ طیارے کے سسٹم کی خرابی دُور کرنے کے لئے انجینئر کو طلب کر لیا گیا۔ دو گھنٹے مزید گزر گئے تو بتایا کہ انجینئر آ چکا ہے اور اب مطلوبہ پرزہ منگوایا جا رہا ہے۔ اتنے میں اعلان کیا گیا۔ "پی آئی اے کے مسافر۔۔۔ ڈی ونشی ہوٹل میں چلیں وہاں انہیں کھانا کھلایا جائے گا۔ ٹرانزٹ لاؤنج کی بھول .بھلیوں سے گزرتے اور ہوٹل کو تلاش کرتے ہوئے ہم وہاں پہنچ گئے ہوٹل کا نام مشہور اطالوی مصور کے نام پر رکھا گیا تھا لیکن اس میں کوئی غیر معمولی بات نہ تھی۔ لوگوں کا اس قدر اژدھام تھا کہ فلائٹ کے ستر کے قریب پاکستانی مسافروں کے یکجا بیٹھنے کے لئے بھی جگہ نہ تھی۔ تاہم ایک الگ ونگ میں بیٹھنے کا تو اہتمام کر دیا گیا اس کے بعد باری باری پوچھا گیا۔ "کیا کھائیں گے؟" بیشتر کی طرف سے بتا دیا گیا "پاکستانی کھانے' نو پورک' نو ڈرنک" کچھ پاکستانی نوجوان ایسے تھے جو ڈرنک کے رسیا تھے چنانچہ انہوں نے کسی قسم کا حجاب رکھے بغیر اپنی محفل الگ جمالی اور وہاں سب کچھ چلنے لگا۔ دوسرے لوگوں کی باری بہت دیر میں آئی۔ ہوٹل کے بدتمیز ملازم محض یاد دہانی پر لڑنے اور بے عزتی کرنے کے لئے تیار ہو جاتے غالباً انہیں غصہ تھا کہ پاکستانی کیوں ہیں اور پاکستانی کھانے کیوں مانگ رہے ہیں۔ یہ پاکستانی کھانے تیار کرتے انہیں ڈیڑھ گھنٹہ لگ گیا۔ پاکستانی کھانے یعنی چاول اور وہ بھی کچے اور فراش بین پھلیاں۔۔۔ ادھ گلی' بالکل پھیکی۔ سب نے انتہائی بھوک کے باوجود چکھ کر چھوڑ دیا اور لاؤنج میں آ کر بیٹھ رہے۔ ٹرانزٹ لاؤنج میں گھومتے پھرتے اور جرمن دوشیزاؤں کو جن میں سے بیشتر

منی سکرٹ میں تھیں دیکھیں۔ دیکھتے آنکھیں تھک چکی تھیں اور اب ہم میں سے کسی کو جرمن معاشرے کے اصل خط و خال دیکھنے سے کوئی دلچسپی نہ تھی بس ایک ہی خواہش تھی کہ کسی طرح اپنا طیارہ ٹھیک ہو جائے اور منزل کی طرف روانہ ہوں۔ کئی فیملیوں کو فکر تھا کہ انہوں نے نیویارک سے آگے پیشل جیسی دور دراز ریاستوں اور کئی نے کینیڈا جانا ہے وہاں انہیں لینے کے لئے عزیز و اقارب آئے بیٹھے ہوں گے۔ ایک نوجوان خاتون اپنے دو سال کے بچے کے ساتھ کینیڈا جا رہی تھی۔ اس کا خاوند شادی کے بعد اسے چھوڑ کر کینیڈا میں غائب ہو گیا تھا اور وہ ویزا لے کر اس کا پتہ لگانے جا رہی تھی۔ غریب بہت پریشان تھی کہ اسے انگریزی بھی نہیں آتی تھی اور اس کا کوئی ہم سفر بھی نہ تھا بس ایک کاغذ پر انگریزی میں اپنا مفہوم و مدعا کسی سے لکھوا کر لائی ہوئی تھی۔ ایک اور لڑکی نیویارک کی عیاشیوں میں کھو جانے والے اپنے جیون ساتھی کی تلاش میں جا رہی تھی۔ اسے بھی واجبی سی انگریزی آتی تھی۔ وہ پریشان تھی کہ اتنے بڑے ملک میں وہ اپنے خاوند کو کیسے ڈھونڈھے گی۔ وہ غالباً نیویارک میں اپنے کسی عزیز کے پاس جا رہی تھی وہ بھی پریشان تھی کہ اسے وہ لینے کے لئے ہوائی اڈے پر آتا ہے یا نہیں۔ نہ آیا تو وہ اسے کیسے تلاش کرے گی۔ اس کے مکان تک کیسے پہنچے گی؟ وغیرہ ایسے ہی اور کتنے المیے ہیں جو نوجوان نسل کے امریکہ جانے کے جنون نے پیدا کر رکھے ہیں۔ یہ گھاؤ کتنی معصوم بے آسرا اور بھولی بھالی لڑکیوں کی زندگیوں کے لئے ناسور بن چکے ہیں اور کب تک بنتے چلے جائیں گے۔ کاش ہمارا اپنا ملک کسی قابل ہوتا کہ نوجوانوں کو اپنے ملک میں ہی باعزت روزگار مل جاتا اور وہ بیٹیوں کا جہیز گروی رکھ کر مغربی ملکوں کا رخ نہ کرتے؟

پورے نو گھنٹے کے انتظار کے بعد پی آئی اے کے کاؤنٹر سے اعلان کیا گیا کہ مسافر طیارے میں اپنی نشستوں پر واپس پہنچیں فلائٹ روانگی کے لئے تیار ہے۔ ایئر لائنز کے ایک افسر معذرت خواہانہ انداز میں کہہ رہے تھے۔

"جہاز کی خرابی دور کرنا بڑا ضروری تھا کیونکہ یورپ سے امریکہ کا آگے کا تمام راستہ سمندر کے اوپر ہے اور ہم اتنے مسافروں کے ساتھ کسی قسم کا رسک لینے کو تیار نہیں تھے۔"

طیارہ روانہ ہوا تو اس بات سے خاصا اطمینان ہوا کہ پرواز Smoth تھی یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ وہی طیارہ ہے جو فرینکفرٹ تک پرواز کے دوران لاہور کی اومنی بس بنا رہا

تھا۔ نیویارک پر لینڈ کیا تو ہمیں پرواز شروع کئے ۲۵ گھنٹے گذر چکے تھے۔

نیوریاک کا وقت ہمارے پاکستان کے وقت سے دس گھنٹے پیچھے ہے۔ یعنی اگر پاکستان میں جمعہ کا دن ختم ہو کر شام ہو رہی ہو تو نیویارک میں جمعہ کی صبح طلوع ہو رہی ہوتی ہے۔ سردیوں میں یہ فرق نو گھنٹے کا رہ جاتا ہے۔ عام طور پر ہوتا یہ ہے کہ لاہور سے نیویارک کی فلائٹ چونکہ ۱۸ گھنٹے کی ہے اس لئے وہاں سے جمعرات کی رات کو روانہ ہونے والے نیویارک پہنچ جانے کے بعد بھی جمعرات سے آگے نہیں بڑھنے پاتے۔ نیویارک دنیا کا بہت خوبصورت' بہت بڑا اور بہت مصروف ایئرپورٹ ہے۔ چند سال ادھر سنا تھا کہ نیویارک پہنچنے پر اس نئی دنیا کے مسافروں کو صدر امریکہ طرف سے خوش آمدید کہا جاتا ہے۔ صدر کا یہ پیغام Wel Come to N. York لیزر شعاعوں کے ذریعے نو واردان امریکہ تک پہنچتا ہے۔ لیکن اب ایسا نہیں ہوتا۔ شاید اس لئے کہ اب امریکہ اپنی سرزمین پر ہر ایرے غیرے کو خوش آمدید کہنے کے لئے تیار نہیں ہے تب ہی تو دنیا بھر میں لوگوں کو امریکہ کا ویزا بڑی مشکل سے ملتا ہے۔

اس نئی دنیا میں جہاں کبھی دنیا بھر سے کالے گورے جرائم پیشہ غرض ہر قسم کے سزایافتہ و غیر سزایافتہ لوگوں کو جہازوں میں بھر بھر کر لایا جاتا تھا اگرچہ ابھی تک اس کا وسیع و عریض علاقہ خالی پڑا ہے تاہم امکانات کی اس وسیع و عریض دنیا میں اب لوگوں کو اندھا دھند نہیں بلکہ ایک خاص اور سوچے سمجھے منصوبے کے تحت آنے اور آباد ہونے دیا جاتا ہے۔ امریکیوں کو اپنی فصلوں اور پیداواروں تک کا بڑا خیال ہے۔ یہاں آنے والے لوگوں سے یہاں اترتے وقت ایک فارم بھروایا جاتا ہے جس میں پوچھا جاتا ہے کہ آپ اپنے ساتھ کیا کچھ لائے ہیں۔ کسی قسم کی کھانے پینے کی چیزیں حتیٰ کہ ادویات پھل فروٹ' خشک و تازہ اور مصالحہ جات یہاں تک کہ پودوں کے بیج اور درختوں کی قلمیں تک آپ امریکہ نہیں لا سکتے۔ ہمارے پاس نہایت اعلیٰ قسم کے آم تھے۔ فارم میں درج کر بیٹھے چنانچہ ایئرپورٹ پر دھر لئے گئے۔ فریش فروٹ (مینگوز) کے لفظ پر سرخ دائرہ لگا کر ہمیں کسٹم کاؤنٹر والے کے سپرد کر دیا گیا جن سے بیگ کھول کر ایک ایک آم نکال کر پاس رکھے ہوئے ڈرم میں پھینک دیا۔ اس کالے کو بہت سمجھایا کہ بھئی یہ اعلیٰ نسل کے آم صرف اپنے کھانے اور اپنے عزیزوں کو تحفہ میں دینے کے لئے ہیں کسی امریکی کو ہرگز نہیں کھلائیں گے۔ لیکن اس نے ایک نہ سنی۔ پھر اس سے اس گستاخی کی وجہ پوچھی تو کہنے لگے۔ اس آم کی گٹھلی یہاں ہماری آموں کی نسل کو تباہ کر دے

گی۔ سبحان اللہ کیا منطق ہے یعنی اس نئی دنیا میں باہر سے آنے والی ہر چیز قابل نفرت اور ناقص ہے۔ ابھی پہلی پہلی دفعہ تھی اور تجربوں سے نہیں گزرے تھے ورنہ اسے ضرور بتاتے کہ تمہارے پھلوں میں نہ تو ذائقہ ہوتا ہے اور نہ خوشبو۔ سنبھال کر رکھو اپنی پھلوں کی نسل کو۔ ایسا ایک آم چکھ لو خوابوں میں بھی ساری عمر یاد کرو گے! بہرحال بعد میں پتہ چلا کہ خود اقراری اور رضاکارانہ طور پر معلومات مہیا کرنا دنیا میں ہر کہیں بے وقوفی کے زمرے میں آتا ہے۔ جن لوگوں نے فارم پر ظاہر نہیں کیا تھا وہ ایسی ڈھیروں "ممنوعہ چیزیں لے کر نکل آئے تھے۔ ہمارے پاس ہیروئن تو تھی نہیں۔ اپنے کھانے کے لئے فروٹ ہی تھا۔ سنا تھا کہ ہوائی اڈے پر ویزا سٹیمپ کرانے اور تلاشی کے مرحلوں میں خاصی دیر لگ جاتی ہے لیکن یہ سب کچھ جلدی اور غیر محسوس طریقے سے ہو گیا۔ باہر نکلے تو صبح کے ۱۱ بجے کی بجائے مقامی وقت کے مطابق شام کے ۸ بج رہے تھے اور ہمیں لینے کے لئے ہمارا بیٹا اپنے دوست کے ساتھ کا ساتھ آیا ہوا تھا۔ میں نے اپنی گھڑی پر اچٹتی ہوئی نظر ڈالی۔ "آپ اپنا ٹائم یہاں کے مطابق کر لیجئے۔" بیٹے نے کہا۔ "نہیں مجھے اپنے پاکستان کا ٹائم ہی عزیز ہے۔ اس کو دیکھتے ہی پتہ چل جائے گا اب وہاں کتنے بجے ہوں گے اور لوگ دفتروں کو جانے کی تیاری کر رہے ہوں گے یا سونے کی؟ میں نے جواب دیا۔ بیٹا میری سادگی پر ہنس دیا۔" ایک بات سمجھ نہیں آئی۔ یہاں رات کے آٹھ بج رہے ہیں اور ابھی تک خاصی روشنی ہے؟"

بات یہ ہے کہ یہاں گرمیوں میں سورج رات کے ساڑھے آٹھ بجے غروب ہوتا ہے جبکہ سردیوں میں ساڑھے پانچ بجے ہی ہوتا ہے۔ سردیوں میں سہ پہر چار بجے ہی ہر طرف گھپ اندھیرا چھا جاتا ہے لوگ گھروں میں گھس جاتے ہیں اور سڑکوں پر سوائے برف اور سرد جھکڑوں کے کچھ بھی نہیں ہوتا!

عجیب دنیا ہے! میں یہاں کے بارے میں اس پہلے انکشاف پر ہی حیران رہ گیا۔

مارچ کی آخری تاریخ تھی۔ ہوا میں ابھی خاصی خنکی تھی۔ ہم پھٹی پھٹی آنکھوں سے نیویارک کی نہایت کشادہ اور عالی شان سڑکوں' دو طرفہ پھیلے ہوئے جنگلوں اور کہیں کہیں بلند و بالا عمارتوں کی جھلکیاں دیکھتے ہوئے گھر کی طرف روانہ ہو گئے۔

نیویارک کے جان ایف کینیڈی ایئرپورٹ سے باہر نکلتے ہی خوشگوار اور سرد ہواؤں نے آگے بڑھ کر استقبال کیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہمارے پاکستان میں بھی یہ دن

گرم نہیں ہوتے اور شام کے وقت ہوائیں گذری بہار کی یاد تازہ کرتی گذرتی ہیں اگرچہ نیویارک کی ہوائیں گذری بہار کی بازگشت تو نہ تھیں البتہ آنے والی بہار کی پیغامبر ضرور محسوس ہوتی تھیں۔

ہماری منزل نیویارک میں نہیں بلکہ اس سے آگے نیوجرسی تھی۔ نیویارک اور نیوجرسی کی حیثیت جڑواں شہروں کی سی ہے جیسی کہ اسلام آباد اور راولپنڈی' ان دونوں شہروں میں بظاہر کوئی حد فاصل نہیں۔ زیادہ سے زیادہ فیض آباد کو راولپنڈی کی آخری حد اور وہاں سے آگے کا علاقہ اسلام آباد کا نقطہ آغاز کہا جا سکتا ہے۔ ادھر نیویارک اور نیوجرسی کے درمیان دریائے ہڈسن کے نیچے سے گذرنے والی دو دو میل لمبی Tunnels ٹنل یعنی سرنگیں ہیں۔ ان میں سے ایک ہالینڈ ٹنل ہے جسے آج سے ایک صدی سے بھی زیادہ عرصہ پہلے ہالینڈ سے امریکہ میں آکر آباد ہونے والوں نے تعمیر کر کے انجینئرنگ کا محیرالعقول کارنامہ انجام دیا تھا۔ دوسری لنکن ٹنل ہے' یہ بھی کم و بیش ایک صدی قبل تعمیر کی گئی' تھی۔ دونوں سرنگیں اتنی کشادہ ہیں کہ بیک وقت دو گاڑیاں آ جا سکتی ہیں۔ چونکہ ان دونوں شہروں میں ٹریفک بہت بڑھ چکی ہے اس لئے اس بات کا بڑا خیال رہتا ہے کوئی کار یا گاڑی سرنگ کے اندر خراب نہ ہو جائے ورنہ ساری ٹریفک رکتے ہی میلوں لمبی قطاریں لگ جائیں گی۔ سرنگوں میں داخل ہونے سے پہلے ٹریفک پولیس گاڑیوں پر کڑی نظر رکھتی ہے۔ اگر کسی پرانی کار پر یہ گمان گذرے کہ یہ اندر جاکر خراب ہو جائے گی تو اسے باہر ہی روک لیا جاتا ہے۔ اس بات کا بھی خیال رکھا جاتا ہے کہ کوئی کار ہیٹ اپ (گرم) نہ ہو رہی ہو۔ گذشتہ دو برس سے امریکی پولیس دہشت گردی کی کارروائیوں پر بھی کڑی نظر رکھے ہوئے ہیں۔ ورلڈ ٹریڈ سنٹر میں دھماکے کے بعد یہ انکشاف ہوا تھا کہ نابینا مصری قاری عمر عبدالرحمن کے پیروکار نیویارک اور نیوجرسی کو ملانے والی سرنگوں کو بھی تباہ کرنے کا منصوبہ بنا رہے تھے۔ مصری مسلمانوں پر اس قسم کے الزامات کو اب تک تو امریکی پولیس ثابت نہیں کر سکی البتہ حفاظتی انتظامات ضرور سخت کر دیئے گئے ہیں اور ہونے بھی چاہئیں کہ دریا کے نیچے سے گذرنے والی کسی سرنگ میں اگر کوئی دہشت گرد بڑا دھماکہ کرنے میں کامیاب ہو جائے تو نہ صرف سینکڑوں کاریں اور ہزاروں افراد ان کے بیچ میں پھنس کر رہ جائیں کے بلکہ نیویارک جیسے عالمی دارالحکومت اور اہم ترین شہر کا نیویارک جیسے اہم ترین صنعتی شہر سے رابطہ بھی بڑی حد تک منقطع ہو جائے گا۔ ماہرین کا کہنا ہے کہ ان دو میں سے کسی سرنگ کو

آسانی سے تباہ کرنا قطعی ناممکن ہے کیونکہ یہ سرنگیں پوری کی پوری فولاد میں ڈھالی ہوئی ہیں۔
ان کے ایک طرف نیویارک کا دل یعنی مین ہٹن اور دوسری طرف نیوجرسی سٹی ہے۔ ٹنل ختم ہوتے ہی ایک طرف مین ہٹن کی بلند و بالا عمارتیں خاص طور پر ایمپائر سٹیٹ بلڈنگ وغیرہ نظر آنے لگتی ہیں اور دوسری طرف نیوجرسی کے کارخانوں کی چمنیاں اور بندرگاہ کی تنصیبات کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ مین ہٹن (Man Hattan) کے جگمگاتے اور انتہائی پر رونق بازاروں سے گذرتے اور دنیا کی مشہور ترین فلک بوس عمارتوں (سکائی سکریپر) کے زیر سایہ کاروں کے جلوس پوری تیز رفتاری سے ہالینڈ ٹنل کی طرف بڑھ رہے تھے۔ ٹنل سے باہر ضروری ہدایات درج تھیں اور جب ہم ٹنل میں داخل ہوئے تو فرش اور چھت کی روشنیوں سے ساری سرنگ جگمگ کر رہی تھی۔ بائیں طرف چار فٹ کی بلندی پر دو فٹ چوڑی چھوٹی سی ٹرین کی چھوٹی سی پٹڑی بنی تھی۔ ہمیں بتایا گیا کہ جب سرنگ کے اندر کوئی گاڑی خراب ہو جاتی ہے تو چند سیکنڈ کے اندر اس چھوٹی پٹڑی پر ایک دو موٹر مکینک یہاں پہنچ جاتے ہیں جو یا تو گاڑی کو فوراً ٹھیک کر کے چالو کر دیتے ہیں یا پھر ٹریفک روک کر پولیس کی گاڑی اسے ٹگ کر کے باہر کھینچ لاتی ہے۔ یوں یہ نظام چند سیکنڈز سے زیادہ کے لئے معطل نہیں ہونے دیا جاتا۔ نیوجرسی سے نیویارک کے انتہائی خوبصورت Posh علاقے لانگ آئی لینڈ تک کا فاصلہ ۴۰ منٹ کا ہے لیکن Rush hours میں فاصلہ دو گھنٹے تک طول پکڑ لیتا ہے۔ کیونکہ میلوں تک کاریں ایک ایک انچ آگے بڑھنے پر مجبور ہوتی ہیں۔

ہالینڈ ٹنل سے نکلتے ہی ہم نیوجرسی سٹی میں داخل ہو چکے تھے۔ سننے میں آیا تھا کہ یہ شہر مسلمانوں خاص طور پر پاکستانی' ہندوستانی اور مصری باشندوں کا مرکز ہے۔ چنانچہ بازاروں سے گذرتے وقت دکانوں کے اردو ہندی بورڈز اور شلواریں اور ساڑھیاں پہنی ہوئی خواتین کو دیکھ کر اس بات کی تصدیق ہو گئی۔

نیوجرسی کی سڑکوں پر رواں دواں کاروں کی نمبر پلیٹوں پر گارڈن سٹیٹ لکھا ہوا دیکھ کر بے اختیار ہونٹوں پر یہ سوال ابھرا۔ "نیوجرسی سٹیٹ کو گارڈن سٹیٹ بھی کہا جاتا ہے؟"

"جی ہاں جس طرح نیویارک کو Big apple کہتے ہیں۔" میرا بیٹا کہہ رہا تھا یہ امریکی اس معاملے میں بڑے خوش ذوق ہیں انہوں نے ہر ریاست اور ہر شہر کا اسی طرح ایک Nick Name رکھ چھوڑا ہے۔ نیوجرسی سٹی کو یہ لوگ آرنج کا نام دیتے ہیں اس کا مشرقی حصہ

East orange اور مغربی حصہ West orange کہلاتا ہے۔ بہرکیف جوں جوں ہم اس گارڈن سٹیٹ کی سڑکوں پر سے گذر رہے تھے ہماری حیرت میں اضافہ ہو رہا تھا کیونکہ باغات کی اس سٹیٹ میں کسی جگہ ہریالی نام کو بھی نہ تھی۔ اشجار کے سلسلے دور دور تک بے برگ و بار تھے۔ یوں لگتا تھا کہ سارا علاقہ پوری طرح خزاں کی لپیٹ میں ہے اور بہار کا دور دور تک نشان نہیں۔

○

امریکی کرسمس کے بعد ایسٹر کا تہوار خصوصی اہتمام سے مناتے ہیں۔ تعلیمی ادارے بند ہو جاتے ہیں اور دس دنوں کی چھٹیاں گزارنے کے لئے امریکی کنبے کاروں اور ٹریلروں پر رخت سفر لاد کر تفریحی مقامات خاص طور پر بچوں کی دلچسپی کی جگہوں اور سمندری ساحلوں کا رخ کرتے ہیں، جو لوگ شہروں سے باہر جانا نہیں چاہتے وہ مقامی طور پر ہی دعوتوں اور تقریبات کا اہتمام کر لیتے ہیں۔

ڈاکٹر بیٹے کے دوستوں کو جب یہ علم ہوا کہ اس کے والدین آئے ہوئے ہیں تو انہوں نے ہمیں مدعو کرنا شروع کر دیا۔ سب سے پہلے لانگ آئی لینڈ کے انتہائی خوبصورت علاقے میں مس گلوریا نے دعوت دی۔ یہ مس گلوریا ڈاکٹر وسیم احمد کی سابق لینڈ لیڈی تھی۔ ہمیں اس کے مس ہونے کے بارے میں کسی قسم کی خوش فہمی نہ تھی کیونکہ امریکہ میں ہر عورت شادی کا بندھن اتار پھینکنے کے بعد (جس کے لئے وہ خاصی بے قرار رہتی ہے) ایک بار پھر مس بن جاتی ہے، اور اگر بیوہ ہو جائے تب بھی مس ہی کہلوانا پسند کرتی ہے، میڈم کا لفظ تو اس کی سماعت سے گالی بن کر ٹکراتا ہے۔

ہاں تو بیٹے نے بتایا کہ مس گلوریا نے ہمیں ایسٹر کے ڈنر میں بڑے اصرار سے مدعو کیا۔ لہذا بارہ بجے ہی نیو جرسی سے نیویارک جانے کی تیاریاں شروع کر دی گئیں۔ میں نے کہا اتنی جلدی بھی کیا ہے ڈنر تو رات کو ہوتا ہے۔ بیٹے نے بتایا کہ نہیں دوپہر ۲ بجے کا ٹائم دیا گیا ہے۔ ذرا گپ شپ رہے گی۔ ہم نے یہ تاثر دینے کے لئے کہ پاکستانی وقت کے بڑے پابند ہوتے ہیں ٹھیک ۲ بجے مس گلوریا کے گھر پہنچ جانے کا فیصلہ کر لیا۔

ٹھیک دو بجے ہم ایک خوبصورت امریکی مکان کے باہر کھڑے تھے۔ بیل کے بٹن پر ہاتھ رکھتے ہی دروازہ کھلا اور مس گلوریا کے روپ میں ایک ساٹھ ستر سالہ بوڑھی مگر سمارٹ سی خاتون "اومائی سن سیمیں" کہتے ہوئے ہمارے بیٹے سے لپٹ گئی۔ اسے جلد ہی اپنی غلطی کا احساس ہو گیا اور اس نے وسیم سے علیحدہ ہوتے ہوئے پہلے وسیم کی امی کو اور پھر مجھے ہم آغوشی کی سعادت بخشی۔ وہ شفقت اور فرط محبت سے بچھی جا رہی تھی۔ پھر اس نے اپنے مکان کے ڈرائنگ روم کی طرف ہماری رہنمائی کی۔ دور سے ہی ہماری نظر کمرے میں موجود مہمانوں پر پڑی۔ کوئی ایک درجن عورتوں اور مردوں سے کمرہ بھرا ہوا تھا اور ہر ایک کے ہاتھ میں پیگ تھا جسے لبوں سے مس کر کے چسکیاں لی جا رہی تھیں۔ رسمی تعارفی کلمات کے دوران اندازہ ہوا کہ ہمارے یہاں پہنچنے سے پہلے یہاں ہمارا تعارف پہنچ چکا تھا اور سارے امریکی مہمان و میزبان متجسس تھے کہ ہونہار پاکستانی نوجوان ڈاکٹر کے پاکستان سے آنے والے پیرنٹس کیسے ہوں گے۔ ہر ایک نے بڑی گرم جوشی سے ہاتھ ملایا اور خیر خیریت دریافت کی۔ سارے ہی ڈرنک کر رہے تھے۔ مس گلوریا میزبان تھی لیکن بوڑھی ہونے کے باوجود خاصی مستعد تھی اور مسلسل چہک رہی تھی۔ اس نے معذرت کے انداز میں کہا۔ "سیمی! ہم نے تمہارا اور تمہارے والدین کا انتظار تو کیا مگر جب زیادہ دیر ہو گئی تو ہم نے مہمانوں کو بٹھائے رکھنا مناسب نہ سمجھا۔

ایک خوبصورت نوجوان جنہوں نے اپنا تعارف تھامسن کرایا تھا اور جو مس گلوریا کے بیٹے تھے کہنے لگے۔ آپ لوگ تو ڈرنک کرتے نہیں۔ پھر کیا پئیں گے۔ میں نے کہا "سافٹ ڈرنک" اور اس کے ساتھ ہی ہمیں کوک وغیرہ پیش کر دیئے گئے۔ دعوت میں موجود بعض لوگوں کے لئے یہ دوسرا اہم انکشاف تھا پہلا تحیر کا مرحلہ اس وقت پیش آیا جب تعارف کے وقت میری بیگم نے جو مکمل طور پر پاکستانی لباس میں ملبوس تھی۔ صرف خواتین سے ہاتھ ملائے اور مردوں سے ہاتھ ملانے سے Sorry کہہ کر معذرت کر لی۔

"اچھا تو آپ لوگ ڈرنک بالکل نہیں کرتے؟" ایک خاتون نے پیگ چڑھاتے ہوئے حیرت سے پوچھا۔

"جی اسلام ہمیں بہت سی ناپسندیدہ چیزوں کے استعمال سے روکتا ہے اور یہ ام الخبائث ہے!"

کچھ اور حیرت کا اظہار ہونے لگا تو میں نے انہیں بتایا کہ شراب تو دنیا کے بہت

سے مذاہب میں یہود و ہنود بلکہ خود آپ کے ہاں بھی ممنوعہ ہے اور آپ کا قانون بھی کم عمروں کو یا سرعام اسے پینے سے روکتا ہے آخر کوئی تو خرابی ہے اس میں!"

بے شک' بے شک۔

ایک بات برابر میرے لبوں پر سوال بن کر اتر رہی تھی اور آخر مجھ سے رہا نہ گیا۔

مس گلوریا! یہ بتائیے کہ ہمیں تو آپ نے ایسٹر ڈنر پر مدعو کیا تھا اور وقت اس کے لئے تین بجے دوپہر کا دیا گیا" دوسرے یہ کہ اس وقت دو ہی بجے ہیں اور ہمیں یہ احساس دلایا جا رہا ہے کہ ہم لیٹ آئے ہیں!

"ہاں--- مگر شاید آپ بھول گئے کہ یکم اپریل سے نیویارک کی گھڑیاں ایک گھنٹہ آگے ہو چکی ہیں اور آج ۴ اپریل ہے۔ شاید سیمیں نے آپ کو بتایا نہیں تب ہی آپ کی گھڑیوں پر ابھی تک دو بجے ہوئے ہیں' کیوں سیمیں یہی بات ہے نا!"

"ہاں ابو--- میں آپ کو بتانا بھول گیا۔

یہاں سال میں دو دفعہ گھڑیاں ایک ایک گھنٹہ آگے پیچھے کی جاتی ہیں۔"

"مگر ہم نے تو ایک بجے لنچ کیا ہے اور اب ہمیں تھوڑی دیر تک ڈنر بھی کھانا پڑے گا---!" بیگم نے کہا اور وسیم صاحب نے اس کا ترجمہ کر کے شرکاء کو بتا دیا۔

"فکر نہ کیجئے--- ہم بہت جلدی آپ کو کھانا نہیں کھلائیں گے۔ اس سے پہلے کئی ہلکی پھلکی چیزوں کے دور چلیں گے اور گپ شپ بھی جاری رہے گی۔" گلوریا کے بوائے فرینڈ نے بتایا جو کسی طرح بھی بوائے نہ تھا۔ بلکہ کسی طور بھی ساٹھ برس سے کم نہ تھا۔ چوڑے قد کاٹھ کا سرخ و سپید بوڑھا امریکی تھا۔ بات دراصل یہ تھی کہ مس گلوریا کا خاوند مر چکا تھا اس سے اس کا ایک ہی بیٹا تھامس تھا جو اس محفل میں موجود تھا۔ خاوند کے مرنے کے بعد مس گلوریا تنہا رہ گئی تھی جبکہ دوسری طرف اس کا بوائے فرینڈ بھی رنڈوا تھا۔ چنانچہ دونوں نے اپنا بڑھاپا اکٹھے کاٹنے کا فیصلہ کر لیا۔

ہمارے خیر مقدم اور مختصر سے تعارف کے بعد شرکائے محفل کا تعارف شروع ہوا اس کے ساتھ ہی پینے پلانے کا شغف بھی جاری رہا۔ ہم لوگوں نے تو کوک کا ایک ایک گلاس ہی کافی سمجھا لیکن امریکیوں کے لئے ایک پیگ۔ اور وہ بھی ایسٹر کے جشن ناؤ نوش میں کچھ

معنی نہ رکھتا تھا چنانچہ چسکیاں لے لے کر باوجود جب کسی کا پیگ خالی ہوتا تو معمر گلوریا جلدی سے اسے پھر لبالب کر دیتی۔ گذری جوانی کو للکارے مارتی ہوئی گلوریا کسی طرح بھی خود کو بوڑھی تسلیم کرنے کو تیار نہ تھی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اپنے لئے بزرگی اور احترام کا کوئی لفظ بھی پسند نہ کرتی تھی۔ میں نے پوچھا۔ آپ کو کیا کہہ کر پکاروں؟

میڈم' مس' یا صرف گلوریا "میڈم" کے لفظ کے ساتھ ہی چہرے پر ایک کڑی کسیلی مسکراہٹ' بکھر گئی اور پھر تلخ قہقہے کے بعد بولی۔ "نونو اونلی گلوریا!" بعد میں اندازہ ہوا کہ یہاں کسی بھی عمر کی عورتیں۔ اپنا نام بلوانا زیادہ پسند کرتی ہیں۔

حاضرین محفل میں زیادہ تر ادھیڑ عمر کے لوگ تھے کچھ جوان لڑکیاں اور مرد بھی تھے۔ گلوریا نے ستر سال ہی کے مضبوط قد کاٹھ کے "نوجوان" سے تعارف کراتے ہوئے کہا۔ "یہ میرے بوائے فرینڈ ہیں" یہ صاحب یوں تو مہمانوں کی خاطر مدارات میں خاصے سرگرم تھے لیکن قدرے کم گو تھے "میرے آباؤ اجداد اٹلی سے یہاں آ کر آباد ہوئے تھے اور یہ آئرش ہیں' جب میرا خاوند مر گیا۔ تو میں نے اپنی تنہائیوں کو ختم کرنے کے لئے یہ بوائے فرینڈ تلاش کر لیا۔ اس پر "بوائے فرینڈ کے لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ دوڑ گئی۔ اس کے بعد گلوریا نے ایک خوبصورت سوٹڈ بوٹڈ نوجوان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "یہ میرا بیٹا ہے۔ تھامس آئل ریسرچ کی ایک بہت بڑی فرم میں ملازم ہے۔ اس نے ریسرچ ٹیکنالوجی میں ڈاکٹریٹ کی ہوئی ہے۔ اس کے بعد مسٹر تھامس نے اپنے بارے میں مزید کچھ بتایا۔ یہ انگریز نوجوانوں کی طرح لباس اور ایٹی کیٹ کے معاملے میں بڑے رکھ رکھاؤ والا تھا۔ ویسے بھی اعلیٰ تعلیم یافتہ ہونے کی وجہ سے بات چیت کا انداز بڑا شستہ تھا۔ امریکیوں والی بات نہ تھی۔۔۔۔ "آپ ہیں مس فلورا" اب مسز تھامس نے اپنے ساتھ بیٹھی ہوئی بڑھیا کا خود ہی تعارف کرایا' "یہ میری گرل فرینڈ ہے" گرل فرینڈ! ہم سب کے منہ حیرت سے کھلے کے کھلے رہ گئے۔ ان محترمہ کی عمر بھی کسی طرح ساٹھ پینسٹھ سے کم نہ ہو گی اور کسی طرح بھی اپنے بوائے فرینڈ کی ماں سے کم نظر نہ آتی تھیں۔

"میں آپ لوگوں کی حیرت کی وجہ سمجھتا ہوں!" تھامس کہہ رہا تھا۔ یہی نا۔۔۔۔ کہ میں نے کسی لڑکی سے دوستی کیوں نہ کی۔" دراصل مجھے ان کا مینٹل لیول بہت اچھا لگا۔ زندگی کا ساتھی وہی اچھا ہوتا ہے جس کی ذہنی سطح آپ کی ذہنی سطح سے ملتی ہو۔ یہ بھی میری طرح سکالر ہیں۔ ہر وقت کتابیں پڑھتی اور لکھتی رہتی ہیں۔ ہم گھنٹوں امریکی معاشرے پر ریسرچ

کے موضوع پر بحث کرتے رہتے ہیں۔ ہمارا اصل ٹھکانہ نوجوانوں کی طرح بیڈ روم نہیں۔ ہماری لائبریری ہے۔۔۔ تھامس کی اس وضاحت کے ساتھ ہی مس فلورا کے چہرے پر پھیلی ہوئی خفت۔ ہلکی ہلکی مسکراہٹ میں بدل گئی۔ اس کے بعد ایک کالے سفید جوڑے اور ان کی گندمی رنگ کی جوان بیٹی کا تعارف ہوا۔ پھر ایک طرح دار استانی کی باری آئی۔ شارٹ سکرٹ سے باہر نکلی ہوئی لمبی خوبصورت ٹانگیں۔ خوبصورت آراستہ پیراستہ قد و قامت اور چہرے پر مصنوعی وقار۔ عمر یہی کوئی چالیس سال۔ "ان سے ملئے بچوں کے سکول میں انگلش ٹیچر ہیں ایک خاوند سے طلاق لے چکی ہیں۔ دوسرے کی تلاش ہے لیکن کہتی ہیں اب کسی ڈاکٹر سے شادی کروں گی۔"

"تاکہ علاج کی فیس ادا نہ کرنی پڑے" ایک اور صاحب نے فقرہ کسا۔ "نہیں نہیں تھینک گاڈ۔ میں کبھی بیمار نہیں ہوئی۔"

"لیکن آپ کی خواہش تو تب ہی پوری ہو سکتی ہے جب کوئی ڈاکٹر بھی کسی استانی سے شادی کرنا پسند کرے۔" ساتھ بیٹھی ہوئی گندمی رنگ کی نوجوان لڑکی نے کہا۔

"ڈاکٹر وسیم! کیا خیال ہے؟" گلوریا نے شرارت سے پوچھا۔

"جی شکریہ" اور ہمارا بیٹا جھینپ کر رہ گیا۔

اس کے بعد باقی لوگوں کا بھی باری باری تعارف کرایا جاتا رہا۔ پینے کا دور ختم ہو گیا تھا۔ اب فروٹ سے سجی ہوئی پلیٹیں آگے رکھ دی گئیں۔ ہر قسم کا فروٹ تھا لیکن سوائے کیلوں کے کسی پھل میں نہ ذائقہ تھا اور نہ خوشبو۔۔۔ کیلے بہت بڑے اور خوش ذائقہ تھے۔ سٹرا بیری خالص یہاں کا پھل ہے مگر اس میں بھی خلاف توقع خوشبو اور ذائقہ دونوں چیزیں نہ تھیں۔

میز کے ایک کنارے پر ایک چوڑے چکلے شانوں لیکن چھوٹے قد والا بوڑھا بیٹھے بیٹھے سو رہا تھا اور میرے درمیان دوسرے لوگوں کے بیچ میں اس کی بڑھیا بیٹھی سب کی گفتگو میں برابر کی شریک تھی۔ یہ جس قدر بوڑھی تھی اتنی ہی فیشن زدہ بھی تھی۔ ننگاپے کا شوق جو جوانی میں بھرپور ساتھ دیتا رہا ہو گا اب بھی تعاقب سے باز نہ آیا تھا اور محترمہ کا کندھوں اور سینے سے اوپر کا حصہ نصف کے قریب عریاں تھا۔ گوشت پوست سے محروم ہڈیاں چیخ چیخ کر پکار رہی تھیں۔ "خدا کے لئے مجھے اب تو رسوا نہ کرو۔ لباس میں چھپا لو۔" مگر یہاں معاملہ دوسرا

تھا۔

یہ ننگ وجود اور ننگ غیرت امریکی ننگے معاشرے پر بھرپور طنز تھی! ان کی ایک بیٹی بھی شریک محفل تھی۔ اس نے آنکھیں بند کیے باپ اور پھر ماں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"ان دونوں کو اب خودکشی کر لینی چاہیے۔۔۔۔ ظاہر ہے موت تو ابھی اور کئی برسوں تک انہیں نہیں لے جائے گی۔"

بوڑھے والدین کے بارے میں اولاد کے یہ سنگدلانہ جذبات۔۔۔ اس کا یہ جملہ ہمارے سینے میں تیر کی طرح لگا۔ یہ امریکہ کے خود غرض اور نفانفسی کے شکار معاشرے کی بھرپور عکاسی تھی۔ یہاں لڑکی اور لڑکا جب سولہ سال کی عمر کو پہنچتے ہیں تو والدین ان سے اپنی لاتعلقی کا اظہار کر دیتے ہیں۔ "چلو۔ خود کماؤ۔ پڑھو اور کھاؤ" اس کے بعد بچے عام طور پر بنکوں یا سٹیٹ کے قرضوں پر تعلیم مکمل کرتے ہیں اور بیشتر چھوٹے موٹے کاموں میں کھپ جاتے ہیں۔ یہاں کالجوں اور یونیورسٹیوں کی اعلیٰ تعلیم بہت خوش نصیب امریکیوں کو ہی میسر ہوتی ہے۔ امریکی کی نہایت اعلیٰ یونیورسٹیوں مثلاً بوسٹن کی جان ہارورڈ واشنگٹن کی ہاورڈ یونیورسٹی وغیرہ' جہاں ایشیائی باشندوں کو تھوڑی سی محنت اور جدوجہد سے داخلہ مل جاتا ہے امریکی طالب علم ساری عمر داخلہ لینے کے خواب ہی دیکھتے رہتے ہیں۔ بات ہو رہی تھی اولاد سے والدین کے رویے کی۔۔۔ جب اٹھتی جوانی میں ہی امریکی بچوں کو والدین کی رہنمائی اور شفقت سے محروم ہونا پڑے تو والدین کے بڑھاپے میں ان کا ردعمل قدرتی طور پر یہی کچھ ہو گا جو آج ہر ایک کو نظر آ رہا ہے۔ بوڑھے والدین جن کو امریکی حکومت سینئر سٹیزن کا نام دیتی ہے' سوشل سیکورٹی سے ان کے سارے اخراجات برداشت کرتی ہے اور جب یہ اپنی املاک کی حفاظت کرنے کی اہل بھی نہیں رہتے تو ان کی تمام املاک کو ان کے سمیت اپنی تحویل میں لے لیتی ہے۔ اولڈ ہاؤسز میں ان کی رہائش کا انتظام کیا جاتا ہے جہاں سال میں ایک آدھ بار ڈیڈس ڈے Dads Day یا مدرس ڈے پر کوئی سعادت مند بیٹا یا بیٹی والد/والدہ کو پھولوں اور مبارکباد کا تحفہ بھیج دیتا ہے یا چند گھنٹوں کے لئے ملنے چلا آتا ہے اور پھر سے بوڑھے پھٹی پھٹی آنکھوں سے آنے والوں کی سال بھر راہ تکتے رہتے ہیں' یہاں جیسا بوؤ گے ویسا کاٹو گے محاورہ عملاً ثابت ہو رہا تھا۔ میرے بیٹے نے انہیں بتایا کہ ہمارے ملک اور معاشرے میں بوڑھے والدین کا بڑا خیال رکھا جاتا ہے۔ اولاد ان کی بڑی خدمت کرتی ہے۔ ان کا دل نہیں دکھاتی۔ انہیں مرنے کے لئے الگ اولڈ ہاؤسز میں

نہیں ڈال دیا جاتا بلکہ انہیں خاندان میں اپنے ساتھ رکھا جاتا ہے۔ انہیں گھر بھر کی خوشیوں میں شریک کیا جاتا ہے اور اولاد ان کی خدمت کر کے ان کی دعاؤں کی طالب ہوتی ہے یہ سب اس لیئے کہ ہمارا مذہب اسلام اولاد کو والدین کا احترام کرنے اور ان کا دل نہ دکھانے کی سخت ہدایت کرتا ہے کیونکہ انہی والدین نے ان کی پیدائش سے لے کر عملی زندگی میں قدم رکھنے تک ان کا ہر طرح خیال رکھا ہوتا ہے۔

"ڈاکٹر، کیا تم شادی کے بعد بھی والدین کو اپنے ساتھ رکھو گے!"

"Sure" ہمارے بیٹے نے بڑے پر جوش انداز میں میز پر مکا مار کر کہا، یہ ان کی مرضی ہے یہاں میرے پاس آ کر رہنا چاہیں تو بے شک رہیں۔ اگر یہ مجھے پاکستان چل کر رہنے کو کہیں گے تو میں اپنے کیریئر کی پرواہ کئے بغیر یہ ملک چھوڑ کر ان کے ساتھ چلا جاؤں گا۔ یہ کبھی نہیں ہو گا کہ بڑھاپے میں جب انہیں میری ضرورت ہو تو میں ان کا ساتھ چھوڑ دوں!"

"تم اپنے مذہب اسلام اور ملک کے بارے میں ہمیں تفصیل سے کچھ بتاؤ۔" انگلش ٹیچر نے کہا۔" ہم تو سنتے آئے ہیں کہ "پاکستان بڑا فرسودہ ملک ہے۔ وہاں لوگ عورتوں پر بڑا ظلم کرتے ہیں" اور ہاں کہتے ہیں "پاکستان میں عورتوں کو خیمہ نما برقعوں کے اندر چلنا پڑتا ہے"۔ "غیر مرد سے ہاتھ ملانا کیوں معیوب ہے"۔ "جہیز کم لانے پر لڑکیوں کو جلا دیا جاتا ہے۔" غرض اب ہر ایک بول رہا تھا۔ آپ لوگوں کے ملک میں عورت ملک کی نصف آبادی ہے۔ اسے تعلیم حاصل کرنے اور گھروں سے باہر نکلنے یا دفتروں میں جانے کی بھی اجازت نہیں۔"

"عورتوں کو ذرا ذرا سے اخلاقی جرم پر کوڑے لگائے جاتے ہیں۔" اور "سنگسار بھی کر دیا جاتا ہے۔"۔ "عورت مرد غیر قانونی اختلاط کریں تو ان کی گردنیں اڑا دی جاتی ہیں۔" اور ہم نے یہ بھی سنا ہے کہ "عورت دوسری شادی بھی نہیں کر سکتی جبکہ مرد دس دس شادیاں کر جاتے ہیں" اور یہ کہ "مسلمان امراء اور بادشاہ چار چار سو عورتوں کے حرم بھی رکھتے ہیں"۔ ہر طرف سے اسلام اور پاکستان پر اعتراضات کی بوچھاڑ ہو رہی تھی۔

ہم نے انہیں بتایا کہ آپ دیکھ رہے ہیں کہ ایک پاکستانی خاتون آپ کے درمیان کسی خیمے یا نقاب کے بغیر موجود ہے۔ یہ اتنی پڑھی لکھی ہیں کہ آپ سب کی انگریزی زبان بخوبی سمجھ رہی ہیں ـــــ یہ بھی آپ بخوبی جانتے ہیں کہ ہمارے ملک کی وزیر اعظم بے نظیر بھٹو دوسری بار وزیر اعظم بنی ہیں، انہوں نے کبھی برقعہ نہیں پہنا انہوں نے مردوں کی طرح اپنی

مرضی سے اعلیٰ تعلیم حاصل کی ہے۔

اور پھر اس کے بعد ہم نے باری باری ان کے ہر سوال کا جواب پوری تفصیل سے دیا۔ اس دوران ہم نے محسوس کیا کہ ہم جن لوگوں میں گھر گئے ہیں جو اسلام کے بارے میں ابتدائی معلومات بھی نہیں رکھتے۔ جو دنیا کے اعلیٰ اور جدید ملک میں رہنے کے باوجود اور سپر پاور ہونے کے علی الرغم پاکستان کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتے۔ جو پاکستان اور اسلام کے بارے میں ہندوؤں اور یہودیوں کے کتنے زہریلے اور گمراہ کن پروپیگنڈے کا شکار ہیں۔ یہ قصور کس کا ہے ہماری حکومت کا' ہمارے دفتر خارجہ اور سفارت کاروں کا یا ہمارے پاکستانی علمائے کرام کا جو یا رسول اللہؐ کہنے پر مسجدوں میں خون خرابے تو کراتے رہتے ہیں' تبلیغی جماعتیں بنا کر لوگوں کو راستہ روک کر "کلمہ تو سنایئے" کی فرمائش کرتے رہتے ہیں لیکن مغربی ملکوں کا رخ نہیں کرتے اگر کرتے ہیں تو ان مولانا کی طرح جنہوں نے انگلستان کا صرف ایک دورہ کر کے وہاں کی پچاس مسجدوں میں جھگڑے کرا کے وہاں کی پولیس کو ان مساجد کو تالے لگانے پر مجبور کر دیا۔

ہم نے اسلام اور پاکستان کے بارے میں ان امریکیوں کی غلط فہمیوں کا ازالہ کرنے کی بھرپور کوشش کی۔ ہماری بیگم چونکہ قرآن اور اسلام کا خاصہ مطالعہ رکھتی ہیں۔ اس لئے ان کی مدد خاصی مفید ثابت ہوئی تاہم بہت سے مواقع پر ہمیں اپنی کم علمی کا شدید احساس ہوا۔ کاش ہم نے جدید تعلیم کے ساتھ اپنے مذہب کا بھی خاطر خواہ مطالعہ کیا ہوتا۔

بہر کیف جب تک یہ محفل جاری رہی ہماری گفتگو کا موضوع پھر بدل نہ سکا اور ہم ادھر ادھر کی ایک دو باتیں کر کے پھر اسی موضوع کی طرف پلٹ آتے۔

"اگر میں کسی پاکستانی سے شادی کر لوں" انگلش ٹیچرس پوچھ رہی تھی "تو مجھے جہیز بھی دینا پڑے گا۔"

"یہ ضروری نہیں —— مذہب اسلام حسب استطاعت والدین کو مشورہ دیتا ہے کہ وہ بیٹی کو رخصت کرتے وقت کچھ دے سکیں تو احسن ہے!"

"ویسے یہ ضروری بھی نہیں' جدید روشنی کے نوجوان —— جہیز کی لعنت کو ختم کر رہے ہیں۔"

کیا جہیز کم لانے والی لڑکیوں کو زندہ جلا دیا جاتا ہے؟"

کن ملکوں کی بات کر رہے ہیں۔ بھارت میں ایسا عرصہ سے ہو رہا ہے پاکستان میں ایسا نہیں ہوتا۔ ایک آدھ استثنا تو ہر جگہ ہوتا ہے۔"

"پاکستان میں نہ سہی--- مسلمانوں میں تو ایسا دیکھنے میں آ رہا ہے؟"

یہ بحث یونہی جاری رہی۔ اور اس دوران ایسٹر کی پر تکلف دعوت کے نہ جانے کتنے خوبصورت اور بد ذائقہ آئٹم آئے اور گزر گئے۔ کبھی روسٹڈ چکن، کبھی تلی ہوئی مرغی، کبھی کباب، کبھی سینڈوچ، کبھی مچھلی اور کبھی چاول--- ہم باتیں بھی کرتے جاتے تھے اور کھاتے بھی جاتے تھے۔ جب ہم نے تین سے شام کے سات بجا دیئے تو میں اٹھ کھڑا ہوا "اب ہمیں اجازت لینی چاہئے---"

"ہاں، اب ہم چلتے ہیں---"

"ارے ابھی تو اصل آئٹم باقی ہیں۔" مس گلوریا چیخنے کے انداز میں کہہ رہی تھی۔ یہ پارٹی رات نو بجے تک تو جاری رہنی چاہئے۔" اس کا بوائے فرینڈ کہہ رہا تھا۔

"مگر ہمارے پیٹ میں تو اب قطعاً" گنجائش نہیں کہ کچھ اور کھایا جائے۔"

میں نے کہا--- اب سارے امریکی زور دار قہقہے لگانے میں مصروف تھے۔

ان کی آوازیں بھی بہت بلند ہو چکی تھیں۔ اور صاف پتہ چل رہا تھا کہ مسلسل پینے کی وجہ سے دخت رز نے اپنا کام دکھانا شروع کر دیا ہے۔

زیادہ تر جوڑے الگ الگ باتوں میں مصروف تھے جو دوسروں کو شریک گفتگو کر رہے تھے وہ بھی اب سنجیدہ گفتگو سے فحش گفتاری پر اتر آئے تھے اور غالباً ان کا یہ احساس ختم ہو چکا تھا کہ باہر کے لوگ بھی ہیں جن کی موجودگی میں انہیں شستہ گفتگو کا دامن نہیں چھوڑنا چاہئے۔

ہماری درخواست پر ہمارے میزبانوں نے ہمیں اپنے مکان کے مختلف کمرے دکھائے۔ ڈرائنگ روم جہاں ہم بیٹھے تھے دو کمروں کے عارضی پارٹیشن کو ختم کر کے ایک بڑا کمرہ بنا دیا گیا تھا دیواروں پر بڑی خوبصورتی سے چینی پلاسٹک اور پیتل وغیرہ کی مختلف قسموں کی خوبصورت پلیٹیں لٹک رہی تھیں۔ اسی طرح نیچے سے اوپر تک مختلف الماریاں چھوٹے بڑے ہاتھیوں سے بھری پڑی تھیں۔ یہ ہاتھی، چینی مٹی، ہاتھی دانت پیتل اور پلاسٹک غرض مختلف چیزوں سے بنے ہوئے تھے۔ گلوریا بتا رہی تھی--- جوانی میں ایک دفعہ میں تاج محل دیکھنے آگرہ

گئی تو وہاں سے یہ پیتل کا بڑے والا ہاتھی خرید کر لائی تھی۔ یہ سری لنکا سے خریدا تھا اور یہ جنوبی افریقہ سے اور یہ پلیٹ مجھے ڈاکٹر وسیم نے پاکستان سے لا کر دی تھی۔

اس کے بعد جب ہم مس گلوریا کے گھر سے رخصت ہونے لگے تو ہر ایک نے ہمیں اتنی گرم جوشی سے گلے لگا کر رخصت کیا جیسے ہم چند گھنٹے پہلے نہیں برسوں سے ایک دوسرے کے ملنے والے ہوں۔

نیویارک میں گرمیوں میں درجہ حرارت عام طور پر خوشگوار ہی رہتا ہے۔ اگر کبھی دوپہر کے وقت ۸۰ یا ۸۵ درجہ فارن ہیٹ ہو جائے تو ریڈیو اور ٹیلی ویژن دہائی ڈال دیتے ہیں گھروں اور دفتروں میں جہاں زیادہ سے زیادہ پنکھے چل رہے ہوتے ہیں اچانک ایئرکنڈیشنر آن ہو جاتے ہیں اور دفتروں سے فارغ ہونے والے اور گھروں میں بیٹھے ہوئے لوگ اچانک کاریں دوڑاتے ہوئے ساحل سمندر کا رخ کرتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ نیویارک کی تاریخ میں کبھی ۹۰ درجے سے زیادہ گرمی نہیں پڑی لیکن اس دفعہ ہمارے آنے کے بعد پہلی بار یہاں درجہ حرارت ۱۰۵ تک پہنچ گیا۔ یہاں جب گرمی ذرا اپنا رنگ دکھانے لگتی ہے تو سڑکوں پر ہر دوسری یا تیسری کار ساحل سمندر کی طرف رواں دواں نظر آتی ہے۔ اور گرمی جوں جوں بڑھتی ہے۔ لوگوں خاص طور پر جنس لطیف کے کپڑے اترتے چلے جاتے ہیں۔ عام حالات میں بھی اس جنس کو یہاں پر گرمی کچھ زیادہ ہی لگتی ہے اس کے برعکس وہ شدید سردی کے موسم میں بھی کپڑے لتے سے بیزار ہی نظر آتی ہیں۔ اس دن بھی کچھ ایسا ہی عالم تھا۔ ساحل کی طرف لوگوں کے بہتے ہوئے سیلاب بے پناہ میں ہم بھی بہے چلے جا رہے تھے۔

نیویارک پانی کے اوپر اور پانی میں گھرا ہوا شہر ہے۔ جدھر چلے جائیں آپ کو سمندر یا دریائے ہڈسن پر بنے ہوئے پلوں ساحلوں اور بندرگاہوں سے واسطہ پڑے گا۔ یوں لگتا ہے جیسے اس شہر کی بنیادیں ہی پانی کے اندر رکھی گئی ہوں۔ شہر کی سب سے خوبصورت تفریح گاہیں Sea beaches ہیں جن کی تعداد ۳۶ کے قریب ہے۔ ان میں سے مشہور beach Jones جان بیچ ہے۔ تقریباً ساری beaches ایک دوسرے سے منسلک ہیں۔ تاہم بعض beaches اپنی انفرادیت بھی رکھتی ہیں۔ ویسے کسی ایک ساحل کے ساتھ ساتھ چلنا شروع کر دیں تو سمندر کے ساتھ ساتھ نیوجرسی کی ریاست میں داخل ہو جائیں گے اور یہ ریاست پورے امریکہ میں سب سے خوبصورت ساحلوں کے لئے مشہور ہے۔ جان بیچ تک پہنچنے کے لئے ہمیں

لانگ آئی لینڈ کے بہت ہی خوبصورت اور سرسبز شاداب جزیرے کو شمالاً" جنوباً" قطع کرنا پڑا۔ بیچ میں داخل ہونے سے پہلے چار ڈالر فی کس کے حساب سے ٹول ادا کرنا پڑا جس میں کار پارکنگ چارجز بھی شامل تھے۔ یہاں کار پارکنگ ایک بہت بڑا مسئلہ ہے۔ بیشتر مقامات پر تو اصل مقام سے نصف میل دور تک کار پارک کرنے کی کوئی جگہ نہیں ملتی۔ تاہم اس بیچ پر پارکنگ کا خاطر خواہ انتظام تھا۔ اور بڑے وسیع پارکنگ بلاک موجود تھے۔ کار پارک کرنے کے بعد جونہی ساحل سمندر پر قدم رکھا آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ چمکدار دھوپ کے باوجود سمندر کے بدن کو چوم کر آنے والی ہوائیں لطافت کا بے کراں احساس پیدا کر رہی تھی' یہاں میں نے احتیاطاً" سمندر کے بدن کو چوم کر آنے والی ہواؤں کا ذکر کیا ہے ویسے خدا گواہ وہ ہر بے لباس حسینہ کا بدن چوم کر آ رہی تھیں۔ اور یوں ہمارے جیسے حیا دار آدمیوں کو حیا آ رہی تھی۔ ہر طرف لباس سے بے نیاز جوان جسموں کو سن باتھ لینے کیلئے اوندھے الٹے پلٹے یا سیدھے ہر طرف دھوپ میں بکھرے دیکھ کر یوں لگا جیسے ہم بالباس لوگوں نے ان عریانیت پسند لوگوں کے درمیان آ کر کوئی بڑا جرم کیا ہے۔ ویسے بھی یہ لوگ ہمیں کچھ عجیب عجیب نظروں سے دیکھ رہے تھے اور انگریزی محاورے کا خیال کرتے ہوئے تو ہمیں بھی روم میں رہتے ہوئے اہل روم کی تقلید کرنی چاہئے تھی لیکن یہ ہمارے لئے نہ ممکن تھا اور نہ ہم اس کے لئے تیار تھے۔ چنانچہ ہم نے احساس "جرم" کے نشتروں کو برداشت کرنے اور گرد و پیش بکھرے ہوئے جوان جسموں اور بے تاب جوانیوں سے صرف نظر کرتے ہوئے محض سمندر کی سیر کا فیصلہ کیا۔

دنیا بھر میں خصوصاً مغربی ملکوں میں ساحلوں کا ماحول فری فار آل ہوتا ہے۔ رسمی حدود و قیود اگر ہوتی بھی ہیں تو ان کی پرواہ کم ہی کی جاتی ہے جس کے جو جی میں آئے کر گزرتا ہے۔ عام طور پر محبتوں کے متوالے یا پیار کے ترسے ہوئے یہاں کا رخ زیادہ کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہر طرف ہم آمیزی و ہم آغوشی کے مناظر بکثرت دیکھنے میں آتے ہیں۔ بعض جوڑے تو انتہائی خلوت کے لئے ساحلوں کے ویران حصوں کا رخ کرتے ہیں اور کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں جنہیں گرد و پیش کی قطعاً" پرواہ نہیں ہوتی۔ وہ زمانے کے ہر غم اور ہر فکر سے بے نیاز "ایک جان دو قالب" کی تصویر بنے ہوتے ہیں۔ امریکہ میں بھی ساحلوں پر یہ تمام آزادیاں دیکھنے میں آ رہی تھیں کہیں بوتلوں کا گ اڑ رہے تھے تو کہیں خوش "فعلیاں" جاری تھیں۔ الغرض ساحل سمندر پر میلے کا سا سماں تھا۔ سارا نیویارک گرمی سے گھبرا کر

یہاں پہنچا ہوا تھا اور یہاں گرمی کا نام و نشان تک نہ تھا۔ سمندر کی طرف سے ٹھنڈی ہواؤں کے جھکڑ چل رہے تھے۔ دھوپ میں تمازت نام کو بھی نہ تھی۔ اور تیز ہوائیں اپنے ساتھ بلند لہریں اچھال اچھال کر ساحلوں پر پھینک رہی تھیں۔ میلوں تک پھیلے ہوئے ریتیلے ساحلوں پر نوجوان لڑکے لڑکیوں کے قریب قریب عریاں اور نیم عریاں جسم بکھرے ہوئے تھے۔ گورے چٹے جسموں کو سن باتھ کے ذریعے ٹین کرنے کا شوق جنون کی طرح بڑھ رہا ہے۔ گندمی رنگ کی جلد رکھنے والوں سے پوچھا جاتا ہے "تم نے جلد کا یہ رنگ کیسے کر لیا" اس وقت پورے امریکہ میں گوری جلد کو ٹین کرنے کے لئے فلوریڈا کے موسم کو بڑا اچھا خیال کیا جاتا ہے۔ چنانچہ ہر گوری کے دل میں ہفتے دو ہفتے کی چھٹی لے کے فلوریڈا جانے اور وہاں میامی یا پام بیچ یا پیٹسبرگ کے ساحلوں پر دھوپ میں گوری چمڑی کو تانبے جیسا بنانے کی خواہش مچلتی رہتی ہے! وہاں دھوپ یہاں کے مقابلے میں قدرے سیدھی اور تیز پڑتی ہے۔ نیویارک یا نیو جرسی کے ساحلوں پر گھنٹوں دھوپ میں پڑے رہیں وہ بات نہیں بنتی جو فلوریڈا میں ہے۔

یہاں کے ساحل پر سن باتھ لینے والوں سے زیادہ فری سیکس کا تجربہ کرنے والوں اور والیوں کی تعداد کہیں زیادہ تھی۔ ان میں گوروں اور گوریوں کے ساتھ رنگ دار اور کالے بھی تھے۔ بہت سی سفید دوشیزاؤں کو رنگدار لڑکوں نے ساتھ لے رکھا تھا۔ بالکل کالے ساحل سمندر پر اکا دکا ہی تھے صرف وہی جو کسی گرل فرینڈ کو سیر کرانے یا اس کے ساتھ انجوائے کرنے یہاں آئے تھے۔ لہروں سے جتنا دور جاتے اتنا ہی خلوت میں جلوت کے مزے لینے والے جوڑے بکھرے ہوئے نظر آتے۔ یہ دنیا و جہاں سے بالکل بے نیاز--- اپنی ہی حرکتوں میں مگن نظر آ رہے تھے۔ ہمارے جیسے لوگ انہیں ان کے حال پر چھوڑ کر دور سے ہی گزر رہے تھے کیونکہ ہماری مداخلت یقینی طور پر ان کے رومانس کو بدمزہ کر سکتی تھی۔ یہ جوڑے کن کن حالتوں میں تھے اس کا ذکر یہاں نہ ہی کیا جائے تو بہتر ہے۔

ساحل سمندر پر آنے والوں کی ایک بڑی تعداد اپنی فیملیوں کے ساتھ آئی ہوئی تھی جن کے پاس صرف بورڈ تھے۔ بعض کے پاس سپورٹس بوٹس تھیں۔ لڑکے اور بکنی پہنے ہوئے لڑکیاں پلاسٹک کے صرف بورڈ لئے ساحل سے دور جاتی ہوئی لہروں پر بہہ کر دور تک چلے جاتے اور پھر جب بڑی بڑی لہریں ساحل کی طرف لوٹتیں تو یہ بھی لہروں کے سینے پر تیرتے ہوئے چلے آتے۔ چھوٹی چھوٹی بچیاں بھی سمندر میں تک تیر رہی تھیں۔ کچھ جہاز دور گہرے پانیوں میں

سفر کر رہے تھے غالباً وہ ایلس آئی لینڈ کی طرف سیاحوں کو لے جا اور لا رہے تھے۔ سمندر کے ساتھ ساتھ تھوڑے تھوڑے فاصلے پر نگران چوکیاں قائم تھیں اور ہر چوکی پر دوربین لئے ایک تیراک لہروں پر نظر رکھے ہوتا جبکہ دوسرا ہر لمحہ ہنگامی امداد کے لئے سمندر میں کود جانے کے لئے ہمہ وقت تیار نظر آتا۔ یہ چوکیاں سمندر میں نہانے تیرنے یا صرف کھیلنے والوں خصوصاً بچوں پر نظر رکھنے اور انہیں ہنگامی حالت میں بچانے کے لئے بنائی گئی تھیں۔ ایک ہمارے ساحل ہیں جہاں نوجوان دیکھتے دیکھتے لہروں کی بھینٹ چڑھ جاتے ہیں اور کئی گھنٹوں کی جدوجہد کے بعد ایدھی کے غوطہ خوروں یا ملاحوں کی خدمات نعشیں تلاش کرنے کے لئے میسر آتی ہیں۔ یہاں آج تک ایسا نہیں ہوا کہ ساحل سمندر پر کوئی بچہ یا بڑا ڈوب گیا ہو! اس جگہ آکر پتہ چلتا ہے کہ ان لوگوں کی نظروں میں انسانی زندگی کی کتنی قدر و قیمت ہے۔ کچھ غریب امریکی بھی تھے جو محض خالی بوتلیں اور خالی ڈبے اکٹھے کر رہے تھے اور ایک ستر اسی سال کی بڑھیا ہاتھ میں سٹک کے آگے میٹل ڈی ٹکٹر لگائے ریت میں گرے ہوئے سکے وغیرہ تلاش کرتی پھر رہی تھی لیکن عام طور پر اسے مایوسی کا سامنا ہی کرنا پڑتا کیونکہ اس کے ڈی ٹکیٹر کے ساتھ کوئی سکہ چپکنے کی بجائے کسی بوتل کا ٹن کا ڈھکنا چپک جاتا۔ اتنے میں کالوں کی ایک بہت بڑی سٹیج نما گاڑی ساحل کے اندر ایک طرف آکر کھڑی ہو گئی۔ کوئی دو درجن کالوں نے نکل کر تھوڑی دیر کے اندر سٹیج سیٹ کر دی اور دیکھتے ہی دیکھتے اس سٹیج پر ہر قسم کے جاز اور موسیقی کے آلات سجا دیئے گئے۔ ایک دو کالے سٹیج پر مائیک لگا کر کھڑے ہو گئے اور ان کے سامنے نیچے ناچنے اور گانے والے کچھ اور کالے دائرے کی صورت میں تھرکنا شروع ہو گئے۔ پھر جو ڈرمنگ شروع ہوئی تو دور دور تک کھڑے ہوئے کیا کالے کیا گورے ہر کوئی تال پر تھرکنے لگا۔ ان کی موسیقی میں شور اور اچھل کود بہت زیادہ اور نغمگی نام کو بھی نہیں ہوتی۔ مائیک سے جاری ہونے والی ہدایات کے ذریعے اٹھک بیٹھک بھی کرائی جا رہی تھی۔ بلند آہنگ نغمے بھی بلند ہو رہے تھے اور جوش جنوں میں تھرکنے اور ہم آغوشی کا عمل بھی جاری تھا۔ ایک بات خاص طور پر دیکھنے میں آئی کہ جب اس قسم کا میوزک بج رہا ہوتا تو کوئی بھی شخص' مرد یا عورت۔ گورا یا کالا تھرکے بغیر نہ رہتا۔ اگر کوئی بنچ پر بیٹھا شراب پی رہا ہے تو وہ بھی اپنی جگہ تھرک رہا ہے اور اگر کوئی اپنی گرل فرینڈ سے لپٹا ہوا ہے تو وہ دونوں بھی میوزک پر رقص کے سٹیپ لینے پر مجبور ہیں۔

اگرچہ شام کے سات بج رہے تھے لیکن سورج سمندر کے اوپر چمک رہا تھا

یہاں غروب آفتاب ساڑھے آٹھ بجے ہوتا ہے اور طلوع صبح ساڑھے پانچ بجے ہی ہو جاتا ہے اس لئے رات ایک دو بجے تک زندگی کی سرگرمیاں جاری و ساری نظر آتی ہیں بعض دکانیں اور بڑے بڑے سٹور آٹھ نو بجے تک بند ہو جاتے ہیں۔ گراسری اور کچھ دوسرے سٹور ۲۴ گھنٹے کھلے رہتے ہیں۔

ساحل سمندر پر آئے ہوئے خاصی دیر ہو چکی تھی اور اس عرصے میں ہم نے اس "مادر پدر آزاد" دنیا کے بہت سے رنگ دیکھ لئے تھے۔ اب ہم مین انٹیرنس سے بہت دور نکل آئے تھے۔ چنانچہ سمندر کے ساتھ ساتھ گیلی ریت پر چلتے ہوئے واپس روانہ ہوئے۔ راستے میں ایک جگہ ایک خوبصورت نوجوان جوڑا جو غالباً پورٹوریکن تھا لہروں کے درمیان کھڑا دنیا و مافیا سے بے نیاز پیار و محبت کے باغ سے خوشہ چینی کر رہا تھا۔ لڑکے نے ایک ہاتھ لڑکی کے گلے میں حمائل کر رکھا تھا اور دوسرے ہاتھ سے اس کے گریبان کے بٹن کھول رہا تھا۔ احتیاط اس نے اس قدر کی کہ لڑکی کا رخ سمندر کی طرف رکھا اور دوسروں کو اپنی جنت نگاہ میں شریک کرنا مناسب نہ سمجھا پھر لڑکی نے بھی قدرے ہمت سے کام لیا اور بٹن کھلنے کے بعد کندھوں سے شرٹ کو خود ہی نیچے سرکا دیا۔

اب سراج الدین ظفر کے اس شعر کی عملی تفسیر ہمارے سامنے تھی:-

کھول کر بند قبائے دل رخاں
حسن قدرت کا تماشا کیجئے

لڑکے نے لڑکی کا رخ پوری طرح سمندر کی طرف موڑ دیا اور اسے سمندر کی سانسیں گننے پر لگا دیا اور خود اس محبوبہ دلنواز کے سینے کے نشیب و فراز میں کھو گیا۔

ہم محبت کے ان متوالوں کی حرکتوں پر زیر لب مسکراتے پاس سے گزر گئے۔

○

تعارف و تبصرہ

| | |
|---|---|
| باد شمال کا ایک سرسری جائزہ | ڈاکٹر سلیم اختر |
| شوق ہم سفر میرا | راحت نسیم ملک |
| داؤد طاہر کا شوق سفر | عطاالحق قاسمی |
| نجم الحسن رضوی بذریعہ آسکر وائلڈ | محمد کبیر خاں |
| سعید قیس اور جدید طرز احساس | محمد ممتاز راشد |
| شہاب نامہ چند معروضات | جمیل احمد عدیل |
| اعمال نامہ | فوزیہ چودھری |

○

# "بادِ شمال" کا ایک سرسری جائزہ

ڈاکٹر سلیم اختر

ترقی پسند ادب کی تحریک اپنے وقت کی اہم ترین اور اس کے ساتھ ساتھ بے حد نزاعی تحریک بھی تھی۔ حکومتوں کے دباؤ' بنیاد پرستوں کی مخالفت' ملاؤں کی معاندانہ شعلہ فشانیوں' رجعت پسندوں کی پیدا کردہ رکاوٹوں اور بحیثیت مجموعی ناسا‏عد حالات کے باوجود یہ تحریک نصف صدی کی تخلیقی زندگی بسر کر گئی تو یہ بذات خود تاریخ ادب کا اہم واقعہ ہے کیونکہ (اردو ادب و نقد کی حد تک تو) بہت کم ایسی تحریکیں نظر آئی ہیں جنہوں نے اتنے طویل عرصے تک تخلیق کاروں کے ساتھ ساتھ ناقدین اور قارئین کو متاثر کئے رکھا ہو۔۔۔

اس کا بنیادی باعث تاریخی حالات کا جبر اور تیسری دنیا کے عوام کی ذہنی پسماندگی اور معاشی استحصال ہے۔ اسی لئے خوش آئند مستقبل کی صورت میں یہ تحریک جو خواب دکھاتی ہے وہ انفرادی سطح سے بڑھ کر اجتماعی روپ اختیار کر لیتا ہے اور اسی میں اس کی مقبولیت کا راز مضمر ہے لیکن کیا ایسا صرف تحریک اور اس کے تخلیقی' تنظیمی اور سیاسی پہلوؤں کی بناء پر ہی ممکن ہو سکا' یہ میرے خیال میں ایسا نہیں۔ اس لئے کہ ترقی پسند ادب کی تحریک سے پہلے بھی ترقی پسندی کا احساس موجود تھا بلکہ یہ ہمیشہ سے رہا ہے۔ رومانیت اور رومانی طرز احساس کی مانند۔ رومانیت کی ادبی تحریک ختم ہو گئی مگر رومانی طرز احساس ہمیشہ سے تھا اور ہمیشہ رہے گا۔ اسی طرح ترقی پسندی بصورت طرز احساس تخلیق کاروں اور ان کے تخلیقی رویوں میں ہمیشہ موجود رہی ہے۔ اسی لیے تو ایک شخص یا تخلیق کار ترقی پسند ادب کی تحریک کا رکن بنے بغیر بھی ترقی پسند ہو سکتا ہے جبکہ کسی اور کے لئے شہرت طلبی' سمجھوتہ پسندی اور مواقع پرستی کی بناء پر اچھے خاصے کیریئر کی صورت بھی اختیار کر سکتی ہے اور اسی طرز احساس کی بناء پر بعض ترقی پسندوں

کے مقابلہ میں غیر ترقی پسند زیادہ سچے اور کھرے ثابت ہوتے ہیں اور یہ طرز احساس ہی تو ہے کہ زمانی بعد کے باوجود غالب اور فیض ایک سطح پر آجاتے ہیں۔

لکھتے رہے جنوں کی حکایات خوں چکاں
ہر چند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے

یہ غالب نے کہا تھا اور فیض یہ کہتے ہیں۔

متاع لوح و قلم چھن گئی تو کیا غم ہے
کہ خون دل میں ڈبو لی ہیں انگلیاں میں نے

اور لندن میں بیٹھ کر بخش لائل پوری یہ کہتا ہے۔

حرف و بیاں کا ایک سلگتا شہر ہمارے اندر ہے
رزم گہ ابطال میں روشن صدق بیاں کا جام کریں

بخش لائل پوری ترقی پسند ادب کی تحریک سے تنظیمی طور پر وابستہ ہے یا نہیں' مجھے اس کا علم نہیں (بخش لائل پوری انجمن ترقی پسند مصنفین برطانیہ کے صدر ہیں۔ مدیر) لیکن جہاں تک اس کی شاعری کا تعلق ہے تو اس میں ترقی پسندانہ طرز احساس بڑی متنوع اور بھرپور قوت میں اظہار پاتا ہے۔ تازہ مجموعہ "باد شمال" سے پہلے وہ "لہو کا خراج" اور "زندان شہر" کی صورت میں دو مجموعے پیش کر چکا ہے (حال ہی میں ان کا تازہ شعری مجموعہ "ابھی تو موسم نہیں بدلا" کے نام سے شائع ہوا ہے۔ مدیر) مگر شاعرانہ طرز احساس کی حد تک ان تینوں مجموعوں میں کوئی فرق نظر نہیں آتا اور یہ شعر بخش کے شاعرانہ مقاصد کے لئے سرنامہ کی صورت اختیار کر جاتا ہے۔

پرورش خون جگر سے جس کی ہوتی ہے سدا
سینہ شاعر کے اس ذوق نمو کی بات کر

اور جب "سینہ شاعر کے ذوق نمو" نے تخلیقی سطح پر اظہار پایا تو بخش نے اس انداز و اسلوب کی شاعری کی:

ہمارا شہر تو چھوٹا ہے لیکن
ہمارے شہر کا مقتل بڑا ہے

اڑے جو ہم تو قفس کو بھی ساتھ لے کے اڑے
یہ معجزے بھی ہمارے ہی بال و پر کے تھے

○

پناہ مانگی تھی یخ بستگی موسم سے
چڑھی وہ دھوپ کہ اب سایہ شجر بھی گیا

○

نوک زباں پہ خار کو رکھنا پڑا مجھے
اپنے لہو کا ذائقہ چکھنا پڑا مجھے

○

کئی برس کے مسلسل قیام کے بعد اب
کھلا یہ ہم پہ کہ آفت زدہ مکان میں تھے

○

ترس رہا تھا جو خود ایک ایک قطرے کو
فرات و دجلہ بھی اس شخص کی امان میں تھے

○

قفس نصیب نے اب کے وہ قید کاٹی ہے
دل و دماغ سے احساس بال و پر بھی گیا

○

لوح و قلم کتاب گیا تن کا لباس بھی
ہر شے ادھار کی مرے بچوں کے پاس ہے

○

اوڑھ کر بدنامی الفاظ کی تن پر قبا
بزم عریانی میں تیرا اونچا سر ہو جائے گا

○

دل غریب نے جب آسماں پہ دستک دی

صدا یہ لوٹ کے آئی وہاں خدا ہی نہیں

○

جہاں پر ملا مجھ کو گھر سا سکوں
جو دیکھو تو وہ اپنا گھر بھی نہیں

○

ظلمت کے سناٹے میں
بولنے والا بولے گا

○

مکیں اس مکاں کے بڑے خوش گماں ہیں
نہ چھت ہے نہ دیوار جس کی نہ در ہے

○

یہ چند اشعار کسی شعوری انتخاب کا ثمر نہیں کہ بخش لائلپوری کا سارا کلام ایسے ہی افکار و اشعار کا مرقع ہے۔

مقصدی شاعری کی سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ شعوری کاوش کی بناء پر شعر مقصد کی کھونٹی پر میلے کپڑے کی مانند لٹکا رہ جاتا ہے یوں شعر اشتہار بن جاتا ہے اور استعارہ نعرہ! ترقی پسند ادیبوں پر سب سے بڑا اعتراض یہی کیا جاتا رہا ہے ایسا اعتراض جس میں جزوی صداقت ہے۔ بخش لائل پوری کو بھی یہ احساس ہے کہ شعر کو ہر قیمت پر شعر رہنا چاہیے اور مقصد کی قربان گاہ پر اسلوب کے جمالیاتی اوصاف کی بھینٹ نہ چڑھانی چاہیے۔ اسی لئے تو وہ اس امر پر بطور خاص زور دیتا ہے:

شعر کو بے رنگ کر دیتی ہے لہجے کی چبھن
استعاروں سے مزین گفتگو کی بات کر

بخش لائل پوری کا مجموعہ "باد شمال" چند نظموں (جیسے "اے خدائے خشک و تر" اور "مرا اس شب سے رشتہ ہے") کو چھوڑ کر غزلیات پر مشتمل ہے لیکن بخش کو ان روایتی غزل گو شعراء میں شمار نہیں کیا جا سکتا جن کی غزل جسم و جاں کا نوحہ ہوتی ہے' جو گل و بلبل کی حکایات سے آگے نہیں بڑھ سکتے اور جن کی بے خواب راتوں کا مقصد محض اختر شماری ہے۔ ان

شعراء کے برعکس بخش لائل پوری کی غزل میں نظم کا جاہ و جلال ملتا ہے۔ بالعموم اس کی غزل مسلسل ہوتی ہے کہ ایک جذبہ ایک سوچ اور ایک درد منتشر اشعار کی شیرازہ بندی کرتا ہے۔ محض یہی نہیں بلکہ اس نے ابتدائی دو نظموں میں جن خیالات کا اظہار کیا تھا ان کی بعض غزلیں انہی کی توسیع معلوم ہوتی ہیں۔ "اے خدائے خشک و تر" خدا کے حضور "شکوہ" بھی ہے اور "دعا" بھی:

اے خدائے خشک و تر
تیری بارگاہ میں
جھک رہی ہے ہر نظر
سر بہ خم ہے اک جہاں
سجدۂ خلوص میں
اٹھ رہے ہیں اپنے ہاتھ
اب دعا کے واسطے
اس گھٹن کے دور میں
رحمتوں کی اک نظر
زندگی کے دشت پر
بھیج دے تو اس طرف
اک ہوائے تازہ تر
اک صدائے بت شکن
اک رسول خوش کلام
اک مسیح معتبر
جو نوائے درد سے
گنبد سکوت کی
خامشی کو توڑ دے
رمز کائنات کا
معنی حیات کا

بھید ہم پہ کھول دے
(نظم کا اختتامیہ)

اور دیکھا جائے تو تخلیقی سطح پر اکثر غزلیں اس دعا کی بازگشت میں تبدیل ہو جاتی ہیں اس فرق کے ساتھ کہ ان غزلوں میں بخش نے انداز و اسلوب بدل بدل کر ایک ہی بات ایک ہی دکھ اور ایک ہی کرب جسے ہم کرب ذات یا کرب حیات کا نام دے سکتے ہیں' کا اظہار کیا ہے۔

محاذ فکر پہ مجھ کو شکست کیا ہوتی
خیال و فکر کے لشکر مری کمان میں تھے

○

زبان دی ہے تو پھر جرات سوال بھی دے
شہید حرف کو رعنائی خیال بھی دے

○

عطا کیا ہے اگر منصب سخن مجھ کو
قلم کے ساتھ مجھے حرف لازوال بھی دے

○

وبال جاں ہے یہ آسودگی بھی منزل کی
سفر نصیب کو اندیشہ ملال بھی دے

بخش صاحب اپنے لائل پور (حال فیصل آباد) سے دور لندن میں رہائش پذیر ہیں مگر اس نے وہاں کی زرق برق زندگی سے مسحور ہو کر فکر و شعور کی آنکھیں بند نہیں کیں۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ وطن کی مٹی سے اس نے اپنا جذباتی رشتہ منقطع نہیں کیا۔ چنانچہ سات سمندر پار بیٹھا بھی وہ وطن اور اہل وطن کے بارے میں کڑھتا ہے یہاں کے ماحول میں جو اب ایک مسلسل گھٹن اور جبر رہتا ہے وہ لندن میں بھی اسے بے چین رکھتا ہے چنانچہ اپنی وطن دوستی میں وہ اتنا پختہ اور سچا ہے کہ اگر لندن میں اس کی مستقل رہائش کا علم نہ ہو تو بلاشبہ اس کی شاعری ایک حساس پاکستانی کی شاعری محسوس ہوتی ہے۔ اس لئے جب وہ یہ کہتا ہے تو بات سمجھ میں آجاتی ہے:

مارشل لاء میں جو ہوئے پیدا
مارشل لاء ہی میں جواں ہوں گے

○

جب کوئی ابھرا جہاں میں صورت تارا مسیح
کر دیا قربان ہم نے سر کسی منصور کا

لندن کے قیام نے بھی اس کے شاعرانہ احساسات پر اثرات ڈالے ہیں مگر یہ احساسات اجتماعی نہیں نہ ہی ان کا شعور وہاں کی تہذیب کے تضادات سے جنم لیتا ہے اور نہ ہی ان میں مغربی سیاست کی بازی گری پر احتجاج ہے۔ یہ احساسات ذات سے وابستہ ہیں اس لئے بلحاظ نوعیت نجی قرار پاتے ہیں۔ جیسے یہ اشعار:

یہ بات بات پہ اب مجھ کو ڈانٹ دیتا ہے
دیار غیر میں بیٹا مرا جوان ہوا

مرے شعروں کی آتشیں لو سے
ظلمتوں میں چراغ جلتے ہیں
ہم سے شمع سخن فروزاں ہے
شہر لندن میں ہم بھی رہتے ہیں
مے کدہ بک گیا ہے جب سے بخش
دودھ پیتے ہیں شعر کہتے ہیں

○

اک مسلسل خوف محرومی ہے اور اس کے سوا
بخش لندن میں مرا درد آشنا کوئی نہیں

اب ذرا دوسرا رخ ملاحظہ فرمائیں۔

یہ اور بات مکینوں کو کچھ خبر نہ ہوئی
لگا رہے تھے محافظ مگر نقب کب سے
نہ حوصلہ ہے دعا کا نہ آہ پر ہے یقیں

کہ ہم سے روٹھ گیا ہے ہمارا رب کب سے

بیٹھے بیٹھے ہمیں اچانک
کیسے کیسے خیال آئے
زیر خنجر بھی اپنے لب پر
زندگی کے سوال آئے
جان لیوا ہے باد مغرب
اب تو باد شمال آئے

اور پھر وطن کی محبت کا با انداز دگر اظہار ہوتا ہے۔

دار ستم پر جھوم کے چڑھ جا
دیوانے! منصور بنے گا
سر نہ جھکاؤ ظلم کے آگے
ورنہ یہی دستور بنے گا
ہم کو یقیں ہے اپنا مرقد
ارض وطن سے دور بنے گا

بخش، بحیثیت فرد کی کئی مجبوریاں ہو سکتی ہیں ایسی مجبوریاں جنھوں نے ارض وطن سے اسے دور رکھا مگر شاعر بخش عمر بھر لائل پور میں ہی رہا ہے وہ کبھی بھی لندنی نہ بن سکا۔ اس نے وطن سے اور شعر و ادب کے مراکز سے بہت دور بیٹھ کر جن فنی ریاضتوں جن فنی تقاضوں کی تکمیل اور جن فکری زاویوں کو اپنایا وہ بدصورتی، ظلم اور جبر کی شب تار کو ختم کر کے حسن و عدل اور مساوات کے روشن خواب سے مشروط ہیں اور اس فکری جہاد اور عمل میں نہ صرف وہ کامیاب رہا بلکہ بعض امور کی حد تک وہ فرض کفایہ بھی ادا کرتا نظر آتا ہے اور یہی اس کے شعری شعور اور فکری گہرائی کا نقطہ عروج ہے۔ شاید اسی لئے وہ یہ دعویٰ بھی کر سکتا ہے۔

بھیگا ہوا لہو میں ہے لفظوں کا پیرہن
خونباری غزل مرے فن کی اساس ہے

○

انھیں یہ زعم ہے اس کو وہ مٹی میں ملا دیں گے
ہمیں دعویٰ زمیں کا پیٹ سچائی اگل دے گا

○

بخش ہم اہل قلم پابندیوں کے باوجود
بحر دل سے فکر کے موتی اگلتے ہی رہے

○

تمام اہل قلم نے قلم کشائی کی
لکھا جو ہم نے وہی حرف لازوال ہوا

○

ہمارے گھر میں ہوا کے ہر ایک جھونکے پہ
کس کے آہنی قدموں کا احتمال ہوا

○

لکھا ہے شعر تو تنقید کی صلیب پہ رکھ
ادب کے باب میں یوں شہرتوں کی بات نہ کر

○

گذرے وہ سانحے مری قد آوری کے ساتھ
بے قامتوں کے سامنے جھکنا پڑا مجھے

○

سمندروں سے کوئی موج سر بلند اٹھے
کہ ساحلوں پہ تڑپتے ہیں جاں بلب کب سے

○

میں حرف حق بھی زباں پہ نہ لا سکا کہ جہاں
دروغ گوئی کمال حیات ٹھہری ہے

○

گاڑے ہیں میرے جسم میں ہر بوالہوس نے دانت
میرے لہو میں دوستو! کتنی مٹھاس ہے

○

ہمیں ہر آن بچھڑنے کا احتمال رہا
تمہارے قرب میں جب تک رہے اداس رہے

○

رگیں کٹیں تو چلا خون روشنی کی طرح
ہمیں تو موت بھی آئی عجب وقار کے ساتھ

○

حیات دہر کی رنگینیاں نہ پوچھ ہمیں
لہو لہو ہے بدن سنگ روزگار کے ساتھ

○

ظلم جتنا شدید ہو گا۔ چیخ اتنی بلند ہو گی
بخش ہمارا حرف صداقت ۔ انسانی منشور بنے گا

○

# شوق ہم سفر میرا

راحت نسیم ملک

اپنے دوسرے ہم قلم دوستوں کی نسبت آج کی یہ تقریب میرے لئے ذاتی سطح پر بھی بڑی اہمیت کی حامل ہے کیونکہ گو داؤد طاہر کے ساتھ میری رفاقت کار تقریباً ایک ربع صدی پر محیط ہے۔ لیکن اتنی طویل رفاقت کے باوجود میں نے 'شوق ہم سفر میرا' کی ورق گردانی کے دوران ہی پہلی مرتبہ اپنے آپ کو ان کے کسی شخصی تجربے میں شریک پایا ہے۔ دراصل تحریر کی دنیا کا دروازہ انسان پر وا ہی اس وقت ہوتا ہے جب وہ اپنے تجربات میں دوسروں کو شریک کرنا چاہتا ہے۔

"شوق ہم سفر میرا" داؤد طاہر کے پہلے غیر ملکی سفر کی روداد پر مبنی ہے اور اس کے ساتھ ہی ساتھ تحریر کی دنیا میں ان کا پہلا قدم بھی۔ ان میں سے پہلی صورت حال کا انکشاف کچھ انہوں نے خود ہی اپنی کتاب میں جابجا کیا ہے اور کچھ اس کا ابلاغ ان کی اپنی ابتدائی حیرتوں اور رویوں کے اظہار کی وساطت سے ہم تک ہوتا ہے' جو مغربی معاشرے کے ساتھ پہلے سے متعارف قاری کے لیے کچھ زیادہ اچنبھے کے حامل نہیں۔ لیکن جہاں تک دوسری حقیقت کا تعلق ہے' داؤد طاہر کی قدرت بیان کے باعث ان کے قلم کی بساط پر نووارد ہونے کا کہیں شائبہ تک نہیں گزرتا۔ منیر نیازی کہتا ہے کہ لفظ لکھنے والے کا ہمزاد ہوتا ہے۔ یہ ہمزاد کمزور لکھنے والے کو کھا جاتا ہے اور پختہ کار عامل کے لئے قوت کا ایک نیا ماخذ بن جاتا ہے۔ اس کتاب میں ایک ایک لفظ داؤد طاہر کے ہاتھوں میں موم کی صورت پگھل کر اس کی قوت متخیلہ کے متعین کردہ سانچوں میں اپنی چھب دکھلاتا ہے اور یوں ہمزاد ایک ایک گام پر اپنے عامل کے تابع نظر آتا ہے۔

اس اسلوب میں لکھنے والے کی پرکاری کے ساتھ ساتھ اس کے مزاج کی کمال سادگی کا بھی عمل دخل ہے جو اسے اپنے فطری رد عمل کے بے لاگ اظہار کا سلیقہ عطا کرتی ہے۔ یہاں مجھے سمرسٹ ماہم کا ایک خاتون کردار یاد آرہا ہے۔ یہ کردار لندن کے پرتصنع اعلیٰ طبقے میں اپنی نادر حس مزاح کی وجہ سے محفلوں کی جان سمجھا جاتا ہے اور اس حس مزاح

کی کلید محض اس کا اپنے فطری رد عمل کا بے ساختہ اظہار ہے۔ اپنی اس بے ساختہ سادگی کی بنا پر مستنصر حسین تارڑ اور عطاالحق قاسمی جیسے سفرنامہ نگاروں کی صف میں داؤد طاہر نواح سے آئے ہوئے اس نئے نویلے طالب علم کی مثال قائم کرتا ہے جو شہری درسگاہوں میں دلیپ کمار اور وحید مراد جیسے گلمرس ہیئر سٹائل رکھنے والے ہم عصروں میں اپنی انفرادیت صرف اور صرف اپنے دیہاتی بشرے کی فطری توانائی سے حاصل کرتا ہے۔ شاید اسی باعث 'شوق ہم سفر میرا' میں فکشن کا شائبہ رکھنے والا گلمیر کہیں نظر نہیں آتا۔ وگرنہ انکم ٹیکس کے دشت کی سیاحی میں ایک عمر سرگرداں رہنے والے شخص کے لیے تو فکشن اپنے گھر کی چیز ہوتا ہے وہ اس لیے کہ ہمارے معاشرے میں شاید انکم ٹیکس کے سالانہ گوشوارے سے بڑا فکشن کبھی نہیں لکھا گیا' جس کا سامنے نظر آنے والے حقائق سے دور دور تک کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ اس معاملہ میں محکمہ انکم ٹیکس بھی ٹیکس گزاروں سے کسی طور پیچھے نہیں کیونکہ ٹیکس گزاروں کے گوشواروں کا تجزیہ کرتے وقت ہم بھی ان کے ساتھ وہی سلوک کرتے ہیں جو کتابوں کی تقریبات رونمائی میں مضامین پڑھنے والے نقاد صاحب کتاب کے ساتھ کرتے ہیں کہ دونوں موقعوں پر کام اندازے ہی سے نکالا جاتا ہے۔

ان الفاظ کے ساتھ میں داؤد طاہر کا تحریر کی دنیا میں خیر مقدم کرتا ہوں اور امید رکھتا ہوں کہ اپنے اگلے بیرونی سفر میں سادگی و پرکاری کے ساتھ ساتھ وہ خواتین کے ساتھ تعلقات کے معاملے میں معذرت خواہانہ انداز چھوڑ کر کچھ کچھ بے خودی و ہشیاری سے بھی کام لیں گے کیونکہ ادب کی دنیا میں تغافل میں بھی جرات آزما ہونا ہی حسن کا معیار قرار پایا ہے۔

(ملتان میں منعقدہ تقریب میں پڑھا گیا)

# داؤد طاہر کا شوق سفر

عطاء الحق قاسمی

گذشتہ روز ایک غیر شادی شدہ دوست نے میرے ساتھ کج بحثی کی انتہا کر دی۔ کہنے لگا "تم آئے روز شادی کرنے کا مشورہ دیتے ہو' آج میں تم سے پوچھے بنا نہیں رہوں گا کہ آخر شادی کا فائدہ کیا ہے؟" "میں نے کہا "کوئی ایک فائدہ ہو تو بتاؤں۔"

"تم جتنے بتا سکتے ہو اتنے تو بتاؤ۔"

میں نے کہا "پہلا فائدہ میں نے ایک اخبار میں پڑھا تھا اور وہ یہ تھا کہ شادی شدہ لوگوں کی عمر لمبی ہوتی ہے"

۔ شادی شدہ لوگوں کی عمر لمبی ہوتی نہیں بلکہ انہیں لگتی ہے"

اس پر میں نے لاحول ولا پڑھا (یا پڑھی) اور اس کے تمسخر کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا "دوسرا فائدہ یہ ہے کہ شادی شدہ لوگوں کو مکان کرائے پر مل جاتا ہے" کہنے لگا "یہ تو ٹھیک کہتے ہو' اللہ تعالیٰ اس طبقے کے افراد کی واقعی مدد کرتا ہے جن کے متعلق اسے یقین ہو کہ یہ ساری عمر اپنا گھر نہیں بنا سکتے"

میں نے ایک دفعہ پر اس کی کٹ حجتی کو نظر انداز کیا اور شادی کے حق میں ایک دلیل یہ دی کہ شادی شدہ لوگوں کی نماز جنازہ جائز ہوتی ہے۔ اس نے میری اس دلیل سے بھی اتفاق کیا اور کہا "یہی وجہ ہے کہ اس کی نوبت دن میں کئی دفعہ آتی ہے"

بالآخر تنگ آکر میں نے کہا "چلو مان لیا شادی کا کوئی فائدہ نہیں تم یہ بتاؤ کہ شادی نہ کرنے کا کیا فائدہ ہے؟"

کہنے لگا "سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ انسان چارپائی کے دونوں طرف اتر سکتا ہے"

اس دلیل نے اگرچہ مجھے چاروں شانے چت کر دیا مگر میں نے بھی اس کی طرح کٹ حجتی سے کام لیتے ہوئے کہا "یہ تو بوگس دلیل ہے' اس سے تو لگتا ہے شادی کے بعد کچھ لوگ چارپائی سے اترتے بھی ہیں حالانکہ شادی پہ اٹھنے والے اخراجات کی وجہ سے

بچارے ہرو میں کئی روز تک اٹھنے کی سکت ہی نہیں رہتی"

بولا "شکر ہے تم نے شادی کا ایک نقصان تو تسلیم کیا"

میں نے مناسب نہیں سمجھا کہ اس ناسمجھ کو اس نقصان کے فائدے گنوانے بیٹھ جاؤں چنانچہ میں نے پوچھا "کیا شادی نہ کرنے کا کوئی اور فائدہ بھی تمہارے ذہن میں ہے؟

بولا "ایک؟ ارے بھئی کئی فائدے ہیں!"

میں نے پوچھا "مثلاً"

کہنے لگا "مثلاً یہ کہ سفرنامہ صرف غیر شادی شدہ آدمی لکھ سکتا ہے کیونکہ اسے دوران سفر ملنے والی حسیناؤں کا حساب بیوی کو نہیں دینا پڑتا۔ یہی وجہ ہے کہ شادی کے بعد اگر کوئی شریف آدمی سفر کے قابل رہ جائے تو وہ ہمیشہ بیوی کے ساتھ سفر کرتا ہے' حالانکہ یہ ایسے ہی ہے جیسے آدمی کسی ریستوران میں جائے اور ٹفن کیریر اس کے ہاتھ میں ہو"

ظاہر ہے اس پھکڑ دوست کے ساتھ زیادہ گفتگو ممکن نہیں تھی چنانچہ میں نے اسے کاؤنٹر کرنے کیلئے یہ نہیں بتایا کہ داؤد طاہر نے حال ہی میں ایک سفر نامہ تحریر کیا ہے جسے پڑھتے ہوئے ایسے لگتا ہے جیسے اس سفر میں ان کی بیگم ان کے ساتھ تھیں' حالانکہ ایسا نہیں ہے' اگر داؤد طاہر بعض نازک مقامات پر سہمے سہمے نظر آتے ہیں تو اس کی وجہ ان کا تقویٰ ہے اور تقوے کی تعریف یہ ہے کہ خلوت میں بھی یہی سمجھو کہ خدا تمہیں دیکھ رہا ہے' اگر ایسا نہیں سمجھو گے تو یقین جانو ایک مخلوق اپنے مجازی خدا کو ضرور دیکھ رہی ہوتی ہے! داؤد طاہر نے اپنے سفرنامے میں حسیناؤں کے ساتھ جس سرد مہری کا مظاہرہ کیا ہے' اس کا اجر انہیں قیامت کے روز حوروں کی صورت میں ملے گا لیکن مجھے داؤد طاہر اتنے نیک لگتے ہیں کہ ممکن ہے وہ حوروں کے ساتھ بھی بغیر نکاح کے رہنا پسند نہ کریں تاہم اس کے لئے انہیں سالہا سال انتظار کرنا پڑے گا۔ کیونکہ کوئی مولوی آئے گا تو ان کا نکاح پڑھا جاسکے گا۔ اسی طرح داؤد طاہر نے دوران سفر کھانے پینے کے سلسلے میں بھی حرام و حلال کا بہت خیال رکھا ہے۔ شاید ان کا خیال ہے کہ انہیں جنت میں اس کے بدلے پلاؤ' قتنجن' اور قورمہ وغیرہ ملے گا حالانکہ داروغہ جنت' جنت میں مقیم چند لوگوں کے لئے اتنا اہتمام نہیں کر سکتا۔ بہرحال داؤد

طاہر کا سفرنامہ پڑھتے ہوئے ذہن میں بار بار یہی خیال آتا ہے کہ ایک شریف آدمی کا سفرنامہ ہے اور یوں اگر دیکھا جائے تو اس سفرنامے کی انفرادیت یہی ہے ورنہ آج تک جتنے سفرنامے پڑھنے کو ملے ہیں وہ میرے اور مستنصر ایسے لوگوں کے لکھے ہوئے ہیں جن میں گناہوں پر شرمندگی کا اظہار بھی ڈینگیں مارنے کے انداز میں کیا جاتا ہے۔ داؤد طاہر کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے زیب داستاں کے لئے کچھ نہیں بڑھایا اور داستان کو بور بھی نہیں ہونے دیا۔ ان کا ایک کمال یہ بھی ہے کہ انہوں نے اپنی عبارت کو خوبصورت بنانے کے لئے اس کا میک اپ پھوہڑ عورتوں کی طرح نہیں کیا بلکہ سادگی سے حسن پیدا کیا ہے' ورنہ ہمارے بہت سے مصنف ہاتھ میں ہتھوڑا چھینی پکڑ کر بیٹھ جاتے ہیں اور فقرے گھڑ گھڑ کر قاری کے آگے پھینکنا شروع کر دیتے ہیں اور ان میں سے اکثر اتنے مصنوعی ہوتے ہیں کہ قاری انہیں واپس مصنف کی طرف پھینکنا شروع کر دیتا ہے جبکہ داؤد طاہر اپنی نثر میں آورد سے کام لیتے نظر نہیں آتے۔

داؤد طاہر کی نثر کی ایک خوبی ایسی بھی ہے جو کہیں کہیں ان کی خامی بھی بن جاتی ہے۔ وہ واقعات کی تفصیل میں اس قدر چلے جاتے ہیں اور انکم ٹیکس میں ہونے کی وجہ سے انہیں اتنا نچوڑ دیتے ہیں کہ باقی کچھ نہیں بچتا۔ اس سے قاری کے سامنے پورا منظر آجاتا ہے اور وہ اکثر اس سے محظوظ ہوتا ہے لیکن اس تفصیل کی وجہ سے کہیں کہیں اسے اکتاہٹ کا احساس بھی ہونے لگتا ہے۔ داؤد طاہر اپنے سفرنامے میں پوری طرح ڈاؤن ٹو ارتھ نظر آتے ہیں۔ ان میں بیگم اختر ریاض الدین والی پھوں پھاں کہیں نظر نہیں آتی' اگر آپ کے سفر میں درویشی نہیں ہے اور آنکھیں حیرت سے محروم ہیں تو خود کو سیاح نہ کہلائیں۔ داؤد طاہر نے سفر کے دوران اپنی حیرت کو برقرار رکھا ہے جب یہ حیرت ختم ہو جائے تو یورپ اور امریکہ ہی کا نہیں' زندگی کا سفر بھی ختم ہو جاتا ہے۔

ایک اور خوبی جو مجھے زیرِ نظر سفرنامے میں نظر آتی ہے' وہ مناظر کو کیمرے کی آنکھ سے دیکھنا ہے۔ مصور' منظر میں وہ کچھ بھی ڈال سکتا ہے جو منظر کا حصہ نہیں ہوتا جبکہ فوٹوگرافر ہمیں وہی کچھ دکھاتا ہے جو اس نے دیکھا ہوتا ہے' داؤد طاہر نے مغرب کی خوبیوں اور خامیوں کو فوٹوگرافر کی آنکھ سے دیکھا ہے' اس امر پر گفتگو ہو سکتی ہے کہ ادیب کو وہی منظر دکھانا چاہئے جو موجود ہے یا وہ منظر جو وہ دیکھنا چاہتا ہے' اس بحث سے قطع نظر داؤد

طاہر کے دکھائے ہوئے مناظر قاری کو بہت کچھ سوچنے پر مجبور کرتے ہیں اور میرے خیال میں جو تحریر سوچنے پر مجبور کرے اس تحریر پر تبریٰ نہیں بھیجا جاسکتا۔

میرا خیال تھا کہ میں اپنے اس مختصر سے مضمون میں داؤد طاہر کی شخصیت پر بھی روشنی ڈالوں گا لیکن میرے ساتھ ان کی دوستی کا عرصہ زیادہ طویل نہیں ہے چنانچہ ان کی شخصیت کو گرفت میں لینا میرے لئے ممکن نہیں البتہ دو ایک مختصر سی ملاقاتوں میں میں نے محسوس کیا ہے کہ ان کی شخصیت میں عاجزی اور انکسار بہت ہے، حالانکہ جس طبقے سے ان تعلق ہے اس نے عاجزی اور انکسار کے بڑے متکبرانہ طریقے ایجاد کر رکھے ہیں۔ داؤد صاحب چاہیں تو ان سے استفادہ کرسکتے ہیں بلکہ استفادہ "حاصل" کر سکتے ہیں۔ ویسے ابن انشاء مرحوم نے انکسار سے منع کیا ہے ان کا خیال ہے کہ اگر کوئی شخص اپنے نام کے ساتھ ننگ اسلاف لکھتا ہے، اس کی دیکھا دیکھی دوسرے بھی اس کے نام کے ساتھ ننگ اسلاف لکھنا شروع کر دیتے ہیں۔ لہٰذا داؤد طاہر کو اپنے اندر تھوڑی بہت اکڑفوں ضرور پیدا کرنا چاہئے۔ اگر انسان چھوٹے موٹے لوگوں سے بھی دوستوں کی طرح ملنا شروع کر دے تو وہ بجا طور پر سوچنے لگتے ہیں کہ جو شخص ہمارا دوست ہے، وہ معزز کیسے ہوسکتا ہے؟

میں داؤد طاہر کے حوالے سے ابھی اور بھی کچھ باتیں کرنا چاہتا تھا لیکن درد کمر کی وجہ سے اب کرسی پہ بیٹھا نہیں جارہا چنانچہ درد کمر کے بارے میں اپنا نظریہ بیان کر کے آپ سے اجازت چاہوں گا۔ درد کمر کے متعلق میرا خیال یہ ہے کہ یہ کچھ لوگوں کو کثرت گناہ اور کچھ کو حسرت گناہ کی وجہ سے ہوتی ہے۔ اور خواتین و حضرات آپ یقین جانیں میرا کیس حسرت گناہ والا ہے!

(ملتان میں منعقدہ تقریب رونمائی میں پڑھا گیا)

○

# نجم الحسن رضوی بذریعہ آسکر وائلڈ

محمد کبیر خان

یہ ان دنوں کا قصہ ہے جب ہمارے دیہاتی سے شہر راولا کوٹ میں پنڈی سے صرف ایک اخبار جایا کرتا تھا۔۔۔ ایک سہ ورقی ہفت روزہ، جس میں بیکریوں کے بنے بسکٹوں کے لذائذ، آرام دہ بس سروسوں کے خصائص، حکمرانوں کے قصائد، مقامی عدالتوں کے اشتہارات اور ایڈیٹر کے قطعات کے علاوہ مصور عاق و طلاق نامے بڑی باقاعدگی کے ساتھ چھپا کرتے تھے۔ جنہیں لوگ اتنی ہی باقاعدگی اور دلچسپی کے ساتھ دیکھا، سنا اور بعضے بعضے پڑھا بھی کرتے تھے۔ ہمارا پہلا مضمون مع تصویر اسی قلیل الاشاعت غیر موقر جریدے میں چھپا تو گاؤں بھر پر حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ ہمارے گھر پہنچنے سے پہلے اخبار اور اخبار سے پہلے پڑوسنیں پہنچ چکی تھیں۔ خاندان قبیلے کی خواتین رو رو کر بے حال ہو رہی تھیں۔ شام تک مشکلوں سے سمجھا بجھا کر انہیں اپنے اپنے گھر جانے پر آمادہ کیا کہ والد صاحب طبعاً" بے حد شریف اور پیار کرنے والے ہیں، وہ اس نوع کا انتہائی اقدام بھلا کیوں کرنے لگے۔ اور اپنی طبعی شرافت کی بناء پر اس نوع کا اقدام کرنا چاہیں تو بھی نہیں کر سکتے۔۔۔ کہ۔۔۔ خیر سے دادا جانی حیات ہیں اور ہنوز انہوں نے اپنی منقولہ و غیر منقولہ جائیداد کا ذرہ بھی کسی بیٹے کے نام نہیں کیا۔ باوجود اس کے مختلف گھرانوں سے جہاں ہمارے چال چلن کے بارے میں سینہ گزٹ جاری ہوتے رہے، وہاں والد صاحب کی سنگ دلی پر بھی مدتوں غائبانہ کوسنے برسا کیے۔

اسی اخبار کو اپنی "بڑھتی ہوئی سرکولیشن" کو قابو میں رکھنے کے لئے ضلعی ہیڈ کوارٹر میں نامہ نگار اعزازی کی ضرورت پیش آئی تو قبیلے کے ایک بے حد معزز بزرگ نے گھر بلا

کر ہمیں آسامی مذکورہ کے خلاف عرضی داغنے کا مشورہ بصورت حکم دیا--- "سارے سارے دن دفتروں کے برآمدوں میں جوتیاں چٹخانے اور شام کو بلاناغہ شمادو خان کے حجرہ میں ہاکیاں ڈنڈے بجانے کے بجائے یہ کام کا کام کرو--- دو لفظ ڈالنا سیکھ گئے تو جہاں صحافتی میدان میں نام ہو جائے گا وہاں سیاسی حلقوں میں بھی جانے پہچانے جانے لگو گے۔" (دو حرف ڈالنا تو ہمیں نہ آسکا چنانچہ اول الذکر میدان میں نام کا سوال ہی پیدا نہ ہوا البتہ قریب سے دیکھنے کے بعد الحمدللہ ہمیں ثانی الذکر حلقوں پر تین حرف بھیجنا آگیا۔)

"ولیکن..."

"لیکن ویکن کچھ نہیں" انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے ہماری بات کاٹ دی "میں چٹھی لکھ دوں گا---"

ایڈیٹر اور ہمارے بزرگ کے مابین دوستی کا بڑا پرانا رشتہ ہے۔ دونوں ڈوگرہ راج میں بولنے کے جرم میں اکٹھے جیل کاٹ چکے ہیں۔

موزوں امیدوار کے انتخاب اور ماہانہ چندے کی وصولی کے سلسلہ میں اخبار کا مالک، پبلشر، ایڈیٹر، سرکولیشن مینجر، کاتب اور قاصد وغیرہ--- جملہ عملہ بزرگ مذکور کے ہاں اترا ہوا تھا اور اس وقت احاطہ کچہری میں ایک کمرے پر مشتمل پاک کشمیر ہوٹل اینڈ ریسٹورنٹ انٹرنیشنل میں اور چیڑ اور اوپلوں کے گاڑھے دھوئیں میں امیدواروں سے پینل انٹرویو کر رہا تھا۔ ہم عرضی اور سفارشی رقعہ سمیت پیش ہوئے تو معلوم ہوا کہ پورا پینل فرد واحد پر مشتمل تھا۔ عرضی کو نظرانداز اور رقعہ کو "پس انداز" کرتے ہوئے پینل نے پوچھا:

"کیا جناب والا پینل ہذا کو اپنا نام نامی اسم گرامی بتانا پسند فرمائیں گے---؟"

"جی کیوں نہیں--- فدوی کو محمد کبیر خان کہتے ہیں۔"

"بنفشہ نفیس---؟"

"جی--- بہ نفس نفیس" ہم نے بزعم خود تسلی بخش جواب دیا۔ مچی ہوئی آنکھوں سے ہمارے سراپا کا مفصل جائزہ لینے کے بعد بولے:

"شاباے---!! سفارشی چٹھی ہذا مرسلہ فلاں فلاں کے علاوہ جناب والا کے پلے نیک چلنی کا کوئی اور واضح دستاویزی ثبوت بھی ہیگا---؟ ہیگا تو لف مسل ہذا کر کے پانچ منٹ میں اسا"ن" سرا جلاس پیش خدمت فرمائیں ورنہ پھٹا کھائیں۔"

یوسفی کے بشارت کی طرح ہماری سمجھ میں بھی کچھ نہ آیا کہ نیک چلنی کا کیا ثبوت ہو سکتا ہے۔ بدچلنی کا البتہ ہو سکتا ہے۔ مثلاً چالان' مچلکہ' وارنٹ گرفتاری' مصدقہ نقل حکم سزایابی یا بستہ ب کی فوٹو کاپی وغیرہ۔ لیکن اس کے لئے بھی اتنی کم مہلت---؟ پانچ منٹ میں تو آدمی ڈھنگ سے بدچلنی بھی نہیں کر سکتا--- کجا نیک چلنی کا ثبوت مہیا کرنا۔ قصہ کوتاہ' ہوا یہ کہ....

مگر چھوڑیئے---" آپ بھی کیا سوچ رہے ہوں گے کہ بات نجم الحسن رضوی کے افسانوی مجموعے "ہاتھ بیچنے والے" کی کرنا تھی' ہم اپنے درد پرانے لے بیٹھے۔ لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ قصے کہانیاں بچپن سے پچپن تک ہمارے ساتھ چلتی ہیں۔ اس کے بعد کبھی قصے ہمیں تھکانے لگتے ہیں' کبھی ہم قصوں کو ہفانے لگتے ہیں۔ پھر یوں ہوتا ہے کہ کہیں قصے میں تقوے کی ملاوٹ ہو گئی' کہیں تقوے نے قصہ گو کا قصہ پاک کر دیا--- بڑھے کے بڑ گئی چک' کہانی گئی مک۔ لیکن کہانی مکتی نہیں--- کہانی کبھی مکی ہے'نہ مکے گی۔ کہانی کی اپنی ایک طویل داستان ہے--- ایک لمبا سفر۔ لوک کہانیوں سے جدید افسانے تک کے سفر میں کہانی رنگا رنگ تجربوں سے گذری ہے۔ اس طویل سفر میں موضوع' تکنیک اور اسلوب تینوں سطحیں شامل ہیں۔ پچھلے کئی سالوں میں افسانے نے خاص طور پر بہت سے نئے فکری اور فنی موڑ کاٹے ہیں۔ حقیقت پسندی' علامت' تجرید' مزاحمت اور بعض حالتوں میں ملامت--- یعنی لا ۔ حسیت تک افسانے کی راہ تجربات سے بھری پڑی ہے۔ ان تجربوں میں محض تجربے بھی ہیں اور تجربے سے آگے نکل کر تخلیق کا ایک نیا سفر بھی۔ افراط اور تفریط کے ڈھیر سارے خام مواد میں سے بہرحال افسانے نے اپنا چہرہ بنایا اور آہستہ آہستہ اپنا قاری بھی پیدا کر لیا۔ لسانی تشکیلات سے تیکنیکی شکست و ریخت تک افسانے نے کئی چہرے بدلے۔ کبھی یہ چہرے اس قدر دھندلائے کہ نقادوں کو اس صنف کا خاتمہ صاف نظر آنے لگا۔ لیکن رفتہ رفتہ نت نئے تجربات اعتدال کی کسوٹی سے گذر کر ایسی راہ آن لگے کہ اس صنف پر لگا ہوا موت کا فتویٰ خود فوت ہو گیا۔

فتوے کو موت کے گھاٹ اتارنے والوں میں نجم الحسن رضوی بھی شامل ہے۔ یہ بے بنیاد الزام ہے' نہ سنی سنائی۔ ہم خود اس واقعہ کے چشم دید گواہ ہیں۔ ہم نے فتوے کی موت کا تماشا نجم الحسن رضوی ہی کی چشم تماشا سے دیکھا اور حیران رہ گئے کہ بظاہر بے ضرر نظر آنے والا یہ بندہ کس قدر خطرناک آدمی ہے--- اس نے کیسی چابک دستی اور فن کاری کے

ساتھ فتوے جیسی خوبصورت چیز کو مارا؟ ہم کل بھی انگشت بدنداں تھے' آج بھی انگشت بدنداں ہیں۔

The Picture of Dorian gray میں آسکر وائلڈ نے فن اور فن کاروں کے حوالے سے دو باتیں کی تھیں۔ پہلی یہ کہ آرٹسٹ وہ ہے جو خوبصورت چیزیں تخلیق کرے اور دوسری یہ کہ آرٹ کا انشراح اور آرٹسٹ کا اخفا ہی فن کا مدعا ہے۔ لیکن دی پکچر آف ڈورین گرے آج سے ٹھیک ایک صدی پیشتر--- ۱۸۹۱ء میں شائع ہوئی تھی۔ وہ زمانہ اور تھا' یہ زمانہ اور ہے۔ وہ عالموں بالموں اور راٹھوں جاٹھوں کا وقت تھا۔ یہ عاقلوں بالغوں' چپوں اور چپوں کا ٹائم ہے۔ وہ بے دام غلاموں' تیسوں اور ناتوں کا زمانہ تھا' یہ زردار آقاؤں' لیلاؤں اور خلاؤں کا دور ہے۔ وہ نیاز مندیوں' لاجوں اور رازوں بھیدوں کی تنگ تنگ دنیا تھی--- یہ بے نیازیوں' انکشافوں' اکتشافوں اور اسکینڈلوں کا کھلا کھلا جہاں ہے۔ کہاں اس وقت کے آسکروں کی وائلڈ لائف' کہاں اس وقت کے دانش وروں اور فلاسفروں کا کلچرڈ ورلڈ۔ وہ زمانے لد گئے میاں آسکر وائلڈ جب تمہاری ثقہ شاہی چلتی ہے۔ تمہاری کہاوتیں تمہارے دور کی سیانتیں رہی ہوں گی---' ہماری کہانتیں ہمارے دور کی سیانتیں ہیں۔ تمہاری دانشوں اور سیانتوں کا دور گذر گیا--- چنانچہ تمہارے افکار بوسیدہ' تمہارے اقوال فرسودہ ہو چکے ہیں۔ اب ہمارے اپنے ارشادات' اپنے فرمودات ہیں۔ تم آرٹ کو اجالنے اور آرٹسٹ کو اوجھالنے کے حامی ہو--- ہم ہر دو پر مٹی ڈالنے کے حق میں ہیں۔ تم خوبصورت چیزیں تخلیق کرنے والے کو آرٹسٹ گردانتے تھے ہم صرف پیداگیر کو آرٹسٹ مانتے ہیں۔ تمہارے پسماندہ وقتوں میں فن کاروں کی لے دے کے صرف ایک قسم ہوا کرتی تھی--- ہمارے دور میں فن کار دو طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک ہاتھ بیچنے والے' دوسرے--- دوسروں کے ہاتھ بیچنے والے۔

تمہارا زمانہ سادہ لوح تھا--- کوئی بھوک کا مارا فن بیچ دیتا تو عمر بھر منہ چھپائے پھرتا۔ جیسے فن نہیں تن بیچ آیا ہو۔ ہمارا زمانہ سیانا ہے۔ فن تو فن کوئی آرٹسٹ وطن بھی بیچ ڈالے تو ہم اسے شرمسار نہیں کرتے--- الٹا سر آنکھوں پر بٹھاتے' اس کی فن کاری کے گن گاتے ہیں۔ ہم ترقی کی ساری منازل استریوں کے نیچے پوری نفاست کے ساتھ "تہہ" کر کے اکیسویں صدی میں داخل ہونے والے ہیں۔ تمہارے دور کے نوگزے بھی بونے اور بودے تھے۔ نجم الحسن رضوی نے تمہارے زمانے کے ایک نوگزے کی ذہنی پستی کا احوال دیکھا ہے۔ لکھا

ہے"... وہ خود بھی لڑائی میں شدید زخمی ہونے کے بعد چل بسا تھا۔ لیکن مرتے دم تک اس کے لبوں پر یہی نعرہ تھا کہ ـــــ سر دوں گا' سرزمین نہ دوں گا... بستی والے نوگزے کو زندہ پیر مانتے تھے" ذرا سوچو تو ـــــ وہ نوگزا بھی کوئی نوگزا ہے جو اپنی لڑائی خود لڑے اور پھر زخمی ہو کر چل بسے ـــــ اس پر یہ نعرہ کہ سر دوں گا' سرزمین نہ دوں گا ـــــ؟ بھئی آسکر وائلڈ ایسے نوگزے کو نوگزا اور پھر اسے زندہ پیر ماننا کہاں کی عقلمندی ہے۔ نوگزے اور زندہ پیر وہ ہوتے ہیں جو لڑائی بھڑائی سے دور اپنے گوشہ عافیت میں بیٹھے ہوں اور ان کی لڑائیاں ان کے مرید اور زر خرید لڑیں۔ سر دینے کی نوبت ہی کیوں آئے ـــــ اور اگر آئے بھی تو سر کی جگہ سرزمین پیش کر دیں ـــــ کہ سر اور زر ہو تو سرزمینوں کی بھلا کیا کمی۔ نوگزوں کو چھوڑو' تم ہمارے دور کے باشندوں کی سیانتیں نجم الحسن رضوی کی کتاب میں درج ایک اشتہار کی عبارت سے لگا لو:

"ہمارے پاس آپ کے مسائل کا فوری حل موجود ہے۔ اپنے ہاتھ ہمارے حوالے کیجئے اور چین اور سکون کے دن گذاریئے۔ جلد ہی ہمارا ایک جہاز ہاتھوں کی ایک بڑی کھیپ لے کر بیرونی سفر پر روانہ ہونے والا ہے۔ کیا عجب ہے کہ خوش حالی کے براعظم کی دریافت میں آپ کا ہاتھ بھی ہمارا شریک کار ہو۔ یاد رکھیے ہاتھوں سے بڑی کوئی نعمت نہیں۔ انہیں ہمارے ذریعہ برآمد کیجئے اور گھر بیٹھے دولت کمایئے۔"

میاں آسکر وائلڈ اگر تمہیں ہمارے بیان پر یقین نہ آ رہا ہو تو ایک بار اپنے جہان سے ہماری دنیا میں آ کر بچشم خود دیکھ جاؤ ـــــ لیکن ذرا فن کاروں سے بچ بچا کر۔ کہیں ان کے ہاتھ لگ گئے تو دیگر بے یقینوں کی طرح تم بھی دیکھتے رہ جاؤ گے کہ تمہارے ساتھ کیسا ہاتھ ہو گیا۔ یقین جانو وہ تمہیں بھی کیش کروا لیں گے' بھنا ڈالیں گے ـــــ بیچ ڈالیں گے ـــــ اور ـــــ بہت ہی سستے میں۔ کہیں سہ نفری شعری نشست کے' کہیں چہار فردی برخاست کے عوض۔ اگر تمہارے ملک عدم کے امیگریشن لاز مانع ہوں تو ہم یہاں سے ہاتھ بیچنے والے بھیج دیتے ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ اس کتاب میں شامل تمام کہانیاں تمہیں اپنی کہانیاں لگیں گی' کیونکہ لکھنے والے نے زمانی اور مکانی بعد کو اپنے اچھوتے طریقہ اظہار سے پاٹ دیا ہے۔ شگفتگی' تازگی اور سادگی کی وجہ سے جو جو علامتی کہانیاں ہم ایسے خادمان زبان یار کے سروں کے اوپر سے

گذر جاتی ہیں، وہ بہ آسانی تمہاری سمجھ میں آ جائیں گی--- اس لئے کہ تم اردو داں نہیں ہو۔ اور ہاں یہ بھی بتا دیتے ہیں کہ "ہاتھ بیچنے والے" کی کہانیوں کا خالق نجم الحسن رضوی فنٹاسٹک اسٹوریاں بھی لکھتا ہے--- معاشرے کو ہلا دینے والی اسٹوریاں۔ لیکن کوئی اس صحافی کی اسٹوریاں چھاپنے کو تیار نہیں۔ اسی لئے وہ اپنے ہاتھ بیچنے کو تیار ہو گیا اور ہم اس کے ہاتھ خریدنے کو تیار ہیں۔ دراصل ہمیں پختہ یقین ہے کہ جو ہاتھ معاشرے کو ہلا دینے والی اسٹوریاں رقم کر سکتے ہیں وہ معاشرے کو سلا دینے والی کہانیاں بھی لکھ لیتے ہوں گے۔ اور ہم ان سے ایسی ہی کہانیاں لکھوانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ لیکن مسئلہ یہ ہے کہ ہمیں ابھی تک اپنے ہاتھوں کی قیمت نہیں ملی۔ اگر تمہارے پاس چار پیسے ہوں تو ہمارے یہ لمبے لمبے ہاتھ خرید لو--- اور کچھ نہیں تو ملنے کے کام آئیں گے۔

اور آخر میں ہمیں ایک بات نجم الحسن رضوی سے کرنی ہے۔ وہ یہ کہ مانا تم اعلیٰ پائے کے کہانی کار ہو--- تمہارا اپنا ایک الگ اور ناقابل تقلید اسلوب ہے۔ بجا کہ تم چھوٹی سی حقیقت کو بڑا فسانہ کرنے کا فن جانتے ہو۔ تمہاری چشم تماشا نے ادبی حلقوں میں زبردست پذیرائی پائی--- اور--- اب تمہاری تازہ تصنیف "ہاتھ بیچنے والے" کو بجا طور پر ہجرہ ایوارڈ کا مستحق بھی قرار دیا جا چکا ہے۔ لیکن نجم الحسن رضوی کیا تمہارے پلے ہجرہ ایوارڈ کے علاوہ ادیب ہونے کا کوئی اور دستاویزی ثبوت بھی ہیگا---؟ ہیگا تو لف مسل بڑا کر کے پانچ منٹ میں اصالتاً سر اجلاس پیش خدمت فرماؤ--- ورنہ پھٹا کھاؤ۔

○

# سعید قیسؔ اور جدید طرز احساس

محمد ممتاز راشد

بحرین سے سعید قیس کا ضخیم شعری مجموعہ "دیوار و در" مجھے قطر میں ملا تو ایک لطیفہ یاد آ گیا۔ ایک پولٹری فارم کے باہر کچھ لڑکے سفید گیند سے کرکٹ کھیل رہے تھے۔ ایک لمبی شارٹ لگی تو گیند پولٹری فارم میں جا گرا۔ خوف کے مارے مرغیاں شور مچاتے ہوئے ہٹ گئیں، آخر ہمت کر کے ایک مرغ گیند کے قریب گیا، غور سے اس کا جائزہ لیا اور مرغیوں سے مخاطب ہو کر کہنے لگا کہ میں آپ کو شرمندہ تو نہیں کرنا چاہتا مگر دیکھ لیں کہ ساتھ والے پولٹری فارموں میں مرغیاں کتنی ترقی کر رہی ہیں۔ یہ لطیفہ سعید قیس کی شاعری اور خلیج کے دیگر شعراء کی شاعری کے تقابل میں فٹ بیٹھتا ہے یا نہیں اس سے قطع نظر یہ بات بہت یقین سے کہی جا سکتی ہے کہ عمر کے اڑسٹھویں برس میں شاعری کرتے ہوئے بھی سعید قیس قدیم طرز سخن سے بہت دور ہے بلکہ اس کی شاعری پر جدید لب و لہجے کی چھاپ اتنی گہری ہے کہ اس کی شاعری سے کوئی اس کی عمر کا اندازہ لگا ہی نہیں سکتا (اس معاملے میں محشر بدایونی کی مثال دی جا سکتی ہے)۔ اس کی غزلوں اور قطعات میں جدت کی اڑان بڑے بھرپور انداز میں ملتی ہے اور جب میں کہتا ہوں کہ سعید قیس کے ہاں جدت کا عنصر نمایاں ہے تو یہ ایسی بات نہیں جسے دوسرے اہل قلم محسوس نہ کرتے ہوں مثلاً "دیوار و در" کے حواشی دیکھیں تو تقریباً سبھی نے یہ بات اپنے اظہار خیال میں ضرور لکھی ہے۔ ڈاکٹر محمد عمر انجم کہتے ہیں کہ کلاسیکی انداز کے ساتھ سعید قیس نے جدت نگاری میں بھی وہ رنگ آمیزیاں کی ہیں کہ انہیں نئی

رتوں کا شعر کہنے میں کوئی باک نہیں۔ اظہر جاوید کے بقول سعید قیس کے حوصلے نے کلاسیکی بیان کی قدرت اور نئے لہجے کی ندرت بخشی ہے۔ امجد اسلام امجد کی رائے میں سعید قیس کی غزل میں معنوی اعتبار سے کلاسیکی رچاؤ کے ساتھ ساتھ جدید آہنگ کا لحن اور بازگشت کچھ ایسے یکجان ہو گئے ہیں کہ ان کے مصرعے دماغ میں کوندتے اور دل میں اترتے چلے جاتے ہیں۔ عطاء الحق قاسمی کا کہنا ہے کہ سعید قیس لفظوں کے حسن اور بدصورتی سے پوری طرح آگاہ ہے اور وہ جانتا ہے کہ ان لفظوں کا صحیح استعمال ان کی ہیئت تبدیل کر کے رکھ دیتا ہے' وہ جدید اور قدیم کے فرق سے بھی آگاہ ہے اور ان رویوں کو ایک نئی شکل دینے پر بھی قادر ہے' چنانچہ اس کی شاعری اس عہد میں ہونے والی شاعری سے الگ بھی ہے اور اس کے عین درمیان میں بھی آباد ہے۔ ڈاکٹر عصمت اللہ زاہد کی رائے ہے کہ سعید قیس نے اپنی غزلوں میں تغزل اور نغمگی کو یکجا کر کے نئے اسلوب کے چراغ روشن کیے ہیں اور ان کا یہ اسلوب ہم عصروں میں منفرد بھی ہے اور دلکش بھی (انھی سے ملتے جلتے خیالات قتیل شفائی اور شہزاد احمد کے بھی ہیں)۔ سعید قیس کے بارے میں اب تک کی گفتگو میں میں نے یہ تو بتا دیا ہے کہ اس کے ہاں جدت کی رنگینیاں ہر طرف رقصاں ہیں لیکن بہتر ہے کہ یہ چیز اس کے اشعار میں بھی دیکھی جائے۔ آغاز کتاب ہی میں اس نے جو قطعہ دیا ہے اسی سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ باقی کتاب کس تیور کی ہو گی وہ قطعہ یوں ہے۔

اپنی دیوار کا نوشتہ ہوں
اپنے ثابت کا بیش و کم ہوں میں
زندگی حرف حرف گذری ہے
اپنے اوراق میں رقم ہوں میں

بالخصوص اس قطعے کا دوسرا مصرع اپنی بنت میں اتنا جدید ہے کہ اس کی مثال ملنا مشکل ہے۔ "رکھا" ردیف والی ان کی غزل کے تو سبھی اشعار جدت کی روشنی میں نہائے ہوئے ہیں۔ خصوصاً یہ شعر:

روشنی مجھ کو بلانے مرے گھر تک آئی
اس نے، دیوار پہ مٹی کا دیا کیا رکھا

کسی کے دیوار پر مٹی کا دیا رکھنے سے روشنی کسی کو بلانے گھر تک چلی آتی ہو تو اس مضمون کو ہم روایتی شاعری میں کہاں ڈھونڈ پائیں گے۔ اسی طرح ان کا ایک شعر ہے

بری عادت ہے' لیکن پڑ گئی ہے
خود اپنے گھر میں رہ کر گھر نہ ہونا

اس شعر کے پہلے مصرع میں جو روانی اور بے ساختگی ہے اسے محض اور محض نئے لہجے کی شاعری کے تناظر ہی میں سمجھا جا سکتا ہے۔ اپنے ایک شعر میں سعید قیس نے "دل" کے بارے میں بڑی خوبصورت بات کی ہے وہ کہتے ہیں

میں اپنے دل کی بہت دیکھ بھال کرتا ہوں
یہ داغدار ثمر بھی مرے شجر کا ہے

اپنے وجود کو ایک شجر کہہ کر اپنے زخم زخم دل کو داغدار ثمر سے شبیہ دینا بلاشبہ ایک خوبصورت اور نئے رنگ کی سخن طرازی ہے۔ اس انداز اور لب و لہجے کے بہت سے اشعار سعید قیس کے مذکورہ مجموعے میں ملتے ہیں جو اس بات کا ثبوت ہیں کہ سعید قیس کا یہ لہجہ اتفاقیہ نوعیت کا نہیں ہے۔

میں یہ بات پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ سعید قیس کی شاعری میں جدت کی اہمیت اس لیے بھی بڑھ جاتی ہے کہ خلیج میں مقیم تمام شاعروں میں ان کی عمر کے برابر کا ایسا کوئی شاعر نہیں جو اس کہنہ سالی کے باوجود اپنی شاعری میں جدید اسلوب کا اتنا بھرپور تاثر پیش کرتا ہو بلکہ عمر میں ان سے کہیں چھوٹے بیسیوں ایسے شعراء خلیج بھر میں موجود ہیں جو نوجوانوں یا نوپیروں کے زمرے میں آتے ہیں مگر ان کی شاعری کی اساس محض روایت پر ہے اور ان کی شاعری کا سراپا عموی بھی ہے اور جدت سے عاری بھی' جبکہ سعید قیس کے ہاں جدید اشعار اتنی بڑی تعداد میں ہیں کہ اسے جدید شعراء کے علاوہ کسی اور حلقے میں شمار کیا ہی نہیں جا سکتا اور بہت جلد وہ وقت آئے گا کہ اہل ادب اس حقیقت کا ادراک کر لیں گے۔ خلیج کے

اہل ادب میں تو سعید قیس پہلے بھی غیر معروف نہیں تھا۔ مگر جنوری ۱۹۹۴ء میں "اشفاق" نے بحرین میں اپنا پہلا مشاعرہ کیاتو یہ اہم موڑ آیا کہ اس کی شہرت پاکستان تک جا پہنچی۔ اس مشاعرے میں احمد ندیم قاسمی' قتیل شفائی' شہزاد احمد' امجد اسلام امجد اور عطاء الحق قاسمی بھی موجود تھے۔ انہوں نے یہاں سعید قیس کی شاعری کو براہ راست سنا' جانچا اور پڑھا اور بے حد متاثر ہوئے۔ یہ شعراء قیس کے فن کی خوشبو سرزمین لاہور تک لے گئے۔ واپسی پر عطاء الحق قاسمی نے "نوائے وقت" میں بحرین کا سفرنامہ لکھا اور قیس کے فن کی بے حد تحسین کی انہوں نے قیس کی "رکھا" ردیف والی پوری غزل بھی اس روداد میں شائع کر دی جس سے سعید قیس کی پہچان دور دراز تک ہو گئی۔ میں اس مشاعرے کے دو ماہ بعد قطر سے لاہور گیا تو میں نے وہاں کئی احباب ادب کو سعید قیس کی تعریف میں رطب اللسان پایا اور مجھے اس پر دلی مسرت ہوئی کہ ادبی مراکز سے ہزاروں میل دور بیٹھے ہوئے ایک قدرے گمنام مگر جینوئن شاعر کی کسی حد تک تو قدر افزائی ہوئی۔ ضرورت اس بات کی ہے ایسے سچے اور بچے فنکار اور اس کے فن کو مزید پذیرائی ملے۔

○

# شہاب نامہ.......... چند معروضات

جمیل احمد عدیل

وادی موت میں اترنے کے بعد زندگی سے کہیں زیادہ شہرت پانے والوں میں محترم قدرت اللہ شہاب بھی شامل ہیں اور اس کا واحد سبب ان کی آپ بیتی ہے۔ بڑی تقطیع کے ۱۲۴۶ صفحات پر مشتمل اس آپ بیتی کے ایک ہی سال میں کئی ایڈیشن نکل گئے۔ اسی سے اس کی عوامی مقبولیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

اس آپ بیتی کے چند اجزاء شہاب صاحب نے خود مختلف ادبی محافل میں پڑھ کر سنائے تھے' ازاں بعد اس کے کچھ حصے بعض ادبی مجلوں معاصر' دستاویز' نیا دور' تخلیقی ادب' سیارہ ڈائجسٹ اور اردو ڈائجسٹ میں شائع ہوئے۔ پھر شہاب صاحب کی وفات کے تقریباً ایک برس بعد یہ خود نوشت سوانح عمری جولائی ۱۹۸۷ء میں منظرعام پر آ گئی۔

کسی خاص شعبے میں' اس کے تمام تقاضوں کو مدنظر رکھتے ہوئے اس شعبے کا کامیاب فرد بن جانے کے بعد اس کے بالکل متضاد شعبہ سے متعلق بعض اعمال و افعال کر کے کچھ لوگوں نے اپنی شخصیت کو اس طرح ابھارا ہے کہ دیکھتے ہی دیکھتے وہ شہرت کے بام عروج پر پہنچ گئے۔ یہ ایک خالصتاً" نفسیاتی طریق کار ہے جس کا بہت زیادہ تعلق انسانی ذہن کی دراکی سے ہے' جیسے کوئی روایتی مذہبی رہنما بلکہ مولوی اپنی تقریر میں جدید سائنس' کاسمو گرافی' اور پیراسائیکولوجی وغیرہ کے حوالے دینے شروع کر دے تو کم پڑھے لکھے سننے والے چونک جاتے ہیں۔ شہاب صاحب کا معاملہ بھی کچھ اس سے ملتا جلتا ہے لیکن عمل کے حوالے سے معکوس ہے۔

انگریز کے زمانے میں کسی مسلمان کا آئی سی ایس کر لینا یا کسی اعلیٰ سرکاری

عہدے پر فائز ہو جانے کا مطلب ہوتا تھا کہ وہ ڈپٹی نذیر احمد کا کردار "ابن الوقت" بن گیا ہے۔ اور اس کے اثرات اب تک موجود ہیں۔ بیوروکریٹ یا سی ایس ایس افسر کا نام آتے ہی ایک کلف زدہ شخص کا تصور ابھرتا ہے' جس کی گردن میں اس کی ڈگری لوہے کا سریا بنی ہوتی ہے جو اسے جھکنے نہیں دیتی' جس کے چہرے کی سرخی اس کی رعونت کا پتہ دیتی ہے' جس کا نچلا ہونٹ تکبر کی علامت کے طور پر نیچے کی طرف ڈھلکا ہوتا ہے' جو اپنے غریب رشتہ داروں کو خاطر میں نہیں لاتا' جو اپنے ماتحتوں پر خوب رعب جھاڑتا ہے' جسے اپنے دفتر کے دروازے میں قدم رکھنے تک بے شمار سلیوٹ کئے جاتے ہیں۔ جو مقتدر' صاحب تصرف و ارادہ ہوتا ہے جو اپنے دائرہ کار سے بڑھ کر سیاہ و سفید کا مالک ہوتا ہے' عاجزی' انکساری' فروتنی' خاکساری اور اخلاق وغیرہ کا دخل اس کی زندگی میں ہرگز نہیں ہوتا۔ یہ تصور محض روایتی نہیں فی الحقیقت اب بھی ایسا ہی ہے۔

شہاب صاحب نے جب آئی سی ایس کا امتحان پاس کیا تو پورے برعظیم میں صرف گیارہ امیدوار کامیاب ہوئے۔ آپ بھی ان خوش نصیبوں میں سے ایک تھے جن کے سر پر آئی سی ایس کی کلغی لہرانے لگی تھی۔ بس یہی وہ موڑ تھا جس نے ان کی آنے والی زندگی کو ایک ایسی نہج عطا کر دی کہ ان کی پراسراریت' ولایت' بزرگی' تصوف' روحانیت' دینی و دنیوی کارنامے سب اسی کے مرہون منت ثابت ہوئے ورنہ ایک سے ایک بڑھ کر ادیب' شاعر اور مدعیان کشف و کرامات پڑے ہیں۔

شہاب صاحب نے خاص ذہانت سے کام لیا کہ افسروں میں افسروں کی طرح ٹھسے والے اہل کار بن کر رہے لیکن ساتھ ہی ساتھ ایم اے آئی سی ایس کرنے' بیوروکریسی کے اعلیٰ ترین عہدوں پر فائز ہونے کے علی الرغم' اسلامیت' مذہبیت' اعلیٰ اخلاقی اقدار' عاجزی' انکساری' ایمانداری کے نمونہ اور ماتحتوں کے ساتھ شفقت کا برتاؤ کرنے والے بن کر رہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عوام پر ان کی شخصیت کا وہی اثر مرتب ہوا جو اس روایتی مولوی کا ہوتا ہے جو اپنی تقریر میں یکایک انگریزی بولنے لگ جاتا ہے۔ چونکہ آئی سی ایس افسر کا یہ طرز عمل راہ عام سے ہٹ کر تھا اس لئے وہ "ہاٹ کیک" کی طرح ہاتھوں ہاتھ لئے گئے۔ نتیجۃً جو لوگ ان کی سرکاری حیثیت اور منصب سے کسی طرح مستفیض نہ ہو سکے ان کے لئے ان کی متصوفانہ بلند اقبالی اور ولایت کا فیض جاری ہو گیا جو ان کی وفات کے بعد ایک کامیاب پیر کی طرح اب بھی

جاری ہے۔ بقول شخصے "شہاب صاحب ایک زندہ مزار ہوا کرتے تھے........... اور اب.........
حقیقتاً ان کا مزار بن چکا ہے اور اس پر شہاب نامے کا جھنڈا لہرا رہا ہے۔

اس روحانی پرچم میں انسٹھ ستارے ہیں اور ہر ستارہ اپنے دلکش افسانوی اسلوب کی وجہ سے نیرو تاباں ہے۔

کتاب کا ابتدائی حصہ جموں میں پلیگ' ننده بس سروس' چکور صاحب' راج کرو گا خالصہ باقی رہے نہ کو' مہاراجہ ہری سنگھ کے ساتھ چائے' چندراوتی وغیرہ ابواب پر مشتمل ہے۔ یہ کتاب کا دلچسپ ترین حصہ ہے۔ اس میں انہوں نے اپنی زندگی کے سفر کے آغاز اور آئی سی ایس افسر بننے سے پہلے کے واقعات بیان کئے ہیں۔ یہ وہ زمانہ ہے جب وہ افسری کے پروٹوکول میں آئے تھے نہ روحانیت و ولایت میں قدم رکھا تھا بلکہ وہ ایک عام سیدھے سادے کھلنڈرے نوجوان تھے' ایسا نوجوان جو کلاس روم میں ڈیسک کی صفائی کے دوران چوہے کو ہاتھ سے پکڑ کر پھینک دیتا ہے۔ جو وہمی اور کنجوس حکیم گورانده مل کو جھوٹ موٹ جا کر بتاتا ہے کہ مجھے اپنے لئے پلیگ کی دوا چاہئے اور روئی کا گالہ ننکچر آیوڈین میں تر کر کے ایک میلی سی پٹی کے ساتھ اپنی بغل میں لگا کر حکیم صاحب کو پریشان کر دیتا ہے اور پھر اس خسیس حکیم کی شیرے میں لت پت گلقند مٹھی بھر کر اٹھا کے بھاگ جاتا ہے۔ جو اپنے اسکول کے چپڑاسی لال دین اور راہ گیروں سے پلیگ پر لیکچر سن کر حیران رہ جاتا ہے' جو اپنے اسکول کے ماسٹر مولوی عبدالحنان کے طاعون میں مرنے کی نہایت خلوص سے دعائیں مانگتا ہے۔ جب وہ بیمار پڑ جاتے ہیں تو ان کا پتہ کرنے جاتا ہے اور ہر مرتبہ بڑے اشتیاق سے پوچھتا ہے "ماسٹر صاحب! گلٹی نکل آئی؟" لیکن جب اس کے برعکس جواب سننا پڑتا ہے تو سخت مایوس ہو جاتا ہے۔ پھر انہی مولوی صاحب کی نوبیاہتا دلہن کے ساتھ تانگے میں بیٹھ کر روشن شاہ ولی کے مزار پر نیاز چڑھانے جاتا ہے تو مستی میں آ کر راستے میں ہی نیاز کا زردہ کھانا شروع کر دیتا ہے۔ پھر واپسی پر مولوی صاحب کی بیوی کو میٹھے پان' ملائی کی برف' بیر وغیرہ کھلا کر خوش ہوتا ہے۔ اسے بازار سے سودا سلف لا کر دیتا ہے تو اپنی طرف سے پیسے ڈال کر سب سے ہنڈی لگا کر بے انتہا مسرت حاصل کرتا ہے۔ گھر سے مزار پر نذر چڑھانے کے لئے چھپیس کی ململ کا دوپٹہ لاتا ہے۔ بجائے قبر پر چڑھانے کے اسے سید عطاء اللہ رنگریز یا محمد دین بٹ سے رنگوانے کے بارے میں سوچتا ہے تاکہ مولوی صاحب کی دلہن صادقہ بیگم کو تحفے میں دے سکے۔

"راج کرو گا خالصہ باقی رہے نہ کو" تو انتہائی دلچسپ باب ہے جس میں طنز و مزاح کی ایسی جوت لگائی ہے کہ بلا تامل اس کے بعض حصوں کو اعلیٰ مزاحی ادب میں شامل کیا جا سکتا ہے......... اس میں شہاب صاحب نے اپنے بچپن کے زمانے کے بعض واقعات بیان کئے ہیں' جب وہ جی اے ایس بے ایچ ہائی سکول میں پڑھتے تھے۔ یہ واقعات محض سپاٹ بیانیہ انداز میں نہیں لکھے گئے بلکہ ایک بھرپور افسانے کا کامیاب ترین تاثر رکھتے ہیں۔ کرم بخش کا ذکر پڑھ کر بے اختیار "گڈریا" کے "داؤجی" یاد آ جاتے ہیں۔ سکول میں داخل کروانے کے لئے جب کرم بخش اور مصنف کی دادی اماں انہیں ساتھ لے کر گئے تو ہیڈ ماسٹر کے ساتھ کیا مکالمہ ہوا؟ بہت ہی پرلطف ہے۔ پہلے دن جب مصنف سکول گئے تو نیا کرتہ' کورے لٹھے کا بنا کھڑ کھڑ کرتا ہوا پاجامہ اور پھندنے والی سرخ ٹوپی پہنی ہوئی تھی۔ اس ہیئت کذائی پر ہم جماعت سکھ اور ہندو لڑکوں کی مضحکہ خیز حرکات اور پھر ان کے گرد گھیرا ڈال کر لہک لہک کر بھانت بھانت کی آوازیں کسنا:

"فوجاں شہروں آئیاں ہیں
فوجاں گٹ مٹ کر دی ہیں
فوجاں پڑھائیاں کریں گی
فوجاں بابو بنیں گی
فوجاں ٹوپی لیتی ہیں
فوجاں مسلے ہوتی ہیں"

اور پھر اردو کے استاد
ماسٹر منگل سنگھ کا غالب کے اس شعر کی
تشریح کرنا۔

سادگی و پرکاری' بے خودی و ہشیاری
حسن کو تغافل میں جرأت آزما پایا

"سادگی تے اوس دے نال پرکاری۔ بے خودی تے اوس دے نال نال ہشیاری۔ حسن نوں تغافل دے وچ کیا پایا؟ شاعر کہندا اے اس نے حسن نوں تغافل دے وچ جرأت آزما پایا۔ لو جی ایہی جئی گل سی۔ غالب شعر بناندا بناندا مرگیا۔ میں شعر سمجھاندے

بھاندے مرجانا اے تہاڈے کوڑھ مغزاں دے پلے گھ نئیں پینا۔ اگے چلو۔"

جب شہاب سکول سے بھاگنے لگے تو اپنے پراسرار بوڑھے ملازم کرم بخش کے ہاتھوں کس طرح بدنی سزاؤں سے دوچار ہوئے۔ قاری اس حصہ کو پڑھتے پڑھتے حیرت انگیز منظروں کے سحر میں گرفتار ہو جاتا ہے' خصوصاً کیسے تپتی ہوئی ریت پر کرم بخش نے مصنف سے لکیریں نکلوائیں۔

پھر چندراوتی والا باب تو پورا افسانہ ہے۔ اس قدر دلکش اور بھرپور کہ ممکن نہیں اس کی دلچسپی سے قاری ایک لمحے کے لئے بھی جدا ہو جائے۔

ہر اہم شخص کی کسی خاص قسم کی شہرت کے عقب میں کچھ خاص نوعیت کے اثرات و محرکات ہوتے ہیں۔ مشفق خواجہ نے تو کہا تھا "قدرت اللہ شہاب مرحوم میں بے شمار خوبیاں تھیں' عیب صرف دو تھے اشفاق احمد اور ممتاز مفتی۔" حالانکہ یہ دونوں صاحبان ممتاز مفتی (مجموعہ عجز) اشفاق احمد (مجسم تکبر) عیب نہیں "محاسن" ہیں۔ قدرت کے راشد خلفاء ہیں۔ ان کی تبلیغ زمین کے کناروں تک پہنچانے والے ہیں۔ بہترین پروپیگنڈہ سیکرٹری ہیں......... قدرت اللہ شہاب کے بارے ایک خاص حوالہ قائم کرنے میں انہوں نے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا ہے۔ بالخصوص ممتاز مفتی باقی سب عقیدت مندوں کو پیچھے چھوڑ گئے ہیں۔ اس سلسلہ میں ان کی "لبیک" کا مطالعہ کافی ہو گا۔ اس کے علاوہ "اوکھے لوگ" میں ان کا مضمون "پراسرار" اور نقوش کے خاص نمبر مطبوعہ دسمبر ۱۹۸۷ء میں "اللہ میاں کا ے••" اور اس کی پانچ سو صفحوں پر پھیلی ہوئی تشریح "الکھ نگری" کا نصف آخر بھی لائق مطالعہ ہیں۔

اشفاق احمد' احمد بشیر' پروین عاطف' بانو قدسیہ' ابن انشاء' اے حمید' ذوالفقار تابش' ممتاز مفتی اور ان کے ہم نواؤں سمیت سب کا یہی کہنا ہے کہ شہاب کی شخصیت میں پراسرار عناصر موجود ہیں' بہت گہرا شخص ہے' اس کے علم' مشاہدہ' روحانی کمالات تک رسائی آسانی سے ممکن نہیں۔ اور یہ کہ اس کے اندر خاص میگنیٹک قسم کی ول پاور موجود ہے جو مخاطب کی توجہ کو باندھ سکتی ہے۔ پھر مریدین قدرت نے اس بات کو بھی شد و مد سے پیش کیا ہے کہ وہ بہت کم گو ہے' اس کے بڑے بڑے امانت دار دوست منتظر رہتے کہ وہ کوئی ذاتی بات کرے' وہ اپنی طاقت اور کمزوری کا اعتراف کسی کے سامنے کم ہی کرتے تھے' وہ اپنا آپ کسی پر ظاہر نہیں ہونے دیتے تھے' قدرت کی شخصیت پر محترم کی مہر لگی ہوئی ہے' ان کے قول و فعل

میں ربط تھا' وہ پاکیزہ تھے' وہ ٹھنڈے مزاج کے تھے' وہ کم گو بلکہ گونگے تھے' مخالف اور مخالفت کو "اگنور" کرتے تھے' اپنے افسروں کی خوشامد یا تعریف میں رطب اللسان نہیں ہوتے تھے' اپنی تعریف نہیں سننا چاہتے تھے' ان کے کردار میں بلا کا عجز تھا' وہ کوئی پہنچے ہوئے بزرگ تھے' دوران ملازمت مالی منفعتیں حاصل نہیں کیں۔ بڑے بڑے بزرگ "ستارہ" (قدرت اللہ شہاب کا روحانی نام ہے) کی دستار بندی کرتے تھے۔ سانڈنی سوار کے ذریعے انہیں روحانی پیغامات ملتے تھے۔ سفید کبوتر اڑتا ہوا آتا تھا اور قریب آکر گرتے ہی سفید کاغذ بن جاتا جس پر پراسرار ہدایات لکھی ہوتیں' عورتوں کو خواب میں اشارے ہوتے کہ ان کے گھر میں اعتکاف کرو' عجز اس قدر تھا کہ مفتی جی انہیں طبعاً" ملامتیہ قرار دیتے ہیں' غرضیکہ قدرت ایک گپت تھے' وہ نہیں چاہتے تھے کہ ان کا بھید کھلے' بحث نہیں کرتے تھے' کبھی ایسا طرز عمل ظاہر نہیں کرتے تھے کہ وہ دوسروں سے بہتر ہیں' کبھی یہ احساس نہیں ہونے دیتے تھے کہ جو کچھ دوسرا شخص کہہ رہا ہے' غیر مناسب ہے' ان کا مسلک تھا کہ منفی طاقتوں کو مثبت کرنا ہی افضل فعل ہے اور جس کے شعلے کی آگ کو جذب کر کے معدوم کر دینا چاہئے تاکہ صرف روشنی ہی روشنی باقی رہ جائے۔

جملہ معترضہ ہی سہی لیکن مفتی بھی شاید اپنے مرشد کے تتبع میں اسی مسلک پر اعتقاد رکھتے ہیں اس لئے اس کے عملی طریق کار کے متعلق وہ اکثر ایک واقعہ سنایا کرتے ہیں بہت دلچسپ ہے۔

"میں نے ایک بزرگ دیکھے ہیں جو ہر تین ماہ بعد' ہیرا منڈی جاتے خوب رو طوائف بک کرتے۔ برہنہ ہو کر اس کی گود میں بیٹھ جاتے اور دھیان لگاتے۔ جب جسم کا ہسیر پھن پھیلا کر اور ٹھوکریں مار مار کر تھک ہار جاتا اور سرزمین پر رکھ دیتا تو وہ اٹھ کر کپڑے پہن لیتے اور طوائف کے سر پر شفقت بھرا ہاتھ پھیر کر سیڑھیاں اتر آتے۔"

"نقوش" ص ۳۹۸ خاص نمبر مطبوعہ ۱۹۸۷ء

اسے کہتے ہیں۔

رند کے رند رہے ہاتھ سے جنت نہ گئی

ویسے مفتی جی کی ساری ہمدردیاں بزرگ کے ساتھ ہی رہیں۔ یہ نہ سوچا کہ طوائف کا گھر بھی کیا

شفقت بھرے ہاتھ سے پورا ہو جاتا تھا یا نہیں؟ کیونکہ اس صورت میں کہ اگر وہ طوائف صابر و شاکر و قانع رہتی تھی تو وہ اس بزرگ سے بھی بڑی بزرگ ثابت ہوتی ہے۔

بہرحال اس صورت حال پر شہاب صاحب کا یہی تبصرہ ہوتا تھا۔ یہ تیرے پراسرار بندے اگر آپ "الکھ نگری" کا باب "چمگادڑیں" (صفحہ ۵۷۱ تا صفحہ ۵۹۰) پڑھیں تو آپ کو شہاب صاحب خود انہی پراسرار بندوں کی فہرست میں وہیں نظر آئیں گے جہاں نیک بندوں کی فہرست میں ابو بن ادھم نے خود کو پایا تھا۔ یہاں ایک سوال ضرور پوچھوں گا کہ طاقت کو ٹرانسفر کرنے کا یہ طریق کس شریعت سے اخذ کیا گیا ہے؟ جس شریعت کی جانب شہاب صاحب عورتوں کا (اپنے قرب کے بعد) رخ موڑا کرتے تھے' اس شریعت میں تو ہمیں یہ طریق کار کہیں مروج دکھائی نہیں دیا۔ مگر ظاہر ہے یہ ہماری نظر کا قصور ہو گا' وگرنہ شہاب صاحب ایسے عالم فاضل اور بزرگ ہستی کے پاس یقیناً کوئی نہ کوئی سند تو ضرور موجود ہو گی وگرنہ وہ اپنے بارے یہ فیصلہ نہ دیتے کہ "عورت مجھے اچھی لگتی ہے۔" اور نہ مفتی صاحبؒ ان کی ان الفاظ میں تائید کرتے "قدرت کی سب سے بڑی کمزوری عورت تھی۔ ایسی عورت جو جاذب نظر ہو اور اسی وجہ سے راستے سے بھٹک گئی ہو۔" بہر نوع قدرت اللہ شہاب نے انہی بیٹس کے ساتھ لانگ ڈرائیو کا لطف بھی اٹھایا اور مری کے پہاڑوں کی گھاٹیوں میں آدھی رات کو کسی طرح دار بیگم کی رفاقت سے بھی خوب حظ اٹھایا۔ اب خدا جانے کس کا رخ کس طرف ہوا؟ لیکن شہاب صاحب نے اپنی یہ ڈیوٹی بخوبی ادا کی۔

اپنی روحانیت کے باب میں قدرت نے اپنی زندگی میں عملاً کم باتیں سامنے آنے دیں' شاید وہ انہیں اپنی آپ بیتی کے لئے سنبھال کر رکھنا چاہتے تھے اور اگر کسی نے استفسار کیا تو اکثر اسے خوبصورت لفظوں میں ٹال دیا۔ مثلاً طاہر مسعود نے جب ان سے انٹرویو کیا تو قدرت نے اس رنگ میں "وضاحت" کی۔

سوال : ممتاز مفتی اور اشفاق احمد نے اپنی بعض تحریروں میں یہ تاثر دیا ہے کہ جیسے آپ پہنچے ہوئے بزرگ اور صوفی ہیں۔ ممتاز مفتی تو آپ کو اپنا پیر بھی کہتے ہیں۔ اس کی حقیقت کیا ہے؟

شہاب : (ہنستے ہوئے) یہ جرم تو میں نے نہیں کیا۔ ممتاز مفتی خاکہ اڑانے کے ماہر ہیں' افسانہ نگار بھی بڑے ہیں۔ لہٰذا "لبیک" میں انہوں نے میرا خاکہ اڑایا ہے۔

سوال : لیکن وہ آپ سے ایسے واقعات بھی منسوب کرتے ہیں جو صرف صوفیوں سے صادر ہوتے ہیں؟

شہاب : وہ صرف ان کی افسانہ نگاری ہے۔

سوال : وہ کہتے ہیں کہ آپ کبھی مان کر نہیں دیں گے کیونکہ صوفیوں میں انکسار بہت ہوتا ہے؟

شہاب : انہیں "لبیک" لکھنی تھی اور اس کے لئے انہیں ایک کھونٹی چاہئے تھی' سو انہیں مل گئی.........!

سوال : آپ نے مفتی صاحب سے کبھی اس موضوع پر گفتگو نہیں کی؟

شہاب : میں نے ان سے کئی بار کہا لیکن وہ بہت ہٹ دھرم آدمی ہیں.........!

سوال : یہ بھی ہوتا ہے کہ جو لوگ پہنچے ہوئے ہوتے ہیں وہ اعتراف نہیں کرتے؟

شہاب : پہنچا ہوا کوئی نہیں ہوتا' سب ایسے ہی ہوتے ہیں۔

"یہ صورت گر کچھ خوابوں کے" ص ۱۱۶

(مرتبہ طاہر مسعود مطبوعہ ستمبر ۱۹۸۵ء)

یہ ساری روائتیں اور ان سے منسوب استدراجات کا سلسلہ ایک طرف اور "شہاب نامہ" ایک طرف۔ کیونکہ "شہاب نامہ" میں دو شخصیتیں ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ چلتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔ ایک قدرت کا بشری روپ اور دوسری قدرت کی روحانی حیثیت۔ کیا یہ دونوں شخصیات ایک دوسرے کی تردید تو نہیں کرتی رہتیں؟ کیا قدرت کے متصورہ روحانی مقام کو ان کا اپنا کردار ضعف تو نہیں پہنچاتا؟ یہ سوالات بہت اہم ہیں۔ ان کا جائزہ "شہاب نامہ" کے تناظر میں ہی لیا جا سکتا ہے۔ اپنی حیاتی میں اپنے بارے تعویق آمیز بیانات اور عاجزی و انکساری کے باوجود قدرت نے "شہاب نامہ" میں اپنے بے شمار معجزات' خارق عادت واقعات' رویا' کشوف اور باطنی مکاشفات کا ذکر کیا ہے اور اس طرح اپنے مریدوں کے روحانی تقاضوں اور عقیدتوں میں تقویت اور تازگی ایمان کا خوب سامان کیا ہے۔

اس سلسلہ میں انہوں نے پہلا قصہ اس کتاب کے ایک باب "بلا کماری کی بے چین روح" کے عنوان سے پیش کیا ہے۔ جب ان کا تقرر بطور ایس ڈی او اڑیسہ میں ہوا تو انہیں ایک کوٹھی (۱۸۔ سول لائنز) کٹک میں الاٹ ہوئی۔ مصنف تب کنوارے تھے۔ یہ کوٹھی

آسیب زدہ تھی۔ ماحول جناتی تھا۔ اس ویران کھنڈر نما کوٹھی میں پر اسرار طریق پر سوئچ بٹن آن آف ہوتے تھے۔ دروازے پر دستک ہوتی تھی۔ باہر نکل کر دیکھا جاتا تو پرخوف سناٹے اور تاریکی کے سوا کچھ نہ ہوتا۔ سفید دھوئیں کے چھلے نظر آتے۔ اچانک ساری فضا معطر ہو جاتی۔ سلیپر خود سے غائب ہو جاتے۔ باتھ روم سے صابن ایک دم گم ہو جاتا۔ سگریٹ اپنے آپ ہونٹوں سے الگ ہو کر دور جا گرتا۔ بند کمرے میں ہڈیوں' اینٹوں اور پتھروں کی بارش ہوتی۔ بھاری بھرکم میز فضا میں بلند ہوتا پھر دھڑام سے نیچے آ گرتا۔ واش بیسن کے نلکے سے پانی کی بجائے خون کی گرم گرم دھاریں بہتیں۔ گراموفون میں سہگل کے گیتوں کی بجائے چیخنے' رونے اور بین کرنے کی آوازیں آتیں۔ دروازے کھڑکیاں بھی خود سے کھلتے اور بند ہو جاتے۔ عجیب وحشت انگیز آوازیں آتیں۔ کبھی طبلہ' چمٹا' ستار' نفیری اور شہنائی کی دل آویز صدائیں آتیں۔

ایک شب شدید بارش میں تار والا آیا۔ جب رسید پر دستخط کر کے دیکھا تو اس کی جگہ ہڈیوں کا خوفناک ڈھانچہ کھڑا کٹ کٹ دانت بجا رہا تھا۔ ایک رات الو کی شکل کا بھاری بھرکم عجیب الخلقت پرندہ برآمدے میں ہچکولے کھانے لگا اور گھوڑوں کے ٹاپوں کی تیز آوازیں آنے لگیں۔ غرض کبھی پسی ہوئی مرچوں کی دھانس اٹھنے لگتی' کبھی سوجی بھوننے اور ہلدی جلنے کی بو آنے لگتی' کبھی سڑی ہوئی مچھلی کی بساند پھیل جاتی۔ اس طرح لاتعداد مزخرفیات کے ذریعہ کوئی غیر مرئی مخلوق مسلسل کئی ماہ تک ناگہانی خوف پیدا کرتی رہی' اور محترم مصنف اس نادیدہ بلا سے تنہا نبرد آزما رہے اور آخر میں ایک ہیرو کی طرح اس طلسماتی مبارزت میں کامرانی سے ہمکنار ہوئے۔ عقدہ یہ کھلا کہ یہ ایک مقتول ہندو دوشیزہ بملا کماری کی بد روح ہے جو یہ اعمال قبیحہ اور افعال شنیعہ انجام دے رہی ہے۔ اس کی لاش ڈرائنگ روم کے جنوب مشرقی کونے میں دفن ہے۔ مصنف نے اس کی اٹھارہ بیس برس سے مدفون لاش نکلوائی۔ ہندو دھرم کے مطابق اس کا کریا کرم کیا۔ بوسیدہ نعش کو چتا میں رکھ کر جلایا۔ خاک و راکھ کو گنگا کے جل میں بہایا' آسیب دور ہو گیا' کوٹھی میں سکون ہو گیا۔

مذکورہ خود نوشت سوانح عمری میں جابجا اس نوع کے جادوئی اور طلسماتی قصص فراوانی سے مل جائیں گے۔ مثلاً آخری باب جس کا سرنامہ ہے "چھوٹا منہ بڑی بات" میں مصنف مرحوم نے سارا علم کلام اپنی اولیائی ثابت کرنے میں صرف کر دیا ہے۔ قرآنی آیات کے ورد' وظیفے اور حق ہو کی مالا جپنے کو ہی مغز دین بتایا ہے۔ وہی رائج متداول عجمی تصوف' حق ہو

مولا مولا ایک ضربی' دو ضربی' سہ ضربی' چہار ضربی۔ عملی قوی کو معطل کرنے والے رہبانیت کے شاخسانے۔

مافوق الفطرت طریق پر مصنف ایک غیبی روحانی سلسلہ (اویسیہ) میں بیعت بھی ہوئے۔ اس باب میں اس بزرگ کے حوالے سے سب سے اہم اور قابل ذکر مطالعہ "ناینٹی" کا ہے۔ یہ ایک پراسرار غیبی ہستی تھی۔ یہ بزرگ ہستی انھیں ربع صدی تک نہایت شستہ انگریزی کے بلند پایہ اسلوب میں خط لکھتی رہی۔ پہلے خط کے آخر میں یہ مبہم نام درج تھا۔

"A ninety years young faqir."

یہ خفیہ چٹھیاں بالعموم بغیر کسی خارجی دنیوی ذریعہ کے شہاب صاحب کو موصول ہوتیں یعنی ہوا کے دوش پر پھول کی پتیوں کی طرح سرپر یہ کاغذات آ گرتے۔ اس بزرگ کے حکم کے موجب یہ تحاریر تلف کر دی جاتیں اور مفہوم اخفا میں رکھا جاتا۔ ایک مرتبہ مصنف نے از راہ عقیدت اپنے غیبی مرشد "حضرت ناینٹی" کے دستخط محفوظ کرنے کا ارادہ کیا تو بجلی کے بلب کے گرد کاغذ منڈلانے لگے' تحریر آئی۔ عبارت سے یہی مستخرج ہوا تمھاری تقصیر پر یہ تعزیر مقرر ہوئی ہے کہ تمھیں نصف گھنٹہ تک ایک زندہ سانپ کے ساتھ باندھ کر رکھا جائے گا۔ ان خطوط میں یہ عجیب واقعہ بھی ہوتا کہ مصنف کے تمام رازوں کو بالصراحت بیان کیا جاتا۔ پھر مصنف مشورہ اور راہنمائی کے لئے ناینٹی کو خط لکھتے یعنی الماری یا تکیے کے نیچے رکھ دیتے اور خطوط از خود غائب ہو جاتے مراد مکتوب الیہ (ناینٹی) تک پہنچ جاتے۔

آخر میں شہاب صاحب نے کچھ آیات کے ورد کی تلقین کی ہے جو ذہنی تشتت و انتشار دور کرنے کے علاوہ مراقبہ نور' مراقبہ رویت' مراقبہ دعیت' مراقبہ اقربیت' مراقبہ تمنا' مراقبہ فنا وغیرہ کے لئے اکسیر ہیں' ان کی ادائیگی کے لئے مشقیں' طریقے اور تعداد وغیرہ کی تفصیل بھی درج ہے۔ بیماری' اولاد' رزق' تعلیم' حاجت روائی' حفاظت' عزت و حرمت اور دیگر مسائل نیز حل المشکلات کے لئے کچھ (مجرب) آیات کی نشاندہی کی ہے۔

یہ تو ایسا رخ ہے جو شہاب کا تعارف بحیثیت "سپر سپرچل مین" کے طور پر کرواتا ہے کیونکہ انہوں نے ولایت کی ہفت رنگ خلعت فاخرہ پہن رکھی ہے۔ لیکن دوسرے روپ میں وہ ایک "خالص بشر" کے طور پر بھی ظاہر ہوتے ہیں۔ وہی بشر جس کا حوالہ اوپر اس کے بچپن کے واقعات کے ضمن میں آ چکا ہے۔ وہی بشر جو ایک ہندو دوشیزہ پر عاشق ہو جاتا ہے

اور ایک ہیرو اور یامراد محب کی طرح سارا سارا دن بائیسکل پر اپنی اس معشوقہ کو بٹھا کر لاہور کی سڑکوں پر ٹریفک سارجنٹ سے بھی زیادہ "آوارہ گردی" کرتا ہے' جذباتی رومانوی مکالمے ادا کرتا ہے' جب وہ روٹھ جائے تو اس کو منانے کے لئے سڑک کے عین بیچ ناک سے لکیریں نکالتا ہے اور اس عفیفہ کو اس کے گھر ایمن آباد چھوڑ کر آتا ہے اس کے کپڑے دھوتا ہے۔ ایک دن میں ستر کلومیٹر کا سفر سائیکل پر کرلیتا ہے۔ لیکن یہاں بھی روحانیت کا ایک پہلو برآمد ہوتا ہوا دکھائی دیتا ہے جس کی طرف توجہ احمد بشیر نے اپنے مضمون "پیر و مرشد" میں دلوائی ہے۔ کیونکہ "شہاب نامہ" میں اس کا ذکر نہیں ملتا۔ احمد بشیر کو یہ واقعہ مرحوم نے زبانی سنایا تھا کہ ان کی ملاقات لندن میں چندراوتی کے ہیولے سے ہوئی جس نے اسے جسمانی طور پر ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچا دیا کیونکہ ان کے پاس کرایہ نہیں تھا۔ اور چندراوتی نے یہ بھی بتایا کہ اب آپ کی بیوی عفت شہاب کی روانگی قریب ہے (ظاہر ہے یہ "خبر" چندراوتی کو ہی دینی چاہیے تھی۔

اگر تو مریدین شہاب کی نظر سے قدرت کو دیکھا جائے تو ان میں کسی کمی 'کجی' خامی کو تلاش کرنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔ مثلاً مفتی صاحب فرماتے ہیں کہ شہاب ایسے خطوط کو پھاڑ دیتے تھے جو ان کی تعریف میں لوگ ارسال کرتے تھے۔ حالانکہ اپنی اسی خود نوشت میں مرحوم نے متعدد معرب' مفرس' منظوم' منثور ایسے خطوط کے عکس شائع کئے ہیں جو ان کی مدحت کے گاڑھے شیرے میں لتھڑے ہوئے ہیں۔ اس کے علاوہ بھی جہاں کسی نے ان کی مدح سرائی بلکہ خوشامد کی ہے اس کو بطور حوالہ وہ التزاماً" لے کے آئے ہیں۔

حضرت علیؓ نہج البلاغہ میں فرماتے ہیں "بہت سے لوگ اس وجہ سے فتنہ میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ ان کے بارے میں اچھے خیالات کا اظہار کیا جاتا ہے۔"

عاجزی اور انکساری کے اس مجسمے نے پوری کتاب میں بے حد تعلی سے کام لیا ہے' کہیں واضح کہیں ڈھکے چھپے لفظوں میں اپنی تعریف کا پہلو شعوری کوشش سے ابھارا ہے۔ مثلاً جب رائٹرز گلڈ کے اجلاس میں صدر ایوب عام سامعین میں بیٹھے تھے اور حضرت شہاب سٹیج پر تشریف فرماتے تو اس واقعہ کو کئی مرتبہ دہرا کر اپنی "لمحاتی برتری" کو اس طرح بیان کیا ہے جیسے جتا رہے ہو کہ "دیکھا میرا کارنامہ!"

عفو اور درگذر کے اس پتلے نے جسمانی طور پر بھی کچھ لوگوں کی خوب

"تواضع" کی ہے جب قاری وہ سطور پڑھتا ہے جس میں مصنف تھپڑوں سے دوسروں کی "خاطر" کرتے ہوئے نظر آتے ہیں تو ان کے مریدوں کے وہ بیانات جن میں انہیں انکساری کا مجسمہ بنا کر پیش کیا گیا ہے' انتہائی مضحکہ خیز نظر آتے ہیں۔

ذیل میں "شہاب نامہ" سے چند اقتباسات پیش خدمت ہیں جنہیں ان کی ولایت' بزرگی' حلم' خاکساری' نرم مزاجی' عفو' درگزر' زبان کی شرافت دشمن سے حسن سلوک' پاکیزگی بیان کے تناظر میں رکھ کر دیکھئے!

"ہوسٹل کے جس کمرے میں مجھے جگہ ملی' اس میں دس بارہ سکھ لڑکے اور بھی تھے۔ سونے سے پہلے انہوں نے کپڑے اتار دیئے۔ کچھ دیر ننگے ٹہل کر جسم کو ہوا لگوائی.......... اور ٹائلٹ سے فارغ ہو کر وہ بڑی دیر تک آپس میں فحش گفتگو اور دھینگا مشتی کرتے رہے۔ دو لڑکوں نے ان کے سامنے بیٹھ کر جھٹ رسی کا مقابلہ بھی کیا۔"

(ص ۱۰۰)

سکھوں کی قطار تھی..........اور سر جھکا کر بڑے خضوع و خشوع سے برسرعام رفع حاجت فرما رہے تھے۔ جب کشتی ان کے قریب پہنچی تو چند سکھ جوان ہماری طرف منہ کر کے ننگ دھڑنگ کھڑے ہو گئے اور.......... اپنے پوشیدہ علم الابدان کی تشریح کرنے لگے.......... جب کشتی ان کے سامنے سے گزر گئی تو سکھ جوان بھی نہر کی جانب پیٹھ کر کے بیٹھ گئے اور از سرنو فطرت سے ہم کلامی میں مصروف ہو گئے۔"

(ص ۵۵)

"اس کے برعکس شیخ محمد عبداللہ سیاست کے کباڑ خانے میں بے پیندے کا لوٹے تھے۔"

(ص ۱۱۱)

"صوفے پر ہز ہائنس.......... بھینسے کی طرح اوندھے پڑے تھے۔ ان کے جسم کا گوشت پوست صوفے پر یوں بکھرا ہوا تھا جیسے گندے کپڑوں سے بھرا ہوا سوٹ کیس تیز رفتار گاڑی سے باہر گر کر پھٹ گیا ہو.......... چند عورتیں اور مرد

ان کے اعضائے رئیسہ وغیرہ کی خفی اور جلی مالش میں مصروف تھے۔ مہاراجہ کی آنکھیں کچھ کھلی کچھ بند تھیں اور ان کے کونوں میں گید گندے بیروزے کی طرح تہہ در تہہ جم رہی تھی......... ہاتھ ملانے کی اس رسم میں وہ کیفیت تھی جو مینڈک کے لجلجے پیٹ کو ہتھیلی پر رکھ کر پیدا ہوتی ہے۔"

(ص ۱۱۷)

"ان پارٹیوں میں شامل ہونے والے کئی زندہ دل لوگ ایسی خواتین کے کندھوں اور کولہوں پر ہاتھ پھیر پھیر کر ان کے لباس کے میریل کی دیر تک تعریف کرتے رہتے تھے......... اگرچہ ان کے کندھوں اور کولہوں پر دور دور تک کسی لباس کا کوئی میریل موجود نہ ہوتا تھا۔"

(ص ۲۶۷)

"آرکسٹرا بج رہا ہے......... اُس کی دھن پر ایک لڑکی آپ کے سامنے طرح طرح کے بل کھا کھا کر ناچنے لگتی ہے۔ لڑکی کی کمر اور پنڈلیاں اور بانہیں اور سینہ کھلا ہے اور اس کے باقی جسم پر باریک سا لباس ہے۔"

(ص ۵۸۶)

"آنکھوں میں گندے انڈے کی ابلی ہوئی زردی......... توند تسلے میں پڑی ہوئی باسی اوجھڑی کی طرح......... یحییٰ خان چہک چہک کر پھدک پھدک کر......... اسے بڑی آسانی سے ایک سدھا سدھایا بھاڑے کا ٹٹو بھی پاس ہی مل گیا۔ اس شخص کا نام میجر جنرل ایس جی ایم پیرزادہ تھا......... ریاکاری کے اس رندے نے اس کے چہرے پر دو (ایسی) مستقل سلوٹیں تراش رکھی تھیں......... اس کے کانوں کی لوؤں اور چہرے بشرے کے مساموں سے گھگھلک' روباہی' چکمہ سازی' حیلہ گری اور چپر چپر کا گدلا سا لعاب اس طرح رس رس کر ٹپکتا تھا جیسے چیڑ کے تنے سے لٹکے ہوئے بدھنے میں لیس دار گندہ بیروزہ قطرہ قطرہ پھسل کر گرتا ہے۔ کبھی کبھی جب وہ میرے کمرے میں داخل ہوتا تھا تو خبث باطن کا تعفن پھٹے ہوئے گٹر کی سڑانڈ کی مانند چاروں طرف پھیل جاتا تھا۔"

(ص ۱۰۲۳)

صدر کے چہرے پر ایک درشت گھری چمگادڑ کے پروں کی طرح پھیلی ہوئی تھی۔ پیرزادہ کے گالوں پر مصنوعی مسکراہٹ.......... مردار جھریوں کی طرح لٹکی ہوئی تھی.......... اس کی لٹکی ہوئی ڈھیلی ڈھالی ٹھوڑی گھوڑے کی زین کی طرح کس گئی۔"

(ص ۱۰۲۸۔ ص ۱۰۲۹)

یحییٰ خان کے وجود کی ساری نحوست اور کثافت سنڈاس کی بد رو کی طرح اس کے روئیں روئیں سے بے برکتی کی سڑانڈ چھوڑتی تھی۔"

(ص ۱۰۳۳)[۱]

"شہاب نامہ" میں جہاں کہیں خوبصورت عورت کا ذکر آیا ہے تو شہاب کے قلم میں واقعی شباب کی کیفیت پیدا ہو گئی ہے اور بے اختیار ان کے افسانوی مجموعے "ماں جی" میں شامل فحش افسانے یاد آ جاتے ہیں۔

شہاب صاحب کے کارناموں میں نمایاں کارنامہ رائٹرز گلڈ کا قیام بھی ہے۔ ایوب خان کی سرپرستی میں قائم ہونے والی اس "سرکاری" ادبی تنظیم کی روح رواں قدرت ہی تھے۔ اس حوالے سے شہاب صاحب پر بے شمار الزامات عائد کئے جاتے ہیں' بقول شخصے "رائٹرز گلڈ قائم کر کے ادیبوں کو ایوب خانی مارشل لاء کے قدموں میں لا بٹھایا۔ ادبی انعامات اور تفریحی دوروں کے سبز باغ دکھا کر ادیبوں کو حکومت کی محاسن شماری کے کام پر لگا دیا.......... اس کاروبار کا خالص منافع صرف قدرت اللہ شہاب کے حصہ میں آیا۔"

اس سلسلہ میں شہاب صاحب نے اپنی آپ بیتی میں ایک پورا باب "صدر ایوب اور ادیب" کے نام سے باندھا ہے جس میں "پاکستان رائٹرز گلڈ" کے ذیلی عنوان کے تحت بہت تفصیل کے ساتھ اس کے محرکات و مہیجات پر اظہار خیال کیا ہے۔ اگرچہ "خامہ بگوش" نے ان کے بیان صفائی کو ناقابل اعتبار قرار دے کر ان الزامات سے بری نہیں کیا' تاہم یہ باب بہت معلومات افزاء اور دلچسپ ہے۔

اس کتاب کی سب سے اہم بات جو اسے سینکڑوں کتابوں سے فائق کر دینے والی ہے' وہ ہے بیوروکریسی اور حکومت کے درون خانہ معاملات۔ ایک عام شخص چاہے وہ پڑھا لکھا بھی ہو نہیں جان سکتا کہ حکومت کے ایوانوں میں کیا ہوتا ہے؟ وہاں سیاسی جوڑ توڑ اور پالیسی

سازی کا کام کیسے وقوع پذیر ہوتا ہے؟ چونکہ شہاب صاحب ایک مانے ہوئے بیوروکریٹ تھے' حکومتی مشینری میں نہایت حساس عہدوں پر فائز رہے' اس مشین کا ایک اہم کل پرزہ تھے' گھر کے بھیدی تھے اس لئے اپنے آقاؤں کے نجی اور سرکاری رازوں سے انہوں نے خوب پردے اٹھائے ہیں۔ یہ سطور عبرت انگیز بھی ہیں اور دلچسپ بھی۔ بالخصوص گورنر جنرل غلام محمد کے زمانہ سے متعلق "محلاتی سازشوں" کو خوب بے نقاب کیا ہے۔ اس کتاب میں غلام محمد کی شخصیت نہایت مضحکہ خیز نظر آتی ہے۔ بے شک ملک غلام محمد کے خاکے کو اردو کے بہترین (بیک وقت مزاحیہ اور سنجیدہ) خاکوں میں شامل کیا جا سکتا ہے۔

خاکہ نگاری اور افسانہ نویسی۔۔ یہ دو خصوصیات فنی اعتبار سے اس کتاب پر چھائی ہوئی ہیں۔ کرم بخش' حکیم گوراندتہ مل' ماسٹر منگل سنگھ' شیخ عبداللہ' چندراوتی' یحیٰی خان' جنرل پیرزادہ' ذوالفقار علی بھٹو' ابن انشاء' اشفاق احمد' ممتاز مفتی' عفت شہاب' صوفی مشرف خان' مس روتھ بورل' بیگم ناہید مرزا' مولوی عبدالحنان......... کے خاکے یقیناً" ایسے جاندار ہیں کہ اس صنف میں بلا مبالغہ انہیں بہت اہم اضافہ قرار دیا جا سکتا ہے۔

کتاب کا آخری حصہ بھی بہت سحر زدہ کر دینے والا ہے' خصوصاً وہ بیان جب انہیں اسرائیل ایک جاسوس کے طور پر جانا پڑا......... آغا محمد یحیٰی خان کے دور میں استعفیٰ کے بعد برطانیہ میں غریب الوطنی کا زمانہ مشکلات کے پہاڑ کی منظر کشی' بیٹے اور بیوی کے ساتھ بے پناہ محبت بھی بہت دل گداز داستان ہے۔

جیسے کسی بادام میں سے دو مغز یا کسی انڈے میں سے دو زردیاں نکل آتی ہیں' اسی طرح شہاب کی دو شخصیتیں تھیں۔ اس خود نوشت سوانح حیات میں دونوں ساتھ ساتھ رواں نظر آتی ہیں۔ اس لئے یہ کتاب بھی "دوآبہ" ہے۔ شہاب صاحب نے نہایت کامیاب ' پر آسائش اور بھرپور زندگی گزاری ہے اس لئے وہ زندگی کے بارے میں قنوطی رویہ نہیں رکھتے تھے' یہی سبب ہے کہ ان کی نگاہ حیاتی کے مثبت پہلوؤں پر بھی پڑتی ہے۔ اس کتاب کا بھی یہی مثبت پہلو ہے کہ اس میں دنیا سے' زندگی سے محبت کا تعلق واضح طور پر محسوس ہوتا ہے اور اس میں وجود دلکش رنگوں کو اور نمایاں کیا ہے۔

شہاب نامہ کا ادبی مقام معمولی نہیں ہے۔ اس میں چھوٹے بڑے واقعات کو اسلوب کی ایسی رعنائی و دلکشی کے ساتھ پیش کیا ہے کہ تمام اعداد و شمار اور خشک دفتری قسم کی

معلومات بھی اس کے بہاؤ میں رکاوٹ نہیں بنتیں۔ بارہ سو صفحات سے زائد یہ تصنیف ایک مرتبہ شروع کر لی جائے تو ختم کئے بنا چھوڑی نہیں جا سکتی۔ یہ کتاب لکھ کر قدرت نے ثابت کر دیا ہے کہ اگر وہ افسانہ نگاری یا ناول نویسی کو کل وقتی کام کے طور پر اپنا لیتے تو اپنے دوستوں مفتی، بانو اور اشفاق سے بڑے فنکار تسلیم کئے جاتے۔

کوئی واقعہ ہو یا کردار باریک بینی سے ایسا تجزیہ مرتب کرتے ہیں کہ پڑھنے والا جان سکتا ہے کہ مصنف کا ذہن کس درجہ غیر معمولی، معاملہ فہم، دراک ہے اور اس کی نگاہ کتنی دور رس ہے۔

عمر کے آخری حصہ میں اپنی یادداشت کے زور پر اتنی بڑی کتاب لکھ ڈالنا اور عہد طفولیت کی ایسی جزئیات کو بیان کر دینا جو عام آدمی کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہوتیں، یقیناً عام بات نہیں ہے۔ بعض مقامات پر افسانوی اسلوب نے ایسی فنکاری سے خانہ پری کی ہے کہ ہرگز محسوس نہیں ہوتا کہ پیوند لگا ہوا ہے۔

○

# اعمال نامہ

فوزیہ چودھری

بعض نام کچھ حوالوں سے سنتے سنتے بااعتبار ہو جاتے ہیں پھر وہ ایسے معتبر ٹھہرتے ہیں کہ آنکھیں بند کر کے ان پر ایمان لایا جا سکتا ہے "بازیچہ اعمال" ایک ایسے ہی نام کا اعتبار ہے۔ لیکن اب دیکھنا یہ ہے کہ عطاء الحق قاسمی نے "بازیچہ اطفال" میں کیا "تماشا" پیش کیا ہے؟

ہمارے ہاں زیادہ تر مزاح فکاہیہ مضامین کی شکل ہی میں لکھا گیا ہے۔ اور یہ روایت خاصی پرانی اور مضبوط ہے لیکن اس سے یہ نہ سمجھ لینا چاہیے کہ اردو ادب کا تمام تر مزاحیہ سرمایہ صرف فکاہی مضامین ہی ہیں۔ مضامین کے ساتھ ساتھ کالم' ناول' افسانہ' سفرنامہ اور ڈرامہ میں بھی مزاح کے اچھے نمونے پیش کئے گئے ہیں۔ مگر یہ سب انفرادی تجربے ہیں۔

مزاح کا اتنا متنوع تجربہ ایک ساتھ ہمیں اور کہیں نظر نہیں آتا جتنا عطاء الحق قاسمی کے ہاں' "بازیچہ اعمال" کی صورت میں سامنے آیا ہے جس میں عطاء الحق قاسمی کی ادبی شخصیت کے چار مختلف رخ سامنے آئے ہیں۔

مرتب عباس تابش نے اس کتاب کو چار ابواب میں تقسیم کیا ہے۔ پہلا باب کالم نگاری' دوسرا خاکے' تیسرا سفرنامے اور چوتھا ڈرامے کو پیش کرتا ہے۔

رواں دور میں عطاء الحق قاسمی کا نام مزاح نگاری کے حوالے سے بہت معتبر ہے۔ کالم نے ان کے ہاں تخلیق کا درجہ حاصل کر لیا ہے اور اسی تخلیقی عمل نے ان کے ہاں وہ رنگ کھلائے ہیں جن سے ان کے کالموں میں افسانے سے لے کر انشائیے تک تمام اصناف کا رنگ نظر آتا ہے۔ وہ اپنے معاشرے میں جنم لینے والے تضادات کو اتنی خوبصورتی سے اپنے کالم کا موضوع بناتے ہیں کہ یہ کالم' کالم سے بڑھ کر معاصر معاشرے کے داخلی تضادات سے رونما

ہونے والی صورت حال کی ترجمانی کرنے والے استعارے بن جاتے ہیں۔ انتخاب میں شامل کالم' "الہ دین کے جن کا زوال"' "اب اور تب" اور "کچا پنکچر" مثال کے طور پر پیش کئے جا سکتے ہیں۔

کالم نگاری کے بعد عطاء الحق قاسمی کا فکری اور فنی اسلوب دراصل سفرنامے میں کھلتا ہے۔ سفرنامہ ان کے نزدیک ایک مفید صنف ادب ہے۔ جس سے اصلاح احوال کی جا سکتی ہے اس سلسلے میں ان کا اپنا کہنا ہے۔

"ہمارے سفرنامہ نگار دوست چاہتے تو اس صنف ادب سے بہت مفید کام بھی لئے جا سکتے ہیں بلکہ میں سمجھتا ہوں کہ اس سے ملک میں ایک عظیم انقلاب برپا کیا جا سکتا تھا۔ قارئین کو رومان' مزاج اور گپ شپ کی میٹھی گولیوں میں شعور اور آگہی کی "ملاوٹ" کے ذریعے وہ سب کچھ بتایا جا سکتا ہے' جو ہمارا میڈیا ان سے چھپا چھپا کر رکھتا ہے۔ ہمارا میڈیا پہلے دن سے اس ظالمانہ نظام کا محافظ ہے۔ جس نے عوام سے ان کے حقوق چھین رکھے ہیں اور وہ یہ کام بہت معمولی "کمشن" پر کرتا ہے۔ ادب سے کوئی مفید کام لینے میں کوئی حرج نہیں جو لوگ اس سے کوئی مفید کام لینے کی مخالفت کرتے ہیں وہ بھی اس سے کچھ نہ کچھ کام ضرور لیتے ہیں۔ ادب مصوری کے علاوہ فوٹو گرافی بھی ہے۔ بس دیکھنا یہ ہے کہ آپ کس زاویے سے تصویر بناتے ہیں یہ تصویر منظر کے لئے دلوں میں محبت بھی پیدا کر سکتی ہے اور اس سے دلوں میں اس منظر کے لئے نفرت بھی جنم لے سکتی ہے۔"

(روزن دیوار سے) ادبی ایڈیشن نوائے وقت ۲۴ جنوری ۹۵ء) ان کے اپنے سفر نامے اس معیار پر پورے اترتے ہیں۔ انہوں نے ہنسی ہنسی میں کمال ہنرمندی سے ان ممالک کے سیاسی و سماجی حالات کا موازنہ وطن عزیز سے کیا ہے کہ بجائے اس کے کہ قاری ان ممالک سے متاثر ہو اور اپنے ملک کے حالات سے ناپسندیدگی کا اظہار کرے' وطن کی محبت اور اصلاح احوال کا جذبہ اور زیادہ ابھرتا ہے۔ "شوق آوارگی" اور "گوروں کے دیس میں" عطا نے جس طرح امریکہ اور برطانیہ کی سیاسی' سماجی اور اخلاقی ناہمواریوں کا پول کھولا ہے اس سے وہاں کی زندگی پر تعیش نظر آنے کی بجائے پر تکلف زیادہ نظر آتی ہے اور یہی تکلف زندگی کو آسان بنانے

کی بجائے اور زیادہ جوکھم میں ڈالتا ہے۔

"دلی دور است" ایک ایسے کٹر اور محب وطن پاکستانی کی تاثراتی کہانی ہے جو اگرچہ اپنی جنم بھومی امرتسر دیکھنے جاتا ہے جہاں سے اسے صرف چار برس کی عمر میں ہجرت کرنے پر مجبور کر دیا گیا تھا۔ مگر وہاں پہنچ کر وہ کسی ایسی جذباتی صورت حال سے دو چار نہیں ہوتا کہ اسے اپنی جنم بھومی سے چھٹنے کا غم ہو بلکہ اس کی نظر میں وہ ہزاروں مائیں، بہنیں اور بیٹیاں گھوم جاتی ہیں جن کی عزتوں اور خون نے پاکستان کی بنیادوں کو لازوال بنا دیا ہے۔

سفرنامے میں اپنے انفرادی اور اجتماعی تشخص کو ابھارنے کے علاوہ عطاء الحق قاسمی کسی شخصیت کی "خاکہ کشی" میں بھی پوری طرح کامیاب ہیں۔ انتخاب میں شامل چھ خاکوں سے یہ نہ سمجھ لینا چاہیے کہ یہ عطاء الحق قاسمی کے منتخب خاکے ہیں کہ ان کے ہاں اس معیار کا مال وافر مقدار میں دستیاب ہے۔ انھیں یہ حیرت انگیز ملکہ حاصل ہے کہ یہ چند ہی لائنوں میں کسی بھی شخصیت کا کچا چھٹا کھول کر قاری کے سامنے رکھ دیتے ہیں۔

خاکہ نگاری میں عام طور پر لہجہ شگفتہ اور چھیڑ چھاڑ والا ہوتا ہے۔ ایسا کہ بات کہہ بھی دی جائے اور زیادہ محسوس نہ ہو۔ گویا ایک بے تکلفی کی فضا قائم کر کے ہی خاکہ لکھا جا سکتا ہے۔

عطاء الحق قاسمی ذاتی طور پر متحمل مزاج واقع ہوئے ہیں ان کی فطرت کا یہی تحمل، لحاظ اور حسن سلوک کا رویہ خاکہ نگاری میں ان کے بہت کام آیا۔ خصوصاً ان کے مزاح کو مزید شگفتگی دینے کا باعث بنا۔ خاکہ لکھتے ہوئے ان کے فقرے کی بامعنی کاٹ صاحب خاکہ کو بھی بدمزہ نہیں ہونے دیتی۔ "مخولیا" اس سلسلے کا خاصا بامعنی خاکہ ہے۔

خاکے، سفرنامے اور کالم کے علاوہ ڈرامہ لکھتے ہوئے بھی عطاء الحق قاسمی کے اندر کا مزاح نگار اپنی پوری فارم میں نظر آتا ہے۔ "خواجہ اینڈ سن" کے مصنف کا "آپ کا خادم" عرف "شیدا ٹلی" طنز و مزاح کا نمائندہ اور شہکار ڈرامہ ہے۔ یہ جس طرح ہمارے نام نہاد، نیم خواندہ اور مفاد پرست سیاستدانوں کو بھرے بازار میں بے نقاب کرتا ہے اس کی مثال سیاسی ڈرامہ نگاری کی تاریخ میں کم کم ہی ملتی ہے۔ یہ ڈرامہ کردار نگاری مکالمہ نگاری اور موضوعاتی اعتبار سے بہت بلند ڈرامہ ہے۔ جس میں طنز و مزاح کے رنگ نے شامل ہو کر اتنے سنجیدہ موضوع کو بھی قابل قبول بنا دیا ہے۔

"بازیچہ اعمال" عباس تابش نے مزاح کے حوالے سے مرتب کی ہے۔ کیا ہی اچھا ہوتا اگر اس انتخاب میں "ایک غیر ملکی سیاح کا سفرنامہ لاہور" کے منتخب حصے بھی شامل ہوتے۔ کیونکہ یہ مزاحیہ سفرنامہ عطاء الحق قاسمی کے مخصوص طرز تحریر اور انداز فکر کا غماز ہے۔ اس سفرنامے میں عطاء الحق قاسمی نے مزاح کے انتہائی بلند معیار کو پا لیا ہے اس میں عطاء نے دراصل ہمارے دوہرے سماجی معیار اور کرداری منافقتوں کے پردے چاک کئے ہیں۔ یہاں ان کے اسلوب کی کاٹ بہت گہری ہے۔ مگر نہ جانے عباس تابش کی نظر اس خالص مزاح پارے سے کیسے چوک گئی؟

مجموعی طور پر "بازیچہ اعمال" صاحب کتاب کی چار مختلف جہتوں کو کامیابی سے پیش کرنے کی ایک کامیاب کوشش ہے۔ جسے مرتب کے دیباچے نے اور وقیع بنا دیا ہے۔

موجودہ دور میں جب ہر چیز کی قدر و قیمت کا معیار باطنی سے زیادہ ظاہری خوبصورتی قرار پاتا ہے اور جس کے بغیر چیز کی مارکیٹ ویلیو زیرو ہو جاتی ہے۔ "بازیچہ اعمال" اس اعتبار سے بھی ایک مالدار کتاب ہے کہ یہ ظاہری اور باطنی ہر دو طرح کی صفات سے متصف ہے اس کی "مالداری" تو سرورق کی ان تیرہ کتابوں سے بھی ظاہر ہے جن کا انتخاب اندرونی صفحات پر قارئین کی آسانی کے لئے جمع کر دیا گیا ہے۔

○

نظمیں

○
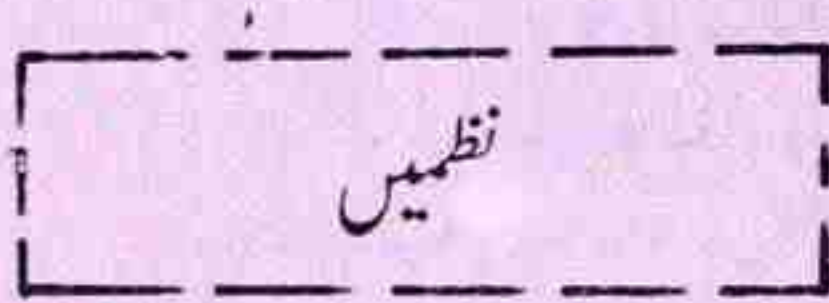
جگن ناتھ آزاد

# سپاہی

(اپنے بھرتی کرنے والوں کے نام)

مری رگوں میں تو میرے لہو کی گردش تھی
تمہارے پاس تھا کیا
ایک خوف جاں کے سوا
تمہیں یہ خوف تھا بزم طرب نہ لٹ جائے
تمہیں یہ غم تھا کہ برہم نہ ہو وہ بزم نشاط
جو موج مے پہ رواں ہے سیاہ راتوں میں
مجھے یہ ڈر تھا مری آبرو پہ حرف نہ آئے
مجھے یہ ڈر تھا کہ میرے وطن کی دھرتی پر
چمن کے پھول اسی طرح مسکراتے رہیں
وطن کے کھیت اسی طرح لہلہاتے رہیں
یہ رود بار اسی طرح گیت گاتے رہیں

مری رگوں میں تو میرے لہو کی گردش تھی
تمہارے پاس تھا کیا

اک "بڑھے چلو" کے سوا
گھسے پٹے سے کچھ الفاظ
شاعروں کا کلام
ہزار بار کی اگلی ہوئی وہ تقریریں
یہ سب فضول ہے بیکار ہے وغا کے لئے
وغا کو کچھ نہیں درکار اک لہو کے سوا
تمہارے پاس لہو تھا کہاں کہ دے سکتے
مجھے تم اپنے رگ و پے کی داستاں نہ سناؤ
لہو کہاں ہے تمہاری رگوں میں اب باقی
جبیں وقت کی تحریر کہہ رہی ہے یہی
لہو کہاں ہے تمہاری رگوں میں اب باقی
کہ ان رگوں میں رواں آب بھی شراب بھی ہے
مگر سوال یہ ہے انمیں خون ناب بھی ہے؟

تمہیں خبر بھی ہے میدان جنگ کی روداد
دل تپاں کی ہے. کوئے بتاں کی بات نہیں
یہاں نہ شعر نہ حسن بیاں کا رنگ چلے
یہاں چلے تو فقط دل چلے. امنگ چلے
فقط خلوص چلے اور بے درنگ چلے

بتاؤ ٹینک کبھی رزمگہ میں دیکھا ہے؟
کسی تفنگ کی زد میں کبھی تم آئے ہو؟
تمہارا عزم کبھی توپ سے بھی ٹکرایا؟
سوال یہ ہے کہ میدان جنگ کا نقشہ

کبھی نگاہ تصور سے ہٹ کے دیکھا ہے؟

یہ داستان مرا ہی لہو سنائے گا
کہ شعلہ شعلہ بڑھی آگ جو چمن کی طرف
یہ موج موج اٹھا اس کو روکنے کے لیے
یہ داستاں مرا ہی لہو سنائے گا
کہ جس کے چھینٹوں نے
بجھا کے آگ وہ رکھ دی جو تم پہ لپکی تھی

○

○

خاطر غزنوی

# نقش کف پا

تیرے بالوں کی صبح، گریہ کناں

شام ویراں بدن کے آنگن میں

مہکی کجلاہٹوں کے دامن میں

رنگ مرے دھواں خیالوں کا

شہر بھٹکے ہوئے سوالوں کا

درد جاگے ہوئے اجالوں کا

اپنے اپنے پڑاؤ پر تھے ہم

اپنے اپنے سفر سے درماندہ

وقت کی آندھیوں سے درماندہ

پھر جو لمحہ ملا قیامت تھا

شعلے اس کے جلا گئے مجھ کو

اب تو آنکھوں میں راکھ اڑتی ہے

راکھ تقدیر کے حوالوں کی

راکھ آتش زدہ اجالوں کی

راکھ میرے جلے ہوئے دل کی

راکھ گم کردہ راہ و منزل کی

برف باری کی رات کی چاندنی

راکھ زلفوں کی صبح صادق کی

○

انیس ناگی

# میں کہ اجنبی

یہ بدن میں میرے جو آگ تھی
مری سوچ کا جو عذاب تھا
وہ نہ خوبرو کے جمال سے
مری آرزو کا فراق تھا
نہ میں مبتلا تھا
کسی کمتری کے خیال میں
نہ تو انگری کی تھی آرزو!
میں یہ سوچتا تھا
کسی نے مجھ پہ سحر کیا تھا
کہ ہوش میری بگڑ گئی
مری نیند کیسے بکھر گئی
مرے خواب کیسے اجڑ گئے
مرا ذائقہ بھی بدل گیا
میں معالجوں کے مطب گیا
کبھی صوفیوں کے میں گھر گیا
یہی پوچھنے کے بدن میں میرے جو آگ تھی
وہ شعور تھا
یا
عذاب تھا

میری ذات کا کوئی واہمہ تھا
یا رات کا کوئی خوف تھا

مری زندگی
اسی مخمصے کے حصار میں
یوں گذر گئی
کہ میں اجنبی تھا
ہجوم میں!

○

○

بخش لائلپوری

## حق نیابت

یہ جاگیرداری
کے بدنام آوارہ کتے
یہ کم ظرف و کم کوش
عیار و شاطر
کہ بخشا گیا جن کو
ذوق گدائی
یہ روز ازل سے
بنام حکومت
زمین وطن کو
تباہ کر رہے ہیں
یوں حق نیابت
ادا کر رہے ہیں

## نماز حق

گناہوں کے تعفن خیز
دامن پر چھڑک کر
عطر کی خوشبو
لگا کر سرمئہ توحید
شاہد باز آنکھوں کے
جھروکوں میں
سجا کر سر کو دستار جہالت سے
ہمارے مولوی صاحب
خدا رکھے نماز حق
ادا کرنے چلے ہیں
خداوند دو عالم سے
دعا کرنے چلے ہیں

○

علی اکبر عباس

# گاؤں (ہائیکو)

اے بھولے بھالے چرواہے
میری بانسری ٹوٹ گئی ہے
میری بھیڑیں لیتا جا

☆

ہانک لگاتا ہے چرواہا
جیسے اسی گلی میں آ کر
بھیڑیں راستہ بھولتی ہیں

☆

گہرا نیلا آسماں
کھیت سنہرے گندم کے
پگڈنڈی کی رونق

☆

آسمان پر شام ہے
اڑتے غول پرندوں کے
دھوئیں کی ایک لکیر

☆

روز ہتھوڑے کی سنگت پر
دھونکنی آگ کا گیت سنائے
پاپی پیٹ کی آگ بجھائے

☆

بچہ دودھ کے واسطے رویا
نیلی ماں کے چہرے پر

دور کھلے مہندی کے پھول
ہو گئے جسم و جان معطر
ڈھولک پہ گیتوں کی دھن

☆

دن کے وقت منڈیر پہ کوا
شام نے وہیں دیا اک رکھا
رات وہاں دو آنکھیں تھیں

☆

تازہ تنوری روٹی میں
خوشبو رچی ہے آگ کی
آگ کو آگ بجھائے

☆

کنواں چلاتے بیل
گھنٹیوں کی آواز کے پیچھے
گھوم رہے ہیں

☆

ہرے بھرے کھیتوں کے اندر
ہوا سے باتیں کرتی جائے
اڑتی لال چڑیا

☆

ایک حسین تبسم ہے

☆

پیچھے لگی گداگر کے
کتوں کی اک ٹولی ہے
اور کتوں کے پیچھے بچے

☆

سبز درختوں کی محراب
بل کھاتی سنسان سڑک پر
گڈے میں بیٹھا اک کنبہ ،

☆

○

○

سلیم کوثر

# ہنستے ہوئے رخصت کرو مجھ کو

وہ کہتا ہے
پرندوں کی اڑانیں قطع ہوتی ہیں
تو ہونے دو
درختوں پر لکھے ناموں کی خوشبو کو دھوئیں کا زہر ڈستا ہے
تو ڈسنے دو
دکانیں کھل گئیں خوابوں کا کاروبار سستا ہے
تو رہنے دو
ہرے پتوں پہ ہریالی ذرا سی ہے
فضا میں کس قدر گہری اداسی ہے
اگر خلق خدا خاموش رہنا چاہتی ہے
ظلم سہنا چاہتی ہے
اور اگر دل میں امیدوں کی جگہ تاریکیوں کا خوف روشن ہے
تمہیں کس بات کا غم ہے تمہیں کاہے کی الجھن ہے
میں دکھ سے ٹوٹے جاتا ہوں
وہ کہتا ہے
جو لمحہ ہم سے دامن گیر ہے
اس کا کہا مانو
بدن جو کہہ رہا ہے

وہ زباں سمجھو

وہ لمحہ جو ہمیں دو مختلف سمتوں کی دوری سے اٹھا کر مرکزی نقطے پہ لے

علاوہ اس کے جو کچھ ہے زیاں سمجھو

بہت سی ان کہی باتوں سے دم گھٹنے لگا ہے

آؤ..... اس خلوت کدے کے مرکزی پھیلاؤ میں ان کو رہا کر دیں

کوئی ہل چل مچائیں اور ہنگامہ بپا کر دیں

ابھی تم کہہ رہے تھے

جس طرف دیکھو

محلے گھر گلی بازار رستے آنسوؤں اور سسکیوں سے بھر گئے ہیں

جانے کتنے لازمی کردار بے مقصد کہانی کے سفر میں مر گئے ہیں

خواب گاہوں سے ہمارے خواب سڑکوں پر نکل آئے

تماشہ کرنے والے بھی نگاہوں میں نہیں آئے

تماشہ دیکھنے والے بھی اب آنکھوں سے اوجھل ہیں

ہمارے رت جگے نیندوں سے بوجھل ہیں

درو دیوار سے الجھی ہوئی سرگوشیوں کے زخم رستے ہیں

سمے کی بھاگتی پرچھائیوں کی اوٹ میں چھپلے ہوئے سائے نئی تاریخ لکھتے ہیں

میں اس کو دیکھتا ہوں

اور نئی تاریخ کا صفحہ الٹتا ہوں

ستم کی آگ میں جلتے ہوئے جسموں کی مزدوری

ہزاروں دائروں اور سلسلوں کے درمیاں رکھی ہوئی دوری

ہمارا پیرہن صدیوں کی مجبوری

ہماری خواہشوں کے پر نہیں ہوتے

کہ ساری عمر جن کی چار دیواری کو بنتے ہیں

ہمارے گھر نہیں ہوتے
ہمارے آئینے خود اپنی ہی حیرت سے ڈرتے ہیں
ہمارے خواب
—
تعبیروں کے آنگن میں
خس و خاشاک کی صورت بکھرتے ہیں
مگر اک آس دل میں کروٹیں لیتی ہے
اک امید کی بارش میں تن من بھیگ جاتا ہے
خیال آتا ہے
دکھ... جاتی ہوئی رت کے مسافر ہیں
اسی جاتی ہوئی رت کی خزاں آباد گلیوں میں
بہار آثار آبادی کے جگنو پھیل جائیں گے
رویوں اور رسموں کے کھنڈر ہوتے ہوئے جنگل کے سناٹے
رہائی کے لئے رستہ بنائیں گے
نئے قدموں کی آہٹ سر اٹھائے گی
ہوا...... آواز کا چہرہ بنائے گی
یہی چہرہ تمہارا ہے' یہی میرا ہے' سب کا ہے
یہ لوحِ وقت پہ محفوظ کب کا ہے
میں اس کو دیکھتا ہوں
اور ایک صفحہ الٹتا ہوں
بہت نزدیک آتے فاصلوں کی دھند چھٹتی ہے
کہ جیسے درد کی زنجیر کٹتی ہے
زمانہ ایک ساعت کو ٹھہرتا ہے
پلک جھپکوں تو یہ منظر بکھرتا ہے
ہمیشہ کے لئے کب رات رہنی ہے

اسی ٹھہرے ہوئے پل میں تمہیں اک بات کہنی ہے
تم ہنستے ہو
تو کتنے بے ریا جذبوں کے عکس آواز بنتے ہیں
چلو ہنستے ہوئے رخصت کرو مجھ کو
جو چلتے ہو
تو کیسے روشنی چھنتی ہے پیروں سے
چلو چلتے ہوئے رخصت کرو مجھ کو
ابھی جس آگ میں ہم جل رہے ہیں.... آؤ.....
اور اس آگ میں جلتے ہوئے رخصت کرو مجھ کو
چلو ہنستے ہوئے رخصت کرو مجھ کو....

○

○

— گفتار خیالی

# قائد اعظمؒ کے لیے ایک نظم

نظر احساس کی گہرائیوں میں جا کے پلٹی ہے
جہاں جولانی خون جگر سے حشر برپا ہے
جہاں دیوار ماضی پر وہ چھینٹے ہیں تمنا کے
کہ جن کی سرخیوں سے آسماں سورج بناتا ہے
وہ سورج جس کی کرنیں شاعر مشرق کے خوابوں کو
وطن کا پیرہن دے کر زمیں پہ ثبت کرتی ہیں
وہ کرنیں جو ازل تا بہ ابد حلقے بناتی ہیں
عمل کے ۔۔۔۔ جذب بہم کے
وہ کرنیں جن کے حلقوں میں اجالے رقص کرتے ہیں
نگار نو کی دوشیزہ نئی تاریخ لکھتی ہے
لہو، آنسو، تمنائیں
سمٹ کر ایک پرچم میں
انوکھے زاویوں اور لہروں کا روپ پاتی ہیں
فضائیں جگمگاتی ہیں
سلامی پیش کرتے ہیں حسیں سورج کو سب جذبے
کہ جس نے جہد پیہم سے انہیں کرنوں میں ڈھالا ہے
مصائب اور ستم کی آتشیں بھٹی میں جل جل کر
فقط سونا نہیں
تعمیر کا کندن نکالا ہے

○

ناہید قمر

## نیا سال

خزاں آ کر
دریچوں میں ٹھہر جائے
تو دیواروں پر کیلنڈر بدلنے سے
بہاریں تو نہیں آتیں

## جواز

جدائی کا سبب اس نے
بتایا ہی نہیں ورنہ
مجھے یہ وہم کیوں ہوتا
کہ اس نے بے وفائی کی

## آگہی

تجھے گنوانے کا دکھ تو
اگرچہ ہے لیکن
رسوا ہے اس سے
خود اپنے گنوائے جانے کا دکھ

○

○

منصور آفاق

## لمحہ وصال کو کھوجتی لکیر

نیم تاریک گلی' رات کی پچھلی سانسیں
میرے قدموں میں مچلتے ہوئے لمبے سائے
ایک دروازے سے بہتی ہوئی روشن سی لکیر
میری بھٹکی ہوئی نظروں کی توجہ کے لیے
اپنے قامت میں بہت رد و بدل کرتی رہی
اور میں ذات کے صحرا میں کہیں کھویا ہوا
نرم بھیگی ہوئی یخ بستہ ہوا میں گم تھا
مجھ کو معلوم نہیں تھا کہ اجالے کی لکیر
اک سلگتے ہوئے جذبے کی خبر دیتی ہے

○

○

منصور آفاق

# یقین کی غیر فانی ساعت

شام کے آدھے بدن پر تھے شفق کے کچھ گراف
دن چرانے پر تلا تھا رات کا تیرہ لحاف
اور باقی تھیں نماز عصر کی کچھ ساعتیں
اپنے آنگن میں مری سارہ بھتیجی چار اور
بھاگتی پھرتی تھی جانے کیا پکڑنے کے لیے
بند مٹھی کھول کر پھر بند کر لیتی تھی وہ
میں نے پوچھا کیا پکڑتی پھر رہی ہو صحن میں
بولی کرنوں کو پکڑتی ہوں ابھی کچھ دیر میں
میرا سورج رات کے غاروں میں گم ہو جائے گا

○

منصور آفاق

# گزری ہوئی ساعتوں کا کشف

ایک کچی سڑک سبز شیشم کے پیڑوں سے ڈھانپی ہوئی
میری مانوس چاپوں کو سنتی رہی، ساتھ چلتی رہی
اور جب وقت نے دو ستمبر کے دن کا سنہری کنول
یوں اچھالا افق کی شفق جھیل میں جیسے سکہ کوئی
پھینکتا ہے فقیروں کے بے خواب و تاریک کشکول میں
میں نے سوچا کہ اس وقت تو سندھ ساگر بھی بہتا نہیں
تیرے پیروں کے، اٹھنے میں لیکن کوئی فرق آیا نہیں
اس سے ملنے کی خواہش میں جذبوں کے جلتے رہے گل کدے
اور پاکیزہ لمحوں میں گھلتی ہوئی شام کی وہ نماز وفا
جو ہزاروں مقدس زمانوں کو اپنے جلو میں لیے جگمگاتی رہے
مجھ سے کہنے لگی وقت کو ضائع کرنا گناہ کبیرہ سے بھی بڑھ کے ہے
اور لبیک میں نے کہا، رک گیا، قبلہ رو ہو کے تجدید پڑھنے لگا
میرے کانوں میں گونجی اچانک صدا، کوئی شہ رگ کے اندر سے کہنے لگا
نمازیں قضا لوٹ سکتی ہیں لیکن۔ قضا ساعتیں لوٹ سکتیں نہیں

○

# منصور ملتانی

## دائرہ

ڈوبتا ہوا سورج
اپنے پیچھے چھوڑے گا رات کی سیہ چادر
اس دہکتے گولے کی اپنی بھی ہے مجبوری
کیونکہ اس نے دنیا کے اور کتنے خطوں کو روشنی عطا کر کے
زندگی کا سرمایہ اس طرح لٹاتا ہے
تاکہ ابن آدم کو
شب کی تلخیاں ساری بھولنے کا فن آئے
شب کی تلخیاں ساری جو سکوں کے پردے میں بے کلی بڑھاتی ہیں
جن کو حسرتیں مل کر اس طرح سجاتی ہیں
جیسے دست ہستی نے اک سیاہ چادر میں
بے شمار تاروں کو ٹانکنے کی کوشش میں
پور پور زخما کر جھلملاتی آنکھوں سے
اشک کچھ گرائے ہوں
رات کی سیہ چادر کچھ اسی طرح آ کر
بستیوں کی رونق کو ڈھانپ ڈھانپ لیتی ہے
اور میری آنکھوں میں رت جگوں کے افسانے
ان ستاروں کی صورت جھلملانے لگتے ہیں
میری سوچ کے سارے بند دریوں کھلتے ہیں
جس طرح کئی چشمے
توڑ کر خیالوں کو اپنا راستہ پائیں
سوچ کے یہ سب دھارے
رات کی سیاہی میں اس طرح سے بہتے ہیں
جیسے کوئی دوشیزہ کوہسار سے اترے
اور گنگناتی ہی پاس سے گزر جائے

اس کی گنگناہٹ پر دل کھنچا چلا جائے
کچھ اسی طرح میں بھی اپنی سوچوں کے پیچھے بے بسی سے چلتا ہوں
گرتا ہوں سنبھلتا ہوں
دھندلکوں میں کچھ چہرے سامنے ابھرتے ہیں
ان کے چہرے جو شاید کھو گئے اندھیروں میں
جن کو دیکھ کر مجھ کو
دکھ ستانے لگتے ہیں
اپنی عمر رفتہ کے صدمے جاگ اٹھتے ہیں
اور ان کی مجبوری آگ ہی لگاتی ہے
جس میں جان و دل میرے دیر تک تڑپتے ہیں
بجھتے اور جلتے ہیں
پھر کچھ ایسا ہوتا ہے
رات کی سیہ چادر کے کسی بھی کونے سے
چاند اک نکلتا ہے اور چاندنی اس کی
سوچ کے اندھیروں میں روشنی کی لہروں سے
راستہ بناتی ہے
اک امنگ جینے کی ساتھ لے کے آتی ہے
آئینے امیدوں کے جگمگانے لگتے ہیں
آنے والے سورج کا انتظار کرتا ہوں
شب گزار لیتا ہوں
اور سحر کے دامن میں جب صبا بکھرتی ہے
خواہشوں کی سب کلیاں مسکرانے لگتی ہیں
تب خیال آتا ہے
میں نے کچھ نہیں کھویا
میں ابھی تو زندہ ہوں
جس کے پر سلامت ہیں
ایسا اک پرندہ ہوں میں ابھی تو زندہ ہوں

○

○

مبین مرزا

# سمندر گیت گاتا ہے

پرندے شام کا
جب سرخ آنچل تھام کر
اپنے گھروں کو لوٹتے ہیں......
اور جب...... آفاق کی بے انت سمتوں میں
ہوائیں خواب بکھرانے نکلتی ہیں.......
......تو ایسے میں..... سمندر گیت گاتا ہے!!

سمندر اپنی موجوں کی روانی میں
نجانے کتنے گم گشتہ زمانوں کی
نجانے کتنے......
......غرق آب ہونے والے.......
لوگوں کی، جزیروں اور جہانوں کی
نہ لکھی جانے والی داستاں ہم کو سناتا ہے
یونہی کچھ گنگناتے گنگناتے ........
وہ اچانک دور سناٹوں میں کھو جاتا ہے
لیکن یہ کسی کو کیا پتہ اپنی حدوں کی آخری منزل پہ جا کر.......
......وہ بھلا کیا سوچتا ہے.......!؟
اور اپنے ساحلوں کی ریت میں کھوئے ہوئے لمحوں کی.......
اور آواز دینے والی یادوں کی...... بھلا کیا کیا نشانی ڈھونڈتا ہے!؟؟
اور ہمیشہ کی طرح..... تھک ہار کر آخر.......
وہ پھر اپنی روانی کی طرف ہی لوٹ آتا ہے.......

خروشِ ذات کا یہ دکھ اٹھا کر وہ کبھی آنسو بہاتا ہے!
مگر پھر مسکراتا ہے!!

سمندر اک قیامت ظرف رکھتا ہے
کبھی وہ بھول کر بھی تو..........
ہواؤں اور موسم کو
چٹانوں اور جزیروں کو (جو اس کے دوست ہیں)
اپنا کوئی دکھ بھی نہیں بتلاتا.........
وہ یہ جانتا ہے.........
کربِ ہستی ہو کہ وہ کربِ تمنا ہو!!.......!
کبھی لفظوں کی صورت میں نہیں ڈھلتا.......!
کسی کو بھی بتایا جا نہیں سکتا! کسی کو بھی سنایا جا نہیں سکتا!
اسے معلوم ہے!
اس کا وجود اک استعارہ ہے
ابد کے پار اترنے والی دوری کا......
کہ جو اک بھید ہے اس ساری دنیا میں......
......اسی بے پردہ مجبوری کا!!
اور تادیر زندہ رہنے والے اس طلسمِ جذبہ و دل کی
سراسر سادگی کا اور رنجوری کا!!
رہ رہ کر ہمارے جسم و جاں میں گونجنے والی
صداؤں اور ہواؤں کا!!..............!!
سمندر جانتا ہے........وہ کنایہ ہے!
دلِ ہستی میں پیہم دوڑنے والے لہو کا......
جو بالآخر سرد ہو کر رزقِ خاک و آب بنتا ہے

سمندر سوچتا ہے اور ہوا کی انگلی تھامے سرسراتا ہے!
مگر پھر مسکراتا ہے!!
سمندر گیت گاتا ہے!!!

○

○

میر تنہا یوسفی

# اک اور کاغذ

یہی ٹھہرا
کہ پت جھڑ کو ترے آنگن میں لمبی رات رہنا ہے
یہی ٹھہرا
کہ تیرے کھیت بھوکی دیمکوں کی بھینٹ چڑھ جائیں
یہی ٹھہرا
کہ تیرے بادلوں کو غم کا صحرا چوس کے رکھ دے
یہی ٹھہرا
کہ تیرے چاند سورج اور تارے اجنبی گلیوں میں گہنائیں
یہی ٹھہرا
کہ تیرا' خوں پسینہ کاغذوں کا رزق ہو جائے
یہی ٹھہرا
کہ تیرے جوگیوں کو اپنے کاسے کاغذوں سے بھر کے لانے ہیں
مگر کاسے
نہیں بھرتے

○

○

ساجدہ فرحت

## بلا معذرت

---

بندہ پرور!
یہ بجا ہے تو نے
مجھے چاہا ہے، سراہا ہے
عنایت عنایت!!
تیرے میزان وفا سے لیکن
اٹھ چکا میرا یقیں
تیرے ہر کھیل میں چلتے ہیں اصول اور ضوابط تیرے
عہد نامہ جو تیرے ہاتھ میں ہے
وضع کردہ ہیں شرائط اس کی
(حسب دستور) تیری اپنی تمام
اس کی ہر شق سے ہے وابستہ فقط تیرا مفاد
دستخط اس پہ میں کس طرح کروں
اپنی گردن پہ چھری رکھ کے بھلا کیسے بیٹھوں
اب مجھے تیرے کسی کھیل، کسی ناٹک میں
کوئی کردار کسی طور بھی منظور نہیں!

○

فرخ چودھری

# وصال رت کا سفر

سنو! یہ وقت بچھڑنے کا تو نہیں جاناں
خبر نہیں کسی کو کہ اس کے جیون کی
مسافرت کے شب و روز کتنے باقی ہیں
کسے خبر ہے
کہ دیکھا ہے اپنا کل کس نے
یہی گھڑی ہے من و تو کے درمیاں، جس میں
محبتوں کو ملے گا پھر اعتبار نظر
شروع ہونے کو ہے پھر وصال رت کا سفر
گلاب آنے کو ہیں شاخچوں پہ بار دگر
سو آؤ! اپنی دعا میں زر رفاقت کے
سوا نہ اور کسی کا بھی ساتھ ہم مانگیں
کبھی جو مانگیں تو اپنا ہی ہاتھ ہم مانگیں

○

نشتر نوید

## گریز

ذکر احوال موسم دوراں
وقت رفتار روز و ماہ و سال
حادثات غم جہاں کتنا
خوش تعلق نشاط قلب و نظر
ہم نفس سایہ وجود میں قید
سال و سن کو کمال دیتے تھے

روح سے منسلک کوئی جذبہ
زندگی کے گداز لمحوں سا
خفتہ احساس شیریں خوابیدہ
شاخ تن پہ ابھرتا کوئی گلاب
ذات کی جھیل پہ لرزتا حباب
بات پہنچے فسوں کی خواہش تک
رشتہ جاں جنوں کی خواہش تک

ہم نفس سایہ وجود میں قید
ان کہی گفتگو کے پردے میں
خود کو لفظوں میں ڈھال دیتے تھے
اب عجب احتیاط سے دونوں
دل کی باتوں کو ٹال دیتے تھے۔

○

○

عامر سہیل

# ایک کڑی پھر گم ہے

جن آنکھوں نے میری خاطر
جگراتے کے سوت سے
اپنی نرم ملائم کاسنی نیندیں کات کے
زندہ صبحوں کے ریشم کا اک اک
تار بنا تھا۔۔۔
وہ آنکھیں جب لحد میں اتریں
میں چپ تھا
جو پیشانی بے سایہ پچھلے پہروں میں
میری خاطر سجدہ ریز تھی
اب اس پر مٹی نے دیپ جلائے ہیں
جن ہونٹوں نے میری ناسمجھی کے
زہر کو قطرہ قطرہ چکھا
اب وہ خود نیلے ہیں
شام ہوئی ہے
چاند کی پھانکل میں

کرنوں کی اک اک بوند پرائی ہے
تنہائی ہے
وہ بانہیں جو مشعل تھیں
اب سرد پڑی ہیں
سوچ رہا ہوں
بے سایہ پیڑوں میں اٹھ کر
کون تمہید پڑھے گا میرے قصے کی
ایک کڑی پھر گم ہے باقی قصے کی!

○

○

عامر سہیل

# میرے خواب چاک کے پھیر میں

تو ہزار سمت سے منکشف
میں چہار سو کے گمان میں

تو فرازِ عرش پہ منتظر
میں ازل ابد کی تھکان میں

میرے خواب چاک کے پھیر میں
میرے ہونٹ کانچ کے ڈھیر میں

میرا جسم شاخِ ببول پہ
میں نشیبِ غم کی اذان میں

میرا ہجر تیرے ہی دھیان میں
میرا وصل تیری کمان میں

میرے ساحلوں پہ سفر بچھا
میرے پانیوں کو وصول کر

کہ صلیب وقت پہ جھول کر
تیری سمت نکلا ہوں بھول کر

میرا جسم شاخ ببول ہے
میری آنکھ روضۂ رسول ہے

○

عامر سہیل

# ہجر کے نواح میں

وصل ہے اور ہم گزارتے ہیں
ایک وہ عمر جس کے پیچھے ہے
کوئی موسم ٹھہر نہیں پاتا
وصل ہے اور وصل بھی ایسا
جس کی ہجراں نواز باراں میں
نیند رکھی گئی قرینے سے
شام اٹھتی نہیں ہے زینے سے

محمد اشرف چوہدری

# ناشتہ

میرے ناشتے میں اکثر
قتل و غارت
اغوا
ڈکیتی
زیادتی
حبس بے جا
لوٹ کھسوٹ
دھوکہ دہی
اور
رشوت جیسے لوازمات شامل ہیں
ڈاکٹر کی اس تسلی پر
کہ
مجموعی طور پر
میرے جسم کی کیفیت پر امن اور تسلی بخش ہے
اس کا استعمال جاری ہے

○

محمد اشرف چوہدری

# یا پھر

مٹی کے گھروندوں کے گرد
بند باندھ کر
پانی کے طوفان سے
تو ان کو بچایا جا سکتا ہے
مگر
محبت کے طوفانی جذبات کو
کوئی بھی آہنی دیوار
دل کے اندر جانے سے
روک نہیں سکتی ــــ اور
جذبات کا یہ طوفان
دل کو امر بنا دے گا
یا پھر
جلا کر اس کو خاکستر کر دے گا

○

امجد اسلام امجد

## ہوا برد

مرے ہم سفر

مرے جسم و جاں کے تمام رشتوں سے معتبر، مرے ہم سفر

تجھے یاد ہیں! تجھے یاد ہیں!

وہ جو قربتوں کے سرور میں

تری آرزو کے حصار میں

مری خواہشوں کے وفور میں

کئی ذائقے تھے گھلے ہوئے

در گلستاں سے بہار تک

وہ جو راستے تھے، کھلے ہوئے!

تجھے یاد ہیں

سر لوح جاں

کسی اجنبی سی زبان کے

وہ جو خوشنما سے حروف تھے!

وہ جو آگہی کے بغیر بھی

دل مدعا کا بیان تھے

مری آرزو کا جہان تھے!

وہ جو سرخوشی کا غبار سا تھا چار سو

وہیں ایک دوجے کے روبرو

ہمیں روشنی کی نظر ملی

ہمیں روشنی کی نظر ملی تو جو ریزہ ریزہ سے عکس تھے

وہ بہم ہوئے

وہ بہم ہوئے تو خبر ملی
کہ جو آگ سی ہے شرر فشاں مری خاک میں
اسی آگ کا
کوئی ان بجھا سا نشان ہے، تری خاک میں!
اسی خاکداں میں وہ خواب ہے
جسے شکل دینے کے واسطے
یہ جو شش جہات کا کھیل ہے یہ رواں ہوا
اسی روشنی سے "مکاں بنا" اسی روشنی سے "زماں" ہوا
یہ جو ہر گماں کا یقین ہے
وہ جو ہر یقیں کا گمان تھا
اسی داستاں کا بیان تھا

کسی دھیان کے کسی طاق پر ہے دھرا ہوا
وہ جو ایک رشتہ درد تھا
مرے نام کا تیرے نام سے
تری صبح کا مری شام سے،
سر رہگزر ہے پڑا ہوا
سر رہگزر ہے پڑا ہوا وہی خواب جاں
جسے اپنی آنکھوں سے دیکھ لینے کے واسطے
کئی لاکھ تاروں کی سیڑھیوں سے اتر کے آتی تھی کہکشاں،
سر آسماں
کسی ابر پارے کی اوٹ سے
اسے چاند تکتا تھا رات بھر
مرے ہم سفر

اسی رخت غم کو سمیٹتے
اسی خواب جاں کو سنبھالتے
مرے راستے، کئی راستوں میں الجھ گئے
وہ چراغ جو مرے ساتھ ساتھ تھے، بجھ گئے
وہ جو منزلیں
کسی اور منزل بے نشاں کے غبار راہ میں کھو گئیں
(کئی وسوسوں کے فشار میں شب انتظار سی ہو گئیں)
وہ طناب دل جو اکھڑ گئی
وہ خیام جاں جو اجڑ گئے
وہ سفیر تھے، اسی داستان حیات کے
جو ورق ورق تھی بھری ہوئی
مرے شوق سے ترے روپ سے
کہیں چھاؤں سے، کہیں دھوپ سے

مرے ہم سفر، تجھے کیا خبر!
یہ جو وقت ہے کسی دھوپ چھاؤں کے کھیل سا
اسے دیکھتے، اسے جھیلتے
مری آنکھ گرد سے اٹ گئی
مرے خواب ریت میں کھو گئے
مرے ہاتھ برف سے ہو گئے
مرے بے خبر، ترے نام پر
وہ جو پھول کھلتے تھے ہونٹ پر
وہ جو دیپ جلتے تھے بام پر،
وہ نہیں رہے

وہ نہیں رہے کہ جو ایک ربط تھا درمیاں وہ بکھر گیا
وہ ہوا چلی
کسی شام ایسی ہوا چلی
کہ جو برگ تھے سرِ شاخِ جاں، وہ گرا دیئے
وہ جو حرف درج تھے ریت پر، وہ اڑا دیئے
وہ جو راستوں کا یقین تھے
وہ جو منزلوں کے امین تھے
وہ نشانِ پا بھی مٹا دیئے!
مرے ہم سفر، ہے وہی سفر
مگر ایک موڑ کے فرق سے
ترے ہاتھ سے مرے ہاتھ تک
وہ جو ہات بھر کا تھا فاصلہ
کئی موسموں میں بدل گیا
اسے ناپتے، اسے کاٹتے
مرا سارا وقت نکل گیا
تو مرے سفر کا شریک ہے
میں ترے سفر کا شریک ہوں
یہ جو درمیاں سے نکل گیا
اسی فاصلے کے شمار میں
اسی بے یقیں سے غبار میں
اسی رہگزر کے حصار میں
ترا راستہ کوئی اور ہے
مرا راستہ کوئی اور ہے۔

○

○

امجد اسلام امجد

# دل کے آتشدان میں شب بھر

دل کے آتشدان میں شب بھر
کیسے کیسے غم جلتے ہیں!
نیند بھرا سناٹا جس دم
بستی کی ایک ایک گلی میں
کھڑکی کھڑکی تھم جاتا ہے
دیواروں پر درد کا کہرا جم جاتا ہے
رستہ تکنے والی آنکھیں اور قندیلیں بجھ جاتی ہیں
تو اس لمحے،
تیری یاد کا ایندھن بن کر
شعلہ شعلہ ہم جلتے ہیں
دوری کے موسم جلتے ہیں

تم کیا جانو،
قطرہ قطرہ دل میں اترتی اور پگھلتی
رات کی صحبت کیا ہوتی ہے!
"آنکھیں سارے خواب بجھادیں
چہرے اپنے نقش گنوادیں
اور آئینے عکس بھلادیں"

ایسے میں امید کی وحشت
درد کی صورت کیا ہوتی ہے!

ایسی تیز ہوا میں پیارے،
بڑے بڑے منہ زور دیئے بھی کم جلتے ہیں
لیکن پھر بھی ہم جلتے ہیں
ہم جلتے ہیں اور ہمارے ساتھ تمہارے غم جلتے ہیں
دل کے آتشدان میں شب بھر
تیری یاد کا ایندھن بن کر
ہم جلتے ہیں

○

امجد اسلام امجد

## ایک عجیب خیال

کسی پرواز کے دوران اگر
اک نظر ڈالیں جو کھڑکی سے ادھر
دور۔۔ تا حد نگہ
ایک بے کیف سی یکسانی میں ڈوبے منظر
محو افسوس نظر آتے ہیں
کسی انجان سے نشے میں بھٹکتے بادل
اور پھر ان کے تلے
بحر و بر' کوہ و بیابان و دمن
جیسے مدہوش نظر آتے ہیں
شہر خاموش نظر آتے ہیں

شہر خاموش نظر آتے ہیں لیکن ان میں
سینکڑوں سڑکیں' ہزاروں ہی گلی کوچے ہیں
اور مکاں...... ایک دوجے سے جڑے
ایسے محتاط کھڑے ہیں جیسے
ہاتھ چھوٹا تو ابھی
گر کے ٹوٹیں گے' بکھر جائیں گے!!
اس قدر دور سے کچھ کہنا ذرا مشکل ہے
ان مکانوں میں' گلی کوچوں' گذرگاہوں میں
یہ جو کچھ کیڑے مکوڑے سے نظر آتے ہیں

کہیں انساں تو نہیں!!!

وہی انساں جو تکبر کے صنم خانے میں
ناخدا اور خدا، آپ ہی بن جاتا ہے
پاؤں اس طرح سر فرش زمیں رکھتا ہے
وہی خالق ہے ہر اک شے کا، وہی داتا ہے
اس سے اب کون کہے
اے سر خاک فنا رینگنے والے کیڑے!
یہ جو مستی ہے تجھے ہستی کی
اپنی وحشت سے بھری بستی کی
اس بلندی سے کبھی آن کے دیکھے تو کھلے
کیسی حالت ہے تری پستی کی

اور پھر اس کی طرف دیکھ کہ جو
ہے زمانوں کا، جہانوں کا خدا
خالق ارض و سما، حی و صمد
جس کے دروازے پہ رہتے ہیں کھڑے
مثل دربان، ازل اور ابد
جس کی رفعت کا ٹھکانہ ہے، نہ حد

اور پھر سوچ اگر
وہ بھی دیکھے تجھے!!!

خصوصی مطالعہ

# منو بھائی

احمد ندیم قاسمی

منو بھائی کی مزاح نویسی' طنز نگاری' شاعری اور شخصیت کے بارے میں احباب بہت کچھ ارشاد فرما چکے ہیں۔ میں ان کی باتیں دہرانے کی بجائے صرف یہ کہنے پر اکتفا کروں گا کہ منو بھائی ادب و صحافت میں یادگار اضافے کرنے والے اس معزز قبیلے کا ایک اہم فرد ہے جس کی قلمی کاوشیں ہماری تاریخ اور تہذیب کا ایک ناگزیر حصہ ہیں۔ یہ قبیلہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کی ناکامی کے رد عمل میں صورت پذیر ہونا شروع ہوا۔ اس قبیلے کے سربراہ سر سید احمد خاں ہیں جنہوں نے ہماری تاریخ کے ایک نازک وقت میں نہایت تدبر اور اعتدال اور فراست سے ایک شکست خوردہ قوم کی رہنمائی کی اور یاد رہے کہ سر سید بیک وقت ادیب اور صحافی تھے' یا یوں کہہ لیجئے کہ انہوں نے ادبی صحافت کا آغاز کیا۔ ان کے بعد ہمارے سامنے ایسے زعماء کی ایک سر بر آوردہ قطار ہے جنہوں نے اپنے ادب کے زور سے ایسی معیاری صحافت کو رواج دیا جس کے وارثوں میں ہمارا منو بھائی نہایت نمایاں مقام رکھتا ہے۔ میں ان زعماء میں سے صرف چند ناموں کا ذکر کروں گا ورنہ یہ فہرست بہت طویل ہے۔

مولانا محمد علی جوہر ہماری تاریخ آزادی کی ایک اہم شخصیت تھے۔ وہ شاعر بھی تھے اور صحافی بھی تھے۔ وہ مسلمانوں کی بیسویں صدی کی ربع اول کی سیاست کا ایک غیر فانی کردار تھے۔ پھر مولانا ابوالکلام آزاد تھے جنہوں نے الہلال اور ابلاغ کے ذریعے ادب اور صحافت کو یکجان کر دیا۔ مولانا حسرت موہانی نے شاعری' ادب اور صحافت کے درمیان ایسا تعاون پیدا کیا کہ ان کی استقامت ہماری تاریخ کا ایک معجزہ قرار پاتی ہے۔ انہوں نے سیاست میں ایک

نڈر اور بے باک رہنما اور صحافت میں ایک مستقل مزاج اور محنت کش صحافی کی حیثیت سے ناموری حاصل کی۔ ان کے ساتھ ہی مولانا ظفر علی خان ہیں جنہوں نے ادب اور صحافت' شاعری اور سیاست کو باہم آمیخت کر کے ایک ایسا طرز زندگی اختیار کیا جو آج کے ان صحافیوں کا منشور قرار پا سکتا ہے جو صحافی کے علاوہ شاعر اور ادیب بھی ہیں۔ پھر مولانا عبدالمجید سالک ہیں' مولانا غلام رسول مہر ہیں' خواجہ حسن نظامی ہیں' مولانا چراغ حسن حسرت ہیں' ابن انشاء ہیں اور یہ سب وہ لوگ ہیں جنہوں نے ادب و صحافت کے درمیان کھنچے ہوئے خط امتیاز کو مٹا دیا۔ آج عطاء الحق قاسمی اور منو بھائی انہی کی روایت کا پرچم بلند کئے ہوئے ہیں۔ ہمارا منو بھائی اصلاً" ایک شاعر ہے اور ہم سب جانتے ہیں کہ اس کی شاعری پڑھنے سننے والوں کے دلوں کی تہوں میں اتر جاتی ہے مگر اس شاعر نے صحافت میں ایک ایسا اسلوب وضع کیا ہے جو سراسر اس کا اپنا ہے اور جس نے ہمارے اردو اخباروں کے فکاہیہ کالموں کو ہماری ادبی تاریخ کے ایک منفرد اور مستقل باب کا مستحق بنا دیا ہے۔

میں نے ادیب صحافیوں یا صحافی ادیبوں کا یہ طویل ذکر منو بھائی پر یہ نکتہ واضح کرنے کے لئے کیا ہے کہ تم محض کالم نگار نہیں ہو۔ تم تو گذشتہ ڈیڑھ صدی کی ادیبانہ صحافت کی عظیم روایت کے وارث ہو۔ تم صرف اخباری کالم نہیں لکھتے' تم بیسویں صدی کے نصف آخر کی تہذیبی تاریخ مرتب کر رہے ہو۔ تمہارے اخباری کالم ہماری قوم کے شعور و دانش کا سرمایہ ہیں۔ تم بیک وقت فن کار بھی ہو اور صحافی بھی اور اسی لئے میں دعوے سے کہتا ہوں کہ تمہارے فن نے صحافت سے اور تمہاری صحافت نے فن سے روشنی حاصل کی ہے اور اسی لئے تم نے جو کچھ لکھا ہے وہ بے مثال ہے۔

○

# ایک اور بزرگ کی آمد!

عطاء الحق قاسمی

مجھے بہت افسوس ہوتا ہے جب مجھے پتہ چلتا ہے کہ کوئی شریف آدمی ساٹھ ستر سال کا ہو گیا ہے کیونکہ ساٹھ ستر سال کی عمر میں اسے لوگ واقعی شریف آدمی سمجھنے لگتے ہیں۔ اورئینٹل کالج میں ہمارے ایک پروفیسر تھے جو ساٹھ کے پیٹے میں تھے' ہماری کلاس میں لڑکیوں کی تعداد زیادہ تھی اور پروفیسر صاحب خضاب لگا کے آتے تھے اور یوں انہیں حق پہنچتا تھا کہ وہ اپنی طالبات کو بیٹیاں کہنے کی بجائے "بہنیں" کہہ کر پکاریں۔ سو وہ طلبہ کو ڈانٹ ڈپٹ کے دوران طالبات کی طرف اشارہ کر کے کہتے "کچھ شرم کرو' یہاں میری بہنیں بیٹھی ہوئی ہیں" ایک روز جب انہوں نے یہی جملہ دہرایا تو پچھلی بنچوں سے ایک دل جلے کی آواز آئی" سر! اگر یہ آپ کی بہنیں ہیں تو پھر ہماری تو یہ پھوپھیاں ہوئیں" دوستو' عمر کا یہ جو مرحلہ ہے' دل زدوں پر بہت بھاری ثابت ہوتا ہے کہ ظالم سامراج ان سے سارے حقوق چھیننے کی کوشش کرتا ہے حتیٰ کہ وہ اگر کسی کو "بہن" بھی کہنا چاہیں تو اس میں سے بھی عجیب و غریب نکتے نکالنے لگتا ہے اور صد افسوس کہ اس میں کامیاب بھی ہو جاتا ہے۔

مجھے جب مظفر محمد علی اور اظہر زمان نے فون پر بتایا کہ منو بھائی خیر سے باسٹھ برس کے ہو گئے ہیں تو مجھے بڑا غصہ آیا کیونکہ اب انہیں بھی شریف آدمی سمجھنا پڑے گا' میرے دوستوں میں پہلے ہی بہت سے شرفاء جمع ہو گئے ہیں جن کی وجہ سے یہ "شیدا" خود کو جنٹری میں پھنسا ہوا محسوس کرتا ہے۔ ہمارے ہاں شریف آدمی کی نشانی یہ ہے کہ وہ کسی رگڑے جھگڑے میں نہیں پڑتا' اگر اس کے سامنے کوئی طاقتور کسی کمزور آدمی کو بہت بے دردی سے پیٹ رہا ہو تو وہ کان لپیٹ کر پاس سے گزر جاتا ہے کہ ایسے مواقع پر شرفاء کا یہی وتیرہ ہوتا ہے۔ اگر کوئی

آمر، جمہور کا گلا دبا رہا ہو تو بھی شریف آدمی ایسے موقع پر خاموش رہتا ہے۔ مہنگائی کے ہاتھوں فاقوں کی نوبت بھی آ رہی ہو تو شریف آدمی نہار منہ خلال کرتا نظر آتا ہے۔ غرضیکہ شریف آدمی بہت دل گردے کا مالک ہوتا ہے جب کہ منو بھائی ایسے معاملات میں خاصا تھڑدلا واقع ہوا ہے، ڈیڑھ پسلی کا آدمی ہے لیکن ظالم کی کلائی مروڑنے سے باز نہیں آتا خواہ اس کوشش میں اپنی کلائی کیوں نہ نکل جائے۔ ماڑے ماڑے لوگوں پر کالم لکھتا ہے اور ڈھاڈھے ڈھاڈھے بندوں کو لتاڑنے میں لگا رہتا ہے چنانچہ مجھے ڈر ہے کہ منو بھائی کا شمار بھی اگر شرفاء میں ہونے لگا تو دکانوں، ورکشاپوں اور فیکٹریوں میں کام کرنے والے "چھوٹوں" کا کیا بنے گا؟

منو بھائی خیر سے ترقی پسند بھی ہے۔ حبیب جالب نے کہا تھا

دنیا کا جن کو درد ہے معدودے چند ہیں
باقی تمام اپنی ترقی پسند ہیں

سو منو بھائی کو جس طرح شریف بننا نہیں آیا، اسی طرح اسے ترقی پسندی کرنی بھی نہیں آئی۔ دس مرلے کے گھر میں رہتا ہے جس میں سب سے قیمتی چیز وہ خود اور اس کے بیوی بچے ہیں جو نجانے کب سے اس کے دلاسوں پر بہلتے چلے آ رہے ہیں۔ اس کا کوئی ڈرامہ ایسا نہیں جس میں گم شدہ قدروں کی تلاش نہ ہو، جس میں پسے ہوئے لوگوں کی زندگی نہ دکھائی گئی ہو اور جس میں امید کی کرن نہ ہو۔ خصوصاً منو بھائی کے لانگ پلے اس کی سوچ کے بہترین نمائندے ہیں۔ میں نے ترقی پسند ادیبوں میں پسے ہوئے طبقوں کے لئے جنوئن درد مندی سب سے زیادہ احمد ندیم قاسمی اور منو بھائی میں دیکھی ہے۔ سو یار لوگ انہی کی ترقی پسندی میں کیڑے نکالتے ہیں۔

چند ماہ پیشتر میں نے ایک کم سن فیڈرل سیکرٹری سے کہا "آپ نے ماشاء اللہ اتنی کم عمری میں وہ کچھ کر دکھایا ہو لوگ عموماً بڑھاپے میں کرنے میں کامیاب ہوتے ہیں" فیڈرل سیکرٹری اس داد سے خوش ہوا تاہم اس نے پوچھا "کیا مطلب؟" میں نے کہا "چالیس سال کی عمر تک انسان کے کچھ آدرش ہوتے ہیں، کچھ خواب ہوتے ہیں جن کی تکمیل کے لئے وہ کچھ نہ کچھ کرتا رہتا ہے۔ پر جوں جوں اس کی عمر میں اضافہ ہوتا ہے، وہ مصلحت پسند ہوتا چلا جاتا ہے حتیٰ کہ بے غیرت ہو جاتا ہے۔ آپ نے ماشاء اللہ اسی عمر میں بڑھاپے کی منزلیں بھی طے کر لیں۔ سبحان اللہ، کیا کہنے!" منو بھائی اور ان کے مرشد احمد ندیم قاسمی جانے کس مٹی کے بنے ہوئے

ہیں کہ ان کی بزرگی بھی ان کے آدرشوں اور خوابوں کا کچھ نہیں بگاڑ سکی بلکہ یہ اپنے رویے میں پختہ سے پختہ تر ہوتے چلے جا رہے ہیں اللہ تعالیٰ ان کے حال پر رحم کرے!

خواتین و حضرات! میں اپنے اس مختصر سے پیپر میں منو بھائی کو دو مرتبہ بزرگ کہہ چکا ہوں، مجھے ڈر ہے کہ اگر تیسری دفعہ بھی یہ لفظ میرے منہ سے نکل گیا تو منو بھائی نے تمام پروٹوکول بھول کر اسٹیج ہی سے مجھے "ت... ت... ت تیری میں..." اور میں نہیں چاہتا کہ ایسا ہو کیونکہ محفل میں میری بہنیں بھی بیٹھی ہوئی ہیں، لہٰذا آپ سے اجازت چاہتا ہوں!

○

بشکریہ
مسرت ٹیکسٹائل ملز

○

## سید ضمیر جعفری اسلام آباد

عزیزم عطاء الحق قاسمی!--- پیار بھری دعائیں!

آپ سے اور امجد اسلام امجد جیسے ادبی "قطب میناروں" کو عزیزم کہتے ہوئے مجھے وہی سرور آتا ہے جو ہمارے ایک دیرینہ محب سردار محمد عظیم کو اپنے دو بیٹوں کو بیک وقت لیفٹیننٹ جنرل کے رینک پر فائز دیکھ کر آیا تھا۔ آپ تو ادب کے چار اسٹار جرنیل ہیں۔

"معاصر" کا تازہ شمارہ موصول ہوا تو ایک "مبہوت کن" مگر بے حد خوش آئند سرشاری کی کیفیت طاری ہو گئی۔ سبحان اللہ کیسی تجلّی اور ساونت اور غلغلہ (بلکہ تہلکہ) آفریں ادبی دستاویز آپ نے مرتب کر دی۔ مگر خیر اس پر ایسی حیرت بھی نہ ہونی چاہیے کہ آپ دونوں کی "جڑواں ذہانتیں" --- ہمارے ملک کے "ادبی دو آبے" میں "دریائے سندھ اور دریائے نیل" کے سنگم کی حیثیت بھی تو رکھتی ہیں۔

○

## نعیم صدیقی۔ لاہور

برادرم عطاء الحق قاسمی زید ظرافتہ' و طرافتہ

السلام علیکم و رحمتہ اللہ'

"معاصر" کا تازہ شمارہ پا کر جی خوش ہو گیا۔ اتنا دلکش اور پر کشش تحفہ جس کا طشت ہیروں جیسے الفاظ کا ایک ڈھیر ہے--- پھول بھی ہیں' انگارے بھی' شعر و ادب کے قفس میں بند بجلیاں بھی' اس لطف خاص کا شکریہ ادا کرنے کے لئے آپ نے معاصر کے دائرہ سے باہر ایسے لفظ چھوڑے ہی کہاں ہیں کہ جواباً آپ کو لکھوں۔ قلم' قلم بجز رقم ہو گیا ہے ویسے اس معنی میں رقم کے علاوہ اپنے پاس اور رقم کہاں کہ ان کو معاصر پر نچھاور کر دوں۔

مزید شکریہ اور داد اس بات کے لئے کہ آپ نے اپنے اس عظیم و وقیع شمارے کو "آلہ جنگ" نہیں بننے دیا' ورنہ آپ اگر ایک سل یا چٹان بھیج دیتے تو وہ کسی نہ کسی وقت فوج داری کا سبب بن سکتی تھی۔ اس میں آپ کا ایک خاص فائدہ بھی ہے کہ معاصر بڑا ہے مگر

عطاء الحق قاسمی کا قد اس کی وجہ سے اور بڑھ گیا ہے۔ لیکن اگر جسم اور ضخامت میں ذرا اور مبالغہ کرتے تو معاصر کے سامنے آپ ٹھگنے (تکلف برطرف) رہ جاتے۔

آپ سے میرے قرب کا ذریعہ ادب ودب سے پہلے مولانا قاسمیؒ کی ذات مبارک بنی۔ خدا اس راست باز اور عجز پسند اور دوستوں عزیزوں کے لئے نہایت مشفق اور محبت کش ہستی کی روح کو اعلیٰ علیین میں جگہ دے۔ آپ کا سارا مزاح مجھے یوں لگتا ہے جیسے ان کے تبسموں اور خندہ جبینی پر اساس رکھتا ہے۔

○

## جگن ناتھ آزاد۔ جموں

پروین شاکر کے انتقال کی خبر سے جو دکھ ہوا ہے لفظوں میں نہیں آسکتا۔ شام کا وقت تھا جب میں اپنے کمرے میں بیٹھا اپنے کام میں مصروف تھا کہ بیوی گھبرائی ہوئی آئی اور کہنے لگی بہت بری خبر ہے۔ میں بھی گھبرا گیا۔ پوچھا کیا ہوا تو اس نے بتایا کہ پاکستان ٹیلی ویژن نے بتایا ہے کہ کار کے حادثے میں اس کی موت واقع ہو گئی ہے۔ **اناللہ وانا الیہ راجعون!**

میری بیوی نے تو اسے ٹیلی ویژن پر دیکھا اور سنا تھا۔ میں تو اس سے کئی بار مل چکا تھا' کراچی میں' لاہور میں' اسلام آباد میں--- اور دہلی میں بھی---

ہائے گلچین اجل سے کیسی نادانی ہوئی
پھول وہ توڑا کہ گلشن بھر میں ویرانی ہوئی

پرسوں "نوائے وقت" کا وہ شمارہ ملا جس میں پروین کے متعلق آپ کا کالم شائع ہوا ہے۔ کل کی ڈاک میں "معاصر" ملا۔ اتفاق کی بات ہے کہ "معاصر" میں دو مضمون اس کے متعلق پڑھے اور اس کا کلام بھی۔ ظاہر ہے "معاصر" تو چند روز پہلے ہی چھپ گیا ہو گا--- کیا عمدہ اشعار اس نے کہے ہیں۔

خوشبو ہے وہ تو چھو کے بدن کو گزر نہ جائے
جب تک مرے وجود کے اندر اتر نہ جائے
خود پھول نے بھی ہونٹ کیے اپنے نیم وا
چوری تمام رنگ کی تتلی کے سر نہ جائے

دراصل وہ خود ایک پھول تھی اور اس کی شاعری پھول کی خوشبو' جب بھی اس سے ملاقات ہوئی ایسی محبت اور ایسے احترام سے ملی جیسے بیٹی باپ سے ملتی ہے۔

○

## محمد خالد اختر۔ کراچی

پیارے عطاء!

کل تمہارا "معاصر" (موسم سرما کا) ملا۔ اتنا بھڑکدار اور سج دھج کا ادبی مجلّہ نکالنے اور مجھے یاد رکھنے کا بہت بہت شکریہ۔ دیکھ کر طبیعت باغ باغ ہو گئی۔ تم نے اتنے سارے "سرخیلان ادب" کو کیونکر اکٹھے کر لیا؟

احمد ندیم قاسمی صاحب اور اشفاق احمد کے افسانے کل پڑھ ڈالے۔ (ان کی کیا تعریف کروں!) باقی افسانے آج پڑھوں گا۔ شاعری میں پڑھتا ہی نہیں کرتا۔

بھائی حمید اختر کا اخلاق احمد دہلوی پر مضمون "ویرانے پر کیا گزری" بھی پڑھا۔ اور بہت پسند آیا۔ پچھلے دنوں سے میں نے مرحوم کی ایک سال پہلے لکھی کتاب "پھر وہی بیاں اپنا" پڑھی تھی اور ان کے طرزِ نگارش کا گرویدہ ہو گیا تھا۔ منٹو پر ندیم صاحب کا مضمون بڑے محبت سے لکھا ہوا ہے اور اس بڑے لکھنے والے کے بارے میں بہت کچھ معلوم ہوا۔

پہلا "معاصر" کا پرچہ "یعنی غالباً" گرما کا شمارہ کہ اب ادبی پرچے موسمی ہو گئے ہیں" تم شاید میرے لیے مشفق خواجہ صاحب کو دے گئے تھے۔ ان دنوں علیل ہوں۔ اور کہیں آ جا نہیں سکتا۔ چند دنوں تک خواجہ صاحب کے ہاں جا کر اسے بھی وصول کر لوں گا۔

○

## محمد خالد اختر کراچی

۲۲ جنوری ۱۹۹۵ء

برخوردار سعادت اطوار عطا خان

بہت سارے دن ہوئے تمہارے خط آئے ہوئے اسی اثناء میں کچھ ایسے سانحے ہوئے کہ کسی بات کی سدھ بدھ نہ رہی۔ (میری علالت اور کاہلی ایک طرف)

"معاصر" کا وہ شمارہ جو تم میرے لئے مشفق خواجہ کو دے گئے تھے۔ وہ انہوں

نے مشفقانہ رویہ اختیار کرتے ہوئے مجھے پہنچا دیا ہے۔ گویا اب میرے پاس دو "معاصر" ہو گئے ہیں اور دو اشفاق اور قدسیہ کی پوسٹر ساز رنگ دار تصاویر۔

پرچہ تقریباً" سارے کا سارا پڑھ ڈالا ہے میں نے تمہیں لکھا تھا کہ شاعری بالکل نہیں پڑھوں گے۔ لگے ہاتھوں وہ بھی پڑھ ڈالی۔ سب سے پہلے ظفر اقبال کی تھوک کے بھاؤ لکھی شوریدہ انسٹنٹ (Instant) غزلیں۔

(اگر ظفر اقبال اسی تیز رفتاری سے غزل گوئی کرتا رہا تو اصناف ادب سے غزل کی صنف خارج ہو کر رہے گی کسی اور کو اس میدان میں جوہر دکھانے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔) بہرحال میں اس کی تند و تیز ذہانت کا قائل ہوں۔

خواجہ مشفق صاحب اور ساقی کی خط و کتابت نے بھی مزہ دیا۔

"معاصر" کو اب بند نہیں ہونا چاہیے۔ پڑھے جانے والے ادبی رسائل ہیں ہی کتنے؟ جوں توں اس صدقہ جاریہ کو جاری رکھو۔

○

## مظفر وارثی۔ لاہور

معاصر کا تازہ اور پچھلا، دونوں شمارے ایک نشست میں پڑھے ایک بات یقین سے کہی جا سکتی ہے کہ آپ خرگوش پر سانپ چھوڑنے اور پھر سانپ کے دانت توڑنے کا فن خوب جانتے ہیں۔ ایک پرچے میں لندن کے مسٹر ساقی نے وزیر آغا کی خوب کھنچائی کی اور دوسرے میں وہ خود چھری کے نیچے آ گئے، ندیم اور خواجہ صاحبان کے اعتراض بالکل درست تھے اور ہیں حیرت ہے ندیم صاحب پسپا کیوں ہو گئے حالانکہ غالب اور اقبال نے جو شعر موصوف کو خواب میں سنائے ان سے تائید نہیں تردید ہوتی ہے گویا گواہی بھی خلاف گئی۔

○

## رام لعل۔ لکھنؤ

۲۲ جنوری ۱۹۹۵ء

ڈیر عطاء الحق قاسمی صاحب، آداب، نیا سال مبارک ہو۔

آپ نے معاصر کا "موسم سرما ۱۹۹۴ء" کا شمارہ برادرم جگن ناتھ آزاد کے

ذریعے بھجوایا ہے۔ جسے میں نئے سال کا ایک قیمتی تحفہ سمجھ کر آپ کا یہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔ یہ جریدہ مجھے ۱۹ جنوری کو موصول ہوا اور اسے میں نے دن رات ایک کر کے پڑھ ڈالا اور بے حد خوشی یہ دیکھ کر ہوئی کہ اس میں پیشتر تخلیقات قدر اول کی ہیں۔ خصوصاً اس کا افسانوی حصہ تو قابل ذکر ہے۔ اس میں سے دو ایک افسانے تو ہمیشہ زندہ رہنے والے ہیں۔ احمد ندیم قاسمی صاحب کا افسانہ ایک مدت کے بعد پڑھنے کو ملا جس میں پہلے کی سی تازگی ہے جو ان کی جوانی کے دور سے عبارت ہے۔ اشفاق احمد اور بانو قدسیہ کے مشترکہ کلنڈر سے قطع نظر ان دونوں کے افسانے بے حد دلچسپ ہیں۔ اشفاق احمد کے افسانے "کیا کسی کو، پھر کسی کا" پر اصلاح پسندی زیادہ حاوی ہے لیکن انہوں نے امریکہ کی ماحول نگاری بہت خوبصورتی سے کی ہے۔ بانو قدسیہ کا ایک افسانہ جو گذشتہ سال نقوش کے سالنامہ میں شامل تھا اور معاصر میں بھی جو اب "کعبہ میرے پیچھے" کے عنوان سے چھاپا گیا ہے ان دونوں میں فکری سطح پر ایک نئی و بولڈ جمپ (Bold Jump) ہے۔ انہوں نے آخرالذکر افسانے میں واحد متکلم میں راوی کی سوچوں کا گہرا سمندر کھنگالا ہے اس سے نئے لکھنے والوں کو روشنی ملے گی۔ نیلوفر اقبال کا "کھوٹا سکہ" وقار بن الٰہی کا "اب میں کیا کروں" محمد سعید شیخ کا "سولی" آثم میرزا کا "اجازت نامہ" غافر شہزاد کا "اپنا اپنا سچ" اور اعجاز احسن کا "کھیل ـــ یہ سارے افسانے فکر و نظر اور فن کے اعتبار سے قابل مطالعہ ہیں۔ کھوٹا سکہ کے میلو ڈرامینک انجام کا اندازہ اسی وقت ہو جاتا ہے جب بگا فوج میں بھرتی ہو جاتا ہے۔ وقار بن الٰہی نے ایک وزیر کے سیاسی کردار اور اسی کے معمولات کو بڑی حقیقت نگاری سے پیش کیا ہے۔ آثم میرزا نے عدالتی ماحول کے ساتھ عام لوگوں کے مسائل کو بڑی دردمندی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اعجاز احسن نے جوگیوں کا ذکر بڑے اچھے علامتی انداز میں کیا ہے جس کی وضاحت میں عمداً نہیں کرنا چاہتا۔ محمد سعید شیخ نے ایک نئے موضوع کو پیش کرتے ہوئے ایک ماں کے کرب کی کئی پرتیں اٹھائی ہیں۔ جمشید مسرور نے ناروے کے ایک اہم فکشن نگار کی تخلیق کا بہت اچھا ترجمہ کیا ہے۔ تخلیق بھی اچھی ہے جو فطری مناظر کے قریب ہے۔ کنوت ہامسون اپنی زندگی میں خصوصاً دوسری عالمی جنگ کے زمانے میں متنازع فیہ شخصیت بن گئے تھے لیکن ان کا لازوال ناول The Sult کو کون بھلا سکتا ہے جو انگریزی میں Hunger اور اردو میں "بھوک" کے عنوان سے چھاپا گیا تھا۔ انگریزی سے اردو میں اس کا ترجمہ پانچویں دہے میں مہندر ناتھ نے کیا تھا لیکن انہوں نے مصنف کا نام لاعلمی کی بناء پر نٹ حسن

لکھ دیا تھا ایسا انہوں نے Know کی طرز پر انگریزی میں چھپے مصنف کا نام Knut Hamson کا بھی K اڑا کر اسے نٹ ہمسن لکھا تھا۔

پروین شاکر کی ایک حادثے میں وفات کی خبر سے یہاں کے ادبی حلقوں میں بھی سوگ منایا گیا۔ معاصر کی اشاعت کے وقت تک یہ حادثہ وقوع پذیر نہیں ہوا تھا۔ بہرحال ان پر آفتاب احمد اور خالدہ حسین کے مضامین ہمارے عہد کی ایک بہت اچھی شاعرہ کے فکری دھارے کا بہت خوبصورت تجزیہ پیش کرتے ہیں۔ ان کی نظموں میں "نہ میں نے چاند دیکھا" اور ان کی غزلوں کے یہ اشعار میں نے دلچسپی سے پڑھے۔

میں دھوپ کی عادی ہو چکی تھی
کیوں مجھ پہ بنا ہے سائبان تو
میں تیری زمین نصف شب ہوں
تاروں بھرا میرا آسمان تو

میں تھا چاند اور اس کو گواہ ٹھہرا کر
ذرا سا یاد تو کر تو نے کہا تھا مجھے
تمام رات مری خواب گاہ روشن تھی
کسی نے خواب میں اک پھول دے دیا تھا مجھے
سامنے تھا وہ اور خامشی تھی
اب نہ ہم تھے نہ وہ دل ربا تھا

ابھی تیرے لبوں پہ ذکر فصل گل نہیں آیا
مگر اک پھول کھلتے اپنے اندر دیکھ سکتی ہوں
مجھے تیری محبت نے عجب اک روشنی بخشی
میں اس دنیا کو اب پہلے سے بہتر دیکھ سکتی ہوں

محترم احمد ندیم قاسمی نے سعادت حسن منٹو کے بارے میں بہت سی بھولی بسری اور ان کہی باتیں بتائی ہیں۔ کچھ باتوں کا سراغ تو منٹو کے خطوط میں مل جاتا ہے جو انہوں نے

قاسمی صاحب کے نام لکھے تھے اس مضمون میں منٹو کی پوری شخصیت جلوہ گر نظر آتی ہے۔

حمید اختر صاحب نے اخلاق احمد دہلوی، منشا یاد نے وقار بن الٰہی، پروفیسر سکین علی حجازی نے مجید نظامی اور مرجب قاسمی نے کبیر خان کے بارے میں بہت عمدہ خاکے لکھے ہیں۔ دیگر مضامین میں میری دلچسپی ڈاکٹر محمد بشیر گورایا کے مضمون پنجابی کہانی اور عصری تقاضے میں رہی۔ الف۔ د۔ نسیم کا مضمون "بات شعری سرقہ کی" بھی قابل مطالعہ ہے لیکن یہ پرانے شعراء کے بارے میں ہے نئے شعراء پر بھی اس سلسلے میں نظر ڈالنی چاہیے۔ سرقہ و توارد کا سلسلہ جاری و ساری ہے۔ مسعود اشعر کا مضمون بھی ٹھیک ہی ہے۔ فوزیہ چودھری کا آپ کے بارے لکھی گئی کتاب پر تبصرہ پڑھ کر اشتیاق بڑھا گیا کہ اس کتاب کو ضرور پڑھنا چاہیے لیکن کیسے؟

ساقی فاروقی، احمد ندیم قاسمی اور مشفق خواجہ کا ادبی معرکہ عروض سے متعلق ہے لیکن ان تینوں حضرات کے خطوط میں ان کے اپنے اپنے مزاج کی جھلک ہے۔ قاسمی صاحب کسی کا دل نہیں دکھانا جانتے اس لئے ان کے یہاں روایتی اعتدال ہے۔ مشفق خواجہ محقق سے زیادہ ایک پرلطف طنز نگار نظر آتے ہیں اور اپنی بات پر اڑے ہوئے۔ ساقی فاروقی حسب معمول غیظ و غضب میں ہیں اور پورے جلال کے ساتھ اپنے استدلال میں موجود ہیں۔ بہرکیف انہوں نے اپنے آخری خط بنام مشفق خواجہ میں وزیر آغا کے خلاف گالیوں اور بے جا فقرے بازی کو نکال دینے کا وعدہ کر لیا ہے لیکن ان کے معاصر میں مطبوعہ خطوط میں تو سب کچھ جوں کا توں موجود ہے کیا وہ یہ ساری بحث اپنی کسی کتاب میں چھپواتے وقت ہی گالیوں کو نکال دیں گے۔ بقول احمد ندیم قاسمی و مشفق خواجہ انہوں نے ان خطوط کے ذریعے سے بہت عمدہ نثر لکھی ہے۔ ان کی نثر کی خوبصورت کا راز ان کی بے ساختگی میں مضمر ہے۔

آپ نے اداریہ میں (رہنمائی فرمائیں) بہت اچھی بات اٹھائی ہے۔

○

## بخش لائلپوری، لندن

"معاصر" کے صفحہ نمبر ۲۷۸ پر آپ کی غزل پڑھی۔ یہ جان کر خوشی ہوئی کہ آپ نے بھی ساقی فاروقی کے اتباع میں دو مصرعے وزن سے خارج کر دیئے ہیں۔ عروض کے رکن مفتعلن کے آغاز میں کبھی دو سبب خفیف اس طرح متواتر نہیں آتے جس میں دوسرے

سبب کا حرف آخر صرف سالم ہو[1]۔ ساقی فاروقی کی غزل کے بارے میں احمد ندیم قاسمی کا خط قول فیصل کا درجہ رکھتا ہے۔ اسی اصول کے مطابق "واضح" واض اور "غافل" غاف پڑھا جائے گا۔ ساقی نے جن ارکان پر اپنے اشعار کی تقطیع کی ہے وہ نقلی ہیں۔ حقیقی نہیں من گھڑت ہیں۔ صفحہ نمبر۲۷۶ پر آپ کی غزل کے چوتھے شعر کا پہلا مصرعہ توجہ طلب ہے کیونکہ "خیال" مصرعہ کو میرے حساب سے بے وزن کر رہا ہے۔ خیال کی جگہ سوچ یا فکر کہنے سے، وزن بحال ہو جاتا ہے۔ دوسرے مصرعہ میں "خیال" درست ہے۔۔۔

○

## جاوید شاہین۔ لاہور

معاصر کا تازہ شمارہ نظر سے گذرا۔ اسے دیکھ کر تمہاری سلیقہ شعاری قابل داد ہے۔ پورے معاصر پر اظہار خیال طوالت پکڑ جائے گا۔ لہٰذا چند تحریروں کے متعلق کچھ کہنے پر میں اکتفا کروں گا۔

ظفر اقبال کافی عرصے سے خرابی معدہ کا شکار ہے۔ دوسرے جریدوں کی طرح اس کی اس بیماری کے جراثیم تمہارے رسالے تک بھی پہنچ گئے ہیں۔ خدا اسے صحت یاب کرے۔ احباب دعا کے سوا کر بھی کیا سکتے ہیں۔

شہزاد احمد جس شعری تنزل کی طرف تیزی سے بھاگا جا رہا ہے اس کا ثبوت تو کچھ عرصے سے مل ہی رہا تھا مگر معاصر کے موجودہ شمارے میں اس نے اسے پوری طرح مہیا کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ اس کے لئے بھی بس دعا ہی کی جا سکتی ہے۔ ویسے غزلوں پر دعا پڑھی بھی جا سکتی ہے۔

ساقی فاروقی نے شاعری کو ذریعہ عزت بنانے کے بجائے اپنی شہرت کے لئے جو نیا طریقہ استعمال کرنا شروع کر دیا ہے میرے نزدیک وہ کوئی اتنا قابل تحسین نہیں ہے۔ مگر اتنی بات ضرور ہے کہ اس نے اپنی ایک اوسط درجے کی غزل کو جس طرح متنازعہ بنا کر بار بار پڑھوایا ہے اس پر واقعی اس کی ذہانت کو داد دینا پڑتی ہے۔

پروین شاکر کی تازہ غزلوں اور نظموں میں جذبات کے ٹھہراؤ اور خیال کی پختگی کو دیکھ کر خوشی ہوئی تھی۔ یہ بات ان نقادوں کے لئے لمحہ فکریہ تھی جو اسے ایک خاص عمر کی

---

[1] عروضی حضرات آپ سے متفق نہیں ہیں (ادارہ)

لڑکیوں اور لڑکوں کے جذبات کی ترجمانی کرنے والی شاعرہ ٹھہراتے تھے۔ نئی جہت میں یہ سفر اس کی قسمت میں نہیں تھا۔

○

## ناصر بشیر، لاہور

"معاصر" کے نئے شمارے میں تمام افسانے پڑھ ڈالے۔ اشفاق صاحب اور بانو قدسیہ کے افسانے پڑھ کر بہت لطف آیا۔ دونوں میں کچھ مماثلتیں تھیں جو ان کی ذہنی ہم آہنگی کا ثبوت ہیں۔ دونوں کی کہانیوں کا مرکزی کردار امریکہ میں جا بستا ہے۔ اور دونوں ہی ہیروئن کو نشہ خیال کرتے ہیں اور شراب کو مشروب سے زیادہ اور کچھ نہیں سمجھتے۔ دونوں کی کہانیوں میں ہجرت کا مسئلہ ابھر کر سامنے آیا ہے۔ اتنی حیران کن مماثلتیں دیکھ کر ذہن کسی اور نہج پر سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے لیکن ایسا سوچنا، میں سمجھتا ہوں کہ کفر کے برابر ہے۔ وقار بن الٰہی کے افسانے کا موضوع اچھا ہے لیکن وہ اسے صحیح انداز میں نبھا نہیں سکے۔ قاسمی صاحب کی کہانی اس امر کی غماز ہے کہ وہ اب بھی مشاہدے اور تجربے کی دنیا میں جی رہے ہیں اور دنیا کی دھوپ چھاؤں سے انہوں نے اپنا ناتہ نہیں توڑا۔ پروین شاکر کی غزلوں کی معنویت ان کے انتقال کے بعد دو چند ہو گئی ہے۔ ظفر اقبال اور آپ کی غزلیں مزے لے لے کر پڑھیں۔ ساقی فاروقی نے جس بحر میں غزل کہی ہے روحی کنجاہی بھی اس میں غزل کہہ چکے ہیں ان کی غزل "ادبیات" میں شائع ہوئی تھی۔ میں بھی حیران ہو گیا تھا اور ان سے دریافت کرنے پر مجبور ہو گیا کہ یہ کون سی بحر ہے۔ انہوں نے وہی بحر بتلائی جو ساقی فاروقی بتلاتے ہیں۔ بہرحال یہ بحث دلچسپ ہے اور اس سے آپ کے رسالے کی اہمیت بڑھ گئی ہے۔ نئے لکھنے والوں کو اس طرح سنجیدہ موضوع کی طرف کسی نے تو ترغیب دلائی۔ "معاصر" میں شامل باقی چیزیں آہستہ آہستہ پڑھ رہا ہوں مزید تبصرہ زبانی ہو گا۔

○

## بی۔ ناہید سرگودھا

"معاصر پڑھنے میں بھی اچھا لگا اور دیکھنے میں بھی۔ ایک اور بات جو بہت اچھی لگی وہ یہ کہ آپ نے اس میں پرانے لکھنے والوں کے ساتھ ساتھ نئے لکھنے والوں کو بھی برابر کی جگہ دی ہے جس سے یقیناً ان کی حوصلہ افزائی ہو گی۔

○

## ساجدہ فرحت۔ لاہور

محترم عطاء صاحب
السلام علیکم!

دلدار بھٹی صاحب کے انتقال پر اسی قدر دکھ ہوا۔ زندگی سے بھرپور وہ شخص کتنی جلدی میں زندگی سے کنارہ کر گیا ویسے جانے کا یہی بہترین طریقہ ہے (جانے والے کے نقطہ نظر سے) آپ کی سالگرہ کے سلسلہ میں ان کا مضمون کتنا شاندار تھا۔ خدا ان کی مغفرت کرے اور انہیں اپنے جوار رحمت میں رکھے آمین۔ کرنل محمد خان نے بھی آپ کے بارے میں کیا خوب کہا کہ آپ پاکستان کے قدرتی وسیلوں میں سے ایک ہیں۔ کیا تعریف کی ہے کہ بس قلم ہی توڑ دیا ہے۔

جہاں تک جلدی میں جانے کا تعلق ہے اس معاملہ میں پروین شاکر نے تو کمال ہی کر دیا۔ خود کلامی تک میں نے اسے باقاعدہ پڑھا تھا اور کچھ دن پہلے تک میرا خیال تھا کہ وہ زندگی میں اتنی Involved ہے اور زندگی میں شاید اسے اتنے امکانات نظر آتے ہیں کہ اس کی awareness موت کے بارے میں اتنی گہری نہیں۔ یا اسی کی طرف دھیان دینے کی اسے فرصت نہیں ہے۔ لیکن اس کے بعد جب اس کے بارے میں لوگوں کی تحریریں دیکھیں تو "انکار" کے کچھ اشعار پڑھنے کا موقع ملا اور مجھے پتہ چلا کہ شاید اب حال ہی میں وہ اسی ذائقہ سے کچھ متعارف ہو گئی تھی جس کے بارے میں اسی نے خوشبو میں بھی بہت ہی سرسری سا ذکر کیا تھا۔

موت کا ذائقہ لکھنے کے لئے
چند لمحوں کو ذرا مر دیکھوں

اس شعر میں بھی گو موت کا ذکر تھا لیکن جیسے بڑے absent minded انداز میں۔
اب کے معاصر کی شان ہی کچھ اور ہے۔ جی چاہتا ہے کسی پیارے سے بچے کی طرح اس کے ایک سیاہ ٹیکہ لگا دوں۔ اس مرتبہ جمشید مسرور کی شان کسی سجیلے دولہا کی سی ہے۔ ان کا ترجمہ کیا ہوا کنوٹ ہامسون کا افسانہ "سورج کا بیٹا" بڑا زبردست افسانہ ہے اور اسے اردو کے قالب میں ڈھال کر انہوں نے اردو ادب کے قارئین پر یقیناً ایک احسان کیا ہے۔ ان کی

غزلیں بھی بہت پسند آئیں۔ ان کے اس شعر میں ان کے ترجمہ کیے ہوئے افسانے کے بوڑھے مصور کا کرب جھلکتا ہے۔ جانے یہ شعوری طور پر لکھا گیا ہے یا محض اتفاق ہے۔

خواب زاروں میں رہے دھوپ کے منظر پیہم
کوئی سورج نہ جلا قریہ بیدار کے نام

شاید انہیں یاد نہیں رہا کہ "خواب زاروں" کی یہ Lethargy دراصل ضرورت سے زیادہ سورج کے Exposure ہی کا نتیجہ ہے۔

اس شمارے میں بانو آپا کا افسانہ "کعبہ میرے پیچھے" لاجواب تحریر ہے۔ جو مہارت بانو آپا کو چیزوں' کیفیتوں اور جذبوں کا X-Ray کرنے میں ہے وہ شاید ہی کسی رائٹر کے نصیب میں ہو۔ جس صورت حال کے بارے میں لکھتی ہیں اسی کا کوئی پہلو تشنہ نہیں چھوڑتیں۔ مذکورہ افسانے میں خواہشوں کے تضاد بلکہ ضرورت اور رغبت کی کشمکش کی بڑی عمدہ عکاسی کی گئی ہے۔ ایک سادہ سچا انسان جو تصنع بھری زندگی نہیں جینا چاہتا وہ واقعی روحانیت اور مادیت کے توازن کے بغیر یعنی کسی ایک انتہا پر چلنے والے (یا منافقانہ روش رکھنے والے) معاشرے میں نہیں رہ سکتا۔ بانو آپا کے جملے ان کے تجربات کا نچوڑ ہوتے ہیں جیسے اس افسانے میں "کچھ لوگ اپنی نمازوں سے اپنے مسئلہ کا نتیجہ اپنی مرضی کے مطابق نکالنا چاہتے ہیں۔" ہمارے یہاں لوگ بظاہر بڑے مذہبی نظر آتے ہیں مگر میرے خیال سے ۸۰٪ لوگوں کی نماز اسی سلسلہ میں ہوتی ہے۔ ایک اور خیال ہے جو دل میں کھب کے رہ گیا "--- پانچ واٹ کا بلب پانچ سو کی روشنی نہیں دے سکتا' چاہے پیچھے سے کتنا بھی کرنٹ کیوں نہ آ رہا ہو۔" مگر خدا کے حوالے سے یہ کیا بات ہوئی کہ "وہ ہماری مرضی کے تابع ہے نہ ہم انصاف پر اسے مجبور کر سکتے ہیں۔" محض ایک کہانی کے لئے سب سے عظیم منصف کے بارے میں ایسے کلمات اچھے نہیں لگے۔ ہاں یہاں یہ کہا جا سکتا تھا "وہ ہماری مرضی یا مفاد کی خاطر کوئی رعایت نہیں کرتا۔" کیونکہ خدا ماں سے کہیں بڑھ کر چاہنے کے باوجود دنیا کی ماؤں کا سا "انصاف" نہیں کیا کرتا۔ پروین شاکر سے متعلق "خصوصی مطالعہ" اور اسی کا کلام سب سے پہلے پڑھنا شروع کیا تھا لیکن اب اس کے کلام کی داد کیسے دوں۔ ان کی من موہنی صورت اور رس بھری آواز بھلائے نہیں بھولتی۔ عجیب اتفاق ہے کہ اسی بار اس کی غزلوں میں بھی اور نظموں میں بھی ایک بوجھل سی اداسی تھی۔

آپ کی نظم "حسین" بہت پسند آئی آپ کی غزلیں بھی اچھی ہیں۔ یہ شعر ہے

حد اچھا لگا۔

زمیں کو چومنا چاہوں کہ وہ زمین پہ ہے
وہ آسمان سے مجھ کو اترنے دیتا نہیں

(اس طرح تو ہوتا ہے اسی طرح کے کاموں میں) سیلبریٹی ہونے کی کچھ تو قیمت چکانی پڑتی ہے!

افتخار مغل کی نظم "کہانی میں آؤ" بڑی منفرد اور پیاری لگی۔ منٹو کی شخصیت پر قاسمی صاحب کا مضمون "میں نے منٹو کو کیسا پایا" پڑھ کر بہت مزا آیا۔ اس سے منٹو کی ذات کے کچھ رخ جن کی بابت پہلے سے اتنی آگاہی نہ تھی سامنے آئے۔ مثلاً اس کا جذباتی ہونا تو معلوم تھا مگر اس کی اس درجہ بچگانہ جذباتیت کا اندازہ نہ تھا۔

منشاء یاد نے چٹکیاں بھرنے والے انداز میں وقار بن الٰہی کا "حق دشمنی" بڑے بے مثال طریقے سے ادا کیا ایسے دانا دشمن تو واقعی نادان دوستوں سے بدرجہا بہتر ہوتے ہیں۔

تبصرہ بے حد طویل ہو گیا ہے۔ لیکن ایک بات رہ گئی۔ "میں وہ اور عطاء الحق قاسمی" پر فوزیہ چودھری کے تبصرے نے اس کے بارے میں تجسس تو خاصا بڑھا دیا ہے البتہ ان کے ثقیل تجزیئے سے لگتا ہے کہ شاید کتاب میرے سر پر سے ہی نہ گزر جائے۔

○

## محمد صفدر خان راولپنڈی

"معاصر کے تازہ شمارے نے بہت مزہ دیا" بہترین افسانے' بہترین شاعری اور بہترین مضامین ایک ایک کر کے پڑھ ڈالے۔ اور اظہر عظیم خان صاحب کا یہ شعر۔

گزر آیا ہوں اس بستی سے میں اظہر عظیم آخر
میرے اندر سے اب ہر روز اک بستی گزرتی ہے

اتنا بے مثال ہے کہ مجھ ایسا کم فہم بس حیران ہی ہو سکتا ہے۔

ہمارے گھر گٹکتے ہیں کبوتر فی سبیل اللہ
چلو کوئی خوشی تو ہے میسر فی سبیل اللہ

عباس تابش کا مشاہدہ اپنے عروج پر ہے۔ ان کا مندرجہ بالا شعر کسی کھرے صوفی کو حال ڈالنے

کے لئے کافی ہے!

زبردست شعر ہے۔ اور جناب شہزاد احمد کی سائنٹفک اپروچ تو اپنی مثال آپ ہے۔ اس شعر میں انسانی مزاج کے دوہرے پن کو کس خوبصورت انداز میں بیان کیا ہے۔

آج اسے میں رخصت کر کے خوش بھی ہوں مغموم بھی ہوں
جیسے کسی ننھے بچے کا بستہ گم ہو جاتا ہے۔

○

## سعید آصف باٹی۔ خانیوال

ان دنوں اخبار میں جہاں کہیں پروین شاکر کا نام نظر آتا ہے تو نظر وہیں پر رک جاتی ہے۔ آج روزنامہ پاکستان میں ایک کالم "پروین شاکر کی شاعری' ایک سرسری جائزہ" پر نظر پڑی کالم نویس ظفر اقبال تھے چونکہ یہ کالم پروین شاکر کی نسبت سے لکھا گیا تھا اس لئے اسے بڑے غور سے پڑھا اور بہت حیرت ہوئی کہ ظفر اقبال صاحب نے یہ کیا لکھا ہے! فرماتے ہیں "پروین شاکر نے کچی عمر کے رومانی جذبات فنکارانہ شعور کے ساتھ پیش کئے۔ ان کا پہلا مجموعہ کلام "خوشبو" منگیتروں اور دوستوں کو تحفے میں دیا جاتا تھا جس سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ وہ بہتر اور معمولی ذوق رکھنے والوں میں یکساں طور پر مقبول تھیں جبکہ "خوشبو" کے بہت سے ایڈیشن اب تک شائع ہو چکے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود وہ کوئی غیر معمولی یا اول درجہ کی شاعرہ نہیں کیونکہ مقبول ہونا بڑے یا اعلیٰ درجے کا شاعر ہونے سے قطعی مختلف چیز ہے جبکہ پروین شاکر کی مقبولیت میں جو عناصر کارفرما ہیں ان کا تجزیہ با آسانی کیا جا سکتا ہے۔ پہلا تو یہ کہ وہ ایک خاتون تھیں اور وہ بھی خاصی حد تک خوش شکل' دوسرے یہ کہ احمد ندیم قاسمی نے انہیں بطور خاص پروجیکٹ کیا۔ تیسرے وہ ایک بہت بڑی افسر تھیں۔ چوتھے' خاتون ہوتے ہوئے بھی انہوں نے خلاف معمول عاشقانہ شاعری کی جبکہ اردو میں پہلے سے اس کی کوئی نمایاں مثال نہیں تھی۔ پانچویں معروف گائیکوں نے بھی ان کی شاعری کو چار چاند لگانے میں خصوصی کردار ادا کیا۔ چھٹا عنصر یہ ہے کہ کچی عمر کے جذبات کی رومانی شاعری۔"

مزید لکھتے ہیں کہ "مقبول ہونے کا ایک مطلب اور بھی ہے اور وہ یہ کہ چونکہ صحیح ادبی ذوق اور شعر کی شناخت رکھنے والوں کی تعداد ہمیشہ ہی قلیل رہی ہے اور چالو قسم کا ذوق

رکھنے والے ہمیشہ ہی اکثریت میں رہے ہیں اس لئے ظاہری طور پر دلکشی رکھنے والی شاعری جو عام طور سے دو نمبر شاعری ہی ہوتی ہے ایسی شاعری دیرپا ہرگز نہیں ہوتی۔ "خوشبو" کے بعد ان کی شاعری پختگی حاصل کر لینے کے باوجود رو بہ زوال ہے حتیٰ کہ ان کی وفات پر اخبارات میں ان کے جو چیدہ چیدہ اشعار نقل کئے گئے ہیں سب ہی درمیانے درجے کے اور بالکل معمولی ہیں۔ پروین شاکر کی شاعری میں تازگی مفقود ہے حتیٰ کہ اس میں جدید طرز احساس نام کی بھی کوئی چیز دستیاب نہیں۔ شاعری اب سنجیدہ لوگوں کا مسئلہ ہی نہیں رہا..." آخر میں مزید لکھتے ہیں کہ "سوال یہ ہے کہ کیا عورت کا خوبصورت ہونا ہی کافی ہوتا ہے اور اگر نہیں تو کیا شاعری کا محض خوبصورت ہونا ہی کافی قرار دیا جا سکتا ہے؟"

اب ہم ظفر اقبال صاحب کے خیالات کا مرحلہ وار جائزہ لیتے ہیں۔ جہاں تک مقبولیت کے عناصر کا تعلق ہے تو خاتون ہونا اور خوش شکل ہونا ہی اگر کامیابی کی ضمانت ہوتا تو بے شمار خوش شکل خاتون شعراء موجود ہیں مگر انہیں پروین شاکر ایسی مقبولیت حاصل نہیں ہو سکتی۔ پھر اردو شاعری میں وارد ہونے والی وہ پہلی خاتون نہ تھیں۔ شبنم شکیل، فہمیدہ ریاض، کشور ناہید، یاسمین حمید، نوشی گیلانی اور دیگر بے شمار شاعرات ہمارے درمیان موجود ہیں۔

ان خواتین نے رومانی شاعری بھی کی ہے مگر مقبولیت کا وہ اعزاز کسی اور کے حصے نہ آسکا جو پروین شاکر کو نصیب ہوا۔ کیا ہمارے ملک میں افسر شعراء کو پذیرائی زیادہ حاصل ہوتی ہے؟ نہیں، قطعاً" نہیں۔ اگر شاعری کا معیار افسری ہوتا تو معذرت کے ساتھ عرض کروں گا کہ اس وقت وہ افسران ملک کے سب سے بڑے شاعر ہوتے جو شعر کہتے ہیں مگر انہیں بطور شاعر کوئی جانتا تک نہیں۔ احمد ندیم قاسمی نے پروین شاکر کو یقیناً ان کے ٹیلنٹ کی وجہ سے ہی پروجیکٹ کیا ہو گا ورنہ ان سے فیض یاب ہونے والے بے شمار دیگر لوگ بھی ہیں جو کہ بڑا نام حاصل نہ کر سکے۔ معروف گایک جن میں ملکہ ترنم نورجہاں اور مہدی حسن بھی شامل ہیں انہوں نے کافی شعراء کا کلام گایا لیکن کیا وہ سب پروین شاکر ایسی مقبولیت اور احترام حاصل کر سکے؟ یقیناً" نہیں۔ نورجہاں جن شاعروں کا کلام گاتی ہیں لوگوں کو تو ان میں سے اکثر کا نام بھی "حفظ" نہیں ہوتا جہاں تک کچی عمر کے جذبات کی شاعری کا تعلق ہے تو یہ کئی پکی عمر کے شاعر بھی کرتے ہیں لیکن یہ ایک روشن حقیقت ہے کہ جو مقبول عام پروین شاکر کو حاصل ہوا وہ کسی اور کا مقدر نہ بن سکا۔

تری چاہت کے بھیگے جنگلوں میں
مرا تن مور بن کر ناچتا ہے
مجھے ہر کیفیت میں کیوں نہ سمجھے
وہ میرے سب حوالے جانتا ہے
میں اس کی دسترس میں ہوں مگر وہ
مجھے میری رضا سے مانگتا ہے

یہ بانکا انداز صرف پروین شاکر کے ساتھ مخصوص ہے۔

ظفر اقبال صاحب کو زمانے کی ناقدری کا بھی گلہ ہے کہتے ہیں کہ ادبی ذوق اور شعر کی شناخت رکھنے والوں کی تعداد قلیل رہی ہے۔ یہ تو سراسر حسد ہے۔ شاعر وہی ہے جو خواص کے علاوہ عوام کی زبان پر بھی ہو جسے ایک عام آدمی بھی سمجھ سکے چنانچہ بڑا شاعر ہونے کی سند صرف انہی شعراء کو ملی ہے جو خواص کے علاوہ کسی نہ کسی حوالے سے عوام کے دلوں میں بھی بستے ہیں۔ ٹی ہاؤس کی سند صرف ٹی ہاؤس تک رہتی ہے اور یہ بہت جلد ایکسپائر بھی ہو جاتی ہے!

ظفر اقبال صاحب نے یہ فتویٰ بھی صادر فرمایا ہے کہ پروین کے چیدہ چیدہ اشعار بالکل معمولی اور درمیانے درجے کے ہیں۔ موصوف اگر اول درجے کے شعروں کا معیار یا تعریف بھی لکھ دیتے تو ہم جیسوں کا بھی بھلا ہو جاتا ورنہ پروین شاکر کے فن کی پختگی، سادگی اور سچائی سے کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا یا پھر ظفر صاحب قدیم اردو ادب کی زبان کے شیدائی ہیں۔

کیسے کہہ دوں کہ مجھے چھوڑ دیا ہے اس نے
بات تو سچ ہے مگر بات ہے رسوائی کی
وہ کہیں بھی گیا لوٹا تو مرے پاس آیا
بس یہی بات ہے اچھی میرے ہرجائی کی

جہاں تک اس الزام کا تعلق ہے کہ پروین کے کلام میں تازگی اور جدت نہیں تو یہ بات صرف وہی شخص کہہ سکتا ہے جو تازگی اور جدت کے معنوں سے آگاہ نہ ہو۔ قبلہ، الفاظ نئے نہیں ہوتے، انداز نیا ہوتا ہے ایک شعر ملاحظہ کریں۔ الفاظ تو پرانے ہیں مگر کیا خوبصورت، اچھوتا، منفرد اور حساس و لطیف انداز ہے!!!

کبھی کبھار اسے دیکھ لیں، کہیں مل لیں
یہ کب کہا تھا کہ وہ خوش بدن ہمارا ہو

اب محض ایک کالم نویس☆ کو سند مان کر پروین کی شاعری سے انکار تو نہیں کیا جا سکتا۔

☆ بھائی، وہ صرف کالم نویس نہیں، شاعر بھی ہیں، قارئین کی اس "بے خبری" ہی نے تو ظفر اقبال کو اردو کے معقول اور مقبول شاعروں کے خلاف کیا ہے۔ (ایڈیٹر)

○

## شیخ محمد منظور الحق۔ راولپنڈی

معاصر کا شمارہ موصول ہوا۔ اتنا پیارا شمارہ ترتیب دینے پر مبارک باد قبول فرمائیں، کچھ مقامات پر کتابت کی غلطیاں کھٹکتی ہیں تاہم شمارہ بہت اچھا ہے آپ نے اتنے خوبصورت ادیب جمع کئے ہیں کہ فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ پہلے کس کو پڑھیں۔

○

## محمد مختار علی' ملتان

مجھے اس بات پر حیرت انگیز مسرت اور اطمینان ہے کہ آپ کے "معاصر" نے شہرت و مقبولیت کا ایک ریکارڈ قائم کر کے ادبی دنیا میں تہلکہ مچا دیا ہے۔ کیونکہ آج سے پندرہ روز قبل یہاں ملتان میں بیکن بکس سے "معاصر" کا تازہ شمارہ خریدا تو اس وقت وہاں تازہ "معاصر" کی ڈھیروں کاپیاں شائقین ادب کی توجہ کا مرکز تھیں۔ اور اب جب کہ آج میں بیکن سے لوٹا تو وہاں "معاصر" کی صرف ایک کاپی باقی بچی ہوئی تھی۔ صرف ملتان میں ایک بک شاپ پر "معاصر" کی ترسیل کا یہ عالم ہے۔ تو قومی سطح پر تو یقیناً سینکڑوں کاپیاں فروخت ہوئی ہوں گی۔ اس کامیابی کا سہرا تو آپ کے سر جاتا ہے۔ میری طرف سے ڈھیروں مبارکیں اور دعائیں۔
رہی پرچے کی طباعت کمپوزنگ ٹائٹل کے معیار کی بات تو جناب میں بس اتنا ہی کہوں گا کہ یہ

نصف صدی کا قصہ ہے۔ اور آپ نے یقیناً کتابیں چھاپتے اور کتابوں میں چھپتے ہوئے ان نصف صدی کے تجربات کو مد نظر رکھ کر اس کی تزئین و آرائش کی ہے۔ خاص طور پر جو بات میرے دل کو بھائی وہ پرچے میں ممتاز ادیب اشفاق احمد اور بانو آپا کی رنگین تصویر کا پوسٹر ہے۔ جو اب میرے دفتر میں احباب کی توجہ و تحسین کا مرکز بنا ہوا ہے۔ "معاصر" کی انفرادیت اور خصوصیت ہی اسے دیگر ادبی جرائد سے ممتاز و مقبول کرنے کے لئے کافی ہے۔ محترمہ پروین شاکر جنہیں مرحومہ لکھتے ہوئے میرا قلم لرز رہا ہے کی تازہ غزلیات اور نظمیں بھی تازہ معاصر کی جان ہیں۔ اس کے علاوہ ساقی فاروقی' مشفق خواجہ اور احمد ندیم قاسمی صاحب کا خطوط کے ذریعے مباحثہ بھی دلچسپ اور فکر انگیز ہے۔ اسی طرح افسانوں میں قاسمی کا "چھلی" اور اشفاق صاحب کا "پھر کسی کو پھر کسی کا" شاہکار افسانے ہیں۔ ظفر اقبال اور سعید قیس کی غزلیں بھی متاثر کن ہیں۔ آپ کی غزلوں اور امجد کی تازہ ترین "نظم" سے رسالہ سج گیا ہے۔ اب کس کس شے کی داد دوں کہ۔

جو ذرہ جس جگہ ہے وہیں آفتاب ہے

○

## ریاض حسین چودھری۔ لاہور

معاصر ۴ کی اشاعت پر دلی مبارکباد قبول فرمایئے۔ "فنون" کے بعد کسی ادبی پرچے کی گنجائش ذرا کم ہی نظر آتی تھی' لیکن معاصر کی فکری اور تخلیقی فضا اپنے ہونے کا خود جواز ہے۔ یونہی معرکے سر کرتے جایئے کہ زندگی نام ہی معرکے سر کرنے کا ہے۔ پروین شاکر کی تعزیت قبول کیجئے' شاید خوشبو کبھی نہیں مرتی' خوشبو ہجرت کرتی ہے' گل رنگ تتلیوں کے ساتھ --- اور مسلسل سفر میں رہتی ہے' معاصر میں پروین کی غزلوں نے رلا دیا۔ اختر حسین جعفری زندہ ہوتے تو پروین شاکر کا نوحہ لکھتے' ایک عہد کا نوحہ ---

○

## فوزیہ چودھری۔ فورٹ عباس

معیاری ادبی رسالوں کی اس خشک سالی میں آپ کا پرچہ "معاصر" سونے کی بوند

کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ بھی یقیناً سرما کی پہلی بارش کی طرح ادب کی مختلف اصناف کی ترویج و ترقی میں کوشاں ہے۔ اس سے نہ صرف ادب بلکہ ادیب بھی پروان چڑھ رہے ہیں۔ یہ شمارہ اتنا خوبصورت اور متنوع دلچسپوں کا مرقع ہے کہ سمجھ میں نہیں آ رہا کہ پہلے کس کا ذکر کروں۔

ساقی فاروقی' ایک دلچسپ اور ذہین شخصیت کے روپ میں سامنے آ رہے ہیں۔ مشفق خواجہ' احمد ندیم قاسمی اور ساقی فاروقی کی دلچسپ خط و کتابت اور فقرے بازی کسی بھی "افسانوی ادب" سے کم نہیں۔ ان ربوں کی نوک جھونک میں دخل دینا' اوکھلی میں سر دینے کے مترادف ہے۔ کیا ساقی فاروقی مستقل طور پر پاکستان میں قیام پذیر نہیں ہو سکتے؟

تازہ شمارے میں شامل حصہ غزل میں اگرچہ بہت سے معتبر نام بھی شامل ہیں اور اگر یہ بات خوشامد پر محمول نہ ہو تو مجھے یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ عطاء الحق قاسمی کی آٹھ غزلیں بہت جاندار ہیں۔ اور اسی طرح امجد اسلام کی "تمہیں مجھ سے محبت ہے" اتنی سچی نظم ہے کہ میں نہیں سمجھتی کہ کوئی شخص ان جذبات کے اظہار پر یوں قادر ہو سکتا ہے۔

"محبت کرنے والوں کی سحر راتوں میں رہتی ہے
یہ عین وصل میں بھی ہجر کے خدشوں میں رہتی ہے

محبت کی طبیعت میں'
یہ کیسا بچپنا قدرت نے رکھا ہے۔"

خدا کرے یہ قلم یونہی صدیوں بلکہ قرنوں تک ادب کی آبیاری کرتے رہیں۔

ظفر اقبال' عباس تابش' زاہد مسعود' افتخار قیصر اور یونس متین کا خصوصی مطالعہ اس لحاظ سے اہم ہے کہ اکٹھی چیزیں شائع ہونے سے ان کے فکری اور فنی مزاج کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔

پروین شاکر کا خصوصی مطالعہ اور ان کا تازہ کلام کہ جس کو آخری کلام کہتے' دل خون کے آنسو روتا ہے اس لحاظ سے اور بھی اہم ہو گیا ہے کہ مرحومہ اپنی بساط لپیٹ کر یوں اچانک اور خاموشی سے چل دیں کہ اب تک یقین نہیں آ رہا۔ کیا اسے سفید چادر اتنی ہی مرغوب تھی کہ وہ اسے اوڑھ کر سو بھی گئی۔ ایسی جذبوں سے بھیگی اور تجربوں کی آنچ میں پکی شاعری کم و بیش ہی دیکھنے میں آتی ہے۔ جہاں جہاں تک تمہارے لفظ پہنچیں گے۔ رہتی دنیا تک تمہارے لئے صدقہ جاریہ ثابت ہوں گے۔

افسانوں میں احمد ندیم قاسمی' اشفاق احمد اور بانو قدسیہ جیسے نام دیکھ کر ویسے ہی میرے قلم پر کپکپی طاری ہو گئی ہے۔ ان کے بارے میں کچھ کہنا "چھوٹا منہ بڑی بات" کے مترادف ہے۔ بہرحال یہ دیکھ کر دل واقعی باغ باغ ہوا کہ ان کے قلم آج بھی ویسے ہی تر و تازہ اور چست و چالاک ہیں جیسے کم از کم بیس بائیس برس قبل تھے۔ ان کے قلم کی زد میں آ کر نہ تو موضوعات ہی عام رہتے ہیں اور نہ ہی لفظ شرمندہ ہوتے ہیں۔ رب کعبہ! ان کے قلم کی تر و تازگی صدیوں تک قائم رکھنا۔

احمد ندیم قاسمی کا خاکہ منٹو پر' ڈاکٹر مسکین حجازی کا خاکہ مجید نظامی پر اور دلہن (مرجب قاسمی) کا خاکہ دلہا (کبیر خان) پر اعلیٰ خاکوں میں شمار ہوتے ہیں۔ مقالات' خاصے پر مغز ہیں۔ جن پر واقعتا مغزماری کرنا پڑی۔

ادبی شخصیات کے پوسٹر کا اضافہ تو آپ کا ایسا کارنامہ ہے جس کی تقلید آئندہ زمانوں میں دوسرے ادبی پرچے بھی کریں گے۔

اداریے میں آپ نے جو مسئلہ اٹھایا ہے۔ وہ واقعی قابل غور ہے بظاہر یوں محسوس ہوتا ہے کہ یہ مسئلہ لاینحل ہے مگر وہ مسئلہ ہی کیا ہوا کہ جو حل نہ ہو۔ میری عاجزانہ رائے میں یہ کام اخبارات یا رسائل کے ایڈیٹر حضرات ہی بہتر طریقے سے انجام دے سکتے ہیں کہ کون سا ادب پارہ قوم میں مایوسی' کنفیوژن' بے بنیاد خوف اور گمراہی پھیلانے کا موجب بن رہا ہے اور کون مثبت رجحانات کا داعی ہے۔ یا یہ کام مصنف اور اگر وہ "معذور" ہو تو' پھر قارئین کو اس کا بائیکاٹ کر کے کرنا چاہیے۔

اور آخر میں ان اشتہاری کمپنیوں کا بے حد شکریہ جن کی وساطت سے اتنا خوبصورت ادب اردو ادب کے لاکھوں قارئین تک پہنچا۔ یقیناً میرے ساتھ ساتھ تمام قارئین "معاصر" ان لوگوں کے حق میں دست بدعا ہیں کہ اللہ میاں نہ صرف ان کے رزق حلال میں برکت دے۔ بلکہ انہیں اس توفیق پر برقرار رکھے (آمین) اور ہم ان کے توسط سے یہ معاصر اور تعمیری ادب پڑھتے رہیں۔

○

منصور ملتانی۔ سکھر

معاصر کا پورا شمارہ پڑھا شمارہ کیا ہے سبد گل ہے۔ ناچیز کی رائے میں شخصیات پر

خاکے خصوصاً احمد ندیم قاسمی صاحب کی وساطت سے سعادت حسن منٹو سے مل کر بہت زیادہ خوشی ہوئی۔ پروین شاکر کا تازہ کلام جو اب اس کی یادوں کی خوشبو میں ڈھل گیا ہے۔ بہت مناسب تھا' البتہ ظفر اقبال بالکل متاثر نہیں کر سکے۔ نظموں اور غزلوں کا انتخاب قابل داد ہے۔ افسانوں میں اشفاق بھائی اور بانو آپا کے افسانے پڑھ کر دعا مانگی اللہ تعالیٰ ہمیں "مریکہ فوبیا" کے اثرات سے محفوظ رکھے۔ "کھوٹا سکہ" ایک عجیب و غریب سوال چھوڑ گیا ہے۔ گریڈوں اور عہدوں کی جنگ وقار بن الٰہی نے "اب میں کیا کروں" کہتے ہوئے جیت لی ہے۔ "سولی" اجازت نامہ اور اپنا سچ مناسب ہیں۔ ہاں "تخیل" بہت زیادہ قابل غور ہے اور مصنف کی جرأت قابل تحسین۔ "سورج کا بیٹا" اچھا لگا ساقی فاروقی حسب معمول تعمیری/ تخریبی کارروائیوں میں مشغول نظر آئے۔ مقالے اور تراجم شمارے کی جان ہیں اور مضامین کا حسن بھی قابل داد بلکہ قابل دید ہے۔ عطاء الحق قاسمی کی غزلیں بہت خوبصورت ہیں۔ البتہ امجد اسلام امجد کچھ غائب غائب سے نظر آئے صرف ایک نظم سے پیاس کہاں بجھتی ہے۔

○

## ناہید قمر۔ بہاولپور

"خوشبو" کے بکھرنے کا بے حد افسوس ہوا لیکن کیا صرف اظہار افسوس کرنے سے پروین جیسی شاعرہ کا حق ادا ہو سکتا ہے؟ ــــ وہ جس نے مردوں کے بنائے ہوئے اس معاشرے میں پورے وقار سے جی کر اس بات کو غلط ثابت کیا کہ۔

نہ جانے کون سا طعنہ بڑا ہے<br>
کہ لڑکی' اور اس پر شاعرہ ہے

اور لوگوں کو یہ بتا کر کہ یہ دونوں حیثیتیں طعنہ نہیں' اعزاز ہوا کرتی ہیں' اپنے بعد آنے والی بہت سی لڑکیوں کے لئے جینا آسان کر دیا ــــ اس ماحول میں جہاں چاروں طرف اونچی اونچی فصیلیں ہوں اور ان کے بیچ صرف حبس و جبر کے موسم ہوں' وہاں سانس لینے کے لئے تازہ ہوا کی طرف کھلنے والا واحد دریچہ (پروین کے آنے کے بعد) کھلا رکھنا ممکن ہو گیا تھا ــــ دوسرے لفظوں میں پروین شاکر اپنی ہم عصروں اور اپنے بعد آنے والی بہت سی لڑکیوں کے لئے' ایک مضبوط ڈھال کی طرح تھیں' معاشرے کی جان لیوا رسموں اور رواجوں کے سامنے ــــ اور

اس ڈھال کے ٹوٹ کر گرنے کے بعد اب لہو لہو کرتی رسموں اور ٹوٹ جانے والی قسموں کی اس جنگ میں کس کس کے ہاتھ سے کہاں کہاں پر ہتھیار گریں گے۔۔۔ کچھ پتا نہیں۔

○

## جمیل احسن۔ سویڈن

معاصر واقعی منفرد پرچہ ہے بہت عمدہ انتخاب ہے۔ اس کامیابی پر دلی مبارکباد!

○

## نواز مائل ڈکی (لورا لائی)

محترم عطاء الحق قاسمی صاحب۔ السلام علیکم

جناب قاضی قیصر الاسلام نے فرانسیسی ماہر بشریات کلاڈی لیوی سٹراس (Claudi Levi Straws) کے کینیڈین ریڈیو براڈ کاسٹ کی سیریز۔۔۔ "خیالات" (Ideas) کے لیے دیے گئے پانچ لیکچروں میں سے پہلے لیکچر کی تلخیص "دیو مالائی فکر اور سائنس کا سنگم" کے عنوان کے تحت، قارئین معاصر" کے سامنے (ترجمہ کر کے) جس مربوط انداز میں پیش کی ہے وہ قابل داد تو ہے ہی لیکن یوں کچھ نہ کچھ بوجوہ ہر کسی کو سوچنے پر بھی مجبور کرتی ہے کہ حقیقت کیا آخر تک، سائنس کی رو سے سوالات کی شکل ہی میں رہے گی یا کہیں اور سے جیسے دیو مالا یا دیو مالائی ورثوں سے مربوط ہو کر اپنا تھوڑا بہت یا قطعی جواب بھی پائے گی؟

لیوی سٹراس نے اپنے موضوع کو قرار واقعی جان گویا اس خیال سے دی ہے کہ "بعض ایسی چیزیں چیزوں کو از سر نو دریافت کر لیے جانے کی جانب سنجیدگی کے ساتھ غور کریں" چنانچہ میرے خیال میں لیوی سٹراس نے یہ خیال ظاہر کر کے، سائنس کے بدیہی حقیقتوں سے متعلق ہونے، یا ذرے ذرے کے تحقیق خوش کا سلسلہ رکھنے اور یا پھر آن موجود پر سلسلہ نظر و نکشف تمام تر برقرار رکھنے کو، کم بہت ہی کم جانا ہے اور یہ ہے بھی صحیح۔ اس ضمن میں جان لاک کا "لوح سادہ" (Tahula Rasa) والا نظریہ بھی گویا فلسفیانہ ہوتے ہوئے بھی، اصلاً اپنے سیاق و سباق میں سائنسی ہی ہے کہ جب یہ خیال ہوتا ہے" کہ ابتدا ذہن ایک "لوح سادہ" کے مانند ہوتا ہے اور جوں جوں وہ تجربے کی زد میں آتا ہے تو اس لوح سادہ پر ارتسامات اپنا نقش چھوڑتے چلے جاتے ہیں" تو گویا کہنے کو یہ کیوں نہ ہو کہ کیا تجربے کی زد

میں آئے بغیر یا تجربے سے کچھ لیے بغیر (جو مفعولی صورت حال ہی کہلا سکتی ہے) اس کی اپنی کوئی فاعلی یا کلی صورت نہیں ہے۔ کیا وہ کینوس پر ہونے کا نام ہے اس پہ خود رنگ بھرنے یا کچھ بنانے کا نام نہیں چنانچہ یہ سوالات اگر ذہن کے تعلق سے اس نظریے یا تصور کے تحت نہ اٹھیں تو معاملہ ایک تجربے کے دوسرے تجربے سے رد ہونے سے زیادہ نہیں ٹھہرتا۔ بخلاف اس کے افلاطون کے نظریے کے تحت یہ دعویٰ جاندار ہی ٹھہرتا ہے کہ "دائرے، مثلث اور لائن جیسے تمام تصورات نہ صرف یہ کہ مکمل طور پر کامل بلکہ ذہن میں وہبی طور پر موجود ہوتے ہیں اور ان تصورات کے وہاں ذہن میں وہبی طور پر موجود ہونے کی بنا پر ہی ہم ان تصورات کو ظاہرہ طور پر دکھانے کے قابل ہو پاتے ہیں" کیا علم سے پہلے علم نہیں تھا' میں یہاں یہ سوال اٹھاؤں گا اور اگر جواب میں یہ ہو کہ "نہیں تھا" تو پھر میں کہوں گا کہ علم شروع کہاں سے ہوا۔ مثال ہی سے مثال نکلتی ہے ورنہ مثال ہو ہی نہیں سکتی یا کوئی وجود ہی نہیں رکھ سکتی۔ افلاطونی نظریے کے تحت بیشک "تصورات" ظاہری روئیوں میں آکر قبل ذہن میں موجود ہونے کا باوصف) "ظاہرہ حقیقت" کے طور' کبھی بھی کسی کامل دائرے یا کامل مثلث کے تصور کو نہ پیش کرتے ہوں ' لیکن کچھ تو پیش کرتے ہیں ماضی سے یا ماضی کے کل سے' آن موجود کی غیر حیاتی حقیقتوں سے اور یا آن منتظرہ (مستقبل) یا اس کی دور از نظر فتادہ حقیقتوں سے۔ دراصل لیوی سٹراس ایک وجودی مفکر ہونے کے ناتے سے اس ادراک شے و اشیا سے بوجوہ قاصر ہیں کہ حقیقتیں غیر حیاتی قاعدوں یا غیر قوانینی دائروں میں اس سے کہیں بڑی اور منظم ہیں جو ہمیں حیاتی قاعدوں یا مدون نظموں میں نظر آتی ہے۔

اسی سلسلہ خیال میں کہ ذہن جامع صورت ترکیبی (ساختیات کے ناتے) یا جامع صورت ادارکیہ (فکر کے ناتے) رکھتا ہے میں ان کے بیان کردہ اس واقع کو لوں گا" کہ جب ماں نے ایک مرتبہ انہیں بتایا کہ جب وہ ڈھائی سال کا شیر خوار بچہ تھا اور بلاشبہ پڑھنا نہیں جانتا تھا تو شیر خوارگی کی عمر میں ان کی طرف سے یہ دعویٰ ہوا کہ وہ پڑھ سکتے ہیں اور جب ماں نے پوچھا کہ بھلا کیسے تو ان کا جواب تھا کہ دو کانوں پر لگے ہوئے سائن بورڈوں پر یہ دو لفظ دیکھ کر (Box-Langer) Baker اور (Boucher) Buchter گویا ان لفظوں کا اولین جزو Box "تصویری مماثلت" کی بنا پر انہیں پڑھنے میں مدد دیتا ہے۔ اس طور کیا یہ اوپر کے پیرے کی بات کی طرح نہ سمجھا جائے کہ "ساخت" (Structure) اور "موضوع" (Theme) [5]

بت کچھ علم کے طور نہاں خانئہ ذہن میں موجود ہے جس کا انطباق خارج میں خارج پر دہرائی کے ذریعے ہوتے ہے یا کچھ یاد کر کے مسلسل یاد کر کے۔ گویا پڑھنا اس طور یہی کرتا ہے۔

دراصل ان کی "باصرہ" اور "شامہ" کی مثالیں بھی یہی بتاتی ہیں کہ کوئی کلی صورت ہی (جس میں سب سمتوں سے متعلق خلیے کام کریں) "باصرہ" کو سب دکھانے کے قابل بناتی ہے۔ اسی طرح "شامہ" بھی کسی ایک مخصوص کیمیائی ترکیب کی حامل شے ہونے کی بنا پر چونکہ کسی ایک بو سے متعلق کلیت یا کلیت کے عناصر کو' لیے ہوتی ہے اس لیے اپنا ادراک یا فہم اس بو کے ناتے دیتی ہے۔ دراصل یہ کل یا کل کا نکتہ یا کل کا تصور لیوی سٹراس جیسے وجودی مفکر کو یوں اپیل نہیں کرتا کہ اس نے کہیں اور "وقت" کو بھی "ارضی وقت" ہی کہا ہے۔ یون وقت----- دراصل زوال پذیر وقت ہی گویا اس کا موضوع ہے اور اس طرح ان کی تلاش اس لیکچر کے ناتے بھی' ایک "عنصر غیر متغیرہ" کو پانے سے بوجوہ قاصر رہتی ہے۔ "عنصر غیر متغیرہ (Invariant Element) بدیہی حقیقتوں سے (حواس کے ناتے) ملے یا بدیہی حقیقتیں یا حقیقت وا یوں کہلائے' قیاس کی حقیقت تو کیا' قیاس کا امکاں تک یوں نہیں رکھتا کہ اس سے چیزیں چھوٹی ہو جاتی ہیں یا چھوٹے نظم کی حامل قرار پاتی ہیں حتیٰ کہ کائنات تک بھی پھر ایسی ہی (چھوٹی) چیز ٹھہرتی ہے کہ معاملہ اس کا حواس کے ادراک سے متعلق ہو جاتا ہے' غیر حواس کی کسی صورت سے نہیں۔

انہوں نے دیو مالا کے تعلق سے "شادی بیاہ کی لغویات یا رسومات کو جو جگہ دینے کی اس لیکچر میں سعی کی ہے یا انہیں ایک حقیقت گنا ہے تو یہ اس تعلق سے محض ایک بات ٹھہرتی ہے یا ایک شے یا رسم یا رسومات کی واساختیاتی صورت (Structural Shape) جس پر حیات کی ظاہری کچھ صورتوں کا مدار ہے لیکن دیو مالا کی حقیقت تو (یہ اصرار کیوں کا) ہر جگہ مذہب' مذہبی عقائد اور رسومات سے زیادہ ہے اور یا پھر قدیم سے' یوں زیادہ چلی آ رہی ہے۔ اس طرح "وہ" (تت: ہندو دیو مالا میں خدا) "اللہ" (اسلامی عقائدی صورت میں خدا) اور "گاڈ" (عیسائی شریعت یا آسمانی نکتہ نظر کے تحت خدا) کیا یوں کچھ نہیں ٹھہرتا کہ دنیا میں سب اسی کا کام ہے اور اول یہ عقیدہ یا ایسے ہی عقیدے علم کے طور پر "ذہن بننے سے" آئے ہیں جو بعد میں دیو مالاؤں (ثقافتی ورثوں' کا جزو بنے ہیں۔ گویا یہ دیو

مالائی ورثے ہی ہیں جن سے عمومی زندگی سے لے کر شادی بیاہ تک کا عمل بھی' برابر فیضیاب ہوتے رہتے ہیں۔ یوں غیر محسوس حقیقت (مثلاً عقاید کا دیا خدا) انسانی نظامات کے شئے محسوس کے تابع ہونے کے تحت' مادئین کے نزد حقیقت نہ بھی کہلائے جب بھی حقیقتوں پر حاوی حقیقتوں کی حقیقت ہے۔

اپنے اس لیکچر میں (اوپر کی رعایت ہی سے کہوں گا) وہ ثقافت کے تعلق سے بھی آپ یہ کہتے ہیں کہ "ہر چندکہ ہر وہ چیز جسے ہم کلچر یا ثقافت کہتے ہیں وہ اس سے کہیں زیادہ پیچیدگی کی حامل شے ہے (جتنا کہ ایک ہی طرح کے مظاہر کا ہم مشاہدہ کر رہے ہوتے ہیں: سٹراس) اور اسی وجہ سے اس میں تغیرات یا تنوعات (Variables) کی تعداد بھی زیادہ ہوتی ہے" گویا دیو مالا یا ثقافت (ثقافت بیشتر دیو مالائی یا روحانی یا بشری اخلاقی رویوں اور رواجوں پر استوار ہوتی ہے) کو ایسا مان کر کہ وہ سائنس کی کلیہ سازی میں نہیں آتی یا مجرو سائنسی تجربیت یا سائنسی پیمانہ ورک نہیں کرتی۔ وہ یہ تسلیم کرلیتے ہیں کہ کوئی چیز اور ہی ہے گرافک تصویری مماثلث سے ورا' اور یا کسی ایسے ذہن کے طور جو جامع معلومات قسم کا ہے اور یا جس میں زمانوں کے علم جیسے پہلے سے پڑے ہوئے ہوں۔ توجیہہ ہو سکے یا نہیں یہ محض بحث کی بات ٹھہرتی ہے۔ گویا ان کی طرف سے ماضی بعید میں گم شدہ اشیا کی تلاش یا دیو مالا کو سائنس کے ساتھ ایک اور زیادہ بڑی حقیقتوں کو جاننے کے ناتے رکھنے کی خواہش دراصل اس لیکچر کی عطا ہے جس سے بشریت اپنی فعالی صورت میں گھٹتی نہیں بوجوہ بڑھی ہے......!!

○

صائمہ اسما شاہد (لاہور)

محترم عطاء الحق قاسمی صاحب!

السلام علیکم و رحمتہ اللہ

میری دو غزلوں کی اشاعت پر شکریہ کے بعد آپ کی خیریت نیک مطلوب ہے۔ یہ پوچھنا نہ چاہوں گی کہ میری باقی تحریروں کے ساتھ کیا سلوک ہوا۔ البتہ اپنی رد شدہ تحریروں کو ایک دیہاتی کی مانند ویسی ہی دعا دوں گی جب اس نے کنوئیں میں گرے ہوئے بیٹے کی پکار سن کر کہا تھا کہ بیٹا! میری دعا ہے' جہاں بھی رہو' خوش رہو!

تازہ معاصر پر تھوڑا سا تبصرہ پیش خدمت ہے

"تازہ معاصر (سرما ۱۹۹۴) پچھلی بار سے شکلاً بہتر اور عقلاً بہت بہتر ہے۔ مگر مزید بہتری کی گنجائش بہرحال موجود ہے۔ محترم اشفاق احمد اور بانو قدسیہ صاحب کے رنگین پوسٹر اور سرورق پر اس کے اعلان مفت حاصل کیجیے' نے عجب مزا دیا۔ آپ تو دونوں بزرگوں کو سری دیوی اور سلمان خان کے لیول پر لے آئے۔ خالص ادب کی دنیا میں یہ چیز کچھ جچی نہیں۔ ادبی لوگوں کا مزاج گلی کے لونڈوں سے مختلف ہوا کرتا ہے۔ "شخصیت" کا پورا حصہ دلچسپ تھا۔ خصوصاً منٹو کی زندگی کے بارے میں احمد ندیم قاسمی صاحب نے بھرپور لکھا ہے۔ مجھ جیسے بہت سے جو بعد کی پیداوار ہیں یہی سمجھتے رہے کہ منٹو ترقی پسند تحریک میں شامل تھا۔ مگر قاسمی صاحب کی تحریر سے حقیقت حال واضح ہوئی۔ شاعری کے حوالے سے ایک بات کہنا چاہوں گی کہ جدید شاعری میں نظم کا ابلاغ روز بروز مشکل تر کیوں ہوتا جا رہا ہے؟ جدید نظم اس قدر علامتی اور اجنبی کیوں لگنے لگی ہے؟ حالانکہ میرے خیال میں نظم غزل کی نسبت زیادہ بہتر ابلاغ کی اہل ہے۔ حصہ غزل البتہ جامع اور رنگا رنگ تھا۔ بہرحال ساری شاعری میں امجد اسلام امجد کی نظم "محبت کی طبیعت میں" حاصل مطالعہ رہی۔ افسانوں میں بانو قدسیہ کا افسانہ "کعبہ میرے پیچھے" نمبر لے گیا۔ نیلوفر نے بھی اچھا لکھا ہے۔

- اداریے میں آپ نے جو سوال اٹھایا ہے انتہائی اہم ہے۔ امید ہے اگلے شمارے میں اس پر سیر حاصل بحث پڑھنے کو ملے گی۔

○

دلیپ سنگھ (دہلی)

برادرم عطا صاحب

معاصر ملا تو جی خوش ہو گیا۔ میری بدقسمتی کہ میں اس سے ناواقف تھا ورنہ لاہور کے سفر کے دوران آپ سے کچھ پرانے شمارے مانگ لاتا۔ بہت بھرپور شمارہ ہے۔ ایک مضمون میں نے نہایت دلچسپی سے پڑھا ہے اور لطف اٹھایا ہے۔ اگر آپ ذرا سا پہلے بتا دیں کہ اگلا شمارہ کب تک آنے والا ہے تو میں بھی اس میں شامل ہو جاؤں گا۔ ہم لوگ چنڈی گڑھ کے مشاعرے میں آپ کے منتظر تھے لیکن معلوم ہوا کہ لاہور کی مصروفیتیں آپ کی راہ

میں حائل ہیں۔ آجاتے تو کچھ دن اچھے نکل جاتے۔ لاہور میں آپ کے ساتھ گزارے ہوئے کچھ لمحے ابھی تک مجھے تازہ دم رکھے ہوئے ہیں۔

○

ابن فرید' رام پور (بھارت)

محترم قاسمی صاحب۔ السلام علیکم

آپ کی عنایت بے نہایت معاصر موسم سرما ۱۹۹۴ء کی صورت میں موصول ہوا۔ اس عزت افزائی اور کرمفرمائی کے لئے سراپا سپاس ہوں۔ کئی راتیں اس کے مطالعہ کے ذریعہ کار آمد ثابت ہوئیں۔ آپ کی سلیقہ مندی' نفاست اور حسن ذوق کا میں ہمیشہ معترف رہا ہوں۔ اس شمارہ نے اس اعتراف میں مزید اضافہ کر دیا۔ افسانوی حصہ میں مجھے یہ وصف خاصا دلپذیر محسوس ہوا کہ تجریدیت و ایکائیت کی سمیلت کے بجائے اس میں معنویت اور عصری شعور نمایاں ہے۔ اگر محترم احمد ندیم قاسمی اجازت دیں تو میں "تیلی" کو اسلامی ادب کی نمائندہ تحریروں میں شمار کروں۔ تمام منظومات' تنقیدات' غزلیات' خاکہ جات وشخصیاتی مضامین معیاری و ادبی ہیں۔ ہر ایک کی الگ الگ تعریف مونو ٹونس ہو جائے گی۔ ایک امر نے قدر خلش پیدا کر دی ہے۔ بھیل پوڑی اور چھولے بھونے والی تحریریں اگر معاصر میں شائع نہ کریں تو اچھا ہو۔ ان کے معاصر کا معیار مجروح ہوتا ہے۔ آپ چاہیں تو اس مشورے کو قبول کریں چاہیں تو نظر انداز کر دیں' ان سے متفق ہونا آپ کے لئے ضروری نہیں!

○

عبدالقیوم (کیماڑی' کراچی)

جناب من!

معاصر (موسم سرما ۱۹۹۴ء) کے شمارے کی فہرست پر ایک نظر ڈالتے ہی زبردست Shock لگا۔ میرے خیال میں یہ برصغیر کا پہلا اچھا خاصا تقریباً ساڑھے پانچ سو صفحات کا وزنی شمارہ ہے جس میں "طنزومزاح" کو قطعاً نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ اگر کوئی اور مدیر ایسا شمارہ نکالتا تو بات سمجھ میں آتی کہ شاید طنزیہ و مزاحیہ تحریروں کی عدم دستیابی کی وجہ سے اس

نے مجبوری کے تحت ایسا کیا ہو گا لیکن عطاء الحق قاسمی جیسے خوبصورت طنزومزاح لکھنے والے مدیر کی موجودگی میں شمارے کا یوں "یتیم" صورت لیے شائع ہونا واقعی باعث تعجب ہے!

افسانوں میں احمد ندیم قاسمی کا "چھلی" اور نیلوفر اقبال کا "کھوٹا سکہ" بہت اچھے افسانے ہیں۔ محمد سعید شیخ کے افسانے "سولی" کا جواب نہیں۔ اردو کے صاحب طرز ادیب اخلاق احمد دہلوی مرحوم پر حمید اختر کا لکھا مضمون "ویرانے پہ کیا گذری" پڑھ کر دل کو بہت ٹھیس لگی کہ ہمارے ان ذہین و فطین لوگوں کی ناقدری کس درجے پر ہے۔ دہلی میں سونے میں تلنے والا لاہور آ کر تنکے کی طرح اتنا ہلکا ہو جائے گا کہ اس کے جنازے میں تین افراد شامل ہوں گے' یہ خیال آتے ہی آنکھوں میں آنسو چھلک آتے ہیں۔ احمد ندیم قاسمی نے "میں نے منٹو کو کیسا پایا" لکھ کر اردو کے اس عظیم افسانہ نگار کی شخصیت کے ان گنت پہلو دکھا کر قائل کر دیا کہ جسے بعض لوگ فحش نگار کہہ کر گالیاں دیتے تھے وہ دل کا کتنا سچا' کھرا اور بباطن کتنا عظیم انسان تھا۔ مرحب قاسمی صاحب کا "موصوف" پڑھ کر دل یہ ماننے کو نہیں چاہتا کہ خواتین شگفتہ نثر نہیں لکھ سکتیں۔ شادی کے فوراً بعد مرحب قاسمی صاحبہ نے "موصوف" کی صورت میں اپنے شوہر کبیر خان کو ایک خوبصورت تحفہ دیا ہے۔ ڈاکٹر محمد بشیر گورایا کا "پنجابی کہانی اور عصری تقاضے اور ڈاکٹر الف نسیم کا "بات شعری سرقہ کی" پڑھ کر معلومات میں اضافہ ہوا۔ ساقی فاروقی کی ایک غزل کے حوالے سے ندیم' مشفق خواجہ اور ساقی کی خط و کتابت پڑھ کر یوں تو لطف آیا لیکن ساقی کی ڈاکٹر وزیر آغا کے بارے میں تلخ کلامی پر افسوس ہوا۔ امید ہے آئندہ ادارہ "معاصر" کم سے کم سال میں دو تین شمارے ضرور شائع کرے گا!

○

پروفیسر سرور جمالی (کراچی)

محترم عطاء الحق قاسمی صاحب السلام علیکم!

موسم سرما ۱۹۹۴ء کا "معاصر" نظر نواز ہوا بلاشبہ یہ ادب میں مثبت روایات اور اعلیٰ قدروں کا ترجمان کہا جا سکتا ہے۔

نظر لگے نہ کہیں.........

مدیران گرامی کے معروف و مشہور ناموں نے اس کی ادبی' ثقافتی' تعمیری

اور تہذیبی اقدار میں سونے پر سہاگے کا کام کیا ہے۔ اس کی تاخیر ہی سے لیکن بہرحال شائع ہونے پر بصد تہنیت پیش کرتا ہوں۔

کراچی میں مجھے "معاصر" کافی تاخیر کے بعد ماہ فروری میں دستیاب ہو سکا اور اب تک میں نے اس کے "اداریہ" سے لے کر انتظاریہ تک سارے کے سارے مقالے شخصیات' افسانے' ساقی کی غزل پر ایک دلچسپ بحث' خصوصی مطالعہ' حمد و نعت' غزلیں' نظمیں کتب پر تبصرے وغیرہ نہ صرف پڑھ ڈالے بلکہ کھنگال ڈالے ہیں۔

میرے خیال میں جناب عطاء الحق قاسمی کا اداریہ "رہنمائی فرمائیں" بہت ہی فکر انگیز اور پر لطف ہے۔ ادیب کو کیا کرنا چاہیے اور کیا نہیں کرنا چاہیے یہ حکومت کا منصب نہیں' بلکہ ایک ادیب خود لکھتے وقت اپنا ادبی احتساب بروئے کار لا کر لاشعوری یا شعوری طور پر منفی و مثبت رجحانات کو رد یا برقرار رکھ سکتا ہے۔ جناب احمد ندیم قاسمی کا "بائیکاٹ" بھی خوب ہے' اور موجودہ حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے ان کا یہ فیصلہ سو فی صد درست تھا۔ بقول غالب

"میں جانتا ہوں جو وہ لکھیں گے جواب میں"

"اہل قلم کانفرنسیں" زیادہ تر منفی پہلو کی حامل ہوتی ہیں اس لئے کسی خوددار اور باوقار شخصیت کا اسمیں شمولیت سے جہاں تک ممکن ہو اجتناب ہی کرنا بہتر ہے۔

افسانوں میں جناب قاسمی کا "چھلی" تکنیک' فن اور زبان کے ناتے بہت کامیاب افسانہ اور اعلیٰ معاشرہ کے منہ پر ایک زبردست طمانچہ ہے۔ نامور افسانہ نگار جناب اشفاق احمد اور بانو قدسیہ کے افسانے "کیا کسی کو پھر کسی کا؟ اور "کعبہ مرے پیچھے" میری ناچیز رائے میں شاہکار اور اعلیٰ درجے کے افسانے ہیں جن میں منشیات اور ہیروئن کی بڑھتی ہوئی وبا کو امریکی نقطہ نظر اور ایک خاص مقصد کے تحت اجاگر کر کے اس کی تمام جزئیات اور باریکیوں کو فنی اور افسانوی تکنیک میں بڑی چابکدستی اور مہارت کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔

○

نعیم الرحمان (کراچی)

محترمی

السلام و علیکم

میں علم و ادب کا ایک ادنیٰ طالب علم ہوں ملک کے تقریباً تمام ادبی جرائد کا مستقل خریدار ہوں۔ بد قسمتی سے ڈاک کی بڑھی ہوئی شرح اور دیگر وجوہات کی بناء پر کئی ادبی جرائد دستیاب نہیں اس صورت میں جن جرائد کا پتہ دستیاب ہو جائے ان کا مستقل خریدار بن جاتا ہوں۔ آپ کے جریدے "معاصر" کا شمارہ نمبر ۴ بابت سرما ۹۴ء حال ہی میں حاصل ہوا۔ پڑھ کر از حد مسرت ہوئی اتنا خوبصورت جریدہ اب سے قبل نہ مل سکا اس کا سخت افسوس ہوا۔ "معاصر" بلاشبہ ایک مکمل ادبی جریدہ ہے نظم و نثر کا بہترین انتخاب اس میں موجود ہے۔ اس شمارہ کی نمایاں خصوصیات ایک طویل عرصہ بعد احمد ندیم قاسمی اور اشفاق احمد کے تازہ افسانے' ساقی فاروقی کی غزل پر ایک دلچسپ بحث' پروین شاکر پر گوشہ' عباس تابش' ظفر اقبال اور سعید قیس کا خوبصورت کلام' احمد ندیم قاسمی اور حمید اختر کے تحریر کردہ خاکے ہیں۔ اس کے علاوہ بھی نظم و نثر کا تمام تر انتخاب بہترین ہے جس پر اگر مکمل تبصرہ کیا جائے تو کئی صفحات اس کے لئے درکار ہوں گے خصوصاً کسی ایک پرچہ میں اس قدر بہترین تخلیقات نظر نہیں آئیں آپ بلاشبہ اتنے اچھے جریدے کی اشاعت پر مبارکباد کے مستحق ہیں۔ اتنے اچھے جریدے کو پڑھ کر اس کے سابقہ شماروں سے محرومی کا احساس بہت زیادہ ہوا۔ آپ سے درخواست ہے کہ "معاصر" کے تینوں سابقہ شمارے یا ان میں سے جو شمارے بھی دستیاب ہوں مجھے فراہم کر دیں جو شمارے دستیاب ہوں اگر وی پی کر دیں تو آپ کا از حد مشکور ہوں گا اور اگر اس کے لئے پہلے منی آرڈر کرنا ضروری ہے تو برائے کرم فوری طور پر مجھے مطلع کریں کتنی رقم کا منی آرڈر کروں اور آئندہ کے لیے بھی مستقل خریداری کے طریقہ کار سے آگاہ کریں۔

آپ کے جواب اور مطلوبہ شماروں کا شدت سے انتظار رہے گا پیشگی شکریہ۔

# ممتاز مفتی

عطاء الحق قاسمی

میں بہت دنوں سے ممتاز مفتی کی موت کا انتظار کر رہا تھا تاکہ اس پر کالم لکھ سکوں لیکن اتنے دن گزرنے کے بعد بھی میری نظروں میں "مرحوم" ممتاز مفتی کی کوئی تصویر نہیں ابھر سکی۔ کفن اوڑھا ہو' آنکھیں موندی ہوں' نتھنوں میں روئی ٹھنسی ہو اور وہ بے حس و حرکت پڑے ہوں میں جب بھی اپنے ذہن میں اس طرح کی کوئی تصویر بنانے کی کوشش کرتا ہوں۔ مفتی صاحب اگلے ہی لمحے اٹھ کر بیٹھ جاتے ہیں اور میرے کاندھے ر دو ہتڑ مار کر کہتے ہیں "ہور سنا فیر تیرے ادبی حلقے کیہہ کہندے نیں!" چنانچہ مفتی صاحب کی اس طرح کی حرکت کی وجہ سے میں ہر دفعہ ان کی وفات پر کالم لکھتے لکھتے رہ جاتا ہوں۔ لیکن میں نے سوچا کہ یہ تو کوئی بات نہ ہوئی اگر مفتی صاحب فوت ہونے کا نام نہیں لیتے تو اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ میں ان پر کالم بھی نہ لکھوں؟ اور ویسے بھی مفتی صاحب کون سے ایسے ثقہ راوی تھے کہ میں ان کی بات پر اعتبار کروں اور یہ جو اخبارات کی سرخیاں اور کالم نگار ان کی موت کا اعلان کرتے پھرتے ہیں' انہیں جھوٹا قرار دوں' سو میں نے کاغذ قلم سنبھال لیا ہے اور مفتی صاحب کی وفات پر کالم لکھنے بیٹھ گیا ہوں' امید ہے مفتی صاحب میری اس بے تکلفی کو معاف فرمائیں گے!

میں زندگی میں جب کبھی ممتاز مفتی کے بارے میں سوچتا تھا تو وہ اکیلے میرے ذہن میں کبھی نہیں آتے تھے بلکہ ان کے ساتھ قدرت اللہ شہاب' اشفاق احمد' جمیل الدین عالی ' بانو قدسیہ ' ابن انشاء ' احمد بشیر' مسعود قریشی' عمر "بکری" (معذرت کے ساتھ کہ دوستوں کے اس گروپ میں ان کا نام یہی تھا) اور خواتین کی ایک لمبی قطار بھی میرے ذہن میں گھوم جاتی تھی اور یہ سطور لکھتے وقت بھی یہ سب خواتین و حضرات ایک ہالے کی صورت میں مجھے نظر آرہے ہیں۔ اخباری اطلاعات کے مطابق مفتی صاحب نے نوے سال کی عمر میں انتقال کیا اور وہ وفات سے تین دن پہلے تک ' علیل ہونے کے باوجود' پوری طرح ہوش و

حواس میں تھے' گوپیوں کے جھرمٹ اپنے اس کرشن کنہیا کے درشنوں کو آتے تھے اور یہ کنہیا دونوں ہاتھوں سے ان کی محبتیں سمیٹتا تھا۔ ان گوپیوں میں اٹھارہ سال سے اسی سال تک کی گوپیاں شامل تھیں اور جو اس گرو کے چیلے تھے۔ ان میں ابدال بیلا سے منشاء یاد اور منشاء یاد سے لاٹھی ٹیکنے کی عمر تک کے بھی لوگ شامل تھے۔ مفتی صاحب کے پاس خدا جانے کیا گیدڑ سنگھی تھی کہ جو ان سے ملتا تھا ان کا گرویدہ ہو جاتا تھا۔ اپنے عہد کے اس بڑے افسانہ نگار کی کچھ اداؤں کا تو مجھے بھی علم ہے جن پر لوگ مرمٹتے تھے۔ ایک ان کی گفتگو کا افسانوی انداز اور دوسرا ہمدردی' غمگساری اور اپنے عہد کے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی! وہ جب گفتگو کرتے تھے تو ایسے لگتا تھا جیسے ایک داستان گو آگ کے الاؤ کے گرد بیٹھا کوئی داستان بیان کر رہا ہے اور اسے داستان پر اس درجہ قدرت حاصل ہے کہ سننے والے آنکھ بھی نہیں جھپک پاتے۔

اس کے علاوہ وہ اپنے ملنے والوں کے دکھ درد کو جس طرح اپنی ذات کا حصہ بناتے تھے۔ وہ بھی ان کی محبوبیت میں اضافے کا سبب بنتا تھا اور جہاں تک لکھنے والوں خصوصاً نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کا تعلق تھا' مفتی صاحب اس میں "خیر" کر دیتے تھے وہ نہایت معمولی لکھنے والوں کو بھی اپنی گفتگو سے اتنا حوصلہ دیتے کہ وہ اپنی ناکامیوں میں سے کامیابی کا راستہ تلاش کرنے میں کامیاب ہو جاتے۔ مجھے جب بھی ملتے۔ ہمیشہ اصرار کرتے کہ تم جو اپنے کالموں میں افسانے بھر دیتے ہو۔ باقاعدہ افسانے کیوں نہیں لکھتے' انہوں نے مجھے زیادہ ناول نگاری پر اکسایا اور اتنا اکسایا کہ میں اس کے لئے ذہنی طور پر تیار ہو گیا' مگر اخباروں کی سرخیاں بتاتی ہیں کہ مفتی صاحب فوت ہو گئے ہیں۔ اگر وہ واقعی فوت ہو گئے ہیں تو میں اگر ناول لکھنے میں کامیاب بھی ہو گیا تو اس پر مجھے "حوصلہ افزائی کا انعام" کون دے گا؟

مفتی صاحب اپنی تمام تر وسیع القلبی اور کشادہ دلی کے باوجود کبھی کبھار کسی بات پر رنجیدہ بھی ہو جاتے تھے مگر وہ جو مومن کی نشانی ہے کہ اس کا دل بھی فوراً صاف ہو جاتا ہے تو یہ نشانی مفتی صاحب میں بھی بدرجہ اتم موجود تھی۔ چنانچہ وہ زیادہ عرصہ کسی سے ناراض نہیں رہ سکتے تھے' ایک دفعہ احمد ندیم قاسمی صاحب سے ناراض ہوئے اور اپنی اس ناراضی کا اظہار ایک خط میں بھی کیا۔ مگر کچھ ہی عرصے بعد ان کا دل شیشے کی طرح صاف ہو گیا

چنانچہ انہوں نے اس ضمن میں ندیم صاحب کو جو خط لکھا' وہ ان کی اس وسیع القلبی اور کشادہ دلی کا مظہر ہے جو ان کی ذات کا لازمی حصہ تھی۔

"علی پور کا ایلی" ممتاز مفتی کی شاہکار کتاب ہے۔ "لبیک" بھی ان کا بالکل منفرد قسم کا سفرنامہ حج ہے۔ ان کی ان تحریروں اور ان کی گفتگو میں کوئی تفاوت نہیں تھا' دونوں چونکانے والی بھی دونوں اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش تھیں اور وہ اس میں ہمیشہ کامیاب رہے۔ قدرت اللہ شہاب کی اولیائی کے قصے اور اس طرح کے دوسرے واقعات کا بیان یقیناً اس کے تجربے کا حصہ ہوں گے لیکن مجھے ہمیشہ ان میں چونکانے کا علم زیادہ نمایاں نظر آیا۔ وہ بظاہر جو کہتے تھے' بین السطور بات اس سے بالکل الٹ ہوتی تھی' مثلاً جب وہ کسی کی برائی بیان کرتے ' اس برائی میں سے اچھائی اچھل اچھل کر باہر آرہی ہوتی اور سب سے زیادہ "برائیاں" وہ بانو قدسیہ کی بیان کرتے تھے۔ اشفاق احمد کا اسٹائل بھی یہی ہے چنانچہ میں مفتی صاحب کے ظاہری لفظوں پر کبھی اعتبار نہیں کرتا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ میں ان کی موت پر بھی تا حال اعتبار کرنے کو تیار نہیں ہوں۔ میں سوچ رہا ہوں کہ کیا یہ زندہ و تابندہ شخص واقعی مر گیا ہے یا ایک دفعہ پھر لوگوں کو چونکانے کی کوشش کر رہا ہے؟

○

# ڈاکٹر آفتاب نقوی

عطاء الحق قاسمی

گزشتہ ہفتے جب میری اہلیہ نے ڈاکٹر آفتاب نقوی اور مقبول کاوش کے لرزہ خیز قتل کی خبر اخبار میں پڑھی تو اس نے کہا "آپ 1970ء میں امریکہ کی شہریت چھوڑ کر واپس پاکستان آگئے تھے، اگر ممکن ہو تو اب بچوں کی خاطر دوبارہ امریکہ کی شہریت حاصل کرنے کی کوشش کریں"۔

"وہ کیوں"؟ ... میں نے پوچھا۔

"اس لئے کہ جہاں اسکالروں اور سو فیصد امن پسند شہریوں کی زندگیاں بھی محفوظ نہ رہیں، وہاں سے ہجرت کر جانا ہی بہتر ہے"۔

میں نے اپنی اہلیہ کی زبانی اس طرح کی بات پوری ازدواجی زندگی میں پہلی مرتبہ سنی اور میں نے سوچا کہ دشمن اپنی حکمت عملی میں پوری طرح کامیاب ہے، وہ پاکستانیوں کو پاکستان کے مستقبل سے مایوس کرنا چاہتا ہے اور جب کوئی قوم اپنے مستقبل سے مایوس ہو جاتی ہے تو پھر اسے فتح کرنے کے لئے ہتھیار اٹھانے کی ضرورت نہیں پڑتی۔

میں ڈاکٹر آفتاب نقوی اور مقبول کاوش دونوں کو ذاتی طور پر جانتا ہوں۔ مقبول کاوش ایک اچھے شاعر اور نہایت شریف النفس انسان تھے۔ ڈاکٹر آفتاب نقوی سے میرے دہرے تہرے رشتے ہیں۔ وہ میرے عزیز اور نوائے وقت کے ادبی ایڈیشن کے انچارج عمران نقوی کے بڑے بھائی تھے۔ پاکستان اور اسلام سے ان کی والہانہ وابستگی کے حوالے سے میرے دل میں ان کے لئے بہت احترام ہے اور پھر ہم ایک ہی یونیورسٹی کے فیض یافتہ تھے۔ وہ اگرچہ مجھ سے جونیئر تھے لیکن علمی فضیلت میں وہ سب پر بازی لے گئے انہوں نے نعت میں پی ایچ ڈی کی اور پھر اپنی تمام دلچسپیوں اور سرگرمیوں کا محور نعت ہی کو بنا لیا۔ انہوں نے رسالہ "اوج" کا نعت نمبر نکالا جو کئی ہزار صفحات پر محیط تھا اور غالباً اس موضوع پر اس سے بڑا کام آج تک نہیں ہوا۔ چنانچہ جب انہیں اس عظیم کام پر صدارتی ایوارڈ سے نوازا گیا تو ہر طرف سے حق بہ حقدار رسید کی آوازیں سنائی دیں۔ اگرچہ مسلکی لحاظ سے ان کا تعلق بریلوی

مکتبہ فکر سے تھا لیکن وہ انتہائی مرنجان مرنج انسان تھے۔ فرقہ واریت ان کے قریب سے نہیں گزری تھی۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ ان کے جنازے میں دیوبندی' بریلوی' اہل حدیث' شیعہ سب ہی شامل تھے۔ اور ان کی طبعی شرافت سے آشنا دوست دھاڑیں مار مار کر رو رہے تھے۔ یہی معاملہ بچارے مقبول کاوش کا تھا۔ وہ ڈاکٹر صاحب سے ملنے ان کے گھر گئے دونوں نے ناشتہ اکٹھے کیا اس کے بعد ڈاکٹر آفتاب نقوی نے اپنے کالج جانے کے لئے موٹر سائیکل اسٹارٹ کرنے کی کوشش کی تو وہ اسٹارٹ نہ ہوا۔ مقبول کاوش نے انہیں اپنے موٹر سائیکل پر بٹھایا ابھی وہ تھوڑی ہی دور گئے تھے کہ موٹر سائیکل ہی پر سوار دو نقاب پوشوں نے ان کا راستہ روکا اور پورے اطمینان سے بھرے بازار میں تھانے سے چند قدم کے فاصلے پر ان کے دماغ میں باری باری گولیاں اتاریں اس کے بعد ایک گولی ان کے دل پر داغی اور سیٹیاں بجاتے ہوئے اپنی کسی اگلی منزل کی طرف روانہ ہوگئے۔ ڈاکٹر آفتاب نقوی اور مقبول کاوش اپنے موجودہ مقام تک کتنی مشکلوں سے پہنچے تھے' ظالموں نے کتنی آسانی سے قوم کو ان کے علم و فضل سے محروم کر دیا اور ان کے کنبوں کو بے سہارا کر دیا! تعمیر کتنی مشکل اور تخریب کس قدر آسان ہوتی ہے؟

پروفیسر ڈاکٹر آفتاب نقوی صرف علم و فضل ہی کے حوالے سے نمایاں حیثیت کے حامل نہیں تھے بلکہ ایک سیلف میڈ انسان کی حیثیت سے بھی ان کی زندگی دلوں کو حوصلہ دینے والی تھی۔ انہوں نے اپنی عملی زندگی کا آغاز معمولی نوکری سے کیا مگر علم سے محبت ان کو نئی منزلوں کی طرف رواں دواں کرتی چلی گئی اور پھر ایک وقت آیا کہ وہ پروفیسر بنے۔ ڈاکٹر بنے اور ایک محقق اور نقاد کے طور پر سامنے آئے۔ مجھے ڈاکٹر صاحب کی جو بات سب سے زیادہ پسند تھی کہ علمی تبحر کے باوجود ان کی شخصیت میں وہ بہوست موجود نہیں تھی جو بعض "اہل علم" کا خاصہ سمجھی جاتی ہے۔ ان کے چہرے پر ہر وقت مسکراہٹ کھیلتی تھی' بے تکلف دوستوں کی محفل میں جملے کہتے اور سہتے تھے۔ طبیعت میں استقامت بہت تھی جس کام کا بیڑا اٹھاتے اسے پایۂ تکمیل تک پہنچا کر ہی دم لیتے۔ میں نے ایک دن انہیں فون کیا اور کہا کہ میں "معاصر" کا ایک ضخیم نمبر کشمیر کے غازیوں اور شہیدوں کے لئے وقف کرنا چاہتا ہوں مگر یہ کام مجھ اکیلے کے بس کا نہیں' میں چاہتا ہوں کہ اس نمبر کے لئے آپ "شریک مدیر"

کے طور پر میرے ساتھ آئیں۔ میرا خیال تھا کہ وہ شاید اپنی مصروفیات اور گوناگوں علمی کاموں کا عذر پیش کریں گے۔ مگر انہوں نے یہ سب کچھ بتلائے بغیر میرے ساتھ بھرپور تعاون کا وعدہ کیا اور اپنی شہادت سے چند روز قبل مجھے فون کر کے بتایا کہ انہوں نے کشمیر کے حوالے سے کام کا آغاز کر دیا ہے چنانچہ اب کوئی میٹنگ ہونی چاہئے۔ تاکہ ہم کوئی ٹھوس لائحہ عمل مرتب کر سکیں۔ ان کے ساتھ میری میٹنگ چند روز قبل ہوئی جب وہ سفید کفن اوڑھے لیٹے تھے' چہرے پر اطمینان اور سکون کی وہی کیفیت تھی جو ان کی زندگی میں نظر آتی تھی۔ مسافر' سفر پر روانہ ہورہا ہو اور زاد سفر ساتھ ہو تو وہ اسی طرح مطمئن ہوتا ہے۔ قاتل اپنے انجام کو پہنچتے ہیں اور مقتول اپنی منزل تک رسائی حاصل کرتے ہیں وہ جو بے گناہ قتل ہوتے ہیں انہیں اللہ تعالیٰ اپنے جوار رحمت میں جگہ دیتا ہے اور جو قاتل ہوتے ہیں انہیں زمینوں اور آسمانوں میں کہیں بھی پناہ نہیں ملتی۔

جب میں نے ڈاکٹر آفتاب نقوی اور مقبول کاوش کے قتل کی خبر سنی تو مجھے اچانک پہلی بار احساس ہوا کہ قتل کو گناہ کبیرہ میں کیوں شامل کیا گیا ہے؟ شاید اس لئے کہ مقتول وہ نہیں ہوتا جسے قتل کیا گیا ہوتا ہے۔ بلکہ "مقتول" تو ورثا اور لواحقین ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر آفتاب نقوی کے چھ بچے ہیں۔ مقبول کاوش بھی اسی طرح عیال دار ہونگے۔ اب ان کنبوں کا کفیل کوئی نہیں رہا۔ ریاست کا کام اپنے شہریوں کے جان و مال اور عزت و حرمت کی حفاظت کرنا ہے۔ اگر وہ اپنے کسی شہری کے ضمن میں اپنا یہ فرض ادا نہیں کر پاتی تو اس کا کم سے کم فرض یہ ہے کہ وہ اس کے کنبے کو مالی پریشانیوں سے نجات دلائے تاکہ لواحقین خود کو زندہ درگور نہ سمجھیں۔ پنجاب کے وزیر اعلیٰ سردار عارف نکئی سے گزارش ہے کہ وہ اس ضمن میں اپنا فرض ادا کریں۔ مقتولین تو اس ملک کے شہری ہی نہیں عالم فاضل شہری تھے اور یوں سردار صاحب کی ذمہ داری میں دوگنا اضافہ ہوجاتا ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ قاتلوں کی فوری گرفتاری اور ورثاء کو معقول معاوضہ دینے کے ضمن میں وہ اپنی ذمہ داریاں کتنی جلدی ادا کرتے ہیں؟

○

# آخری صفحہ

## ایڈیٹر

"معاصر" کا پانچواں شمارہ پیش خدمت ہے۔ جیسا کہ آپ جانتے ہیں "معاصر" کا پہلا شمارہ کم وبیش آٹھ سو صفحات، دوسرا شمارہ، گیارہ سو صفحات، تیسرا شمارہ ساڑھے تین سو صفحات اور چوتھا شمارہ ساڑھے پانچ سو صفحات پر مشتمل تھا۔ اب پانچواں شمارہ آپ کے ہاتھوں میں ہے جو نو سو صفحات پر مشتمل ہے۔ ہم ہر دفعہ کانوں کو ہاتھ لگاتے ہیں کہ آئندہ اتنا ضخیم پرچہ نہیں نکالیں گے کہ اس کی اشاعت ایک مسئلہ بن جاتی ہے لیکن ہر بار ہمارے پاس اتنی خوبصورت تحریریں جمع ہوجاتی ہیں کہ انہیں حصوں میں بانٹنے کو جی نہیں چاہتا۔ کاغذ سے لے کر پرنٹنگ کے اخراجات پورے کرنے تک ہمیں جن دشوار گذار مراحل سے گزرنا پڑتا ہے۔ ہم اس کی تفصیل سے قارئین کو نہ تو بور کریں گے اور نہ ان پر کوئی احسان جتائیں گے۔ ہم اگر پرچہ نکالتے ہیں تو اپنے شوق کی تکمیل کے لئے نکالتے ہیں چنانچہ اس رستے میں پیش آنے والی تکلیفوں کے ذکر یا کسی پر احسان دھرنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ہم نے پرچے کی قیمت بھی بہت کم رکھی ہے اور یوں اس سارے "پروجیکٹ" میں ہمارا "منافع" وہ پذیرائی ہے جو اس پرچے کو پوری دنیا میں پھیلے ہوئے اردو ادب کے قارئین سے ملتی ہے۔ ہم اپنے قارئین کے بھی ممنون ہیں اور اپنے تخلیق کاروں کے بھی جن کے بغیر ہم کچھ بھی نہیں ہیں اور مشتہرین کے بھی کے جن کے تعاون کے بغیر ہم اتنا ضخیم مجلّہ کبھی شائع نہیں کر سکتے۔ ویسے آئندہ، ہمارا ارادہ سال میں کم از کم تین شماروں کی اشاعت کا ہے اور ظاہر ہے ان شماروں کی ضخامت خاصی کم ہوگی۔ تاہم یہ ہمارا ارادہ ہے' وعدہ نہیں ہے یہ ارادہ اس صورت میں عملی شکل اختیار کر سکے گا. اگر ہم معیاری تخلیقات مخصوص مدت میں حاصل کرنے میں کامیاب ہوسکے کہ اصل مقصد پرچہ نکالنا نہیں. معیاری پرچہ نکالنا ہے۔

اب دو ایک گذارشات اپنے قلمی معاونین سے! ایک گذارش تو یہ کہ وہ

براہ کرم ہمیں اپنی تحقیق کی فوٹو کاپی ارسال نہ کریں ہمیں وہ اصل مسودہ بھیجیں اور فوٹو کاپی اپنے پاس محفوظ رکھ لیں فوٹو کاپی پروف کی بے شمار غلطیوں کا باعث بنتی ہے۔ دوسری گذارش یہ کہ "معاصر" کے لئے جو تحقیق عنایت کریں. یہ سوچ کر کریں کہ پرچے کی اشاعت میں کافی تاخیر بھی ہوسکتی ہے۔ کاپیاں پیسٹ کرتے وقت ہمیں بہت سارا کمپوزڈ میٹر ضائع کرنا پڑتا ہے کہ اس دوران وہ کہیں اور شائع ہوچکا ہوتا ہے جس ۔ سے ادارے کو بہت مالی نقصان برداشت کرنا پڑتا ہے اور تیسری گزارش مکتوب نگار خواتین و حضرات سے ہے کہ خطوط اگر تجزیاتی نوعیت کے ہوں تو ان کی افادیت دوچند ہوجائے گی۔

ایک دو گذارشات ہمیں قارئین سے بھی کرنا ہیں ایک تو یہ کہ ہمارے اسٹاک میں "معاصر" کے گذشتہ شمارے موجود نہیں ہیں. لہٰذا شائقین کی فرمائش پوری کرنا ہمارے بس میں نہیں دوسرے یہ کہ ہم فی الحال "معاصر" کے سالانہ خریدار نہیں بناتے۔ جب پرچے کو باقاعدہ کریں گے اس وقت سالانہ خریداری کا سلسلہ شروع کیا جائے گا اور تیسری گذارش یہ کہ "معاصر" پاکستان میں ہر اچھے بک اسٹال پر دستیاب ہوتا ہے چنانچہ دفتر کو آرڈر بھیجنے کی بجائے اگر آپ اسٹال سے پرچہ خرید فرمائیں تو اس میں دکاندار کا فائدہ اور ہماری اور آپ کی سہولت مضمر ہے۔

اور آخر میں یہ کہ آپ آخری صفحے تک پہنچ چکے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ پرچہ پڑھ چکے ہیں تو پھر ہمیں آپ کی رائے کا انتظار ہے۔

عطاء الحق قاسمی

45 اے مزنگ روڈ، لاہور
فون: 7832037-5416262

۱۵ جنوری ۹۶ء

تعاون

جناب ایم انور مرزا

دوحہ۔ قطر

# لمحہ فکریہ!

## اہل علم و دانش، تاریخ دان، ماہرین عمرانیات، علماء و اساتذہ کرام کے لئے لمحہ فکریہ!

بے شمار دینی تنظیموں، دینی مدارس، علماء و پیران کرام اور دینی رسائل و کتب کے باوجود پاکستان میں صحیح مسلمان بلکہ انسان تک تلاش کرنا مشکل ہو گیا ہے۔ اسلام کے علمبردار ہونے کے باوجود ہم میں مسلمانوں والی کوئی خوبی موجود نہیں بلکہ منافقت کی انتہا ہے۔ ہر بدی ہم میں کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔ حالات کا جائزہ لیں تو آپ تسلیم کریں گے کہ:

1. ہر بدی ہماری قوم میں اپنی انتہاؤں پر ہے۔ جھوٹ، مکر، فریب، ناانصافی، ملاوٹ، ظلم، بے حیائی، رشوت و بدعنوانی کی انتہا ہو چکی ہے اور ہمارے معاشرے کا کوئی پہلو ایسا نہیں جس پر اطمینان کا اظہار کیا جا سکے۔
2. قوم ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہے اور ہماری سیاست مکر و فریب کا منشور لئے تیزی سے آگے بڑھ رہی ہے۔
3. اتحاد کا درس دینے والے مذہبی راہنما اور دینی جماعتیں منافقت، تعصب اور انتشار کا شکار ہیں اور اسی کا پرچار کر رہی ہیں۔
4. سیاسی و مذہبی راہنماؤں نے معاشرے کو فرقہ واریت، تعصب اور منافقت سے اس حد تک بھر دیا ہے کہ انسانیت نام کی کوئی چیز ہم میں باقی نہیں رہی۔ ہر فرد دوسرے کا حق مارنے اور اسے نقصان پہنچانے کے لئے گھات لگائے بیٹھا ہے۔ مذہبی فرقہ واریت، سیاسی تعصب اور نفرتوں نے قوت برداشت ختم کر دی ہے اور ہر فرد مرنے مارنے پر تلا ہوا نظر آتا ہے۔
5. جہالت، پسماندگی، غربت اور ظلم ہماری شناخت بن چکے ہیں۔ دنیا ترقی کر کے بہت آگے نکل چکی ہے اور ہم ابھی تک اقتصادی پسماندگی اور اخلاقی بدحالی کا شکار ہیں۔ دوسرے اسلامی ممالک تیزی سے ترقی کی منزلیں طے کر رہے ہیں لیکن ہم روز بروز پستی میں گرتے چلے جا رہے ہیں۔ ہم میں برائیاں بڑھ رہی ہیں اور خوبیاں ناپید ہوتی جا رہی ہیں۔ افسوس تو یہ ہے کہ ہم میں کوئی ایسی خوبی نہیں رہی جسے آئندہ آنے والی نسلوں کے لئے بطور نمونہ پیش کر سکیں۔ مزید افسوس یہ ہے کہ ہمیں اس کی کوئی فکر بھی نہیں۔
6. ہر فرد کے لئے زندگی عذاب بن چکی ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ روز حساب سے پہلے ہی جہنم میں پہنچا دیئے گئے ہیں۔
7. تاریخ بتاتی ہے کہ ایسے حالات صرف ان قوموں میں پائے جاتے ہیں جن پر بحیثیت مجموعی خدا کی لعنت برس رہی ہو۔

### سوچنے کی بات

سوچنے کی بات یہ ہے کہ ہماری قوم سے ایسا کون سا گناہ سرزد ہوا کہ خدا کی ساری لعنتیں ہم پر ہی برس رہی ہیں۔ اس سلسلہ میں پاکستان کے اہل علم و دانش، تاریخ دان، ماہرین عمرانیات، علماء و اساتذہ کرام سے گزارش ہے کہ وہ مندرجہ بالا حالات کا تاریخ کے تناظر میں مطالعہ کریں اور ان غلطیوں کی نشان دہی کریں جن کی وجہ سے ہمارا معاشرہ تباہ ہوتا جا رہا ہے تاکہ اصلاح احوال ہو۔ اپنی تحقیق کے نتائج سے پوری قوم کو آگاہ کریں اور اپنی تحریریں ہمیں بھی ارسال کریں تاکہ ہم بھی اصلاح معاشرہ کے لئے بہتر منصوبہ بندی کر سکیں۔

**تحریک اصلاح معاشرہ پاکستان۔ پوسٹ بکس نمبر 6216 لاہور**

تعاون
جناب بابر فاروق
دوبئی
متحدہ عرب امارات

MUASAR The Literary Magazine Lahore - Pakistan Tel : 7832037 - 5416262
TAPAL TEA
دیکھا
ٹپال کا
کمال
دانے دار
TAPAL
TAPAL